
چنگاری

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چندہ ۱

ہفت روزہ چنگاری

ایڈیٹر
جمیل احمد
ادبی حصے کی ترتیب
بشیر احمد
انیس احمد خاں
شمارہ نمبر — ۲۲
قیمت ۲ روپے — سالانہ ۵۰ روپے
پتہ ۲/۱۰/۱۳۱ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

جمیل احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ... آفسٹ پرنٹرس جامع مسجد دہلی سے
چھپوا کر ۲/۱۰/۱۳۱ رام نگر دہلی ۳۲ سے شائع کیا۔

چنگاری ہر قسم کے استحصال کے خلاف ہے خاص طور پر مذہب کا استحصال مگر بعض لوگ دنیا میں کسی قدر کو بھی اہمیت نہیں دیتے شاید ایسے ہی لوگوں میں نارنگ صاحب ہیں انھوں نے چند وقتی فائدوں کے لئے ہندو دھرم چھوڑ کر قبول اسلام کیا اور پھر تختۂ مشق کھینچ کر دہریں جا بیٹھے۔ دراصل یہ لوگ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان بس موقع پرست ہیں۔ اور وقتی فائدے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ لیکن حیرت تو ان لوگوں پر ہے جو ایسے لوگوں کو بانس پر چڑھاتے ہیں۔ درجات و مراتب عطا کرتے ہیں۔

ملاحظہ کیجئے فوٹو اسٹیٹ کاپی صفحہ ۲۰ پر

اس شمارے میں

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]
ضروری ہے۔

[illegible]

•••

[illegible]

ستار طاہر — فٹ نوٹس

الف — اگر الف پیرے درکار —

حق . ہے ......

(۲)

DOUBLE, FACED READER, —

KINSMAN — BROTHERMINE!

(BAUDELAIRE)

(۳)

کچھ دنوں "نوائے وقت" کے ادبی ایڈیشن میں ممتاز مفتی کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا حسب قاعدہ اور دستور "پالیسی کے عین مطابق" ممتاز مفتی سے کچھ پسندیدہ سوال پوچھا گیا۔ اسلامی ادب کے بارے میں —

ممتاز مفتی ترقی پسند مصنفین کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار پہلے ہی کر چکے تھے۔ وہ رائے بھی اپنی جگہ دلچسپ چیز تھی۔ ممتاز مفتی نے کہا کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے تو انہیں اختلاف نہ تھا۔ بس یہ اعتراض تھا کہ یہ اوپر سے احکام لیتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال یہ جواب "نوائے وقت" کو خوش کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن اسلامی ادب کے بارے میں رائے دیتے ہوئے ممتاز مفتی نے صاف کہا کہ وہ اسلامی ادب وغیرہ جیسی اصطلاحوں کو سرے سے ہی نہیں مانتے ادب یا ادب ہوتا ہے۔ اسلامی ادب کوئی چیز نہیں ہوتی۔

(۴)

ایک کہانی سے ایک اقتباس —

"وہ عید کی نماز تھی۔ جماعت شروع ہو گئی ہے۔ اوپر اللہ کے گھر کی دھوپ کا سایہ ہے۔ نیچے بچھا ہوا چٹائی کا فرش ہے۔ جس پر ہاتھ بچھائے ہوئے اور نمازیوں کی قطاریں ایک سلائی کی طرح کھلی ہیں۔"

چنگاری ۴

[illegible] جگہ نہیں رہی [illegible]
[illegible] مثال [illegible]
[illegible]
[illegible] اور ایک ساتھ [illegible]
[illegible]
[illegible]

— ۵ —

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

— ۶ —

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

— ۷ —

[illegible]
[illegible]
[illegible]

قسمت دوم

جولائی ۱۹۵۰ء

چنگاری ۵

ان کی بیماری پر پنجاب گورنمنٹ اور اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے خاصی معقول رقم ان کو بھیجی گئی۔ لیکن انھوں نے اس رقم کو واپس کر دیا۔ قبول نہیں کیا۔

(۸)

یہ "تفضلات" بے نیازانہ ادا کیا ہے۔ ابوالاثر، فردوسی اسلام، پاکستان کے ترانے کے خالق، خان بہادر حفیظ جالندھری بھی اس ادا کو نہیں کر سکے۔ جو "ابوالاثر میرا شوہر" "ابوالاثر بچشم اہل نظر" جیسی کتابیں چھپوا کر، خاص جلدیں بندھوا کر ڈالر کی سنہری پرنٹنگ کرا کے — یہ کتابیں جنرل ضیاء الحق کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اور یوں — ایسی کتابیں — "آسی چیونٹے" کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، جسے لام پر صرف کر کے، نرواں کی امید میں زندہ رہا جاتا ہے — خواہ چھپا، پیلا گرا گئے سے ہی چلا جائے۔

یہ ادا — ہمارے محترم — میرزا ادیب بھی ...
مگر نہیں — ان کا ذکر ذرا تفصیل سے ہوگا

(۹)

گزشتہ "فٹ نوٹس" لکھتے ہوئے میں نے میرزا ادیب کی خود نوشت "مٹی کا دیا" پر اپنی طالب علمانہ رائے کا حق بیان کیا تھا۔ اس کتاب پر لکھتے ہوئے میں نے "مٹی کا سونا" یا "مدیاتی" جھوٹ؟ وہ یوں کہ میں جتنا کچھ اس ضخیم کتاب کے بارے میں لکھ سکتا تھا۔ پچھلے نوٹس میں نے اسی پر تیار کئے تھے۔ وہ پریس نہ گئے۔ وجہ یہ کہ ایک تو بات لمبی ہو جاتی تھی۔ دوسرا یہ کہ مجھے میرزا ادیب کا بھی احترام تھا۔ ورنہ وہ ایسی مجرمانہ رویہ کتاب ہے کہ اس پر میں بہت کچھ اور بھی لکھ سکتا تھا۔ اس کے بعض منفی پہلوؤں کو میں نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا تھا۔

اس کی اشاعت پر جناب (بشیر) محمد کا شدید ردعمل سامنے آیا۔ جو "تخلیق" کے گزشتہ شمارے میں شائع ہوا ہے۔ میں نے اس کتاب کے حوالے سے جو کچھ کہا اس پر اب بھی قائم ہوں۔ چیلنج کرتا ہوں کہ اگر کوئی بات غلط کہی ہے تو ثابت کی جائے۔ کتاب کے متن اور میرزا ادیب کی زندگی اور شخصیت سے باہر کی کوئی بات میرے قلم پر آئی ہو تو میں ہر سزا کا مستحق ہوں۔

مجھے کامل یقین تھا کہ جناب (بشیر) محمد اتنے برافروختہ ہوں گے کہ وہ میرا اور "تخلیق" سے اپنے دیرینہ تعلقات کو اس بار ختم کر لیں گے اور اسے بے جا، سے تعبیر کریں گے۔

میں اس خط کے حوالے سے جو جناب (بشیر) محمد نے لکھا۔ چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ریکارڈ پر آ جائیں۔

میرزا ادیب صاحب سے میرے ذاتی اور گہرے تعلقات ہم جیسی ایک برس سے ہیں۔ ہم ان کے نیاز مند تھے اور ہیں۔ وہ بھی ہمارے قدردان رہے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ "حسرت تعمیر" کی بیشتر کہانیاں اور تحریریں میری ادارت میں ایک پرچہ میں شائع ہوئیں۔ ان کا خیال کرتے ہوئے میں نے میرزا ادیب کو کچھ مشورے بھی دیئے۔

جولائی ۱۹۸۳ء

نصف دوم

چناری ۶

[illegible] براہ [illegible] ہیں [illegible]

[illegible] حضرات اس [illegible] ہیں۔

[illegible]

[illegible] جناب [illegible]

[illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible] کتاب [illegible] ہوں۔ [illegible]

[illegible]

نصف دم

جولائی ۱۹۸۳ء

(۱)

لطف اس خط میں جناب (بشیر) موصوف نے یہ اعزازی تخلیق کی ہے۔
"آپ نے ایڈیٹر کے نوٹ میں میرے بزرگ کی جو تذلیل کی ہے ۔۔۔"
مرزا ادیب ہمارے لیے بھی بزرگ تھے اب بھی ہیں۔ ایک بڑی کتاب لکھنے سے ان کی بزرگی پر ہمارے نزدیک کوئی حرف نہیں آتا۔ ہمارے لئے وہ اب بھی واجب الاحترام ہیں۔
جیسے مرزا ادیب کو اپنا بزرگ سمجھنے والوں کی اس برصغیر میں کمی نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ جناب (بشیر) صاحب مرزا ادیب کے داماد ہیں ۔ یہ رشتہ دیکھنے والوں سے چھپا ہوا نہیں۔ پھر ایسے حضرات سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔

(۲)

بعض باتوں کا اخفاء جانے کیوں رکھا جاتا ہے۔ شاید لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کسی بات یا رشتے کو چھپا کر بات میں زیادہ وزن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چلئے اس "صحت مند" روایت کی پیروی میں ہم بھی کئے جاتے ہیں۔

(۳)

آجکل عریانی فحاشی کے خلاف بڑا محاذ قائم کیا گیا ہے۔ حکومت کی یہ مہم پسند ہے۔ فلمی اداکاراؤں کی تصویریں نہیں چھپ سکتی ہیں۔ فلمیں چل سکتی ہیں۔ خیر — یہ موضوع دوسرا ہے۔ عریانی فحاشی کے علمبرداروں سے ہماری گذارش ہے کہ وہ لاہور کے میوزیم میں آویزاں ایک "عریاں اور فحش تصویر" کو ذرا وہاں سے ہٹانے کی کوشش کریں۔ اسے دیکھ کر اخلاق خراب ہوتا ہے۔ سیکڑوں لوگ روزانہ میوزیم جاتے ہیں۔ ان بے چاروں کا ایمان مفت میں خراب ہوتا ہے۔
اس تصویر کا نام ہے "زہرۃ اعظم" کہ جسے دیکھتے ہوئے نہیں جاتا۔ اور اس کے مصور — مفکر مشرق اور اسلام کے عظیم مصوروں میں سے ایک عبدالرحمن چغتائی ہیں۔

(۴)

"اوراق" کے تازہ شمارے میں جناب انور سدید نے پچھلے برس کے ادب کی ایک رپورٹ پیش کی ہے۔ اس رپورٹ میں انہوں نے بعض ادبی امور میں جناب حسن رضوی کی رائے پر بھی انحصار کیا ہے۔ بہرحال انہوں نے عنایت اللہ کے ایک ناول کا بھی ذکر کیا ہے۔ عنایت اللہ کا وہ ناول پچھلے برس شائع نہیں ہوا۔ بلکہ آج سے تقریباً دو برس پہلے کا ناول ہے بار بار چھپ رہا ہے۔ انور سدید نے اسے پچھلے سال کے ناولوں میں شمار کیا ہے

چالیس ادیبوں کی منتخب مزاحیہ اور طنزیہ تخلیقات پر مشتمل

کالم نگار نمبر

- یہ صرف ڈیڑھ سو سال کی تاریخ صحافت اور سماجی و سیاسی نشیب و فراز کی دلچسپ داستان پیش کرتا ہے۔
- بلکہ اُردو زبان کی زبردست قوت بیان اور ادیبوں کے جرأت اظہار کی بہترین عکاسی بھی کرتا ہے۔
- فوٹو آفسٹ کی طباعت [illegible] سے مزین۔

چند [illegible] خواجہ حسن نظامی۔ حاجی لق لق۔ عبدالمجید سالک۔ [illegible] قاضی عبدالغفار۔ شوکت تھانوی۔ کنہیا لال کپور۔ ابراہیم جلیس۔ [illegible] فکر تونسوی۔ ۱۵ سو صفحات۔ قیمت صرف ۱۰ روپے۔ چنگاری کے خریداروں کو خصوصی رعایت۔

چنگاری ۳ / ۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی نمبر ۳۲

چنگاری کے غزل نمبر سے پہلے بھی کئی رسائل کے غزل نمبر شائع ہوئے ہیں

- مگر چنگاری کا غزل نمبر ان تمام نمبروں سے قطعی منفرد ہوگا۔
- اس نمبر میں کلاسیکی شعرا کی غزلوں کا انتخاب نہ ہوگا۔
- مگر اہم ترین [illegible] شعرا کی غزلوں کے انتخاب پر مشتمل ہوگا جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک نمایاں ہوئے۔
- اس کے علاوہ بعض [illegible] غزل گو شعرا کی غزلوں کے انتخاب پر مشتمل ہوگا جو تقسیم ملک کے بعد نمایاں ہوئے۔
- تمام نئے [illegible] شعرا کے سوانحی خاکے [illegible] غزل گوئی پر مختصر مضامین ہوں گے۔
- غزل میں کلاسیکی [illegible] جدید ترین رجحانات اور تجربات پر مضامین ہوں گے۔
- غزل کی تاریخ [illegible] دوسری زبانوں [illegible] کی مقبولیت پر مضامین ہوں گے۔
- تمام غزل گو شعرا کی [illegible] تصاویر ہوں گی۔
- یہ [illegible] ہوگا۔
- [illegible] ضرورت [illegible] تکمیل کرے گا۔
- اگر آپ غزل لکھتے ہیں تو اپنی [illegible] غزلیں، تصویر اور [illegible] ارسال کیجیے۔

پندرہ روزہ چنگاری ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

کتابوں کی باتیں

[illegible]

[illegible]

اسلام کے چودہ سو سالہ تاریخی نظام میں دور جدید
کے پیچیدہ مسائل کا بہتر حل موجود ہے۔
دوسری طرف عصر جدید کے علمبردار حضرات اسلامی
نظام کو قدیم شکل میں ہی اختیار کرنے پر مصر ہیں اور
[illegible] کا رویہ اختیار کر چکے ہیں۔
چند سو سال قبل اسلام کی مقبولیت کی
وجہ [illegible] باصلاحیت
مخلص، انصاف پسند اور جفاکش افراد تھے جنہوں نے
عملی طور پر اسلامی نظام قائم کر کے
ظالم حکمرانوں کے مقابلے میں ایک بہتر نظام دے کر
اسلامی نظام کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔
بدقسمتی سے جب تک جبر کے ذریعے مسائل
کا حل [illegible] اور [illegible] حکومت بہتر
[illegible] اسلامی نظام ایک فلاحی
نظام کی شکل میں ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ایسی صورت میں اگر اسلامی نظام کو مقبول
[illegible]
[illegible]
باصلاحیت جفاکش اور انصاف پسند افراد
پیدا کریں گے اور اس کے لئے بہت اعلیٰ پیمانے
پر افراد کی تربیت کا انتظام کریں گے۔
احسان اللہ صاحب کا کتابچہ کار [illegible]
اسلامی نظام کو جدید دور میں اختیار کرنے کے
طریقے [illegible] ہیں ان کا ایک اجمالی
خاکہ پیش کیا ہے تاکہ اسلام کی [illegible]
سکے۔ (زاہد [illegible])

●●●

موصولات برائے تبصرہ

۱۔ کتاب: شفق زار
شاعر: [illegible]
سن: ۱۹۸۳ء

قیمت: ۱۵ روپے
صفحات: ۱۴۴
سائز: ۲۲×۱۸/۸ (مجلد)
سن اشاعت: اپریل ۱۹۸۱ء
ناشر: ادبی سنگم ۱۵۲/۱۵ فرخ آباد ٹاؤن شپ

۲۔ کتاب: ایک ٹکڑا ابر
افسانہ نگار: رام کرشن راحت
قیمت: ۱۵ روپے
صفحات: ۱۲۸
سائز: ۲۲×۱۸/۸
ناشر: ادبی سنگم۔ فرخ آباد

۳۔ کتاب: آگ کے پھول
افسانہ نگار: [illegible]
قیمت: ۱۵ روپے
صفحات: ۱۳۶
سائز: ۲۲×۱۸/۸
سن اشاعت: ۱۹۸۰ء
ناشر: بک امپوریم۔ سبزی باغ۔ پٹنہ ۴

۴۔ کتاب: دکنی مثنویوں میں منظر نگاری
مصنف: [illegible]
قیمت: ۵۰ روپے
صفحات: ۱۴۴
سائز: ۲۲×۱۸/۸
ناشر: [illegible] ۳۵۵ [illegible]
[illegible] بنگلور ۲۹

۵۔ کتاب: [illegible]
افسانہ نگار: [illegible]
قیمت: ۲۵ روپے
صفحات: ۲۳۰
سائز: ۳۰×۲۰/۱۶
ناشر: [illegible]
۲۰۸/۱۲۰ فرخ آباد ۱۲۱۰۰۲

●●●

۱۹۸۳ء کی مطبوعات

ادب کی پرکھ (تنقیدی مضامین)
ڈاکٹر [illegible]
۳۰ روپے
سائز ۲۲×۱۸/۸، صفحات ۱۴۴
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

●●●

رنگ آتش سوار (شاعری)
منصور سبزواری
۲۵ روپے
سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۱۲۸
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

●●●

گوپال متل۔ شخصیت اور فن (تنقید و تجزیہ)
کماری [illegible] (مرتب)
۵۰ روپے
سائز ۲۲×۱۸/۸ ڈیمائی
صفحات ۲۸۲
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

●●●

مکاتیب احسن
ڈاکٹر [illegible]، منیر احسن (مرتبین)
۲۵ روپے
سائز ۲۲×۱۸/۸ ڈیمائی
صفحات ۱۹۰
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

●●●

محمد اقبال۔ ایک ادبی سوانح حیات
پروفیسر جگن ناتھ آزاد
۲۵ روپے
سائز ۲۲×۱۸/۸ ڈیمائی
صفحات ۱۳۶
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

●●●

نصف دوم

خامہ بگوش

سخن در سخن

نالوں کا جھگڑا

تنقید اور مزاح میں انیس بیس کا فرق ہے

[illegible]

نصف دوم

[illegible]

دو کتابیں شائع کرنے کے بعد انہوں نے دھمکی دی ہے کہ وہ

عنقریب تیسری کتاب بھی شائع کر رہے ہیں

جولائی ۱۹۸۰ء

نصف دوم

افسانہ

شمیم نکہت

"کتابیں جو بند کردی گئیں"

— شیلفوں سے گرد جھاڑتے ہوئے ہی بہرام پہنچ
سے [illegible] — بدبادشاہ [illegible]
کرا ہاتھ [illegible] — اور کتابوں پر سر کا بوجھ [illegible]
تیا — پھر کوشش کے باوجود کوئی بھی کتاب مکمل
سکی — وہ پھر شانے [illegible]
مزید محل چلے — کتابیں — کتنی ہی کتابیں سامنے

سلطان صلاح الدین — قائم — مسجد
کیا سلطان — بابری — لکھنؤ — بنگال —
بہادر شاہ ظفر — سب ذہن میں گڈمڈ ہو چکا تھا
— اور ذہن کی [illegible] کتاب کی تلاش
میں — آنکھوں اور [illegible] سے ایک جگہ
ٹھہرنے نہیں دیتا — انگلیاں [illegible]
[illegible]



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

افسانہ

اوم کرشن راحت

کھلی قبر



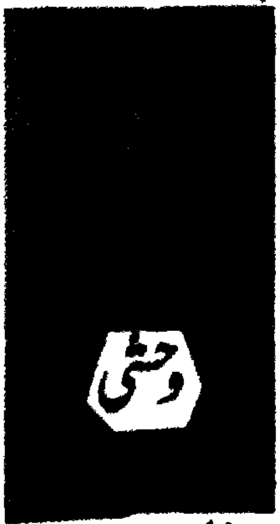
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نصف دوم



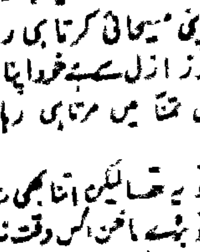
اِس وحشی کی حالت پر آئیے ترس کھا کر

پتھر کے زمانے کا یہ بھٹکا ہوا راہی
خود اپنی مسیحائی کرتا ہی رہا برسوں
یہ روزِ ازل سے ہے خود اپنا ہی متلاشی
جینے کی تمنا میں مرتا ہی رہا برسوں

وحشی تو یہ تھا لیکن اتنا بھی نہ تھا وحشی
اتنے تو بڑے ناخن اس وقت نہ تھے اس کے
اس دور میں بھی سورج تاریک تو ہوتا تھا
دن رات مگر اتنے بدبخت نہ تھے اس کے

اس دور میں یہ وحشی کب اتنا گھبراتا تھا
کب نیند تھا پوچھو کب ... آتے
اپنے ہی لہو سے کب آغشتہ تھے ... کے
پھر ... زمانے میں کب تیز تھے دانت اپنے

اقبال انصاری



[illegible]



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد اللہ کے رسول ہیں

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

بے شک دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے

سندِ قبولیتِ اسلام

مورخہ .... ماہ .... ھ مطابق .... ماہ .... ء بروز ....

[illegible] حلیہ نشان	اسلامی نام	[illegible] یا پاسپورٹ کی تفصیلات	شہریت
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
کیفیت		سکونت	
—		[illegible]	

[illegible] صاحب [illegible] نے اپنی مرضی سے بلا جبر و اکراہ جامع مسجد دہلی میں اسلام قبول کیا اور یہ [illegible]

[illegible] ۱۱۷۵ بطور سند [illegible] جامع مسجد دہلی [illegible] جاری کی گئی۔

دستخط و مہر شاہی امام جامع مسجد دہلی

[illegible]

افسانہ

مشرف عالم ذوقی

معاف کرنا امتیاز



[illegible]

—— جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔
گرودت: اگر ہم چاہتے تو ——؟

اگر ہم چاہتے تو جا سکتے تھے۔ جیسے صاحب چلے گئے۔ جیسے جشنہ بابو چلے گئے۔ جیسے میرا بیٹا چلا گیا ——

ہاں رگھو ویر تم بھی جا سکتے تھے۔ جیسے صاحب چلے گئے۔ جشنہ بابو چلے گئے اور تمہارا بیٹا چلا گیا —— تو دوست وہاں تم اپنے وزیر ہوتے... اور وہاں آ کر پیدا ہونے والی بیٹیوں کی قسمت پر بھی ہنستے جاتے اور روز روز کی ذلتوں سے بچ کے زمین کو یہ کہہ کر خالی کر دیتا — کہ تم بے جان نہیں ہو —— اور —— اور تم چاہتے ہو کہ ——ہ——ا——ہ——ے——

تو دوست رگھو ویر اس عالیشان بلڈنگ کے تیسرے مالے کے دروازے کے بیچ میں کرسی پر تم بیٹھے ہو اس کی حیثیت چپراسی —— اور اپنی خواہشوں کو اپنے ہی دل میں گھونٹ کر جسم کا واسطہ دو اور اپنے گھر جا کر دو پیسے آنے کی روٹی اور تنخواہ منظر ہے اور چپ کا شور بیچارا آنکھیں کھول دیکھتے کو شور روز کے جھگڑے سے نجات نہیں دلا سکتا ہے

تو رگھو ویر آگے جا کر بیٹھ جانے والی قطار پر ٹھہر گیا ہے کہ سڑک پر ٹریفک کا ہجوم ہے —— بس ہے۔ موٹریں ہیں —— گاڑیوں کی لمبی قطار ہے... اسٹیشن ویگن ہے۔ ایمبولنس ہے —— جیپ ہے۔ بگھی ہے۔ جیسے ہے اور آدمی ہیں۔۔ آدمیوں کے بے جان دھوپ میں جلتے پھرتے ہیں۔ انجنیں ہیں۔۔ سب چلے جا رہے ہیں اور اپنی منزل میں بہے جا رہے ہیں

تو ٹھہر جاؤ رگھو ویر —— یہاں بہت بھیڑ ہے —— ابھی ٹریفک ایک گھنٹے سے پہلے صاف ہونے والا نہیں ہے۔

دیکھتے نہیں دوسری جانب سرمایہ داروں کے خلاف زور دار نعرے لگاتا ہوا جلوس چلا آ رہا ہے ——

ابھی ٹھہرو —— ارے ہاں۔ تم نے تو کہا تھا کہ سارا شہر دلی چلا گیا۔ ایک ہم ہی نہیں گئے۔ مگر دیکھو تو —— یہاں بہت بھیڑ ہے۔ تو رگھو ویر —— زر دوروں کی چھیٹ ایک اکیلے ہم ہی نہیں ہیں۔

آؤ ایک طرف کو ہٹ جاؤ —— ورنہ لوگ تمہارے پیروں کا خیال نہیں کریں گے اور بڑے آرام سے کچلتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے ——

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے رگھو ویر —— اور یہاں سب کو اپنی ہوا سے آگے بڑھنا ہے۔ صاحب یا تمہارا بیٹا نہیں ہے جو اپنی ذات دیہاں چھوڑ کر دلی چلا جائے۔ جیسے جیتے لے اپنی طرح سمجھا کر رکھا ہے —— جشنہ بابو نے تم سے اور صاحب نے تمہارا ہے —— کروڑوں آ کر ہم سے پوچھیں گے صاحب کہاں گئے —— تو دوست بھر کوئی صاحب کی طرح اپنے دلوں سے سمجھوتا نہیں کرتا۔ ورنہ۔۔۔

ہاں۔ ہاں۔ تم ان مرسیڈیز والے صاحب سے جو ٹریفک کے صاف ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ جا کر پوچھ سکتے ہو کہ جناب آپ کے پاس تو سب کچھ ہے۔ پھر آپ کیوں نہیں گئے۔۔؟

ہاں —— ہاں —— کیا جواب دیں گے —— وہی حکومت —— مصروفیت ——

تو دوست رگھو ویر —— آج کا آزاد ہندوستان اور حکومت کے بیچ دوڑ میں کسی پیر گر مشین بن گیا ہے —— اور مشین سانس نہیں لیا کرتیں۔ وہ تو چلتی رہتی ہیں۔ چلتی رہتی ہیں جب تک ان کے کسی پرزے کو زنگ نہیں لگتا۔ جب تک کوئی پرزہ خراب نہیں ہوتا —— تو پرسیڈیز والا صاحب اور ہمارا صاحب اسی مشین کے دو پرزے تھے۔۔ ایک تو پرزے کے خراب ہونے کا احساس ہے۔ دوسرا اب تک احساس سے بے نیاز ہے اور ایک تیسرا جو چل رہا ہے —— یعنی ہم صرف پرزے ہیں —— ٹوٹنے والے اور بیکار ہونے والے۔۔۔۔

تو رگھو ویر۔ ہم صرف —— اور صرف مشین میں استعمال ہونے والے پرزے ہیں۔

تو رگھو ویر ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے اور اس کا نحیف جسم ٹریفک کی طرح ہلتا تھرکتے تھرکتے اور رکتے رکتے جاتا ہے ——

میں رگھو ویر کے بیٹے ہوئے چہرے کا تعاقب کرتا ہوں اور ساتھ کی سٹ برابر نکل جاتا ہوں۔

تیز بہت تیز میں چلتا ہوں۔۔ قافلہ ہی ہے اور ایک گہرا سکوت —— میں سوچتا ہوں کہ اب سوچنے کا خیال ترک کر دوں گا۔ جلوس قریب آ گیا ہے —— مشینوں کا شور کچھ پیروں کا بوجھ دیکھو —— جیسے ایک پل میں یہ سارے کے سارے مزدور سرمایہ داری کے محلے پھونک کر جلا ڈالیں گے۔۔۔ ان کا شور ہے رگھو ویر۔۔؟

اصلیت ہے ——

اور ایک شکایت عزم ہے ——

اور بکھرا ہوا جلوس کا ہر فرد

ہو گا ——

رگھو ویرا تمہاری مٹھیاں بھی تنی رہی ہیں۔۔۔

شاید اپنی مٹھیوں کے ہاتھ چلانے کے دوران تم نے مزدوروں سے گھنٹہ بھر لیا اور کہہ لے... مگر اس کی مزدوری سے جو لاش کی گونج ساری دنیا میں پھیل گئی۔۔ اسے خود بھی کر لیا۔۔

دوست ہارو رگھو ویر۔ ذرا جاگو۔ اب تک تم نے اپنے مزدوروں اور ساتھیوں کے نعرے میں اپنے سکتے سسکیوں کو حل کیا۔۔۔ کتنی فرحت ہو

[illegible]

اصغر علی انجینئر — مارکسزم اور مذہب

[illegible]

COMPATIBILITY

[illegible]

GENERAL CATEGORY

[illegible]

E P IDS IN BIOLOGY [illegible]

C HEOLOGY [illegible]

[illegible]

DIALECTICAL [illegible] MATERIALISM [illegible]

HISTORY AND CLASS CONSCIOUSNESS

[illegible]

GENERAL CATEGORY

[illegible]

"THIS 'SOCIALISM' WAS IN FACT, AS FAR AS IT WAS POSSIBLE AT THE TIME, [illegible] AND EVEN BECAME [illegible] IN CHRISTIANITY"

[illegible]

آرٹ کی صورت پیدا ہو جاتی [illegible]
[illegible]
[illegible] تاہم وہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کیا جاتا ہے۔

[illegible] مذہب [illegible]
[illegible]
[illegible] سوال اسلام
SOCIAL AND PHYSICAL [illegible]
[illegible]
[illegible] مادی کائنات [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کائنات [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کائنات سے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] اس کا مذہب بن سکتے ہیں
قرآن مجید میں اس بات کا [illegible]
[illegible] شامل کیا گیا ہے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔

[illegible] بات صاف ہو جاتی
ہے کہ ہر قوم [illegible]
[illegible]
[illegible] ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ایک
[illegible]
[illegible] PARALLEL [illegible]
[illegible] PARALLEL [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔
[illegible]
شکل ANTHROPOLOGICAL [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کائنات [illegible]

کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بہرحال ایسی صورت
پیدا ہونے کا امکان [illegible] کا راز جاننے کی
کوشش میں وہ کائنات یا اس کی پراسرار
تخلیقی قوت سے اس کا شعور روحانی ہو اور
مادیت کے سوال کرتا ہے اور ایک روحانی اور
معنوی رشتہ جوڑ لیا جاتا ہے۔ یہ رشتہ دو
[illegible] عبادت کے ذریعہ جوڑا
جاتا ہے [illegible] شکل میں۔

اس معنی میں مذہب اور کمیونزم کا کوئی ٹکراؤ
نہیں ہے مارکس کی تصنیفات میں بھی کوئی ایسی
بات نظر نہیں آتی [illegible] معنی میں مذہب پر
حملہ سمجھا جا سکے۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] قوت سے اپنا
[illegible] کے لئے آزاد
ہے اور اس معنی میں وہ کمیونزم کے سیاسی یا سماجی
نظریات سے کسی بھی طرح [illegible]
قدروں POSITIVE VALUES کا علمبردار
ہے [illegible] کائنات کی تخلیق [illegible]
[illegible] THEISM کی ایک
شکل ہے [illegible]
[illegible] ATHEISM
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] اسلامی عقائد کے خلاف نہیں سمجھا۔

کلامِ ساحر میں محبت

ڈاکٹر پریتم سینی

[illegible]

ہے۔ وہ محبوب کی کمی ہوتی ہے مگر نصیبوں
کس کا وصل نصیب ہوتا ہے۔ اس سے اس کی
بے لوث محبت کے جذبے [illegible] جاتی
اور عشق سے [illegible] ٹوٹ جاتے ہیں
عورت کی اسی مجبوری کو [illegible]
[illegible] ہے ساحر نے [illegible] کیا ہے
[illegible]
[illegible] ہے

[illegible]
[illegible] کا [illegible]
[illegible] سے
[illegible]

[illegible]

ایسی محبوب عورتوں کے بارے میں لکھی ہوئی
ساحر کی مشہور نظم [illegible] محبت کو
[illegible] ہوئی دکھاتی
ہے۔

غالب نے بہت [illegible] عاشق کو [illegible]
[illegible] ساحر [illegible]
[illegible] ہے [illegible]
ایک دوسرے کے [illegible]
بات کو [illegible] رہتا ہے۔ وہ
محبت اور ہوس کے فرق کو [illegible] ہوئے
بتاتا ہے

[illegible] نیک [illegible] عالم
جیسا [illegible] رنگ [illegible] سال
[illegible]

وفا فریب ہے [illegible]
کسی کو راس [illegible]

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جنون رسوا
چند بے کار سے بیہودہ خیالوں کا ہجوم
ایک آزاد کو پابند بنانے کی ہوس
ایک بیگانے کو اپنانے کی سعی موہوم
(سوچتا ہوں - تلخیاں)

کہ ساحر محبت کے ایسے [illegible]
کرتے ہوئے [illegible] کی طرح [illegible]
THEORY کے خلاف ہیں۔
وہ عاشق و معشوق بنتے رہنے [illegible]
مذمت کرتا ہے اور وہ وفاداری [illegible]
[illegible] والی بات کی ہم نوائی کرتا
ہے۔ [illegible] تو وہ
[illegible] کرتا ہے
کو [illegible]
سے [illegible]
جانے [illegible] نئے
[illegible] کو [illegible]
کرتا۔ اسی لئے [illegible]

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے
(فرار - تلخیاں)

گزر رہی ہے [illegible] سے
[illegible] کسی ایک کی ہو جاتی ہے تو [illegible] ہے

اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبت نبھا تو دی
(ایک منظر - تلخیاں)

یہ بات تفصیل سے لکھنے کی چنداں ضرورت
نہیں کہ ساحر [illegible]
[illegible]
[illegible]
سا [illegible] ساحر [illegible] محبت کی
[illegible] اور اس سے
[illegible] سے [illegible] کے
[illegible]

یعنی ایک نظم میں اس شاعر نے کہا ہے

جن میں سے اک رنگین قبا
آتش نفس آتش نوا
کرکے محبت آشنا
رنگ عقیدت آشنا
[illegible] دل [illegible] کو
[illegible] آلام کو
[illegible] جہان دے گئی
ساری خدائی دے گئی
([illegible])

[illegible] وفا کرنے والی عورت [illegible]
[illegible] کسی ایک عورت کے جسم کو ہمیشہ
کے لئے اپنے قبضے میں رکھنے والی بات کو
[illegible] ہوس۔ کتنا ایک نیا اور ترقی پسند
نظریہ ہے [illegible] صداقت اور خلوص
پر مبنی ہے۔ اس کی بنیاد [illegible]
ہے کیونکہ ساحر [illegible]
تھا۔ اس محبت کی [illegible]
[illegible] انسانی [illegible] ہے۔
محبت کرنے والے [illegible] ایک
دوسرے کو [illegible] بہتری اور
بہبودی کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک
دوسرے کے لئے جذبہ خلوص رکھتے ہیں۔
[illegible]
ہے

اک پرسش کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تم وہی خلوص سراپا ہو آج بھی؟

لیکن جب دو پیار کرنے والے ایک بار
حالات کی مجبوری یا کسی اور سبب سے
الگ ہو جاتے ہیں تو پھر وہ مل نہیں
سکتے۔ اس سے محبت ایک مذاق بن جاتی
ہے۔ ساحر [illegible] وفاداری کو
[illegible] نہیں سمجھتا۔

روایتی اردو شاعری میں محبوب
کے لئے دنیا [illegible] ٹھکرا دیا
جاتا ہے [illegible]

طنزیہ

راہِ راست

محمد اسد اللہ



[illegible]

وہاب تسنیم

دیوانِ غالب بخطِ غالب

دیکھنے والے بیشتر ہیں۔ ابھی کچھ قبل ان سے "دیوانِ غالب بخطِ غالب" سے متعلق چند دلچسپ باتیں نظر ہوئی تھیں۔ پچھلی سے قارئین کے لیے یہ معلومات دلچسپ بھی ہوں گی اور غور طلب بھی۔

"دیوانِ غالب بخطِ غالب" سے متعلق جب متضاد دلائل سامنے آنے لگیں تو اس صورتِ حال کی وضاحت کے سلسلے میں چند دلچسپ حقیقتیں سامنے آئیں۔

اس سلسلے میں امروہہ کے توفیق احمد صاحب سے ملاقات کی گئی تو انھوں نے کہا کہ یہ نسخہ انھوں نے بھوپال کے شوکت الحسن صاحب سے گیارہ سو روپیہ میں خریدا تھا۔ شوکت الحسن صاحب سے ملاقات کے لیے بھوپال کا سفر کیا گیا۔ ایک سفر میں ان سے ملاقات ہوئی دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ امروہہ کے توفیق احمد صاحب ایک تاریخ کی کتاب کے سلسلے میں یہاں آئے تھے۔ اس وقت میں نے یہ مخطوطہ انھیں دکھایا اور تصدیق چاہی۔ تصدیق اور تحقیق کے بہانے وہ یہ انتخاب نسخہ اپنے ساتھ لے گئے۔ تاریخ کی کتاب گیارہ سو روپیہ میں انھوں نے خریدی تھی۔ وہ مخطوطہ وہ اس تاریخ کی کتاب میں رکھ کر لے گئے۔

بھوپال کے شوکت الحسن صاحب کے اس بیان کی تصدیق امروہہ کے توفیق احمد صاحب سے چاہی تو ان سے یہی دریافت کیا گیا کہ دیوانِ غالب کے اس تاریخی نسخہ کا اصل مالک کون ہے؟

انھوں نے کہا کہ میں اس کا اصل مالک تھا۔ بھوپال کے شوکت الحسن سے میرا بیعت ہو چکا ہے!

یہاں سے رامپور کے اکبر علی خان عرشی عرشی زادہ صاحب بھی اس بیاض کی داستان میں شامل ہو گئے۔ عرشی زادہ صاحب بیش بہا کام سے غالب کی تحریروں کے تمام عکس جمع کر رہے ہیں۔ اب تک ایک بڑا ذخیرہ جمع کر چکے ہیں۔ اسٹیٹ آرکائیوز الہ آباد کے جلال عارفی صاحب امروہہ سے بیاض کا کے چند صفحوں کے زیروکس عرشی زادہ کے پاس لے گئے اور انھیں دکھایا۔

حقیقتِ حال کی دریافت کے لیے عرشی زادہ سے پوچھا گیا کہ آپ تو غالب کی تحریر پہچانتے جانتے ہیں۔ اس بیاض کے غالب کے ہونے پر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ کیا یہ نسخہ واقعی غالب کے ہاتھ میں تھا؟

وہ بولے — جلال عارفی جو زیروکس لے گئے وہ آخری صفحہ کے تھے۔ قانی ترقیمہ تھا "اسد اللہ خاں" اصل دیکھے بغیر غالب کے ہاتھ میں تھا۔

پھر ان سے دریافت کیا گیا کہ بیاض صاحب کا اصل نسخہ آپ کو دکھایا گیا؟

انھوں نے کہا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ توفیق صاحب نے فون کیا کہ کہ تم ایک عرصہ سے غالب پر کام کر رہے ہو اس لیے امروہہ تک جاؤ اور دیکھ کر آؤ۔ پھر کیسے گھبرا کر اس کے پاس گیا۔ میں وہاں سے بھی ان سے پہنچا گیا۔ توفیق احمد صاحب سے وہ نسخہ دیکھا۔ پھر ان کو اپنے ساتھ رامپور لے آئے۔ طے پایا کہ اسے شائع کر دیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔

توفیق احمد صاحب اور عرشی زادہ نے یہ طے ہو کر کر بیاضِ غالب شائع کیا جائے پانچ ماہ بعد یہ بیاض نسخۂ عرشی زادہ کے تعاون سے شائع ہو گیا۔ اس کے صرف چند سو نسخے چھاپے گئے۔ اور فی نسخہ تین سو قیمت مقرر کی گئی۔

یہاں سے کچھ اور دلچسپ واقعات شروع ہوتے ہیں۔ تقریباً انہی دنوں پاکستان کے مشہور ادبی پرچے "نقوش" کا غالب نمبر چھپا جس میں اسی بیاضِ غالب دیوان کے سارے کا سارا عکس موجود تھا۔ اس کی قیمت صرف تیس روپیہ تھی۔ اور اسی زمانے میں مختلف سمتوں سے یہ آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں کہ بیاضِ غالب کی نقل جعلی ہے۔

امروہہ کے توفیق احمد صاحب نے جو اسے دریافت سے ہمارا حق حاصل کرنے کی توقع رکھتے تھے، اب اپنا حصہ طلب کرنا شروع کیا اور آخری غضب یہ ہوا کہ اس دیوانِ غالب غالب کا نسخہ لاپتہ ہو گیا۔ توفیق احمد صاحب سے یہ پوچھا گیا کہ عرشی زادہ صاحب سے آپ کا تنازعہ ہے۔

انھوں نے کہا کہ تنازعہ یہ ہے کہ جب انھوں نے یہ کتاب چھاپی تو مجھے معاوضہ دیا اور نہ وہ دیوان اب تک لوٹایا جو ان کے ناجائز قبضہ سے ان کے پاس موجود ہے۔"

عرشی زادہ صاحب سے دریافت کیا گیا کہ دیوانِ غالب کا اصل مخطوطہ کس کے قبضہ میں ہے؟ تو انھوں نے کہا

"میں تو یہ نہیں جانتا کہ کس کے قبضہ میں ہے۔ میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں نے اس کے مالک توفیق احمد صاحب کو واپس کر دیا تھا۔ اس کی رسید آج بھی میرے پاس موجود ہے۔"

چونکہ اس دوران بیاضِ غالب کا عکس پاکستان میں بھی شائع ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں ایک قیاس آرائی یہ کی گئی کہ بھارت سے کسی نے پوری بیاض کا نسخہ وہاں بھیج دیا۔ کراچی کے استاد اور غالبیات کے ماہر لطیف الزماں صاحب کو پہنچا دیا گیا۔ لطیف الزماں صاحب نے اسے نقوش کے

[illegible]
اس کی حقیقت [illegible]
میں اور [illegible] محبت کی کمند
[illegible]

[illegible]

[illegible] کی حقیقت [illegible]
[illegible]
انسان زندگی کے [illegible] مسائل کے
[illegible]
[illegible] نہیں رہتا۔

[illegible]
ساغر [illegible] کیا ہے

[illegible]
زمین و آسمان کے [illegible]
[illegible]
[illegible] زندگی میں [illegible]
پیتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

بقیہ [illegible] محبت

[illegible]

[illegible]

مشین

جون ناٹنگ کارا وگیرنانگ

(آواز کے شکل میں چار دل طرف بیٹھے ہوئے شاطین۔ درمیان میں لوہا کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک ایک کرکے اداکار اسٹیج پر پیچھے سے آتے ہیں اور الگ الگ مشینی انداز میں ہاتھ پیر ہلا کر مشین کے پرزے کی طرح کام کرتے ہیں۔ مشین کو دیر تال میں چلتی ہے اور لگتی ہے۔)

راوی ۱۔ یہ ہے مشین۔ لوہے کی مشین کارخانے کی مشین۔ مشین ہے ایک مالک اور بہت سے پرزے۔ پرزے مزدور۔ دن بھر چلتی ہے اور رات کو بھی دیتی ہے بہت کچھ ایک کے بدلے ایک۔ طرح طرح سے طرح طرح کی آواز نکلتی ہے۔ بہت خوب؟ دیکھنے میں بھلی کی ہے، مشینوں میں سے یہ دیکھئے وہ لوگ ہے جس کی کام یہ ہو کی اصل میں کیا.... یہ کیا فرمایا آپ نے کس نے بتایا ہے۔ جی آپ نے آپ نے ابھی آپ نے انہی سے گڑنے والے ہے بیٹھے آپ کے ہی جیسے انسان تھے جو آپ کا اوہ جوڑ کر بہت ہی کچھ بہت ہی جان سے بنائی گئی اور جیسے ہی مشین سے بنائی گئی۔ صرف اس کی محنت ہے اس کی مرضی۔ کھٹ، کٹ کھٹ، کھٹ۔ کٹ کھٹ، کھٹ۔ (مشین پھر تال میں چلنے لگتی ہے اور تال میں رک جاتی ہے)

راوی ۱۔ دیکھیں آپ نے اس کی لے اور تال۔ تال اور لے۔ اگر لے اور تال نہ ہو تو زندگی ختم۔ لیکن مشین کی تال بات کچھ کچھ ہے۔ لیکن سمجھ سے میں ذرا دور ہے۔ ہاں! اگر ایک پرزہ نے پوچھے تو وہ سوا سے سوا سماجہ چلتا ہے تیسرا بھی۔ اس نے زور کر کے ہی ساتھ ساتھ سمجھتے ہی ساتھ ساتھ تھک اور مزدور، تھکتے اور مجبور۔

اور بتا دیں کہ ساتھ تھی، تھک کر اور بیچ میں ساتھ ساتھ، ساتھ، ساتھ، ساتھ۔ ساتھ۔ (راوی کی منہ سے آواز کے ساتھ ایک اداکار مشین سے الگ ہو جاتا ہے)

اداکار ۱۔ راوی کی جانب غضب ناک ہو کر دیکھتا ہے۔ راوی برو گھر جاتا ہے)

ساتھ۔ ساتھ، ساتھ، ساتھ، ساتھ، ساتھ۔ کیسا ہے یہ ساتھ؟ کون دیتا ہے یہ ساتھ؟ کون مالک ہے یہ ساتھ؟ کیسے ملتا ہے یہ ساتھ؟ یہ آدمی ہے صرف لات۔ کس کی لات؟ ابھی سب کی، مکان، ملک کی لات، مل مالک کی لات، راشن والے کی لات، دودھ والے کی لات، پولیس والے کی لات، آدمی کی کمر ہی خراب ہو گئی۔ بتائیں مشکل کیا میں ہوں کون بلا؟ میں ہوں مزدور۔ مشین کا ایک پرزہ۔ کام کی چیز مگر نازک چیز۔ ضروری چیز۔ لیکن بے کار چیز۔ کام کرتا ہوں مشین کا، ٹھیکہ ملک کا اور اس کے بعد کچھ نہیں۔ آگے کم مالک کے سے کچھ بھی نہیں۔ تھکا ہارا مشکل۔ نا کرو مشکل جیسی باتوں اگر چھٹی نہیں ساتھ چلی۔ ساتھ، ساتھ، ساتھ ساتھ۔

اداکار ۲۔ ساتھ ساتھ ساتھ ساتھ کے پرچھے ڈرتے ہوئے بہلاتے ہیں ساتھ تھے۔ بات ساتھ یہ ساتھ۔ اسی ساتھ پر بیٹھ کر سنیں۔ حال کی پرچھے تو بیک آؤٹ کر ساتھ ہے یہ ساتھ۔ مرتے میری کمر تک ساتھ ہوتا ہی ساتھ ہے یہ ساتھ۔ مالک اور مزدور اور مشین کا ساتھ۔ نہیں سمجھے کیا آپ؟ ابھی کیسے ہو ہی آپ، سمجھ کر دیکھ لیجیے آپ۔ اسے میں نے نہیں بتایا تو آپ ہی بتا دیجئے کون ہوں میں، اس کو کچھ پوچھیں۔ آپ کے ساتھ رہ کر دیکھا بھی ورنہ غریب ۔ اسے اپنے مل کے غریبانہ۔ میں مالک ہوں اور بڑی محنت زندگی ہے میری۔ پوچھی کرتا ہوں مزدوری کرتا ہوں۔ پولیس کو چاہتا ہوں کچھ آگے رکھا ہوں، مزدوروں کو دھمکاتا ہوں، مشین کو چلاتا ہوں۔

تب جاکر کہیں سے ساتھ سکھاتا ہا۔ لیکن آپ خفا نہ ہوں میرے مہربان میرے قدردان آپ پر قربان میری جان آپ کے لیے ایک دیکھ اسپتال اور قبرستان جڑاؤں گا۔ میں دعا کر دوں گا آپ کو زندگی کے انقلاب رونے کی بات رہے سکے۔ اگلے چالیس سال سے دیکھا، پھر یہ کیسے میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ سے بیٹا اور بھائی سے بھی بڑا ہوں اور کیا کہیں، یہ کرکی نگاہ ہے جتنا بنا سکتا اور نہ یہ دنیا بچانے ہے اور بیگاروں سے ہے یہ ساتھ۔ بس یہ تو ہے یہ ساتھ ساتھ ساتھ ساتھ۔

اداکار ۱۔ ٹھیک.... مشین سے باہر نکل کر بھی ہنس کے ساتھ ساتھ ساتھ ساتھ ساتھ۔ بس یہ کیسا برداشت۔ [illegible] میں سب ساتھ بولیں تو کیا ہوا۔ [illegible] ساتھ ہم ساتھ ہے اور کی کام سے ساتھ اور رنگ میں۔ [illegible] [illegible] [illegible] ساتھ ساتھ۔

نعت

کوہِ فاراں کی تجلی کا حوالہ بولا
آپ آئے تو شہادت میں اُجالا بولا

لا بح کو ہی کی تائید میں کنکر بولے
بتکدے گونجے رہی کا شوالا بولا

بات کرنے سے تھا معذور جو خستہ بدن
حکمِ سرور پہ مگر سے کے سنبھلا بولا

امن تھا جس نے دیا کفر کو پیغام بڑا
ایک پتھر تو گیا سارا ابجد بولا

سیلِ انوار سے ظلمت کا شکنجہ ٹوٹا
ہر وہ لب جس پہ تشدد کا تھا تالا بولا

جرأتِ حالات سے مجبورِ خموشی جو کئے
دل ہر اک شے عقیدت کا جو لالا بولا

پا کے فرمانِ محمد کا اشارہ راسخ
ایک گنبد کی طرح چاند کا ہالہ بولا

راسخ عرفانی

جولائی ۱۹۸۴ء

نعت

نور شکل میں ہے یا خاکِ بطحا آپ کا
آفتابِ زندگی ہے روئے زیبا آپ کا

نور افشاں عرش سے تا فرش ہے کل کائنات
ضو فگن ہے چار سُو حسنِ سراپا آپ کا

شرر فشانی آفتابِ حشر کی کچھ بھی سہی
امتِ عاصی پہ ظلِ لطف دیکھا آپ کا

پھر گیا آنکھوں میں اک اک منظرِ حسن و جمال
دیدۂ پُر شوق نے دیکھا جو جلوہ آپ کا

پا گیا سجدہ گہِ اربابِ عرفاں کا شرف
ذرّہ ذرّہ چوم کر نقشِ کفِ پا آپ کا

ہر اندھیرے کو ملا نورِ صداقت کا لباس
جب شبِ تیرہ نے دیکھا روئے زیبا آپ کا

رحمتِ باری نے آ کر دی نویدِ مغفرت
عاصیوں نے حشر میں دیکھا جو چہرا آپ کا

لطفِ یزداں سے ہوئی ختمِ نبوت آپ پر
خاصۂ امت یہ شرف یہ مرتبہ تھا آپ کا

کہکشاں در کہکشاں ہے آپ کا عکسِ جبیں
پرتوِ مہتاب ہے رخشندہ سایا آپ کا

دور ہے کرب و الم کی دھوپ سے وہ آدمی
دامنِ لطف و کرم جس نے ہے تھاما آپ کا

جب سے آیا ہے درِ محبوبِ یزداں پر بسنت
ہے نگاہِ لطفِ یزدانی میں بندہ آپ کا

بی ایل۔ بسنت گڑھ مہاراجوی
نصف دوم


غزلیں
کیسے گزرے گا یہ سفر خاموش
رات خاموش ہے سحر خاموش
کیسی بیمار غم کی حالت ہے
زندگی کو کہاں تلاش کریں
زخم پھولوں کے کون اب دیکھے



کہیں مطلب کا میرا رہ چاند ہو
رہزن راہبر مرا شیوہ نہ ہو
دشمنوں سے اس کے بڑھ کیا ہو پیار
منہ چھپا کر ہم کبھی بیٹھا نہ ہو
مات گر ہوگا وہی ہم نے کبھی
آنکھوں کا الٹ دیکھا نہ ہو
جی میں کیا ہے آرزو کیا کیوں
جس کے لئے آپ کا شیوہ نہ ہو
پھر تو دو طرفہ کا ذرا شوق سے
کام جب اک ٹھیک سے چلتا نہ ہو
وہ خدا ہے کہ کر لے فیصلہ
آدمی ہم نے بھی دیکھا نہ ہو

شبیر احمد قرار

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

ایک خصوصی رعایت

• یکم اگست ۱۹۸۳ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۸۳ء تک چنگاری کی سالانہ خریداری قبول کرنے والوں کو پانچ روپے کی خصوصی رعایت دی جائے گی۔ اس مدت کے دوران ۴۵ روپے کی جگہ زر سالانہ صرف ۴۰ روپے لئے جائیں گے۔

• اس طرح صرف ۴۰ روپے میں گھر بیٹھے لگ بھگ ایک ہزار صفحات (۲۴ شمارے) آپ کو مل جائیں گے۔

• آپ جانتے ہیں چنگاری آفسیٹ پر چھپتا ہے اس لئے اس میں لیتھو کے صفحات سے تقریباً دوگنا مواد پیش کیا جاتا ہے۔

• زر سالانہ کی ادائیگی بذریعہ منی آرڈر، چیک یا ڈرافٹ ہو سکتی ہے۔ چیک، ڈرافٹ چنگاری دہلی کے نام ہونا چاہئے۔ انگریزی میں CHINGARI .... لکھ کر کراسڈ کر دیں تو بہتر ہے۔

• اس مدت کے دوران خریدار بننے والوں کو وہ تمام سہولتیں اور رعائتیں حاصل ہوں گی جو دوسرے خریداروں کو حاصل ہیں۔

• سالانہ خریداروں کو پابندی سے ہر مہینے کی ۲ اور ۱۴ تاریخ کو پرچہ پوسٹ کیا جاتا ہے اگر دس اور بیس تاریخ تک رسالہ نہ ملے تو مطلع کیجئے فوراً دوبارہ رسالہ بھیج دیا جائے گا۔

• چنگاری نہ صرف آپ کے ادبی اور جمالیاتی حس کی تسکین کرتا ہے بلکہ آپ کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی کے تحفظ اور ارتقا میں بھی معاونت کرتا ہے۔ یہ آپ کے جذبۂ ذوق اور ضرورت کی تکمیل کا باعث ہے۔

پندرہ روزہ چنگاری ۱۴۱۰/۳ - رام نگر شاہدرہ - دہلی ۳۲

چاند شفق کی لالی کا رنگ ہے
آنکھ میں ساون کا منظر ہے
پاگل سوچ کے بادل شرما ہے
موسم گل میں پیدا [illegible] ہے
[illegible] کی تپتی ہوا ہے

ریت در ریت جب سائے بکھر گئے
اپنے اطراف بھر دل کو بھیگی
اور یہ تنہائی کھو گئی ہے
آنسو آئے ہیں کہ بات ہے

نقش چھوٹا ہے جسے اترتا ہے
آپ تو اپنے مقصد سے [illegible]
کوئی نہیں ہے کوئی مرتا ہے
[illegible] اے انقلاب
وقت کی آگ سے اترتا ہے

عاشی انصار

نہ قسمت اگر دو دار کے قابل بکھتے ہیں
ہم ان کے ہر ستم کو امتحان دل سمجھتے ہیں
کبھی تیرا تصور تک ہو سے جان بنتا ہے
کبھی ہر سانس کی لے میں تجھے شامل سمجھتے ہیں
کبھی یہ چاہتے ہو کہ زندگی سے پیار ہو جائے
یقین اپنے نکلے وہ ہر روز دل کہتے ہیں
کبھی تو جستجو منزل کو کوئی حد بہت لگتی ہے
کبھی ہر شوق بے حد کے لوٹی منزل کہتے ہیں
[illegible]
[illegible]
غریب آنکھ میں دل [illegible] اکثر
[illegible] ہیں
[illegible]
تسمہ بوڑھا [illegible] دوار دل کہتے ہیں

انجم اقبال

آئینہ ایک نہ اک روز سنہرا ہوگا
ہر بدلا ہوا ہر شخص کا چہرا ہوگا
[illegible]
اس کی پیشانی پہ حالات کا سہرا ہوگا
[illegible]
اپنے خوابوں کا [illegible] گہرا ہوگا
[illegible]
[illegible] کہ گہرا ہوگا
اک لہر میں بکھر جائے گی بستی اپنی
میری پیشانی پہ ہر وقت کا سہرا ہوگا
[illegible]
کس کو معلوم تھا جگنوؤں کا پہرا ہوگا
پاؤں میں [illegible]
[illegible] سہرا ہوگا

نصرت جی



غزلیں

اپنا کمال میں نے اجاگر نہیں کیا
پتھر کو پھول پھول کو پتھر نہیں کیا
کیفیت [illegible]
[illegible] سے باہر نہیں کیا
[illegible] منزل ہے
[illegible] نہیں کیا
[illegible]
آمادگی [illegible] بہتر نہیں کیا
[illegible]
[illegible]

فضا کوثری

دوستوں پر نگاہ کی جائے
رائیگاں جب یہ زندگی جائے
جرم میرا اور ستم ہے
ہر کرادی سزا نہ دی جائے
آدمی آدمی کا دشمن ہے
قطرہ قطرہ لہو نہ پی جائے
خوف دامن سے ہے برا
بات انسان کی کہی جائے
مصلحت کے ریزہ ریزہ دل کو
چاک کرنے کی فکر کی جائے
[illegible]
[illegible] روا رکھی جائے

رضوان نقوی

بقیہ سخن در سخن

آئندہ شمارے میں

- عصمت چغتائی کا راہی معصوم رضا کے نام ایک دلچسپ خط
- راہی معصوم رضا کا جواب
- فکر تونسوی کی فکر تونسوی سے ملاقات
- فکر کی نظمیں اور غزل
- کنہیا لال کپور کا ایک غیر مطبوعہ مضمون
- خواجہ عبدالغفور کا ایک تازہ مضمون

اور نظمیں • غزلیں • افسانے وغیرہ



پندرہ
چنگاری
جلد ۱

…ر
…ں کی ترتیب
…ر
…احمد خاں
…بر —— ۲۳
… ۲ روپئے —— سالانہ: ۴۵ روپئے
…/۱۰۳۱ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

…ائٹر پرنٹر پبلشر نے جے کے آفسٹ پرنٹرس جامع مسجد دہلی سے
…ر ۳/۱۰۳۱ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲ سے شائع کیا ۔

…آزادی کے داغ داغ اجالا کے بعد فنون لطیفہ کاروں
…طرح بے قدری ہوئی اور خاص طور پر جناب
…ند سے جڑے والے فن کاروں کو جس طرح نظر انداز کیا گیا
…بھی معاشرے کے لئے شرمناک ہے۔
…س رویئے سے سب سے زیادہ نقصان اردو کا ہوا
لیکن اس سے بھی زیادہ خسارہ معاشرے کو ہوا۔ اس
…و معاشرہ اپنے فن کاروں اور فنون کی قدر نہیں کرتا
…وحشت، بربریت، تنگ نظری، منافرت، بازاریت
…شینیت کا غلبہ ہو جاتا ہے اور انسان کی اعلیٰ قدریں
…عد مشی سے میسر کر رہی ہیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ انسان
…کا پرزہ بن جاتا ہے۔ اور ذہنی تناؤ اس کا مقدر
…بنتا ہے۔
…چنگاری اپنے قاری کا نہ صرف ذہنی تناؤ کم کرتا ہے
…ن کی اعلیٰ قدروں کو بیدار کرکے فنون لطیفہ اور
…روں خاص طور پر قلم کاروں کو معاشرے میں مستحق
…دلانے کے لئے بھی کوشش کرتا ہے۔

…یہ آپ کے تعاون سے ہی ممکن ہے

اس شمارے میں

نصرت اکرل

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]

•••

[illegible]

[illegible]

ایک خط

عصمت چغتائی

عزیز بھابی۔

آپ جو اتنے بڑے مصروف ہیں کہ آپ کو اتنا نہیں
جانتے کہ آئیڈیا کرسی کو ملک کے لئے مذہب ذات پات
کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔ ہندو کو مسلم ہونا
چاہئے کہ وہ کس مذہب، ذات اور صوبے کا
ہے۔ ہر آدمی کو ایک ہی طرح سمجھنا چاہئے کہ پیدائش
کے وقت اس کے علاوہ کی [illegible] میں
[illegible] اور مذہب [illegible]
کو بہت ضروری ہے۔

سب [illegible] میں ذات پات
مذہب کے نام پر [illegible] رہتی ہے۔
پہلے انگریز آئے اس سے پہلے [illegible]
ہندوستان میں ذات پات کا [illegible]۔ ہندو
مسلمان [illegible] لڑتے تھے۔
[illegible]

پہلے [illegible] مذہب [illegible]
[illegible] بہت [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] مذہب کو ختم کر دیا۔
[illegible] مذہب میں ایک شادی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
مذہب [illegible]

[illegible] مذہب کے [illegible] میں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جب بھی آریہ ایکٹ کے وقت [illegible] مذہب
[illegible] اور [illegible] سب
[illegible] میں [illegible] ہندو
مسلمان [illegible] دوسرے فرقے کے انسان ہیں۔
اس وقت ضرورت [illegible] میں [illegible]
انگریزی جنگ مذہب کو [illegible]
گئی اور انگریزی [illegible] آ گیا۔ مگر
پہلے [illegible] مذہب
[illegible] تقسیم ہو گیا۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

انگریزی [illegible] کی کلاس میں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
برما، سری لنکا، بھوٹان، نیپال، پاکستان،
بنگلہ دیش مذہب کے نام پر [illegible]
[illegible] پاکستان [illegible] مذہب کے نام پر
[illegible]
[illegible]

اسی [illegible] ہندوستان [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ہندوستان میں ہر مذہب کو فروغ ملا کیونکہ
ہندو دھرم کا بنیادی فلسفہ ہے کہ
دنیا کا کوئی مذہب ہندو دھرم کے احاطے سے
باہر نہیں۔ [illegible] دھرم میں بھی دنیا [illegible]
دولت کے تیاگ کی تلقین ہے۔ یہ دونوں [illegible]
کے ابتدائی فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ
اشتراکیت جو بجائے ہتھیاروں کے استعمال
کے [illegible] دنیا میں پھیلائی جائے گی۔
تیاگ کا پرچار [illegible] مذہب اور [illegible]
[illegible] ہزار سال قبل انسان [illegible]
[illegible] آپس ہی میں [illegible]
چلی گئی۔

ہندوستان کو [illegible] یورپ [illegible] کے
وجود [illegible] دو ڈھائی ہزار سال قبل۔
ایشیا میں [illegible] فتوحات کے [illegible]
[illegible] دھرم کی تبلیغ کے سلسلے میں۔
[illegible] اس مذہب کا بہت شاندار
[illegible]
آپس میں [illegible]
[illegible] خود ہندوستان میں تیاگ [illegible]
[illegible]
[illegible] مسلمانوں [illegible] حکومت قائم
کرنے میں مدد دی۔ اس وقت یورپ سے
پرتگالی، اسپینی، فرانسیسی یہاں بیوپار کے
سلسلے میں آئے [illegible] یہاں کی
[illegible]
[illegible]
[illegible] انگریز حکومت
قائم کرنے میں مدد دی۔

انگریز نے [illegible] ہندوستان میں
مذہب کے نام پر [illegible]
[illegible] کے وقت [illegible] اور
مذہب [illegible]
جنگ کی بنیاد ڈالی گئی۔

[illegible]
[illegible] مذہب کا [illegible]
(زبان [illegible])

عصمت [illegible]

فکر تونسوی

فکر کا انٹرویو تونسوی سے

[illegible]

کہا ہے۔

تونسوی صاحب: مگر مجھے ملا اور نفسے کے ... سے قائل کرایا ہے۔

فکر صاحب: ملا، نفسے ... [illegible] کی تخلیق کرتے ہیں ... [illegible]

تونسوی صاحب: آپ کا ... [illegible] کرو یجیے۔

فکر صاحب: ... [illegible] ... لگا رکھے۔

تونسوی صاحب: ... [illegible]

[illegible]

بننے کی تربیت دی ... [illegible]

تونسوی صاحب: فکر صاحب آپ کی تحریریں ... رٹ رٹ پڑھتے ہیں۔ تو آپ کا رد عمل کیا ہوتا ہے۔

فکر صاحب: ... [illegible] ... کمزوری ہے۔ ... [illegible]

تونسوی صاحب: ... [illegible]

فکر صاحب: ... [illegible] ... پڑھ کر ... [illegible]

تونسوی صاحب: ... [illegible]

فکر صاحب: ... [illegible]

[illegible]

تونسوی صاحب: اور طنز کیا چیز ہے۔

فکر صاحب: ... باتوں پر مزاح کا خول ... وقت پیدا ہوتے ہیں۔

تونسوی صاحب: چارلس ڈکنس مجھے دنیا کا بہترین مزاح نگار لگتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فکر صاحب: ... مجھے بس یہی ... کہ آپ ... [illegible] ... آپ اس کی نقل کریں گے۔

تونسوی صاحب: ... طنز نگار مجھے تو آپ ہی پسند ہیں۔ ... [illegible] ... طنز نگار ... ناپسند نہیں ... [illegible]

... [illegible] ... آپ کی اصل طنز نگاری کو پسند ... [illegible] ... اُن کے ... [illegible] ... قوم کو مشتعل کر دیں ... فکر صاحب کا طنز ... [illegible]

[illegible]

فکر تونسوی کا کچا چٹھا

[illegible] تونسوی

[illegible]

مجرم

وہ کہتی ہے —
کھلی ہوئی چاندنی ہے، ماحول میں نشہ سا گھلا ہوا ہے
فضا کا دست سیمگوں، ہر ایک دل پہ بار سا ہے
مگر وہ لیٹے میں رو رہی ہے
شکستہ امید کی طرح نہیں، آنسوؤں کی طرح رو رہی ہے

(۲)

وہ رو رہی ہے، وہ مجھ پہ الزام دھر رہی ہے
کہ میں نے کیوں اپنے گیت، جھلس کے بیاباں میں جا کے رولے
کہ میں نے مقدریت کی بانہوں میں کیوں بغاوت کے ناگ پالے
کہ میں نے کیوں انقلاب کی کھیتیوں میں شعلوں کا بیج بویا
کہ میں نے کیوں اس غم جہاں کو
بنا کے سوتن، کھلے گلوں سے، اپنا گھر میں بٹھایا
— وہ رو رہی ہے، وہ کہہ رہی ہے
جلا کے غصے کے تند چہرے
انہی نفرت کی گرم لہروں پہ بہہ رہی ہے
دکھا رہی ہے وہ داغ دل کے،
کہ دیکھ لو، یہ مری تمنا کے پھول بھی ہیں
یہ میری آنکھیں ہیں، ان میں جھانکو،
یہ پتلیاں مدتوں سے کاجل کو ڈھونڈتی ہیں
یہ میرے لب ہیں
گلاب ان پنکھڑیوں پہ مدت سے سو چکے ہیں
یہ میری بندیا ہے، جو ستاروں سے زرد رنگ ہے
یہ مانگ ہے جس میں آج سیندور کا چراغاں نہیں رہا ہے
یہ میرا جوبن ہے، کہ میرے سہاگ کی دھجیاں بدن پر لٹک رہی ہیں
یہ میرے بچے ہیں، دھوپ میں کونپلیں سکڑ گئی ہوں جیسے
یہ میرا گھر ہے کہ فقر سے تنگ میں درد کے بھوت گھومتے ہیں
یہ میرا جیون ہے —
— آج تیری زیست پر کوئی مشت خاک جیسے پڑی ہوئی ہے۔

(۳)

وہ کہتی ہے —
وہ میرے شانوں پہ اپنا سر رکھ کے کہہ رہی ہے
کہ میں ہی مجرم ہوں، آس کی محرومی کا
کہ میں نے ہی کسی آشنا کے واسطے قتل کر دیئے ہیں
کہ میں کتابوں میں پڑھ رہا ہوں جہان کی باتیں
مگر اپنا نہ اپنے گھر کی، نہ اپنے بچوں کی —

— زندگی جن کے حق میں وبال بنی ہوئی ہے

(۴)

وہ کہتی ہے، وہ چاہتی ہے،
کہ اس کے اشکوں پہ تڑپ کر تلافی جرم کر سکوں گا
کہ اس کے اجڑے ہوئے بدن پر گلاب بن کر میں کھل اٹھوں گا
کہ جن خیالوں کو میں نے سینے میں پال کر جواں کیا ہے
انھیں ندامت کی پھانسیوں پہ چڑھا ہی دوں گا
مگر میں کہتا ہوں میری پیاری ——!
اے کاش، میں تمہارا مجرم نہیں ہوں اصل پیاری ...!
اے کاش میں وہ دل نہیں ہوں،
کہ بال آ جائے حسن کے آئینے میں جس سے
مگر وہ مجرم جو آئینے کی نظر سے اوجھل رہا ہے صدیوں،
میرے خیالوں نے آخرکار اس کو بے نقاب کر کے دیکھ ہی لیا ہے
وہ چاندنی کے گلے گھونٹ کر آنسوؤں سے رلا رہا ہے
جس سے دل میں
تمہارا غم بھی جہان غم بن گیا ہے پیاری!
کہ دیکھ پایا ہے اس کو میں نے
تمہارے کاجل کی دھاریوں سے،
وہ اپنی جلن کے دھوئیں کو گاڑھا بنا رہا ہے
تمہاری آنکھوں کی پتلیاں بیچنے جا کے ڈالتا ہے
تمہارے ہونٹوں کی شہد بھری نرم لوریاں، چھینتا ہے سکے
تمہاری بندیا کو جیب میں رکھ کے سودا اپنا چکاتا ہے
تمہارے سیندور سے وہ تصویریں بنا کے ——
—— لاکھوں سہاگ پل میں اجاڑتا ہے
تمہارے جوبن کی کونپلیں کے میں نے بازار میں بکتے دیکھا
تمہارے بچوں کی کونپلوں کو
جیب کتروں کے تخت جو سلیں پستے دیکھا
تمہارے گھر میں جو درد کے بھوت گھومتے ہیں۔
میرے خیالوں کی آنکھ نے ان کو پہچانتے ہوئے ——
—— ہر ایک گھر میں دیکھا ہے جسے پیاری:
جس سے میں بن گیا ہوں مجرم
ان ہی لٹیروں کا جو مرے سامنے ہی حسن جہاں پہ شب خون مارتے ہیں

فکر تونسوی

اگست ۱۹۴۳ء

نصر اللہ

چھکا ۸

آدمی نامہ

(۱)

دُنیا میں آرہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کھاتا ہے جو کہ سو ہے وہ بھی آدمی
[illegible]
[illegible] سو ہے وہ بھی آدمی
اس [illegible] سو ہے وہ بھی آدمی

(۲)

[illegible] سو آدمی
[illegible] سو آدمی
[illegible] سو آدمی
[illegible] سو آدمی
[illegible] سو ہے وہ بھی آدمی

(۳)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] سو ہے وہ بھی آدمی

(۴)

[illegible] آدمی پھر
[illegible] آدمی پھر
[illegible] آدمی پھر
[illegible] آدمی پھر
[illegible] سو ہے وہ بھی آدمی

(۵)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] سو ہے وہ بھی آدمی

(۶)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] سو ہے وہ بھی آدمی

(۷)

[illegible] بھی آدمی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] سو ہے وہ بھی آدمی

(۸)

[illegible] آدمی
[illegible]
[illegible]
[illegible] آدمی
[illegible] سو ہے وہ بھی آدمی

قمر تونسوی

آخری غزل

[illegible] آئے ہیں
[illegible] آئے ہیں
[illegible]
[illegible] آئے ہیں
[illegible]
[illegible] آئے ہیں
[illegible] احتیاط لازم ہے
[illegible] احترام آئے ہیں
[illegible]
[illegible]

قمر تونسوی



فکر تونسوی میری نظر میں

کنہیا لال کپور

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ وہ چھوٹا سا قصبہ [illegible] فکر تونسوی کے ہاتھ لگ گیا۔ [illegible] ہر شخص [illegible] جیسا کہ [illegible] پھول کھلتے ہیں۔

فکر صاحب بڑی محنت سے لکھتے ہیں [illegible]

[illegible]

بھیل سے لے کر دکن تک ہر قسم کے طنزیہ مضامین مل جائیں گے۔

فکر صاحب کے پاس کسی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں [illegible] یونیورسٹی کی [illegible] ریسرچ کرنے کے لئے اب فکر تونسوی پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں اور [illegible] ڈاکٹری کی ڈگری عطا کر کے [illegible]

فکر طنز برائے طنز نہیں [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر جانسن نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ اگر کوئی شخص چاہتا ہے وہ پختہ اور خوبصورت نثر لکھ سکے تو اُسے چاہیے وہ شب و روز ایڈیسن کی تحریروں کا مطالعہ کرے۔ میری رائے میں جو شخص طنز نگار بننے کا خواہش مند ہے اُسے چاہیے وہ دن رات فکر تونسوی کے مضامین پڑھا کرے۔

بقیہ فکر تونسوی کا کچا چٹھا

[illegible]

- [illegible] کی فہرست ملاحظہ فرمایئے [illegible] اردو [illegible]

۱۔ ہیولے ۲۔ چھٹا دریا ۳۔ ساتواں شاستر ۴۔ [illegible] ۵۔ تیرِ نیم کش ۶۔ [illegible] ۷۔ [illegible] ۸۔ [illegible] ۹۔ [illegible] ۱۰۔ [illegible] ۱۱۔ [illegible] ۱۲۔ [illegible] ۱۳۔ [illegible] ۱۴۔ [illegible] ۱۵۔ [illegible] ۱۶۔ [illegible] ۱۷۔ [illegible] ۱۸۔ [illegible]

[illegible]

۱۔ [illegible] ۲۔ [illegible] ہندوستانی ۳۔ [illegible] ۴۔ [illegible] گرفتاری۔ ۵۔ [illegible] ۶۔ [illegible]

- [illegible]

- [illegible]

●●

نریندر لوتھر

سب سے زیادہ لکھنے والا

اردو ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ لکھنے والا، سب سے زیادہ چھپنے والا اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادیب فکر تونسوی ہے۔ میں اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فکر کا شمار دنیا کی کسی بھی زبان میں سب سے زیادہ چھپنے والے ادیبوں میں ہوگا۔

یہ پڑھ کر آپ شاید مصنف کی تصنیفات کی گنتی شروع کر دیں گے۔ لیکن ذرا ٹھہریے۔ یہ بحث [illegible] جائے گی کہ [illegible] دو ہزار [illegible] لکھتا، چھپا [illegible] ہے۔ اور جس [illegible] الفاظ [illegible] ہندوستان کے [illegible] اشاعت [illegible] سے ہو جاتی ہیں۔

[illegible] فکر [illegible] کا [illegible] ہے۔ کسی [illegible] اور کسی [illegible] زبان کے کسی [illegible] ادیب کی [illegible] میں چھپ [illegible] کے [illegible] نہیں۔ [illegible] کا پیدا [illegible] تھا۔ [illegible] لیکن [illegible] کے لئے [illegible] وقت [illegible] بڑے [illegible]۔ لیکن ایک [illegible] ہے کہ [illegible] میں پیدا ہوا تھا۔ [illegible] سال برٹش میوزیم کی لائبریری میں [illegible] کر کے ایک بھاری بھرکم کتاب لکھی تھی۔ [illegible] کتاب کا نام [illegible] ہے۔ اس کتاب [illegible] کے [illegible] سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب [illegible] ہندوستانی نے ہی لکھی ہوگی۔)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

زیب ہے۔ تصویر اگر بڑا ہوتی ہے تو کتاب ختم کی۔ اس زندگی میں کسی نے بھی فکر کو اتنی خالص اور معصومانہ ہنسی ہنستے نہیں دیکھا۔ تصویر کی یہ ہنسی فکر کی اصلی مسکراہٹ سے تجاوز کر گئی ہے۔ اُمید ہے یہ تصویر فکر کو بے فکری سے مسکرانا اور ہنسنا سکھائے گی۔

فکر تونسوی ہماری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔

ایک زندگی کا نہیں متعدد زندگیوں کا۔ پچھلے جنم سے لے کر اگلے جنم تک اور پھر واپس اس جنم تک سنسنی خیز ہوتی رہتی ہے۔ فکر نے ادب اور تاریخ کی کسی بھی روایتی حد کا لحاظ نہیں کیا۔ لکھتے لکھتے وہ زندگی سے موت میں اور موت سے پھر زندگی میں ایک دیدہ دلیری اور بے فکری سے داخل اور خارج ہوتا رہتا ہے۔ جیسے راج کپور کی فلم میں ہیرو ڈھنڈ کی تیوری کو پڑھتا ہوا ہیروئن سے بچ جاتا ہے۔ فکر سب دیواروں کو ڈھنڈ کی دیواریں کہتا ہے۔ میری نظر میں فکر کی یہ خاص خوبی ہے۔ اس نے گویا زندگی کو مختلف عنوان کے تحت تقسیم کیا اور پھر ہر عنوان کے تحت دل کھول کر لکھا۔ اور یہ "فکر تونسوی" کتاب زندگی ہے جس کے ہر عنوان تلے دوسروں کی زندگی کا نچوڑ رہتا ہے۔ کئی ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریروں میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ لیکن بہت کم مصنف ایسے ہیں جن میں "عالمگیریت" پائی جاتی ہے۔ طنزیہ ادب میں فکر ہی واحد ایسا ادیب ہے، جس میں "عالمگیریت" ایک حد تک موجود ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کیوں کہ فکر، ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہے، جن میں اکثر لکھنے کے موضوعات پر ہی لکھتے رہے ہیں۔ مثلاً مرزا ادیب کرشن، اُردو میں بہت سخت جان واقع ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بھی آزمائی کئے بغیر "حسن و عشق حق" ادھورا رہتا ہے۔ اس لئے اُردو ادیبوں کی نسل (جس کا اس سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے) "مشورہ"، "شاعر"، "خالہ" یا "کاکا جان"۔ (ان کے نام چلے جانے بھلا) "فوجی"، "زخمی"، "دوست"، وغیرہ۔ "بچوں کا" کو ہر ادیب نے پال کیا ہے (اس پر مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ مجھ کو (ان کا) یہ بات بالکل فطری ہے۔ اور چندی رانا جی کے مصنف تلسی داس نے بھی کہا تھا کہ ناری، تاڑن کی ادھیکاری ہے) لیکن دوسری نسلوں کے لکھنے والوں نے کئی نئے اور اچھوتے موضوعات کو بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔ ان کی تحریروں میں جدت، تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے دیکھا جائے تو فکر اور میری نسل کے ادیبوں میں کوئی "جنریشن گیپ" نہیں ہے۔ فکر کے ہاں اگر موضوعات کی بھرمار ہے تو اسٹائل بھی ہر مضمون کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ اکثر مضامین، افسانوں کے ٹکڑوں جیسے ہیں اور انہیں پڑھتے وقت کیفیت وہی ہوتی ہے جو افسانہ پڑھتے وقت —— لیکن فکر کو پڑھتے وقت آپ کو محظوظ ہونا پڑتا ہے، نہ جانے کب نشتر چل جائے۔ مضامین پڑھ کر اکثر "کیتھارسس" (CATHARSIS) کا احساس ہوتا ہے۔ آپ "بیویاں کی ذہنیت" پڑھئے اور بتائیے کہ کیا آخری چند سطروں میں آپ کی آنکھیں پُرنم ہوتی ہیں یا نہیں۔ "فکر تونسوی نے الیکشن لڑا"۔ نہایت ہی پُرلطف مضمون ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد ہمارا وہ خیال اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ الیکشن کی پالیٹکس شریف لوگوں کے بس کا روگ نہیں۔ "نو دے کے لئے کتابی فہرست" یا "چلت ماہ نے قلم خانی"۔ میں آپ کو اپنے ملک کے اسمبلی کے ممبروں کے ماتھوں اور مشتہ نقوش نظر آئیں گے۔ جن مضمونوں کے بارے میں آپ اکثر شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر یا سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے چھوٹے چھوٹے دوستوں سے پوچھتے رہتے ہیں۔ "آخر ایسا کیوں؟" وہ سب آپ کو فکر کی تحریروں میں ملیں گے۔

فکر جیسے نے فکر کو "بیچارہ آدمی" کہا ہے۔ "بیچارہ" ذرا کے ساتھ بعض جگہ کے ذکر بھی کے ساتھ ذکر [illegible] فکر کے مسائل بھی بیچارے کے مسائل ہیں۔ ان کے موضوع عام کے مسائل ہیں۔ وہ مسائل جو ازل

نریندر لوتھر

سب سے زیادہ لکھنے والا

اردو ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ لکھنے والا، سب سے زیادہ چھپنے والا اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادیب [illegible] نہیں ہے۔ [illegible] ان سے بھی ایک قدم آگے جناب [illegible] کا شمار دنیا کی کسی بھی زبان میں سب سے زیادہ چھپنے والے ادیبوں میں ہوتا۔

یہ پڑھ کر آپ جناب [illegible] کی تصنیفات کی تلاش شروع کر دیں گے۔ لیکن ذرا ٹھہریئے۔ یہ حضرت [illegible] جانے کتنے زمانے سے [illegible] دو ہزار [illegible] پڑھا جاتا ہے۔ اور جس [illegible] الفاظ [illegible] ہندوستان کے [illegible] اشاعت [illegible] ہو جاتی ہیں۔

[illegible] ایک [illegible] سے [illegible] کسی [illegible] اور کسی زبان کے کسی [illegible] ایڈیشن میں چھپ کر [illegible] خود کی [illegible] [illegible] اس کے [illegible] کے [illegible] [illegible] وقت ہندوستان میں [illegible] بڑے بڑے۔ لیکن ایک [illegible] [illegible] سال سال برٹش میوزیم کی لائبریری میں [illegible] کر کے ایک بھاری بھرکم کتاب لکھی تھی۔ [illegible] کا نام [illegible] ہے۔ [illegible] کتاب کے نام کے پہلے حصے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب [illegible] ہندوستان نے ہی لکھی ہوگی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فریب ہے۔ تصویر اگر بڑا ہی کی ہے تو کتاب فکر کی۔ اس زندگی میں کسی نے بھی فکر کو اتنی خالص اور معصوم ہنسی ہنستے نہیں دیکھا۔ تصویر کی یہ ہنسی فکر کی اصل مشکلات سے تجاوز کر گئی ہے۔ اُمید ہے یہ تصویر فکر کو بے فکری سے مسکرانا اور ہنسانا سکھائے گی۔

فکر تونسوی پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔

ایک زندگی کا نہیں متعدد زندگیوں کا۔ پچھلے جنم سے لے کر اگلے جنم تک اور پھر واپس اس جنم تک منتشر ہوتی رہتی ہے۔ فکر نے ادب اور تاریخ کی کسی بھی روایتی حد کا لحاظ نہیں کیا۔ لکھتے لکھتے وہ زندگی سے موت میں اور موت سے پھر زندگی میں ایسی دیدہ دلیری اور بے فکری سے داخل اور خارج ہوتا رہتا ہے۔ جیسے راج کپور کی فلم میں ہیرو دُھند کی تہوں کو چیرتا ہوا پیروں سے بڑھتا جاتا ہے۔ فکر سب دیواروں کو زبد کی دیواریں کہتا ہے۔ میری نظر میں فکر کی یہ خاص خوبی ہے۔ اس نے گویا زندگی کو مختلف نظموں کے تحت تقسیم کیا اور پھر ہر ایک کے تحت دل کھول کر لکھا۔ "فکر تونسوی" کتابِ زندگی ہے جس میں ہر مضمون میں دوسروں کی زندگی کا نچوڑ رہتا ہے۔ کئی ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریروں میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ لیکن بہت کم مصنف ایسے ہیں جن میں "عالمگیریت" پائی جاتی ہے۔ طنزیہ ادب میں فکر ہی واحد ایسا ادیب ہے جس میں "عالمگیریت" اور تک زیادہ حد تک موجود ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کیونکہ فکر ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہے جن میں اکثر ایک ہی موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔ مثلاً ترقی پسندی اُردو میں بہت سخت جان واقع ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بیچ آزادی کے بغیر "شبِ (رنج) غمِ حسن" دوہرایا رہتا ہے۔ اس لئے اُردو ادیبوں کی نسل پاس اس سے چاہے جتنا کو دہرایا گیا ہے (جیسے "مشاعرہ"، "شاعر"، "غالب" یا "بکواس"۔ ان کے نام پہلے جانے پہچانے "شادی"، "قرض"، "دوست"، وغیرہ۔ "بھوک" کو تو ہر ادیب نے پامال کیا ہے (اس پر مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں، بھوک زندگی کی بات بالکل فطری ہے۔ اور چندر یا ان کے مصنف کسی وال نے بھی کہا تھا کہ "نازی" نازی کی اور ہیکاری ہے) لیکن دوسری نسلوں کے لکھنے والوں نے کئی نئے اور اچھوتے مضامین کو بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔ ان کی تحریروں میں جدت، تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے دیکھا جائے تو فکر اور میری نسل کے ادیبوں میں کوئی "جنریشن گیپ" نہیں ہے۔ فکر کے ہاں اگر موضوعات کی بھرمار ہے تو اسٹائل بھی ہر مضمون کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ اکثر مضامین دونوں کے ڈھانچوں میں ہیں اور انہیں پڑھتے وقت کیفیت وہی ہوتی ہے جو افسانہ پڑھتے وقت ——— لیکن فکر کو پڑھتے وقت آپ کا تذبذب بڑھتا ہے، نہ جانے کب نشتر چل جائے۔ مضامین پڑھ کر اکثر "کتھارسس" (CATHARSIS) کا احساس ہوتا ہے۔ آپ "بیویاں کیا نہیں پڑھتیں" پڑھ کر بتایئے کہ کیا آخری چند سطروں میں آپ کی آنکھیں پُرنم ہوئی ہیں یا نہیں۔ "فکر تونسوی نے الیکشن لڑا"۔ نہایت ہی پُر اثر مضمون ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد چاروں وہ خیال آ رہی پختہ ہو جاتا ہے کہ الیکشن کی پالیٹکس شریف انسان کے بس کا روگ نہیں۔ "فٹ پاتھ کی فہرست" یا "بجلی واپس نہ آئی"۔ ممکن آپ کو اپنے سامنے اسٹینڈرڈ لوگوں کے ماضی اور شکستہ نقوش نظر آئیں گے۔ جن مسئلوں کے بارے میں آپ اکثر سوچتے کے سامنے کھڑے ہوکر یا سڑک کے درمیان کھڑے ہوکر اپنے چھوٹے چھوٹے دوستوں سے پوچھتے آئے ہیں۔ "آخر ایسا کیوں؟" وہ سب آپ کو فکر کی تحریروں میں ملیں گے۔

کچھ عرصے سے فکر "بچے کا آدمی" بنا ہے۔ "بچہ" زیر کے ساتھ جنہیں بچے کے ذکر کے ساتھ ذکر کرنے والوں کو فکر کے مضامین بچوں کے مضامین ہیں۔ ان کے موضوعات عام کے مسائل ہیں۔ وہ مسائل جو ازل

ملا دوپیازہ

عبدالغفور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میرے انتقال کے بعد

ٹرز کوٹنس ؟

میرا انتقال کب ہو گا، یہ [illegible]
نہیں ہو گا۔
مجھے باہر نکلنے میں [illegible] کہ میرا کوئی
[illegible]
[illegible] خوبصورت [illegible] تھا ہے۔
[illegible]
[illegible] ایک
کتاب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔
مجھے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کی ضرورت
نہیں ہے۔
میرے انتقال [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ہو گی۔ اگر یہ [illegible] تھا کہ [illegible] افراد
میری تحریر پڑھنے کے بھی [illegible] نہیں ہو جاتا۔
اور یہ [illegible] کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ [illegible] ہیں۔
[illegible] نہیں کی جا سکتی، جو [illegible] حضرات
قوم کی تقدیر بدلنے کے مسلسل وعدے کرتے ہیں۔
احترام کے اہل [illegible]
[illegible] لیڈروں کے لئے
ایک وقت [illegible] کے
لئے نہیں۔ قوم [illegible] ہے۔ اور
[illegible] ہے۔
[illegible] اہمیت نہیں
[illegible] کہ ایک دن
[illegible] انتقال [illegible]
[illegible]
[illegible] نہیں ہوتا۔
اور [illegible] کہ میرے انتقال [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہو گا۔
[illegible]
[illegible]
[illegible] میرا اصول
[illegible] نہیں
سمجھتا تھا [illegible]
[illegible]
[illegible] سال [illegible]
تھا۔ [illegible]
[illegible] نہیں ہو گی۔
میرے انتقال کے بعد [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] سے زیادہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
نہیں ہوتا۔ [illegible]
میرے [illegible] زندگی [illegible]
[illegible]
نہیں، بطور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] عبادت خانے کی تعمیر
کے لئے [illegible] چنانچہ
عبادت خانہ [illegible]
[illegible]
تھا۔ لیکن [illegible] عبادت خانہ تھا
[illegible]
عبادت خانے [illegible]
[illegible]
[illegible] عبادت خانہ تھا۔
[illegible]
[illegible]
کا عبادت خانہ تھا۔
اور [illegible]
کے امکانات پیدا کرتے ہیں۔ ایک [illegible]
[illegible]
[illegible] عبادت خانہ [illegible]
[illegible]
چنانچہ [illegible]
لئے اس عبادت خانے کو آگ لگا دی گئی۔ [illegible]
آگ [illegible]
[illegible]
کے انسان [illegible]
میرا انتقال [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

تھا۔ اور میرے پاس [illegible]
کی قسمت ہی نہیں تھی۔
[illegible] ———

[illegible] زبیر کی [illegible]
[illegible] کیا۔ پھر کی
[illegible]
[illegible]
[illegible] انسان ہوں۔ [illegible]

[illegible]

کرشن چندر نے کہا:
رام لال اگرچہ ایک بدقسمت انسان تھا
ایسے بدقسمتی کا احساس کبھی نہیں ہونے دیتے ذہین
کرتا تھا۔ مگر اس وقت سوال یہ کرنے کا نہیں
تھا۔ انسان ہونے کو کہاں کہاں [illegible] نے اعلان
کیا کہ میرا بیٹا [illegible] کم از کم [illegible] سے
[illegible] بینک
بیلنس بھی [illegible] لیکن اگر [illegible]
[illegible]
[illegible] فکر
[illegible] ہے۔
بلونت گارگی: اگر [illegible]
[illegible] ہے۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔
[illegible]
[illegible]
نہیں۔
[illegible] نہیں [illegible]
[illegible] ہیں۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔۔۔
ایک چنگاری:
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

"محبت؟ محبت!"
"محبت نہیں، فکر تونسوی [illegible]
[illegible] خریدے گے۔ [illegible] سال [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تھے؟
فکر تونسوی:
[illegible]
تحریر [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] زندگی [illegible]
تھے۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible]
[illegible] ہیں اور [illegible]
[illegible] ہے۔
جنت [illegible] فکر تونسوی نے انھیں
[illegible] کا شکار نہیں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہیں۔
دیکھتا [illegible]
[illegible] ہے

انھوں نے کبھی روپے پیسے کی پرواہ کی
نہ اس کی للکار ہی لیکن اپنی فکر صلاحیت کو
انھوں نے منفعت نہیں جانا اور نہ کبھی اونچی
روپے مانگا۔ ان کی زندگی میں ایک دن ایسا
بھی آیا تھا کہ ریوسے کیا چولہا جلانے کے لئے
لکڑیاں نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی جیب میں کچھ
تھا کہ جس سے لکڑیاں خرید لیں۔ یہ کہتے
ہیں کہ وہ دن ان کی زندگی کا بڑا اداس تھا
کہ انھیں کچھ [illegible] کے [illegible]
[illegible] ایک [illegible]
اور [illegible]
[illegible] فکر صاحب
کیا کریں گے۔ [illegible] چنگاری اس
میں [illegible]
فکر تونسوی اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں
انھیں کسی سے شکوہ ہے نہ شکایت۔ حالانکہ
گیان پیٹھ۔ ساہتیہ اکادمی۔ اردو ترقی بورڈ یا
کسی ادارے نے ان کی صلاحیتوں علمی ادبی
کارناموں کو کسی طرح بھی [illegible] نہیں [illegible] ان
کے [illegible] ہیں اور انھوں نے [illegible]
لیے اسی طرح [illegible] ہیں۔

ان کی تصانیف میں [illegible]
[illegible]
[illegible] پیاز کے چھلکے (۲ طنز و مزاح کا کالم)
[illegible] عالم بالا آپ
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
بعض [illegible] طنز نگاری
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]



سقراط بڑا خوش قسمت تھا

سقراط بڑا خوش قسمت تھا

[illegible]

سقراط بڑا خوش قسمت تھا

کرشن موہن

اب

[illegible]

مجھے اندر ہی اندر چاٹتا ہے
یہ کیسا خوف مجھ میں پل رہا ہے
درختوں کی گھنی لذت نہ ڈھونڈو
ابھی میلوں برہنہ راستہ ہے
یہی صدیوں سے سنتے آ رہے ہیں
سمائے [illegible] آ چکا ہے
جسے میں [illegible] کر چکا تھا
وہی پھر سامنے [illegible] کھڑا ہے
میں اپنے آپ میں محفوظ لیکن
مرے اندر کوئی پر تولتا ہے
درختوں کا لہو [illegible] شاید
ہوا کا ذائقہ [illegible] ہوا ہے
یہ کس منظر [illegible] ڈوبتی ہیں
یہ کیسا بوجھ آنکھوں پر لدا ہے

بیگانۂ طلسم تماشا نہ تھا بہت
ہاں میں [illegible] کو غور سے دیکھا نہ تھا بہت
کوئی نگاہ سطح سکوں تک نہ جا سکی
ملبوس اضطراب شکستہ نہ تھا بہت
جو رنگ ہے اسی کی عقیدت کا رنگ ہے
یوں تو اسے دل میں وہ ٹھہرا نہ تھا بہت
تحریر وقت پڑھتے ہی [illegible] گزر گئیں
حالات کو لکھنے والے نے لکھا نہ تھا بہت
[illegible] اپنے سائے [illegible] میں دھوپ تھی
[illegible] راستہ [illegible] بہت
چہروں سے [illegible] میں شناسائیوں [illegible]
پہلے میں اس [illegible] تھا بہت
پھر [illegible] چپ کی صدا [illegible] رہی
ویران [illegible] دشت [illegible] تھا بہت
[illegible] فصل جنوں
اب کے گل طلب تر و تازہ نہ تھا بہت



غزلیں

سر اٹھاتی ہوئی ہر لمحہ ضرورت میری
مجھ کو نیلام نہ کر دے کہیں غربت میری
میں [illegible] لوحِ حقارت [illegible]
زندگی کرنی رہی پھر بھی [illegible] میری
اب جو [illegible] بھرے شہر میں تنہا تنہا
یاد آئے گی بہت [illegible] میری
ہر قدم [illegible] دیوار [illegible]
پھر بھی قائم رہی دستارِ فضیلت میری
اس کے چہرے پہ کہیں [illegible] نہ ملا
میری آنکھوں میں [illegible] میری
[illegible] میں [illegible] کل
آئینہ [illegible] طلب [illegible] صورت میری

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
جیسے آج نکلے ہوں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
آئیے [illegible] جائیں [illegible]



[illegible]
مرے خلوص پہ [illegible] کھا ہے
[illegible] ٹوٹے ہوئے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اسی نگاہ [illegible]
اسی نگاہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

نہ اختیار کی کلیاں نہ اقتدار کے پھول
وہ دے گیا ہے [illegible] کے پھول
[illegible] سے مابعد [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کی [illegible] کے پھول
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کے پھول

رحمت قادری

[illegible] سے [illegible] کو [illegible] نہیں
اک [illegible] دعا نہیں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] آشنا نہیں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ڈاکٹر ابو محمد سحر

غزلیں



[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] دعا کرو
[illegible]
[illegible] کرو
[illegible] اس قدر
[illegible] کیا کرو

سیدہ فرحت

[illegible]

غزلیں



سورج سے چاندنی کا طلبگار میں ہی تھا
الزام کس کو دوں کہ گنہگار میں ہی تھا
تیشہ اٹھایا ہاتھ میں تو بھید یہ کھلا
خود اپنی رہگزار میں دیوار میں ہی تھا
جب رات تھی تو چاروں طرف انقلاب تھا
سورج اگا تو تنہا سر دار میں ہی تھا
جنگل کی شانتی میں بھی تھا اداس اداس
شہروں کی بھیڑ بھاڑ سے بیزار میں ہی تھا
پھر یہ ہوا کہ میری زباں کاٹ لی گئی
خورشید اپنے شہر کا اخبار میں ہی تھا

عالم خورشید

چھاؤں میں بیٹھے ہوئے جلتے زیادہ
ننھے گھر میں ہیں کابل سے زیادہ
ہونے لگی تشہیر بہار گل سے زیادہ
ہونے جیسے ہے تپ سے زیادہ
یک حرف بات اور کچھ نہیں ہے
یکجا ٹوٹے ہوئے پل سے زیادہ
اب فیصلہ ہو پر نہیں ہے مول اپنا
اک ترے حرف تسلی سے زیادہ
راستہ سب کچھ نہیں منزل بھی تو ہے
گرد میں دقت ٹالے کل سے زیادہ
سب ہیں سرگرداں ہم کے واسطے ہم
ہو بہ جاتا ہے تو کل سے زیادہ
اہمیت ہے کچھ انداز تغزل کی
شعر میں رنگ تغزل سے زیادہ

رؤف خیر

ہے یہ سال رواں دیکھیے دیکھیے
کوہ آتش فشاں دیکھیے دیکھیے

حال اپنا ہے جو دیکھیے دیکھیے
سائباں نشاں دیکھیے دیکھیے

کور چشموں ہماری نظر ہے
پھر ایک سماں دیکھیے دیکھیے

وقت شداد تھا وقت فرعون
مٹ چکے ہیں نشاں دیکھیے دیکھیے

آ پڑا ہے ملاوہ موسم سنبلا ہے
مسکرائی خزاں دیکھیے دیکھیے

مرے احساس کا پیش نظر
چھا پڑا دھواں دیکھیے دیکھیے

میرے خوں، شعر ملت تو ہیں
کھلا رہا ہے دھواں دیکھیے دیکھیے

کہنا تو آپ کا شعر
اور دل تاب دیکھیے دیکھیے

کس کا ہے الجھنے تک
الفت دھواں دیکھیے دیکھیے

قاسم ندیم



رنج سوانی کے بھی تیری جبیں پہ تب سے
کرچی ہو بچل تو ظاہر ہے کہ ہم شیشے
ہم جرم ہو گا اگر چہ بات سے ٹھیک ہو
دولت کہ لب سے خوں سے پھر تو شہ
بیٹھے نشیں کی شعر ہے شکل
سب ہوائے وہ شہر کا سے تند آشنا سے
خواب کے دیوان سے ہوگی جو یہ بات
سنتے ہوئے شہر ہم سے مگر تک سے
دیکھا پھر کوئی انسان بات نہ ہے
کشتیاں ہم اپنی ساحل پہ ہو گئی ہیں سے
شہر کا ماحول بھی بجلی بھی جلا کر
ہوا لے سمندر تو دوالوں میں گزر گئے

جمیل قریشی

دعا گو رہتے ہیں سب ہی، دعا کب تک
گریباں تار تار تھا خدا کب تک
مری بستی میں بھی وحشت سی کوئی اتری
لب سے شور کی آب و ہوا کب تک
لفظ پہ رہتے ہیں اور کسی کا جینا
اب اس کے بعد کسی کا سہارا کب تک
سب سمجھتے ہیں سب کہاں کا جلنا
ملے کہ تب نہ ملے کب تک
کہتا ہے کوئی سب سے کہ جلنا
یہ زندگی تو ہوا ہے ہوا کب تک
چاہت ہوا کا شیشہ نہ ٹوٹے بھی
قرار خواب سے چاہت ہوا کب تک

شمیم قاسمی

غزلیں

خود اپنے خون کا پیاسا دکھائی دیتا ہے
ہر ایک شخص درندہ دکھائی دیتا ہے
عجیب قہر کا منظر ہے ہر طرف یعنی
جو شخص زندہ ہے مردہ دکھائی دیتا ہے
گلہ کروں تو کیا آئینۂ حیات سے جب
خود اپنا چہرہ ہی دھندلا دکھائی دیتا ہے
جو شخص دوستو اونچی اڑان بھرتا تھا
وہ پر شکستہ پرندہ دکھائی دیتا ہے
ہر ایک آنکھ میں بھینیاں ہیں خیمہ زن
ہر ایک جسم شکستہ دکھائی دیتا ہے
ہمارے ہاتھ میں اخبار تو نیا ہے مگر
ہر ایک حرف پرانا دکھائی دیتا ہے
ہمارے دور کی میزان کا کرشمہ ہے
کہ ہم کو کانچ بھی ہیرا دکھائی دیتا ہے
عجب طلسم ہے آنکھوں کے روبروئے بھرت
نظر کے سامنے کیا کیا دکھائی دیتا ہے

بھرت جی



صبر نے بے تاب کیا شمع کو پروانے کو
اب وہی آگ جلا ڈالے گی دیوانے کو
دار کو چوم لیں، قاتل سے گلے لگ جائیں
کس طرح پیش کریں جان کے نذرانے کو
اب کسی شہر میں جانے سے کوئی فرق نہیں
کوئی پوچھے ہے نہ اپنے کو نہ بیگانے کو
کسی دیوار سے ٹکرائیں کوئی بت توڑیں
وحشتِ دل کو کھلونا تو دیں بہلانے کو
ایک مانوس سی خوشبو ہے جو ہر شام ڈھلے
ہم کو دیتی ہے صدا لوٹ کے گھر آنے کو
علمیؔ کیا روئیں اسے جس کا یہاں کوئی نہیں
آؤ اب لوٹ چلو پھر اسی ویرانے کو

انعام الحق علمیؔ۔ سنانجیریا

دیواروں پر ہلتے سائے
اک دوجے سے ملتے سائے
جسم کے خول سے باہر آکر
ساری رات ٹہلتے سائے
گھر سے جب میں باہر نکلوں
مجھ سے قبل نکلتے سائے
رفتہ رفتہ موم کے جیسے
جلتی رات پگھلتے سائے
آنکھ ذرا جو موندی ہم نے
دیکھے لاکھ مچلتے سائے
ایسے بھی کچھ دیکھے ہم نے
جیسے آگ اگلتے سائے
شمسؔ میاں اب کیا سوچا ہے
تم سے آگے چلتے سائے

شمس تبریزی

شبِ فراق اٹھائیں صعوبتیں کیسی
کسی کی یاد نے دی ہیں اذیتیں کیسی
وفا شعاریاں اپنی اساسِ الفت ہیں
پھر اس کے جور و ستم کی شکایتیں کیسی
بیاضِ درد میں غم کی وہ داستاں ہے رقم
تمہارے عشق میں گزریں ہیں ساعتیں کیسی
رہِ طلب میں بڑھے جا قدم قدم سرشار
حصولِ منزلِ مقصد میں کلفتیں کیسی
وہ لفظ لفظ میں پوشیدہ طنز کے نشتر
یہ بات بات میں لب پر محبتیں کیسی
لہو کے اشک، خلش، انتظار، بے تابی
ترے فراق میں حاصل ہیں نعمتیں کیسی
کہیں گلاب، کہیں نسترن، کہیں ریحان
فروغِ حسنِ نظر کی ہیں صورتیں کیسی
ملی نسیمِ بہار و چمن کو تیری ادا
خرامِ ناز میں دیکھیں لطافتیں کیسی
جو پاسباں تھے چمن کے وہی ہیں غارتگر
یہ ہم نے سونپ دیں ان کو کفالتیں کیسی
جنوں نواز بہاروں کا خیر مقدم ہے
لہو میں ناچ رہی ہیں یہ وحشتیں کیسی
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ خلوص و مہر بسنت
معاشرے پہ ہیں غالب کدورتیں کیسی

بی ایل بسنت

میری کیا اوقات ساری خلق ہی مجبور ہے
جو مشیت کی رضا ہو وہ مجھے منظور ہے
چار دن کی زندگی ہے اور وہ بھی مستعار
پھر خدا معلوم انساں کس لئے مغرور ہے
اس کے وعدوں پہ جئے جانے کی پائی یہ سزا
دل سبھی دکھ درد سہنے کے لئے مجبور ہے
ہو گئی معدوم چہرے کی بشاشت کس لئے
قتل کر کے میرا قاتل کس لئے رنجور ہے
انگنت ٹکڑوں میں یا تو بٹ گیا چہرا مرا
یا تمہارے ہاتھ کا آئینہ چکنا چور ہے
زیست جب بارِ گراں ٹھہری تھی اے تابشؔ تو پھر
اس کے چھن جانے سے انساں کس لئے رنجور ہے

طلحہ تابش

افسانہ

آگ

محمد طارق



میرے گھر کو آگ لگ گئی۔ نامعلوم کیسے لگی، میں نہیں جانتا میں سویا ہوا تھا۔ ابھی کچھ لمحے ہی تو گزرے تھے میری آنکھ لگے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سونے سے قبل میں نے چولھے کی آگ کو بجھا دیا تھا۔ خوب پانی چھڑک دیا تھا۔ چراغ روشن تھا صرف۔ مگر چراغ سے میرے پھونس کے جھونپڑے میں آگ نہیں لگی۔ مجھے پکا یقین ہے۔

نامعلوم کس دل جلے نے اپنے دل کی آگ میرے جھونپڑے میں لگادی ——— آپ ہی آپ تو نہیں لگ سکتی ایسی آگ!

میں سوچ رہا تھا۔ میں کس کا نام لوں؟!

میرے تمام پڑوسی تو شریف اور مہذب لوگ ہیں۔ یہ کسی کمینے، کم ظرف کی ہی بدمعاشی ہو سکتی ہے مگر کمینہ کون؟ کم ظرف کون؟

مجھے تو کوئی نظر نہیں آتا۔ تمام شریف، با اخلاق، مہذب نظر آتے ہیں۔ کوئی دشمن بھی نہیں میرا۔ برسوں سے میں اس بستی میں رہ رہا ہوں۔ مگر کسی نے میری طرف ترچھی نظر سے بھی نہیں دیکھا ... مجھے یاد نہیں آرہا ہے میں نے ہم وطنوں کی نظروں کو پرکھا ہی کب، مجھے ضرورت بھی ایسی پیش نہیں آئی۔ بہرحال تمام پڑوسی با اخلاق۔

پھر یہ آگ؟!

بس آنکھ لگنے کی ہی دیر تھی کہ جھونپڑے کو شعلوں نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ ...

میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اور جھونپڑے کے باہر نکل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور چیخنے لگا تھا۔

"آگ لگ گئی، آؤ .... آؤ میرے بھائیو، میرے گھر کی آگ بجھانے آؤ"

کچھ ہی دیر میں میرے تمام پڑوسی اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ مگر یہ کیا! اُن کے ہاتھوں میں بالٹیاں نہیں تھیں۔ چراغ تھے۔ بجھے ہوئے دیئے۔ وہ میرے جھونپڑے کی آگ سے اپنے چراغ جلانے لگے، اپنے گھروں کی تاریکی دُور کرنے کے لئے۔ ....

چراغ جلا کر وہ چل دیئے، اور میں چیختا ہی رہ گیا، چراغ مت سلگاؤ بھائیو، پانی سے بجھادو اس آگ کو!

مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی میں کیا دیکھتا ہوں، میرے پڑوسیوں کے مکانوں کی چھت سے شعلے نکل رہے ہیں۔

وہ تمام گھبرائے گھبرائے اپنے اپنے گھروں سے نکلے وحشت اُن پر سوار تھی۔ وہ میری طرف بڑھنے لگے چیختے ہوئے۔

"ہم تجھے نہیں بخشیں گے۔ تیرے گھر کی آگ سے ہمارے گھر جلے ہیں۔ ہم تجھے بھی جلا ڈالیں گے!!"

وہ میرے قریب آنے لگے۔

وہ اب انسان نہیں تھے۔ اپنے جلتے ہوئے گھروں کے شعلے تھے۔ اُن شعلوں نے مجھے گھیر لیا۔ ....

●●●

بہت سے اچھے افسانے پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں صرف اس لئے ناکام رہتے ہیں کہ ان کی ابتدا اچھی نہیں ہوتی۔ یا پھر شروع کا حصہ اتنا کھنچتا چلا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کو اصل قصے کا دُور دُور معلوم نہیں ہوتا اور وہ پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے اور پڑھنا چھوڑ دیتا ہے۔ حالانکہ وہ افسانہ مجموعی حیثیت سے کامیاب افسانہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی کوئی بہت ہی اچھا افسانہ اس لئے ناکام رہتا ہے کہ اس کا اختتام خراب ہوتا ہے۔ شروع سے افسانہ دلچسپ اور نکھرتا چلا جاتا ہے لیکن اختتام پر ذرا سی چوک سے سارا افسانہ بکھر جاتا ہے اور پڑھنے والے پر کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ کامیاب افسانہ وہی ہے۔ جو پڑھنے والے کو شروع سے آخر تک اپنی طرف متوجہ رکھے اور ختم ہونے پر اپنا اثر چھوڑ جائے۔

سہیل عظیم آبادی

افسانہ

کچھ پوچھو نہ مجبوری

سرسوتی سرن کیف



"ممی آج تو میٹ لاؤ گی نا؟" ریکھا کی آواز آئی۔

شاید لے بھی آتی۔ بیچارے وں کو روزانہ تو جلد جلد الٹ پلٹ کی ہوئی سبزی اور تاڑ توڑ سینکی ہوئی روٹیاں کھانے کو ملتی ہیں۔ اس سے زیادہ ہو بھی کیا سکتا ہے جب صبح ماں اور بیٹی کو کام پر اور بیٹے کو کالج جانے کی جلدی ہو۔ شام کے وقت اتنی تھکن ہو جاتی ہے کہ کبھی کھچڑی ملتی ہے کبھی انڈے کے بھرتے کے ساتھ پراٹھے۔ اتوار ہی کو ڈھنگ کا کھانا مل پاتا ہے' وہ بھی اس دن جب کوئی فنکشن دوپہر کو نہ پڑ جائے۔ لیکن ریکھا کی تجویز میں جو دبی ہوئی ہنسی کی آمیزش تھی اس نے دماغ کو مشتعل کر دیا۔

میں نے غراتے ہوئے کہا" کیوں، کہیں سے خزانہ مل گیا ہے کیا؟ میٹ کا نرخ کیا ہے۔ سیدھی طرح دال روٹی کھاؤ۔"

"اور پھر بھوکے گن گاؤ" ہیمنت نے جملہ اپنے ڈھنگ سے پورا کیا۔ میرا اشتعال تقریباً ختم ہو گیا تھا لیکن ریکھا کی شرارت ختم نہ ہوئی۔ بولی "پر بھوکے گن تو روز گاتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا آج---"

جاتی ہوں چڑیل تونے کیا سوچا تھا اور کیا کہنا چاہتی ہے۔ پر نکل رہے ہیں تیرے۔ بس چلتا تو اندر جاکر دو تھپڑ لگاتی۔ ساری کھلکھل دھری رہ جاتی۔ قاعدے کی بات تھی کہ میں خاموش رہتی لیکن چوری پکڑی جائے تو عقل بھی ماری جاتی ہے۔ پہلے کی طرح غراتے ہوئے میں نے کہا "آج کیا؟"

ریکھا چپ ہوگئی لیکن بات ختم نہ ہوئی ہیمنت مصنوعی معصومیت سے بولا "لیکن ممی آج تو تم نے ہریش انکل کو کھانے پر بلایا ہے؟"

بلایا ہے تو کیا ہوا؟ کیا ان کے کھانے پر سب کچھ لٹا دیں؟ یہاں آئیں گے تو وہی کھائیں گے جو ہم کھاتے ہیں۔"

بچے خاموش ہوگئے لیکن مجھے بہت دیر تک معلوم ہوتا رہا کہ دبی دبی ہنسی کی آوازیں آرہی ہیں۔ پندرہ بیس منٹ تک یہی حالت رہی۔ برداشت نہ ہوا تو ریکھا کے کمرے میں گئی تاکہ دونوں کی سرزنش کروں۔ لیکن کمرہ خالی تھا۔ میں نے زور سے آواز دی "ہیمنت"

غسل خانے سے ریکھا کی آواز آئی" ہیمنت سبزی لینے گیا ہے۔"

"کب گیا؟"

"پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے۔"

"لیکن مجھے بتائے بغیر کیوں چلا گیا؟ میں کچھ۔۔"

"ابھی آرہی ہوں ممی۔ یہاں ٹھیک سے سنائی نہیں دیتا۔"

اس کا مطلب ہے ریکھا بھی پندرہ منٹ سے غسل خانے میں ہے' ورنہ نہا کر نکلنے والی کیوں ہوتی؟ لیکن پھر ابھی تک دبی ہنسی کی آوازیں کیسی آرہی تھیں۔ مجھی کو کچھ ہو گیا ہے کیا؟ واپس اسٹڈی میں آگئی اور کرسی پر بیٹھ کر ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

سر تھامنے کی فرصت بھی کتنی دیر کے لیے ملنی تھی۔ نو بج گئے تھے۔ ہریش نے ساڑھے گیارہ بجے آنے کو کہا تھا تو گیارہ بج کر اکتیس منٹ نہیں ہونے دیں گے۔ معلوم نہیں کچھ لوگوں میں کیا سنک ہوتی ہے کہ اتنی سختی سے وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر آدھ پون گھنٹے دیر میں آئیں تو کیا انھیں کھانا نہیں ملے گا؟ لیکن اپنی جھنجھلاہٹ پر ہنسی آگئی۔ ہریش تو وقت کے ایسے پابند پہلے نہ تھے۔ گیارہ بجے آنے کو کہتے تو سچے فلسفی کی طرح ایک ڈیڑھ بجے آیا کرتے۔ بیس برس پہلے میں نے ہی شرمندہ کرکے' مذاق اڑاکر' ناراض ہو کر غرض کہ ہر ممکن طریقے سے انھیں وقت کا پابند بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں سال ڈیڑھ سال میں اس مہم میں کامیاب بھی ہوگئی۔ کیوں ایسا وقت کا پابند بنایا تھا انھیں؟ میں خود ہی کب ایسی وقت کی پابند تھی؟ راجندر آدھ گھنٹے چیخ' پکارتے تو میرا میک اپ ختم ہوتا اور اس میک اپ کی وجہ سے ہم ہر پکچر میں دس پندرہ منٹ دیر سے پہنچتے۔ ہاں ہریش کے لئے شروع کی ہوئی مہم سے مجھے بھی یہ فائدہ ہوا کہ میں خود وقت کی پابند ہوگئی۔ اس

نصف اقبال

عادت کی وجہ سے موجودہ ملازمت میں میرا موجودہ ملازمت میں اچھا امپریشن پڑا اور اور میری عزت ہونے لگی۔

لیکن یہ تو بعد کی بات ہے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ مجھے ملازمت کرنی پڑے گی۔ راجندر، میرے خاوند، الیکٹریکل انجینئر تھے۔ پاپا کی وکالت میں پہلے جیسی شان تو نہ رہی تھی پھر بھی اچھی خاصی چل رہی تھی۔ کیسے خیال تھا کہ مجھے رات دن تگ و دو کرکے اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرنا پڑے گا۔ دس برس پہلے پاپا کا عدالت سے رکشے میں واپس ہوتے وقت ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ان کی ٹانگ جو ٹوٹی تو کبھی ٹھیک سے نہ جڑی۔ دو بھائی ہیں۔ اگر ایک بھی پاپا کی خواہش کے مطابق وکالت میں آ جاتا تو گھر میں کسی بات کی کمی نہ ہوتی لیکن بھائیوں کا یہ حال کہ ایک کو تھیٹر کی دھن تو دوسرے کو جوے کی لت۔ پاپا اپاہج ہوئے تو بڑے صاحب نے، جو کسی طرح فرسٹ کر بی۔ اے۔ کر چکے تھے، سب جج کی سفارش سے عدالت میں اہلمد کی جگہ حاصل کر لی تھی لیکن چھوٹے صاحب کو جوے نے اتنی بھی فرصت نہ دی کہ ڈگری لیتے۔ گھر کی حالت خراب ہوئی تو سیلزمین بن گئے لیکن انھوں نے اپنی آمدنی کو اپنے خرچ ہی تک محدود رکھا۔ ہاں، یہ مہربانی کی کہ شادی نہیں کی۔ بھابی چاہتی تھیں کہ ہم لوگ بھی گاہے بگاہے ان کی مدد کیا کریں لیکن پاپا پرانی وضع کے آدمی تھے، انھوں نے بیٹی سے کچھ بھی لینا منظور نہ کیا۔ اس پر بھائی اور بھابی ان کا جھگڑا رہنے لگا اور چار پانچ برس اسی ذہنی خلفشار میں گزار کر دل کی بیماری میں جان دے بیٹھے۔ میری بدقسمتی کہ میں ان کی تعزیت میں بھی شریک نہ ہو سکی۔ کیونکہ یہاں راجندر یرقان کے شکار ہو گئے تھے عمر بھر کی عادت نے انھیں مار ڈالا۔ ڈاکٹر کی ہدایت اور میری منت سماجت کو نظر انداز کرکے چوری چوری منگا کر شراب پی لیتے۔ ایسے میں کونسا علاج کارگر ہوتا تھا۔ دو تین مہینے بعد وہ بھی آخری راہ اختیار کر بیٹھے۔

بعد کی کہانی اور بھی غیر دلچسپ ہے۔ راجندر کی موت کے بعد دستور کے مطابق ان کے سارے بڑے آدمیوں نے نظریں پھرا لیں پھرا بھی کیوں نہ لیتے؟ ان کی دوستی تو رشوت دے کر کام کروانے تک تھی، اس وقت دوسرے الیکٹریکل انجینئر کی جیب گرم کرتے یا مجھے اور میرے بچوں کو ٹکڑے ڈالتے۔ صرف ایک کمپنی کے منیجر مہربان نکلے۔ انھوں نے مجھے رسپشنسٹ کی جگہ دے دی۔ وہ بھی قسمت کی بات تھی کیونکہ اسسٹنٹ منیجر صاحب اپنی نوعمر محبوبہ کو اس جگہ رکھنا چاہتے تھے اور پر خاش کی بنا پر منیجر نے خدا اسے مسترد اور مجھے منتخب کر لیا۔ بعد میں روکھی سوکھی کھا کر ریکھا کو ایم۔ اے۔ کرایا۔ سال بھر سے ریکھا ایک پبلشنگ فرم میں اسسٹنٹ لگ گئی ہے اور ہم لوگوں کے پاس ڈھنگ کے کپڑے ہو گئے ہیں مکان کی ضرور کوئی دقت نہیں ہوئی کیونکہ راجندر نے جلد ہی موقع دیکھ کر یہ مکان بنوا لیا تھا۔

لیکن یہ تو دوسری ہی کہانی شروع ہو گئی کیا سوچ رہی تھی؟ ہاں، ہریش کی بات تھی۔ ہریش نے پہلی ہی ملاقات میں میری دلچسپی ان میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی۔ اس بات کو بھی لگ بھگ بائیس سال ہونے آئے۔ اس وقت ریکھا چھ مہینے کی تھی اور ہیمنت پیدا نہیں ہوا تھا۔ راجندر ایک دبلے پتلے عینک پوش حضرت کو شام کے وقت گھر لے آئے تھے اور کہا تھا کہ یہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میں نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ راجندر یار باش آدمی تھے کبھی ہم لوگ کسی کے گھر مدعو ہوتے، کبھی کسی کو اپنے گھر مدعو کرتے۔ لیکن ان صاحب کی بات ہی اور تھی۔ اسکول میں راجندر کے ہم جماعت تھے اور قسمت نے ان بچھڑے دوستوں کو پندرہ سولہ برس بعد ایک بالکل نئے شہر میں ملا دیا تھا جہاں راجندر بجلی کے الیکٹریکل انجینئر مقرر ہوئے تھے اور ہریش اگروال کالج میں فلسفے کے لیکچرار۔ فلسفیوں کی عادت کے برخلاف ہریش ہمیشہ مسکراتے رہتے لیکن عین فلسفیانہ انداز میں خاموشی بھی اختیار کئے رہتے۔

راجندر کو ان کا مذاق اڑانے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ میں نے شروع شروع میں راجندر سے کچھ لے دے بھی کی کہ کیوں غریب کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ لیکن نہ معلوم کیوں دو چار مہینوں میں شاید غیر شعوری طور پر میں ان کا مذاق راجندر سے بھی زیادہ اڑانے لگی اور اس معاملے میں اس حد تک بڑھ کر ایک آدھ بار راجندر کو بھی برا معلوم ہوا۔

لیکن ہریش دنیا سے نرالے تھے۔ ہر مذاق پر ان کا جواب ایک تبسم ہوتا۔ ہاں، یہ میں نے ضرور نوٹ کیا کہ راجندر کے ریمارکس پر وہ ایک مختصر اور نیم جاں تبسم سے کام لیتے اور میں کچھ کہتی تو پہلے پانچ سیکنڈ مجھے ایک ٹک آنکھوں سے گھورتے اور پھر ساڑھے تین انچ کی پائدار سی مسکان بکھیرتے۔ میں کبھی سوچا کرتی کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے ورنہ اس گوگے مجنوں میں ایسی کیا بات ہے کہ میں گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھی رہتی ہوں۔ گھنٹوں؟ ہاں گھنٹوں ہی تو بیٹھی رہتی تھی کیونکہ ہریش اکثر تیسرے پہر آ جاتے تھے اور چھ سات بجے تک راجندر کے آنے کا انتظار کرتے رہتے۔

ایک روز میں یکطرفہ گفتگو سے اوب گئی اور بولی "کیوں صاحب، آپ کو تو اس بات سے فرق نہیں پڑتا ہوگا آپ انسانوں سے بات کر رہے ہیں یا مجسموں کے سامنے بیٹھے ہیں؟"

ہریش نے پانچ کی بجائے دس سیکنڈ تک مجھے گھورا اور بغیر مسکرائے بولے "اگر ایسا ہوتا تو تمھارے گھر کیوں آیا کرتا، میوزیم میں

نہ جاتا؟"

"آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟ شاید غلطی سے میوزیم سمجھ کر یہاں آجاتے ہوں" میں ہنستے ہنستے بولی۔

"نہیں میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں میوزیم کی مورتیوں میں تراش خراش تمہارے جسم سے بہتر ہے لیکن وہ مجھے تمہاری جیسی حسین آنکھیں کہاں سے لائیں گے؟" ہریش ایسے سپاٹ لہجے میں بولے جیسے کسی طالب علم کو فلسفے کا کوئی مسئلہ سمجھا رہے ہوں۔

میں جیسے آسمان سے زمین پر آرہی۔ میں نے پیدائشی طور پر رومانٹک طبیعت پائی تھی۔ میرا خاص مشغلہ رومانی ناول اور نظمیں پڑھنا تھا۔ ماں بننے کے بعد بھی میں نے مہینے میں چار پانچ مرتبہ سینما دیکھنا جاری رکھا تھا۔ میں رومانیت کے ہر پیچ و خم سے واقف تھی لیکن اچانک بغیر کسی تمہید کے اس قسم کے سپاٹ عرض محبت کے لئے تیار نہیں تھی۔ یہ بات نہیں کہ غیر مرد کی محبت کا مجھے تجربہ نہ ہو راجندر کے کئی دوست میرے شکار رہ چکے تھے۔ کچھ شوق سا ہو گیا تھا کہ اپنے شوہر کے دوستوں کو اپنی نگاہوں کا نشانہ بناؤں۔ یہ خیال ضرور رہتا تھا کہ کھیل آنکھوں ہی آنکھوں تک رہنا چاہئے۔ جب تک حضرت عاشق میں عرض تمنا کی جرأت پیدا ہو تب تک میں خوبصورتی سے انہیں دھتا بتا دیتی تھی۔ کئی بار اس بات پر میں اور راجندر خوب ہنسے بھی تھے۔ لیکن اس وقت تو شکاری کو اپنی جان بچانے کی فکر پڑ گئی تھی۔

میں کچھ دیر تک زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی" آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں"

"نہیں کرنی چاہئیں تو نہیں کروں گا" ہریش صاحب نے قدرے ہنس کر کہا" پھر اور باتیں کرو۔ لیکن کیا باتیں کروں گی؟ میں فلاسفی کے علاوہ کچھ نہیں جانتا' تم سینما کے علاوہ کچھ نہیں جانتیں۔ اور ابھی تک نہ سینما کی فلاسفی نکلی ہے نہ فلاسفی پر کوئی پکچر بنی ہے" ہریش نے زور سے ہنس کر بات بڑھائی۔

دو سال کی ملاقات میں یہ دوسری بار میں نے انہیں ہنستے دیکھا تھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ بڑی دیر میں ایک عجیب سا سوال کیا" آپ مسز ہریش کو کبھی یہاں نہیں لائے"

"وہ کسی کو دیکھنے نہیں جاتیں۔ لوگ ہی ان کے پاس آتے ہیں"

"اچھا میں ہی چلوں گی ..... کار نہیں تو رکشا تو آپ کی گلی میں پہنچ جائے گا" دراصل میں واہی تباہی بک رہی تھی۔ مسز ہریش کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ نیم خواندہ دقیانوسی قسم کی عورتیں ہیں۔ ان سے ملنے کی خواہش نہ پہلے تھی نہ اس وقت۔ لیکن کچھ بات کرنی تھی چاہے وہ کتنی ہی اوٹ پٹانگ اور بے تہذیبی کی کیوں نہ ہو۔

ہریش بولے" چلنا۔ لیکن گالیاں کھانے کے لئے بھی تیار رہنا۔ انہیں دماغی عارضہ ہے..... میں ان کا کم سے کم سامنا کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے دوپہر کا وقت باہر گزارتا ہوں' کبھی لائبریری میں کبھی تمہارے گھر"

بات آگے نہ بڑھ سکی۔ پڑوس کا لڑکا خون میں لت پت دیکھا تو لے کر ڈرائنگ روم میں آگیا تھا۔ ریکھا ایک اسکوٹر کی چپیٹ میں آگئی تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے سے بل بل کرکے خون بہہ رہا تھا۔ وہ رو بھی نہیں رہی تھی تقریباً غشی کی حالت میں تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے لیکن ہریش بجلی کی تیزی سے اٹھے انھوں نے ریکھا کے گلے کی ایک رگ دبا کر خون بند کیا اور مجھے تیزی سے ہدایتیں دے کر پٹی بندھوائی۔ راجندر شہر سے باہر تھے' انھیں ٹیلیفون نہ کرنے دیا۔ اسکوٹر کرائے پر لائے اور مجھے اور ریکھا کو ہسپتال پہنچایا۔ ڈاکٹر نے جب ریکھا کو چھٹی دے دی تبھی ہریش نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے دوسری بار سخت تعجب کا سامنا ہوا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی ہریش جیسا ڈھیلا ڈھالا آدمی وقت پڑنے پر اتنی چستی دکھا سکتا ہے۔ راجندر ایسے موقع پر بھاگ دوڑ تو بہت دکھاتے لیکن ان کی گھبراہٹ مجھ سے زیادہ ہوتی۔ اور ہریش تھے کہ ایسے اطمینان سے کام کر رہے تھے جیسے اس قسم کے حادثات سے روزانہ دو چار ہوتے۔

گھر واپس آکر میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا" کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں"

"شٹ اپ" ہریش نے کہا" بچی کی مدد کر کے میں نے کسی پر احسان کیا ہے؟..... اچھا اب میں چلتا ہوں تم بھی آرام کرو"۔

"لاحول ولا قوۃ! کیا عاشقی ہے اور کیا دوستی ہے اور کیا شرافت ہے! ستیاناس ہو اس فلسفے کا' اچھے خاصے آدمی کو ہونق بنا دیتا ہے۔ تمہاری بیوی بے چاری پاگل نہ ہو جائے تو اور کیا کرے" میں نے کہنا چاہا لیکن نہ کہہ سکی۔

ہریش کی بیوی کے جنون کی جا ہے جو وجہ ہو' مجھ میں جنون کے آثار ضرور پیدا ہو گئے تھے۔ زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ اپنی طبیعت کے خلاف' اپنے ضمیر اور اپنے استدلال سے لڑ کر کیسے عشق کیا جاتا ہے اس رات کو دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکی حالانکہ سونا بہت ضروری تھا۔ ریکھا اس وقت تو دواؤں کے اثر سے بے ہوش پڑی تھی' دوسرے دن درد کی وجہ سے چیخ پکار کرتی رہی۔ لیکن انسان جہاں اور بہت سی باتوں میں بے بس ہے وہاں نیند کے معاملے میں بھی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں امتحان کے دنوں میں کم بخت بھگانے پر بھی آجاتی تھی اور اب بلانے پر بھی نہیں آتی۔ رات بھر میں

خود کو ملامت کر تی رہی۔ آخر ہریش کس نقطہ نظر سے پیار کے قابل تھے؟ صحت ماشاءاللہ، مالی حیثیت سبحان اللہ، دماغی کیفیت معاذاللہ لیکن کیا کیا جائے ؎

کر نگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔

یکا یک محبت میں ساحل کے قریب ہی غوطے لگا رہی تھی کہ ایک اور صدمہ لگا۔ کچھ عرصے کے بعد ہریش نے بتایا کہ ان کا تقرر وکرم یونیورسٹی لکچرار کے عہدے پر ہوگیا ہے۔ کافی خوش نظر آرہے تھے کہہ رہے تھے کہ وہاں صیغہ فلسفہ میں بہت سے لوگ ریٹائرمنٹ کے قریب ہیں اور چار پانچ برس ہی میں ریڈر شپ مل جائے گی اور قسمت نے ساتھ دیا تو دس بارہ برس میں ہیڈ ہو جائیں گے۔ میں نے اندر کی آگ دبائی اور مسکرا کر مبارکباد دی۔ غصہ ضرور آرہا تھا کہ عجب بدھو آدمی ہے ایک بار تو مفارقت کی پریشانی آنکھوں میں دکھائی دیتی! آخر اس تین چار برس میں میں نے جو اشارے دیئے تھے انہیں سمجھنے کی تو کوئی بات نہیں ہے لیکن کیا ہوتا ہے؟ پانی میں کنکری پھینکو تو لہریں اٹھیں گی، ریت میں پتھر بھی پھینکو تو کیا ہوگا؟

روانگی کے وقت ریل پر بٹھانے راجندر اور میں دونوں گئے۔ اس وقت تنہا ہی جا رہے تھے، اہل وعیال کو کچھ عرصے کے لیے نہیں چھوڑنا تھا۔ راجندر پان لینے کے لیے گئے تو میں نے آہستہ سے کہا "خط تو بھیجو گے۔"

اس عرصے میں وہ میرے لیے آپ سے تم ہو گئے تھے۔

"کیوں نہیں" اسی سپاٹ لہجے میں مختصر جواب۔

"ہر ہفتے؟"

اب چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ بولے "یہ تو بہت زیادہ ہے۔ ہر مہینے کا وعدہ کروانا چاہو تو کر سکتا ہوں۔"

"جی چل گیا۔ بڑی مہربانی کریں گے اگر میں وعدہ کرنے کے لیے درخواست دوں اور آپ منظور فرمائیں۔ شاید کچھ جلی کٹی سناتی لیکن تبھی راجندر پان لے کر آگئے۔ دو منٹ کے بعد ٹرین چھوٹ گئی۔

وعدہ پابندی کے ساتھ پورا ہوا۔ ہر مہینے کی دسویں تاریخ کو وکرم یونیورسٹی سے خط آتا کافی لمبے خطوط ہوتے تھے۔ لیکن اپنا پن کہیں نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کسی نہ کسی مذہبی، کلچرل یا ادبی یا سماجی مسئلے پر ایک مقالہ سا چلا آتا تھا ہر مہینے۔ راجندر نے یہ خط کبھی پورے نہ پڑھے۔ ایک تو ہوتے ہی میرے نام تھے پھر اس خشک مغز سوزی کی طاقت راجندر میں تھی ہی کہاں۔ میں ضرور انہیں تین تین چار چار بار پڑھتی تھی اور آخری بار پڑھنے پر محسوس ہوتا تھا کہ یہ خط صرف میرے لیے لکھے گئے ہیں۔ اتنا کافی تھا میرے لیے۔

سات آٹھ برس کے بعد ان کے ایک خط سے دل میں ہیجان سا پیدا ہوا۔ اس میں انھوں نے اطلاع دی تھی کہ ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ خط معمول سے کچھ زیادہ لمبا تھا۔ زندگی اور موت کے مسائل پر پوری تھیسس تھی۔ دل میں پیدا ہونے والا ہیجان فلسفے کے طلاطم میں ڈوب گیا۔

ہاں راجندر کی وفات پر ان کا خط لمبا بھی تھا اور غیر فلسفیانہ بھی۔ اس کی ہر سطر سے ان کے دل کی تڑپ ابھر رہی تھی۔ کچھ کچھ ویسا ہی محسوس ہوا جیسا ریکھا کے چوٹ لگنے کے روز ان کے اپنے معمول کے خلاف تیزی طراری دکھانے پر ہوا تھا۔ لیکن اس وقت یہ باتیں کون سوچتا؟ راجندر کی موت نے مجھے بہت نڈھال کر دیا تھا۔

اس کے بعد ان کے خط کافی دیر دیر سے آنے لگے تھے کیونکہ میں جواب دینے میں بہت خشک ہو گئی تھی۔ ہو نہیں گئی تھی، بن گئی تھی پہلے جذباتی خط لکھتی۔ پھر اسے پھاڑ کر پندرہ بیس سطروں کا خشک خط لکھ دیتی۔ اسے ڈاک میں ڈالنے کے بعد پچھتاتی کہ پہلے والا مسودہ ہی کیوں نہ بھیج دیا۔ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تین چار مہینے میں ایک بار خط و کتابت۔

ڈیڑھ برس پہلے عجیب سی حرکت کر بیٹھی۔ دراصل میں بہت پریشان تھی۔ دفتر میں کچھ ایسی مشکل پڑ گئی تھی کہ ملازمت چھوٹنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ریکھا کا ایم۔ اے۔ فائنل کا سال تھا۔ بغیر ملازمت کے بچوں کی پڑھائی کس طرح چلتی؟ بچوں کے آگے اپنے دل کا غبار نکالنا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ انہیں فضول پریشانی ہوتی اور ان کا پڑھائی میں جی نہ لگتا۔ ہریش کو لکھ بیٹھی۔ کافی لمبا خط لکھا، اپنی ساری پریشانی بتائی حالانکہ یہ بھی لکھ دیا کہ مجھے امید ہے کہ ملازمت کا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا، تمہیں صرف دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے لکھا ہے۔

چوتھے پانچویں روز اس خط کا جواب آیا۔ صرف پندرہ بیس سطر، فلسفیانہ بحث کا نام و نشان نہیں۔ آخر میں لکھا تھا "پدما میری عمر پچاس برس کی ہوگئی ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جس طرح بیس برس پہلے تمہارا نام سن کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی اسی طرح اب بھی ہو جاتی ہے۔ میں تمہارے کام آنا چاہتا ہوں لیکن کچھ کہو تو، کس طرح کام آؤں۔"

خط پڑھ کر نشہ چڑھ گیا۔ دفتر کی چھٹی تھی۔ اسی حالت میں سو گئی۔ کھلا خط ہاتھ سے چھوٹ کر پلنگ پر آرہا۔ اسی عرصے میں ریکھا آئی۔ لڑکیوں کو ویسے بھی سراغ رسانی کا شوق ہوتا ہے۔ اس نے چپکے سے خط پڑھا اور اسے جیسے کا تیسا چھوڑ کر دبے پاؤں چلی گئی۔ لیکن اسی روز سے ہریش کا نام آنے پر اس کے چہرے پر شرارت آمیز تبسم دکھائی دینے لگا۔ اس نے ہیمنت کو بھی اپنا ہمراز کر لیا۔ تیس برس پہلے کی بات ہوتی تو ایسی بات

پھر ان بچے اور بچیاں کو کیا چاہا جاتے۔ اس وقت صرف مذاق اڑایا کرتے ہیں۔ زیادہ بہت مشکل ہوئی مجھے کھل کر بات کرنے کی۔ لیکن اشاروں کی شرارت کون روک سکتا ہے۔

تین روز پہلے ہریش میرے دفتر میں آئے تھے۔ اس شہر میں ثقافتی کانگریس ہو رہی ہے۔ اسی سلسلے میں آئے ہیں۔ بہت مقالات پڑھے ہیں کانگریس میں۔ ایک پیپر بھی پڑھا تھا۔ میرا مفصل حال پوچھنے لگے۔ میں نے نہ معلوم کس جھونک میں کہہ دیا بہت سے مسئلے ہیں۔ یہاں کیا کیا بتاؤں گی۔ اتوار کو کانگریس کی چھٹی ہے، دوپہر کو کھانے پر آنا تو سب کچھ بتاؤں گی۔"

آج اتوار ہے اور ہریش آ رہے ہیں۔ اب سوال ہے کون سے مسائل انہیں بتاؤں۔ انھوں نے میرے کام آنے کی بات کی تھی، کون سا کام ان سے لوں؟ دیا! خود ہی منہ مانگا وردان دینے آ رہے ہیں لیکن اب تو وردان ہی سے ڈر لگتا ہے۔

ڈر ہی ڈر ہے ہر طرف۔ غم سے ڈر، خوشی سے ڈر، موت سے ڈر، زندگی سے ڈر۔ میں نے ہریش کے استقبال کی تیاری شروع کر دی۔ کچن کی تیاری تو ریکھا کے سپرد تھی۔ میں نے اپنے کمرے سے پلنگ ہٹا کر باہر ڈال دیا۔ فرش پر ہلکے پیلے رنگ کی جا‌نماز بچھائی۔ دیوار پر راجندر کی بڑے سائز کی تصویر آویزاں کر دی اور اس پر تازہ پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ خود نہانے کے بعد سفید ریشمی ساڑھی پہن لی جیسی ہندو بیواؤں کو پہننی چاہئے۔ ہر طرح اپنے "تحفظ" کی تیاری کر لی۔

ہریش آئے۔ کھانے کے وقت خوب چہل پہل رہی۔ ریکھا اور ہیمنت نے خوب بک بک کی اور خوب چپکے لگے۔ کھانے کے بعد دونوں بہلنے سے باہر چلے گئے اور ہریش کو تاکید کر گئے کہ وہ تیسرے پہر چائے پینے سے پہلے واپس نہ جائیں۔ بڑی ہمدردی ہے میرے بچوں کو میرے ساتھ۔

تیسرے پہر تک کا وقت ہم دونوں نے بغیر پلنگ والے بیڈ روم میں گزارا۔ ہریش نے راجندر کی تصویر اور اس پر چڑھے ہوئے تازہ ہار کو دیکھا اور ان کے ہونٹوں کے گوشوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ بولے

"ہاں بھائی اب بولو کیا حال چال ہیں؟"

"سب ٹھیک ہے"۔ میں اس سے زیادہ کیا کہتی؟ لیکن مسئلے؟ کن مسئلوں کا ذکر کر رہی تھیں؟ معلوم نہیں اس روز کیا کہہ گئی۔ دراصل کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔"

"اچھا..... ٹھیک ہے۔"

کچھ پیار کی باتوں میں اور کچھ بالوشیوں میں دو گھنٹے گزر گئے۔ ریکھا اور ہیمنت واپس آ گئے۔ چائے بھی ہنسی خوشی کی فضا میں ہوئی۔ چائے پی کر ہریش چلے گئے۔ میں نے پلنگ اندر ڈال لیا اور منہ ڈھک کر لیٹ گئی۔

دن بھر بجلی غائب رہی تھی۔ شاید ریڈیو کھلا رہ گیا تھا۔ شام کو بجلی آئی تو یک لخت فراق کی غزل گائی جا رہی تھی۔

اے دوست محبت کی کچھ پوچھ نہ مجبوری
اک ہجر تری قربت اک ہجر تری دوری

افسانہ

خاموشی

قاسم خورشید

جب وہ اپنے سات سالہ پوتے کے ساتھ گاؤں لوٹا تو اس کا گھر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔

اس بار اس کا پورا پریوار پہلی مرتبہ گاؤں آیا تھا اس لئے بوڑھا بہت خوش تھا ضعیفی اور کمزوری کے باوجود وہ اپنے پوتے کو لے کر ہولی کا سامان خریدنے کی غرض سے شہر چلا گیا تھا۔ واپسی کے وقت اسے طریق میں معلوم ہوا کہ بلوائیوں نے بستی کے اس حصے کو جلا کر راکھ کر دیا ہے جہاں غریبوں کی جھونپڑیاں تھیں۔

اور جیسے ہی اس نے گاؤں میں قدم رکھا اس کے پاؤں کانپنے لگے بھنویں سکڑنے لگیں پھر وہ لاچار و بے بس اپنی جلی ہوئی جھونپڑی کو دیکھ کر آنسوؤں میں ڈوب گیا۔ جب اور آگے بڑھا تو ادھر ادھر پڑی ہوئی نعشوں کو دیکھ کر زمین پہ لوٹنے لگا۔ بچہ ان نعشوں میں اپنی ماں کو تلاش کر رہا تھا لیکن چہرے اس طرح جھلس گئے تھے کہ وہ کسی کو نہ پہچان سکا۔ اس نے روتے روتے پوچھا۔

ماں ۔ ماں " دادا جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بولو نا ماں کہاں ہے؟"

کوئی جواب دینے سے پہلے ہی بوڑھا بے ہوش ہو چکا تھا۔ پھر بھی بچہ اپنا سوال دہراتا جا رہا تھا۔ اچانک کہیں سے گولی چلنے کی آواز ابھری۔ اور وہ خاموش ہو گیا۔

ادی شاہنواز
تحریر: احمد منیر

فلمی دنیا کی کہانی۔ شاہنواز کی زبانی



شاہنواز، چالیس برس پہلے

روایت :- شاہنواز تحریر :- احمد منیر

ٹائم خراب کرنا تھا سو کر دیا

ہم حیدر آباد دکن کے رہنے والے ہیں۔ جہاں میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا۔ والد صاحب حیدر آباد فوج میں میجر تھے۔ وہ اصل میں میرے ماموں تھے، عادل میر۔ ان کے اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے متبنّیٰ بنایا تھا۔ انہی کے پاس میں پلا بڑھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں کم از کم گریجوایٹ ہو جاؤں تو وہ مجھے فوج میں اچھی جگہ دلوا دیں گے لیکن پڑھنے پڑھانے میں ہم کچے رہتے۔ زبردستی کا جیسے کہتے ہیں ڈنڈے بازی سے پڑھ لینا، ورنہ صورت حال یہ تھی کہ ناٹک کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ ناٹک میں کام کرنے کا شوق یوں ہوا کہ سکول میں ہم لوگوں نے ایک ڈرامہ کیا تھا۔ سمرنا فنڈ کے لئے۔ اس میں میرا کردار کامیڈین کا تھا۔ مرتضیٰ اشرف اس کے ڈائریکٹر تھے۔ غالباً شکسپیئر کے کسی ڈرامے کا اردو ترجمہ تھا۔ ٹھیک یاد نہیں۔ نام بھی یاد نہیں۔ یہ ڈرامہ شہر کے ایک ہال میں ہو رہا تھا۔ شہر میں اس طرح کے کئی ہال تھے۔ اس ڈرامے نے چلنا چلانا کیا تھا۔ اس کا اہتمام کرنے والا ایک سٹوڈنٹ تھا۔ اس بیچارے کا جو پیسہ لگا تھا وہ بھی مارا گیا۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے اس نے بعد میں بھی ڈرامے کئے۔ حالانکہ وہ سستی کا زمانہ تھا۔ پھر بھی وہ اپنا نقصان پورا نہ کر سکا۔ اس کے بعد وہ صاحب میدان سے ہٹ گئے۔

اس زمانے میں فلم بہت کم ہوتی تھی۔ ہندوستانی خاموش فلمیں کوئی خاص مقبول نہیں ہوتی تھیں۔ زیادہ تر انگریزی خاموش فلمیں آتی تھیں۔ کم از کم حیدر آباد میں یہی صورت حال تھی۔ ناٹک ہوا کرتے تھے۔

سمرنا فنڈ والے ڈرامے کے بعد یار لوگوں کو جب بھی ڈرامہ کرنے کی ضرورت ہوئی اور فنڈ اکٹھا کرنے کی بات ہوئی۔ وہ سب سے پہلے میرے پاس چلے آتے تھے۔ ڈراموں میں حصہ لینے والے دوسرے لوگ تو یا پاپولر نہ ہوئے۔ میں سب سے مقبول ہوا۔ جس کی وجہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں زیادہ تر کامیڈی رول کرتا تھا اور سوچتا کہ لوگ ہنستے کیوں ہیں۔ ڈرامے کے ڈائیلاگ کبھی یاد نہیں کرتا تھا۔ مطلب سمجھ جاتا تھا۔ اس کے مطابق جو جی میں آتا تھا، بک بک جاتا تھا اور تالیاں بج جاتی تھیں۔ پھر پردہ گر جاتا۔ اللہ اللہ

ست ۱۹۸۳ء

سلا۔

پھر تو یہ ہوگیا کہ سٹیج پلے کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ سٹیج پر کام ہو رہے ہیں۔ اس میں آکر تعلیم خراب ہوگئی تعلیم خراب ہونے کے بعد پڑھائی سے پیچھے رہ کر بھگوڑ بچ گئی۔ والدین نے سوچا کہ اب یہ تو ہاتھ سے جاتا نظر آرہا ہے۔ والد صاحب، وہی ماموں کے ایک دوست جیل کے آئی جی تھے۔ ان کو انہوں نے ایک چٹھی لکھی۔ آئی جی صاحب نے نوکر رکھ لیا۔ یہ نوکری ایسی رہی کہ ہم کوئی کام وام نہیں کرتے تھے۔ ڈیوٹی سے غائب ہی رہتے۔ ہم اس قسم کی ایکٹوٹی میں مصروف رہتے تھے کہ کسی کو ستایا جائے۔ کسی کو چھیڑا جائے۔ حس مزاح مجھ میں کچھ ضرورت سے زیادہ تھی۔ ہنستا رہتا تھا، ہنساتا رہتا تھا۔ لوگ ہنسانے کے لئے لغویات بکتے ہیں لیکن میں گالی گلوچ، بیہودہ، ننگے اور فحش قسم کا مذاق پسند نہیں کرتا تھا۔

جیل کی ملازمت کے دوران کبھی ٹھکانے سے نہیں بیٹھا۔ کبھی ایک جگہ نہیں رہا کسی کو چھیڑ دیا۔ کسی کو ستا دیا۔ شکایت ہو جاتی لہٰذا میں ٹرانسفر ہو جاتا تھا۔ پھر سوچا کہ اب ملازمت نہیں کروں گا جیل کی نو سالہ ملازمت کے دوران میں ریکارڈ کیپر رہا۔ وارڈ غیرہ رہا ڈپٹی جیلر رہا۔ میں نے سوچا خود کیوں نہ کوئی کام کروں لیکن سوال یہ تھا کہ خود کیا کام کرتا۔ کوئی کام آتا ہوتا تو کرتا۔ یار دوستوں نے مشورہ دیا کہ جس چیز سے تمہاری تعلیم خراب ہوئی۔ اس چیز سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرو لیکن پھر گولڈ سگریٹ میں نوکری کر لی۔ وہیں حیدرآباد میں اور ہمارے عزیزوں کا سگریٹ کا کارخانہ تھا۔ دو تین مہینے بعد یہ بھی چھوڑ دی کہ یہ گڑبڑ والی بات ہے کہ عزیز داری ہیں، دوستی میں نوکری کرنا مناسب نہیں۔

پھر یہ دھندہ شروع کیا کہ بمبئی سے موٹریں خرید لاتا اور حیدرآباد میں فروخت کر دیتا۔ اس زمانے میں سیکنڈ ہینڈ موٹر (کار) تین سو میں مل جاتی تھی۔ اچھی چالو جسے 'آن روڈ' کہتے ہیں۔ شاندار موٹریں ہوتی تھیں۔ ایک موٹر سو روپیہ منافع پہ بک جاتی تھی۔ کبھی پچاس بچ جاتے تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی بات تھی۔ تو جناب اس زمانے کی آمدنی کے لحاظ سے ہم سیٹھ تھے۔

بمبئی میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو حیدرآباد میں ہمارے ساتھ سٹیج پر کام کرتے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا تم بیوقوف آدمی ہو۔ آواز تمہاری ماشاءاللہ اچھی ہے۔ اچھے خاصے آدمی ہو۔ تم تو وہ دھندہ کرو جس کی وجہ سے تمہارے کو موٹروں کے دھندے میں آنا پڑا۔ میں نے سوچا مشورہ تو اچھا ہے۔ پہلے بھی یار لوگوں نے بھی مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے پتہ بتایا کہ دادر میں ہریش چندرا آرٹ پروڈکشن کی فلم شروع ہونے والی ہے۔ وہاں چلے جاؤ لیکن کچھ سفارش ہونی چاہیئے۔ میں نے کہا سفارش نہ پہلے میرے کام آئی ہے نہ اب آئے گی۔ ان میں ایک مجید بھی تھا۔ اس نے مجھے ہریش چندرا آرٹ پروڈکشن کا پتہ بتایا۔ لاہور کا تھا۔ بمبئی میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اس نے بھی میرے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا چلو بھائی جس کے نصیب میں ہوگا اسے کام مل جائے گا۔

ہم ہریش چندرا آرٹ پروڈکشن پہنچے تو وہاں ایس ایم یوسف بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پہلی نظر میں ہی مجھ سے متاثر سے ہوگئے۔ پوچھا تم کہاں تھے، کیا کرتے تھے۔ میں نے بتایا شوقیہ سٹیج پہ کام کرتا تھا۔ انہوں نے کہا آپ کو ولن کا رول دیا جاتا ہے۔ ہریش چندرا پروڈکشن کے مالک چندرا راؤ قادم بھی وہاں موجود تھے۔ وہی اس فلم کے ہیرو اور پروڈیوسر تھے۔ ہیروئن مس فیروزہ تھی۔ ایس ایم یوسف ڈائریکٹر تھے۔ فلم کا نام 'بھارت کا لال' تھا۔ میں نے کہا صاحب وہ دینے لینے کی بات۔ کہنے لگے دینے لینے کی بات یہ ہے کہ شروع میں ہم کسی کو زیادہ دے نہیں سکتے۔ اس لئے آپ کو ۷۵ روپے ملیں گے۔ میں نے کہا مجھے منظور ہے۔ ۷۵ روپے اس زمانے میں بہت ہوتے تھے۔ بعد میں ایک موقع پر میں نے کہا کہ ۷۵ روپے بہت کم تنخواہ ہے تو یوسف صاحب کہنے لگے۔ ۷۵ روپے تو میری تنخواہ ہے حالانکہ میں ڈائریکٹر ہوں۔ اس زمانے میں پندرہ ہزار میں پکچر بن جاتی تھی اور ڈھائی تین مہینے میں مکمل ہو جاتی تھی۔ زیادہ ہوا تو چار ماہ لگ گئے۔ ادھر فلم ختم ادھر آرٹسٹوں کو چھٹی۔ اس زمانے میں زیادہ تر سٹنٹ فلمیں بنتی تھیں۔ اس لئے آؤٹ ڈور میں ہی کام ہوتا تھا۔ بمبئی میں بہت تیز بارش ہوتی تھی۔ چنانچہ بارش کے زمانے میں بھی چھٹیاں ہوا کرتی تھیں۔

ہاٹ بلڈ عرف 'بھارت کا لعل' ۱۹۳۶ء میں بنی تھی۔ تین مہینے میں فلم مکمل ہوگئی اور ہماری چھٹی۔ یہ فلم کچھ چلی نہیں۔

اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں چندرا راؤ نے 'دولت' کے نام سے ایک اردو فلم اناؤنس کی۔ اس میں بھی وہ خود ہیرو تھے۔ ان کا بھائی ہریش چندرا راؤ بھی تھا۔ وہ سٹنٹ فلموں کا ہیرو تھا۔ ڈائریکٹر ایس ایم یوسف تھے۔ میں پیراماؤنٹ فلم کمپنی میں ملازم ہوگیا تھا۔ جن لوگوں کے پاس سٹوڈیو ہوتے تھے وہ پرمانینٹ ملازم رکھتے تھے۔ جن کے پاس سٹوڈیو نہیں ہوتے تھے ان کے یہاں کنٹریکٹ کی بنیاد پہ کام ہوتا تھا۔ پیراماؤنٹ میں مستقل ہوتے ہی میری تنخواہ

فلمی دُنیا کے حاجی دراصل کمرشل حاجی ہیں

۱۲۵ روپے ہوگئی۔ اس تنخواہ کو حاصل کرنے والے اپنے کو بہت بڑا آدمی تصور کرتے تھے۔

میری مستقل ملازمت سے ہرلیش چندرا والوں کو چبھن سی ہوئی۔ یوسف نے مجھ سے کہا وہ کمپنی تو اچھی نہیں ہے۔ اس کی پکچر ریکچر بھی تو ٹھیک نہیں ہوگی۔ تم میرے پاس رہو گے تو فائدہ ہوگا میرے پاس تمہارے لئے بہت اچھا رول ہے بہت "تگڑا" رول ہے۔ تو صاحب میں چلا آیا ان کے پاس۔ ایسا میں نے دوستی یاری میں کیا۔

یہ فلم بھی تین ماہ میں مکمل ہوگئی اور ہم سب بیکار۔ 'دولت'، 'بھارت کا لعل'، کی نسبت بہت زیادہ چلی۔ پھر صاحب ہرلیش چندرا راؤ اور یوسف نے مل کر ترکیب کی۔ وہ دونوں واڈیا موودی ٹون میں چلے گئے میں کہیں اور جا کے لگ گیا۔ اس دوران ان دونوں نے پھر مجھے ڈھونڈا اور کہا یار چلے آؤ۔ واڈیا میں بہت چانس ہے میں نے کہا میں جس کمپنی میں کام کر رہا ہوں۔ اس کی فلم ختم ہو رہی ہے۔ ختم ہوجائے تو آجاؤں گا۔

واڈیا میں مجھے 'رنگیلا مزدور' میں ولین کا کردار ملا ڈھائی سو یا تین سو روپے میری تنخواہ تھی۔ 'رنگیلا مزدور' سوشل کاسٹیوم پکچر تھی۔ یہ فلم اچھی چلی۔ فلم مکمل ہوتے ہی میں بھاگ گیا۔ حالانکہ واڈیا والوں نے مجھے کہا بھی کہ پرمانٹ لسٹ پرآجاؤ۔ لیکن میں تیار نہ ہوا یوسف نے مجھ سے کہا کہ ملازمت چھوڑنے کے نتیجے میں تم پریشان ہوجاؤ گے۔ میں نے کہا "گولی مارو میں نہیں رہتا یہاں" وہاں سے چلے آنے کے بعد دو چار دن اِدھر اُدھر ٹہل کے وطن چلے گئے۔

اس دوران انہوں نے ایک اور پکچر شروع کی۔ کیونکہ یوسف اور ہرلیش چندرا پرمانٹ لسٹ پر تھے۔ پکچر کاسٹیوم تھی۔ سٹوری پر کام شروع ہوا تو مسٹر واڈیا جو مجھ سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے کہا کہ ٹائٹیل رول کے لئے شاہنواز ٹھیک رہے گا۔ پورے گروپ نے میری مخالفت کی۔ کیونکہ جب میں واڈیا میں تھا تو ان لوگوں کی سنتا نہیں تھا۔ ان لوگوں نے واڈیا سے کہا کہ اس رول کے لئے فلاں آدمی ٹھیک رہے گا۔ واڈیا نے کہا کہ یہ عجیب لوگ ہیں، میں اونچے آدمی کے لئے کہتا ہوں۔ یہ چھوٹے آدمی کی بات کرتے ہیں۔ وہاں ایک خاں صاحب تھے، اس سے واڈیا نے پوچھا، شاہنواز کہاں ہے۔ اس نے کہا "صاحب، وہ تو اپنا ملک گیا ہوا ہے"۔ سیٹھ نے اس سے میرا پتہ مانگا۔ جس بلڈنگ میں میں رہا کرتا تھا۔ خاں صاحب نے اس بلڈنگ کے ہوٹل والے سے میرا پتہ پوچھ کر سیٹھ کو دیدیا۔ سیٹھ نے آرڈر کیا کہ اس پتہ پر شاہنواز کو ٹیلی گرام کرو۔ ان لوگوں نے ٹیلی گرام کی بجائے پوسٹ کارڈ لکھ دیا اور اس میں لکھ دیا صاحب اس کو ٹیلی گرام سمجھیں اور فوراً بمبئی آجائیں۔ مجھے بمبئی آنا تو تھا ہی۔ میں چلا آیا۔

واڈیا نے کہا تم کدھر گیا تھا، میں نے کہا حیدرآباد، کہنے لگا یار پتہ تو دے کر جانا تھا۔ میں نے کہا پتہ دے کر کیا کرتا۔ بولا عجیب آدمی ہو۔ میری پکچر التوا میں پڑی ہوئی ہے۔ چلو شروع ہو جاؤ۔ 'جنگل کنگ' شروع ہو رہی تھی۔ مارا ماری والی فلم تھی۔ فوراً میری شرٹ کا ناپ لیا گیا اور دوسرے لباسوں کی تیاری کا حکم دے دیا گیا کمپنی وہ بہت بڑی تھی۔ چند گھنٹوں میں میری ساری چیزیں تیار ہوگئیں اور شوٹنگ شروع ہوگئی۔

دراصل ٹاکی (بولتی) فلموں کا زمانہ پورے طور پر آچکا تھا۔

اسی لئے وہ لوگ جو خاموش فلموں میں کام کرتے تھے اور ٹاکی میں بول نہیں سکتے تھے، وہ ناکام ہو گئے۔ خاموش فلموں میں اس کی قدر ہوتی تھی جو دوڑنا، بھاگنا، کودنا یا لڑائی مار کٹائی اچھی طرح کر سکتا ہو۔ اب جو زمانہ آیا ٹاکی (بولتی) فلموں کا تو مانگ ہو گئی بولنے والوں کی۔ جو بول سکتا تھا وہ ہو گیا بادشاہ۔ جو بول نہیں سکتا تھا وہ وزیر بھی نہیں۔ بلکہ ایکسٹرا کی لائن میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ میری فلموں میں ایسے لوگ ایکسٹرا میں کھڑے ہونے لگے جو کسی زمانے میں ہیرو ہوا کرتے تھے۔ حالانکہ انھیں ایکسٹرا میں نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہ ہیرو رہ چکے تھے۔ انھیں کوئی اور دھندا کر لینا چاہئے تھا۔ مثال کے طور پر ایک صاحب تھے شیراز۔ سٹنٹ فلموں میں ہیرو آیا کرتا تھا۔ اہل زبان نہیں تھا لیکن بول لیتا تھا۔ ٹاکی فلموں میں ایکسٹرا آتا رہا۔ اسی طرح وٹھل تھا۔ وہ اپنے زمانے میں سٹنٹ ... تھا۔ اسے انڈین ڈگلس کہتے تھے۔ ٹاکی فلم میں ... اس کو ایک معمولی سا رول کرتے دیکھا تو کہا۔ یار تم تو بادشاہ تھے اپنے زمانے کے۔ اس نے کہا کہ وقت گذرتا نہیں تھا، اس لئے یہ کام کر رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ وقت گذرنے کی یہ یونہی کہہ رہا ہے۔ دراصل یہ کچھ کمانے کی فکر میں آئے ہیں کہ شائد ایک دو پکچروں میں اچھا رول مل جائے۔ لیکن یہ جمے نہیں۔ ایک دو پکچروں کے بعد دکھائی نہیں دیئے۔ میں تو ٹاکی فلموں میں خوب چلا، جم گیا۔ ویلن کا رول کرتا رہا۔

ایس ایم یوسف 'کہاں ہے منزل' بنا رہے تھے۔ انھوں نے کہا یار اس میں رول ایسا ہے کہ تمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ رول مہاگورو کا تھا۔ یعنی بدمعاشوں کے گروہ کا۔ بہت اونچا رول تھا۔ اس میں جو بھی سامنے آیا ٹک نہیں سکا تھا۔ زبردست ڈائیلاگ تھے۔ بہت بڑے بڑے سیٹ لگے تھے۔ لیکن یہ فلم کوئی خاص چلی نہیں۔ فلم مکمل ہوئی تو ہماری بھی چھٹی۔

بعد میں پھر چندر راؤ قادم نے پکڑ لیا۔ "آؤ یار پکچر بناتے ہیں۔" میں نے کہا مال کتنا ہے۔ کہنے لگا پندرہ سو روپے۔ میں نے کہا اس سے کاہے کی پکچر بناؤ گے۔ کہتا ہے، یار کوشش کریں گے تو بس آ جا میرے پاس۔ میں نے کہا آ تو جائیں گے پر کھائیں گے کیا؟ اس نے کہا اسی میں کوشش کریں گے۔ شروع ہو گئے۔ سستے سے سستا ایک سٹل فوٹوگرافر لے لیا۔ دیکھئے اس زمانے میں کیسی فلمیں بنتی تھیں۔ ہم نے اس فوٹوگرافر سے کہا یار دس روپے لے لے اور سٹل فوٹوگرافی کر دے۔ اچھا خاصا فوٹوگرافر تھا۔ کیمرہ اس کا تھا فلم ہم نے ڈالو دی اور سٹوڈیو میں جا کے ایک سیٹ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور مختلف ایکشنوں کے ساتھ تصویریں اتروا لیں۔ یہ سیٹ بھی کسی اور کی فلم کا لگا ہوا تھا۔ وہ تصویریں چندر راؤ نے اخبارات کو ریلیز کر دیں اور ساتھ لکھا چندر راؤ کی آنے والی پکچر۔ حالانکہ تھا کچھ بھی نہیں۔ نہ فلم کا وجود تھا نہ کوئی سٹوری تھی۔ میں نے کہا یار یہ کیسی پکچر ہے۔ نہ سٹوری ہے نہ ڈائیلاگ۔ چندر راؤ نے کہا ایسے ہی چلتا ہے۔ تم دیکھو تو سہی کیسی پکچر بنتی ہے۔

ان تصویروں کو پرکاش پکچرز والوں نے دیکھا تو بڑے دہشت زدہ ہوئے کہ یہ تو بڑی زبردست فلم ہو گی۔ خاص طور پر اس میں جو ویلن ہے وہ بہت اونچے قسم کا معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے میری تلاش شروع کر دی۔ میں کسی کو اپنا پتہ نہیں بتاتا تھا لیکن ان لوگوں نے ڈھونڈتے ڈھانڈتے آخر مجھے پکڑ لیا۔ جیسے آپ نے آتش فشاں میں انٹرویو کے لئے مجھے ڈھونڈ لیا ہے۔ ایسے ہی انھوں نے پکڑ لیا۔ میں ان کے یہاں پہنچ گیا، اور کہا، کچھ ہے بھی یا خواہ مخواہ کا ڈھونگ ہی ہے۔ ان لوگوں نے میری بڑی آؤ

بھگت کی۔ وہ "سردار" بنا رہے تھے۔ ہیرو جنیت تھا۔ میں نے کام شروع کر دیا۔

اس دوران وہ جو چندر راؤ کی سٹلیں اخبارات میں چھپی تھیں انھیں دیکھ کے پنجاب سے ایک سکھ ڈسٹری بیوٹر آ گیا۔ اسے وہ تصویریں بڑی پسند تھیں۔ ڈنڈے بازی کا زمانہ تھا۔ وہ تصویریں بھی ایسی ہی تھیں۔ سردار جی نے پوچھا، کیا سٹوری ہے۔ سٹوری کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اب ضرورت یہ ہوئی کہ "جنگ آزادی"، کی کچھ سٹوری چندر راؤ بنا کے سنا دے۔ کچھ میں سنا دوں۔ یونہی بیٹھے بیٹھے ہم نے سردار جی کو سٹوری سنا دی۔ حالانکہ سٹوری کا وجود ہی نہ تھا۔ پورے پنجاب سرکٹ کا پندرہ ہزار میں سودا ہو گیا۔ پانچ ہزار روپے چندر راؤ کو ایڈوانس مل گیا۔ اسی طرح اس نے کچھ ساؤتھ (جنوبی ہند) سے لے لیا اور پکچر شروع کر دی۔ "سردار" بھی مکمل ہو گئی اور یہ فلم بھی بن گئی اور ہماری پھر چھٹی اور ہم پھر بڑے آدمیوں کی طرح گھومنے لگے۔

شروع سے یہ میری عادت رہی ہے کہ بے کار ہوا تو کسی سٹوڈیو تو نہیں گیا، لیکن ایک روز میں ہرش چندر و آرٹ پروڈکشنز گیا تاکہ "جنگ آزادی" کی سٹلیں تو لوں۔ باتوں باتوں میں میں نے چندر راؤ سے کہا۔ وہ تصویریں تو لاؤ البم بنا لیں۔ اتنے میں ہرش چندر اور یوسف آ گئے۔ میں ان کے گروپ ورگ میں نہیں تھا۔ انھوں نے مجھے طنز یں کرنی شروع کیں اتنے میں آغا جانی آ گیا کہتا ہے ارے یار تم یہاں بیٹھے ہو مجھے تمھارے گھر کا پتہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تین گھنٹے ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا صاحب کیا تکلیف ہے آپ کو کہنے لگے یار بمبے ٹاکیز والے تجھے یاد کر رہے ہیں فوراً چل کے ملو۔ اس زمانہ میں چائے کا کپ دو پیسے میں ملتا تھا۔ یہ سن کر میں نے آغا جانی سے کہا۔ صاحب میری جیب میں اس وقت چار آنے ہیں اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو چائے پلاؤں تو دو پیسے کی چائے آپ پی لیجئے۔ دو پیسے کی چائے میں پی لیتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں آپ کی خاطر نہیں کر سکتا۔ گھر بھی واپس جانا ہے۔ آغا جانی نے کہا نہیں نہیں ایمان سے شاہنواز بھائی میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بمبے ٹاکیز والے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ وہاں میرا کیا کام وہاں تو ایسا آدمی چاہیئے جو پندرہ بیس برس لندن میں، مغربی جرمنی میں رہا ہو یا کم از کم گریجویٹ ہو۔ میں تو صاحب نہ لندن گیا نہ مغربی جرمنی اور نہ گریجوایٹ ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ وہاں میری کیا ضرورت ہے۔ آغا جانی کیوں مجھے مار کھلانے کے چکر میں ہو وہ پھر قسمیں کھانے لگا۔ ایس مکرجی آپ کے انتظار میں ہیں۔

میں نے اسے کہا، یار اس وقت تو میری حالت بھی اچھی نہیں۔ ان دنوں بمبئی میں پاجامہ کوٹ چلتا تھا۔ میں زیادہ تر وہی پہنتا تھا۔ میں نے آغا جانی سے کہا۔ اس بُری حالت میں بمبے ٹاکیز کیسے جاؤں۔ اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ آغا جانی نے بمبے ٹاکیز میں ٹیلی فون کیا۔ اور انھیں بتایا کہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے شاہنواز مل گئے ہیں۔ اب یہاں میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ مکرجی نے جواب دیا انھیں میرے پاس فوراً بھیج دو۔ آغا جانی ٹیلی فون پر ہاتھ رکھ کے مجھے کہتا ہے۔ صاحب تمھارے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے وہی دلیل دی کہ میں اس وقت مناسب لباس میں

نہیں ہوں۔ آغا جانی نے انھیں کہا۔ صاحب وہ کہتا ہے مناسب لباس میں نہیں ہوں، اس وقت کیسے آسکتا ہوں۔ اُدھر سے جواب ملا۔ ہم اس کا ڈریس دیکھنا نہیں مانگتا۔ ہم اُس آدمی کو دیکھنا مانگتا۔

میں نے سوچا جیسے ٹاکیز والے ایسی فلمیں کیوں دیکھتے ہیں کیونکہ جن فلموں میں ہم کام کرتے تھے وہ چھکڑا قسم کی فلمیں تھیں۔ جب کہ ان کا معیار بڑا اونچا تھا۔ سوشل فلمیں بناتے تھے۔ اس سوچ نے مجھے پریشان سا کر دیا۔ تب آغا جانی نے بتایا کہ جیسے ٹاکیز والوں کو ویلن کی ضرورت تھی اور وہ خود چلا گیا۔

ایس مکرجی نے اسے کہا کہ تم ویلن کا کام نہیں کر سکو گے اور نہ ہی تم ویلن دکھائی دو گے۔ کامیڈین سنجیدہ ہوگا تو مزا نہیں آئے گا۔ اس پر آغا جانی نے انہیں کہا تھا۔ صاحب جس قسم کا ویلن آپ لوگوں کو چاہیئے ویسا تو پورے بمبے میں ایک ہی آدمی ہے۔ انہوں نے کہا وہ کون ہے ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم اسے جا کے لاتے کیوں نہیں۔ یہ واقعہ سنا کے جب آغا جانی نے پھر زور دینا شروع کیا اور ساتھ ہی ایک اور صاحب کہنے لگے۔ تم ضرور جاؤ۔ بہت چانس ہے۔ میں نے کہا، یار میں کیسے جاؤں۔ میرے پاس جانے آنے کا کرایہ ہی نہیں۔ ایک شیرازی صاحب تھے وہاں، وہ بولے۔ یہ میرا پاس آپ لے لیجئے بعد میں واپس کر دیجئے گا جب بخت کی بات ہوتی ہے نا صاحب تو پھر ایسے ہی ذرائع پیدا ہوتے ہیں۔ وہی شیرازی بعد میں کراچی کے ایسٹرن سٹوڈیوز میں لیبارٹری انچارج ہوا۔



۱۹۵۰ء ـــــ شیخ اقبال، شاہنواز، نجمہ ـ فلم "ہماری بستی" (اردو)

سخن در سخن

خامہ بگوش کے قلم سے

و فیض صاحب، احمد فراز کے رنگ میں شعر کہتے ہیں :
و بینڈ بجانا، نثری نظم لکھنے سے بہتر ہے۔

لیجیے آخر کار فیض صاحب وطن واپس آگئے

؎ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

پاکستان فیض صاحب کا گھر ہے اور ہر مسافر اپنے گھر واپس آ سکتا ہے، لیکن ہم اس بات سے بے حد پریشان ہیں کہ اُن لوگوں کا کیا ہوگا جنہوں نے فیض صاحب کی ملک بدری، در بدری اور جلا وطنی کے غم میں اپنی صحت خراب کر لی تھی۔ پریس کلب ہو یا ریس کلب، جہاں چار دانشور مل بیٹھتے تھے یہی مسئلہ زیر بحث ہوتا تھا کہ فیض صاحب پر بڑا ظلم ہوا ہے، انہیں ناگفتہ بہ حالات میں وطن چھوڑنا پڑا۔ خود فیض صاحب نے بھی۔ مرے دل مرے مسافر، ہوا پھر سے حکم صادر، کہ وطن بدر ہوں ہم۔ جیسی باتیں کہہ کر مسئلے کی سنگینی میں اضافہ کیا۔ فیض صاحب کو وطن واپس آنا ہی تھا تو کم از کم اُن لوگوں سے مشورہ کر لیا ہوتا جنہوں نے اُن کی "جلا وطنی" پر نظمیں لکھیں اور دستے کے دستے مضمون لکھ ڈالے تھے۔ کیا یہ سب نظمیں اور یہ سب مضمون بیکار جائیں گے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان تحریروں کو عنوان بدل کے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ "جلا وطنی" کی بجائے "جلا فراز" کر دیا جائے کہ آج کل احمد فراز بھی اسی ملک بدری، در بدری اور جلا وطنی کا ڈنکا بجا رہے ہیں۔

کئی سال تک ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے فیض صاحب میں بعض تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ایک تبدیلی کا احساس تو انہیں خود بھی ہے۔ ۲۸ نومبر کو وہ لاہور پہنچے تو اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا، "ہم پر بڑھاپا آگیا ہے"۔ شاعری پر بڑھاپا آنے کی بات ہوتی تو

ہم مان لیتے کہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے، لیکن گزشتہ جمعرات کو پریس کلب کے جلسے میں انہیں ہم نے دیکھا تھا، ہمیں تو بڑھاپے کے آثار دور دور تک دکھائی نہیں دیتے بلکہ ہمارے خیال میں تو فیض صاحب اپنے بعض معاصرین مثلاً مرزا ظفر الحسن اور سید سبط حسن سے زیادہ جوان نظر آتے ہیں۔

فیض صاحب میں جو سب سے اہم تبدیلی آئی ہے وہ یہ ہے کہ اب اخباروں میں اُن کے بیانات اس طرح چھپتے ہیں جیسے یہ کسی سیاسی لیڈر کے بیانات ہوں۔ بیانات کیا ہوتے ہیں ابھی جامعی گل افشانی گفتار ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فیض صاحب شاعر نہیں، سیاستداں ہیں۔ ہمیں تو کچھ ایسا نظر آ رہا ہے کہ اگر یہی عالم رہا تو فیض صاحب نگار مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے کہ اب یہی واحد سیاسی پارٹی ہے جو حملہ آبادی ادبی دستاویزی سے محفوظ ہے۔

فیض صاحب کی تشریف آوری کی خبر جب ہم نے سنی تو سوچا کیوں نہ اُن کا ایک انٹرویو لے لیا جائے کہ ہمارے اخبار میں شاعروں، ادیبوں کے انٹرویو چھپتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی قیام گاہ پر یوں کیا تو اُن کے میزبان نے کہا، فیض صاحب بہت مصروف ہیں، وہ انٹرویو کے لیے وقت نہیں دے سکتے۔ ہم نے جب اصرار کیا تو میزبان نے مشورہ دیا کہ آپ فیض صاحب کے بجائے مرزا ظفر الحسن کا انٹرویو کیوں نہیں لے لیتے کہ ان کی زبان بھی فیض ترجمان ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ مرزا صاحب جو کچھ کہیں گے ہمیں معلوم ہے، ہم تو فیض صاحب کے خیالات سے براہ راست استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ میزبان نے بتایا کہ فیض صاحب ماسکو سے فی الحال خالی ہاتھ آئے ہیں۔ ان کے خیالات اُن کے دوسرے سامان کے ساتھ بعد

میں آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ میزبان کی خواہش نہیں تھی کہ ہم فیض صاحب سے ملیں۔ اس کا ہمیں بے حد افسوس ہوا اور کف افسوس ملتے ملتے ہماری آنکھ لگ گئی۔ . . . اتنے میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ فیض صاحب ہمارے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہم سوال کر رہے ہیں اور وہ جواب دے رہے ہیں۔ سارہ سارہ گفتگو نوار رند میں ہوتی جا رہی ہے۔ "نوار رند" کی اصطلاح ہم نے ایران کی سیاحت کے دوران سنی تھی۔ کسی آواز کو محفوظ کرنا "نوار رند" کہلاتا ہے۔ "نوار" ٹیپ کو کہتے ہیں۔ یہ وہی لفظ ہے جو اُردو میں "نواڑ" ہوگیا ہے اور "نواڑ" وہی چیز ہے جسے بہادر شاہ ظفر نے اپنے ایک شعر میں اس طرح استعمال کیا ہے:

ہوا ہے کل جو مرا خط پلنگ پہ گم
سو بارے آج وہ پایا نواڑ میں سے خط

اس غزل کا مطلع بھی خوب عمدہ ہے

لکھا جو تو نے ہم کو اخبار میں سے خط
تو کوئی بھی لکھے گا بہار میں سے خط

معاف کیجئے، جملہ معترضہ بہت طویل ہوگیا۔ ہاں تو فیض صاحب کی جو گفتگو ہم نے نوار رند کی تھی، وہ آپ بھی سن لیجئے:

ہم : بڑی خوشی کی بات ہے کہ بالآخر آپ تشریف لے آئے۔ آپ نے بڑی زحمت فرمائی۔

وہ : زحمت کی کوئی بات نہیں ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں

ہم : کیا اب مستقل قیام پاکستان ہی میں رہے گا

وہ : بستر لپیٹ کے اُدھر سے منظوری مل گئی۔

ہم : اُدھر سے؟

وہ : ہاں بھئی اُدھر سے۔ غالب نے بھی تو کہا تھا۔ کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے۔

ہم : معاف کیجئے گا بات سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ : بھئی ہم شاعر لوگ استعاروں میں بات کرتے ہیں

ہم : یہ استعارہ کیا ہوتا ہے؟

وہ : آپ انٹرویو لینے آئے ہیں یا تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں۔

ہم : اگر دونوں کام ہو جائیں تو اچھا ہے۔

وہ : کوئی بات پوچھنی ہے تو پوچھئے، وقت ضائع نہ کیجئے۔

ہم : اچھا تو ایک ادبی مسئلہ حل کر دیجئے۔ اس سال الواہ گرم تھی کہ نوبل پرائز آپ کو ملے گا لیکن کسی اور کو مل گیا۔ اس کا سبب کیا ہے؟

وہ : سبب ظاہر ہے کہ یہ انعام بعض مصلحتوں کے تحت دیا جاتا ہے۔ خصوصاً ادب اور عالمی امن کے سلسلے میں بڑی دھاندلی ہوتی ہے۔

ہم : آپ کو کون سا انعام مل رہا تھا۔ ادب کا یا عالمی امن کا۔

وہ : اصولاً تو دونوں ملنے چاہئے تھے پھر کوئی ایک بھی مل جاتا تو ٹھیک تھا۔

ہم : کیا اُمید کی جائے کہ اگلے سال یہ انعام آپ کو ملے گا۔

وہ : اُمید پر تو دنیا قائم ہے۔

ہم : اگر تلافی کے طور پر آپ کو ادامٹر ریگولڈ کا انعام دیا جائے تو کیا مار رہے گا۔

وہ : نہیں بھئی گولڈ کا انعام ہم نہیں لیں گے۔ اول تو رقم بہت کم ہوتی ہے اور پھر اسے کئی متعدد ادیبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

ہم : اس سال اکیڈمی آف لیٹرز بھی انعامات تقسیم کر رہی ہے اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

وہ : اچھا، اکیڈمی انعامات بھی دے گی ہم نے تو سنا تھا کہ یہ ادیبوں کی ڈائریکٹری چھاپنے کے لئے بنائی گئی ہے۔

ہم : اکیڈمی ہر سال ادیبوں کی ایک کانفرنس بھی کرتی ہے۔ اس مہینے یہ کانفرنس پھر ہو رہی ہے کیا آپ اس میں شرکت کریں گے۔

وہ : دعوت ملی تو سوچیں گے

ہم : آپ کو دعوت ضرور ملے گی کیونکہ آپ ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں اور کانفرنس میں اخباری کالم نگار اور مراسلہ نگار تک بلائے جاتے ہیں

وہ : اچھا تو آپ کو معلوم ہے کہ ہم ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں۔

ہم : جی ہاں "لوٹس"، ہماری نظر سے گزرا ہے بہت اچھا رسالہ ہے۔ یہ تو فرمائیے کہ کیا پاکستان کے قیام کے دوران بھی آپ اس کے ایڈیٹر رہیں گے۔

وہ : ہاں نگرانی ہماری ہی رہے گی، باقی کام احمد فراز کرے گا۔

ہم : کیا وہ انگریزی کے رسالے کو ایڈٹ کرے گا۔

وہ : جب وہ اُردو میں ہمارے رنگ میں شعر کہہ سکتا ہے تو انگریزی میں ہماری طرح رسالہ کیوں نہیں ایڈٹ کر سکتا۔

ہم : اچھا تو آپ کو معلوم ہے کہ فراز آپ کے رنگ سخن کو چمکا رہا ہے۔

وہ : یہ تو معلوم نہیں کہ چمکا رہا ہے یا دھندلا رہا ہے لیکن میں نے اسے بارہا کہا ہے کہ میاں اب تم خاصے سمجھدار ہو گئے ہو، شاعری میں اپنا رنگ پیدا کرو۔ مگر وہ کہتا ہے فیض صاحب اب تو میں اسی رنگ میں کہوں گا، آپ اپنے لئے کوئی اور طرزِ سخن ایجاد کر لیجئے۔

ہم : تو پھر آپ نے کیا سوچا؟

وہ : ابھی تک تو کچھ نہیں سوچا لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا ہے کہ کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا

ہم : وہ واقعہ کیا ہے؟

وہ : پچھلے دنوں کینیڈا میں ایک مشاعرہ ہوا تھا فراز بھی وہاں موجود تھا۔ پہلے اس نے کلام سنایا اور پھر میں نے۔ سامعین میں سے ایک شخص نے باآوازِ بلند کہا۔ "فیض صاحب۔ آپ فراز کے رنگ میں خوب کہتے ہیں"

ہم : شاعری کی بات چلی ہے تو گستاخی معاف، بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اب آپ کی شاعری میں پہلے جیسی بات نہیں رہی۔

وہ : یہ فضول بات ہے۔ میں جیسی شاعری پہلے کرتا تھا، ویسی ہی اب بھی کرتا ہوں۔ وہی مخصوص الفاظ، وہی مترنم بحریں، وہی بے ساختہ قافیے، وہی مخصوص ردیفیں۔ اور کیا چاہتے ہیں آپ؟

ہم : ہم اور کچھ نہیں چاہتے، البتہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ نثری نظم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

وہ : یہ نثری نظم کیا چیز ہے؟

ہم : یہ ایک ادبی صنف ہے جو حال ہی میں ایجاد ہوئی ہے۔

وہ : اچھا تو ہماری عدم موجودگی میں اس قسم کے کام ہوتے رہے ہیں۔ یہ ایجاد کس سنہ ایجاد کی ہے۔

ہم : بہت سے لوگ اس کا موجد ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ آج کل اخباروں میں اس مسئلے پر بڑی گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔

وہ : اس بحث کا کوئی نتیجہ نکلا؟

ہم : جی ہاں خوف کے مارے شاعروں نے نثری نظمیں لکھنی چھوڑ دی ہیں۔

وہ : بھئی یہ نثری نظمیں تو ہم بھی دیکھیں گے۔

ہم : اگر آپ اجازت دیں تو ایک نثری نظم پیش کی جا سکتی ہے۔

وہ : ضرور۔

ہم : جب میں بچہ تھا

رونی کے گالوں سے ڈرتا تھا

اب دشمن کی چالوں سے ڈرتا ہوں

میرے بچپن میں

آگ کے اطراف

دادا ڈرائنگ بگت گاتی تھیں

اور اب میں ایک ہوٹل میں

سینڈ وچ کھاتا ہوں

اور لومڑی کی کھال سے

اپنا لباس سیتا ہوں

وہ : آگے چلیئے

ہم : بس نظم یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ نظم کیسی ہے؟

وہ : بھئی یہ نظم ابھی سمجھ میں تو نہیں آئی۔ شاعر کو بینڈ بجانے ہی کا کام کرنا چاہیئے۔ نثری نظمیں نہیں لکھنی چاہئیں۔

کتاب اُن کے ہاتھ میں تھی جس کی وہ ورق گردانی کر رہے تھے غور سے دیکھا تو یہ احمد فراز کی کتاب "بے آوارگی کوچوں میں" تھی۔ موقع کو غنیمت جان کر ہم اُن صاحب کے پاس گئے اور کتاب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے کتاب ہماری طرف بڑھا دی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ موصوف ہندوستانی شہری ہیں۔ چند روز پہلے لندن سے آئے تھے۔ کراچی میں اپنے عزیزوں سے ملتے ہوئے اب اپنے وطن واپس جا رہے ہیں۔ انہیں اسی جہاز سے دہلی جانا تھا، جس جہاز کے آنے کا ہمیں انتظار تھا اس لئے کتاب کے مطالعے کے لئے ہمیں خاصا وقت مل گیا۔

بشکریہ جسارت

ادیب اور کاغذی ادارے

ٹی وی کے ادبی پروگرام یا آشوبِ چشم و گوش

مسیح الدین صدیقی کا رنگ برنگی جھنڈیوں سے استقبال

ہمیں یہ تو یاد ہے کہ نظیر صدیقی نے اپنے شعروں کا مجموعہ ایک پمفلٹ کی صورت میں طبع کرایا تھا اور یہ پمفلٹ [illegible] سدی کے شائع کردہ پمفلٹوں کی طرح مفت تقسیم ہوا تھا لیکن ہمیں یاد نہیں کہ نظیر صدیقی کو کسی مشاعرے میں بحیثیت شاعر تو کیا بحیثیت سامع بھی بلایا گیا ہو۔ وہ تقریباً [illegible] سال کراچی میں رہے اس دوران میں ہم نے ان میں شاعروں جیسی کوئی بات نہ دیکھی یہاں تک کہ اگر وہ کسی ضرورت سے کسی اور شاعر کا شعر پڑھتے تھے تو اس کی موزونیت کا گمان بھی سننے والا رکھتا تھا لیکن جب سے وہ اسلام آباد گئے ہیں صورتِ حال یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ خدا جانے اسلام آباد کی آب و ہوا میں کیا اثر ہے کہ آدمی وہاں جا کر شاعر بن جاتا ہے۔ نظیر صدیقی بھی وہاں جا کر باقاعدہ شاعر بن گئے اور سرِعام شعر سنانے سے انہیں تکلف نہ رہا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب انہیں اسلام آباد کے مضافات ہی میں نہیں بلکہ غیر ملک میں بھی شعر خوانی کے لئے بلایا جانے لگا ہے۔ پچھلے دنوں دبئی میں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں احمد ندیم قاسمی، ضمیر جعفری، سلیم احمد اور بعض دوسرے نامی گرامی شعراء کے ساتھ نظیر صدیقی کو بھی بلایا گیا۔ انہیں نہ صرف آنے جانے کا کرایہ ملا، بلکہ معاوضے کے طور پر خاصی معقول رقم بھی ملی۔ اس رقم سے انہوں نے دوستوں کے لئے تحفے خریدے۔ ایک خوبصورت قلم انہوں نے ہمیں بھی عنایت کیا۔ آج کا کالم ہم اسی قلم سے لکھ رہے ہیں۔ اس لئے اگر کالم میں [illegible] نظر آئے تو اسے قلم کے سابقہ مالک کا فیضان سمجھنا چاہئے۔ بہرحال ہم نظیر صدیقی کی ادبی ترقی پر بے حد خوش ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ انہیں آئندہ کینیڈا، انگلستان اور امریکہ وغیرہ کے مشاعروں میں بھی بلایا جائے اور ہم خوبصورت تحفوں سے مالا مال ہوتے رہیں۔ شاعری کا کیا ہے۔ وہ تو اردو والوں سے بھی مالا مال ہو گئی ہے اس کے لئے نظیر صدیقی تو واحد وسیلہ نہیں ہیں۔ دبئی سے واپسی پر نظیر صدیقی نے کچھ دنوں کے لئے کراچی میں قیام کیا۔ اس مرتبہ انہوں نے پہلی بار شاعروں اور [illegible] سے ان کی شاعری پر گفتگو کی۔ دبئی کے مشاعرے سے زیادہ وہ یہ بتاتے رہے کہ کس طرح ان کے ایک ایک شعر پر انہیں داد ملی ہے۔ [illegible] کراچی کے ادبی حلقوں میں بھی نظیر صدیقی کی آؤ بھگت پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہوئی اور اس طرح ہاتھوں ہاتھ لئے گئے جیسے وہ کوئی غیر ملکی مہمان ہوں۔

غیر ملکی مہمان سے یاد آیا کہ گزشتہ ہفتے مولانا امداد صابری دہلی سے تشریف لائے اور چند روز کراچی میں ٹھہرے۔ مولانا امداد صابری [illegible] ادب [illegible] اور صحافت [illegible] لکھنے والے کا نام دریافت کیا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ عبدالرؤف عروج ایک فرضی نام سے یہ کالم لکھتے ہیں۔ مولانا نے پوچھا: وہی عبدالرؤف عروج جنہوں نے "بزمِ غالب" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور جو مرزا ظفر الحسن کے ادارۂ یادگارِ غالب نے شائع کی ہے۔ ہم نے اس کی تصدیق کی تو مولانا مسکرا دیئے۔ اس مسکراہٹ کو ہم یہ سمجھے ہیں کہ مولانا نے مالک رام کی مشہور کتاب "تلامذۂ غالب" اور عروج کی "بزمِ غالب" کا ایک ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالک رام نے عروج صاحب کی کتاب کے مطالب کو اپنی کتاب میں [illegible] لیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مالک رام کی کتاب پہلے شائع ہوئی اور عروج کی بعد میں۔ اچھا ہوا کہ عروج صاحب نے کتاب سازی کا کام چھوڑ دیا اور کالم نگاری کی طرف آگئے۔ پہلے وہ کالم اپنے نام سے لکھتے تھے اور سندھ کی تاریخ کے واقعات پیر حسام الدین راشدی کی کتابوں سے "اخذ" کرتے تھے۔ اب انہوں نے ایک اور نام سے ادبی کالم نگاری شروع کی ہے جس میں [illegible] کا مظاہرہ وہ اس طرح کرتے ہیں کہ خود بھی ظاہر [illegible] ہیں۔

مہمانوں کی بات چلی ہے تو جناب مسیح الدین صدیقی کا ذکر بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ گزشتہ ہفتے انہوں نے بھی کراچی کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا۔ اکادمی ادبیات کے ڈائریکٹر جنرل ہونے سے پہلے صدیقی صاحب کراچی ہی میں رہتے تھے، لیکن اہلِ شہر بے خبر رہے اور جب سے وہ اکادمی کے ڈائریکٹر ہوئے ہیں تو اہلِ کراچی حیران ہیں کہ یہ چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی۔

صدیقی صاحب کراچی آتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی [illegible] سربراہ آگیا ہو۔ بہت سے عزت مند ادیب [illegible] ہو جاتے ہیں اور [illegible] لوگ رنگ برنگی جھنڈیاں [illegible] پہنچ جاتے ہیں۔ اب کے بھی صدیقی صاحب کا استقبال اسی شان سے ہوا۔ ظہرانے، عصرانے، عشائیے اور ایک آدھ جلسہ عام میں شرکت کی۔ کچھ نئے وعدے کئے، کچھ پرانے وعدوں کی تجدید کی اور سب کو خوش کر کے اور خود بھی خوش ہو کر اسلام آباد واپس چلے گئے۔ صدیقی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔

اب کے صدیقی صاحب کے کراچی آنے کا بنیادی سبب راس مسعود ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی کا جلسہ تھا جس میں وہ مہمانِ خصوصی تھے۔ اس جلسے میں صدیقی صاحب کو سوسائٹی کی لائف ممبر شپ پیش کی گئی۔ اکادمی ادبیات کے بعد یہ دوسرا ادارہ ہے جس سے صدیقی صاحب کا زندگی بھر کا تعلق قائم ہوا ہے۔ ہم [illegible] صدیقی صاحب کو [illegible] راس مسعود سوسائٹی کے [illegible] کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے صدیقی صاحب کو سوسائٹی کا لائف ممبر بنا کر خود اپنی سوسائٹی کی لائف میں اضافہ کر لیا ہے۔

صدیقی صاحب نے ادیبوں کے ایک گھریلو اجتماع میں بھی شرکت کی اور اس بات پر زور دیا کہ ادیبوں کو بچوں کے لئے کتابیں لکھنی چاہئیں۔ انہوں نے یقین دلایا کہ اکادمی ادبیات بچوں کے لئے کتابیں لکھنے والے ادیبوں کی مالی امداد بھی کرے گی۔ یہ بیان جس روز اخبارات میں شائع ہوا اسی دن [illegible] صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی۔ [illegible] صاحب نے فرمایا، صدیقی صاحب کے مشورے کے بغیر ہی جو لوگ "بچوں" کے لئے ادب تخلیق کر رہے ہیں ان کی اب تک کیا حوصلہ افزائی ہوئی ہے جو اب بچوں کے لئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی [illegible] جا رہی ہے۔ ہمیں یہ بات پسند نہ آئی اور ہم نے کہا "اکادمی بہت کام کر رہی ہے اور ہم کو اس کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہئے۔" جناب [illegible] نے فرمایا "بس منہ نہ کھلوایئے۔ ہمیں سب معلوم ہے کہ [illegible] ادیب کے نام پر کون لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ پاکستان کے ادیبوں کی نمائندگی کرنے کے لئے کس قسم کے لوگوں کو غیر ملک بھیجا جاتا ہے۔ کراچی کے کس تجارتی ادارے کو بیس ہزار اور لاہور کے کس تاجر ادیب کو گیارہ ہزار [illegible] کی رقم دی گئی ہے۔" ہم نے عرض کیا "[illegible] کا تعلق بہت گہرا ہے اس لئے [illegible] ادیبوں کی مدد کرنے سے بھی ادب ہی کو فائدہ پہنچے گا۔"

اس کے جواب میں [illegible] صاحب نے فرمایا "اکادمی اگر واقعی صحیح کام کر رہی ہے تو اسے اپنی آمدنی اور خرچ کا گوشوارہ شائع کرنا چاہئے۔" ہم نے کہا "ابھی تو اکادمی نے ادیبوں کی ڈائریکٹری شائع کی ہے۔ ابھی اس کا [illegible] ختم نہیں ہوا اور آپ گوشوارہ آمد و خرچ کی اشاعت چاہتے ہیں۔" تو انہوں نے فرمایا "جی ہاں یہ تجویز ہم اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ عام ادیبوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے نام پر جو رقم ملتی ہے وہ کس طرح خرچ کی جا رہی ہے۔ [illegible] دس ہزار روپے ماہوار سے زیادہ [illegible]" ہم نے [illegible] پیش کی: "[illegible] کسی کی آمدنی نہیں دیکھی جاتی [illegible] دیکھا جاتا ہے۔ آپ جس [illegible] کا حوالہ دے رہے ہیں [illegible] اس کا خرچ گیارہ ہزار روپے ماہوار ہو۔ آخر ایک ہزار کا خسارہ کس طرح پورا ہونا چاہئے۔" یہ سن کر [illegible] صاحب مسکرانے لگے "جی ہاں یہ سب جانتے ہیں [illegible]"

ہم نے [illegible] صاحب کی مسکراہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی اور پوچھا "[illegible] کیا خبر ہے؟" [illegible]

(باقی صفحہ ۹۳ پر)

[illegible] اقبال

اگست [illegible]

ب - ۱

کتابوں کی باتیں

کچھ نئی اور کچھ پرانی مطبوعات

۱۹۸۳ء کی مطبوعات

تردید (شاعری)
محبوب راہی
قیمت : ۲۰ روپے
سائز ۱۸×۲۲/۸ ڈیمائی
صفحات : ۱۱۲
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

ننھی کتاب (بچوں کی نظمیں)
بدیع الزماں خاور
قیمت : ۶ روپے
سائز ۱۸×۲۲/۸ ڈیمائی
صفحات : ۴۸
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

تیرے کوچے سے ہم نکلے (ناول)
عطیہ پروین
قیمت : ۲۵ روپے
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کراؤن
صفحات : ۳۲۰
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

ناظرہ (ناول)
ہاجرہ نازلی
قیمت : ۲۵ روپے
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کراؤن
صفحات : ۲۴۰
تقسیم کار : موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

عداوت (ناول)
بالا دوبے
قیمت : ۲۵ روپے
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کراؤن
صفحات : ۱۲۰
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

نگارینہ (ناول)
ثریا محمود نزہت
قیمت : ۲۵ روپے
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کراؤن
صفحات : ۲۵۶
تقسیم کار : موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی

• • •

خواب زخمی ہیں (ناول)
ثروت ذکی
قیمت : ۲۵ روپے
سائز ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات : ۲۰۸
ناشر : سیمانت پرکاشن۔ ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں۔ دریا گنج نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

شرافت (ناول)
اکرشا لا
قیمت : ۲۵ روپے
سائز ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات : ۱۹۲
ناشر : سیمانت پرکاشن۔ ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں۔ دریا گنج نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

زمیں زاد (ناول)
شاہد پرویز
قیمت : ۲۰ روپے
سائز ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات : ۱۶۰
ناشر : سیمانت پرکاشن۔ ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں۔ دریا گنج نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

پتھر پسیجتے ہیں (ناول)
مسافر
قیمت : ۲۲ روپے
سائز ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات : ۱۶۰
ناشر : سیمانت پرکاشن۔ ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں۔ دریا گنج نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

زندگی درد سے دوا بھی ہے (طنز و مزاح)
ہری کا مہتہ
قیمت : ۳۵ روپے
سائز ۲۳×۳۶/۱۶
صفحات : ۱۲۸
ناشر : سیمانت پرکاشن۔ ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں۔ دریا گنج نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

امیر خسرو اور ہمارا مشترکہ کلچر (ادبی مضامین)
کے۔ کے۔ کھلر
قیمت : ۴۰ روپے
سائز ۲۳×۳۶/۱۶
صفحات : ۱۲۰
ناشر : سیمانت پرکاشن۔ ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں۔ دریا گنج نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

اردو ناول کا نگار خانہ (تنقید)
کے۔ کے۔ کھلر
قیمت : ۴۰ روپے
سائز ۲۳×۳۶/۱۶
صفحات : ۱۲۸
ناشر : سیمانت پرکاشن۔ ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں۔ دریا گنج نئی دہلی ۲-۰۰۰۱۱

• • •

... ہی ایک ... مسائل ... لا پتہ ... بیٹر، بڑا ہیر ... ایک سے ... ہیں ہر شخص نے ان کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شخص ختم ہو گئی۔ مسائل ابھی زندہ ہیں اور مسائل رہیں۔ فکر ان کو حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ صرف ان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرواتا ہے اور پھر ایک طرف کھڑا ہو کر دیکھتا ہے کہ کہیں آپ بھی معصومیت سے ان کو حل کرنے کی کوشش میں لگا تو نہیں ہو گئے۔

فکر کا عقیدہ ہے کہ اُسے خدا نے ہندوستان کے ایسے معاشرے میں پیدا کر کے اُس کے ساتھ مذاق کیا ہے بھونڈا اور بے وقت کا مذاق۔ یہ حرکت خدا کی غلطی تھی۔ اس کے لئے فکر نے آج تک اُسے معاف نہیں کیا۔ اور کئی صدیوں سے وہ خدا اور اُس کے نظام، اُس کے بنائے ہوئے انسان، اُس کے سماج اور اُس کے مختلف اجارہ داروں کو "ایکسپوز" کر رہا ہے۔ اس کی ہر کتاب ایک نثر نگار کا شکوہ ہے۔ کسی ایک مذہب یا ملت یا قوم کا شکوہ نہیں، بلکہ انسان کا شکوہ خدا کے خلاف، انسان کا شکوہ سماج کے خلاف۔ لیکن ہم نے سُن رکھا ہے کہ خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔ سب کچھ سمجھتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو فکر کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا پنر جنم اس کے بیان کے مطابق اس کا موجودہ گلی میں اپنے ہمسایہ کے گھر نہیں ہوگا۔ اگر ہوا تو یورپ کے کسی نہایت متمول گھرانے میں ہوگا جہاں وہ اپنے پچھلے جنموں کی تلخیاں اور اس جنم کی خرافات سب کو بھول جائے گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ یہ فکر کا آخری جنم ہے۔ مصلحت ایزدی اسی میں ہوگی کہ اس جنم کے بعد فکر کو مکتی دے دی جائے۔ نہیں تو خدا کی خدائی اور سماج کی بُنیادوں کو سخت خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

"نخشم کم جہاں پاک"!

بقیہ سخن در سخن

ہے۔ ... کوئی نہیں۔ البتہ ذوالفقار ... نے مزے کا ایک مضمون لکھا ہے اور پڑھیے۔ تابش صاحب نے مضمون کا تراشہ ہمارے سامنے رکھا اور خود ملاحظہ کی اس انداز سے چلے گئے جیسے کسی غیر ملکی ٹیم کا کلاڑی اپنی ٹیم کی نمائندگی کرنے جاتے ہیں۔

تابش صاحب کا مضمون لاہور کے ایک اخبار میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ٹیلیویژن اور ادب"۔ اس میں انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ ٹیلیویژن والے ادب کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں وہ اکاڑی ادبیات کے سلوک سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ٹی وی کے مشاعروں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ کراچی پشاور اور راولپنڈی کا حال انہیں معلوم نہیں۔ لاہور ٹی وی کے ... مشاعروں میں مدعو کئے جانے والے شاعروں کی فہرست اگر آپ ملاحظہ فرمائیں تو پتہ چلے گا کہ چند مخصوص اور محبوب شعراء گزشتہ کئی سالوں سے ہر مشاعرے میں بلائے اور پڑھوائے جاتے ہیں۔ ان شاعروں کو اہم ترین ... پڑھنے کی سند کس نے جاری کی اور کیسے جاری کی یہ راز آج تک کسی پر نہیں کھلا۔ ... ایک طویل فہرست ان شعراء کی ہے جنہیں آج تک کسی مشاعرے میں مدعو کرنے کے لائق نہیں سمجھا گیا۔ ممکن ہے آپ میرے دعوے پر شک کریں۔ چلئے زیادہ نہیں صرف اوّل کے چند نام لکھے چلتے عرض کر دیتا ہوں۔ کیا آپ نے کبھی ... آغا عبدالعزیز خالد، بیخود ناظرہوی ...۔ کو لاہور کے کسی ٹی وی مشاعرے میں دیکھا ہے؟

ذوالفقار احمد تابش نے لاہور ٹی وی کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ سارے ملک کے ... ٹی وی اسٹیشنوں کا بھی ... ایسے ... شاعروں کو ...

جانا ہے کہ ناظرین آشوب چشم و گوش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا جناب منظر ایوبی نے کراچی کے ان شعراء کی فہرست شائع کی تھی جنہیں ٹی وی پر کلام سنانے کا موقع کبھی نہیں دیا گیا۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ جناب منظر کو ایک دو مشاعروں میں مدعو کر لیا گیا، فہرست کے باقی شعراء فہرست ہی میں رہے اور انہیں ٹی وی پر چلن کر بولنے کا موقع نہ ملا۔

ٹی وی سے کتابوں پر جو تبصرے ہوتے ہیں ان کے بارے میں ذوالفقار احمد تابش فرماتے ہیں۔ "اگر آپ ادب پڑھتے ہیں تو گزشتہ دو سالوں کی چیدہ اور اعلیٰ کتابوں کی فہرست ترتیب دیجیے اور پھر دیکھیے ان میں سے کتنی کتابوں پر ٹی وی سے تبصرے ہوئے۔ چند کتابوں کے نام تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں جو میری نظر میں ادب کا سرمایہ ہیں اضافہ کرنے کا موجب بنی ہیں۔ "اک نشیب، عبداللہ حسین، گرد مہتاب (احمد مشتاق) دوسرا کنارہ (وزیر آغا) ملاقاتوں کے درمیان (کشور ناہید) جھلکیاں (محمد حسن عسکری) ... یہ کتنے آپ نے ٹی وی پر ان میں سے کسی کتاب پر تبصرہ دیکھا یا سنا ہے؟"

تابش صاحب بڑے معصوم آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ خود میٹرن کی کونسل کے عہدیدار ہیں، اس لئے وہ سمجھے ہیں کہ ان کی طرح ٹی وی والے بھی معیاری کتابوں سے واقف ہوں گے۔ ٹی وی والوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ کتابوں سے کیا، ادیبوں سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ہم ایک ایسے ٹی وی پروڈیوسر کو جانتے ہیں جو ضیاء سرحدی سے تو واقف تھا، لیکن صبا دہلوی کا نام اس نے نہیں سُنا تھا۔ جب ہم نے اُسے بتایا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں اور وہ شخص ٹی وی کا نامور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مشہور شاعر بھی ہے تو وہ پروڈیوسر حیران ہوا اور کہنے لگا کہ ...

بڑے عہدے پر فائز ہونے کے بعد ... صاحب کو شعر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم نے عرض کیا۔ ضرورت تو ان کو عہدے پر فائز ہونے سے پہلے بھی نہیں تھی۔ اسباب تھا انہیں فرصت ہی نہیں ملتی کہ شعر کہہ سکیں۔ لیکن "سر شام" اور "..." کے مصنف کی حیثیت سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس پر پروڈیوسر صاحب نے فرمایا۔ "اچھا! انہوں نے سر شام اور ... کے نام سے ٹی وی ڈرامے بھی لکھے ہیں؟"

ٹی وی پروگرام "ماہِ ناہ" کے بارے میں ذوالفقار احمد تابش کو جو شکایت ہے، وہ یہ ہے ——— "گنتی کے چند نام ہیں وہی بار بار اس پروگرام میں تشریف لاتے ہیں یا ان کو بلا کر مدعو کیا جاتا ہے۔ .... ان کے علاوہ بھی بڑے اچھے لوگ شہر میں موجود ہیں۔ سبھی ... ہیں جن کے عقائد والوں کا بھی شکار نہیں ہیں کبھی زحمت دی جا سکے ..." چند نام اس ضمن میں ملاحظہ فرمائیے اور دیکھ لیجیے کہ ان کا ادبی قد و قامت کیا ہے ... شبیر سید اللہ، جمیل ... مجید عثمان، عبداللہ قریشی، علی عباس جلالپوری ...

تابش صاحب نے ناموں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ ہم ... کے چار نام سب سے دے رہے ہیں، انہیں سے آپ باقی ناموں کا اندازہ کر لیجئے کہ وہ کیسے اہم ہوں گے۔ حیرت ہے کہ ... ماجد ... تھا ... جو لوگوں کا یہ پروگرام "ماہِ ناہ" میں مدعو نہیں کرتے۔ تابش صاحب اگر پسند فرمائیں تو ان سب حضرات کو کراچی بھجوا دیں۔ ہم انہیں ٹی وی پروگرام دلانے کی کوشش کریں گے۔ آج کل کراچی میں جن پروڈیوسر کے پاس "ماہِ ناہ" کا پروگرام ہے، اُن کا یہ کہنا ہے کہ کراچی میں ایسے لوگ نہیں ملتے جو اس پروگرام کے شایانِ شان ہوں۔

بقیہ ایک خط

اس کی کیا ضرورت ہے۔ پاسپورٹ سے اور مذہب سے کیا واسطہ۔ میں نے پوچھا اگر میں اپنا مذہب نہ لکھوں تو پاسپورٹ نہیں ملے گا پتہ چلا نہیں ملے گا۔ میں نے اس کالم میں "تمام مذاہب" لکھ دیا۔ اب بھی جب کسی فارم میں مذہب کا کالم ہوتا ہے تو بہت جی جلتا ہے۔ سرکار کو میرے یقین کی کمی سے کیا واسطہ۔

انگریزوں نے تو یہ کالم اس لئے رکھا تھا کہ یورپ میں اور پھر یہاں ہندوستان میں بھی اپنی پھوٹ ڈالنے کے طریقے نکالنے کے لئے مذہب جاننا ضروری تھا۔ لیکن اپنی سرکار اس سے کیا کام لیتی ہے۔ اب بھی پیدائش کی اطلاع میں، اسکول کالج کے داخلے کے وقت یہ کالم بھرنا پڑتا ہے۔ میرا چھوٹا سا نواسہ جانتا ہے کہ اس کے کانوینٹ میں کون ہندو ہے مسلمان عیسائی اور سکھ ہے۔

کیوں؟

کیا ہماری سرکار بھی فرقہ وارانہ فساد کے ذریعے پھوٹ ڈال کر اور پھر دونوں کے زخموں پر مرہم رکھ کر سرخ روئی حاصل کرنے کے لئے ان مذہبی ڈراموں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اور مختلف پارٹیاں بھی اس تقسیم سے کچھ فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اسی لئے ہر رجسٹر میں مذہب درج ہے۔ مذہب ذہن اور دماغ کی آسودگی کے لئے نہیں سیاسی اور اقتصادی ہتھکنڈوں کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

تب کیوں نہ یقین ہو کہ انگریز کی گدی پر بیٹھنے والے انگریزی پانسہ ہی پھینکتے ہیں — ابھی ایک فارم سرکار کی طرف سے بھرنے کو ملا۔ وہی مذہب کا کالم منہ چڑا رہا تھا۔ جی چاہا پھاڑ کر پھینک دوں یا لکھ دوں کیا ہوگا میرا مذہب معلوم کر کے، کون سی سزا ملے گی یا انعام۔ مجھے ان لوگوں کی ضرورت نہیں جو میرے مذہب کی بنیاد پر ملے۔

نا بھی پیارے کیا فرق پڑتا ہے جو ہم سمجھے

ہیں، کچھ کر نہیں پاتے۔ تمہارا مضمون مختصر ہوتے ہوئے بھی دل کو چھوتا ہے۔ اگر عوام کو جہالت اور توہم سے نکال لیا تو پھر کروڑپتی فٹ پاتھ پر نظر آئے گا۔ یہ مذہب ہی ہے جو کہتا ہے۔ دینے والا اللہ ہے، اپنے پیاروں کو مٹھی کھول کر دیتا ہے۔ اسی لئے کرتار اور چرچ مل کر عوام کو لوٹتے تھے، انقلاب روس میں سب سے پہلے ان دونوں کا قلع قمع کیا۔ زار کے بعد اگر چرچ رہ جاتا تو نئی مذہبی شہنشاہیت تو اور بھی خوفناک ہوتی۔ یہ مذہب کی برکت پولینڈ میں کیا رنگ جا رہی ہے۔ پوپ صاحب پولینڈ میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنی برکتیں پھیلا رہے ہیں۔

تلک دھاری، معجزہ دکھانے والے پیر اور فینسی ڈریس والے پوپ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے لگتے ہیں۔ عام انسانوں جیسے کپڑوں سے کام نہیں چلتا۔ کیا یہ مکٹ پہننا پوپ کے لئے بہت ضروری ہے۔ کیا خدا صرف عبادت گاہوں میں دھرا ہے دلوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اپنے یقین کا ثبوت مندر مسجد اور چرچ گوردوارہ کی صورت میں دکھانا ضروری ہے۔ اس خدائے ذوالجلال کی عبادت میں زر جاگیر کا بٹوارہ ضروری ہے۔ صوبے کی جوڑ توڑ اقتصادی اور سیاسی مسئلہ سے خدا کو کیوں دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ صوبوں کی منسٹریاں اسمبلی کی سیٹیں اونچے نیچے عہدے مختلف مذاہب کے خداؤں کو بڑی شدت سے چاہئیں۔ یہ سب قوم کی خدمت کے لئے مانگ رہے ہیں؟ یہ مذہب ہے۔

اور ہاں یہ جو جائے پیدائش کا بھی کالم ضروری ہوتا ہے تو اس کے پیچھے کون سی پالیسی ہماری بہتری کی پوشیدہ ہے۔ صوبہ پرستی کا زور شور ہے کہیں ایسا تو نہیں جو جہاں پیدا ہوا ہے وہیں جا بسنا ہوگا۔ اپنی تو چھٹی... ہو جائے گی۔ ہم کہاں پیدا ہوئے تھے۔ بھئی میں تو یوپی کے سیدھے سڑے ہوئے شہر میں پیدا ہوئی تھی۔ نام نہیں بتاؤں گی کہیں نوٹ کر لیا گیا تو؟ انگریز نے تو ملک ہی تقسیم کیا تھا ہمارے رہنماؤں نے چوکہ صوبہ چوکڑہ زبانیں،

چھوٹے چھوٹے چودہ ملک بنا ڈالے جن کی زبانیں بھی چودہ۔

در میان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

بقیہ فکر کا انٹرویو تونسوی سے

فکر صاحب: خدا کے متعلق کچھ ارشاد؟

تونسوی صاحب: ہے اور نہیں کے درمیان ایک سینڈوچ۔

فکر صاحب: کیا آپ کالم نگار ہیں یا طنز نگار؟

تونسوی صاحب: میں کالم نگار ہوں اور آپ طنز نگار۔

فکر صاحب: آپ نے اپنے دو ٹکڑے کیوں کر دیئے!

تونسوی صاحب: آپ نہیں! ہم نے اپنے دو ٹکڑے کر دیئے۔

فکر صاحب: مجھے تو یہ دوغلا پن لگتا ہے۔

تونسوی صاحب: ادب کی تاریخ میں دوغلے پن کا ہی رواج ملتا ہے۔

فکر صاحب: آج کل جدید ادب کا دور چل رہا ہے۔ کیا یہ آپ کو مضحکہ خیز لگتا ہے۔

تونسوی صاحب: اس کا جواب میں نہیں دوں گا۔ آپ دیجئے۔

فکر صاحب: ہر دور کا ادب جدید ہوتا ہے۔ اس کی شروعات ہمیشہ مضحکہ خیز ہوتی ہے۔

تونسوی صاحب: ادب اور سرکار میں کیا رشتہ ہوتا ہے۔

فکر صاحب: جو درباری اور قصاب میں ہوتا ہے۔

تونسوی صاحب: فکر صاحب! ہمارے قارئین کے نام کوئی پیغام دیجئے۔

فکر صاحب: اپنا پیغام ظرافت ہے جہاں تک پہنچے۔

آپ چنگاری پڑھتے ہیں؟ اس کے سالانہ خریدار ہیں؟ اردو میں کوئی دوسرا پندرہ روزہ اس طرح کا ہے؟

نصرت اقلا

پندرہ روزہ

چنگاری دہلی

ایڈیٹر:
جمیلہ احمد
ادبی حصے کی ترتیب
بشیر احمد
انیس احمد خاں
شمارہ نمبر —— ۲۵
قیمت: ۲ روپے
سالانہ: ۴۵ روپے
پتہ: ۳/۱۰/۱۴۱ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

جمیلہ احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے
جے کے آفسٹ پرنٹرس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر
۳/۱۰/۱۴۱ رام نگر دہلی ۳۲ سے شائع کیا۔

خصوصی مضمون جس کی اشاعت کا
گزشتہ شمارہ میں اعلان کیا گیا تھا
بعض دشواریوں کی وجہ سے اس
شمارے میں شریک نہ ہوسکا۔ ہم
قارئین سے معذرت چاہتے ہیں۔

ادارہ

اس شمارے میں



نگاہ کا دامن

میں اس وقت امریکا اور کینیڈا کے لئے پا بہ
رکاب ہوں۔ کینیڈا کی دو یونیورسٹیوں اور امریکا
کی ایک یونیورسٹی میں لیکچر ہے۔ ان دنوں مصروفیت
کا یہ عالم ہے کہ تین لیکچروں میں ایک ابھی تک نامکمل
ہے۔ یہ خط آپ کو پالم ایرپورٹ، نئی دہلی سے لکھ رہا
ہوں۔ اس وقت صبح کے دو بجے ہیں۔ تین بجے سیکورٹی
چیک کے لئے ہم لوگ چل پڑیں گے۔ سوچا اسی وقت
یہ عریضہ آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں۔
انشاء اللہ سفر سے واپسی پر "چنگاری" کے لئے
کچھ نہ کچھ حاضر کروں گا۔

جگن ناتھ آزاد

• • •

"چنگاری" کے جو شمارے مجھے اب تک ملے،
ان کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ "چنگاری" ایک بہترین
ٹکسچر ہے۔ ایک ایسا ٹکسچر جو کئی امراض میں کام آئے۔
دلوں کو بہلائے اور دماغ پر بوجھ بھی نہ دے۔ لہٰذا
آج کے دور میں اس قسم کے "ٹکسچر" اگر ضروری پبلسٹی
کی جاسکے تو جلد مارکیٹ پکڑ لے گا اور آپ کو کامیابی
ہوگی۔

آجکل میں افسانہ نگار نہیں ہوں۔ عموماً ادبی
اور تحقیقی مضامین لکھتا ہوں اور یہ مضامین اکثر
طویل ہوتے ہیں اور نہایت خشک۔ لہٰذا وہ
"چنگاری" کے لائق نہیں۔ آج سے ۲۰، ۲۵
برس پہلے میں افسانے لکھا کرتا تھا۔ پھر نہ معلوم
کیوں افسانوں کی آمد بند ہوگئی اور میں مضامین لکھنے
لگا اور لوگ بھول گئے کہ میں نے بھی کئی افسانے لکھے
ہیں اور میرے افسانوں کے دو مجموعے بھی آج سے
۲۰، ۲۱ برس پہلے شائع ہو چکے ہیں جو کتابیں آج
نایاب ہیں۔ اس کے بعد ۱۸، تحقیقی اور ادبی کتابیں
اب تک شائع ہو چکی ہیں جن کی بدولت مجھے کئی
چھوٹے بڑے (سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری)
انعامات پانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

لیکن "چنگاری" کے شماروں کو پڑھ کر دل
نے کہا کہ پھر سے افسانے لکھوں۔ لہٰذا میں نے ایک
افسانہ "گڑیوں کی ماں" لکھا ہے جو آپ کی خدمت
میں حاضر کر رہا ہوں۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

• • •

سجاد ظہیر صاحب کا شعری مجموعہ "پگھلا نیلم"
اور ایک اچھی سی تصویر روانہ کر رہا ہوں۔
فیض صاحب نے اپریل ۸۱ء میں میموریل
لیکچر دیا تھا۔ اس موقع پر کمیٹی کی جانب سے ہم نے
ایک پمفلٹ بانٹا تھا۔ ایک کاپی منسلک ہے۔
نے بھائی اور فیض کی آخری تصویر کے علاوہ "جام
الوداعی" بھی ہے جس پر فیض کے دستخط ہیں۔
"روشنائی" چند ماہ بعد چھپ جائے گی۔
راج بہادر گوڑ کا دیباچہ ہے اور ضخامت پانچ سو
صفحے ہے۔ اس کی قیمت ساٹھ روپے رہے گی۔

علی باقر

سجاد ظہیر میموریل کمیٹی ۱۹ دکشنا پورم
جواہر لال نہرو یونیورسٹی — نئی دہلی

• • •

مریخ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو کر آپ کے
ہاتھوں میں ہوگا۔ آپ کو دفتر سے بھی اشتہار و خط
بھیجا گیا ہے۔ میں اس کی تجدید کے لئے زحمت دے
رہا ہوں۔ ادب کے علاوہ دیگر علوم پر مضامین
درکار ہیں۔
"چنگاری" اکثر دیکھتا اور پڑھتا رہا ہوں۔
اس پندرہ روزہ میں تنوع کے امکانات موجود
روشن ہیں۔ "غزل نمبر" کی اشاعت ہونے والی ہے۔
اصل یہ ہے کہ غزل لکھنے والے بہت ہیں لیکن غزل
کی توسیع کرنے والے شعرا بس چند ہیں۔ ایسا نہ
ہو کہ یہ غزل نمبر بھی اور نمبر کی طرح ادب کی قدر اوّل
کا ترجمان نہ ہو سکے۔ بہر حال اب تو اشاعت
کے بعد ہی فیصلہ ہو سکے گا۔

شکیب ایاز

• • •

ابھی تک کوئی بھی ایسا ادبی رسالہ نظر
سے نہیں گذرا جس کا مطالعہ شروع سے آخر
تک بغور کیا جائے۔ لیکن چنگاری کا ہر ایک شمارہ
اپنے آپ سے باندھ لیتا ہے۔

اگر اسے مبالغہ خیال نہ فرمائیں تو لکھوں کہ چنگاری
کے سرورق کے توسل سے جو مغل آرٹ کے نمونے آپ
پیش کر رہی ہیں وہ بھی اپنے آپ ہی ایک رکارڈ ہے

عشرت صدیقی

• • •

"غزل نمبر" کی اشاعت کا اعلان بہت حوصلہ
افزا ہے۔ یقین ہے اس میں نامور شعراء کے پہلو بہ
پہلو نسبتاً کم معروف نئے شعراء کو بھی صحیح نمائندگی
ملے گی اور سوانحی خاکوں کے علاوہ ان کی غزل گوئی پر
مختصر مضامین شامل ہوں گے، جیسا کہ اعلان میں
کہا گیا ہے۔ خدا کرے آپ کی کاوشیں بار آور ہوں
اور چنگاری کا غزل نمبر ہر لحاظ سے آپ اپنی مثال ہو!

جنید حزیں لاری

• • •

یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس قحط الرجال کے
دور میں لوگ اتنا اچھا اور سستا پرچہ نکال لینے کی
کیسے ہمت کرتے ہیں۔
آپ کے برہنہ حروف نے واقعی سوسائٹی میں
چھپے ہوئے کوڑھ کو برہنہ کر دیا ہے۔ ممتاز مفتی صاحب
نے اپنے افسانہ "مانا نمانہ" میں قاری کے ذہن کو
الجھا کر رکھ دیا ہے۔ لندن کی ایک رات پر ڈاکٹر
عبدالقیوم ابدالی صاحب کا تبصرہ بڑا اچھا معلوم
ہوا۔
انیس احمد خاں صاحب نے موجودہ دور
میں تعلیمی معیار اور اساتذہ کرام کی چاپلوسیوں کو
اچھی طرح اجاگر کیا ہے

ظفر اللہ صادق

• • •

چنگاری کے کئی شمارے خرید کر پڑھ چکا ہوں۔
پرچے کے متعلق اتنا عرض کروں گا کہ واقعی
آپ کا عزم مصمم قابلِ ستائش ہے۔ جسے پورا کرنے
کے لئے آپ کے پاس حسن سلیقہ بھی ہے۔ ساتھ ہی
ایک اچھا معیاری اور صحت مند ادب کا ترجمان ملنے
کے لئے میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

سلطان احمد سا[illegible]

• • •
• • •

نصرت اوّل[illegible]

ہم کیا ہماری شخصیت کیا

قرۃ العین حیدر

شخصیت نگاری یوں کی جاتی ہے کہ۔
موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں
وں اور قوس قزح سے سخت دلچسپی ہے۔
وسیقی سے الفت۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ
رتی ہیں۔ ان کے کمروں کا رنگ ہلکا ہے۔
دے جیپٹی۔ دریچوں میں بنفشہ کے شگوفے
لے لیکتے ہیں۔"

ادیبوں کے بارے میں اس طرح کے
مضمون پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ رو رہے جیجوں
مدا کا شکر ہے کہ اس طرح کی "شخصیت نگاریاں"
ب دیکھنے میں نہیں آتیں۔

ہم بہابت ذوق وشوق سے رسالہ "شمع"
ی پڑھتے ہیں، اور یہ بھی کہ جب سارے ہیں
ھائیوں کی محفل جمع ہو کر مسلسل ایک چنڈوخانہ
ن جاتا ہے تو گھر میں کیا ہنگامہ رہتا ہے
ماشاءاللہ ایک کمرے میں ریڈیو دھاڑ رہا ہے
دوسرے میں ایک بھانجی صاحبہ پیانو سے شغل
ر رہی ہیں۔ گیلری میں "چہ ہے دوڑ بلی آئی"
کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ
یچ ہو رہا ہے متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے
در کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم
چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھانجی صاحبہ اللہ
کے فضل وکرم سے ڈاکٹر ہیں اور ایر فورس میں
فلائیٹ لفٹننٹ کے عہدے پر فائز ہیں مگر
ن کا یہ عالم ہے کہ ان کو ڈاکٹری کے علاوہ دنیا
بھر کی فضولیات اور خرافات سے سخت دلچسپی
ہے۔ جدید انگریزی ادب، یونانی آرٹ، ہندو
فنون لطیفہ سے شدید اُنس ہے اور وہ کومکس
کی تو آپ عاشق ہیں۔ ٹیل للو اور ٹام اینڈ جیری
اور ڈونلڈ ڈک آپ کے پسندیدہ کردار ہیں
جب کوئی ان سے ڈاکٹری کی باتیں کرتا ہے
تو دفعتاً یاد آتا ہے کہ ارے یہ تو ڈاکٹر بھی ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے
سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا
پڑے گا۔ کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی
اور کوئی ہستی قطعی نہیں ہوں (انفرادیت وغیرہ
اس قسم کے جو سب عالمانہ الفاظ استعمال
کرتے ہیں، وہ سب گپ ماری ہے) ایک روز
ہم سب حسب معمول گھاس پر بیٹھے (رات کے بارہ
کا عمل رہا ہوگا) نہایت اطمینان سے شکرا کو
کبڈ اراہیں منتقل کرنے میں مشغول تھے
کہ ایک چھوٹے بھائی نے جو اب مستقلاً کینیڈا
میں رہتا ہے، اچانک یہ انکشاف کیا (جس
طرح ایک انگریز مصنف نے یہ انکشاف
کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا) کہ ساری عمر
ہم لوگوں کی اسی PITCH پر گذری ہے۔
کرکٹ کا PITCH نہیں) باوجودیکہ ہماری
زندگیوں میں تقسیم ہند کے کارن وافعتاً بڑا
زبردست انقلاب آچکا ہے اور بہرصورت
اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہو گئی ہے۔ ایک
چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے
ہیں۔ شدید ذہانت اور شدید مزاحی جس
فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان
ہے۔ غالباً ہماری اپنی "خصوصیات" کی زیادہ
لوگوں کے جیسے ہیں پڑتیں (یہ انکشاف بھی
اسی کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا اور اسی لیے
وہ دوسرے لمحے گھاس پر سے اٹھ کر کینیڈا
چلا گیا۔)

میری بہن عزیز تر سہیلیاں جو مجھے سگی
بہنوں کی طرح عزیز ہیں اور جن کے ساتھ میں
نے بہت بچپنے سے لے کر ۱۹۴۷ء تک عمر
کا ایک ایک لمحہ اکٹھے بتایا تھا۔ ہندوستان
میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری سہیلیوں کی
ایک بہت بڑی فوج بھی تقریباً ساری کی ساری
وطن مرحوم ہی میں رہ گئیں۔

سہیلیوں سے قطع نظر ہم سب ماشاءاللہ
سے اٹھارہ انیس فرسٹ کزن ہیں۔ سیکنڈ تھرڈ
فورتھ ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح آٹھویں
کزن تک پہنچتا ہے) ان کے علاوہ خدا نظر بد
سے بچائے، ان سب میں جو ہمارا اپنا ایج
گروپ ہے وہ اللہ کے فضل سے ایک ہی
مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ المورڑے
میں ہمارے منجھلے چچا جان کا مکان "بیکٹ
ہاؤس" تھا گرمیوں کے زمانے میں اس
میں مسلسل اودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا
آیا رہتا۔ شاہ جہاں پور میں چھوٹے چچا جان
کی کوٹھی کے باغ کے پیچھے سے ٹرین گزرتی تھی
ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹری
پر جا کر پتھر رکھ آتے اور پھر درختوں میں چھپ کر
انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹری سے اترے گی
بالکل دہشت پسندوں کا گروہ تھا۔ اب خیال
آتا ہے کہ اگر واقعی کبھی ایسا ہو گیا ہوتا۔ غالباً
سب کو جیل خانے بھیجا جاتا۔

یہ سب بڑے ہوئے تو اسے لیجئے۔ ایک
سے ایک عالم، فاضل چلا آرہا ہے۔ دو بہنوں
نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ کھٹاکھٹ
توڑ ڈالے۔ ننھیال میں جو بہن بھائی ہیں۔ ان
کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون
نے مانچسٹر یونیورسٹی ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی
کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بہت بڑے
سیاست دان بن گئے۔

بہت کم کنبوں میں اتنا زیادہ، قبیلے
کا احساس، ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً وہی
نرمت اور وہ مخصوص تہذیبی پس منظر ہے
جس کا ذکر میں نے ملدرم کے متعلق مضمون
میں کیا ہے۔ ہمارا کنبہ اب بہت دور دور تک
تتر بتر ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں
ہیں۔ کچھ لندن میں۔ بہت سے اپنے آبائی
وطن ہندوستان ہی میں رہتے ہیں۔
بعض وقت مجھے خیال آتا ہے۔ بھانت
بھانت کے انسانوں سے ملے۔ بھانت

بجانت کی معروفیتیں رہیں۔ پچپن رنگا رنگ مناظر سے پر رہا۔ اتر پردیش کے ہرے ہرے ضلع، ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں ۔ سب سے پہلی یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے کہ بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بمبئی، کلکتہ جنوبی ہند کی بندرگاہیں، ایران کے ساحل کربلائے معلیٰ، قاہرہ، ترکی۔ مستقل ادھر سے ادھر گھوم رہے ہیں۔

پہلی کہانی بھر چھ سال لکھی (یہاں صاحب! کیا بات ہے، ہونہار بروا۔) کہانی کچھ یوں تھی کہ ۲ کاٹھ گودام کا اسٹیشن تھا، رات کے بارہ بجے تھے۔ قُل لالٹینیں لیے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ جگنو کی قطاروں کی طرح نظر آتی دکھائی پڑیں۔ "دجرہ وغیرہ ماشاءاللہ کس قدر شاعرانہ تخیل تھا غور کیجئے کہ جگنوؤں کی قطاریں

پھر مدتوں تک گڑیوں کا بہت سخت سلسلہ رہا۔ گڑیاں ہی گڑیاں۔ ان کے لیے باقاعدہ اسکول کھولا گیا تھا۔ ایک جرمن سہیلی سے بہت سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ "لیڈی بیلنڈا" سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آمبڈ یا کچھ چاہتی نہیں مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے۔ عین برات کے وقت جرمن لڑکی جو تھی۔ اس سے کسی بات پر بگڑ کر کہہ دیا کہ بہرحال میرا گڈا خالص جرمن ہے۔ سید صابر لس سے آ رہا ہے۔ تمہاری "لیڈی بیلنڈا" جو ہے مگر تمہاری گڑیا ہے لہٰذا اس سے در بالی ہے۔ اسقدر غصہ آیا کہ برات واپس وشادی گئی عرصے تک شدید ایشی جرمن جذبات دل میں موجزن رہے۔

اسپورٹس اور ریاضی سے جان نکلتی تھی اسکول اور کالج میں کبھی جو باسکٹ بال کھیل کر دیا ہو۔ فساد کرانے میں بڑا لطف آتا تھا بیک وقت دونوں پارٹیوں میں شامل ہیں اور فساد کرا رہے ہیں۔ بعد میں خود ہی صلح کرا دی۔ اس وجہ سے کالج کی سیاسیات میں ہم کو بہت ہی اہم مقام حاصل تھا۔

اب یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ سب سے بڑی ٹریجڈی جو ہوئی وہ یہ تھی کہ اسی مستقل ہنگاموں کے چکر میں بغیر سوچے سمجھے جو کہانیاں وغیرہ کالج کے رسالوں کے لئے لکھتے تھے، وہ ادبی رسالوں میں چھپوا دیں۔ یہ ایسی ایکٹوٹی ہوئی ہے آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کوئی عقلمند آدمی انگریزی میں کہہ گیا ہے۔

LITERARY SINS HAVE LONG SHADOWS

یہ بہت ہی حسبِ حال مقولہ ہے یعنی یہ کہ اب بیٹھے اس قسم کا روح افزا تبصرہ سن رہے ہیں۔

ایک خاتون ہماری ایک کتاب کی ورق گردانی کر کے نہایت اطمینان سے بولیں آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں!۔ اور اس روز تو مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن چندر صاحب کی (جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے) یہ رائے پڑھی کہ "میرے جی ٹیم جانے" میں سوائے پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسے لیجئے۔ یہاں ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان تحریر کی تھی۔ کرشن چندر صاحب نے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ ختم کر دیا۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ کیا کیا جائے۔

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس "فٹ نوٹ" کا اضافہ کرنے کے ساتھ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ بذاتِ خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے۔ جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کی موجودہ حالات ہیں ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساسِ برتری کا شکار ہیں یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے COMPLEX میں گھرا ہوا ہے NORMAL کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا اور میں ان لوگوں کو بہت قابلِ قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری "شخصیت" تو بھئی یہ تو ایک بڑا جدید قسم کا خوفناک لفظ ہے شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری شخصیت — یہ کیا مسخرہ پن ہے۔

قرۃ العین حیدر۔ شمس الرحمان فاروقی

تخلیق بہ مقابل تنقید

شمس الرحمٰن فاروقی

پہلا سوال

آپ کی تخلیق پر کوئی نقاد اظہار خیال کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ نقاد سے کیا توقع کریں گے؟

(الف) نقاد آپ کی تخلیق پر فیصلہ جاتی انداز میں اظہار رائے کرے یعنی یہ بتائے کہ تخلیق اچھی ہے یا بری ہے اور اچھی یا بری ہونے کی وجہ بھی بیان کرے۔

(ب) نقاد آپ کی تخلیق کی تشریح و تعبیر کرے۔ تخلیق کے اچھی یا بری ہونے کا فیصلہ اس قاری کا ہو جو آپ کی تخلیق کو نقاد کی تشریح و تفسیر کی روشنی میں پڑھتا ہے۔

(ج) نقاد آپ کی تخلیق کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرے۔ وہ تخلیق پر نہ تو فیصلہ صادر کرے اور نہ اس کے معانی و مفاہیم کی تشریح کرے بلکہ وہ محض اس ذہنی کیفیت اور جذباتی ردعمل کا بیان کرے جو اس تخلیق کے ذریعے اس کے اوپر مرتب ہوئے ہوں۔

(د) نقاد فیصلہ دے، نہ تشریح کرے، نہ اپنے تاثرات بیان کرے، بلکہ آپ کی تخلیق کا سچا اور ایماندارانہ بیان تحریر کرے۔

پہلے طریقہ کار کو EVALUATIVE دوسرے کو INTERPRETIVE، تیسرے کو APPRECIATIVE اور چوتھے کو DESCRIPTIVE کہا جا سکتا ہے۔

... آپ کے خیال میں آپ کے نقاد کا صحیح منصب ان چاروں میں سے کس طرح کی تنقید لکھنے کا ہے؟

دوسرا سوال

کیا آپ اپنے نقاد کے لئے یہ مناسب سمجھیں گے کہ وہ آپ کی تخلیق میں ایسے معانی و مفاہیم تلاش کرے جو آپ کے عندیے (INTENTION) میں نہ ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ ممکن ہے بھی کہ نقاد آپ کے عندیے تک بلاشک و شبہ پہنچ سکے۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ کے نزدیک علامت اور استعارے کا تفاعل کیا ہے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے کہ علامت اور استعارہ معانی کو روشن یا وسیع تو کرتے ہیں لیکن فنکار کے عندیے کو مبہم بھی کر دیتے ہیں۔

تیسرا سوال

کیا آپ کا نقاد اس بات میں حق بجانب ہوگا کہ وہ آپ کی تخلیق پر اظہار خیال کرتے وقت آپ کی ذاتی زندگی کے واقعات اور آپ کی ذاتی رایوں اور پسند اور ناپسند کو بھی اپنے فیصلے یا تجزیے یا تاثر یا بیان کی دلیل میں لائے؟

چوتھا سوال

اگر فیصلہ کرنا نقاد کا کام نہیں ہے تو کیا یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ فن پارے کے بارے میں جو بھی اظہار خیال کیا جائے گا، اس میں کسی نہ کسی حد تک فیصلے کا عنصر بھی ہوگا۔ مثلاً یہی کہنا کہ "گئو دان کا مرکزی کردار ہوری ہے" فیصلہ جاتی بیان ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے گئودان کے تمام کرداروں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کرداروں میں ہوری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے یا مثلاً یہی کہنا کہ "اقبال کا مرثیۂ داغ میر انیس کے مرثیوں کی طرح کا نہیں ہے" فیصلہ جاتی بیان ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مرثیوں کی قسمیں اپنے ذہن میں قائم کر چکے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی فیصلے تک پہنچنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ CATEGORIES قائم کی جائیں۔ لہٰذا اگر ایسا ہے تو آپ یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ تنقید کو فیصلہ جاتی ہونا چاہئے؟

پانچواں سوال

کیا نقاد کو اس بات کا حق ہے کہ وہ آپ کی تخلیق کو اس بنا پر مسترد کر دے کہ زندگی کے بارے میں جو رویّہ یا کسی حقیقت کے بارے میں جو نظریہ آپ کی تخلیق میں ملتا ہے نقاد اس رویے یا نظریہ کو غلط سمجھتا ہے؟

قرۃ العین حیدر

پہلا جواب

نقاد اگر سمجھ دار اور مخلص ہے تو وہ چاروں طریقے استعمال کرے گا۔ لیکن (الف) کے علاوہ کیا باقی تین طریقوں میں سچائی اور ایمانداری نہیں برتی جاتی۔ معاف کیجئے گا آپ کے سوالات نظریاتی اور ٹکنکل قسم کے ہیں اور یہ دنیا کی کسی بھی زبان کے ادیب سے کئے جا سکتے ہیں۔ میں اردو میں لکھتی ہوں اور آپ بھی اسی زبان کے نقاد ہیں لہٰذا میں لامحالہ آپ کے سوالات کے جواب اپنے تجربے اور اردو کے ادبی ماحول کی روشنی ہی میں دوں گی۔

آپ نے ان چار طریقوں کے علاوہ پانچویں کا ذکر نہیں کیا جسے مصلحتی تنقید کہا جا سکتا ہے اور جو ذاتی تعلقات، ذاتی پرخاش ادبی سیاست اور دیگر اغراض و مقاصد کی بنا پر لکھی جاتی ہے اور اردو میں کافی رائج ہے اس نوجوان ادیب اور شاعر کا حالیہ واقعہ عبرت پکڑنے کے لئے کافی ہے کہ جب وہ مالی لحاظ سے صفر تھا تو اس کی تخلیقات پر کسی نے کچھ نہ لکھا مگر جب وہ کروڑپتی وغیرہ بنا تو اسے ایلیٹ اور حافظ اور مولانا روم سے برتر ثابت کیا گیا (اس کے متعلق ایک قصیدہ شب خون میں بھی چھپا تھا)۔ یا اگر یہ طے کر لیا جائے کہ فلاں افسانہ نگار کو FRONT

کرتا ہے تو اس کے ایک بے حد معمولی افسانے کے پانچ پانچ "تجزیاتی مطالعے" ایک ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ مثال کے طور پر یہاں بانو قدسیہ جیسی غیر معمولی اور بلند پایہ افسانہ نگار کا کہیں نام تک نہیں لیا جاتا۔ (یہ میرا فیصلہ جاتی بیان ہے) یا مثلاً میں ایک کتاب لکھتی ہوں ایک مشہور نقاد جو ایک رسالہ بھی شائع کرتے ہیں ایک اور مشہور نقاد سے اس کے خلاف طویل مضمون لکھواتے ہیں تاکہ ان کا چرچا CONTROVERSY کی صورت نکلے اور ان کا رسالہ زیادہ بکے۔

اس صورت حال میں دانشور نقادوں کی CREDIBLITY ایک ادیب یا ایک عام قاری کے لیے کتنی رہ گئی ہے۔ اور اس صورت حال میں آپ کے سوالات ذرا غیر ضروری سے معلوم ہو رہے ہیں۔

دوسرا جواب

آجکل ایک جناتی قسم کی تنقید لکھی جا رہی ہے (مثال:۔ مہدی جعفر) جس میں (الف) کچھ پتے نہیں پڑتا ہے کہ مضمون نگار کہنا کیا چاہتا ہے (ب) ایسے مفاہیم تلاش کر لیے جاتے ہیں جو لکھنے والے کے عندیے میں ہیں تھے اور نہ کسی علامت اور استعارے سے اس کا اشارہ ملتا تھا۔ ایک بار زیدی صاحب نے شاید "ایک باپ بکاؤ ہے" کے لئے مجھ سے کہا تھا کہ یار لوگوں نے اس میں اسطوری اور جانے کیا کیا نکتے ڈھونڈ نکالے ہیں جو ان کے ذہن میں نہیں تھے۔

اس کے برعکس میرا ذاتی مسئلہ یہ ہے کہ سوائے "آگ کا دریا" کے (جس کی بال کی کھال نکالی جا چکی ہے) میری تحریروں کے استعارے، علائم اور تلمیحات کو اکثر نقادوں نے قطعاً نظر انداز کیا ہے یا غلط مطالب اخذ کیے ہیں۔ مثلاً مراد آباد کے فساد کے متعلق افسانے "دریں گرد سوارے باشد" ایک خاصے مشہور ناقد کو مسلمانوں کی نئی زر پرستی کے متعلق افسانہ نظر آیا۔

ظاہر ہے کہ علامت و استعارے کا تفاعل وہی ہے جو ہونا چاہئے۔ آجکل یا بے حد مبتدیانہ اور OBVIOUS قسم کے علامتی افسانے لکھے جا رہے ہیں یا بے حد مبہم۔ استعارہ اتنا مبہم نہ ہونا چاہئے کہ بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ ورنہ ایک SANE تخلیق اور پاگلوں کی لکھی ہوئی تحریروں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ مغرب کے پاگل خانے اپنے ذہنی مریضوں کے لکھے ہوئے افسانے نظمیں اور ان کی بنائی ہوئی تصویریں شایع کرتے ہیں جو اکثر نہایت فکر انگیز اور مضطرب کرنے والی ہوتی ہیں۔ مگر وہ صحیح الدماغ کا ادب یا آرٹ نہیں۔

ذاتی طور پر میں ضرور ایک صاحب نظر نقاد سے یہ توقع رکھوں گی کہ وہ میری SECRET LANGUAGE کو سمجھ لے اور اس کی تفسیر و تشریح کر سکے۔ لیکن جب تخلیق کار اور ناقد کے درمیان ہی کمیونی کیشن نہیں تو یہ قصور کس کا ہے۔؟ ناقد کو بلا شک و شبہ میرے عندیے تک پہنچنا چاہئے۔ اگر وہ نہ سمجھ سکے تو اس کا برملا اظہار ہونا چاہئے۔ بغیر سمجھے بوجھے اپنی رائے دینا میرے نزدیک نقاد کا صحیح منصب نہیں ہے۔ علامت اور استعارے معانی کی توسیع ضرور کرتے ہیں لیکن فنکار کے عندیے کو مبہم اس وقت کرتے ہیں جب فنکار چاہے کہ معنی یا کسی اور مقصد سے وہ عندیہ مبہم رہے مجھ سے اکثر طنزاً کہا جاتا ہے کہ آپ کی تحریروں پر لکھنے کے لئے تو بہت سے علوم سے واقف ہونا چاہئے۔ یہ بالکل مہمل بات ہے اگر ناقدین نے اپنے آپ کو ادب کا یارکھ مان کر اپنی گدیاں سنبھالی ہیں تو یقیناً ان کو بہت سی پوتھیاں بانچنی چاہئیں۔ ادب ایکبری کدو چیز نہیں ہے۔

فن کار چاہتا تو ہے کہ علائم کے ذریعے معانی روشن ہوں اور وہ دھندلے ہو جاتے ہیں تو یہ لکھنے والے کی اپنی کمزوری ہے۔ بڑے فنکاروں کا ابہام ان کی طاقت ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا ہر فارسی تاریخ انگلستان

یا انگلو کیتھولک چرچ کی LITURGY سے واقف نہیں یا ایٹس کو آئیرش اساطیر جانے بغیر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ یعنی ان کے الفاظ کے ظاہری، یونیورسل، اندرونی معانی بھی گرفت میں آ سکتے ہیں۔ لیکن ابہام برائے ابہام جو پچھلے دنوں اردو میں رائج تھا لایعنی ہے۔

تیسرا جواب

تنقید لکھتے وقت فنکار کی ذاتی زندگی رائیں، پسند ناپسند وغیرہ کے متعلق CONTENT شعوری یا غیر شعوری طور پر نقاد کے ذہن میں عموماً پہلے سے موجود رہتا ہے۔ بالکل نئے لکھنے والوں کے علاوہ مشہور اہل قلم کے متعلق سب کو اتنا معلوم رہتا ہے کہ اس کا اثر ناقد کی رائے پر پڑنا ناگزیر ہے۔ میں نے آجتک میراجی کے متعلق کوئی مضمون ایسا نہیں پڑھا جس میں اس شاعر کی ابنارمل تعصبات کو زیر بحث نہ لایا گیا ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ ژاں ژینے کی طرح میراجی اپنی ابنارملٹی کو (CELEEBRATE) کرتے تھے۔ مگر مجاز، منٹو، ناصر کاظمی کی جو ہیں زندگیاں اور ان کی شراب نوشی یا کرشن چندر و فیض کی اشتراکیت سے وابستگی ان پر تنقید کے فریم ورک میں ہمیشہ شامل رہتی ہیں۔ انتظار حسین اور ان کی "ہجرت" کی MISTIQUE لازم و ملزوم ہو چکے ہیں جب کوئی "خوشبوؤں کے باغ" پر لکھنے بیٹھا ہے تو اسے پہلے سے معلوم ہے کہ انور سجاد ایک سیاسی آدمی ہے اور اس نے ایک سیاسی استعاراتی ناول لکھا ہے۔ آپکے TAINE کی تھیوری بھی تو یہی تھی کہ فنکار کی زندگی اس کی نسل قومیت سماجی پس منظر وغیرہ وغیرہ نقاد کے پیش نظر رہنا چاہئے۔ اردو میں خواتین کا معاملہ گویا ایک اور جہت کا اضافہ کرتا ہے ہمارے فکشن پر بڑی حد تک خواتین غالب ہیں۔ تنقید مردوں کا اجارہ رہی ہے (سوائے ایک خاتون ممتاز شیریں جو مرحوم ہو گئیں) اور نقدیں

باقی صفحہ ۔۔۔ پر

فتح محمد ملک

قرۃ العین — اپنی تلاش میں

قرۃ العین حیدر کے ہاں تلاشِ ذات کے سفر کے موجودہ مرحلے کا خیال کرتا ہوں تو اقبال یاد آتے ہیں۔ اس تلازمِ خیال پر غور کرتا ہوں تو اقبال اور قرۃ العین کے کارنامۂ فن میں چند در چند مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ اقبال ہی کے مانند قرۃ العین بھی آتشِ رفتہ کے سراغ میں ہیں اور ان کی ساری سرگزشت بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو سے عبارت ہے۔ اقبال نے ہماری شاعری کو فلسفیانہ رنگ و آہنگ بخشا تو قرۃ العین نے ہماری فکشن کو گہرے فلسفیانہ انداز میں سوچنا سکھایا۔ دونوں کی تخلیقی بے چینی کا سرچشمہ ایک ہے۔ دونوں کا سوز و سازِ آرزو ہندی مسلمانوں کے اجتماعی مقدر پر غور و فکر سے پھوٹتا ہے اور دونوں کے ہاں یہ موضوع بالآخر وقت اور تاریخ کی ماہیت و معنویت پر فکری و تہذیبی مراقبہ بن گیا ہے۔ پھر ہر دو مفکر فن کار ہم نصیب بھی ہیں۔ اقبال عمر بھر جس فکری تنہائی اور روحانی اضطراب سے دوچار رہے، فکری اجنبیت اور روحانی جلاوطنی کا وہی احساس قرۃ العین کا مقدر ہے:

"دور سے جبل الطارق نظر آیا۔ اماں بہت مضطرب ہو کر کھڑکی سے لگی اس چٹان کو دیکھا کیں اور اقبال کے اشعار دہراتی رہیں اس پوری نسل کو اقبال اور اسلامی تاریخ اور اسلامی تجدید کے جذبے اور اپنے ماضی کے ورثے اور اس کی المناک گم شدگی کا بڑا شدید احساس تھا حالانکہ ان لوگوں نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ دورِ حاضر کی کوئی لڑکی میرے خیال میں جبل الطارق کو دیکھ کر متاثر نہ ہوگی۔ شاید اسے اس چٹان کی معنویت کا علم نہ ہو۔"[1]

قرۃ العین عہدِ حاضر کی شخصیت ہیں لیکن انہیں جبل الطارق کی تہ در تہ تاریخی اور جذباتی معنویت کا احساس ہے۔ یہی احساس انہیں اپنے معاصرین میں ایک یگانۂ روزگار ہستی بھی بناتا ہے اور فکری تنہائی اور تہذیبی بے چارگی سے بھی دوچار کرتا ہے۔ جس زمانے میں قرۃ العین حیدر نے شعور کی آنکھ کھولی وہ زمانہ ہماری ادبی دنیا میں نئے اور ترقی پسند ادب کے فروغ کا زمانہ ہے۔ اپنی تہذیبی اور ادبی روایات کا باغی ادب فقط لمحۂ موجود کی اسیری پر نازاں ہے۔ اقبال کے مرزِ فکر و احساس سے بغاوت اور آبائی چلن سے انحراف جدیدیت پرستی اور ترقی پسندی کا لازمہ ہے۔ ایسے میں قرۃ العین اپنے والدین سے کسی نفسیاتی پرخاش یا فکری عناد کو پروان چڑھانے کی بجائے ان سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں۔ جن روایات اور اقدار سے ان کی زندگیاں عبارت تھیں انھیں سینے سے لگاتی ہیں۔ ان کی شخصیتوں میں انھیں [illegible] رنگ ہی رنگ نظر آتا ہے۔ جس باشعور محبت کے ساتھ انھوں نے اپنے عظیم باپ کی شخصیت[2] اور محمد علی ردولوی کے فن[3] پر قلم اٹھایا ہے وہ جدید ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب اپنی تاریخ اور تہذیب کو رد کرنا ایک غالب ادبی رجحان تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنے مخصوص تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے حسن و قوت کو اجاگر کیا اور اس بات پر غور و فکر ترک نہ کیا کہ ان کے ابا اماں وقت بے وقت اقبال کے اشعار کیوں گنگناتے رہتے تھے۔ اسی غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ مادی جبر اور وسط کے عہد میں انھوں نے برملا اعلان کیا کہ:

---

[1] کارِ جہاں دراز ہے

[2] سید سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ نقوش، شخصیات نمبر حصہ اول، ۱۹۸۳ء

محمود نیر

[3] داستان طراز، مطبوعہ سویرا، لاہور، شمارہ ۱۹

"لکھنا ایک مابعد الطبیعاتی عمل ہے۔ اس طرح لکھنا جیسے عطیے پر بارش ہو رہی ہو۔ ادراک، اکتساب، تجزیہ، تشریح، ترجمانی، اطلاع، خبررسانی، یہ سب ایک عمل میں شامل ہے ...... کوئی ایک معمولی سا واقعہ اور آپ ایک نئے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

تین چار سال ہوئے آپا نے مشین پر سلائی کرتے ہوئے یوں ہی باتوں باتوں میں کہا، "اپنے قصبے میں جاڑے آتے ہی ہم ہارسنگھار سے دوپٹے رنگتے تھے اور جب بسنت آتی تھی ——"

ان کی بچی نے جو چار سال کی عمر سے کراچی میں رہ رہی ہے ایلس پریسلے کی سوانح حیات پر سے سر اٹھا کر پوچھا "اماں بسنت کیا ہوتی ہے؟"

اس ایک جملے کو سننے کے بعد میں نے آٹھ سو صفحات کا ناول لکھ مارا۔ اماں! بسنت کیا ہوتی ہے؟"

ساری دنیا، ساری کائنات کا تجزیہ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر تلاش کسی ایک نقطے سے تو شروع کی جا سکتی ہے[1]"

بسنت کی تلاش میں قرۃ العین "آگ کا دریا" عبور کر کے اپنے آبائی قصبے میں پہنچیں تو وہاں اور ہی نقشہ پایا۔ اب یہاں نہ وہ بسنت تھی نہ وہ بستی نہ وہ لوگ۔ "آگ کا دریا" کے آخری باب میں جب کمال رضا، ہری شنکر اور گوتم نیلمبر سے ملے بغیر پاکستان لوٹ آتا ہے تو وہ دونوں اکٹھے سوچنے لگتے ہیں کہ:

"ابوالمنصور کمال الدین کس طرح ہند[illegible]ں میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا؟[2] ——"

—— بسنت کیسے ہندوستان میں نمودار ہوئی تھی اور کیوں کر غائب ہو گئی؟ —— نہٹور کی بستی کیسے بستے بستے بسی تھی اور کس طرح آن کی آن میں تاراج ہو گئی ہے —— یہاں سے قرۃ العین کے ہاں تلاش کا وہ نیا سفر شروع ہوا جس کے احوال و مقامات اور واقعات و مشاہدات "کارِ جہاں دراز ہے" میں جلوہ گر ہیں۔

"کارِ جہاں دراز ہے" کی شانِ نزول حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تجدیدی کارناموں کے نقطۂ آغاز کی یاد دلاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے خواب میں اشارہ پا کر "حجۃ اللہ البالغہ" لکھنا شروع کی تھی اور قرۃ العین نے نہٹور کے ویران آبائی مکانات کے کھنڈرات میں ہاتف کی صدائے "برخیز و بنگر" سن کر کوفے سے کوفہ تک صدیوں پر پھیلے ہوئے سفر کا عزم باندھا اور جب بارہ سو سال تک مختلف زمانوں اور زمینوں میں سرگرداں رہنے کے بعد منزل پر پہنچیں تو انجام میں آغاز کا منظر دیکھا:

"میں دشتِ لوط کے کنارے کھڑا ہوں۔ کس طرف جاؤں؛ موت کہیں بھی کسی راستے سے آ سکتی ہے۔ چمکیلے خنجر کا وار، زہر کا بلوریں پیالہ، زنداں کے دروازے پر جلاد کی دستک۔"

یوں قرۃ العین اپنی جڑوں اور حقیقت کی دوسری جہات اور جہتوں کی تلاش کے لیے "دل کی مشعل جلا کر وقت کی اندرونی ہفت خواں" طے کرتے کرتے ۱۲۲ھ کے دمشق میں امام زید بن زین العابدینؒ تک جا پہنچتی ہیں۔ اقبال قرۃ العین کے خون میں بولنے لگتا ہے اور عہد در عہد صدیاں پھر سے زندہ ہو کر ان کے کانوں میں ایسا طلسم پھونکتی ہیں کہ ہر واقعہ سراسر حیرت اور تنبیہ الغافلین نظر آتا ہے اور اپنی تمام تر جلا وطنیوں اور ہجرتوں کا سبب اسلام پر ملوکیت کے غلبے میں دیکھتی ہیں:

"اللہ کی دنیا بڑی عجیب و غریب ہے۔ کون کون کدھر نکل گیا۔ کیسی کیسی اجنبی اقوام کے درمیان جا بسے۔ آگے کیا ہو گا۔ [illegible]۔
فتح خراسان کو عرصہ ہو چکا۔ بخارا، سمرقند اور ترمذ میں عرب نوآبادیات قائم ہیں۔ دمشق و بغداد سے بہت دور ماوراء النہر میں شاید امن نصیب ہو۔ ایک وقت تھا کہ ہم آلِ حسنؑ و حسینؑ مدینہ میں خاموشی سے رہتے تھے مگر خدا کی قسم منصور کے جاسوسوں نے ہماری زندگیاں تلخ کر دیں۔

---

[1] [illegible] منقول ہے۔ مطبوعہ نقوش لاہور، [illegible] ۱۹۵۹ء، ستمبر ۱۹۸۲ء
[2] صفحہ ۸۳۰

چنگاری ۹

کہا جاتا ہے کہ اہلِ ایران شہزادی شہر بانو کی وجہ سے ہم سے محبت کرتے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ سیاسی معاملات زیادہ پیچیدہ اور نازک ہیں۔ میری سمجھ میں کبھی نہ آئے۔

بلخ کے آتش کدے سرد ہو چکے۔ امیر سامان نے کلمہ پڑھ لیا۔ دیلم کے کریم بن شہریار نے کلمہ پڑھ لیا مگر ساسانیت ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے۔ حاکموں نے بادشاہت کے آداب اختیار کر لئے۔ سامان کے لڑکوں کو حکومتیں بخشی گئیں۔ نوح سمرقند، احمد غزنہ، الیاس ہرات۔ سب نے اپنا شجرۂ نسب بہرام چوبیں سے جوڑا۔ سارے حاکم خود کو خسروؔ اور دارا کہلوا کر خوش ہو رہے ہیں۔ بخارا اور سمرقند گھوم کر آؤ تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کیسی بدلی ہے۔ سامانی دربار میں رودکی قصیدے پڑھتا ہے؛

شاہ ماہ است و بخارا آسماں   شاہ سرو است و بخارا بوستاں

ہائے ابوذر غفاریؓ

ملک گیری، کشور کشائی اور ملوکیت کے معاملات عبرت ناک ہیں ......"

——ملوکیت کے معاملات عبرت ناک ہیں چنانچہ کلمہ گو شہنشاہوں کے قیصر و کسریٰ سے مستعار آئین جہانداری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والوں پر ظلم و ستم کے وہ وہ پہاڑ توڑے گئے کہ لوگ دار و گیر کے خوف سے جنگلوں اور ویرانوں کو نکل گئے اور!

"یہ جو بعض اصحاب کا قول ہے کہ مذہب اسلام میں قطع علائق ممنوع ہے۔ اکابر صوفیا، راہبانِ مسیحی و اہل ہنود سے متاثر ہوئے۔ ہمارے نزدیک یہ نظریہ چنداں صحیح نہیں۔ کس واسطے کہ جب امتِ رسول کے حاکموں نے طور طریق شاہانِ عجم کے اختیار کیے۔ خود کو بصد ناز خسروؔ و دارا کہلوایا، وہ اور ان کے حاشیہ بردار مظالم غربا پر کرتے تھے۔ تب ائمہ و اولیا نے اقتدار پرستی کے خلاف ایک تحریک گویا شروع کی اور ہم جو ائمہ اور صوفیا کی نسل سے ہیں ارکانِ دولت میں شامل ہو کر داخل طبقۂ امرا میں ہوئے۔ لبادے کارچوبی طلائے مغرق زیب تن کرتے تھے۔ ہاتھیوں پر سوار رہتے تھے۔ شیخینؓ اور اویس قرنیؓ اور ابوذر غفاریؓ کو بھول گئے، اور یہ سراسر فراموش کر چکے تھے کہ ملوکیت و شہنشاہیت کے معاملات عبرتناک ہیں"۔

——شہنشاہیت کے معاملات عبرتناک ہیں۔ سو، امام زین العابدینؒ کی اولاد میں سے ایک صوفی بزرگ غریب الوطنی کو شہنشاہیت کے ساتھ سمجھوتہ بازی پر ترجیح دیتے ہیں اور یوں سید کمال الدین ترمذی "کفار کو دین مبین کی راہ پر ڈالنے کے عزم سے" اپنے بی بی بچوں کے ساتھ "ہندوستان" ہجرت کرتے ہیں۔ "کارِ جہاں دراز ہے" سید کمال الدین ترمذی کی اولاد کی بارھویں صدی عیسوی کے ربع آخر سے لے کر بیسویں صدی کے ربع آخر تک پھیلی ہوئی نسل در نسل مادی اور روحانی سرگزشت ہے۔ دس برس کی دلسوزی اور دیدہ ریزی کے ساتھ قلم بند ہونے والی اس "طلسم ہوشربا" کو قرۃ العین نے سوانحی ناول کہا ہے مگر میں اسے اسلامیان ہند کی تہ در تہ اجتماعی شخصیت کا آئینہ سمجھتا ہوں۔ مسلمانوں کے برصغیر میں جڑ پکڑنے سے لیکر برگ و بار لانے کے سماں تک اور پھر پت جھڑ کی چیرہ دستیوں سے دوچار ہو کر مانند ایک خوشبو کے دیس دیس ہجرت کی داستان اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ اس نادر و نایاب فن پارے میں جلوہ گر ہے۔

اسلامیانِ ہند دورِ سلطنت سے دورِ مغلیہ میں کیونکر داخل ہوئے ہیں، اس دورِ جاگیرداری کی فضا سے نکل کر ڈپٹی کلکٹروں کی سول لائینز میں خان بہادروں کا نیا طرزِ زیست کس ٹھاٹھ سے اپناتے ہیں اور پھر برطانوی سنگینوں کے زور سے قائم کی گئی جغرافیائی وحدت کے ٹوٹنے پر پاکستان بنگلہ دیش اور بھارت کی آزاد ریاستوں میں جبر و قدر کی گتھیاں سلجھانے میں کس طور سرگرداں نظر آتے ہیں —— آٹھ صدیوں پر پھیلی ہوئی یہ رزمیہ قرۃ العین نے جس آفاقی تناظر اور جس باشعور جنون کے ساتھ بیان کی ہے وہ اقبال کے بعد آج تک کسی دوسرے فن کار کو نصیب نہ ہو سکا۔ پھر اسالیب کا ایسا حیرت انگیز تنوع ہے کہ قصۂ قدیم و جدید واقعتاً کم نظری کی دلیل معلوم ہوتا ہے اور پوری کتاب زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک——

کا جیتا جاگتا ثبوت بن جاتا ہے۔ راوی عہد بہ عہد اپنی شکل بدلتا ہوا قرونِ وسطی کا سفرنامہ نگار، مورخ، صوفی تذکرہ نگار، درباری وقائع نویس، داستان گو، جدید ناول نویس، سیاسی کالم نگار اور اردو افسانہ نگار کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ خود قرۃ العین نے "حادثات و واقعات کے الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے اس پیر جہاندیدہ کا دوسرا نام وقت" بتایا ہے۔

وقت کہ تیغ قاطع اور برہان ناطق ہے قرۃ العین کے ہاں عصر رواں سے زمان دائم اور زمانِ دائم سے عصر رواں بنتا نظر آتا ہے:

یاد رہے کہ پچھلا وقت آج سے منسلک ہے۔ کوئی سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا ازل سے ابد تک وجود مبہم اور مسلسل اور مستقل ہے سامنے کا ہر واقعہ ہم سے بہت نزدیک ہے۔ تاریخ کی مجموعیت اور تسلسل اور معنویت کا جس قدر شدید احساس ہم محمڈن لڑکوں کو ہے۔ دنیا کی کسی قوم کو نہیں۔ ہر واقعہ اور حادثہ موجود ہے۔ ہم حال میں زندہ ہیں مگر ماضی میں اسی شدت کے ساتھ شامل ہیں۔ ہر زمانے میں ہم شریک رہے ہیں۔ بات مابعد الطبیعیات کی طرف چلی جائے گی .....''

بات اکثر مابعد الطبیعیات کی طرف نکل جاتی ہے خصوصاً جب قرۃ العین ماضی کی ہم عصریت اور حال میں ماضی کی کارفرمائی پر غور و فکر کرتے وقت مسلمانوں کے تصورِ زماں اور تصورِ تاریخ سے روشنی لے رہی ہوں۔ ایسے میں" تیرہ سو برس کی تاریخ کے بے بہا خزانے" ان کے کرداروں کے "نسلی حافظے اور خون" میں کروٹیں لینے لگتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں سے:

مسٹر ڈوشر پنے جافرت الحیال، اپنا عالم رویا رکھتا ہے جس میں کوئی دوسرا شامل نہیں ہو سکتا جس طرح ہم کسی دوسرے کی موت کی تکلیف نہیں چکھ سکتے کسی اور کے خواب نہیں دیکھ سکتے ہر انسان کے دن رات، صبح شام لمحات منفرد اور علیحدہ ہیں۔

عذاب قبر۔ وہ سزائیں جو تم بھگتو گے۔ اس حس کے ذریعے ہو گے جو صرف تمہاری حس ہو گی اور جو زندگی میں تمہیں حاصل نہیں۔

اس عالم سے اس عالم تک خالص اذہان، فرشتے اور روحیں اور الہام اور رہا ہن کرتے ہیں بسہروردی نے کہا تھا یا ابن العربی نے؟

ایکا ایکی ایک جماعت ادھر سے گذری۔ سب کی صورتیں مختلف۔ رجال الغیب ہوا میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ اخیار و ابدال اور ابرار اور اوتار اور اقطاب کے گروہ آسمان پر چل رہے ہیں۔

سارا عالم قوس و قزح میں تبدیل ہو گیا.....''

یہ واردات ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے باغی سپاہی میر احمد علی کی ہے جسے قرۃ العین نے "شخص نامعلوم" کے عرف کے ساتھ روح عصر قرار دیا ہے اسلامیانِ ہند کی رثائے حریت کا یہ استعارہ گاگن ندی کے خاموش پانیوں کے کنارے میٹھا صحنوں کو یاد کر کے روتا ہے اور سوچتا ہے:

"ضیاء الدین صاحب پھر واپس آگئے ؟ وہ کیا سامنے کھڑے ہیں۔ فلاسفہ کی کتابوں میں آیا ہے کہ ہمارے سارے اجداد ہمارے اندر زندہ ہیں جسمانی اور مابعد الطبیعیاتی دونوں طرح۔

ہم خود اس وقت میر ضیاء الدین کی آنکھوں سے اس سرد ویرانے کو دیکھتے ہیں۔ ضیاء الدین کی آنکھیں اور ہماری آنکھیں ایک ہیں۔ ہمارے ابا کسی اور نگڑ دادا کے ہاتھ ہیں دماغ، عقل، فہم یا نانا کسی اور پرکھے کی عقل یا نانا ہی ہے۔

ہماراہزاروں برس سے شریانوں میں گردش کر رہا ہے۔ تجدید الخلق۔ سوچ کر پھریری سی آجاتی ہے۔ مولانا روم نے کیا فرمایا تھا۔ کچھ ضرور فرمایا تھا۔ یاد نہیں آیا۔ حافظہ کمزور ہو چلا.....''

بے شک ہمارا حافظہ کمزور ہو چلا ہے۔ اقبال کے بعد تو ہمارا حافظہ کمزور ہوتے ہوتے معدوم ہو چلا تھا کہ بعد ایک مدت کے قرۃ العین حیدر ہمارا اجتماعی حافظہ بن کر نمودار ہوئیں اور پتہ چلا کہ ہماری تہذیب میں مافوق الفطرت، فطرت کی توسیع ہے، ماورائے حقیقت، حقیقت کا جزو لاینفک ہے۔ عشق کی تقویم میں اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام اور یہ زمانے عصر رواں میں جاری و ساری بھی ہیں اور عصر رواں سے الگ تھلگ بھی ہیں:

ستمبر ۱۹۸۳ء

"بارہویں اور بیسویں صدی کے درمیان وقفہ صرف ایک پل ایک آن کا ہے!" (زمیں سے جت)

"آنسوؤں کا فرات تیرہ سو برس سے بہہ رہا ہے۔ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے غلامانِ اہلِ بیت اطہار اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں گویا واقعہ کربلا آج کی بات ہے!" (امام باڑہ)

"چھ سو برس قبل ابن بطوطہ نے رپورٹ کیا تھا کہ کنارے فرات شہر دجلہ میں مسجد کے دروازے پر حریر کا پردہ لگا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام مہدی قائم آلِ محمدؐ اسی مسجد میں داخل ہو کر مستور ہوئے۔ روز شام کو غروبِ آفتاب کے وقت شیعہ وہاں جمع ہو کر گریہ و بکا کرتے ہیں۔ اخرج یا صاحب الزمان۔ اخرج یا قائم المنتظر ـــــــ رات گئے تک روتے چلاتے رہتے ہیں۔ حریر کا پردہ اسی طرح ساکت رہتا ہے۔ پھر وہ مایوس ہو کر گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

گدائے پاشاؤ، شریفو، آغاؤ، سیدو، خان بہادرو، آج سارا دارالسلام سرنگوں ہے، سب مل کر پکارو ـــ اخرج یا صاحب الزمان اخرج یا حجت اللہ، یا قائم المنتظر۔

خفیہ کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ جگہ جگہ چپکے چپکے میٹنگیں کی جا رہی ہیں۔ طہران، استانبول، قاہرہ، بغداد کے قہوہ خانوں میں سازشیں ہو رہی ہیں۔ زمانہ نازک ہے اور دیکھو کل کی بات ہے جب بنی امیہ کے خلاف، بنی عباس کے خلاف، بنو فاطمہ کے خلاف کیا کیا خفیہ میٹنگیں نہ ہوئیں۔ یہی کوچہ و بازار، یہی دشت و صحرا، یہی انسان، ان کے اب وجد۔ آج شاہانِ قاچار اور آلِ عثمان اور خاندانِ رامنوف اور اولاد وکٹوریہ کی باری ہے

طہران، استانبول، سینٹ پیٹرز برگ، ماسکو، باکو، لندن، پیرس، کلکتہ، ہر شہر میں سر پھرے لونڈے خفیہ مسکوٹ کر رہے ہیں۔ زمانہ خطرناک ہے۔

مستقبل کی محراب کا پردہ اسی طرح ساکت ہے اور نوجوان ایشیا اور افریقہ اس کے سامنے کھڑا چلا چلا کر پکار رہا ہے۔ اخرج یا صاحب الزمان۔ اخرج یا روحِ انقلاب!" (باب عالی)

یہ بیسویں صدی کے آغاز کا ایک لمحہ ہے۔ آج بیسویں صدی اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لمحہ دنیائے اسلام میں منجمد ہو کر رہ گیا ہے:

"مسلمان محض دعاؤں اور عظمتِ رفتہ کے خوابوں کے سہارے جی رہا ہے۔ نئی دنیا اس کی سمجھ میں نہیں آتی مگر بلائے سطلے، نجف اشرف اور مشہد ہر جگہ سے حسبِ معمول گریہ و زاری کا شور بلند ہو رہا ہے!" (باب عالی)

در سلاطین و ملوک:

"کاتا زمینوں کی طرف حسبِ معمول کمال استغراق ہے اور صاحب لوگ جنٹلمین لوگ، فوجی، سویلین اور تاجر پی اینڈ او کے جہازوں پر سوار جبل الطارق اور سویز سے گزرتے ہوئے مراقش سے لے کر افغانستان تک بادیہ نشینوں کے خیام لوٹنے میں مصروف ہیں۔ مشرق میں ہر سمت سوا جہالت، سوا پسماندگی اور درماندگی، غلامی، ناداری، تباہی اور کیا نظر آتا ہے۔

السلام علیک یا بنتِ رسول اللہ!" (باب عالی)

لو دو زوال اور استبداد کا یہ لمحہ دنیائے اسلام میں اٹل ہو کر کیوں رہ گیا ہے؟ ـــ قرۃ العین نے اس سوال پر بڑا قیمت اور

چنگاری ۱۲

رقت کے بجائے ایک حقیقت شناس اور ترقی پسند شعور کے ساتھ تخلیقی مراقبہ کیا ہے اور اس عمل کے دوران خود کو اپنے مراعات یافتہ طبقے سے جزوی الگ کیا ہے:

"ماسٹر برٹ لانڈ ...... منی بس میں میرے برابر بیٹھے ہوئے کزن نے کہا: باجی یہ سارا علاقہ اپنا تھا:
معلوم ہے۔ وہ خدایا! یہ زمیں، تیری نہیں تیری نہیں۔ تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں۔ یوپی اور سارے ہندوستان میں مسلم اہل حرفہ کا ایک متمول اور ترقی پذیر طبقہ پیدا ہو چکا ہے۔" (تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا)

"ہاؤ خوداآئی برخیزا — بہٹور، انگوی، محمود پور — اردوئے شاہجہانی کے ان تین گمنام، ویران خیموں کی روداد — بنگرا — فیوڈل سماج اپنے افراد کو DELUSIONS OF GRANDEUR میں مبتلا رکھ کر عمر طبعی کو پہنچ کر کس طور سے ختم کرتا ہے۔ کھول آنکھ! اور اسی محلہ سادات سہ دری میں صدیوں کے درماندہ جنکروں اور کاریگروں کی نئی خودداری اور خوش حالی کو ذرا دیکھ کہ یہ نئے سماجی انقلاب کی ایک خوش آیند علامت ہے۔ منفی کہانی کہ وقت گل ——
یہ انقلاب میں نے بات کاٹی، خاصا سست خرام ہے اور ادھوری علامتیں کافی نہیں۔ مجھے چیزوں کی ابتدا جاننے کی ہمیشہ لو رہی۔ میر صاحب، خان صاحب اور نواب صاحب رفعت پناہ کیوں تھے اور ناحق چرٹ جوا کیوں کھاتا تھا۔ وجہ معلوم ہے علاوہ ازیں خود غرضی اب بھی موجود ہے۔" (تعارف)

قرۃ العین حیدر مسلمانوں کی فکری اور تہذیبی تاریخ کو مسلمانوں کے امپیریل ماضی سے الگ کر کے دیکھتی ہیں۔ لکھنا ان کے لئے "ایک مابعد الطبیعیاتی عمل ہے۔" اور اقبال کے مصرعے صفحۂ قرطاس پر بارش کی مانند گرتے ہیں[1]۔ کچھ یہی صورت انبیاء، ائمہ اور صوفیا اولیا کے ملفوظات کی ہے۔ مسلمانوں کا زندہ ماضی اُن کے خون میں یوں گردش کر رہا ہے کہ "سری رنگا پٹنم" کا "بورڈ" دیکھ کر ہی دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا ہے۔" اسی دوران سفر ہمکارن سے یہ گفتگو ہوتی ہے:

"کیا نام ہے؟"
"تجاندلی بی!"
"بچے کا نام!"
"حسین صاحب"
"تجاندلی بی، مجھو صاحب، حسین صاحب! — صاحب یہ مابعد التواریخ ہے۔" (دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں)

برسوں پہلے "نقوش" کے شخصیات نمبر میں ابن سعید کے مضمون پر اپنے فٹ نوٹ میں قرۃ العین نے لکھا تھا:

"قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی انوکھی ہستی نہیں ہوں۔"

اور جب سارے گھرانے کا احوال رقم کرنے بیٹھیں تو مابعد التواریخ کی خوابناک فضاؤں میں جا نکلیں۔ کائنات اور وقت کے باطن میں قرۃ العین حیدر کا سفر ہنوز جاری ہے۔ دیکھئے اگلی منزل کہاں ہو!

---

[1] مثال کے لئے دیکھئے باب بعنوان: یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ۔

ستمبر ۱۹۸۳ء

معروضی تنقید

رفاد فہمی

ہر زندہ نسل اپنی تنقید اپنے معیار اور پیمانے خود بناتی ہے۔ اسی سے توصیف کے پیمانے بنتے ہیں اور اسی سے گمنام ادیب اور ادبی ادوار دوبارہ اہمیت حاصل کرتے ہیں اور نامور ادیب اور ادوار گوشۂ گمنامی میں جا چھپتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ہر دور اپنے پچھلے دور سے ذہنی سماجی تہذیبی و فکری اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی ضروریات، تقاضے اور عوامل جدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ادبی رجحانات اور انکے مطالعے کا انداز بدلتا رہتا ہے اگر ہم ادبی تنقید کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ ہر زمانے میں ادبی تنقید اس زمانے کے فلسفے یا سائنسی اصولوں سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر ہم یہ کہیں کہ ہر زمانے کا انداز فکر ہی اس زمانے کے ادبی تنقید کا دائرہ عمل متعین کرتا ہے تو شاید غلط نہ ہو۔ جبھی ادبی تنقید ادیب کے ذہن میں جھانکنے کی غرض سے نفسیاتی اصولوں کا سہارا لیتی ہے تو کسی دور میں ادب کے سماجی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے سماجیات کا دامن تھامتی ہے۔ تو کبھی ادب میں جمالیات کا تجزیہ کرنے کے لیے دیگر سائنسی علوم کا سہارا ڈھونڈتی ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرانے معیاروں پر ہمیشہ نظر ثانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تاکہ نئے معیار نئی نسل کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کر سکیں بیسویں صدی میں سائنس کی ترقی اور پھر اس کے عام استعمال کیمو نیکلس انجینئرنگ اور مشینی ترقیوں نے ادبی مطالعوں میں تنقید نگاروں کو بھی سائنسی رنگ دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادب کے سائنسی مطالعے کے نام پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس کا رشتہ سائنس کے مختلف شاخوں کے کچھ شعبوں تک ہی محدود رہا ہے۔ ان تنقیدی مطالعوں میں اس انداز فکر کی جھلک نہیں نمایاں ہو سکی جو سائنسی مطالعے کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھئے تو ایسا ہونا نہ صرف فطری بلکہ ادبی تنقید کے لیے بے حد ضروری بھی تھا۔ اگر ادب کا یہ سائنسی مطالعہ پورے طور پر سائنسی رنگ میں رنگ گیا ہوتا تو پھر علم کیمیا کے مطالعے اور شاعری کے مطالعے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا در حقیقت تنقید کو سائنٹفک بنانا ان اصولوں کو سائنٹفک بنانا ہے جن اصولوں کو مد نظر رکھ کر ہم ادب کا تجزیہ کرتے ہیں۔ تنقید کی بھی سائنٹفک تکنیک فن پارے کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس کی تہہ تک پہنچنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔

نے اپنے ایک مضمون میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ادبی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یکے بعد دیگرے دو معیاروں کا استعمال کریں۔ یعنی خالص ادبی معیار اور غیر ادبی معیار۔ عام طور پر تحسین اور محاکمے میں ہم یا تو ادبی کارنامے کے کسی پہلو پر اظہار رائے کرتے ہیں یا پھر موضوع کی معنویت اور پھیلاؤ پر۔ اس سے ادبی کارنامے کی سالمیت مجروح ہوتی ہے۔ ادبی کارنامہ ایک مکمل وجود ہے اس طرح عناصر کے تفریق اور انتشار کے ساتھ دیکھنا درست نہیں۔ ایلیٹ کسی فن پارے کو کوئی ایسی الہامی چیز تسلیم نہیں کرتا جو شدت جذبات کے ساتھ ایک خاص شکل اور ایک خاص لے میں خود بخود وجود میں آ گیا ہو وہ فن پارے کو ایک شے کی طرح سمجھتا ہے جسے سوچ سمجھ کر ناپ تول کر سلیقہ اور محنت سے تعمیر کیا جاتا ہے جس کا مقصد ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ کام ایلیٹ کے خیال میں بصری امیجز اور موزوں الفاظ کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ ایلیٹ کے اس قول کی روشنی میں ادب کے مطالعے میں الفاظ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ الفاظ یعنی زبان۔ اپنے اندر لازوال قوت کا خزانہ رکھتے ہیں۔ الفاظ اور زبان کے ذریعے ہی ادیب یا شاعر کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ جمالیاتی احساس کو فکری احساس میں تبدیل کر دے۔ الفاظ اور زبان ہی کے وساطت سے یہ موقع میسر آتا ہے کہ وہ اس رد عمل کو جسے آرٹ کے مواد نے اس کے اندر پیدا کیا ہے ایک لطیف اور نازک سانچے میں ڈھال دے۔ روایتی ادبی تنقید میں ایک عام غلطی جو ہم سے سرزد ہوتی ہے وہ یہ کہ ہم الفاظ کو ایک بے جان اور منفعل سی چیز سمجھتے ہیں اور انھیں اس پورے عمل میں ایک ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ ہم بہت آسانی سے یہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ الفاظ نہ صرف جذبات کی زبان ہیں بلکہ وہ جذبات میں گہرائی ہمواری اور زرخیزی بھی پیدا کرتے ہیں اور محض مطالب کو خارجی لبادہ نہیں پہناتے بلکہ ان کی وسعتوں میں اضافہ کرتے ہیں اور ان میں وزن و وقار پیدا کرتے ہیں۔ گو یہ حقیقت ہے کہ اسلوب صرف الفاظ کا نام نہیں لیکن ہم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اسلوب ذہنی

نظر آتا ہے جہاں شخصیت الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے. مثال کے طور پر غالب کی شخصیت مزاج کے رنگ کے بغیر مکمل نہیں. غالب کی شخصیت میں نظر آنے والی مزاح کی حیثیت ان کے اسلوب کی شناخت بن جاتی ہے. مثلاً

چاہتے ہیں خوب رولوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

• • •

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

• • •

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

• • •

ان مثالوں کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں غالب کی شخصیت الفاظ کا جامہ پہن کر ان کے اسلوب کی شناخت بن جاتی ہے. لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معیاری تنقید صرف جذباتی ردعمل کا نثری بیان نہیں ہوگی. دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تنقید بیک وقت موضوع فن اور زبان پر نظر رکھتی ہے. اس کے پیش نظر یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کون سے انسانی مسائل ادبی اور فنی تخلیق میں سموئے گئے ہیں اور اس سلسلے میں کس قدر جمالیاتی قدروں کا لحاظ رکھا گیا ہے. روایتی اردو تنقید ہر شاعر کو علاحدہ علاحدہ دیکھتی رہی ہے. یہ سیاست کا امام ہے — یہ رجائیت کا پیغمبر. ذاتی حالات اور محض تجربات کا تذکرہ ہوتا رہا ہے. لیکن دراصل تنقید اس وقت تک معیاری نہیں ہو سکتی جب تک شخصی تاثرات کو خارجی حقائق کی روشنی میں پرکھ کر نہ دیکھا جائے. یہ درست ہے کہ ہر تنقید میں خواہ وہ جمالیاتی ہو یا عمرانی. فنی ہو یا رومانی وجدانی ہو یا نفسیاتی یا کسی اور [illegible] ذاتی تاثرات کا شامل ہونا یقینی ہے. لیکن اگر

ہم اس کو مثل قرار دے دیں تو پھر ایسی تنقید غیر تشفی بخش کہلائے گی.

میڈلٹن مرے کا یہ قول کہ اسلوب میں ادبی حسن کا تجربہ شامل ہوتا ہے اسلوب کی اہمیت کا اظہار کرتا ہے. اور مواد اور زبان کے رشتے کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے. کوئی فنی کارنامہ آئیڈیولوجیکل کنٹنٹ کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا اور مواد اور ہیئت کی مکمل ہم آہنگی کے بغیر ہم ادب یا فن پارے میں اسلوبی کشش کا تصور نہیں کر سکتے کیونکہ زبان یا الفاظ کی مدد سے ہی عام تجربہ گہرائی اور معنی خیزی حاصل کرتا ہے. ہر نظم ایک لسانیاتی تنظیم ہے. جس میں ہر ایکائی کی اپنی اہمیت ہے ان لسانیاتی ایکائیوں کی باہمی ترتیب و ترکیب ہی ادبی حسن یا اسلوبی کشش پیدا کرتی ہے مثلاً لفظ کی تکرار شعر کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے تو کبھی شعر میں الفاظ کی صوتی حیثیت غور طلب ہوتی ہے.

— — —

قطرہ قطرہ آنسو جس کی طوفاں طوفاں شدت ہے
پارہ پارہ دل ہے جس میں تودہ تودہ حسرت ہے

— — —

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

— — —

عالم عالم عشق جنوں ہے
دنیا دنیا وحشت ہے
میں دریا دریا روتا ہوں
صحرا صحرا وحشت ہے

— — —

گرنے لگی صفوں پر جھڑا جھڑ ادھر ادھر
ہر قصر تن گرائے دھڑا دھڑ ادھر ادھر

— — —

اوپر کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مواد (MATTER) اور لسانیاتی ایکائیوں کی مکمل ہم آہنگی ہی اسلوب کا معراج ہے. لہٰذا اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ تنقید داخلی (Subjective) نہ ہو کر معروضی (Objective) ہو تو پھر ہمیں لسانیات اور تنقید کے درمیان ایک راستہ تلاش کرنا ہوگا جس کے ایک طرف تخلیق کار کے تخلیق کی روح تک پہنچنے کی کوشش ہوگی تو دوسری طرف تخلیق کی زبان و بیان کا بھی تجزیہ ہوگا. ادبی تنقید اور لسانیات اگرچہ ذہن انسانی کی دو مختلف تحریکیں ہیں لیکن اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان خط نہیں کھینچا جا سکتا. ان دونوں کی مکمل ہم آہنگی ہی تنقید کا معیار ہے.

اسلوبیات ہماری تنقید کا نظریہ بھی ہے اور عمل بھی. اسلوبیات کی بنیاد اس نظریے پر رکھی گئی ہے کہ ادب ایک [illegible] ہے. فن پارے کی شکل میں ادبی تخلیق زبان کے دائروں میں بندھی ایک تجربہ [illegible] اکائی ہے. زبان اور مواد کے اٹوٹ رشتے کو مدنظر رکھ کر ان ماہرین اسلوبیات نے ایک ایسے نظریے کا اختراع کیا ہے. جس میں ادبی تخلیق کے تجربے کے کسی بھی سطح پر زبان کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے. زبان کی ماہیئت ساخت اور مزاج کا مطالعہ علم لسانیات کی روشنی میں ہوتا رہا ہے. لہٰذا اسلوبیات نے ادبی تخلیق کے سائنسی مطالعے میں علم لسانیات کے اصولوں سے کافی استفادہ کیا ہے. دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلوبیات جس تنقیدی تکنیک کی بات کرتا ہے. اس تنقیدی تکنیک کو جامہ پہنانے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ تنقید نگار ادب کے ساتھ ساتھ لسانیات کے اصولوں سے بھی آشنا ہو. لہٰذا

(باقی صفحہ [illegible])

جدوجہد آزادی کا ایک شاندار باب

راجونت سنگھ رانا

ہندوستان کی جنگ آزادی پر سرسری نظر ڈالنے والا یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ جدوجہد آزادی میں تشدد اور عوام تشدد دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ غلط فہمی کا شکار ہو کر یا حقائق کو نظرانداز کرنے والا ہی اس جدوجہد کو عدم کی تحریک کا نام دے سکتے ہیں باقی سب لوگ دونوں طرح کی جدوجہد کو تحریک آزادی کے اٹوٹ حصے سمجھتے ہیں۔

پہلی عالم گیر جنگ کے بعد بین الاقوامی اور قومی حالات نے جو موڑ لیا اس کے بارے میں مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرف برطانوی اپرلیسٹ جنگ کے دوران کیے گئے وعدوں سے منہ موڑ چکے تھے۔ دوسری طرف لام بندی کے ختم ہو جانے کی وجہ سے فوجیوں کو نکال کر انھیں بے روزگاری کے منہ میں پھینک دیا گیا تھا، تیسری طرف کھیتوں کی پیداواروں کی قیمتیں گرنے سے کسان مالی بحران کا شکار ہو گئے تھے، چوتھی طرف منتو مارلے سکیم کے تحت برطانوی امپیریلسٹ ہندوستان کے سیاسی جیون میں فرقہ پرستی کو داخل کر رہے تھے۔ پانچویں طرف متذکرہ بالا وجوہات کی بنا پر ہندوستانی عوام میں پھیلی بے چینی کو دبانے کے لیے رولٹ ایکٹ کی تشکیل کر چکے تھے۔ اور عوامی جدوجہد کو خون میں ڈبونے کی تیاری کر چکے تھے۔

ایسے حالات میں عوامی غصے اور عوامی جدوجہد کی چھوٹ پھٹ بھڑ چڑی سے مجبور ہو کر کل ہند کانگریس کمیٹی عدم تعاون کی تحریک چلا چکی تھی اور چورا چوری کے واقعہ کے بعد [illegible] سے واپس لے چکی تھی۔ جس کا فائدہ [illegible] تھا کر امپیریلسٹ حکمرانوں اور ان کے گرگوں نے ہندو مسلم فسادات کا طوفان برپا کر کے مچا دیا تھا۔ اور عوامی اتفاق و بھائی چارہ اور یکجہتی تہس نہس ہو چکی تھی۔

خلافت تحریک بھی ایک ماضی کی یاد بن کر رہ گئی تھی۔

جلیاں والا باغ اور مارشل لا کے ظلم بھی بھلائے جا رہے تھے۔

اکالی تحریک کے اسباق کو بھی نظرانداز کیا گیا تھا۔

کل ہند کانگریس کمیٹی کی طرف سے عدم تعاون کی تحریک واپس لیتے وقت جو زمینداروں کے حق میں ریزیولیشن پاس کیا گیا تھا۔ اس سے کسان، مزدور، درمیانہ طبقہ، پڑھا لکھا نوجوان طبقہ اور انقلابی تنظیمیں سخت ناراض تھیں۔ اور وہ ایسی تنظیمیں قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے جو سامراجی حکمرانوں کے خاتمہ کے بعد کسان مزدور راج کو قائم کر سکیں۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب، جس کو روسی عوام سوشلسٹ انقلاب کے نام دیتے ہیں۔ نے بھی ان لوگوں کی رہنمائی کی۔

امپیریلزم دشمن عوامی اتحاد کو قائم کرنے کے لیے انقلابی نوجوان ہتھیلیوں پر سر رکھ کے آگے بڑھے سابقہ تجربات اور حالیہ حالات کا انھوں نے تجزیہ کیا۔ اور ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کی تشکیل کی گئی۔ اور اس تنظیم کے قیام میں ساتھی سچندر ناتھ سانیال نے نمایاں کردار ادا کیا کیونکہ اس سے پہلے وہ غدر پارٹی کے خفیہ کام سے متعلق رہ چکے تھے۔ اور پہلی جنگ کے خاتمہ کے بعد جن سیاسی کو رہائی نصیب ہوئی ان میں سے آپ ایک تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس تنظیم کے پروگرام کا میدان عمل صوبہ سرحد، پنجاب، دہلی، یوپی اور راجستھان تھا۔ لیکن ساتھی سانیال کی وجہ سے اس کا تال میل بنگال و بہار اور جنوبی ہندوستان کے انقلابیوں سے بھی تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت کی مرکزی سرکار کی خفیہ ایجنسیاں اس تنظیم کو بنگال کی انوشیلن سمتی کا ہی ایک حصہ سمجھتی تھیں۔ حالانکہ "سوشلسٹ" لفظ جو اس تنظیم کے نام میں شامل ہے۔ وہ انوشیلن سمتی کے آئین میں کہیں نہیں ہے اور اس اضافے کا ذمہ دار بھگت سنگھ کو ہی مانا جاتا ہے۔

کامریڈ مہر چند آہوجہ آف راولپنڈی اپنے ایک مضمون بعنوان "کاوان انقلاب" میں رقم طراز ہیں

"دلی گیٹ کے باہر کوٹلہ فروز شاہ کے کھنڈرات میں آٹھ انقلابی۔ چندر شیکھر آزاد، بھگوتی چرن وہرہ، بھگت سنگھ، بٹوکیشور دت، سکھدیو، راج گورو، یشپال اور وجے کمار سنہا۔ اکٹھے ہوئے۔ وہ عالم و فاضل، فلسفی، ماہر اقتصادیات، سیاسی امور و رموز کے واقف کار اور سماجی مطالعہ سے لیس تھے۔ انھوں نے چندر شیکھر آزاد کو ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کا کمانڈر ان چیف مقرر کیا اور ہتھیلی پر سر رکھ کر برطانوی امپیریلزم سے لوہا لینے کا عہد مستحکم کیا۔ اور پھر سامراجی دشمن مورچہ کے قیام کے لیے انقلابی اقدامات کا ایک سلسلہ جاری کر دیا۔ ان انقلابی اقدامات میں سے اہم و مشہور اقدامات ہیں۔"

مرکزی اسمبلی میں بم پھینکنا، سانڈرس قتل، وائسرائے ٹرین بم کیس، امرتسر کالج بم کیس، سول سرجن قتل کیس پشاور، گورنر شوٹنگ کیس لاہور۔ تا لا مار بم کیس پنجاب، چیرودی بم کیس۔

اور ان اقدامات کے نتیجے کے طور پر وہی سامراجی دشمن حالات و ماحول پیدا ہو گئے۔ جن کی خواہش شہید اشفاق اللہ نے پھانسی کے تختہ پر چڑھنے سے پہلے کی تھی۔

"وادریس کو چڑھنے کے پہلے شہید اشفاق اللہ سے دشمن کے نام پیغام دینے کو کہا گیا تو انھوں نے کہا: "کل ہند کانگریس کمیٹی کی طرف سے جاری کردہ تحریک عدم تعاون کے وقت جو سامراجیہ دشمن عوامی اتحاد قائم ہوا تھا۔ نوجوان اس کو پھر سے قائم کریں۔ تبھی غلامی کا طوق گلے سے اتارا جا سکے گا۔"

اور تواریخ گواہ ہیں کہ ان نوجوانوں نے ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کے تحت اپنے کارہائے نمایاں سے شہید اشفاق اللہ کی خواہش کو پورا کر دکھایا۔ کیونکہ اپنے انقلابی اقدامات سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ برطانوی امپیریلزم نہ تو غیر مفتوح ہے اور نہ ہی وہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان کو غلام بنائے رکھ سکتا ہے اور وہ امپیریلزم دشمن تحریک کو بھی نئے سے نئے طبقات اور علاقہ جات میں لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

ان اقدامات سے عوامی تحریک کو بھرپور طاقت ملی۔ مزدوروں اور کسانوں کے اندولن جگہ جگہ نظر آنے لگے جن سے پریشان ہو کر برطانوی حکومت نے مرکزی اسمبلی میں دو بل، بنام پبلک سیفٹی بل اور ٹریڈ ڈسپیوٹ بل پیش کیے تاکہ ان تحاریک کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

اس سے پہلے حکومت ہندوستان بھر میں سے مزدوروں اور کسانوں کے راہنماؤں کو گرفتار کر چکی تھی اور ان پر میرٹھ سازش کیس نام کا مقدمہ چلا رہی تھی۔

آٹھ اپریل ۱۹۲۹ء کو سردار بھگت سنگھ اور شری بٹوکیشور دت نے انھیں دو بلوں کی مخالفت ظاہر کرنے کے لیے بم پھینکے تھے۔ اور پرچے بانٹے تھے۔

"انقلاب زندہ باد" کو سب سے پہلے انھیں دو انقلابی جوانوں نے نعرے کا روپ دیا تھا۔ جو بعد میں ایک عوامی نعرہ بن گیا۔

ایک امپیریلزم دشمن نعرہ۔

انقلاب سے ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کی کیا مراد تھی؟ اسے ۶ جون ۱۹۲۹ء کو سیشن جج۔ دہلی کی عدالت میں سردار بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت نے اپنے تحریری بیان میں صاف کیا۔ انھوں نے تحریر کیا تھا کہ "انقلاب سے ہماری مراد ہے کہ بے انصافی کی بنیاد پر تعمیر اس سماج میں بنیادی تبدیلی"۔ اور مرکزی اسمبلی میں بم پھینکنے کے اپنے مقصد کے بارے میں آپ دونوں نے کہا "سماج کی صحیح شکتی کے حق دار محنت کش عوام ہیں۔ اور عوام حکومت کا قیام ہمارا منتہائے مقصود ہے۔"

آج اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی اور اور انوشیلن سمتی کے انقلابی نوجوانوں کے کارہائے نمایاں تھے۔ جن سے مجبور ہو کر کل ہند کانگریس کمیٹی کو اپنے سالانہ سیشن جو کہ لاہور میں ہوا۔ میں تحریک آزادی جس کی راہنمائی کانگریس کر رہی تھی۔ کا منتہائے مقصود مکمل آزادی قرار دینا پڑا۔ اور حکومت دشمن تحریک چلانی پڑی۔

اس مضمون میں میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مرکزی سرکار کی خفیہ ایجنسیاں انوشیلن پارٹی کو ہی ہندوستان ریپبلکن آرمی کا سربراہ مانتی تھیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان سالوں میں جو انقلابی اقدامات اس کی راہنمائی میں سرانجام دیے گئے۔ ان کا بھی مختصراً ذکر کیا جائے تاکہ انقلابی تحریک کو ٹھیک طرح سمجھا جا سکے۔

مشرقی اور جنوبی ہندوستان میں مندرجہ ذیل انقلابی ایکشنوں کا تواریخ میں بھرپور ذکر ملتا ہے۔

چٹاگانگ آرمری کیس، کارپورل فائٹ کیس نوجبرہٹ انسپکٹر جنرل قتل کیس ڈھاکہ، چندرنگر ریڈ کیس، یوروپین کلب ریڈ کیس، ہجلی، اور ڈی بم کیس، گوہیرگاؤں ریڈ کیس، کرکٹ گراؤنڈ ایکشن کیس، وعدہ معاف (غدار)

ان تمام انقلابی حادثات و واقعات کا مقصد سامراجیہ دشمن تحاریک کا مضبوط بنانا تھا اور سرکاری حکام جو ظلم و ستم کے مجسمہ بن چکے تھے ان کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کرنا تھا۔ اور اس مقصد میں انقلابی مکمل طور پر کامیاب ہوئے۔

ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کے شہید ہماری جنگ آزادی کے درخشاں ستارے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ سماج وادی سماج کے قیام کے لیے متحرک کرتے رہیں گے کیونکہ ان کے منتہائے مقصود کو ابھی حاصل کرنے کے لیے سرگرم جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ہم یوم جمہوریت کے موقع پر ان شہیدوں کو ہدیہ تبرک پیش کرتے ہیں۔ اور عہد کرتے ہیں کہ ہم سماج واد کے قیام کے لیے جدوجہد میں سرگرم حصہ لیں گے۔

اس کے لئے میں ہر منزل تک آسکتا ہوں لیکن وہ
گیسو گیسو دار و رسن تک جا سکتا ہوں لیکن وہ
اپنے غم سے میں خود ہی ٹکرا سکتا ہوں لیکن وہ
کوئی بھی رت ہو اپنا جی بہلا سکتا ہوں لیکن وہ
تنہا تنہا پل بھر جینا مشکل تھا پر اتنے سال
کیسے گزارے ہیں میں نے بتلا سکتا ہوں لیکن وہ
عشق و ہوس کی آگ میں یارو جب چاہو جل سکتا ہوں
ہر دل میں جذبات کی تو بھڑکا سکتا ہوں لیکن وہ
جس کا جو کچھ قرض تھا مجھ پر یوں میں نے بیباق کیا
جس جا چاہوں جب جب چاہوں جا سکتا ہوں لیکن وہ
دشت وفا میں سارا عالم کھویا کھویا سا رہ جائے
یوں بھی کتنے خواب حسیں دکھلا سکتا ہوں لیکن وہ
دنیا والے شاعر سمجھیں دل والوں میں نام رہے
یوں بھی دل کے داغوں کو دکھلا سکتا ہوں لیکن وہ
کتنے روپ بدل سکتا ہوں کیا کیا بات بنا سکتا ہوں
اب بھی اسے اقبال عمر اپنا سکتا ہوں لیکن وہ



اقبال عمر

کیا ہے اپنی دنیا میں نے سوچا ساری ساری رات
اس کی یادوں کی خوشبو سے مہکا ساری ساری رات
یوں بھی ہوا ہے اکثر اپنا جگنا ساری ساری رات
دور افق پر ایک ستارہ چمکا ساری ساری رات
میرے خوابوں کی عظمت نے میرا جی یوں بہلایا
جیسے برہ کی اگنی میں ہو جلنا ساری ساری رات
میں نے سمندر سے تو اٹھتے طوفانوں کو دیکھا ہے
لیکن دل سے طوفانوں کا اٹھنا ساری ساری رات
شور بڑے شہروں میں بہت ہے لیکن میں نے دیکھا ہے
بھولی بسری یادوں کا وہ میلہ ساری ساری رات
ایسی ویسی کوئی خبر تو ہے ہی نہیں اخباروں میں
کیسی کیسی باتوں پر میں رویا ساری ساری رات
جو کچھ تھا قربان کیا ہے قدر سکوں بھی پاس نہیں
ہنستا رہا ہے دریا دل پر دریا ساری ساری رات
ساری دنیا ہم سے خفا تھی لیکن ایسے عالم میں
ذہن میں آیا ان آنکھوں کا ملنا ساری ساری رات
کس کو خبر ہے اپنا مقدر یہ ٹھہرا اقبال عمر
جگری جگری دوارے دوارے پھرنا ساری ساری رات

نظمیں

یہ دنیا دن بدن تبدیل ہوتی ہے
نئے موسم پرانی خاک سے آواز دیتے ہیں
ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی ہیں
ہوائیں رتجگوں کے آ گئی ہیں
گھنے ان جنگلوں کے درختوں سے لپٹ کر
گریہ کرتی ہیں
غرض سارے مناظر ایک گہرے دکھ کا پرتو ہیں
مگر یہ سب ذرا سی دیر کو ہوتا ہے
پھر سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں
ہنگاموں میں کھو جاتے ہیں رات آتی ہے سو جاتے ہیں

اسعد بدایونی

جہاں آداب فرزندی سلام سب نے زہر کی زندگانی پی
اب وہ ذہن میعاد پوری کر چکی اپنی
اور منتظر ان ساعتوں کی ہے
جو اس کو ایک گہری چیخ میں تبدیل کر دیں
نواب ہر سحر ہوں نہ اپنی نسل کو پھیل دیں
اوران آنکھوں کو وہ پابندیاں بالکل نہ دیں
اور ان آنکھوں سے ودیعت ہیں
کہ دار دار
جو تازہ وادیٔ مرگ دنیا ہیں
اس لمحے کے سائنس ایپ
ذرا آزاد ہو کر سائنس پیک کریں
اور خود ہی اپنا سامانِ سفر

آتش فشاں

تمہیں جو کہنا ہے کھل کر کہو مرے یارو
میں آشنائے زمانہ ہوں اور سمجھتا ہوں
کہ میرے گیتوں کا اس شہر میں سا ادبی کیا
وہ لوگ بھی ہیں ہم ابر مرے کرم فرما
جو دے رہے ہیں شب و روز بدلتے فضا
ارے یہ سال کی بیتی ہوئی جو ان کو
پیوند کر وہ آتش فشاں جو ان کیلئے
جو بجھا تے مرے اندر رہی
یا میں مرے ہے زبان کو ترستی رہ ملے
وہ میری زبان کو ترستی رہ میں
میری ابر میری پوتی گیتوں سے
وہ آتی رہی ہم ابر ہیں میرے کوئی تمام
نیک لوگ جو ہیں کہ جب ہونٹوں پہ
مگر وہ لوگ بھول سکتے ہیں اپنے جن کی چال
بات کو سمجھا ہے گیت سکتی ہے
پھٹے دل کو نغمے ہیں وہ کو چیر
وہ گونج اٹھتے ہیں پردے کو چیر
کسی بھی جھوٹ کے پردے کو چیر سکتے
تمہیں جو کرنا ہے کرتے رہو مرے یارو
مجھے یقین ہے مرے گیت مر نہیں سکتے

اندر سروپ دت نادان



گرد ہوں میں اُگے چہرے

یہ سب چہرے
گرد ہوں میں اُگے چہرے
گرد ہوں میں پلے چہرے
یہ صف آرا، یہ بل کھاتے، یہ شکراتے ہوئے چہرے
یہ آدیزش کی تپتی دوپہر کے خشک چہرے
یہ چہرے جن کے قامت کی بلندی
سحری جو کر گزرنے
ابھر آتے ہیں صد ہا نفرتوں کے داغ
ہر انگلی کے پورے پر
یہ چہرے جن کی سفاکی کے عبرت ناک افسانے
لکھے جاتے ہیں ہر دن شہر کی دیوار گریہ پر
یہ چہرے جو رکھتے ہیں سیدھی مستقل اپنے نشانے پر
یہ چہرے چھپکلی کی طرح ہر دم جو شکار آمادہ رہتے ہیں
یہ چہرے جن کی پیشانی پہ
حرف دعا لکھا ہوا ہے کالے حرفوں سے
یہ چہرے جن کے نرغے میں
صداقت منصفی کی راہ سے نظریں چراتی ہے۔
یہ چہرے جو بیچتے ہیں۔
عداوت کی غلاظت میں، دھڑے بندی کی لعنت میں
یہ چہرے بر سر منبر
یہ چہرے بر سر محفل
ابھی تک سرخرو ہیں کیوں کہ یہ چہرہ سیاست ہیں
ابھی تک قدر ہستی کا کوئی چہرہ نہیں ابھرا

ڈاکٹر محمد یعقوب عامر



دو نظمیں

دیارِ خواب

دیارِ خواب کے اُدھر
مسافروں کی بستیاں
نشیلی کالی بدلیاں، شرابیوں کی ٹولیاں
نشہ بڑھاتی دھانی چنریاں
مہکتے کنوارے جسم، چلمنوں کی تیلیاں
سجیل ریشمی پروں میں رنگ برنگی تتلیاں
لچکی لچکاتی عورتوں میں شہوتوں کی بجلیاں

ذرا سی رات بھیگ جائے،
پھر سنو اندھیرے کی زباں
تھکے تھکائے جسم، ہانپتی لٹکتی چھاتیاں
شفیق آنکھیں ماؤں کی، رحیم لوریاں
خزاں لُٹاتی کہکشاں،
دُھواں اگلتی چمنیاں
دھڑکتے دل، نڈھال جسم، دھوپ کے مکاں
سنہرے، سُرخ پیرہن جھلکوتی شہزادیاں
گدیلے گندے پوکھروں میں تیرتی ہیں مچھلیاں
نہ جانے کس گناہ کی سزا میں بہتی ندیاں
دیارِ خواب کے اُدھر
مسافروں کی بستیاں!!

پرچھائیاں پکڑنے والے

ڈائری کے یہ سادہ ورق
اور قلم چھین لو
آئینوں کی دکانوں میں ہم
اپنے چہرے لئے
اک برہنہ تبسّم کے محتاج ہیں
سر دیارِ زیں،
ایک بھی چاہنے والا ایسا نہیں
جو انھیں،
زندگی کا سبب بخش دے
دھند سے جلگاتے ہوئے سحر کی بتیاں
سجدہ کرتی ہوئی کہکشاں
خوبصورت خداؤں کی پھرتی ہوئی ٹولیاں
ایسا لگتا ہے سب
ایک مدّت سے پرچھائیوں کو پکڑنے میں مصروف ہیں

دو غزلیں

حدِ نگاہ تلک ایک سلسلہ دیکھیں
سُنیں تو سارے مناظر کو بولتا دیکھیں
طویل راتوں کو سورج کے روبرو رکھ دیں
چمکتی دھوپ میں خوابوں کا حوصلہ دیکھیں
وہ بھیڑ ہے کہ بدن لمس کو ترستے ہیں
وہ شور ہے کہ سماعت کو کانپتا دیکھیں
لہولہان زبانیں دیوار سے چمٹی!
ہمیشہ خواب کسی مرغزار کا دیکھیں
انھیں یہ فکر کہ امن و امان سے گذرے
ہمیں خیال کوئی تازہ حادثہ دیکھیں

مشعل ہاتھوں میں لے کر آ گئے ہیں
حدوں سے ہم نکلنا چاہتے ہیں
سُنا ہے شہر میں کچھ شوخ بچے
انہوتی باتوں پر ہنسنے لگے ہیں
کوئی منظر نہ اب کے ساتھ ہوگا
بہت عجلت میں ہم تجھ سے ملے ہیں
سفر اس بار تو گھر کی طرف تھا
قدم کچھ دن سے پھر بہکے ہوئے ہیں
زمیں کی کچّی خوشبو کہہ رہی ہے
ادھر ہو کر کبھی دریا بہے ہیں
یہ اُن اسلاف کے نقشِ قدم ہیں
جو ان خیموں سے آگے بھی گئے ہیں

آشفتہ چنگیزی



غزلیں

جو زندگی نہ سمائی تری نگاہوں میں
تمام عمر وہ بھٹکی غموں کی راہوں میں

اثر ہوا تو ہے اتنا ہماری آہوں میں
سکون قلب نہیں اک کو جلوہ گاہوں میں

وہ بدنصیب اگر جائے تو کہاں جائے
اماں نہ مل سکی جس کو تری پناہوں میں

نکل کے گھر سے کسے درس خودشناسی دیں
قدم قدم پہ خرد ہے جنوں کی باہوں میں

یہ غم ہیں کہ ہمیں دشمنوں نے زخم دیئے
کچھ اپنے دوست بھی شامل تھے سربراہوں میں

نہ جانے کس لئے احباب میرے دشمن ہیں
میرا شمار گداؤں میں ہے نہ شاہوں میں

رہ حیات میں ہر موڑ پر پس پردہ
گناہگار ہیں پوشیدہ بے گناہوں میں

سمجھ کے اپنا لگایا تھا جن کو سینے سے
میرے خلاف وہی لوگ تھے گواہوں میں

نقوش عظمت ماضی نہ ڈھونڈیئے طالب
وہ بات اب کہاں پہلی سی کج کلاہوں میں

طالب عرفانی

نہ کوئی کھیت نہ ٹوٹا مکان ہے بھائی
یہ خارزار ہی صحرا کی جان ہے بھائی

نہ کوئی چھت نہ کوئی سائبان ہے بھائی
ہمارے سر پہ کھلا آسمان ہے بھائی

یہ سخت دھوپ، یہ صحرا، یہ پیاس کی شدت
لبوں پہ اب تو مسافر کی جان ہے بھائی

زمانہ اُس کو تقدس مآب کہتا ہے
وہ جس کے ماتھے پہ کالا نشان ہے بھائی

ابھی سے باز نہ آ تو ستم شعاری سے
ابھی تو سر پہ مرے آسمان ہے بھائی

ہر ایک ظلم و ستم کا جواب خاموشی
ہماری قوم بڑی بے زبان ہے بھائی

یہ سچ کہ قتل ہوتے ہیں ہزارہا انساں
مگر ہے دعویٰ کہ امن و امان ہے بھائی

نگاہ ناز سے وہ جس کو دیکھ لیں عشرت
وہ شادماں ہے وہی کامران ہے بھائی

عشرت صدیقی

آغوش خزاں میں بھی سنور جائیں گے ہم لوگ
اپنا ہی لہو پی کے نکھر جائیں گے ہم لوگ

خوابوں کے حسیں شہر بسائے ہوئے دل میں
ہر کوہ و بیاباں سے گذر جائیں گے ہم لوگ

ٹھہرے گا وہیں قافلۂ عمر سبک گام!
جس منزل ہستی پہ ٹھہر جائیں گے ہم لوگ

گلشن ہو کہ صحرا ہو خیاباں ہو کہ کہسار
نقش کف پا ہوں گے جدھر جائیں گے ہم لوگ

ہر حال میں جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے!
کیا گردش ایام سے ڈر جائیں گے ہم لوگ

مٹی کے کھلونوں کا مآل آپ نہ پوچھیں
ذرات کے مانند بکھر جائیں گے ہم لوگ

لفظوں کے تعاقب میں، حزیں آپ ہی رہیئے
آشوب معانی سے گذر جائیں گے ہم لوگ۔

جنید حزیں لاری

اُٹھائیں کیوں نہ تیشے مستقل موجیں سمندر کی
کھنچی ہے شہر کے چاروں طرف دیوار پتھر کی

بھنچی تھیں مٹھیاں آنکھوں میں تھی اک جگمگاہٹ سی
بپھرتے پانیوں سے لاش یوں ابھری شناور کی

کرے مت رائگاں ہستی مسلسل آفتاب اپنی
سیاہی بام و در پر ہے چراغوں کے مقدر کی

ابھرتے ہیں خرابے جس کے قدموں کے نشانوں سے
مرے کانوں میں ہے آہٹ اسی سفاک لشکر کی

اچانک خاک میں مدفون اک بستی نکل آئی
مجھے تھی جستجو اک گمشدہ ساعت کے پیکر کی

ہیں ہر جانب سے پھیلے کرگسوں کی یورشیں عشرت
برہنہ لاش پر اک لمحۂ شاداب و بہتر کی

عشرت ظفر

غزلیں

ان درختوں میں آندھیاں رکھ جا
آندھیوں میں تباہیاں رکھ جا
جانے والے سفر پہ [illegible] ہو
شہر بھر میں اداسیاں رکھ جا
ہر پرندہ ہوا ہے بے آشیاں
ہر نشیمن میں بجلیاں رکھ جا
کوئی منظر تو دیکھنا ہے ہمیں
کوئی لمحہ تو جاودانیاں رکھ جا
پھیلتی جا رہی ہے دھوپ دور تلک
اپنے آنچل کا سائباں رکھ جا
[illegible] بے دلی [illegible]
جو مجھے پائے جہاں [illegible] رکھ جا

راشد جمال فاروقی

پیاس کی آگ سے جس دل کو جلایا ہوگا
کس نے اس گاؤں میں تالاب بنایا ہوگا
شام کا وقت ہے بستی کی طرف مت جاؤ
جلتے چولہوں کا دھواں گھر میں سمایا ہوگا
جان و دل فکر و نظر ذہن و خیالات وجود
کرب کی آگ نے کس کس کو جلایا ہوگا
گاؤں میں پھیل رہی سوندھی سہانی خوشبو
تم نے آنگن میں کوئی پیڑ لگایا ہوگا
رات برسات بھی خلوت بھی ہوا بھی تھی
ایسے موسم نے کئی بار جگایا ہوگا
ریگزاروں میں ذکی پیڑ کا سایہ بھی نہیں
دھوپ میں اس نے کہاں زخم سکھایا ہوگا

ذکی طارق



شمع حیات سوز الم سے پگھل گئی
اب کیا ہے شام غم جو سحر سے بدل گئی
تسکیں سے اضطراب کی صورت بدل گئی
موج نگاہ ناز یہ کیا چال چل گئی
تھا اضطراب دل خلش درد سے سوا
اب درد بڑھ گیا تو طبیعت سنبھل گئی
اب کیا نشاط موسم گل کیا غم خزاں
تھا جس پہ آشیانہ وہی شاخ جل گئی
نکہت یہی نہیں کہ وہ ہم سے بدل گئے
حالات و واقعات کی صورت بدل گئی

عذرا نکہت لولکی

افسانے

چٹان

شوکت حیات

اچانک اسے لگا کسی نے اسے آواز دی —
دوپہر کی چلچلاتی دھوپ تو پڑ ہی رہی تھی۔ کئی دنوں سے دھوپ میں شدت تھی۔ ایک زمانے سے دھوپ کا یہی عالم تھا کہ سکوں کی چند سانسیں لینا دوبھر ہو گیا تھا۔

اس وقت سارا راہ پر بھی ستاتا تھا۔ اس لیے قیامت خیز دھوپ میں وہ تنہا سفر کر رہا تھا۔ سورج کی کرنوں کی چمک آنکھوں کو اس قدر خیرہ کر دینے والی تھی کہ بصارت کچھ ہی آگے بڑھ کر دم توڑنے لگی۔

کسی نے آواز دی ؟ سڑک پر تو دور دور تک کسی کا نام و نشاں نہیں ! ۔

اس نے سوچا۔ جہاں تک وہ دیکھ پاتا تھا۔ کوئی پرندہ تک موجود نہیں تھا۔ سینے میں شرابور اس کے بھاری وجود کے ساتھ سایا اور عجیب سا پچھڑوں کا ایک اژدہام ہمراہ تھا۔ تمام چہرے مختلف ہوتے ہوئے ایک سے تھے۔ ریاکاری کی شکنیں سبھوں میں یکساں تھیں ——— اس کا سفر بظاہر تو ایک مخصوص دفتر تک تھا۔ جہاں وہ ایک سماساتی نوکری کی درخواست داخل دفتر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا اصل سفر جانے انجانے چہروں کی انھیں ریاکار شکنوں میں درد کی لہر سی رواں کرنا تھا۔ درد سے دوچار کرنے کا سنگلاخ عمل اسے اکثر و بیشتر لہولہو کر جاتا۔ جہاں سے درد کی لہریں چشمے کی مانند پھوٹتی تھیں، اس پر بہت بڑی چٹان پڑی تھی۔ ویسی بڑی اور بھاری چٹان اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ایک طویل عرصہ تو اس چشمے کی کھوج میں گزر گیا تھا۔ زندگی کا سرمایہ کتابوں اور چہروں کی سنگتی کھوئی پڑتال میں گھلانے کے بعد اسے اس چشمے کے منھ پر چٹان کی موجودگی کا ادراک ہوا تھا۔ اس نے چٹان کو ہٹانے کی کوشش کی اور اسے لگا کہ اس بھاری چٹان کو ہٹانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

اس نے اطراف کے لوگوں کو سب سمجھایا۔ علاقے کی خشک سالی کے اس بنیادی سبب کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ لیکن کوئی اس بات کے لیے آمادہ نہ ہوا کہ اس چٹان کو بے جگہ کیا جائے۔ اس کے پیچھے کی کوئی دلیل نہ تھی سوائے اس کے کہ وہ باپ دادا کے زمانے سے اس چٹان کو وہیں دیکھتے آرہے تھے اور اسے وہاں سے ہٹا دینے سے ان تمام لوگوں کو کسی عذاب میں مبتلا ہو جانے کا خوف تھا۔

لوگوں کی اس جہالت اور روایت پرستی سے وہ عاجز آچکا تھا۔ بہت تھوڑے سے لوگ اس کی باتوں سے متفق ہوئے۔ ان تھوڑے سے لوگوں نے زور آزمائی کی لیکن چٹان ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اتنی بھاری اور بڑی چٹان کو ہٹانے کے لیے جمِ غفیر کی ضرورت تھی۔ زور آور بازوؤں والے جمِ غفیر کی۔

تین بجنے والے تھے۔ وہ تیز قدم بڑھانے لگا۔ اس نے خیالات کو جھٹکا دیا۔ فارم جمع کرنے کی آج آخری تاریخ تھی۔ بے روزگاری کے لق و دق صحرا میں نوکری کے شجر کی تلاش عبث تھی۔ پھر بھی امیدواری کی جھوٹی تسلی کے لیے وہ فارم جمع کر دینا چاہتا تھا۔ یہ جھوٹی تسلی تو ایک زمانے سے لوگوں کو مرتے ہوئے بھی زندہ رکھے ہوئی تھی۔

اس نے جسم کی بچی ہوئی قوتوں کو مجتمع کر کے اپنے پاؤں کی رفتار تیز کی لیکن جھلسا دینے والی شدید دھوپ کی تاب نہ لا کر اسے رک جانا پڑا۔ رکتے ہی پورا وجود اور بھی سلگنے لگا۔ اس نے اغل بغل کسی سائبان کی تلاش کی۔ کہیں کوئی سایہ دار جگہ نہیں تھی۔ اسے پھر لگا کہ بہت دور سے آتی ہوئی آواز اسے چھونے کی کوشش کر رہی ہے

"بابو جی بابو جی . . . . "

اس نے ذہن پر زور دیا۔ ان کٹھن گھڑیوں میں بھلا کون اسے آواز دے سکتا ہے۔ یہاں تو افراتفری کا عالم ہے۔ اپنا وجود تک اپنے آپ سے بیگانہ ہو رہا ہے۔ ان لمحوں میں اتنی عزت اور احترام سے اسے کون پکار سکتا ہے۔ لوگوں کا بس چلے تو ناموں کے ساتھ جناب، شریمان، صاحب اور جی لگانے کے بجائے ایک دوسرے کو کتا اور خنزیر کہہ کر مخاطب کریں اور بغل میں رکھی ہوئی چھری ایک دوسرے کے وجود میں اتار دیں۔

آواز کچھ اور تیز ہوئی۔

"بابو جی . . . . بابو جی . . . . سنئے . . . !

اس انجانی آواز کے اندر جو تڑپ تھی۔ اسے لگا کوئی اسے ہی پکار رہا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر سورج کی چندھیائی ہوئی روشنی میں کچھ بھی صاف اور واضح نظر نہیں آیا۔ بس ایسا لگا جیسے کوئی بہت دور سے تیزی سے آگے بڑھتا ہوا اس کی طرف آرہا ہے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خشک ہوتے ہوئے ہونٹ پر زبان پھیری۔ اس درمیان پیچھے سے آتا ہوا مجسم اس کی بغل میں کھڑا ہو کر اس کا ہاتھ جھنجوڑ رہا تھا۔

"بابو جی . . . میں بہت دیر سے آپ کو پکار رہا تھا"

ایک لڑکا بہت زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ ذہن پر زور دینے کے بعد اسے یاد آیا کہ وہ اس کے دفتر کے پاس والے ڈھابے میں کام کرنے والا لڑکا تھا جو لوگوں کو چائے اور پانی پلایا کرتا تھا۔ اس لڑکے کی بے چارگی کی حد تک بڑھی ہوئی معصومیت اور کولہو کے بیل جیسی مشقت نے اسے اس پر بے حد مہرباں بنا دیا تھا اور اکثر و بیشتر وہ اسے کچھ ٹپ دے دیا کرتا تھا۔ ایک زمانے کے بعد اس لڑکے کو اس سنگین موسم میں دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی۔

"اتنے دنوں سے تم کہاں تھے . . . ؟ گیان جی کی اسٹال میں تم پر بہت دنوں سے نظر نہیں پڑی ! ؟"

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اس کو دیکھ کر ہی اس بات کا خیال آیا تھا کہ وہ جی کی اسٹال میں بہت دنوں سے نظر نہیں آرہا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اس دکان میں

آرام سے چائے پانی کے سلسلے کو جاری رکھا اور دیکھ کر اُسے بھی کسی کا خیال ہی نہیں آیا۔ اس سلسلے میں لڑکے نے جو کچھ بتایا وہ بے حد عجیب اور مذاق تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ اس مکان کو اپنی دکان کی طرح سمجھتا تھا اور کبھی اس نے کوئی چیز ادھر اُدھر نہیں کی تھی۔ گاؤں میں رکھا پڑنے کے بعد وہ اس ہوٹل میں ملازم ہوا تھا۔ جانے کی بات تھی کہ اسے بے تحاشا بھوک لگتی تھی۔ تین اوقات کے علاوہ بھی ایسے میں اس سے کچھ بھی کرنا مشکل ہو جاتا مالک کے سامنے سو سے سوال کر کھانے لگتا۔

اس نے لڑکے کو بتایا کہ جن کے پاس کھانے کی اشیا نہیں ہوتیں انھیں جانوروں کی طرح بھوک لگتی ہے..... جب اشیا لوگوں کو آسانی سے مہیا ہونے لگتی ہیں تو پھر بھوک انسانوں کی طرح لگنے لگتی ہے۔

"ہاں بابوجی...۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں.... گاؤں میں جب سوکھا پڑا تھا تو مجھے اور بھی زیادہ بھوک لگتی تھی..... ہم تمام گاؤں والوں کو لگتی تھی.... لیکن وہاں پیٹ بھرنے کا کوئی اپائے نہ دیکھ کر سب لوگ اِدھر اُدھر چلے گئے..... وہ گاؤں جنگل ہی گیا.... یہاں اگر بھی بھوک لگتی ہے لیکن پہلے کے مقابلے میں کم.... ایک دن ایسی تیز بھوک میں میں سو سے کھا رہا تھا مالک کے لڑکے نے کہا کہ تین وقت کے علاوہ تو جو کھاتا ہے وہ حرام کا ہے..... بس میں نے وہاں کام چھوڑ دیا بابوجی.... یہاں عزت نہیں وہاں... آپ بھی تو اپنے کھا شن لیتے ہی بولتے ہیں کہ کھاتا بابوجی...."

"بہت اچھا کیا تم نے... اب کیا کرتے ہو...؟"

لڑکے کی اطلاع کے مطابق جس دفتر میں اسے ملازم ہونے کے لیے جانا تھا اسی کے پیچھے گنگا کے کنارے ایک ہوٹل میں اس نے کام شروع کر دیا ہے اور وہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

اُسے بہت خوشی ہوئی۔

وہ دونوں تیز تیز چلتے ہوئے دفتر قریب آیا تو لڑکے نے اپنے ہوٹل میں چل کر چائے پینے کے لیے کہا۔ اس نے لڑکے کو اپنی مجبوری بتاتے ہوئے واپسی میں آنے کا وعدہ کیا۔

فارم جمع کرنے والے آدمیوں کی بھیڑ میں جانوروں کی طرح دھکا کھاتے، دھکا دیتے اور کرتا پھٹوانے کے بعد جب وہ لوٹ رہا تھا تو سنا اس لڑکے کا خیال آگیا اور اس ہوٹل کی جانب اس کے قدم اٹھ گئے۔

لڑکے نے ہوٹل کے دروازے پر اسے وی آئی پی کی سی اہمیت دی۔ بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ہوٹل کی صاف کرسی اور میز کو دوبارہ پونچھا اور کھانے کی کئی چیزیں سامنے لاکر رکھ دیں۔ پھر خود جاکر اسپیشل چائے بنانے لگا۔ ان تمام کارروائیوں کے دوران میں اس کی مسرت دیکھنے کے قابل تھی۔ ہوٹل کے دوسرے لڑکوں اور مالک کی جانب وہ بیچ بیچ میں فخریہ انداز میں دیکھتا بھی جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہوٹل میں نہیں اپنے گھر پر ہے اور یہ سب کارکردگی اس کی میزبانی کے فرائض میں داخل ہے۔

تمام خاطر مدارات کے بعد وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوا کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ لڑکے کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ وہ اس کے قریب آیا۔

"بابوجی... آپ پیسہ مت دیجیے... آپ میرے مہمان ہیں....!"

اس کی جیب میں پہنچی ہوئی انگلیاں جیسے سن ہو گئیں۔ یہ لڑکا کس قدر بھولا ہے۔ بھلا ہوٹل میں بھی مہمان داری ہوتی ہے۔ اور اس ہوٹل میں جہاں وہ ایک معمولی ملازم ہے۔ اسے کچھ عجیب لگا کہ اگر وہ پیسہ دیتا ہے تو لڑکے کا دل ٹوٹ جائے گا۔ کسی کو مہمان نوازی کے شرف اور مسرت سے محروم کرنا اسے ظالمانہ کارروائی معلوم ہوئی۔ اس نے جیب سے ہاتھ نکال لیا۔ لڑکے کا بجھا ہوا چہرہ کھل اٹھا لیکن اسی درمیان ہوٹل کے مالک کے چہرے پر کچھ ناگواری کے تاثر ابھرے۔ اس نے پھر سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

اور ہوٹل کے دروازے پر آکر اس سے رخصت ہوتے وقت اس نے دیکھا کہ لڑکے کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ ایک گہرا سکوت۔ ایک نامعلوم اداسی۔ لڑکے کی آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں۔ آنسو گال پر ڈھلک آئے تھے۔ جیسے اپنوں کو رخصت کرتے ہوئے سوگواری کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ دونوں ہی الوداعی لمحوں کے کرب سے دوچار تھے۔

لڑکے کی آنکھوں کے آنسوؤں دیکھ کر اسے لگا کہ جیسے کے منھ پر پڑی ہوئی چٹان ایک ذرا کھسک گئی ہے۔

●●

افسانہ

گھر

محمد اسد اللہ



رات ہوئی تو ہم سب کھانے پر جمع ہوئے مگر آج گھر میں روزانہ کا سا ماحول نہیں تھا۔ پتاجی کھانا کھاتے ہوئے چاچا جی سے باتیں کرتے جاتے کورٹ کچہری، کیس، تاریخیں، سودا، وکیل وغیرہ الفاظ ان کی باتوں میں بار بار سنائی دیتے مگر آج وہ تمام باتیں بند تھیں۔ بڑے چاچا گلے بھر میں سنائی دے سکے ایسی زوردار ڈکار لیتے جس پر ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑتے تب وہ پوچھتے —— کیوں مس دہے ہو رے بچو! ایں؟"

چھوٹے بابو راؤ چاچا سر جھکائے کھانے میں مشغول تھے آج نہ بڑی چاچی نے ان کی ہنسی مذاق شروع کی تھی نہ ہمارے ساتھ چٹپٹی باتیں، چھوٹی چاچی کی لڑکی اونگھ رہی تھی اور وہ اسے چڑیا چڑے کی کہانی سنانے کے بجائے صرف گود میں لیے ہوئے تھیں دادی ماں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے مالا جپتی بیٹھی تھیں ہر دن کی طرح ماں اور چاچیوں کی تکرار کی روداد پتاجی کو سنا رہی تھیں اور نہ ہی بہت دیر سے انھیں اپنی نسوار کی ڈبیا یاد آئی تھی جسے میں ایک کونے میں چھپا آیا تھا اماں خاموشی سے کھانا نکال رہی تھیں اور

چھوٹی چاچی ہر روز کی طرح ہر ... کام کر رہی تھیں۔

ہم بچوں کو اس طرح خاموشی کے ساتھ کھانا کھانے کی عادت نہیں تھی، ہم کھانے بیٹھتے تو جیسے سارا گھر گونجنے لگتا دادی ماں کہتیں —— میرا گھر کیسا گوکل جیسا لگ رہا ہے۔ ہاں کبھی کبھی دادی ماں یا بڑی چاچی میں جھڑپ ہو جاتی اسی وقت گھر میں ایسی خاموشی چھا جاتی مگر آج تو گھر میں ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا ہم بچوں میں بڑی چاچی کا ... سمجھا جاتا تھا

اسے نہ جانے کیسے بڑوں کی ساری باتیں معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔ میں نے اسے اشارہ سے

ایسا کیوں؟ کہہ کر پوچھا تو وہ ہماری "ف" والی بولی میں بولا —— افسے نفم کفومفا لفم نفی افسے کفپھ؟ میں نے پوچھا۔ کفا! تو وہ بولا —— افن کفو نفے گھفر ... افن ہفے کفو جفا نفا ہفے یہ پرشو نے نئے گھر کا تو ذکر کر دیا مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ نیا گھر کہاں ہے اور اس میں رہنے کے لیے ہم لوگ کب جائیں گے نئے گھر میں جانے کی خبر سن کر میں نہال ہو گیا۔

پچھلے سال راجیندر جو میرا ہم جماعت تھا مجھے اپنے نئے گھر میں کھانا کھانے لے گیا تھا۔ میں نے سوچا میں بھی اسے نیا گھر دکھاؤں گا گی جو ہماری "ف" والی بولی نہیں جانتی تھی قریب آ کر پوچھنے لگی اسے پرشو نے کیا کہا میں نے کہا ——

ہم کسبتاں اب نئے گھر میں رہنے کے لیے جانا ہے "

"سچ!" بڑی خوشی سے پھول نہیں سمائی اور

قریب بیٹھے ہوئے گوپو اور شکیل کو بھی چلانے لگی۔ میں نے پاپا سے کہا — "ہم نئے گھر میں کب جائیں گے پاپا؟"

ابھی پوچھنے اور ابھی اماں ڈپٹ کرتیں۔ کہا کہا الٹی سیدھی باتیں مت کرو اور چھوٹی چاچی سے شکیل کے کونڈے سے پانی نکال کر لاتے ہوئے مگر ایک ٹی کی آواز سیدھی کی طرح چاچا "آرام سے آرام سے" کہہ کر خاموش ہوا ہے۔ چاچی ابھی سے بولے — "بچوں کو کیوں خواہ مخواہ ڈانٹ رہی ہو۔ ہاں بیٹا اب اپنے کو نئے گھر میں جانا ہے۔" تب ہم سب بچے نیا گھر نیا گھر کہہ کر شور مچانے لگے تب اچانک گوپو کی کہنی کے دھکے سے میرا پیالہ گر گیا اور زمین پر کیچڑ ہو گیا۔ چھوٹی چاچی نے دوڑ کر دو چار زور دار مکے گوپو کی پیٹھ پر رسید کر دیے۔ دادی ماں کو یہ بات پسند نہ آئی مگر نہ جانے کیوں آج انھوں نے ہمیشہ کی طرح اس معاملہ میں چاچی کو کچھ نہیں کہا اور زور زور سے مالا جپنے لگیں۔ ورنہ ہم بچوں کی پٹائی انھیں سخت ناگوار گزرتی۔

آج سب کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ بہت دیر تک سب خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے رہے۔ کوئی کسی سے کچھ نہیں بولا۔ گوپو کی پٹائی کے بعد ہم سب بچے دیوسمان خاموش ہو بیٹھے۔

"بہن مونگ کی دال تھوڑی اور دینا ذرا" — اس آواز پر ماں کی آنکھیں بھیگ گئیں اس نے فوراً آنسوؤں کو قمیص کی آستین میں جذب کر لیا۔ بھائی، آج کھا لو پیٹ بھر کے نئے گھر میں مونگ کی دال کا سالن نہیں ملے گا۔ میری شادی ہوئی تب سے میں یہ پیڑ یہاں دیکھ رہی ہوں گی کہ پھر نیچے میں یہ کہہ کر چاچی نے اپنی اشک آلود آنکھیں بند کر لیں۔

"میرا ابا پچھوا سا تھا تب انھوں نے اسے لگایا تھا" دادی ماں کہنے لگیں، اور پھر بہت دیر تک یہ پرانی باتیں سناتی رہیں کہ کس طرح ہمارے دادا نے غربت میں گزارے کتنی مشقتیں جھیلیں اور انھیں تاگپور میں اس گھر کو بنواتے ہوئے کتنی دقتیں پیش آئیں۔ دادا جان نے گھر کو کس طرح محفوظ رکھا۔ وہ بار بار سفیدی کراتے اور اس کے بغیر زیادہ عرصہ گزر جاتا تو دادی ماں پر بری طرح برس پڑتے۔ دادی ماں بتانے لگی کہ اس گھر میں کس کس کی شادی ہوئی۔ کون پیدا ہوا، کس کا انتقال ہوا، کون کون مہمان ہمیشہ آیا کرتے تھے۔ اور جب سب اکٹھا ہو جاتے تو کیسے مزے آتے۔ اور پھر بڑی چاچی بھی کچھ پرانی یادیں سمیٹ لائیں۔ کچھ بابو رادیا چاچا نے اضافہ کیا۔ اور ہماری اماں تو یادوں کی بھی ہیں ہی۔ دادی ماں تمام کھڑکیوں دروازوں پیڑ پودوں کی تاریخ بیان کرنے لگی۔ [illegible] نواکب لگا اور گھر میں کب بجلی آئی۔ کنواں کتنی بار سوکھا کتنی بار کھدوایا گیا۔ گائے کے کوٹھے میں ایک دن یکایک کیسے آگ لگ گئی۔ سب تفصیلاً سنایا۔ پھر آنکھوں میں ڈبڈباتے ہوئے آنسو آنچل سے پونچھتی ہوئی بولی — گڑھا چاکشمی نانی میرے گھر آ کر کہتی — "تیرا گھر کیا گول جیسا لگ رہا ہے تیرے بچے کیسے رام لکشمن جیسے ہیں" اب کیا رہ گیا باپ کے ہاتھوں کی اتنی کمائی رہ گئی تھی وہ بھی تم نے گنوا دی۔

اور دادی آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگی بڑی چاچی انھیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ہم لوگ کھانا ختم کر چکے تھے۔

بستر پر پپو نے بتایا کہ ہماری بہت بڑی دکان تھی جو برباد ہو گئی اور ہم مقروض ہو گئے۔ اسی کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اسی قرض کی ادائیگی کے لیے مکان بیچ دیا گیا۔ تو کیا واقعی گھر بک گیا؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ہاں، وہ بولا — اسی لیے تو ہمیں نئے گھر میں رہنے کے لیے جانا ہے۔ ایک مہینے کی مدت ملی تھی اسی دوران ہمیں یہ گھر چھوڑ کر نیا گھر ڈھونڈنا ہے۔ اب گھر میں یہی موضوع زیر بحث تھا۔ شام صبح یہی چرچے ہوتے مگر شہر میں بڑا سا گھر کہیں ملتا ہی نہ تھا۔ شام ڈھلے چاچا گھر لوٹتے تو چاچی پوچھتی — ملا گھر؟ وہ جواب دیتے اتنی جلدی کیسے ملے گا۔ آج تک خود کا گھر تھا۔ کرائے کے مکانوں کے مسئلہ سے وہ ناواقف تھے۔ کہتے — اتنے سارے لوگوں کے لیے کافی ہو سکے ایسا گھر اب شہر میں ہے ہی کہاں؟ اپنے جیسا بڑا خاندان اب شہر میں ہے ہی نہیں۔

اور کبھی اماں پتاجی سے پوچھتیں کہ کچھ پتہ چلا گھر کا؟ وہ جواباً کہتے ہاں ہے مگر اتنا بڑا کہاں ہے؟ پھر آفس بھی اس سے بہت دور ہے۔ اور کبھی چھوٹی چاچی چاچا کو علیحدگی میں لے جا کر سمجھاتی — "بڑے گھر کے چکر میں کیوں پڑتے ہو۔ خود کا گھر تو تمہارے بھائیوں نے اجاڑ ڈالا۔ اب ایک ساتھ رہ کر کیا کریں گے۔" وہ کہتے — ارے بھئی مگر ماں کو کیا لگے گا؟

اونہہ! انکا کیا ہے خود کا گھر ہے تو ایک ساتھ رہتے تھے اب نہیں ہے تو کیا رہیں مجھے تو ساتھ میں رہنے سے کوئی نہیں۔ ہمارے یہاں بمبئی میں ایک کمرہ میں سارا گھر رہتا ہے۔ تم بھی ایک دو کمرے دیکھو نا وہاں سے تمہیں آفس بھی قریب پڑے گا۔ چاچا اس بات میں سر ہلا دیتے تو چاچی خوش ہو جاتی۔ مگر دادی ماں خاموش تھیں۔ گھر ملا نہیں ملا کبھی بھول کر بھی کسی سے پوچھا نہیں بلکہ اب انھوں نے صبح کا کھانا بھی چھوڑ دیا تھا: بس ہر دم مالا جپتی رہتیں بیچ بیچ میں ڈبڈبائی آنکھیں صاف کرتی رہتیں۔ اب پڑوسی آ کر گھر کے بارے میں پوچھتے چھوٹی چھدر دیا جاتے۔ دادی مطلق خاموش رہتیں۔ سب کہتے دادی ماں کے دل پر کسی بات کا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ یہ سبھی رات گئے۔ پتاجی گھر آتے اور اکیلے ہی کھانا کھانے بیٹھے۔ میری نیند اڑ چکی تھی کمرہ میں تنہا ڈر بھی لگ رہا تھا میں نے سنا ماں پتاجی سے

مہکی تھی — بڑی بی کی طبیعت اب کچھ ٹھیک
نہیں راتوں میں اٹھ اٹھ کر ساری دیواریں ٹٹو
لتی پھرتی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے ......
بابو چاچا جی نے پوچھا۔
کہیں کسی دیوار میں ماما جی کے ہاتھوں کا کچھ
سونا وغیرہ تو چھپا ہوا نہیں۔ چاچا جی ہنس پڑے
بولے — کہاں کا سونا چاندی بڑھیا کا سارا
دل گھر کے ایک ایک اینٹ پتھر میں اٹکا ہوا
ہے۔ اور پھر ماں کو پرانی باتیں بتاتے بتاتے
ان کا لہجہ گلوگیر ہو گیا کہ دادی کو گھر کی ایک
ایک چیز کتنی عزیز ہے ان درو دیوار سے
اسے کتنی شدید محبت ہے۔

ایک ماہ کی میعاد ختم ہونے کو آئی مگر
کوئی بڑا گھر ابھی تک نہ مل سکا۔ ایک دن
بابو راؤ چاچا نے بتایا کہ انہیں ہر ڈی پر دو
کمرے مل گئے۔ چاچا جی نے بھی کہیں دو کمرے
حاصل کر لیے اور بڑے چاچا بھی عنقریب کسی
چال میں رہنے کے لیے جانے والے تھے کمرے
ملتے ہی گھر میں ہر دن شورشیں شروع ہو گئیں
سامان کی تقسیم ٹھیک طرح نہیں ہو پا رہی تھی
چھوٹی چاچی خوب زور زور سے جھگڑتی
اور اب کھانے کے لیے بھی سب الگ
الگ بیٹھنے لگے تھے۔ بڑوں کے جھگڑے
ہماری سمجھ سے باہر تھے مگر ہمارے درمیان
بھی روزانہ دو چیزوں کا بٹوارا ہوتا۔ ایک
دادی ماں اور دوسرے طوطا ہر کسی کو یہ
دونوں چیزیں اپنے گھر چاہیے تھیں ہماری
بھی تقسیم نہیں ہو پائی۔ خوب لڑائیاں
ہوتیں آخر ہم دادی ماں کے پاس جاتے
اور پوچھتے — دادی ماں تو کس کی؟
مگر دادی ماں ہر کسی سے کہتی — بیٹا میں
تیری ہی ہوں رے ——

مگر ہمیں اطمینان نہ ہوتا بلکہ جھگڑے
میں اور زور پیدا ہوتا تب دادی ماں
جھلا کر کہتی۔ کمبختو! آج تک اس گھر
میں کوئی لڑا نہیں۔ اب دیکھو تو روز روز
جھگڑے ہو رہے ہیں۔ جیسے بڑے ویسے
چھوٹے میں چاند کا ٹوٹا سا ٹکڑا نکل گیا ایک
ٹک لگا ہوں پہرے بھی ہم جھگڑے کرتے
بانٹ لوتے تب ہم خاموش ہو جاتے مگر
پھر ہماری پیاری ماں ہماری دادی ماں
کہہ کر لڑ پڑتے۔

ہماری ہی طرح سے گھر کے بڑے لوگوں
میں بھی چاچا چھوٹی چاچی کہتیں۔ بڑی بی
ہمارے پاس رہ جائیں مگر ہمارے یہاں تو دو
ہی کمرے ہیں ان کی پوجا پاٹ مشکل ہو جائے
گی۔ ماں کہتیں ہمارے پاس رہ جائیں مگر بھلا
گھر دوسری منزل پر ہے زینوں سے اترنا
چڑھنا بھلا ان سے کیا ہوگا۔ بڑی چاچی
بولیں۔ ہمارے پاس رہ جائیں مگر ان کا دل
تو بابو راؤ جی میں اٹکا ہوا ہے۔ ہر دو دن
کے بعد کہیں گی مجھے بابو راؤ کے پاس پہنچا
دو۔ دادی ماں یہ ساری باتیں سنتیں مگر ایک
لفظ نہ کہتیں۔

آج دوپہر کو نئے گھر جانا تھا۔ بڑی
بڑی چیزیں جس کی تھی وہ لے گیا صرف کھانے
کے برتن اور چھوٹا موٹا سامان باقی بچا تھا۔
اسے بند ہوانے کے لیے وقت ملنا چاہیے
اس لیے صبح کا کھانا جلدی ہی کھا لیا گیا۔ ہم
سب بچے بابو راؤ چاچا کے ساتھ کام کر رہے
تھے۔ چاچا بابو راؤ چاچا گھر کے سارے کیلے، کھڑ
کیوں کے شیشے، کھونٹیاں الماریوں کے کواڑ،
ٹین کے ڈبے جو کچھ نکالا جا سکتا تھا نکال رہے
تھے جس کی وجہ سے دیواریں خراب ہو رہی
تھیں۔ پلاسٹر اکھڑ رہا تھا۔ مگر انہیں اس کی
پرواہ کب تھی۔ البتہ دادی ماں انہیں بار
بار منع کر رہی تھیں کہ وہ دیواریں خراب نہ
کریں مگر وہ نہ مانتے اسی دوران انہوں نے
ہمیں کیلوں کے حصے کرنے کے لیے کہا۔ مگر
پرشو نے ایک کیلا زیادہ لے لیا جس کے لیے
چھوٹی چاچی نے پرشو کو خوب باتیں سنائیں
اسی بات پر بڑی چاچی سے ان کا جھگڑا ابھی
ہوا۔ بڑی چاچی نے پرشو کو بری طرح پیٹ
کر اس کے سارے کیلے چھین کر گوپو کے منہ
پھوٹے ملے سے پرشو روتا ہوا دادی کے
پاس گیا مگر دادی نے اسے قریب نہیں لیا
بلکہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جیسے
اندر ہی اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔

سارا گھر خالی ہو گیا۔ بولتے تو ہماری
آواز سارے گھر میں گونجنے لگتی ہمیں مزہ آتا
ہم خوب چلانے لگے۔ اوپر کمروں میں کچھ رہ
گیا یا نہیں یہ دیکھنے کے لیے ہم اوپر پہنچے تو دیکھا
تمام کمرے خوف ناک حد تک اجاڑ ہو چکے تھے
سب سنسان ہو چکا تھا۔ کسی دیوار پر کوئی کیلا
کوئی کھونٹی تک باقی نہیں تھی۔ الماریاں
اور دروازوں سے کواڑ غائب تھے
ہر طرف ویرانی کا راج تھا صرف ایک
آئینہ جس میں جگہ جگہ بال آ گئے تھے۔ دیوار
میں جڑا ہوا تھا۔ اس آئینے میں ایک آدمی
کے کئی کئی چہرے نظر آتے تھے۔ آئینے میں
جھانکتے ہوئے بابو راؤ چاچا بولے —
جاؤ بچو! ذرا سبل لے آؤ۔ ہم سبل لے
آئے تو وہ دیوار پھوڑنے لگے جس کی آواز
سن کر دادی ماں اوپر آئیں۔ زینہ چڑھتے
ہوئے ان کی سانس بھر آئی۔ ان سے ٹھیک
طرح بولا بھی نہ جا رہا تھا بڑی مشکل بولیں۔
بابو راؤ! ارے دیوار گر جائے گی نا۔
کچھ نہیں ہوگا ماں تو پیچھے جا۔
ارے میرے لال سن میری قسم تجھے
دیوار گر جائے گی تو اس آئینے کا کیا کرے گا
دیکھ دیوار گر جائے گی۔
گرنے دو اب یہ گھر ہمارا تھوڑا ہی ہے
ارے واہ! اتنے دن اس کی چھاؤں
میں نکالے اور اب اس کا تیرا کچھ نہیں کوئی
رشتہ نہیں مگر بابو راؤ چاچا نے ایک نہ سنی
اور آئینے کے پیچھے کے ٹکڑے کھود کر نکال
لیے۔

بہت دنوں بعد ہم سب کھانا کھانے کے
لیے اکٹھے بیٹھے تھے مگر ہم میں آپس میں کسی
قسم کی بات چیت نہیں ہوئی۔ پھر چیر کو ایک
غریب لڑکا آن ہمارے یہاں کھانا کھانے

آیا کرتا تھا۔ آج وہ بھی چپ تھا۔ ورنہ عام طور پر اس کی زبان ایک منٹ نہ رکتی مونگ پھلی کی دال کا سالن آج شاندار بنا تھا چھوٹی چاچی بن سے بولیں ۔ تجھے کہا تھا نا کہ کھانا کھانے اب اگلی بار کسی دوسرے کے یہاں جانا کیا کوئی دوسرا گھر نہیں دیکھا

دیکھ تو رہا ہوں مگر ابھی ملا نہیں ۔

بن بولا اور تبھی دادی ماں بری طرح جھلا گئیں۔ کیوں ! دس آدمیوں کے گھر میں ایک برہمن کا بچہ نہیں پل سکتا۔ ہمارے گھر میں کئی کئی لڑکے کھایا کرتے تھے تم پر ایک بچہ بوجھ ہو گیا ؟ دادی ماں کے اس سوال پر سب خاموش رہے۔ ماں نے کبھی بن کو دوسرے کے گھر جانے کے لیے کہہ دیا دادی ماں چپ چاپ دروازہ میں بیٹھی رہیں۔ اور ہم سب کو بہت دنوں بعد اکٹھا کھاتے ہوتے ٹک لگائے ہوئے عجیب نظروں سے دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر پتا جی سے بولی ۔ تم نے سارا سامان اکٹھا کر لیا مگر آنگن میں تلسی کا ورنداون کیوں چھوڑ دیا ؟

اس پر بابوراؤ چاچا درمیان ہی بول پڑے۔ تم بھی خوب ہو ماں دو کمروں کے گھر میں اسے کہاں رکھیں گے ؟

کہیں بھی رکھو۔ مگر کیا گھر میں تلسی نہیں چاہئے۔ میں نے اتنے دن . . . .

ادکھ جانے دو ماں مٹی پتھر کا بوجھ تجھ سے چھوٹتا ہی نہیں بابوراؤ چاچا کے کہنے پر دادی ماں اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

کوئی ۳ بجے بابوراؤ چاچا تانگے لے آئے باقی بچا ہوا سامان ان میں رکھ دیا گیا۔ منّو دیدی سسرال جاتے وقت جس طرح روتی تھیں سب لوگ رو رہے تھے مگر ماں کا کہیں پتہ نہ تھا بڑی چاچی کے پاس کی لٹیا بھی غائب تھی سب پریشان تھے دادی ماں کہاں ہے دادی ماں کہاں ہے۔ کہہ کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ پتا جی کسی انجانے خوف سے گھر کے کونوں میں بھی جھانک آئے۔ آخر بابوراؤ چاچا اوپر بلڈنگ پر گئے اور پانچ دس منٹ بعد لوٹے تو ان کے ایک ہاتھ میں چاچی کی پانی لیٹا تھی اور دوسرے ہاتھ سے دادی ماں کا مٹی گارے میں سنا ہوا ہاتھ جسے تھام کر وہ نیچے اتر رہے تھے۔ دادی کا سارا جسم مٹی اور گارے سے سنا ہوا تھا۔ چاچی نے دادی کا یہ حلیہ دیکھا تو پوچھا — یہ اوپر کیا کر رہی تھیں ؟ بابوراؤ چاچا بولے — عجیب پاگل پن ہے جس دیوار سے آئینہ نکالا وہ جگہ اکھڑی ہوئی تھی اس کو گارے سے لیپ رہی تھیں۔ پتا جی بولے ۔ کیسی ہے ماں تو . . . . اب اس گھر سے ہمیں کیا لینا دینا ۔

نیچے تانگے والے جلدی چلنے کے لیے شور مچا رہے تھے "جلدی چلو۔ جلدی چلو" ماں نے فوراً دادی کے ہاتھ دھلوائے ہم تانگے میں جا بیٹھے۔ دادی ماں کی تمنا تھی کہ بابوراؤ چاچا کے ساتھ جائیں اور ان ہی کے وہاں رہیں مگر وہ خاموش رہے بڑے چاچا نے دادی ماں کو اپنے تانگے میں لے جا کر بٹھایا۔ دادی ماں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں پڑوسی دری چوں دروازوں میں سے جھانک جھانک کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔

تانگے والوں نے فضا میں چابک لہراتے اور ہمارے تانگے تینؔ سمتوں میں چل پڑے دھیرے دھیرے ہمارا گھر ہماری نظروں سے دور ہوتا گیا ۔ (مراٹھی سے ترجمہ)

افسانہ

دوسرا رُخ

نیاز احمد اعظمی





وہ بھاگ رہا تھا۔ لوگ پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے شکار کے پیچھے شکاری۔ لیکن وہ بہت دور نکل چکا تھا، اور لوگ بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ لہٰذا لوگ لاٹھی ڈنڈا سنبھالتے ہوئے واپس ہولیے ــــ کوئی کہتا بس قدم دو قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا، ورنہ تو۔ ،کوئی کہتا میری لاٹھی گر پڑی تھی، ورنہ تو۔ ۔۔۔،کوئی کہتا میری دھوتی پھنس گئی تھی، ورنہ تو غرض یہ کہ ہر کوئی ناکام شکاری کی طرح اپنی اپنی ڈینگ رہا تھا۔

پوری بستی میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کچھ لوگ مکھیا جی کے دروازے پر بیٹھے ہوئے اپنے اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے آپ کو بہت بہادر اور عقلمند ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگوں کی بہت سی باتیں ابھی ادھوری تھیں، لیکن لوگ مارے ہوئے جواریوں کی طرح اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے، کیونکہ رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔

رات کا واقعہ پوری بستی (اور پاس پڑوس) والوں کے لیے گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا حالانکہ یہ واقعہ کوئی نیا نہیں تھا، پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ لیکن بستی والوں کی بے پناہ کوششوں اور چھان بین کے باوجود بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کون ہے، آدھی رات کے لگ بھگ بستی میں کیوں آتا ہے ؟ جبکہ اسے معلوم ہو چکا ہے کہ بستی والے ہمیشہ ہوشیار رہتے ہیں اور ہاتھ آجانے پر اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ جان بھی۔۔۔۔۔ پھر بھی وہ ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے اندر بے خوف و خطر اس خطرے سے کھیلنے ضرور آتا ہے۔

اس ایک آدمی نے پوری بستی والوں کو اس قدر پریشان و خوف زدہ کر رکھا تھا کہ پہرا دینے والوں کے علاوہ بھی لوگ آنکھوں میں نیند ٹھُس جانے کے باوجود آنکھیں کھلی رکھتے، کہ نہ جانے کب وہ آتے اور کیا کر جاتے۔

بستی میں اس سلسلے میں اکثر پنچایتیں بھی ہوتیں، لیکن مسئلہ ایک قدم بھی آگے پیچھے نہ ہوتا ــــ مگر ایک دن بستی کا مالی گھر گھر کا پانی پینے والا، حقیقت کے ایک دروازے تک پہنچ ہی گیا۔ اس کی اطلاع

کے مطابق یہ آدمی کوئی چور ڈاکو، کوئی پاگل یا وحشی نہیں، بلکہ ایک عاشق ہے" جو بستی میں کسی سے پیار کرتا ہے۔ لیکن اسکے بارے میں مزید کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کون ہے کہاں کا ہے، کس سے پیار کرتا ہے۔

لہٰذا بستی کی تمام پر پھڑ پھڑاتی ہوئی کنواریوں کو گھروں کی چہار دیواریوں میں قید رکھنے کا قانون لاگو کر دیا گیا۔ اور انکی نگرانی کا بھی کڑا انتظام کر دیا گیا۔ حالانکہ اس قانون سے مزدوری کر کے گذر بسر کرنے والے غریب اور چھوٹے لوگوں کو تکلیف تھی، ان کا نقصان تھا۔ کیونکہ ان کی بہو بیٹیاں گھر کے کام کاج کے علاوہ باہر بھی ان کے ساتھ کام کیا کرتی تھیں۔ پھر بھی وہ اس قانون پر عمل کرنے کے لیے مجبور تھے، کیونکہ یہ مکھیا اور بستی کے کچھ بااثر لوگوں کا لاگو کیا ہوا قانون تھا وہ بھی خاص طور سے ایسے ہی لوگوں کے لیے۔

مگر جیسے جیسے یہ قانون پرانا ہوتا گیا ویسے ویسے کمزور ہوتا گیا۔ مکھیا کے پاس کچھ شکایتیں بھی آنے لگیں۔ مثلاً فلاں کی بیٹی یا بہو گھر کے باہر فلاں جگہ فلاں کام کرتے ہوئے دیکھی گئی۔ لہٰذا مکھیا نے ایک دن ایسے تمام لوگوں کو بلا لیا اور ان سے کچھ دریافت کئے بغیر ہی ان پر برس پڑے —— "سالو، کمینو، ذلیل — بستی کی عزت کو مٹی میں ملانا چاہتے ہو۔ ابھی اپنی لڑکیوں کو تم لوگوں نے گھروں سے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ آخر تم چھوٹے اور بے عزت لوگوں نے اپنی اصلیت کا ثبوت دے ہی دیا۔ اپنی اوقات پر آ ہی گئے۔ اگر تم لوگوں کو اپنی اپنی لڑکیوں پر اتنا اختیار و قابو نہیں رہا تھا تو انہیں کوٹھوں پر کیوں نہیں بٹھا دیتے —— کان کھول کر سن لو اگر پھر ایسی شکایت میرے پاس آئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

بے گناہ، بے بس و مجبور مجرم مکھیا کی عدالت سے چپ چاپ فیصلہ سن کو سر جھکائے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو آ گئے۔

دوسرے دن پوری بستی (اور پاس پڑوس) میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی تھی کہ مکھیا کی جوان بیٹی نہ جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی۔

بقیہ تخلیق بہ مقابل تنقید

کے رویّے اکثر MALE CHAUVINISM کی غمازی بھی کرتے ہیں اور ایک عجیب سا رویّہ یہ ہے۔ مثلاً کشور ناہید کے نئے شعری مجموعے کے گرد پوش پر انور سجاد شاعری پر اظہار خیال کرنے کے بعد آخری جملہ یوں لکھتے ہیں "وہ پکوڑے بھی اچھی بناتی ہے۔" یہ کیا بات ہوئی۔؟

جواب

نقاد خالص معروضی تنقید بھی کرسکتا ہے اور فیصلے بھی (گو بعض ناقدین فتوے صادر کرتے ہیں) مگر اکثر اوقات فیصلے صادر کرنے والے آزاد نقاد اور مارکس وادی فیصلہ جاتی تنقید کرنے والے ادبی کو معیار ہیں شاید زیادہ فرق نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں "قومی تشخص" پر اصرار کرنے والے آج کے پاکستانی نقاد بھی دوان دنوں CATEGORIES قائم کر کے ان کے مطابق ادب کی چھان پھٹک میں معروف ہیں۔ کیا انہیں ناقدین کے زمرے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔؟

جواب

نقاد یقیناً میری تخلیقات کو مسترد کرسکتا ہے جس طرح مجھے حق ہے کہ میں جو چاہوں اور جس طرح چاہوں لکھتی رہوں۔ اسی طرح نقاد کو حق حاصل ہے کہ وہ مجھے مسترد کر دے۔ ادب تو جناب عالی بالکل آزادی کا معاملہ ہے۔ لیکن مجھے علم ہیں کہ آج تک کسی لکھنے والے نے نقادوں کی دہشت میں لکھنا چھوڑ دیا ہو۔ دراصل اکثر ناقدین کے ہاں ان کے ذاتی یا نظریاتی تعصبات بھی کار فرما رہتے ہیں۔ اور ان کے اپنے اپنے FAOS ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اقبال کے قائل ہیں۔ ورنہ آ ہر جگہ کھینچ تان کر زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں۔ وارث علوی کا خیال ہے جب تک وہ ہر صفحے پر چند مغلظات استعمال نہ کر لیں گے ان کی بات میں وزن نہیں پیدا ہوگا۔

دراصل تخلیق کار اور نقاد کا معاملہ ان کی انانیت سے تعلق رکھتا ہے۔ ادیب یا شاعر سمجھتا ہے کہ اس کی تخلیقات کی اساس پر ہی نقاد اپنی دکان چمکاتا ہے۔ کچھ ناقدوں کو زعم ہے کہ وہ گویا ادب کے KING MAKER ہیں۔ میں نے بہت سے مشہور اہل قلم کو مشہور ناقدین کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا ہے۔ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ "فلاں فلاں کو NTAGONISE مت کیجئے آپ کے خلاف لکھنا شروع کر دینگے" کمال ہے۔

یوں تو شاید آپ کو یاد ہو گا ہی سارتر ناقدوں کے بارے میں کیا کہہ گئے ہیں۔ شکریہ

بقیہ معروضی تنقید

ساخت اور مزاج کے دائرے میں ہی ممکن ہے۔ اسلوبیات کا انداز فکر معروضی، اور صریحی، ر

ہے۔ کسی ادبی تخلیق کے اسلوبیاتی مطالعے کے وقت ماہر اسلوبیات متن سے باہر کی چیزوں مثلاً زبان و مکان یا ادیب کی شخصیت کو نظر انداز کرتا ہے اور صرف اس ادبی تخلیق پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے۔ جو زبان اور شاعر یا ادیب کے اسلوب کے دائرے میں بندھی ہوتی ہے۔

لہٰذا عصر حاضر میں اس اردو ادبی تنقید کو جس کے بارے میں کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ "یہ محض فرضی ہے۔ یا اقلیدس کا خیالی نقطہ یا معشوق کی موہوم کمر" سا ٹھک بنانے کی ضرورت ہے۔ لسانیاتی اصولوں اور ادبی تنقید کی ہم آہنگی ہی معیاری تنقید کی بنیاد ثابت ہو سکتی ہے - - - - -

نصمت اوّل



خامہ بگوش کے قلم سے

سُخن دَر سُخن

٭ادب کے نام پر بے ادبی۔

٭ساقی فاروقی کا خط۔

٭غائبانہ تقریبِ رونمائی

پچھلے ہفتے ہم نے افتخار عارف اور ساقی فاروقی کے درمیان معرکہ آرائی کی طرف اشارہ کیا تھا اور یہ اطلاع دی تھی کہ اوّل الذکر کے نام ثانی الذکر نے ایک طویل اور سنسنی خیز خط لکھا ہے۔ حال ہی میں کراچی کے متعدد ادیبوں کو اس خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں موصول ہوئی ہیں اور اب بعض لوگ اس خط کے مزید عکس بنوا کر تقسیم کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی ایک کرم فرما نے اس خط کا عکس عنایت کیا ہے جسے پڑھ کر ہمیں کاتب اور مکتوب الیہ دونوں کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی۔ کاتب سے اس لئے کہ اب تک انہوں نے شاعری کر کے خواہ مخواہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو زحمت دی اگر وہ شروع ہی سے نثر کی طرف توجہ کرتے تو خاصے کامیاب نثر نگار ہوتے۔ مکتوب الیہ سے اس لئے ہمدردی پیدا ہوئی کہ ان کے مجموعے کی رونمائی سے پہلے خود ان کی اپنی رونمائی ہو گئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس خط میں افتخار عارف کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا کوئی دستاویزی ثبوت پیش نہیں کیا گیا اور جو لوگ افتخار عارف کو قریب سے جانتے ہیں وہ اس خط کا کوئی خاص اثر نہیں لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ ان پر خوشدلی طاری ہو جائے گی اور خوشدلی کا سبب ہے وہ تو ساقی فاروقی کا خط پڑھے بغیر بھی طاری ہو سکتی ہے۔

ہم نے گزشتہ ہفتے قارئین کرام سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ساقی کا خط ہمارے پاس آیا تو ہم اسے اپنے کالم میں شائع کریں گے بشرطیکہ اس سے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کی خلاف ورزی

ستمبر ۱۹۸۳ء

نہ ہو۔ یہ خط اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ ۲۶ صفحات پر اسی طرح پھیلا ہوا ہے جس طرح ساقی کی شاعری ۲۶ برسوں میں پھیلی یا پھنسی ہوئی ہے۔ اس خط کا بڑا حصہ مذکورہ آرڈیننس ہی کے نہیں حکیم محمد سعید کے آوارۂ اعلان کے بھی خلاف ہے لیکن یہ کہنا چاہئے کہ ناقابلِ اشاعت ہی نہیں ناقابلِ مطالعہ بھی ہے کیونکہ ساقی نے افتخار عارف پر وہ تمام الزامات لگائے ہیں جو سیاستداں یحییٰ خان پر لگاتے ہیں اور یحییٰ خان سیاستدانوں پر لگایا کرتا تھا۔ سیاستداں بھی سچے تھے اور یحییٰ خان بھی سچا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ساقی اور افتخار دونوں سچے ہیں کیونکہ جب تک افتخار کا جوابی بیان سامنے نہیں آجاتا، اس وقت تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ سچ کس کے ساتھ ہے۔ فی الحال تو سچ ہمارے ساتھ ہے کہ ہم دونوں کے بارے میں ایک جیسی رائے رکھتے ہیں یعنی شرح اسرار ہیں۔ ذیل میں ہم ساقی فاروقی کے خط کے وہ حصے شائع کر رہے ہیں جو ناقابلِ اشاعت نہیں ہیں۔ املا کی غلطیاں ہم نے درست کی ہیں۔ مطالب کی غلطیاں افتخار عارف درست کر لیں گے۔ سادہ لوگ جن کے نام اس خط میں آئے ہیں۔ ہم نے اس خط کی بہت سی عبارتیں حذف کر دی ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اتنا طویل خط نہیں چھاپ سکتے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں بعض پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں اور تیسری وجہ یہ ہے کہ قارئین کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو الفاظ یا جملے ہم نے حذف کئے ہیں ان کی جگہ نقطے درج کر دئیے ہیں۔ پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ خالی جگہوں کو قیاسی طور پر پُر کرنے کی کوشش میں وقت ضائع نہ کریں بلکہ خط لکھ کر ساقی فاروقی سے خط کا مکمل عکس منگوا لیں۔ ہمیں ساقی فاروقی کا پتہ معلوم نہیں۔ البتہ افتخار عارف (اردو مرکز لندن) کی معرفت خط لکھا جا سکتا ہے۔

اس خط کی اشاعت سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ کاتب یا مکتوب الیہ کو رسوا کیا جائے کہ یہ کام متعلقہ حضرات جیسے خوبی سے انجام دے سکتے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ انجام دے چکے ہیں۔ اس کی اشاعت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہمارے ادیب اپنا وقت کن غیر معمولی کاموں میں صرف کر رہے ہیں۔ ادب کے نام پر اس بے ادبی کا کوئی جواز نہیں۔

ایک بات ہمیں ساقی فاروقی سے بطور خاص یہ کہنی ہے کہ جب آپ نے افتخار عارف سے دوستانہ مراسم قائم کئے تھے تو اس کی اطلاع آپ نے کسی کو نہیں دی تھی، اب تعلقات خراب ہوئے ہیں تو آپ اس کی اطلاع دوسروں کو کیوں دے رہے ہیں۔

دوسری بات ہم افتخار عارف سے کہنا چاہتے ہیں کہ ساقی کے خط سے پریشان ہو کر آپ اپنی کتاب کی رونمائی کا پروگرام منسوخ یا ملتوی نہ کیجئے گا۔ یہ تقریب ضرور ہونی چاہئے۔ سنا ہے کہ اس موقع پر آپ کراچی نہیں آئیں گے۔ آپ آئیے اور شرکت کیجئے اور دیکھئے کہ کس دھوم دھام سے تقریب ہوتی ہے۔ آپ کی شرکت اس لئے بھی ضروری ہے کہ غائبانہ تقریبِ رونمائی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔

اب آپ ساقی کا خط پڑھئے،

عزیزی افتخار عارف! یہ خط لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ہندوستان سے "ن" (نارنگ) کا خط آیا کہ تمہیں معاف کر دوں۔ لندن کے "ن" نے بتایا کہ تم میرے گھر آ کر معافی مانگنے پر تیار ہو مگر خوف ہے کہ کہیں مار کر بھگا نہ دوں... گویا کہ میں ایک شمشیر برہنہ ہوں۔ نہ مجھے اپنی طبعی یا شعری بزرگی کی فکر ہے نہ اخلاق، تہذیب، مروت وغیرہ سے غرض ہے...... دوسرے لوگوں سے پتہ چلا کہ میں تم سے خفا ہوں۔ جب پتہ چلا کہ تم اپنی مراجعت کی تیاری کر رہے ہو کہ کہیں مجھے .... سے وہ باتیں بتا تو نہیں دیں جو تم جب بے طرب کہتے یا کرتے رہتے ہو تو تم غلط نہیں سمجھ رہے ہو .... اطہر نفیس کا خط (ایک لڑکے کا حال لکھا) ——— جو تم نے بھجوایا تھا یا سلیم احمد کا خط ("یہ لڑکا تم سے بہت مرعوب ہے اس کا اسی طرح خیال رکھنا جیسا تمہیں رکھا") یا تمہارا اوّلین کارڈ، مکتب کے ایک پرچے پر کہ "آپ ہی اس شہر کے قطب ہیں اور یہاں کون ہے" مجھ تک لانے کے لئے کا جے گلے پیا کیٹ لانا، گنڈیری سوا سی کو لکھا سمجھا ملک پھول بھی ——— ان چیزوں کے باعث میں نے تم کو ایک طرح کی PROTECTION دے رکھی تھی پھر اپنا دیوان خط نے مجھے دیکھنے کے لئے دیا تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ "ساقی کے لئے برائے اصلاح" اور میں نے اپنے حساب سے کانٹ چھانٹ بھی کر دی تھی، کچھ مصرعے اور شعر بدل دیئے تھے، کچھ کاٹ

نصف اوّل

کی مخالفت کی ہے... نے جو شعر پڑھے تھے وہ ان کی طبیعت کے تھے ... پھر شوکت کے رسالے میں جو غزلیں دیکھیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے معنی شعر نہیں تھے ... ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان اور ... ایسی بات نہیں ... دوستوں کے ساتھ ... ایک خوشبو ... بڑی مشکل سے ...

... بہت دنوں سے ... کہ ان ... PROTEST ... شادی ... کی باتیں ... تم کو لکھنے میں شرم ... سوچتے رہے ... شاید کر چکا ہوں اور شاید یہ جواب ملا کہ "نیل" ... میں ... کی وجہ سے برا بھرے ... کو خوش کرنے کی عادت پڑ گئی ہے جاتے جاتے جائے گی ... مگر اب محسوس کرتا ہوں کہ وہ عادت تو دور ہو گئی کے درمیان شک ... پیدا کرنے لگی ہے اور تم بالکل ... کر دوسروں کے تعصبات اور اپنی ... کو عرض کرتے ہو۔ اب جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ ایک طرح کی وارننگ ہے اور کسی بات کا حوالہ کسی کے سامنے پیش نہ کرنا۔ لکھا ابھی ہیں کہ ہر بات کے ... گواہ ... لاہور اور کراچی میں موجود ہیں، کچھ تحریریں میرے پاس موجود ہیں، ... اور لوگوں کے پاس ... ایک صورت ہے کہ ... کرو۔ ... سب ... ٹوٹ جائیں گے۔ ... ہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ ذرا دیکھو تو ....

... ایک جلسے میں ... صاحب نے ایک نظم کی فرمائش کی اور ایک مقام پر کہا کہ "بس ... صاحب نظم یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ آگے مت پڑھئے۔" اور ... صاحب ... رک گئے۔ یہ ان کی بڑائی تھی اور میری جرأت کے ایک معنی ... سے ہے۔ پھر محمد علی صدیقی تہرت ... نے کہا کر پڑھے ... سے کہا ... نہیں ... مگر تم نے وہ کلام کیا جس کے لئے مشہور ہو۔ دوستوں ... حبیب حیدر آبادی ..... کو ... اور ... کے علاوہ یہ بھی کہا کہ "کن کن لوگوں کو آپ گھر ... بلاتے ہیں" ... کا ذکر تھا جو ایک طرف کلام کی اصلاح ... کرتا تھا اور جس کو "... بھائی" کہتے تمہارے منہ سے ... اس کی۔ پھر جب میں خفا ہو اٹھا تو مجھے فوراً تم نے بتایا ... کہ یہ طلبہ کے لوگ ہیں" ... اکبر حیدر آبادی ... انہیں ... میرا انٹرویو لینا ہے ... تو بتایا کہ میں ... کو اس لیا ... بس بتایا کہ انٹرویو چھپتے ہی میں نے تمہیں اور ... کو فون کر کے کہا تھا کہ یہ دو باتیں غلط ہو گئیں۔ ایک یہ ... نے ایسی باتیں کی شاعری کی تعریف کر دی، دوسرے ... کا نام انہوں نے نہیں چھاپا۔ پھر عبداللہ حسین نے بتایا ... سے پوچھا ہیں مگر ... نے فون پر ... ایک ... سایا۔ ... تم نے کہا کر ... یوسفی ... نہرت ... ذہین ...

۶۱۹۸۴

اور ... کے دوست ... کی سے منہ ... ہے کسی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ یہ تمہاری ... اور سب سے بڑا جو ... ہی صاحب عبداللہ حسین کو ... اور ... کے ... اصل ... کے لئے ... جانتے ہو کہ "... اور دیکھیں" تو ... ہی ہیں .....

ایک ... بہت ... ہو کہ جب میں انگریزی پڑھا ... کر تمہیں انگریزی ... نہ پڑھی۔ انگریزی نظمیں لکھا دیں۔ پھر میرے دوست سلیم احمد کے بارے میں ... انگریزی مصنفوں کو کوٹ کرتے ہیں، انہیں انگریزی ... تک نہیں آتی ..... ایک "... " ... کو ... کرنے کیلئے ... کشور ناہید کی شاعری کی تباہی اور ان کی ... پر ایسا تبصرہ ... کہ میرے تو جوان ... ہوتے تھے اور تمہارا خیال ہے ایسی باتوں سے ... خوش ہوتی ہیں؟ پھر ... بجائے ... کہ "... ساقی بھائی اگر آپ کے ان سے ذاتی تعلقات نہ ہوتے تو کیا آپ ... ہو ... تمہارا ... یہ کہ تمہاری فرمائش پر ... نے تمہارا دیباچہ لکھنے میں شامل ہوں گی۔ تمہیں تاؤ کہ اگر اس کیلئے ... کلام پر لکھتا تو کیا تمہارا دل نہیں ٹوٹتا ... کیسی شاعری ہے جس سے میرا ... اور مشہور ہو گئے۔ شکایت کی ہے ... شاکر کی تمہارا ایک ... ادیش۔ میر ... کس سے شکایات کریں گے۔

تمہیں یاد ہے ... شاکر ... پر یوسفی صاحب کے یہاں میں نے لکھا تھا "اعتبار وہ ... دلیل ہے کہ جس نے ... اٹھائی" پھر یوسفی صاحب نے ... صاحب علم و صاحب نظر ہیں، انہیں غلط مشورہ نہیں دیا تھا کہ صاحب نادے اپنا ... ایک کر ... یا ... اور میرا ... مشورہ کرمانی ... اور ... ہو گئے۔ اب ... کرو۔ یاد آیا کہ جس کشور ناہید کی شاعری پر تمہارا ... ہو جاتا تھا۔ ادھر ادھر اس کے پاس ... کہ واہ آپ کیا غضب کی خاتون ادیبہ ہیں اور یہ کہ تمہارے مجموعے کی رونمائی لاہور میں کرا دیں ....

... تک میری جان حاضر! ایسی کوئی بات ... میں ... نہیں کہہ چکا ہوں، چاہے فیض صاحب چاہے میرے یار سلیم احمد ہوں، چاہے میری جان شمس الرحمٰن فاروقی، چاہے قاسمی صاحب ہوں، چاہے وزیر آغا.... میرے دوست محمد علی صدیقی سے یہ بھی پوچھ ... کیا میں ... سے ہزار گنا بہتر نہیں لکھتا؟ صدیقی اور میں ... نہ بنے۔ ... تم زمانے بھر ... سکو گے ہو تو جس ... سال سے ... ہے۔ پھر ... مصرع کہنا آتا ہے۔ ... احساس، خیال اور الفاظ ... کی وجہ سے چھوٹا شاعر اور ... شاعر سمجھتا ہوں۔ تم اس قسم کی باتیں ... لکھتے ... بہت کم ہیں....

ابھی لاکھوں باتیں اور ہیں جو دلی، لاہور، کراچی اور

... میں ... تم ... وقت ... نہیں کر ... کہ پہلے تمہیں آج رات تمہیں ... کہنا ہوں ...... میں اپنے ... سے بہت خوف زدہ ہوں .... کیوں ... کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا؟

فقط - ساقی

◆◆◆

ہم چاہتے تو ... کو ... و ... کو ... طرح ... تھے ... کر سکے اس ... کے ... میں ... اضافہ ... سکتے تھے، لیکن اس قسم کا معرکہ آرائیاں ... تو کیا ... ہی ... نہیں ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ کالم ہم اپنے شوق کی خاطر لکھتے ہیں اگر اس کے ذریعے دوسرے اپنا شوق پورا کرنے لگیں تو پھر ہم کیا کریں گے؟ حمایت علی شاعر کا مراسلہ چھاپ کر ہم نے جو غلطی کی تھی اب اس کا خمیازہ شمیم احمد کے مراسلے کی صورت میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ آئندہ ہم اس قسم کی کوئی غلطی کرنے اور پھر اس کا خمیازہ بھگتنے کا ارادہ نہیں رکھتے، اس لئے ان دونوں حضرات سے درخواست ہے کہ اس بحث کو ختم کر کے کوئی تعمیری کام کریں۔ مثلاً شمیم صاحب اپنے ممدوح کی شاعری پر ایک اور تنقیدی مقالہ لکھ سکتے ہیں اور شاعر صاحب اپنے ممدوح کی تنقید نگاری پر محققانہ نظر ڈال سکتے ہیں۔ ان دونوں مقالوں کو استاد اختر انصاری اکبر آبادی کے رسالے "... " میں ... سالانہ چھپوایا جا سکتا ہے کہ بیس سال پہلے یہ بحث اسی رسالے میں شروع ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ "... سالانہ" کا مطلب یہ ہے کہ استاد اکبر آبادی اپنے مضمون نگاروں سے صرف کتابت کے اخراجات وصول کرتے ہیں۔ کاغذ اور چھپائی وغیرہ کے اخراجات خود ادا کرتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کے دیوان کی طرح شمیم صاحب کے مراسلے میں آپ کو متعدد مقامات پر نقطے نظر آئیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض الفاظ یا ... ہم سے پڑھے نہیں جا سکے، مجبوراً انہیں حذف کرنا پڑا اور نقطوں سے کام لینا پڑا۔ نقطوں کی شمولیت کی وجہ سے کہیں کہیں ربط عبارت کے لئے ایک آدھ لفظ بڑھانا پڑا ہے لیکن تمام الفاظ قوسین میں دے دیئے گئے ہیں۔

محترم خامہ بگوش صاحب! سلام مسنون

آپ تو ہمارے ایک ... سے ... ہیں ... نسلت کے ترقی پسندوں کو ہرا ... بہت پسند ہے، ان کا مزاج ... ہے اور ...... بجی ہمارے ...... حمایت علی شاعر ... نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان کا یہ ... ہیں ... اور ... کہتے ہیں، ... کے ... شاعر ہیں لیکن ... چاہیئے کہ ...... کے ... آپ کے کالم میں ... کر ... آپ اپنے کالم میں ...

نصف الآل

وہ معرکۂ محبت و نفرت [illegible]

وہ فطرت اور غلاظت کا خمیر!

وہ نکتہ وری کے [illegible] نقطے!

[illegible]

[illegible]

آپ پر [illegible] کا الزام لگا دیں گے کیونکہ آپ نے [illegible]
شاعر کا نام نہیں لکھا ہے

اس [illegible] اور مسرت کے [illegible]
ایک ادیب [illegible] آپ کو [illegible]
ہوا کوئی [illegible] ہے جس میں [illegible] ان کی تعریف
کی گئی ہے [illegible] صاحب [illegible]
ہیں کہ ایک [illegible]
[illegible]
میں ایک تبصرہ کو [illegible]
تاکہ لوگوں کو [illegible]
[illegible]

ملاقاتی

ایک ملاقات ایک اپیل

ہماری خواہش تھی کہ چنگاری میں ایسی شخصیتوں پر مضامین، ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا جائے جن کے دم سے جینے کا حوصلہ ملتا ہے اور جو زمانہ اور زندگی کے صحرا میں نخلستان کی طرح مسافروں کو سایۂ حیات پر گامزن رکھتے ہیں۔

دو تین شماروں میں ایسی شخصیتوں پر مضامین آئے بھی۔ ایک مسیحا نفس کی بات کے عنوان سے ڈاکٹر اگروال سے ایک تشنہ ملاقات بھی پیش کی گئی تھی۔ اور وعدہ کیا گیا تھا کہ پھر ان سے تفصیلی ملاقات کرائی جائے گی۔

اس بار جب میں نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے اپنے بارے میں بتانے کے بجائے اپنے دوستوں کے بارے میں بتانا پسند کیا۔ انھوں نے زور دیا کہ آپ سلامت علی مہدی کے بارے میں لکھیے اور اپنے قارئین سے درخواست کیجیے کہ وہ سلامت صاحب کی مدد کریں۔ سلامت علی مہدی سے میری بھی ملاقاتیں رہی ہیں اور ہر ملاقات میں ان کی شخصیت کا جادو مجھ پر اور زیادہ گہرا ہوا ہے۔

سلامت علی مہدی علم کا بحر زخار ہے اس کی زبان میں جادو ہے۔ قلم میں زور ہے۔ سلامت علی مہدی جب لکھتا ہے تو پڑھنے والا اس کی تحریر میں ڈوب جاتا ہے اس کا قاری اس تحریر کا دیوانہ بن جاتا ہے۔ اور جب بولتا ہے تو سننے والا کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

"وہ کہے اور سنا کرے کوئی"

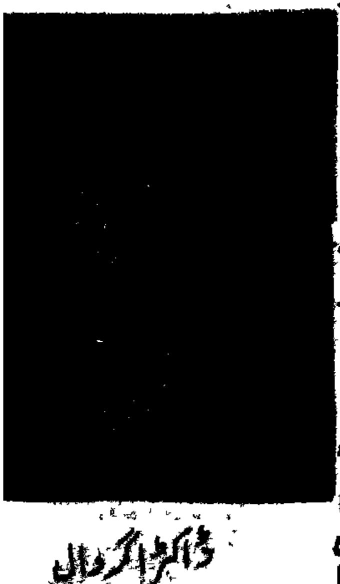
سلامت علی مہدی صرف صحافی نہیں ہے وہ مجاہد آزادی بھی ہے اور اس کا یہ جہاد آج بھی جاری ہے اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ آزادی کا یہ داغ داغ اجالا فریب ہے آزادی نہیں۔

سلامت علی مہدی نے ناول بھی لکھے ہیں اس کا ایک ناول "زمرد" تو بلاشبہ اردو ناول کا شہکار ہے مگر ہمارے ناقدین جو انگریزی ادب کے حوالے کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتے اس ناول کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا حالانکہ یہ وہ ناول ہے جسے شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر چھوڑنا ناممکن ہے اس کا ماحول بالکل طلسمی ہے اور اس کے کردار زندہ جاوید۔

سلامت علی مہدی میں چند خامیاں بھی تھیں مثلاً وہ بے تحاشہ پیتے تھے انھیں کچھ اور لت بھی تھی مگر اب انھوں نے ان سے کنارہ کر لیا ہے اس لیے کہ جس جان لیوا مرض نے انھیں اپنے دام میں گرفتار کر لیا تھا اس سے نجات کا بس یہی ایک راستہ تھا۔۔۔ اب سلامت علی مہدی رو بہ صحت ہے لیکن اسے ضرورت ہے دوا کی تمنا کی تاکہ ایک بار پھر وہ قلم کا جادو جگا سکے ہمارے جذبات کی ترجمانی کر سکے۔

مہدی ہماری آن ہے ہمارا فرض ہے کہ اس چراغ کو بجھنے نہ دیں اردو اکاڈمیوں، سرکاری اداروں اور افراد ان سب سے استدعا کہ وہ سلامت صاحب کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔

اس لئے کہ سلامت علی مہدی جیسے لوگوں کی ہماری قوم کو ضرورت ہے۔ (باقی آئندہ)



ڈاکٹر اگروال

کتابوں کی باتیں

کچھ نئی اور کچھ پُرانی مطبوعات

ب ۔ ا

ششماہی "افکار" جون ۸۳ ۱۹ء

(۲)

اڈیٹر :۔ ابو الکلام قاسمی
قیمت :۔ پندرہ روپئے
سائز :۔ ۲۲ × ۱۸ / ۸
صفحات ۔ ۲۵۶

"افکار" علی گڑھ کے شمارہ نمبر (۲) جون ۱۹۸۳ء میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون چھپا ہے ۔ "شعر شور انگیز" اسمیں انہوں نے میر کے اشعار کی تجزیاتی تشریح کی ہے اور حسب معمول بال کی کھال نکالی ہے یہاں میں "بال کی کھال" کو بُرے معنوں میں استعمال نہیں کر رہا ۔ اس عمل سے جہاں ایک فائدہ یہ ہے کہ شعر کی زیادہ سے زیادہ ممکنہ تشریحات اور معنی و مفہوم کی پرتیں سامنے آجاتی ہیں وہاں دوسری طرف ایک قباحت بھی پیدا ہو گئی ہے وہ یہ کہ انہوں نے بعض ایسی دور از کار معنی پیدا کئے ہیں جن سے شعر کا حسن مجروح ہوتا ہے اور طبیعت منغص ہو جاتی ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے فاروقی اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ ہر بڑے شاعر میں ایک ایسی صفت ہوتی ہے جو اسے دوسرے شاعروں سے ممیز ممتاز اور منفرد بناتی ہے ۔ میر کی صفت میریت اداسی جیسے بطور ریاست تنائی بھی کہا جا سکتا ہے مگر یہ اداسی، یہ غمناکی یا الم ناکی عرفان حیات کا نتیجہ ہے ۔ زندگی کو اچھی طرح دیکھنے، برتنے، جینے اور سمجھنے کے بعد شاعر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ زندگی غم کا دوسرا نام ہے ۔ یہ اداسی گوتم بدھ کی اداسی سے ملتی جلتی ہے جو زندگی کو دکھ ہی دکھ سمجھنے کا نتیجہ ہے ۔ لیکن گوتم بدھ کی طرح میر کی اداسی بھی حوصلہ شکن یا حوصلہ افزا نہیں ہے ۔ یہ انسان کو موت اور بے عملی کی طرف نہیں لے جاتی ۔ اور نہ ہی عیش کو یا غم کو غرق مئے ناب کرنے کی تلقین کرتی ہے ۔ میں نے اس اداسی کو عرفان حیات کا نتیجہ اس لئے قرار دیا ہے کہ یہ انسان کو تیاگ اور ترک کی طرف لے جاتی ہے ایثار پسند بناتی ہے ۔ میر یا بدھ کی اداسی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ زندگی فانی ہے بلکہ ان کی اُداسی کی وجہ یہ ہے کہ زندگی دُکھ ہی دکھ ہے ۔ اس کے سارے مظاہر سارا حسن ساری تخلیقات مبتلائے غم بھی ہیں اور وجہ غم بھی ۔ میر کے نزدیک زندگی کی بے ثباتی بھی غمناکی یا دکھ کا ایک سبب ہے مگر سب سے بڑا سبب نہیں ۔ جبکہ خیام کے نزدیک زندگی کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ زندگی فانی ہے ۔ میر کے نزدیک زندگی حباب نہیں بلکہ غم کا دریا ہے اور ہم سب اس کے قطرے ہیں ہم سب ایک عظیم غم کا جزو ہیں ۔

خیام کو بھی زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہے صرف احساس ہی نہیں انھیں غصّہ ہے انکا غصّہ اور خفگی کبھی کبھی اداسی میں بدل جاتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ جب زندگی کو آخر فنا ہی ہونا ہے تو پھر یہ تگ و دو، اور زندگی کرنے سے کیا فائدہ بہتر ہے کہ خود کو غرق مئے ناب کر دو "میریت" طنز و تضحیک یا ہجو سے عبارت نہیں ہے ۔ میر کا وہ کلام جسمیں اس طرح کے عناصر ہیں وہ میر کی عظمت کا سبب نہیں ہیں جس طرح میر کے یہاں بہت سا رطب و یابس ہے اسی طرح طنز و تضحیک بھی ہے ۔ میر کی عظمت کا سبب ہے ان کا عرفان حیات عرفان غم ۔ فاروقی صاحب نے میر کے اشعار کی تجزیاتی تشریح کے وقت اسی بنیادی بات کو نظر انداز کر دیا ہے اس لئے بعض ایسی باتیں میر سے منسوب کر گئے ہیں جو "میریت" کو مجروح کرتی ہے ۔ مثال کے طور پر میر کے مشہور شعر ؎

"کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا ۔"

کی تشریح کرتے وقت بات میں بات پیدا کرنے کے چکر میں وہ کئی ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو میر سے ناواقف ہے ۔

میر کا یہ شعر اردو شاعری کی روایات کو نظر انداز کر کے نہیں سمجھا جا سکتا ۔

زندگی مسلسل ہے پھول اسکے بے شمار مظاہر میں ایک مظہر ہے کلی اسکا بچپن ہے پھول کی زندگی چاہے کتنی ہی عارضی ہو، دو روزہ ہو، کلی پھول بننے سے رک نہیں سکتی کلی مسکراتی ہے پھول بنتی ہے اور مرجھا جاتی ہے ۔ یہی زندگی ہے ۔ یہی زندگی کا راز ہے اور اس کا نتیجہ ہے غم، دُکھ، درد میں بنیادی دوڑ ہے اس کے ہاتھ میں غم کا یہی سبب ہے یہ غم عرفان حیات کا نتیجہ ہے ۔ اس لئے محترم ہے، پُر وقار ہے مقدس ہے ۔

اس شعر میں نہ شاعر خود کلامی کر رہا ہے نہ کسی سے سوال کر رہا ہے "کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات" میں کوئی سوال نہیں ہے نہ خود کلامی ہے ۔ اور نہ ہی کلی نے کچھ سنا ہے بلکہ یہ ایک طرز اظہار ہے ۔ محسوسات کو الفاظ کا پیکر دینے کا بہانہ ہے ۔

فاروقی نے میر اور خیام کے شعر کا موازنہ کرتے وقت بھی یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ زندگی کے بارے میں دونوں شاعروں کے رویے میں بنیادی فرق ہے ۔ میر کے نزدیک زندگی دکھ کا دوسرا نام ہے جبکہ خیام کے نزدیک زندگی فانی ہے اور اس لئے غرور کرنا نادانی ہے فاروقی نے میر کے شعر ؎

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

کا سودا کا شعر ؎

تھا یہ جوانی فکر و تردد بعد از پیری یا ہاحسں
رات تو کاٹی دکھ سکھ ہی میں صبح ہوئی آرام کیا

سے موازنہ بھی کیا ہے۔ مجھے یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ ہر کلام منظوم شعر نہیں ہوتا۔ سودا کا "شعر" بھی محض کلام منظوم ہے۔ اسی طرح فاروقی نے میر کے شعر ؎

عالم میں آب و گل کے کیوں کر نباہ ہوگا
اسباب گر پڑا ہے سارا مرے سفر میں

کا غالب کے ایک شعر سے موازنہ کیا ہے۔ وہ یہاں پھر یہ بات بھول گئے کہ غالب کی صفت یعنی "غالبیت" "میریت" سے بالکل مختلف چیز ہے۔

غالب کو اس کی ذرا بھر پرواہ نہیں کہ دہقان ہے۔ اسی لئے نہ وہ زندگی کو فانی سمجھ کر خفا یا اداس ہوتے ہیں نہ اسے دکھ کا مترادف سمجھتے ہیں ان کے نزدیک یہ ہزار شیوہ ہے۔ وہ زندگی کو برتنے اور اس سے محظوظ ہونے کے قائل ہیں وہ شہد کی مکھی بننے کے قائل ہیں۔ غالب سے ہی ملتا جلتا رویہ نظر کا ہے مگر وہ زندگی سے لپٹ لپٹ کر محظوظ نہیں ہوتے بلکہ ایک سیاح کی طرح زندگی کو برتتے ہیں وہ اسی میں مگن ہیں "تک دیکھ لیں، دنیا دیکھا جوش دست ہوئے اور چل نکلے" یہ چل نکلنے والی خصوصیت ہی نظیر کو غالب سے الگ کرتا ہے۔

فاروقی نے اس مضمون میں آتش کو معمولی شاعر قرار دیا ہے اور ثبوت کے طور پر ان کا ایک خراب شعر نقل کیا ہے۔ اگر یہی رویہ رہا تو دنیا کا ہر فنکار معمولی بلکہ گھٹیا قرار دیا جائے گا اس لئے کہ اسکی تخلیقات میں خراب اور گھٹیا تخلیقات بھی ہوں گی۔ اسے کہتے ہیں چاول کے ڈھیر سے چنا اٹھا کر اس ڈھیر کو چنے کا ڈھیر ثابت کرنا۔

عیس حنفی کا مضمون بہت عمدہ ہے مگر اس کے ابتدائی ڈھائی صفحات بالکل لغو ہیں۔

رالف رسل کا مضمون "کل ہند ترقی پسند مصنفین میں "تبادلت کا عمل" قابل مطالعہ ہے مصنف نے غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی ہے مگر وہ ایسے مصنفین سے ناراض ہیں جنہوں نے انگریزوں کو برا بھلا کہا ہو خاص طور پر وہ کرشن چندر سے ان کی تصنیف لندن کے سات رنگ کی وجہ سے زیادہ ناراض ہیں۔

اس شمارے کی جان ہے قرۃ العین حیدر کا "قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے" (عالم آشوب)

چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"آج کی نسل اس لفظ مرگ سے مسحور ہے۔ ان سب کو مرگ پسند اور BRUTALISE کس نے کیا۔ آپ نے۔ اور آپ نے۔ اور آپ نے۔ آپ سب مجرم ہیں۔" راحت کے محلوں کو ملا ڈھونڈ رہی ہے۔ واجب القتل ہیں۔ بستی کے مکانوں کو مٹا ڈھونڈ رہی ہے۔" سزائے موت کا مصلہ سنا دیا گیا۔" تقدیر اپنی عمر سا ڈھونڈ رہی ہے۔" قتل کر دئیے گئے۔ ان جوانوں کی مرگ طرح طرح کے بھیسوں میں آ رہی ہے۔ تند دنگیوں کی باڑھ۔ شہری فسادی کا چھرا۔ پولیس کا "امن کا ڈسٹر" اور خانہ ساز پستول۔ (مجھ کو نوحانہ ساز دے) اور کیسری وردیوں میں ملبوس برہنہ کر کے نوجوان ان سب کو اور ان مرجوں اور کو جن کے باپ دادا خود مظلوم شہید ہوئے ان سب کو کس نے BRUTALISE کیا۔

آپ نے اور آپ نے اور آپ نے
آپ سب مجرم ہیں۔

مکانوں پر بلڈوزر چل گئے۔ مکانوں پر بلڈوزر برسوں سے چل رہے ہیں' کوہن آج ان کے متعلق اسٹوری

ملبے کے ڈھیر، لاشوں کے انبار، جلے ہوئے گھر۔
عل تھا کہ ایسے گھر میں الٰہی جہاں میں ہیں
ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکاں میں ہیں
وہ شب کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں
ہر دم زمین کی نکلتا تھا یوں بخار
جیسے دھواں تنور سے اٹھتا ہے بار بار
سہمے بچوں کا یہ عالم ہے کہ گھبراتے ہیں
گود میں ماؤں کے دہشت سے چھپے جاتے ہیں
ننگی تلواریں جو ظالم انہیں دکھلاتے ہیں
بس تو چلتا نہیں اشک آنکھوں میں بھر لاتے ہیں
نہ تو کر سکتے ہیں فریاد نہ رو سکتے ہیں
چپکے سہمے ہوئے اک اک کا منہ تکتے ہیں

ملبے میں ہر طرف کھلونے اور ننھے منے جوتے اور ننھے منے کپڑے۔

کل مجھے لوٹ کا اسباب جو دکھلایا تھا
اک پھٹے کپڑے پہ حاکم کو بھی غش آیا تھا
اک علم تھا اسی اسباب میں خورشید نشاں
مشک بیچے میں بندھی خون میں پھریرا افشاں
ایک گہوارے کی خوشبو سے یہ ہوتا ہے عیاں
کہ ابھی اٹھ کے سدھارا ہے کوئی غنچہ وہاں
بیچ میں تکیوں کے ننھا سا شلوکہ دیکھا
دودھ اگلا ہوا اور داغ لہو کا دیکھا۔

ایک سات سالہ بچی دہشت زدہ اپنے کھنڈر مکاں میں لاشوں میں گھری ایک خالی ٹب کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ بلک بلک کر رو رہی ہے۔

اچھی نہیں عادت نہ رویا کرو بی بی
پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی
کب ہوتے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں
مجبور ہوں ایسے کہ تمہیں چھوڑ کے جائیں
جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی
برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی
ہزاروں ہزار یتیم بے خانماں بچے
بیٹی کے سوا آپ کا کوئی نہیں بابا
شب بھر میں اسی خوف سے سوئی نہیں بابا
میں بے بی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔
میں صرف پانچ سال کا ہوں۔

"بچوں کے سر اب کٹ کے نشانوں پر چڑھیں گے"
"استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی ہے"

ٹیلی ویژن کی چینل بدل لئے۔

مگر اس چینل پر کوئی تصویر نہیں سناتا ہے سناٹا؟ جی نہیں یہاں سب خیریت ہے۔ برضائے الٰہی۔ منافقین اور زمین پر فساد پھیلانے والوں کو چن چن کر ختم کر دیا گیا۔ واجب القتل تھے۔ جو باقی ہیں انشاءاللہ ان کو بھی۔

"قید خانوں میں اسیر منتظر اجل بیٹھے ہیں۔"
آنکھوں پر سیاہ پٹی اور بند دنگیوں کے

گولیوں کی باڑھ ۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندوں کو آنے کی اجازت نہیں ۔ وہ شیطان عظیم کے کارندے ۔

قیدخانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے؟ ہند ہرگز نہیں آئے گی ۔ کاہے کو آنے لگی سب کو اپنے اپنے قومی مفاد کا خیال ہے صاحب لائن سے اپنی قبریں کھود کر سب اس قطار میں آجائیں ۔ جلدی جلدی ۔ افراتفری نہیں سسنتی نہیں ڈسپلن آخر دم تک ضروری ہے ۔

کچھ کفن کے لئے ہمراہ نہیں لایا ہوں
باپ کو چھوڑ کے بے گور و کفن آیا ہوں
فکر مت کرو ۔ کفن سرکاری ملیں گے ۔

بھاوڑے قرینے سے رکھ دیجئے دوسرے آرہے ہیں ۔

کاؤنٹ ڈاؤن ۔ دس ۔ نو ۔ آٹھ ۔ سات چھ ۔ پانچ ۔ چار ۔ تین ۔ قیدخانوں میں کمسن لڑکے لڑکیاں منتظر اجل بیٹھے ہیں ۔ دنیا کے ایوانوں میں اقتدار کی راہداریوں میں انکی آواز نہیں پہنچتی ۔ کوئی ان کو چھڑانے نہیں آتا ۔

متبسم اور خلیق کمانڈانٹ نے اسی اخلاق سے جھک کر جواب دیا" جی نہیں پہلے غسل بعد میں

وہ سب دو بڑے بڑے کمروں میں لے جائے گئے ۔ مرد ایک طرف عورتیں دوسری طرف ۔ جہاں انھوں نے اپنے کپڑے اتارے، کنٹوپ اور دستانے کوٹ اور کپڑے اتار کر کھونٹیوں پر قرینے سے ٹانگے ۔ جس طرح ان کو ان کے گھروں پر اور اسکولوں میں سکھلایا گیا تھا کپڑے اور جوتے اتارتے وقت بچے آپس میں ہنستے اور لڑتے بھی جاتے تھے ۔ ایک بچے نے اپنی ننھی بہن کی چٹیاں کھینچیں ۔ ایک بڑی لڑکی نے اسے ڈانٹا ۔ نرسوں کی سفید پوشاک میں ملبوس چند فربہ عورتیں اندر آئیں اور ان سب کو نکال کر ایک بڑے ہال میں لے گئیں ۔ مرد اور عورتیں دوسرے دروازوں سے ہال میں داخل کئے گئے ۔ پھر سارے دروازے بند کر کے گیس کے سلنڈر کھول دیے گئے

چالیس سال بعد ان دانشور بوڑھوں اور نوجوان فنکاروں اور معصوم بچوں کے رشتے دار جو اور جگہوں پر زندہ بچ گئے تھے انہوں نے ___

وہ پہاڑیاں بے حد حسین ہیں جن پر سیدار اگتے ہیں ۔ وہاں خلیل اپنے المصطفےٰ کے لئے گیت لکھتا تھا ۔ نیلا سمندر اور سرسبز کوہسار اور افسانوی قلعے صلیبی جنگوں کے زمانے کے اور جدید ترین جھلملاتی عمارتیں

کوفے سے ایک ناقہ سوار

گیس میں نہانے والوں کی باقی ماندہ اولاد اور ان کے باقی ماندہ رشتہ داروں کی اولاد پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں طیاروں کے پر بنا کر آئے ۔

ناقہ سوار آیا ناگہاں

مرجی بمبار بند دسے ۔ آئے

ان لشکروں کے نام رکھیں ۔ ابوالحنوق ، ارزق نوفل ۔ ابن زیاد ۔ سنان بن انس ۔ حنظلہ ۔ خولی انہوں نے خوشنما بم گرائے جنھیں معصوم بچوں نے کھلونے سمجھ کر اٹھایا اور بھسم ہوئے ۔

" فرمائیے آپ کس قسم کی اذیت اور موت اپنے لئے پسند فرمائیں گے ۔ ؟ بڑی ورائٹی ہے آجکل چند آئٹم سیکرٹ ہیں ۔

علاوہ ازیں اس شمارے میں شمس الرحمان کے سوال اور تخلیق کاروں کے جواب بھی ہیں جن میں سے ہم سوالات اور صرف قرۃ العین حیدر کے جواب اسی شمارے میں پیش کر رہے ہیں ۔

ان کے علاوہ نظمیں ، غزلیں ، مضامین ہیں حسن نعیم کا تبصرہ قابل ذکر ہے ۔

●●●

آگ کے ہم سائے :۔ احمد یوسف

صفحات :۔ ۱۳۸

قیمت :۔ پندرہ روپیے

ملنے کا پتہ ۔ بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۴

یہ مجموعہ جدید اور علامتی افسانوں کا ہے مصنف صف اوّل کا افسانہ نگار ہے ۔ یہ اس کا دوسرا مجموعہ ہے ۔ مصنف شروع میں ہی اپنے دل کی بات چند سطروں میں ہی کہہ جاتے ہیں ۔

' یہ ضرور ہے کہ ان قصوں نے خوشنما ملبوسات زیب تن کر لئے ہیں ۔ بستیوں میں رونق آگئی ہے ۔ شور اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے دباؤ سے ہمارے دل بیٹھے جا رہے ہیں اور رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ اس کا ساتھ دیتے دیتے ہماری سانسیں اکھڑ جاتی ہیں ۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ، قصے کا بنیادی عنصر وہی ہے ۔ جو کل تھا ۔"

مصنف کے ہر افسانے میں درد و کرب کا اظہار ہے ۔ مصنف سماجی ناانصافی ۔ زندگی کی ناہمواری ۔ انسانوں کی ذہنی کشمکش ۔ مسائل و مصائب اور مکروہ حقیقتوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے ۔ ان کے اسباب کو بے نقاب کرتا ہے ۔ مسائل کی عکاسی کرتا ہے ۔

افسانے ہی جدید نہیں بیان کرنے کا رنگ و آہنگ بھی جدید ہے ۔

" چراغ کشتہ " پہلا افسانہ ہے ۔ ایک ملازم ہے ۔ اپنی کہانی سنانا شروع کرتا ہے اور ایک عہد کی کہانی سا جاتا ہے ۔ یعنی خود ہی ایک کردار بن جاتا ہے ۔ " ورنہ " کا الفاظ دیکھئے ۔

" ان کا باپ تو پھر بھی معصوم تھا کہ صرف کفن ہی چراتا تھا ۔

یہ تو کفن بھی چراتے ہیں اور مردے کی بے حرمتی بھی کرتے ہیں ۔

آخری افسانہ " وہ ایک شخص " ہے

آبادی میں ایک مست نکل آیا ۔

تہوار کا چہرہ چمک اٹھا ۔ اس نے کھڑے ہو کر خلقت کو خطاب کیا ۔

" میرے یہی وہ تھا جو کبھی سرسبز شاداب کھیت ۔ گیہوں اور گیہوں کی روٹی کی رٹ لگایا کرتا تھا ۔ کبھی جوتا ۔ دھاگا ۔ سوا اور موم کی رٹ لگا رہا ہے ۔"

پورے مجموعہ کو آپ اس ایک شعر کی ترجمانی کہہ سکتے ہیں ۔ " غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

کتابت ۔ طباعت عمدہ ہے ۔ قیمت صحیح ہے ۔

کم قیمت پر عُمدہ کتابیں خصوصی کمیشن

(1)
کتاب ۔ ایڈیٹ
مصنف ۔ دستوئسکی
نوعیت ۔ ناول
مترجم ۔ ظ ۔ انصاری
صفحات ۔ ۹۲۵
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸
قیمت ۔ ۱۸ روپے (مجلد)

(2)
کتاب منزل کی تلاش
مصنف ۔ گورکی
نوعیت ۔ سوانحی داستان
مترجم ۔ رضیہ سجاد ظہیر
ایڈیٹر ۔ انور عظیم
صفحات ۔ ۲۰۴
قیمت ۔ ۳ روپے (مجلد)
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸

(3)
کتاب سہ دسال آشنائی
مصنف ۔ بیس امریقی
نوعیت ۔ یادیں، منظوم ترجمے وغیرہ
صفحات ۔ ۱۳۶
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸
قیمت ۔ ۵ روپے (مجلد

(4)
کتاب منتخب تصانیف
مصنف ۔ پشکن
نوعیت ۔ ناول (شری طبع دوم)
مترجم ۔ ظ ۔ انصاری
صفحات ۔ ۳۵۲
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸
قیمت ۔ ۶ روپے

(5)
کتاب شعر و شاعری
مصنف ۔ پشکن
نوعیت ۔ منظوم ترجمے
مترجم ۔ ظ ۔ انصاری
صفحات ۔ ۲۲۶
قیمت ۔ ۵ روپے (مجلد)
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸

(6)
کتاب دھرتی ماتی
مصنف ۔ شولوخوف
نوعیت ۔ ناول (دو حصے)
مترجم ۔ انور عظیم
صفحات ۔ ۳۰۱
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸
قیمت ۔ ۱۸ روپے دس پیسے

(7)
کتاب بہار کے ستر لمحے
مصنف ۔ پویان
نوعیت ۔ ناول
مترجم ۔ مرزا اسماعیل بیگ
صفحات ۔ ۳۶
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸
قیمت ۔ ۵-۹ روپے

(8)
کتاب پانی کا قطرہ سونے کا ذرہ
مصنف ۔ رحمان
نوعیت ۔ کہانیاں
مترجم ۔ منظر سلیم
صفحات ۔ ۱۹۷
قیمت ۔ ۵-۳ روپے
سائز ۔ پاکٹ بک

(9)
کتاب جنگل کی داستان پہلی محبت کی
مصنف ۔ ردویم اف مان
مترجم ۔ مرکو علیم
نوعیت ۔ ناول
صفحات ۔ ۲۶۸
قیمت ۔ ۴ روپے
سائز ۔ پاکٹ بک

(10)
کتاب سفید جہاز
مصنف ۔ چنگیز
نوعیت ۔ ناول
مترجم رحمان
صفحات ۔ ۲۸۶
سائز ۔ پاکٹ بک قیمت۔
سائز ۔ پاکٹ بک
قیمت ۔ ۵ روپے

(3)
کتاب : جدلیاتی مادیت
مترجم ۔ مرزا اشفاق بیگ
مصنف مارکس، اینگلس، لینن
صفحات ۔ ۴۸
قیمت ۔ ۵ روپے
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸

(4)
کتاب ، تاریخی مادیت
مصنف ۔ مارکس، اینگلس، لینن
مترجم ۔ تقی حیدر
صفحات ۔ ۵۸
قیمت ۔ ۶ روپے
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸

(5)
کتاب منتخب تصانیف
مصنف ۔ لینن
صفحات ۔ ۴۸۸
قیمت ۔ ۵-۴
سائز ۱۸×۲۲/۸

(6)
کتاب کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو
مصنف ۔ مارکس، اینگلس
صفحات ۔ ۷۷
قیمت ۔ ۵۰ پیسے
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸

(7)
کتاب اقتدار میں عوام الناس کی شرکت
مصنف ۔ لینن
صفحات ۔ ۳۱۸
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸
قیمت ۔ ۳ روپے ۲۵ پیسے

(8) کیمونزم میں بائیں بازو کی طفلانہ بیماری
(9) آخری خطوط اور مضامین

بچوں کیلئے رنگین تصویروں سے مزین
کم قیمت پر عُمدہ کتابیں

(1)
تصویروں میں چٹ پٹی کہانیاں
مترجم ۔ ط ۔ انصاری
صفحات ۔ ۴۸
قیمت ۔ ۲ روپے
سائز ۔

(2)
دوست
مترجم ۔ شگفتلا
صفحات ۲۸
قیمت ۔ ۵-۴
سائز ۔ جہازی

(3)
آفتابی ہوا
مترجم ۔ حبیب الرحمان
صفحات ۔ ۵۰
قیمت ۔ ۳ روپے

(4)
ایک دو تین
مترجم ۔ شگفتلا
صفحات ۔ ۱۶
قیمت ۔ ۱-۲۵
سائز ۔ جہازی

(5)
چڑیوں کی کہانیاں
مترجم ۔ امیر اللہ خاں
صفحات ۔ ۱۰۸
سائز ۔ جہازی

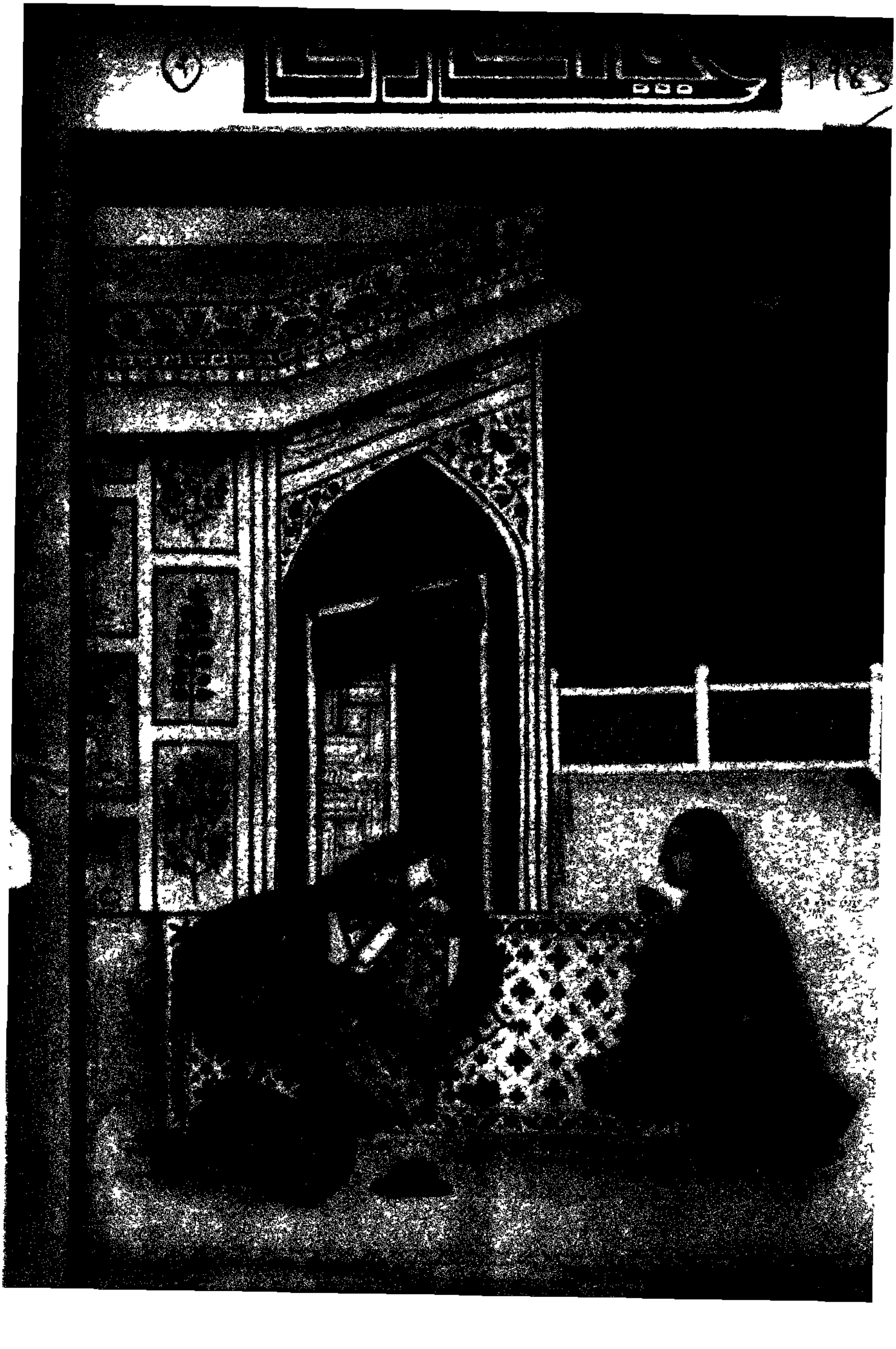
(6)
کُتّا اور شیر
مصنف ۔ لیو تالستائی
مترجم ۔ ظ ۔ انصاری
صفحات ۔ ۲۵
قیمت ۔ ۷ پیسے
سائز ۔ جہازی

کتابیں جن کا مطالعہ ضروری ہے

(1)
کتاب : مختصر تاریخ عالم (۲ جلدیں)
مصنف ۔ پروفیسر ے مان فریڈ
ترجمہ ۔ امیر اللہ خاں
صفحات ۔ ۱۳۳۰
قیمت ۔ ۲۵ روپے
سائز ۔ ۱۸×۲۲/۸

(2)
کتاب معاشرے کی سائنس
مترجم ۔ حبیب الرحمان
صفحات ۵۷۵

عصری آگہی پبلی کیشنز ۔ ۱۴۱۰/۳ رام نگر ۔ شاہدرہ ۔ دہلی ۔۳۲



چنگاری

ایڈیٹر:

جمیلہ احمد

[illegible] ترتیب

بشیر احمد

انیس احمد خاں

شمارہ نمبر ——— ۱۶

قیمت

[illegible] ——— سالانہ ۲۵ روپے

پتہ

۳۰۱۰/۳۴۲ رام نگر شاہدرہ دہلی ۱۱۰۰۳۲

جمیلہ احمد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی [illegible] سے چھپوا کر ۳۰۱۰/۳۴۲ رام نگر شاہدرہ دہلی سے شائع کیا۔

آپ بیدی نمبر نکال رہے ہیں۔ براہ کرم مجھے لکھیں کہ وہ نمبر مجھے میرے سالانہ خریدار ہونے کے باعث مل جائے گا یا اس کے لئے الگ روپے ارسال کروں۔

پریتم سنگھ۔ پنجاب

یہ کہانی آپ ہی کے شہر سے بھیج سیا ہوں یعنی مظفر پور سے۔

خیر ایک عصری آگہی کے افسانوں کا معیار تھا ایک چنگاری کے افسانوں کا ہے آخر اس کے افسانے کمزور کیوں ہیں۔

مشرف علی ذوقی۔ بہار

چنگاری بے حد پسند آیا۔ طبیعت سنبھلنے کے بعد بنگلور جا کر دوست احباب میں خریداری کے لئے کوشش کروں گا۔

فضا کوثری۔ کرناٹک

آپ نے اطلاع دی تھی کہ آپ میری کہانی وشوامتر اگلے شمارے میں شائع کر رہے ہیں کیا وہ شمارہ شائع ہو چکا ہے۔

وریندر پٹواری۔ جموں

چنگاری اچھا پرچہ ہے۔ بہت جلد ترقی کی منزلوں سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں تھوڑی سی توجہ کتابت کی طرف ہونا چاہیے۔

سیدہ شان معراج

'چنگاری' کا شمارہ نمبر ۹ آپ نے مجھے بھجوا کر ممنون کرم کیا ہے پیشتر اس کے مجھے وہ پرچہ بھی مل گیا تھا۔ جس میں میرا مضمون 'کیفی اعظمی سے ایک ملاقات'

[illegible] آپ کی تحریر [illegible] اولین تصنیف علم الاقتصاد [illegible] بھی ہے اور محققانہ بھی۔ حیرت ہے کہ ماہرِ اقبالیات نے ابھی تک اس قیمتی تصنیف کو منظرِ عام پر لانے کی کوئی سعی نہیں کی۔ "نیلام گھر" کا مطالعہ بھی بصیرت افروز ہے۔ ڈاکٹر اجمل اجملی کا مضمون جوش اور فراق بھی قابلِ تعریف ہے۔ دیگر مضامین بھی معیاری ہیں۔

انتخاب کلام کے عنوان سے "نقشِ خانقاہ" والے صفحہ پر جو آٹھ قطعات درج ہیں وہ جملہ قطعات رباعی کے وزن پر ہیں اس لیے ان کا عنوان قطعات کی بجائے رباعیات دینا زیادہ موزوں تھا۔ صفحہ نمبر ۲۵۰ پر جناب فضا کرتپوری کی غزل کے مقطع کے پہلے مصرع کے شروع میں 'ہم' زائد لکھا گیا ہے۔ اس کی ضرورت نہ تھی۔

احسان دانش کی تحریر 'میری شاعری کی عورت' ایک جرأت مندانہ مضمون ہے تاہم وہ اپنی تحریر میں یہ کیا کہہ گیے۔

"ایک لادین طاقت نے ہمارے ہی ملک میں ہمارے مسلم بھائیوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا ہوا ہے۔ ہم سب شاعروں کو اس کے خلاف شعر کہنے چاہئیں۔ نہ کہ ہم عورتوں پہ اپنا قیمتی وقت ضائع کریں۔"

یہ الفاظ ایک [illegible] شاعر کی زبان سے کہاں زیب دیتے ہیں۔ [illegible] احسان

سفال ہند کے مینا و جام

سید ضیاء اللہ

ڈاکٹر اقبال بڑے سیانے تھے۔ انھوں نے کہا ہے ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

آج ہم دیکھتے ہیں تو یہ بات پرانی لگتی ہے۔ اور آج کے حالات سے میل نہیں کھاتی۔ پتہ نہیں ان کے زمانے میں جنتا اور نیتا کیسے ہوا کرتے تھے۔ آیا سیاسی اہمیت اور عوام میں ہر دل عزیزی کا کوئی تعلق توند کی پیمائش اور لیڈر کے وزن سے تھا یا نہیں۔ ویسے جن بڑے لیڈروں کو انھوں نے دیکھا ہوگا اور ہم نے بھی دیکھا ہے بڑے نحیف و لاغر ہوا کرتے تھے۔ گاندھی جی کو لے لیجئے۔ جناح صاحب کو لے لیجئے۔ لگتا تھا جیسے یہ بہت ہی نازک آبگینے ہیں جنھیں نوادرات کی طرح روئی کے گالوں میں بڑی احتیاط سے رکھنا چاہئے۔ ایک مدراس کے سر سلیمان ہوا کرتے تھے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹ جائیں لیکن سُنا ہے کہ بہت موٹے تازے تھے اور ایک تقریب میں کرسی صدارت سے جب اُٹھنے لگے تو کرسی بھی ان کے ساتھ اُٹھ آئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تولنے کی بات ہوئی تو سر سلیمان اور پیلو مودی کی کئی بھاری بھرکم لیڈروں کے جھتوں پر بھی بھاری رہیں گے۔ اس زمانے میں غالباً اسی لئے نیکوکار اور گناہ گار بندوں کو صرف گن لیا کرتے تھے۔ تاکہ جمہوریت کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ اور حکومت کے کاروبار چل سکیں۔

یہ تو ایک مسلّمہ امر ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے زمانے میں ہمارے برِصغیر میں جمہوریت نہیں تھی۔ انھوں نے جو کچھ بھی دیکھا ہوگا ولایت میں دیکھا ہوگا۔ اور ولایتی میم کی طرح انھیں بی بی جمہوریت بھی شاید اچھی نہیں لگی۔ اور اسی لئے انھوں نے اپنے فرزند دلبند کو نصیحت فرمائی کہ ؎

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

یہ فرزند دلبند چونکہ پاکستان میں رہ گئے اس لئے بے چاروں کو سفالِ ہند نصیب نہیں ہوئی۔ اور وہ مینا و جام بھی پیدا نہ کر سکے۔ ان کی دیکھا دیکھی پاکستان والوں نے اپنے سب سے بھاری بھرکم وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر کے رفتہ رفتہ مارشل لا اپنے ملک میں لگا لیا کہ شاہین بچے کہاں بندوں کو گننے اور تولنے کے جھنجھٹ میں پڑیں۔ کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے پانچ چھ سال کا ایک جمہوری دورہ آجاتا ہے تو اسے فوراً ہٹا کر مارشل لا لگا لیتے ہیں۔ اور سکھ چین سے زندگی گزارتے ہیں۔

لیکن اِدھر بھارت کے شب و روز ہی نرالے ہیں۔ ہمیں روزِ اوّل ہی سے پہلا مونٹ بیٹن کی طرح بی بی جمہوریت بڑی اچھی لگتی آئی ہیں۔ اس تجربہ کار فرنگی میم کو ہم اپنے ملک میں لے آئے اور اسے اپنے اوپر مسلّط کر لیا۔ لیکن احتیاط یہ کی کہ حضرت اقبال کی نصیحت کو من و عن ہم نے قبول کر لیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ سفالِ ہند کا صندل بنایا اور اس میم صاحبہ کے جسم پر مَل کر اسے گنگا جل سے نہلایا۔ پھر سفالِ ہند کے جام کمہار سے حاصل کئے اس میں گنگا جل بھر کر اس کو پلایا اور اس کا راشٹریہ کرن کر لیا۔ اس کے فرنگی کپڑوں کی جگہ اسے ساڑی بلاؤز یا شلوار شرٹ پہنایا اور گلے میں دوپٹہ بھی ڈال دیا کہ سو فیصد ہندستانی نظر آئے۔

اس سارے انتظام میں ہمیں کل ۳۵ سال لگ گئے اور اب یہ بھارت کی رانی بنی ہوئی ہے۔ اور ملک کے چپے چپے میں اس کا راج ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی ہم بھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ایمرجنسی لگا لیتے ہیں۔ اور توبہ کرنے کی نوبت آتی ہے تو اعلان کر دیتے ہیں کہ ہزار سال تک پھر ایمرجنسی نہیں لگ سکتی۔

ہر پانچ سال میں رانی جی کا دربار لگتا ہے۔ ملک کا ہر عاقل و بالغ اس وقت جشن مناتا ہے۔

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

احسان دانش کو صحیح صورتِ حال کا علم ہوتا تو شاید ایسی بات نہ کہتے۔ افغان میں روسی فوجیں کسی سے جنگ آزما نہیں وہاں وہ اس لئے ہیں کہ اگر کوئی بیرونی طاقت حملہ آور ہو تو اس کا جواب دیا جائے۔ حملہ کا اندیشہ اس لئے ہے کہ جہاں کہیں ترقی پسند طاقتیں آگے بڑھتی ہیں سامراجی اور ان کے ایجنٹ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو افغان کے شاعر اور ادیب اس کی ضرور مخالفت کرتے اس کے برعکس افغانی ادبا انقلاب کے قصیدے کہہ رہے ہیں۔ ایک نظم کا ترجمہ حاضر ہے۔

سمن سرحدی

●●●

کے کے کھلر کی کتاب اردو کا آخری نقاد اردو کے تاثراتی تنقید میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے اس سے پہلے تاثراتی تنقید میں طنز و مزاح کا رنگ نہیں آیا تھا اردو کا آخری نقاد اپنی کمی کوتاہیوں کے باوجود قابل مطالعہ کتاب ہے۔

فاروق احمد صدیقی

●●●

آخری نقاد کے چند ایک مضامین تو بڑے سنجیدہ ہیں مثلاً اکتوبر انقلاب کا اردو ادب پر اثر مگر زیادہ تر مضامین غیر سنجیدہ ہیں مگر بین السطور اس کی ایسی باتوں کو بڑی جرات سے کہہ دیا گیا ہے۔ دوسرے ادیب جنھیں لکھنے میں تامل کرتے ہیں یا جو شاید انھوں نے سمجھا ہی نہیں۔

کلدیپ سنگھ

●●●

دورِ حاضر میں اتنا حسین و جمیل اور معلومات سے پُر مجلّہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔ قدرت آپ میں محسوس رہا ہوں کہ نمبر ۴ تک آپ پیش کر سکی ہیں جب کہ ... یار" الیشور، دھرم اور آدمی" کی پہلی قسط سے درست معلوم ہو رہا ہے۔ دوسری قسط دیکھ بھی پاؤں گا نہیں۔ انفرادی ملکیت کے مذہبی سماج اور سرمایہ دارانہ نظام میں ایسا مقالہ منصور کے ان الحق سے کم نہیں سمجھا جاتا ہے۔

کیسے وہ اس جہاں کی وسعت کو دیکھتا
وہ آئینہ جو اپنے ہی گھر میں بند تھا

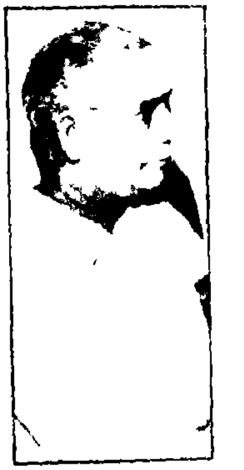
موجودہ عہد میں شاعری کا کیا کردار ہے؟
(صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے)

اس ضمن میں معروف ادیب

جنابِ سیّد سبطِ حسن کا انٹرویو

ملاقات: مشتاق احمد کیفی

★ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کو قوم کی آنکھوں سے تشبیہہ دی ہے
★ نئی شاعری کا چولا بدل گیا ہے
★ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا



س: کیا شاعری اور زندگی لاز[illegible] [illegible]دم ہیں۔؟
ج: زندگی سے آپ کی اگر مُرا[illegible] [illegible]سانی زندگی ہے۔ تب تو اس موضوع پر گفتگو ہو سکتی ہے ورنہ زندگی کے لئے تو فقط ہوا پانی اور خوراک ضروری ہے۔ آخر پودوں اور جانوروں میں بھی تو زندگی ہے لیکن یہ شاعری نہیں کرتے۔ انسان بھی ابتدا میں دوسرے حیوانوں سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ بلکہ علمائے سائنس نے تو دورِ حاضر کی بہت سی پسماندہ قوموں کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ گویائی کی قوت اور بامعنی آوازوں کا نظام جس کو ہم زبان کہتے ہیں۔ انسان نے بہت بعد میں وضع کیا ہے۔ اپنے تخلیقی عمل کا سب سے پہلے شعوری اظہار اس نے ان آلات و اوزار میں کیا جن سے وہ جنگلی جانوروں کا شکار کیا کرتا تھا اور اس تخلیقی عمل اور آلات و اوزار کے استعمال کے دوران اس نے ان بامعنی آوازوں کے ذریعے ابلاغ کے رشتے قائم کئے۔ یہ بھی اب تحقیق شدہ امر ہے کہ ابتدائی انسان آج کل کی طرح نثر میں گفتگو نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے کلام میں وہ خصوصیات پائی جاتی تھیں جن کو ہم شاعری سے منسوب کرتے ہیں یعنی غنائیت آہنگ اور جذبات کی شدت۔ چنانچہ آج بھی پسماندہ قوموں کی بول چال کی زبانوں میں یہ خصوصیتیں موجود ہیں اور اسی بنا پر کہتے ہیں کہ انسان نے شعر کہنا نثر سے پہلے شروع کیا۔ یہ بات میں تحریری شاعری کے حوالے سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اس شاعری کے حوالے سے جس کو آپ لوگ "شاعری" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی وہ شاعری جو فنِ تحریر کی ایجاد سے پہلے رائج تھی۔ پُرانی عربی زبان یا سنسکرت زبان میں جو غنائیت آہنگ اور ترنّم ہے۔ وہ بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ابتدائی انسانوں کی زبان شعری زبان تھی۔

س: کیا اس سائنسی عہد یا دور میں شاعری کی کوئی گنجائش ہے۔؟
ج: مجھے نہیں معلوم کہ سائنسی عہد سے آپ کی کیا مراد ہے۔؟ شائد آپ صنعتی عہد کو سائنسی عہد کہتے ہیں۔ کیونکہ سائنسی عہد تو اس وقت شروع ہو گیا جب انسان اپنے تجربوں اور مشاہدوں سے اشیاء کی حقیقت و ماہیت میں تغیر و تبدّل کرنے پر قادر ہو گیا۔ مثلاً جب کمہار نے کچی مٹی کے برتنوں کو آگ میں پکا دیا تو ایک نئی شے کی تخلیق ہوئی البتہ وہ اس وقت تک اپنے تجربوں سے کوئی کلیئہ اور اصول نہیں بنا سکا تھا مثلاً کمہار یہ نہیں بتا سکا تھا کہ وہ کون سا کیمیاوی عمل ہے جس کے باعث کچی مٹی کے برتنوں میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی۔

اور جب انسان نے قوانینِ قدرت سے آگاہی حاصل کر لی اور ان کے حرکت و تغیر کا راز معلوم کر لیا تو سائنسی دور کی ابتدا ہو گئی۔ اس اعتبار سے شاعری کی عمر بہت پُرانی ہے اور سائنسی عہد میں جیسا کہ شاعری کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ شاعری کی پوری پوری گنجائش ہے۔ آخر تلسی داس کبیر، امیر خسرو، دانتے، درجل، شیکسپیر ایسے ہی دور میں پیدا ہوئے۔

البتہ ہمارے نقادوں میں ایک حلقہ ایسا بھی ہے جس کا خیال ہے کہ موجودہ صنعتی دور میں شاعری کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میرا خیال ہے کہ یہ قنوطی اندازِ فکر درست نہیں ہے۔ شاعری میں دیگر صنعتوں کے مانند ایک تخلیقی عمل ہے اور تخلیقی عمل کو جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ اس کے کئی دھارے ہیں۔ ہر چند کہ سب کا مخرج انسانی ذہن ہے۔ اور ان دھاروں کو ہم فکر، تخیّل اور جذبے کی شکل میں بیان کر سکتے ہیں۔ یہ تینوں دھارے کبھی الگ الگ رہتے ہیں اور کبھی آپس میں مل کر۔ پھر الگ ہو جاتے ہیں مگر یہ دھارے زندگی کی زمین ہی پر بہتے ہیں۔ اگر کسی ذہن پر فکر کا غلبہ ہو۔ تو اس کے تخلیقی عمل کا رُخ عموماً سائنسی علوم یا اقتصادیات، فلسفہ یا تاریخ کی طرف منتقل ہو گا۔ اگر تخیّل اور جذبے کی فراوانی ہے تو عموماً اس کا رجحان فنونِ لطیفہ کی جانب ہو گا۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ فکر کا غلبہ ہو تو انسان تخیّل اور جذبے سے یکسر خالی ہو جاتا ہے اور تخیّل اور جذبات کی فراوانی ہو تو فکر غائب ہو جاتی ہے۔ ایسی کی [illegible] تخیّل اور جذبے

خالص [illegible] کی

اور شاعری تخیل اور جذبے کی ہے جس میں فکر نہیں پائی جاتی ہے۔ غالب اور اقبال کے یہاں فکر کا غلبہ ہے اور تخیل کا بھی۔ البتہ جذبات کی وہ شدت نہیں جو آپ کو میر یا سودا کے یہاں ملے گی۔ ہمارے دور کے (جس کو آپ سائنسی دور کہتے ہیں) ن۔م راشد بہت ممتاز شاعر ہیں۔ اور انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ایسی ملکوں میں گزارا جہاں سائنس اور صنعت کو عروج حاصل ہے۔ مگر ان کی شاعری میں ہمیں فکر کے علاوہ تخیل کی پوری پوری چھاپ ملتی ہے۔ دوسری طرف فیض صاحب ہیں ان کے کلام میں ہمیں فکر، تخیل اور جذبے کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

جاگیردارانہ دور کی قدروں اور روایتوں سے زبان کے مزاج اس کی علامتوں، اس کی لغت، اس کی تشبیہ و استعاروں کے اس قدر خوگر ہیں کہ ہمارے لئے یہ سوچنا مشکل ہو جاتا ہے کہ شاعری کے لئے سوچنے، محسوس کرنے اور اس کے اظہار کا کوئی اور ڈھانچہ بھی بن سکتا ہے۔ حالانکہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نئی شاعری کا چولا بدل گیا ہے۔ نئے شاعروں کا نظامِ فکر و احساس وہ نہیں ہے جو میر یا غالب بلکہ علامہ اقبال کا تھا، اور زندگی کی حقیقتوں کو ایک نئے انداز سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے بھی کہ خود زندگی کی حقیقتیں بڑی تیزی سے بدل رہی ہیں۔ وہ ان حقیقتوں کو نئے انداز سے محسوس کرتے ہیں ان کے یہ تصویری پیکر اور علامتی استعارے اب روایتی بہت کم ہوتے ہیں۔

علامتی شاعری اور رمزی شاعری یا تجریدی شاعری یا آزاد شاعری یا نثری نظم کے جو تجربے ان دنوں ہو رہے ہیں وہ دراصل سائنسی یا صنعتی دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی اچھی کوششیں ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ تمام تجربے کامیاب ہوئے ہیں لیکن ان میں پختگی آہستہ آہستہ آئے گی۔

شاعری کی گنجائش اگر غلامی اور جاگیردارانہ عہد میں تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ اس صنعتی عہد میں نیا انسان نئے نظامِ فکر و احساس کے ساتھ نئی شاعری تخلیق نہ کر سکے۔ انسانی معاشرے میں [illegible] پیار اور محبت کے رشتے قائم ہیں انسان کے جذبات و احساسات [illegible] روپ میں اپنے جلوے [illegible]

آخر آپ کے کہنے کے مطابق سائنسی عہد مغرب میں تو ڈیڑھ دو سو سال سے موجود ہے تو کیا وہاں شاعری مفقود ہو گئی۔؟ یا لوگوں کے جذبات و احساسات مشینوں تلے کچل گئے۔؟ شاعری تو وہاں اب بھی ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ معاشرہ ایسے دور سے گذرے جس میں لوگوں کا رجحان شاعری کی بجائے دوسرے اصنافِ سخن کی طرف زیادہ مائل ہو۔ مثلاً مصوری، فلم سازی یا رقص، موسیقی کیونکہ تخلیقی عمل کے لئے اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے کہ اس کا دھارا کس سمت بہے۔ اگر کوئی شے اس کے بہاؤ کا رُخ متعین کرتی ہے تو وہ معاشرے کی ضرورتیں ہیں۔ سماجی حالات ہیں۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب بھی معاشرتی نظام میں کوئی بھی انقلابی تبدیلی آتی ہے تو دوسرے انسانوں کی طرح فن کاروں کو بھی اس نظام سے ہم آہنگ ہونے میں اپنے مزاج اور مذاق کا رشتہ اس سے جوڑنے میں اس کی ترجمانی کرنے میں وقت لگتا ہے۔ شاعری بہرحال ایک فن ہے اور جس طرح اچھے بُرے گویّے اور مصوّر ہوتے ہیں اسی طرح اچھے بُرے شاعر بھی ہوتے ہیں جو اپنے افکار جذبات و احساسات کو فن کے پیکر میں ڈھالنے پر قادر ہوتے ہیں، یا نہیں ہوتے ان کو اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار میں کامیابی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں خارجی حقیقتوں جسے اقبال جوشے کی حقیقت کہتے ہیں۔

جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

اب اگر شے کی حقیقتیں بدلتی جائیں اور شاعر ان حقیقتوں کا ادراک نہ کر سکے یا ان کو محسوس نہ کر سکے تو اس میں ان حقیقتوں کا قصور نہیں ہے بلکہ شاعر کی اپنی کہائیگی کو دخل ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ سائنسی دور میں شاعری کی گنجائش نہیں ہے تو درحقیقت یہ اعتراف ہے اپنی قوتِ فکر و احساس کی شکستگی کا۔ مثلاً اسرار الحق مجاز کی نظم "رات اور ریل" یاد آ رہی ہے۔ ریل خالص غیر شاعرانہ موضوع ہے یعنی روایتی سوچ کے مطابق مجاز نے اس موضوع کو جس طرح سے شعر کا پیکر عطا کیا ہے وہ اس کی قادر الکلامی کی دلیل ہے، ریل

کی حرکت اور رفتار اس کے لئے تو زندگی کے ارتقا کی علامت بن گئی ہے۔ میں نے علامہ اقبال کا نام اس وجہ سے نہیں دیا کہ ان کی شاعری میں تو بڑی کثرت سے یہ وصف ملتا ہے۔ سرمایہ اور محنت، ارتقاء، زمانہ، ساقی نامہ بے شمار نظمیں ہیں۔ سائنسی دور کا جو ردِ عمل شاعر کے فکر و احساس پر ہوتا ہے۔ اس کی ترجمانی کرتی ہیں۔ لہٰذا ناچ وہیں آکر ٹوٹتی ہے کہ

ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا

وہی مثال ہے لہٰذا اگر ناچنا آئے تو آنگن ٹیڑھا ہو یا سیدھا۔ تو زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ اگر ہمارا نوجوان شاعر سائنسی دور کی حقیقتوں کو محسوس کرنے اور جذب کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا۔ کہ ساری خرابی صنعتی نظام کی ہے۔ صنعتی نظام میں جذبات اور احساسات کے اندر جو طوفان برپا ہے جو فکریں ہو رہی ہیں اور انسانی معاشرہ بے جان اور اضطراب کے جس دور سے گزر رہا ہے اگر شاعر اس تصادم اس شکست و ریخت اور نئی پرانی زندگی میں جو حیات و موت کی کشمکش جاری ہے اس کے ادراک و احساس سے محروم ہے تو یہ ہمارا بہت بڑا المیہ ہے۔ کیا معاشرت کی تطہیر یا انسانی اخلاقیات کی اصلاح کی ذمہ داری شاعری کے کندھوں پر ڈالی جا سکتی ہے۔

شاعر معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی دہری ذمہ داری ہوتی ہے۔ ایک معاشرے کے ساتھ انصاف اور دوسرے اپنی ذات کے ساتھ۔ اقبال نے اسی بنا پر شاعر کو قوم کی آنکھوں سے مشابہت دی ہے مگر شاعر قوم کا مصلح نہیں ہوتا۔ شاعری کو اگر آپ تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو انسانی معاشرے نے شاعری سے مختلف کام لئے ہیں۔ اخلاق کی اصلاح کا کام مثلاً مولانا روم کی مثنوی، شیخ سعدی کی بوستاں۔ مہابھارت کی مشہور نظم بھگوت گیتا ہے۔ جس کا شمار دنیا کی بڑی نظموں میں ہوتا ہے۔ شاعری سے جوش اور ولولہ پیدا کرنے کا کام بھی لیا گیا ہے۔ مثلاً شعرائے عرب کے رجزیہ قصیدے اور رزمیہ نظمیں ہیں۔ ہومر اور ایلیڈ کی نظمیں ہیں۔ وطنیت کے جذبے کو ابھارا گیا ہے جیسے فردوسی کا شاہنامہ تو شاعری سے معاشرے کی اصلاح اور لوگوں کے ضمیر بیدار کرنے کا کام لیا گیا ہے اس کی مثالی حالی کی

میر تقی اور اقبال کی پوری شاعری ہے۔ اسی طرح شاعری سے زندگی کو لطف اندوز کرنے اور عشق و محبت کے گیت گانے کا کام لیا گیا ہے۔ شاعری سے معاشرہ کی تنقید اور ترجمانی کا کام لیا گیا ہے۔ مثلاً ہمارے شہر آشوب ہیں یا اکبر الہ آبادی کی نظمیں اور حافظ کی غزلیں ہیں کہ ان میں نشاط و لذتیت بھی ہے اور اپنے عہد میں معاشرے میں جو مختلف [illegible] اور ریاکاریاں تھیں۔ ان پر برملا تنقید ہے محتسب، فقیہ، پیر، ملا غرض معاشرے میں قوت قاہرہ کے جو مختلف نمائندے تھے ان پر شاعری نے بھرپور ضرب لگائی ہے۔ لہٰذا شاعری کے لئے ایسا ضابطہ اور قاعدہ وضع نہیں ہوا ہے اور نہ ہی شاعر کے کسی منصب کا تعین ہوا ہے کہ اسے یہ کرنا چاہئے وہ نہیں کرنا چاہئے، شاعر کا ردِ عمل معاشرے سے اس کی وابستگی سے گہرا تعلق رکھتا ہے جس قدر گہری وابستگی ہوگی یعنی اس وابستگی میں جس قدر خلوص اور جس قدر سچائی ہوگی جس قدر درد ہوگا اتنا ہی اس کا کلام اگر اس میں قوتِ اظہار کی صلاحیت ہے تو اتنا ہی پُراثر ہوگا۔ شاعری کی ابتدا پر اگر آپ غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ شاعری موسیقی اور رقص یہ تینوں فن انسان کی پیداواری یا تخلیقی سرگرمیوں سے وابستہ رہے ہیں۔ مثلاً ابتدائی زمانہ کے گیت تین طرح کے ہیں۔ یا تو وہ کسی جفاکشی کی مہم یا کسی ساحرانہ رسموں سے ان کا تعلق ہوتا تھا جیسے بھجن یا منتر وغیرہ۔ یا تخلیقی کام کے دوران وہ گیتوں کے ذریعے اپنے بیگاری یا جفاکشی کے کاموں کو ہلکا بناتے تھے۔ مثلاً کشتی کھینے والے گیت، جیسے مشہور گیت SONG OF THE BOAT [illegible] یا فصلیں کاٹتے وقت گیت گائے جاتے ہیں۔ تیسرا طریقہ یا مقصد جیسے فتح اور خوشی۔ سقراط سے پہلے تمام فلسفہ شعری زبان میں استعمال ہوتا تھا۔ فرمودات شعری زبان میں ملتے ہیں LUCRETIUS جس نے نیچر آف دی یونیورس جیسے سینکڑوں اشعار پر مشتمل نظم لکھی ہے۔ اس میں جفاکشی اور اخلاق دونوں ہیں۔

س: کیا آپ اس سے اتفاق نہیں کرتے کہ آج شاعری اور ادب اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں اور کہیں بھی بڑا ادب پیدا نہیں ہو رہا؟

ج: یہ بات صرف شاعری تک محدود نہیں۔ تمام فنونِ لطیفہ کی تقریباً ایسی ہی صورت ہے۔ تاہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ افادیت کو کیسے [illegible] کیا جاتا ہے۔ شاعری اور فن کا اثر کا نتیجہ تو بے شک نہیں جس کو [illegible] پرکھا جا سکتا ہے کہ اس نے [illegible] ہیں؟

آپ جب اس کی افادیت کی بات کریں گے تو آپ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سوچتا ہوں کہ میں کس کے لئے لکھ رہا ہوں۔ مراد یہ تھی کہ میری تحریر سے کس قسم کے احساسات، جذبات یا افکار چلا پائیں گے اور وہ کون سی قوتیں یا عناصر ہیں جن پر اس سے ضرب لگے گی۔

اب حبیب جالب کی شاعری آپ لے لیں عام لوگ اور بالخصوص مظلوم اور محکوم طبقے اس کی شاعری کو بے حد پسند کرتے ہیں، ان کی نظر میں وہ نہایت مفید شاعر ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کو حبیب جالب کی شاعری بالکل ناپسند ہے۔ جوش ملیح آبادی کو لے لیں آپ پاکستان اور ہندوستان کے لاکھوں انسانوں کو ان کی شاعری بہت پسند تھی۔ ان کی شاعری دلوں کو تڑپاتی اور گرماتی تھی اور روح میں ولولہ اور جوش پیدا کرتی تھی۔ مگر ایسے بھی لوگ ہیں جو شاعری ہی کی وجہ سے جوش کے جانی دشمن تھے۔

میں اس کو نہیں مانتا کہ شاعری اپنی افادیت کھو بیٹھی ہے۔ اگر انسان نے محسوس کرنا اور اپنے احساسات اور تخیلات اور خیالات کو فن کے پیرائے میں پیش کرنے کی صلاحیت کھو دی ہے تو یقیناً آج کی شاعری کی افادیت بھی ختم ہو جاتی ہے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ نہ انسان مشین ہے نہ آئندہ کبھی وہ مشین ہوگا۔ وہ غموں اور خوشیوں کو، اچھائیوں، برائیوں کو محسوس کرے گا۔ اس کی قلبی واردات کا ردِ عمل اس کی زبان سے ہوگا۔ وہ گیت گائے گا، شعر کہے گا۔ افسانے لکھے گا۔ جب تک اس میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ وہ حرکت کرتا ہے۔ اس کے تجربے اور مشاہدے اس کے جذبات اور احساسات کے تاروں کو چھیڑتے ہیں۔ اس وقت تک وہ شعر بھی کہے گا، افسانے بھی لکھے گا اور ڈرامے بھی تخلیق کرے گا

آپ کے سوال کے پس منظر میں مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک اندیشہ ہے کہ کہیں سائنس یا فنی زندگی، تخلیق شعر کے لئے مضر ہے۔ اور ہمارے ملک میں تو ابھی صنعتی زندگی اتنی حاوی ہوئی ہے اور نہ سائنس کا چرچا اس قدر زیادہ ہے کہ سائنس کے مسئلے پر غور کیا جائے لیکن اگر ہو بھی تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ ممکن ہے کہ انسان کی تخلیقی قوتوں کا رخ بدل جائے اور ایک فن کے بجائے دوسرے فن کو فروغ ملے۔ مثلاً سائنسی دور کا سب سے بڑا فنی اظہار فلم ہے۔ اب فلم صنعت بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بہت بڑا فن بھی ہے۔ جس میں دوسرے اصناف کی قوتیں یکجا ہوتے ہیں۔

افسانہ، رقص، موسیقی، اداکاری، مصوری کی طرح سے فنی ہے۔ یہ سب اپنی جگہ ترقی کرتی ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ معاشرتی ارتقا کے کسی خاص دور میں کوئی مخصوص فن ترقی کرے۔ مثلاً آپ پاکستان کو لے لیں۔ یہاں موسیقی اور رقص نے بالکل ترقی نہیں کی۔ اس کے اسباب واضح ہیں۔ لیکن بعض اصناف میں فن کاروں کو تخلیقِ فن کی آزادی ملی۔ مثلاً مصوری، شاعری، افسانہ نگاری ایک چیز یہ بھی ہوتی ہے کہ قوموں کے کچھ مزاج ہوتے ہیں، اب آپ دیکھیں انگلستان میں جو معاشرے کا مزاج ہے وہاں شاعری نے سب جگہ ترقی کی جرمنی میں فلسفہ اور موسیقی نے بہت ترقی کی۔ روس میں ناول اور افسانے نے بہت ترقی کی۔ اسی طرح اردو یا دوسری مشرقی زبانوں میں شاعری نے بہت ترقی کی۔

اب یہ سوال کہ پوری دنیا میں کہیں بڑا ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بڑا غیر تاریخی سوال ہے یہاں پھر وہی مسئلہ نکلے گا کہ بڑے ادب کی تعریف کیا ہے؟ اور وہ کون سا زمانہ ہے جس میں بڑا ادب پیدا ہوا ہے تنقید کی کتابیں پڑھیں تو علم ہوتا ہے کہ ہر دور میں نقادوں کو یہی رہا کہ پہلے دور میں بڑا ادب پیدا ہوتا تھا اب بڑا ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے۔

حالانکہ یہ فیصلہ زمانہ کرتا ہے کہ کون سا ادب بڑا ہے اور کون سا ادب بڑا نہیں ہے۔ مثلاً غالب کو اپنے عہد میں وہ مرتبہ نصیب نہیں ہوا جو انہیں آج حاصل ہے۔ مرزا داغ دہلوی کو اپنے زمانہ میں بڑی شہرت اور بڑی مقبولیت نصیب ہوئی لیکن آج وہ اس مقام پر فائز نہیں ہیں۔ لہٰذا قوموں میں مزاج کا اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے اور ایسے دور آتے ہیں کہ جب کسی فن کار کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت ملتی ہے۔ آج کل کی دنیا میں جو ادب پیدا ہو رہا ہے اس میں ایسا ادب بھی ہے جو شاید بہت عرصے تک پسند کیا جائے اور پڑھا جائے اور ایسا ادب بھی ہے جس کی زندگی بہت مختصر سی ہے۔ زندگی کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے اور ہمارا مذاق اور ہمارا مزاج بڑی سرعت سے بدل رہا ہے، ظاہر ہے اس کا اثر فنی تخلیقات پر بھی پڑتا ہوگا۔ تخلیقی عمل خاص طور پر فنی تخلیقات کے لئے تفکر، حس، سکون اور فرصت کا متقاضی ہے۔ وہ بھی بہت کم میسر ہے۔ میرا قوی خیال ہے کہ اس سے فن کا معیار ضرور متاثر ہوتا ہوگا لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں ہے جس سے ہم ناپ کر بتا سکیں کہ وہ ادب جو آج کل تخلیق ہو رہا ہے کہ کتنا [illegible] اس کا شمار [illegible]

گئے دنوں میں تو شام و سحر نہ تھے ایسے
کہ ہم اداس بہت تھے مگر نہ تھے ایسے

یہاں بھی پھول سے چہرے دکھائی دیتے تھے
یہ اب جو ہیں بھی دیوار و در نہ تھے ایسے

رفاقتوں سے مرا ہوں مسافتوں سے نہیں
سفر وہی ہے مگر ہمسفر نہ تھے ایسے

دل تباہ تجھے اور کیا تسلی دیں
ترے نصیب ترے چارہ گر نہ تھے ایسے

فراز خوش ہو کہ احسان اس ستمگر کے
جو تجھ پہ ہیں وہ کسی اور پر نہ تھے ایسے







میری شاعری کی عورت

احمد فراز

مجھ پر "رومینٹک پوئیٹ" کی جو چھاپ ہے وہ ٹھیک نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر کچھ نے مجھے پسند کیا، یا محبت برتی میری شاعری سے، تو اس لیے نہیں کہ وہ رومینٹک پوئٹری تھی یا عشق کا چسکا بہت تھا اس میں۔ بلکہ اس کی وجہ وہ پرابلمز تھے ملک کے یا انسانوں کے، جن کو میں نے چھوا۔ مثال کے طور پر میری نظم "بانو کے نام" بظاہر ایک عورت پر کہی گئی نظم ہے لیکن دراصل وہ انسانی ٹریجڈی کو اپنے اندر سموئے ہوئے۔ دوسری نظم جو مجھے پسند بھی ہے "تختی"، تو وہ فریزر کے رقاص لوگوں کے متعلق ہے جو ان کی سوسائٹی کا ایک انسٹی ٹیوشن بن چکا ہے۔

تو جہاں تک محبت اور پیار کے جذبوں کا تعلق ہے، وہ فطری چیز ہے لیکن ایک بات یقینی ہے کہ میں نے اوڑھا نہیں عشق کو باقی میری شاعری میں محبوب کا تصور کیا ہے، وہ آئیڈیل وغیرہ کوئی نہیں کہ اس کی ناک ایسی، کان ایسا وہ تو ایک شخص آتا ہے طوفان کی طرح، یا آہستگی سے خوشبو کی طرح اور چھا جاتا ہے وہ فیشن شو میں رنگینیاں بکھیرتی لڑکی کی طرح نہیں۔ کم از کم میرے لیے نہیں۔ ویسے بھی ہجر و وصال کے جتنے جذبے ہوتے ہیں وہ انسان کے اندر ہوتے ہیں۔ آبجیکٹ کا CONTENT اتنا نہیں ہوتا۔

میں نے سوچا نہیں ہے کہ میری شاعری میں عورت کا تصور کیسا ہے، اور کیسے آیا۔ کوئی فارمولا تو نہیں۔ ایک شخص کی قربت اور اس کی جدائی کیا اثر ڈالتی ہے انسان پر، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ،

شعر کسی کے ہجر میں کہنا، حرفِ وصال کسی سے
ہم بھی کہاں ہیں دھیان کسی کا اور سوال کسی سے

مراد میری یہ نہیں کہ میں عورت کی یا محبوب کی شخصیت کو NEGATE کر رہا ہوں، تصویر تو بنتی ہے، لیکن میں خود کچھ کہنے کی بجائے پڑھنے والوں پر اس کے خدوخال کو چھوڑ دوں گا۔

میں نے کبھی اپنے کسی مجموعہ کو، بلکہ زندگی کو، پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ جو چھپ گئی، سو چھپ گئی۔ اس لیے بھی میں ادوار آل تصور کی بات نہیں کر سکتا۔ اگر بتانا ضروری ہو جائے تو مجھے اپنی کتابیں دوبارہ دیکھنی پڑیں گی اور یہ میں اس لیے نہیں کر سکوں گا کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے میں خوف آتا ہے مجھے۔

"تنہا تنہا" میری شاعری کا پہلا مجموعہ تھا نوعمر سا۔ اس میں جو عورت نظر آتی ہے وہ ویسی ہی تھی جیسی عام طور پر ہوتی ہے۔ لڑکی سی۔ ان دنوں میں لگتا ہے کہ دو کیریکٹرز کا میں مرکب تھا۔ ہیتھ کلف "ووڈرنگ ہائیٹس" کا، اور ہینچرڈ۔ ہارڈی کا۔ میں بہت وائلڈ تھا اپنے ATTACHMENS اور PASSIONS میں، میرے محبت کے جذبوں میں بھی۔ وائلڈنیس تھی، جو یقیناً میری شاعری میں خاص طور پر میری سیمی پولیٹیکل پوئٹری میں REFLECT کی ہو گی۔ وہ لڑکی جو میرے ان جذبوں کا اظہار بنتی بڑی یوتھ فل تھی۔ اداس آنکھوں والی

اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

اس سٹیٹ آف مائینڈ میں میری غزلیں "شاعر"، "کھنڈر"، "تم زمانہ آشنا، تم سے زمانہ آشنا"، میرا خیال ہے کہ خوبصورت تھیں۔ یہ زمانہ افلاطونی عشق کا تھا۔

اس کے بعد "دردِ آشوب" میں گوشت پوست زیادہ متحرک نظر آتا ہے ہیومن گروتھ نظر آجاتی ہے۔ اس میں زندگی کے حاصے DELICATE EXPERIENCES ہیں۔ مختلف اینگلز، سے میں زندگی کو دیکھنے کے۔

مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ میری شاعری میں عورت نظر ہی نہ آتی ہو میں ہی میں نظر آتا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے زیادہ تر عورت سے ملنے اور بچھڑنے کے تجربات کا جو پیدا ہونے والے ری ایکشن کے حوالے سے اظہار کیا ہے۔ مثلاً قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے یا پھر:

ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بار ہا دیکھا نہ جائے

اور اگر کسی میں صحیح عورت نظر آ سکتی ہے تو وہ میرے منظوم ڈراموں کی کتاب "میرے خواب ریزہ ریزہ" ہے۔ صحیح عورت سے میری مراد میری آئیڈیل عورت نہیں۔ بات آئیڈیل کی نہیں، شخصیت کی ٹائپ کی ہوتی ہے اور اگر میرا کوئی آئیڈیل ہے تو اس کا ملنا نہ ملنا میری کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ "نایافت" اسی میں میں نے فارسی کی ایک لائن دی ہے

گفت آں کہ یافت می نوشد آنم
آرزوست!

تو "صحیح" عورت میری آئیڈیل نہ سہی، اتنی دھڑکے دار ضرور ہے کہ جو کسے آپ کا آپا بھلا دے۔ اور میرے ساتھ یہی ہوا، جو اکثر ہوتا ہے کیونکہ جہاں زندگی کی دوسری چیزیں چلتی ہیں، وہاں محبتیں بھی اپنا سفر جاری رکھتی ہیں۔

ضروری نہیں ہوتا کہ جس قسم کی عورت آپ زندگی میں چاہتے ہیں ویسی ہی ملتی رہی ہو لیکن سلسلہ تو جاری رہتا ہے، تا آنکہ وہ شخص مل جاتا ہے۔ یا نہیں ملتا...

بہر حال NO REGRETS ___

کہ میری پوئیٹری میں عورت کی کانٹری بیوشن بیحد ہے خواہ عورت میرے تصوّر کے جھروکوں میں رہی ہو یا حقیقی زندگی میں۔ خاص طور پر "دردِ آشوب" کے بعد تو خاص طور پر عورت اُٹھ کر سامنے آتی ہے۔ خصوصی طور پر ایک لڑکی کا تو اس میں بہت کانٹری بیوشن ہے۔

یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ میں نے اپنی شاعری میں کبھی اس بات کی تعریف نہیں کی کہ یہ عورت ہے، یہ مرد ہے، عورت مظلوم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سوسائٹی مرد کی ہے ظاہر ہے کہ جب آپ مسکولین جینڈر اوپر سے شروع کرتے ہیں تو ابتدا ہی عورت کا نام فریب ہے، جو شیطان کی تابع ایک کمزور سی ہستی ہے جس نے اپنی کمزوری کے باوجود آدم کو جنت سے نکلوادیا تھا۔

تو اصل بات تو سوسائٹی کی یا پچوایشن کی ہے۔ عورت اور مرد دونوں اس کے قیدی ہیں یہ تو نہیں کہ زلزلہ آئے تو اینٹ صرف عورت پر گرے، مرد پر نہیں۔ یا یہ کہ صرف عورت پر گرے بنیادی مسئلہ عورت کا نہیں، انسان کا ہے۔ اور اس حوالے سے میں عورت کی سچوایشن کی بات نہیں کرتا۔ اس سے اپنے ذاتی تعلق کی بات کرتا ہوں۔ کیونکہ میری نظموں میں جہاں بھی انسانی حوالہ آیا ہے اس میں عورت اور مرد دونوں کی بات ہوتی ہے۔

کئی لوگوں نے الزام دیا ہے کہ میں نے اپنی شاعری کے لیے عورت کو استعمال کیا ہے میرا خیال ہے کہ میں نے عورت کو نہیں، انسانی میٹریل کو استعمال کیا ہے۔

انسان کا تجربہ اسی وقت تجربہ کہا جا سکتا ہے جب وہ دوسرے انسان سے ملتا ہے۔ میں بھی عورت سے جب بھی ملا ہوں تو اسے میں نے ایک شخص یا پرسن کے طور پر دیکھا، اور قبول کیا ہے۔ تو اس ملاپ کے تجربے میں کئی تہیں میری زندگی کی، کھلتی گئیں جو اگر نہ کھلتیں تو میں ایک عظیم انسانی تجربے سے محروم رہتا، تشنہ رہتا۔

عورت کو نہ جانوں، عشق نہ کروں۔ ایک عورت کو دیکھ کر نقاب ڈال لوں چہرے پر تو یہ بڑی کیمیکل بات ہے اس کے بجائے اگر عورت سے تعلق کی بنیاد پر، عورت کی قیمت پر نہیں بلکہ اس سے اپنے تعلق کی بنیاد پر۔ اگر میں کوئی ایسی چیز تخلیق کر سکوں جو دوسروں کو اچھی لگی یا مسرت بخشے تو میرے خیال میں یہ ایسی کوئی بری بات نہیں

نہ ہی میں نے اپنی جسمانی ضرورتوں کے لیے کسی کی بے چارگی، بے بسی یا مجبوری کا فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک شوہر اپنی بیوی کو ریپ کر سکتا ہے کہ لو مبکنگ اور ریپ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یوں بھی عورت بنیادی طور پر ایک ہی ہے میری زندگی میں۔ جس کی تلاش میں ہوں ممکن ہے بچپن میں کوئی FLAW رہ گیا ہو یا کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ میری شاعری میں جتنی محرومیاں جھلکتی ہیں، ہو سکتا ہے ان سے پتہ چل سکتا ہو کہ میں کون سی عورت چاہتا ہوں لیکن میں خود بتا نہیں سکتا۔ ایک دفعہ میری نظم سن کر کسی نے پوچھا۔

"فراز صاحب! اس نظم کا مطلب کیا ہے۔؟"

مجھے ہنسی آئی کہ بھئی اگر میں نثر میں وہی بات کہہ سکتا ہوتا تو نظم کہتا ہی کیوں؟

مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی شاعری میں جھلکنے والی عورت کو ڈسکرائب نہیں کر سکتا کہیں، کسی میں مجھے اس کی جھلکی دکھائی دیتی ہے تو میں خود بخود اس کی طرف کھنچتا ہوں وابستگی محسوس کرتا ہوں۔ یہ وابستگی محسوس کرتا ہوں۔ یہ وابستگی بہت معصوم ہے، جو پرمانینٹ بھی ہو سکتی ہے اور عارضی بھی۔ ہر وابستگی یا ہر تعلق کو میں پرمانینٹ تو نہیں بنا سکتا۔ جیسے ایک آرٹسٹ درختوں کی تصویریں بنانے کے بعد انہیں اکھاڑ اکھاڑ کر اپنے صحن میں تو نہیں لگا سکتا۔ کہ اگر وہ یہ کرے تو پھر اسے پینٹ کرنے کی بجائے شجر کاری کی مہم شروع کر دینا چاہیے

میں نے کبھی کسی عورت کو بے وفا نہیں کہا بلکہ اس کی ذمہ داری سچائی سے اپنے سر لی ہے۔

خود اپنے آپ کو پرکھا تو یہ ندامت ہے کہ اب اسے کبھی الزام بے وفائی نہ دوں یا....

پھر پرانی خواہشوں نے خواب دکھایا
کوئی سر کسی کے دوش پر تھا، اور یاد آیا کوئی

میری شاعری میں عورت ایک ہی ہے خواہ اس کی آنکھیں، پیکر مختلف ہوں.. اور میں نے....

جس کو بھی چاہا اسے شدت سے چاہا ہے فراز
سلسلہ ٹوٹا نہیں درد کی زنجیر کا

بعض عورتیں ایسی بھی ملیں جو ہر بات کو انٹیلکٹ کے زور پر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ عشق بھی! ان کا متاثر کرنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ دوسرے انسان کو انسان کی سطح پر محسوس کرنے کی بجائے یہ گنواتی رہتی ہیں کہ عشق کے بارے میں ڈی ایچ لارنس نے یہ کہا، سعدی یہ فرماتے تھے، غالب کا خیال تھا کہ، حافظ، سارتر، تو وہ تھیوریز بتاتی رہتی ہیں، ان میں رومانس نہیں ہوتا۔ تو ایسی عورتوں سے مل کر لگتا ہے کہ ہم کسی انسان سے نہیں ملے، کتابوں کی دکان میں۔ اخبار ... گئے ملے

کاؤبوائے اور ریڈ انڈین

قرۃ العین حیدر

ایئر کرافٹ جنوبی کیلی فورنیا سے گزر کر — جنوب مغربی صحراؤں اور سُرخ پہاڑوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ ریاست ایری زونا کے شہر ٹوسون کا ایئرپورٹ چک لالہ (راولپنڈی) ایئرپورٹ معلوم ہوا۔ امریکن طیران گاہوں کے عام معیار سے بہت مختصر۔ ہوائی جہاز ایرجیٹی کی سقفت گیلری سے جا لگنے کے بجائے میدان میں رُک گیا۔ سامنے کے دروازے میں ریڈ انڈین لینڈ اؤننگ کھڑی نظر آئیں۔ ان کے پیچھے مشہور انڈولوجسٹ ڈاکٹر مائیکل جہار۔ ریاست ایری زونا اپنے صحرائی حُسن کی وجہ سے PAINTED DESERT کہلاتی ہے اور ہسپانوی میکسیکن تہذیب کی چھاپ۔ دیو ہیکل کیکٹس۔ چاروں طرف خشک پہاڑ۔ شدید گرمی۔ یونیورسٹی کے یونیفارم سے مہمان خانے میں پیار دیوار والا آسمان۔ عرب اندلسی مکانوں کی صدیوں پار سے آئی ہوئی بازگشت۔

کمرے والے کمرے کی دیوار پر سوویت یونین کا پوسٹر یوٹیلکو ایک پوری نظم انگریزی میں لکھی گیا تھا۔ باورچی خانے کے دریچے کے باہر زرد پھولوں والا گھنا درخت۔

تمام یونیورسٹی پولیس کی خاتون افسر نے آکر خیریت دریافت کی۔

صحرا کی راتوں میں وحشت اور تاریکی اور سناٹے کا احساس زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے صحرا کی ان تنہا راتوں میں گڈریوں نے جو کاؤبوائے کہلاتے۔ اپنی چراگاہوں اور چوپایوں کا بچوں کے سامنے یا الاؤ کے گرد سیاہ آسمان کے نیچے بیٹھ کر گٹار بجاتے ہوئے وہ نغمے تخلیق کئے۔

اس اندھیری رات میں کیمپس سے بہت فاصلے پر ہندی پروفیسر ڈاکٹر چنڈولا کے روشن مکان میں اگر ستاروں کو آگے لے جایا جائے تو یوں کہئے کہ میدانِ علم کے نئے کاؤبوائے جمع تھے۔ اور کاؤ گرلز ڈاکٹر لزلی فلیمنگ (آگ کا دریا) پر جن کا طویل مقالہ جرنل آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز میں شائع ہوا تھا۔ ایک پاکستانی پنجابی نوجوان ڈاکٹر ریاض جو یونیورسٹی کے عربی فارسی مخطوطات کے نگراں تھے اور بہت سے امریکن پروفیسر اور پروفیسریاں جن کو ڈاکٹر اور مسز چنڈولا نے راقم الحروف سے ملوانے کے لئے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مع ایولین ور رابرٹ وردی جو سلسلۂ ریسرچ لکھنؤ میں رہ چکے تھے۔

ذرا ایک منٹ ٹھہرے۔ مغرب کے ذخائر علوم و فنون ترقیہ۔ پوری انڈیا آفس لائبریری سارا برٹش میوزیم ہندوستان کے تمام کتب خانے۔ ہندوستان کے ایک سائیکل رکشا کھینچنے والے کے لئے بے معنی ہیں۔ کیونکہ اس کی کچھ مدد نہیں کرتے۔

کسی بھی مغربی کیمپس پر جا کر کبھی کسی کو یہ خیال آتا ہے کہ مثلاً علی گڑھ یا لکھنؤ، الہ آباد یا ڈھاکہ یا اور کوئی یونیورسٹی ٹاؤن ہندوستان اور بنگلہ دیش میں ایسی جگہیں ہیں چند ہزار نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں اور ان کے ہم قوم مفلوک الحال مدقوق نوجوان یا بوڑھے چلچلاتی دھوپ اور لُو یا کڑکڑاتے جاڑے یا برسات میں سائیکل رکشا کھینچے ان طلباء اور ان کے اُستادوں کو یونیورسٹی لاتے لے جاتے ہیں۔

اب میں ڈاکٹر چنڈولا کے ڈرائنگ روم آپ کو واپس لئے چلتی ہوں۔ موصوف بہت ہی خلیق اور بھلے آدمی تھے۔ گڑھوال کے باشندے یہاں اٹھارہ سال سے پڑھا رہے تھے۔ ان کی بیوی بھی بہت ملنسار اور نیک خاتون تھیں۔ ہندی گیتوں میں دیوی کے تصور پر ڈاکٹریٹ کر چکی تھیں شکتی کے تصور کی تجسیم مختلف ہے۔ بُنیادی تصور یکساں ہے اور علامہ اقبال کو تو دیواستبداد اور جمہوریت کی نیلم پری دونوں ایک سے معلوم ہوئے تھے۔

دوسرے روز اسکول آف جرنلزم کے صدر شعبہ ڈاکٹر فورڈ کی ایک کلاس میں راقم الحروف نے انڈین جرنلزم پر لیکچر دیتے ہوئے ڈاک ہرکاروں کے ذریعے سرکاری خبر رسانی درباری وقائع نویسی کا تذکرہ کیا جو سامعین کے لئے بالکل غیر متوقع چیز تھی، کیونکہ وہ ہندوستان کے اٹھارویں صدی سے شروع ہونے والے چھاپے خانوں اور اخباروں کے متعلق بھی کچھ نہ جانتے تھے۔

ایک دلچسپ بات ہے۔ عہد وسطیٰ میں عرب کاغذ سازی نے اسلامی تہذیب دُنیا میں پھیلائی تھی۔ پندرھویں صدی یوروپ میں چھاپے کی ایجاد کے کچھ عرصے بعد مارٹن لوتھر کی اصلاح دین کی کامیاب اشاعت ہو سکی۔ آج کے ایران میں آیت اللہ خمینی کی تقریروں کے کیسٹ شاہ کی شہنشاہیت کے آخری دنوں میں ایران میں گھر گھر بجائے گئے تھے۔ اس روز دور دراز طہران میں امریکن یرغمالیوں کی قید کا ستاسیواں دن تھا۔ لیکچر کے دوران ایک لڑکا ٹیلی پرنٹر کا کاغذی فیتہ لالا کر میز پر رکھتا جا رہا تھا۔ اس پر چھپی ہر ایران کے متعلق ہر خبر کے آخر میں دو الفاظ درج تھے۔ SLUG KHOMEINI اس پیمانے کے قومی غم و غصے اور تنفر کا اظہار پچھلی جنگِ عظیم میں جرمنوں کے خلاف ہی کیا گیا تھا۔

تیسرے روز پروفیسر فورڈ نے بے حد تعجب سے بار بار پوچھا۔ "آج انھوں نے چند امریکن عورتوں کو رہا کر دیا ہے۔ عورتوں کو کیوں رہا کیا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟

"بہت ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ شیعہ اسلام میں فاطمہؓ بنت رسولؐ خاص اہمیت کی مالک ہیں علاوہ ازیں شیعہ مذہبی قانونِ وراثت وغیرہ بھی عورتوں کے لئے زیادہ منصفانہ ہے۔ ممکن ہے اسی لئے یہ ایرانی علماء عورتوں کو کچھ اہمیت دیتے ہوں" چند ماہ بعد ماہر تعلیم خانم پارسا کو گولی سے اُڑا دیا گیا۔)

اس صبح (ADVANCED JOURARLISM) کی کلاس میں میں نے ایرانی تاریخ میں شاہ اور مُلّا کی آویزش، شیعہ اسلام میں امامت کے تصور وغیرہ

کے متعلق ایسے طلبہ کو سمجھانے کی کوشش کی جو مسئلہ خلافت و امامت تو بہت آگے کی بات ہے۔ اسلام ہی سے قطعاً ناواقف تھے۔

ڈاکٹر فورڈ نے بعد میں اس کلاس سے کہا کہ اس لیکچر پر مبنی ایک اسٹوری ایران پر تیار کرے۔ (ہر امریکن یونیورسٹی کے مدرسہ صحافت کی طرح اس اسکول آف جرنلزم کا بھی اپنا ضخیم روزانہ اخبار تھا جسے طلبا شائع کرتے تھے)

تیسرے پہر کو میں ڈاکٹر مائیکل مہار کے ساتھ لفٹ میں اوپر جا رہی تھی ایک فلور پر ایک صاحب پھرتی سے داخل ہوئے "میں ابھی واشنگٹن سے واپس آرہا ہوں۔ بھاگا بھاگا گیا تھا کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ والوں کو ایران کے متعلق کچھ سمجھاؤں۔ میں نے بچشم خود تہران میں شاہ کے مخالف مظاہرین کو گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھا ہے اور ان کو مارنے والے فوجی امریکن اسلحہ جات سے لیس ہوتے تھے۔ امریکہ سے اس شدید تنفر کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مگر یہاں کسی نے میری نہیں سنی" اتنا کہہ کر وہ صاحب ایک فلور پر اسی سرعت کے ساتھ لفٹ سے نکل گئے۔

یہ صدر شعبہ فارسی تھے۔ ڈاکٹر مہار نے بتایا شام کو شعبہ علوم شرقیہ میں "وزٹنگ انڈین موزیم جرنلسٹ" کے لئے پارٹی کے دوران ایک مصری پروفیسر سے میں نے دریافت کیا "مصر میں قبطیوں کو بہت تنگ کیا جاتا ہے؟"

"نہیں۔ مگر وہ امریکہ آکر یہی کہتے ہیں تاکہ اپنے ہم مذہب عیسائی امریکنوں کی ہمدردی حاصل کریں، اور گرین کارڈ مل جائے۔" انھوں نے جواب دیا۔

یہ بات بھی مجھے سو فیصدی صحیح نہیں معلوم ہوئی کیونکہ اسلامی انتہا پسند مصر میں آج کل قبطی گرجا پر حملے کر رہے ہیں۔

دکھی دنیا کے ان ہولناک مسائل سے بے نیاز کیمپس پر ایک جگہ گھاس پر بیٹھے ہرے کرشنا والے امریکن چھوکرے کیرتن گا رہے تھے۔ ایک لڑکا ہارمونیم بجا رہا تھا۔ ایک ڈھول ان کے لٹریچر کی کتابوں کا انبار سامنے رکھا تھا اور ایک . . .

"JESUS FREA" نوجوان ایک سر منڈے امریکن سنیاسی کی ناک کے نیچے بائیبل ٹھونس کر مناظرے میں مصروف تھا۔ بہ حد دلچسپ بحث جاری تھی۔ ہندو یوگیوں کے پھیلائے ہوئے CULTS کے ردِ عمل کے طور پر نوجوانوں میں چند عیسائی فرقے بھی نمودار ہو چکے ہیں" JESUS FREAKS" ان میں سے ایک گروہ ہے۔

ایک ساڑی پوش خاتون کو قریب سے گزرتا دیکھ کر سنیاسیوں نے بڑی خوشی سے "ہرے کرشنا!" کا نعرہ لگایا۔ میں نے نہایت متانت سے اس کا جواب دیا۔ "شوا شوا۔" اور آگے بڑھ گئی۔ ان کے چہرے اتر گئے اور وہ پھر اپنے ڈھول مجیرے اور مناظرے کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"ہرے کرشنا والے امریکنوں کے سامنے شوا کا نام لو تو بہت خفا ہوتے ہیں" میں نے لنڈا سے کہا۔ "مکمل مفاہمت دیوتاؤں میں بھی نہیں ہے۔ تو قبطیوں اور مسلمانوں اور ایرانیوں اور امریکنوں اور عربوں اور اسرائیلیوں میں کیسے ہوگی"

ایر پورٹ سے شہر جاتے ہوئے میں نے پروفیسر مہار سے کہا تھا کہ ورمونٹ کے گھنے رنگ برنگے جنگلوں اور کوہساروں کے بعد یہ صحرا کس قدر مختلف ہے" کیا تم کو مشرقی ساحل کی کسی یونیورسٹی نے مدعو کیا تھا؟"

"پن سلوینیا اور شمال میں منی سوٹا نے وہاں گئی تھیں۔ وقت نہیں ملا۔ ورمونٹ میرے کزن نے بلایا تھا۔ ایر ٹکٹ بھیج دیا تھا"

پروفیسر مائیکل مہار نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ دوسرے روز اپنی کھچا کھچ بھری عمرانیات کی کلاس میں تعارف کراتے ہوئے فرمایا جب یہ بمبئی سے آیووا سٹی پہنچیں تو آیووا سٹی سے برلنگٹن تک جانے کا ایر ٹکٹ پہلے سے ان کا منتظر تھا جو ان کے کزن نے کینیڈا سے بھیجا تھا۔ یگانگت اس معاشرے کی خصوصیت ہے جس میں EXTENDED خاندان کو اصل خاندان میں شامل سمجھا جاتا ہے"

"آپ کو یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوئی لیکن ہم لوگوں کو آپ کا معاشرہ عجیب لگتا ہے جس میں "اصل" خاندان اور XTENED خاندان میں فرق کیا جاتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

مغرب میں رشتہ داروں کی اجنبیت ہم لوگوں کو ہمیشہ متحیر کرتی ہے۔ میں مغربی جرمنی میں ایک ایسے میاں بیوی کو جانتی ہوں۔ میاں ہندوستانی ہیں۔ بیوی جرمن۔ جب کبھی وہ لڑکی اپنی ماں کو اپنے بچے کے خبر گھنے کی "بے بی سٹنگ" کے لئے بلاتی تھی بطور معاوضہ ماں کے لئے قیمتی تحائف رکھ جاتی۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں نانیاں دادیاں خود تحائف لا کر بے تکان بے بی سٹنگ کرتی ہیں"

"اسی لئے جوائنٹ فیملی کے متعلق کچھ بتاؤ" ڈاکٹر مہار بولے۔

"جوائنٹ فیملی اور کاسٹ سسٹم وغیرہ پر آپ خود کافی لیکچر دے چکے ہوں گے لیکن میرے خیال میں آپ کے شاگرد یہ بالکل نہیں جانتے کہ یہ زندگی کس قسم کے مکانوں میں گزاری جاتی تھی" میں نے بلیک بورڈ پر ایک روایتی انڈو مسلم "مردانہ" اور "زنانہ" مکان کا نقشہ بنایا۔ دالان در دالان کے اندر ایک قطار میں بچھے پلنگ۔ صحنچیاں۔ آنگن۔ مشرق کی گھریلو اجتماعی زندگی میں فرد کی PRIVACY کا تصور تقریباً مفقود تھا۔

مرزا ابو طالب اصفہانی جو کلکتے سے ۱۷۹۹ء میں ڈبلن گئے تھے۔ انھوں نے ایک آئرش مکان میں قیام کر کے حیرت کے ساتھ قلم بند کیا تھا کہ ان لوگوں کے ہاں ہر کام کے لئے الگ الگ کمرے ہیں۔ کھانے کا کمرہ الگ۔ سونے کا الگ۔ بیٹھک الگ۔ اور باورچی خانے میں قیمہ اور پیاز کاٹنے کے لئے آہنی مشینیں اور برصغیر ہند و پاکستان و بنگلہ دیش کے روایتی مکانات آج بھی اسی طرح کے ہیں جیسے مرزا ابو طالب کے زمانے میں تھے اور جو تعجب مرزا ابو طالب کو آج سے پونے دو سو سال قبل انفرادیت پرست مغرب میں پہنچ کر ہوا تھا۔ اسی تعجب سے امریکن طلبہ مشرقی طرزِ زندگی کے متعلق سن رہے تھے۔ مغرب میں آپ کسی دوست یا عزیز کے ہاں کبھی بغیر اطلاع یا بن بلائے بلا اجازت اچانک نہیں پہنچ سکتے لیکن اسی وجہ سے آپ کو ماہرینِ نفسیات اور سوامیوں سے اپوائنٹمنٹ لینے پڑتے ہیں۔ میں نے کہا۔

شام کو یونیورسٹی کے ایک آڈیٹوریم میں "اسلام میں عورتوں کا درجہ" پر لیکچر دیتے ہوئے محسوس ہوا کہ سامعین کے لئے اسلام بھی ایک دوسرے کرّے کی چیز تھی۔ یہ موضوع اس وقت

ڈاکٹر فورڈ اور ڈاکٹر فلیمنگ نے اسلامی ممالک میں انتہا پسند تجدیدیت کی لہر کے مدِنظر تجویز تجویز کیا تھا۔ "رجم" "چار شادیاں" "پردہ" مسلم عورتوں کی کمتر حیثیت" وغیرہ تمام تصورات اور سعودی عرب اور ایران کے موجودہ حالات کے مناظر میں ایک پیچیدہ اور نازک موضوع تھا۔ اسلام میں حقوقِ نسواں اور اسلامی تاریخ میں عورتوں کے اہم رول وغیرہ کے متعلق بے حد وضاحتی اور تقریباً تبلیغی لیکچر کے بعد حسبِ معمول آیت اللہ خمینی کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ۔

آپ کہتی ہیں کہ قرآن نے عورتوں کو یہ سب حقوق دیئے ہیں۔ مگر ملا خمینی نے تو پردے کا حکم صادر کیا ہے۔ آپ کہتی ہیں اس روایتی پردے کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ ورنہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ کھلے منہ حج کرنے کا حکم نہ ہوتا۔ اور آپ نے کہا اسلام میں چرچ اور CLERGY نہیں ہے۔ تو پھر یہ ایران کے آیت اللہ لوگ کون ہیں؟ امریکنوں نے سوال کیا۔

سامعین میں ایک نہایت جوشیلے پاکستانی مسلمان بھی موجود تھے۔ انھوں نے میری تقریر پر نہایت کٹر ملاؤں کے اعتراضات کئے۔

جس وقت میں نے کہا۔ مغربی عورتوں کو شوہر سے علیحدہ اپنی جائداد رکھنے کا حق اب جاکر ملا ہے۔ قرآن نے یہ حق چودہ سو برس قبل دیا تھا وغیرہ۔ اس وقت سامعین میں ایک امریکن لڑکی۔ "بالکل ٹھیک" "بالکل درست" کہے جارہی تھی۔ شہر ٹوسون کے روزنامے کے دو رپورٹر اگلی صف میں بیٹھے تھے۔ ان کے سوالات سے نپٹنے کے بعد ہال سے باہر نکلنے لگی تو وہ لڑکی سامنے آئی اور مصافحے کے بعد گرم جوشی سے بولی۔ "السلام علیکم"! میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ قطعی شرعی لباس۔ پیشانی تک اسکارف، لمبی آستین۔ ٹخنوں تک لمبا فراک۔ "مرحبا۔ اسلام آج کل اتنا بدنام ہورہا ہے۔ آپ نے اس کی صحیح صورت پیش کی۔" اس شرعی امریکن لڑکی نے کہا۔

"کیا تم اسلامی تاریخ کی طالب علم ہو؟"

میں نے دریافت کیا۔

"الحمد للّٰہ کہ میں خود مسلمان ہوں۔ وہابی مسلمان۔

لیجئے صاحب۔ اب تک امریکن "ہندو" صافے اور کرپانیں باندھے امریکن "سکھ" لڑکے لڑکیاں نظر آتے تھے۔ اب تبلیغی جماعت کی کوشش سے اکا دکا طالب علم مسلمان بھی ہونے لگے اور وہ بھی FUNDRMENTALIST کیونکہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنے والوں کو اس مذہب کا انتہا پسند روپ ہی بھاتا ہے۔ ہرے کرشنا والے مغربی لوگ ہندوستان کے پیدائشی سناتن دھرم ہندوؤں سے کہیں زیادہ کٹر ہیں۔ یہ CONVERT کی نفسیات ہے۔

دوسری صبح شہر کے اخبارات میں مفصل دو کالم کی رپورٹیں چھپیں "موزلم جرنلسٹ کا کہنا ہے۔" ایران کی صورتِ حال کے متعلق موزلم جرنلسٹ کا خیال ہے کہ یہ ایران کی انتقامی کارروائی ہے کیونکہ سی آئی اے کی مدد سے شاہ وغیرہ وغیرہ اور یہ کہ امریکہ کو چاہئے کہ ایران کا یہ مطالبہ کہ شاہ کے جرائم کی تحقیقات کی جائے منظور کرلے۔" وغیرہ وغیرہ لفظ "انڈین" وہاں عموماً ان قبائل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جن کو ہم ریڈ انڈین کہتے ہیں۔

ریاست ارِی زونا نواہو اور ہوپی انڈین قبائل کا وطن ہے۔ کیلی فورنیا کے ساتھ اری زونا اور ٹیکسس بھی میکزیکو نے جنگ میں ہار کر امریکہ کو دے دیئے تھے لیکن "سرخ ہندوستانی" قبائل سے گورے مہاجروں کی لڑائیاں جاری ہیں۔ اپاش قبیلے سے بیس سالہ جنگ ۱۸۸۶ء میں چلتی گئی تھی۔ گایوں کے ریوڑ پالنے والے RANCHEKS نے گلوں کی حفاظت کے لئے کاؤبوائے نوکر رکھے۔ امریکن رومانس کی تخلیق، سرخ ہندوستانیوں اور ڈاکوؤں کے علاوہ خود بھیڑ پالنے والوں، گائے پالنے والوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں۔ مزید کاؤبوائے رومانس۔

"کوئی ریڈ انڈین بستی دکھلائیے۔" میں نے پروفیسر جبار سے کہا۔

اس روز بڑی دھوپ پڑ رہی تھی۔

ایولین درودی اور لنڈا کے ساتھ ڈاکٹر مبارک کا کار میں صحرا کی طرف جاتے ہوئے راستے میں سرخ مرچیں نظر آئیں جو دھوپ میں سکھائی جاتی ہیں۔ مرچیں میکزیکن کھانوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔

میکزیکو کی سرحد پار کرکے ہر سال تقریباً تیس لاکھ میکزیکن اور باقی جنوبی امریکہ کے لوگ غیر قانونی طور پر بیاہ ٹیکس امریکہ میں داخل ہوتے ہیں۔ پریشان حال تیسری دنیا امریکہ کی سرحد سے شروع ہوجاتی ہے۔ لیکن خود امریکہ کے اندر ہر شخص مصروفِ عیش نہیں ہے۔

چند خستہ حال مکان دکھائی دیئے جن کے سامنے کھٹارہ کاریں کھڑی تھیں۔ چند ریڈ انڈین ان کھٹارہ کاروں کے انجنوں پر جھکے کاہلی سے تمباکو پی رہے تھے۔ کچھ بہت ہندوستانی سا منظر تھا۔ سستی اور بے پرواہی۔

"چراغ تلے اندھیرے" میں نے اظہار خیال کیا۔

"یہ لوگ کاہل ہیں اور اپنا طرزِ زندگی بدلنا نہیں چاہتے۔ ڈاکٹر مبارک نے کہا۔" لیکن اب پچھلے دس سال سے ان کے ہاں بھی سیاسی شعور پیدا ہو چلا ہے۔"

"کمال ہے کالوں نے لڑ بھڑ کر، دکھ اٹھا کر، قربانیاں دے کر امریکن کلچر میں اپنا اہم مقام حاصل کرلیا۔ موسیقی۔ ادب، تعلیم، سیاست ہر جگہ۔ مگر ملک کے یہ باشندے اور ان کا یہ حال، ان کی اپنی یونیورسٹیاں اور اپنی موسیقی اور اپنے اخبار ہونے چاہئیں تھے۔ آخر وجہ کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ "بہت سے انڈین ملک کی سفید فام آبادی میں شامل ہوکر اپنی انفرادیت کھو چکے ہیں۔ اور ان کی اکثریت پسماندہ رہ کر اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتی ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

بستی کا انڈین کمیونٹی سنٹر سنسان پڑا تھا۔ احاطے کی دیوار پر ایک انڈین لڑکا برش چابک دستی سے ایک قبائلی رقص کا فریسکو بنانے میں مصروف تھا۔ وہ سوالات کا مختصر جواب دیتا رہا۔ وہ مسکرایا نہ خود سے کوئی بات کی۔ سنٹر سے نکل کر ہم لوگ شاہراہ کے کنارے ایک میکزیکن ریسٹورنٹ میں گئے۔ میکزیکن انڈین مخلوط النسل لوگ سرخی مائل رنگت کھٹا

نقش ۔۔ کچھ کچھ جاپانی گڑیا سے معلوم ہوتے تھے ۔ (ریڈ انڈین ۔ قبائل دراصل منگولین لوگ تھے ۔ جو ہزار سال قبل آبنائے بیرنگ عبور کرکے سائبیریا سے امریکہ پہنچے تھے ۔) سولھویں صدی عیسوی میں ہسپانوی اور پرتگالی فاتحین نے مایہ اور ازٹیک وغیرہ پوری تہذیبیں اجاڑ ڈالیں ۔ مگر جب باقی ماندہ (انڈین) رومن کیتھولک ہوگئے تو ہر جگہ اور جنوبی امریکہ اور ادھر گوا اور فلپائن میں مقامی لوگوں سے شادی بیاہ کرتے رہے ۔ انگریز اور دوسرے شمالی یورپین اور پروٹسٹنٹ فاتحین کے برعکس ان لوگوں میں نسلی تعصب نہیں تھا اور میرے خیال میں یہ ان کے اندلسی عرب ورثے کا لاشعوری اثر تھا ۔ یعنی یہ کہ جب مفتوح ذمی یا کافر نے اسلام قبول کیا تو بلا تخصیص رنگ و نسل اُمّت میں شامل کرلیا گیا ۔

سیاہ چشم میکزیکن ویٹرس نے مرچوں والا کھانا پیش کیا ۔ ایک ریڈ انڈین لڑکی اپنا قومی لباس پہنے بال میں ایک پر لگائے ریسٹوراں سے نکلی اور اپنی کار ڈرائیو کرتی روانہ ہوگئی ۔

اور آگے ریگستان کے وسط میں ایک سفید رنگ کا ہسپانوی کیتھڈرل نیلے آسمان کے مقابل میں ایستادہ تھا ۔ سامنے دلو قامت کیکٹس ۔ اندر مذہبی تصاویر اور شمعوں کے ہجوم میں ایک حنوط شدہ نوجوان راہب شیشے کے تابوت میں خوابیدہ لاش کے سیاہ لبادے پر پنوں کے ذریعے بے شمار تصاویر ٹانگ دی گئی ہیں ۔

زیادہ تر تصویریں نوجوان فوجی سپاہیوں کی تھیں ۔ جو ان کی ماؤں نے ان کی منتیں مان کر اس مقدس پادری کے کفن پر ٹانگ دی تھیں ۔

جب ہم لوگ ٹوسون واپس آرہے تھے وہ ریڈ انڈین اسی طرح اپنی کاروں کے انجنوں پر چُپ چاپ بیٹھے تماشا کرتے نظر آئے ۔

کالوں کی مانند یہ لوگ احتجاج کیوں نہیں کرتے ؟

" اب ایک کاؤبوائے اسٹور بھی دیکھتے چلو شاید وہاں کاؤبوائے بھی نظر آجائے ۔"

ڈاکٹر ہما نے شہر میں داخل ہوتے ہوئے کہا ۔

اس دُکان میں گھوڑوں کی مرصع زین چمڑے کے ملبوسات ۔ ٹوپیاں ۔ ایڑی والے مرصع جوتے ۔ مرصع پیٹیاں کٹار ۔ غرض یہ کہ پورا کاؤبوائے ساز و سامان بک رہا تھا ۔ برآمدے کے باہر گھوڑا باندھنے کی کھونٹیاں بھی موجود تھیں ۔ جب کلہ بانی کمپیوٹر اور راڈار اور IPEMOTE CONTROL سے شروع ہوگی ۔ کاؤبوائے بھی معدوم ہوجائیں گے

رات کو لنڈا کے ہاں دعوت میں ان کے ماہر موسمیات شوہر نے نہایت نفیس کھانا تیار کیا تھا ۔ مع مرچوں والی میکزیکن مسور کی دال ۔ باقی مہمان ایک ایک ڈش ساتھ لائے تھے ۔ ڈاکٹر ریاض کے بیوی بچے چند روز بعد لاہور جانے والے تھے ۔ ڈاکٹر اور مسز جنڈولا کچھ عرصہ قبل ہندوستان ہو آئے تھے ۔ وہی معاملہ یہاں ہر طرح کی آسائش تھی ۔ مگر دل وطن میں اٹکا تھا ۔

لنڈا کی اونچی چھتوں والے بنگلے میں برطانوی ہندکی چھاؤنیوں کے بنگلوں کی جھلک موجود تھی ۔ دستِ ایری زونا کے پرانے کیمپ ماحول اور گرم موسم نے یہ اسٹائل تخلیق کیا ہوگا ۔

لنڈا اردو جدیدیوں کے بارے میں مقالہ لکھنے میں مصروف تھیں ۔ " یاد رکھو اگر تمہارے بجائے تیسری دُنیا کی کوئی لڑکی ، الجیریئن یا تھائی لینڈ یا انڈونیزیا سے یا کوئی کالی امریکن ہی یہ مقالہ لکھنے ہندوستان و پاکستان آتی ۔ اردو حلقوں میں اسے اُس قدر اہمیت نہ دی جاتی لیکن تم سفید فام ہو ۔ اور امریکن ہو ہمارا COLONIALHANGOVER ابھی زائل نہیں ہوا ہے ۔" میں نے اس سے کہا ۔ ایک مرتبہ رالف رسل نے مجھ سے اظہار خیال کیا تھا کہ لوگ ان کو اس لئے زیادہ قابل ذکر سمجھتے ہیں کہ ایک انگریز اردو پڑھتا پڑھاتا ہے ۔

اور اب دنش گیگن وزنی ہیٹ پہنے تیل کے کروڑ پتیوں کے دیس ٹیکس جارہی ہوں ۔

افسانہ

بابو رفیق

صادق



بابو رفیق، دروازے میں پڑا ٹاٹ ایک طرف کو ہٹا، باہر نکلا تو جیرا پہلوان، تہمد اور بنیان پہنے، ننگے پاؤں، اپنے گھر کے سامنے کھڑا ریڑھی پر دسہری آم سجا رہا تھا۔ جیرا پہلوان نے اپنی موٹی تازی گردن موڑ کر مخصوص لاہوری لہجے میں کھنکتا ہوا اسلام کیا۔ بابو رفیق نے موٹے موٹے شیشوں والی عینک ناک کی پھنگی تک لا کر، چہرے کا سرخ و سفید چہرہ دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا، گلی سے نکل، بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گیا۔ جیرا پہلوان نے اپنے گھر کے آنگن میں جھانک کر کہا "بشیرے کی ماں! ساتھ بج گئے ہیں۔ چولہے کی پتی ذرا ادھر کھسکا دو۔"

گلی کے سب لوگ جانتے تھے کہ بابو رفیق، صبح کے ٹھیک سات بجے دفتر جاتا ہے کوئی دو برس پہلے جب وہ اس گلی میں کرائے کے مکان میں اترا تو سب سے پہلے جیرا پہلوان نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس دن سورج کی شعاعیں منڈیروں سے ڈھل کر نیچ گلی میں آپہنچیں مگر بابو رفیق گھر سے باہر نہ نکلا۔ جیرا پہلوان نے دل میں سوچا۔ خدا خیر کرے بابو جی ابھی تک دفتر نہیں گئے۔ اس نے ایک راہگیر سے وقت معلوم کیا تو بوہنی کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا۔ دوسرے لمحہ وہ دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا رہا تھا۔

"کون ہے؟" اندر سے ایک نسوانی آواز آئی

"باجی! میں ہوں جیرا پہلوان۔ باؤ جی دفتر نہیں گئے؟"

"انہیں بخار آ گیا ہے۔"

"میں باؤ جی کو دیکھنا چاہتا ہوں"

بابو رفیق کی بیوی نے دروازہ کھول کر پردہ کر لیا۔

جیرا پہلوان اور بابو رفیق کچھ دیر۔ چارپائی پر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر جیرا پہلوان نے اٹھ کر ڈب سے دس دس کے دو نوٹ نکال، بابو رفیق کے تکیے کے نیچے رکھ دیئے۔

"پہلی تاریخ کو حساب چکا دوں گا۔"

بابو رفیق نے آہستہ سے کہا

"باؤ جی! اس کی فکر نہ کریں۔ آپ بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔

اس گلی میں رہنے والے مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے تھے

مہاجا قصاب اپنی دکان میں گدی پر بیٹھتے ہی یکسر بدل جاتا پٹھو کی تازہ بوٹیوں میں سینے کے دو چار باسی ٹکڑے اس صفائی سے ملا دیتا کہ کسی کو پتا نہ چلتا۔ گاہک کی بات سنی ان سنی کر کے جی ہی جی میں خوش ہوتا کہ اس کے پاس بھی ایک ایسی طاقت ہے جسے برت کر وہ لکھے پڑھے آدمی کے سر کو نیچا دکھا سکتا ہے بابو رفیق کی بات اور تھی۔ وہ تو پاؤ بھر گوشت خریدنے کے لئے ہفتے عشرے میں مہاجے کی دکان کا رخ کرتا۔ مہاجا پاٹ دار آواز میں کہتا "آؤ باؤ جی! اٹھ چھو کرے لپک کر جا اور باؤ جی کے لئے ہاف سیٹ کڑک چائے لے آ" بابو رفیق کی بھگت ہوتے دیکھ، آدھا آدھا بکرا خریدنے والی موٹی آسامیاں ہکا

بکارہ جاتیں۔ مہاجا قصائی سوچتا۔ بابو رفیق گوشت کم کھاتا ہے۔ اسی لئے تو اس کی پسلیاں نکل آئی ہیں۔ بچارے کی بنی تلی تنخواہ کا ایک حصہ تو کپڑوں کی دھلائی پر اٹھ جاتا ہو گا۔

برکت دھوبی بابو رفیق کی سوتی قمیصوں کو کلف دے کر احتیاط سے استری کرتا پتلون کہیں سے مسک جاتی تو نظیراں دھوبن بچکے سے رفو کر دیتی۔ مسٹنڈی نظیراں تھی تو بڑی جھگڑالو، عورت مگر بابو رفیق کی عزت کرتی شاید اس لئے کہ وہ بابو رفیق سے خط لکھوا کر اپنے بیٹے کو بھیجتی تھی۔ اس کا بیٹا دوبئی میں محنت اور مزدوری کر کے دھڑا دھڑ روپے بھیج رہا تھا۔ پہلے تو نظیراں، دھلائی کے لئے آئے ہوئے رنگ برنگے کپڑے پہنتی مگر اب وہ قیمتی کپڑے کی لمبی قمیص اور تنگ پانچوں والی شلوار پہن، ٹھمک ٹھمک گلی میں پھیرے لگاتی۔ اس کی چھم چھم کرتی پازیبیں فضا میں ہل چل مچا دیتیں۔ اب تو وہ بھنا ہوا گوشت اور پراٹھے کھاتی۔ سردیوں میں پنجیری بناتی۔ دودھ میں پھینیاں ڈال، سڑپ کھاتی۔ گرمیوں میں حلوہ پوری کا ناشتہ کر کے ریڈیو پر گانا سنتے سنتے۔

کپڑوں کے گٹھر پر فقیرا افیونی کہہ کر پکارتے اس لئے کہ وہ گٹھر کے تکیے پر آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کئے سوچتا رہتا تھا۔ رحیما مالشی اور دِتا کنجڑا، رائے عامہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، فقیرا افیونی کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ رحیما مالشی نے ایک دن بابو رفیق سے کہا تھا، "باؤجی! فقیرا افیونی کو اپنا پیر بنا لو۔ پھر نوٹ سنبھالے نہ جائیں گے۔ مجھے دیکھو۔ میں الف بے نہیں جانتا لیکن مرشد کی دعا سے روز تکے کباب کھاتا ہوں۔" دتا کنجڑا بولا "میرے بادشاہ! کام وہ کرو کہ شام کو اٹھو تو کڑک نوٹ گن کر شلوار کے نیفے میں اڑس لو۔ پھر خوب کھاؤ پیو اور جان بناؤ۔"

بابو رفیق جانتا تھا کہ رحیما مالشی سرا یافتہ ہے۔ وہ سر کی مالش کرتے ہوئے جیب کی مالش بھی کر دیتا ہے۔ شام کے وقت جب وہ دھندا کرنے نکلتا تو اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر بابو رفیق حیران رہ جاتا۔ گلے میں طلائی زنجیر چھنگلیا میں سونے کی انگوٹھی۔ کلائی میں گھڑی۔ ٹیڑھی مانگ نکالے کان میں سگریٹ اٹکائے بیشہ ورانہ صندوقچی ہاتھ میں پکڑے۔

دتا کنجڑا تو پیاز کا بادشاہ تھا۔ اس کی نگاہ دوربیں، طلب و رسد کا جائزہ لیتی رہتی۔ وہ ٹھیک وقت پر پیاز کا ذخیرہ باہر لے آتا۔ وارے نیارے ہو جاتے۔ عورتیں اپنے سینے پر دوہتڑ مار کے سبزی منڈی کے آڑھتیوں کو برا بھلا کہتیں۔

بابو رفیق تو صرف ایک کام جانتا تھا۔ وقت پر دفتر جاؤ۔ قلم گھسیٹتے رہو۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ تنخواہ وصول کر کے قرض ادا کرو۔ لیکن اس مہنگائی کے زمانے میں۔ محدود آمدنی سے میاں بیوی کی بنیادی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ "باؤجی! چھوڑو یہ نوکری۔ ریڑھی لگا لو مزے میں رہو گے۔"

جیرا پہلوان نے بابو رفیق کو ریڑھی پر پھل سجانے، ڈنڈی مارنے اور گاہک سے آنکھ بچا، گلے سڑے میوے لفافے میں ڈال دینے کے گر بتائے تو بابو رفیق کو جیرا پہلوان کی باتوں سے بدبو آنے لگی۔ اس نے جیرا پہلوان کے ننگے پاؤں کی طرف دیکھا جن پر میل جما ہوا تھا۔ جیرا پہلوان سردیوں میں لنڈا بازار کا گرم کوٹ پہن کر، سینہ تانے یوں چلتا، جیسے کہہ رہا ہو، "ہٹ جاؤ راستے سے۔ دیکھتے نہیں۔ جیرا پہلوان آ رہا ہے۔" اسی کی طرح، استاد کرچھی، صبح سویرے حلوائی کی دکان سے لوٹ کر، بازو ہلاتا، گلی میں یوں داخل ہوتا جیسے آواز دے رہا ہو، "استاد کرچھی ایک سیر دہی اور آدھ درجن پیڑوں کی لسی پی کر آ رہا ہے۔" استاد کرچھی کا اصلی نام صرف شاہ عالم مارکیٹ کے بزرگ جانتے تھے۔ ایک زمانے میں وہ کرچھیاں بنا کر تھوک کے بھاؤ فروخت کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا نام استاد کرچھی پڑ گیا۔ اب وہ جیرا کی طرح ریڑھی لگاتا تھا۔

مزاج اور لہجے کے اعتبار سے کاروبار کے طریقے مختلف تھے۔ جیرا پہلوان کی ریڑھی سارے علاقہ کا چکر لگاتی۔ وہ چوراہے کے پاس، ریڑھی روک کر، آواز بلند کہتا، "مصری ورگے" "مب لے لو، سیانیا دے سودے جے۔" اس کی آواز سن کر بابو رفیق سوچتا، "کون کہتا ہے کہ ہمیں دل کی بات کہنے کی آزادی نہیں۔"

جیرا پہلوان گرمیوں میں درختوں کی چھاؤں میں دھندا کرتا۔ سردیوں میں دھوپ کی تلاش میں رہتا۔ ایک دن۔ دھوپ چھاؤں کی بات چل نکلی تو گلی کے ایک بزرگ نے کہا، "جیرا پہلوان، باہر کی دھوپ چھاؤں تو کچھ بھی نہیں۔ اندر کی رُت کا فکر کرو۔" جیرا پہلوان بزرگ کی بات سمجھ نہ سکا۔ اس نے جھٹ ریڑھی سے ایک آم اٹھا، چوسنا شروع کر دیا گلی کی ایک تاریک کوٹھری میں رہنے والے بھکاری نے بزرگ کی بات سن کر سوچا "پلے ہوں تو سب موسم ٹھیک ہیں۔" وہ خود اچھے موسم کی تلاش میں، مسکین صورت بنائے، ہاتھ پھیلائے، دن بھر صدا دیتا رہا "دے اللہ کے نام پر،" سخی کا رتبہ بلند ہو ہو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھلا" جھٹ پٹا ہونے سے پہلے وہ اتنی رقم اکٹھی کر لیتا، جس سے وہ لکشمی چوک میں جا کر گردے کپورے اور نان کھاتا، گرم گرم چائے پیتا، سگریٹ کے کش لگاتا، سینما دیکھتا اور دوسرے دن پنواڑی کو ریزگاری دے کر اس سے نوٹ لیتا۔ اب اس کے پاس اتنی پونجی ہو گئی تھی کہ زمین کا ایک ٹکڑا خریدنے کے لئے وہ دلال سے بات چیت کر رہا تھا

...سونا گداگری سے اچھا ہوئی۔ ...نہیں۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ بھی ...آئے۔ اب تو اس نے بھیک مانگنے کے اوقات بڑھانے کی ٹھان لی تھی۔ اس لئے کہ وہ استاد کرچھی کی طرح امیر بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ وہ استاد ...جس کی پرورش گزشتہ دو برس سے ...کے پیچھے کھڑی تھی جیرا پہلوان۔ ...دیکھا تھا خود لوگوں کے پاس جاتا مگر استاد کرچھی کے پاس لوگ چل کر آتے

استاد کرچھی کی بیوی، بیوہ بہن اور جوان بھانجی، پانی میں بھگوتی، ماش کی دال ...سے پیسنے میں جتی رہتی۔ کڑھائی میں پکوڑے تل کر پانی میں ڈال دیتیں۔ گلی کی گندی نالی سے مکھیاں اڑ اڑ کر چھابے کے سامان پر بھنبھناتی رہتیں۔ عصر کی اذان سے پہلے، دہی سے بھری مٹکی، بڑے ابلے ہوئے آلو، سبز مرچ اور ٹماٹر، مسالے املی کی چٹنی اور پیاز کے لچھے، استاد کرچھی کے اڈے پر پہنچ جاتے۔ برقی قمقموں کی روشنی میں اگربتیوں کی بھینی بھینی خوشبو آس پاس پھیل جاتی۔ ٹرانزسٹر ریڈیو سے گیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ گاہک ٹوٹ پڑتے موٹر کاروں، سائیکلوں، سکوٹروں کی بھیڑ لگ جاتی۔ استاد کرچھی اور اس کے ملازموں کو سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی۔ استاد کرچھی، رات کو اڈے سے اٹھتا تو نوٹوں کی گٹھری باندھ کر گھر لے جاتا۔

بابو رفیق استاد کرچھی سے کنی کاٹتا تھا غالباً اس لئے کہ بات کرنے میں استاد کرچھی کے منہ سے جھاگ اڑتے تھے۔ اس کی گفتگو ہر پھر کے دہی بڑے پر آجاتی۔ بابو رفیق کے ذہن میں وہ ناخوشگوار واقعہ بھی تو نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اس دن استاد کرچھی نے کرائے کے غنڈے بلوا کر موجی کو بری طرح پٹوایا تھا۔ موجی سردیوں میں چھابڑی لگا، ریوڑیاں اور مونگ پھلی بیچتا، گرمیوں میں قلفیاں اور فالودہ۔ اس کا جرم یہ تھا کہ ایک دن اس نے استاد کرچھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔

"ابے لونڈے نیچی کر آنکھیں" استاد کرچھی نے گرج کر کہا

موجی کی آنکھیں نیچی نہ ہوئیں۔

استاد کرچھی نے خون کے گھونٹ پی کر اپنے گھر کے دروازے میں پہنچ اٹھا، اندر جانے لگا تو دیکھا کہ جوان بھانجی دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تو یہاں کھڑی ہے" استاد کرچھی نے رعب سے پوچھا

"ماموں جی!"

"بول کیا کہنا چاہتی ہے"

"ماموں جی موجی کو کچھ نہ کہنا"

"بے شرم کہیں کی آئندہ تجھے دروازے کے پاس دیکھا تو تیرا گلا گھونٹ دوں گا"

چھٹی کے دن بابو رفیق اور استاد کرچھی کی ملاقات ناگزیر ہو جاتی۔ بابو رفیق فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آتا تو استاد کرچھی اسے اپنے بیٹھک میں لے جا کر چائے پلاتا۔ گلی کے دوسرے افراد بھی آجاتے۔ بابو رفیق اخبار پڑھ کر سناتا۔ استاد کرچھی "ضرورت رشتہ" کے اشتہارات میں گہری دلچسپی لیتا۔ وہ مزے لے لے کر رشتوں کے کوائف سنتا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو جاتا

ایک دن استاد کرچھی نے بابو رفیق سے کہا، "بابو جی! آپ نوکری چھوڑ کر میرے اڈے پر آجائیں۔ جو تنخواہ آپ کو سرکار دیتی ہے اس سے تین گنا زیادہ میں دوں گا۔ میرا کام اتنا پھیل گیا ہے کہ حساب کتاب رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ مجھے آپ جیسے آدمی کی ضرورت ہے"

بابو رفیق ٹس سے مس نہ ہوا۔

اس دن چھٹی تھی۔

بابو رفیق نے مسجد میں فجر کی نماز پڑھی اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ وہ رات بھر خیالات کی کال کوٹھری میں تو چار رہتا تھا۔ اگر وہ پان سگریٹ کی دکان کر لیتا تو پیٹ بھر کر کھانا تو کھا لیتا۔ تازہ اور خشک میوے تو اس کی دسترس سے باہر تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ حیاتیات اور حیاتین کی کمی کی وجہ سے انسانی جسم کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اگر اسے ان باتوں کا علم نہ ہوتا تو شاید اسے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ اب اس کی بیوی امید سے تھی۔ ایک بیمار زندگی سے نئی زندگی طلوع ہو کر اس گھر میں کیا کرے گی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ کولہو کے بیل کی طرح چکر کاٹ رہا ہو جیسے وہ جنم سے لے کر آج تک کسی قید خانے میں بند ہو خیالات کی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی جھنکار اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔

اس دن چھٹی تھی۔

بابو رفیق مسجد سے نکل کر گلی میں داخل ہوا تو استاد کرچھی اسے بازو سے پکڑ کر اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ گلی کے افراد بھی آکر نصف دائرے کی صورت میں قالین پر بیٹھ گئے۔ بابو رفیق کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے اخبار پڑا تھا۔

استاد کرچھی، صاف ستھرے کپڑے پہنے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، قالین پر بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ گلی کا بزرگ آنکھیں بند کئے، تسبیح پھیر رہا تھا۔ چائے آگئی۔ جیرا پہلوان سڑکا مار کر بولا "استاد کرچھی تیری خیر ہوئے"

مہاجا قصاب چائے کا گھونٹ پی کر بولا "یخنی کا مزا آگیا"

برکت دھوبی، رحیما اور روتا کنجڑا سب کے سب تازہ خبریں سننے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔

دفعتاً کہیں دور سے توپیں گرجنے لگیں۔

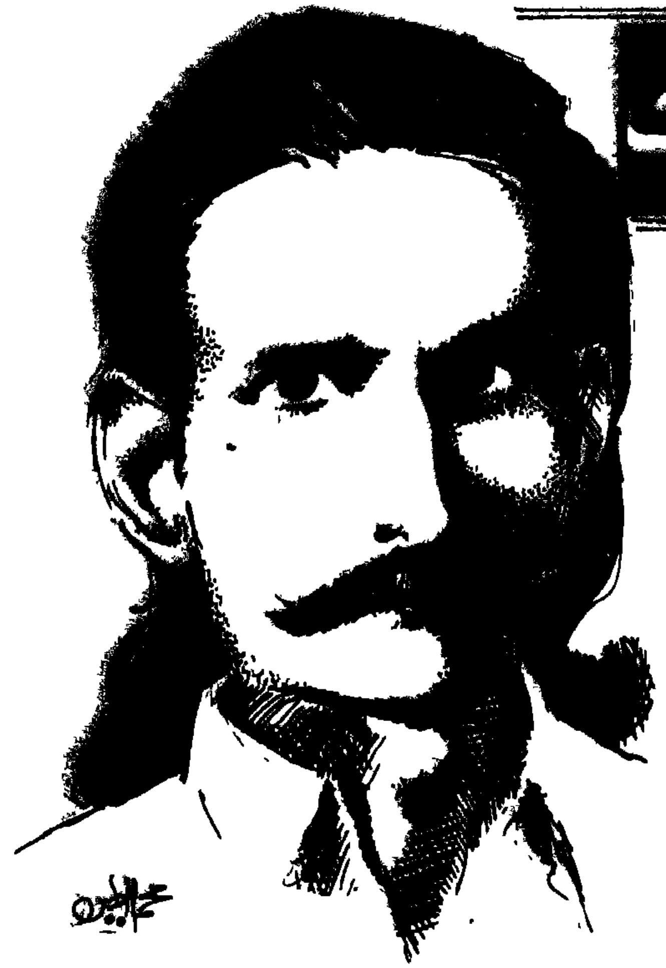
"بابو رفیق! یہ آوازیں کیسی ہیں؟" استاد کرچھی نے پوچھا

بابو رفیق نے کھڑکی میں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج کے دن ہم آزاد ہوئے تھے۔ ہماری قوم یوم آزادی منا رہی ہے"

میراجی کی محبت

ضیا ساجد



محبت ہر انسان کرتا ہے ــــ کوئی اپنے مفادات سے کرتا ہے ــــ کوئی اپنے مال و متاع سے کرتا ہے ۔ کوئی اپنی آل اولاد سے کرتا ہے ــــ کوئی انسانوں سے کرتا ہے ــــ کوئی اپنے آپ سے کرتا ہے ــــ اور کوئی دوسروں کی بہنوں بیٹیوں سے کرتا ہے ۔ یہ سب محبتیں اپنا اپنا فلسفہ اپنی اپنی نفسیات اور اپنا اپنا مرتبہ رکھتی ہیں ۔ ان میں سے کسی کا بطلان نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ اپنی اپنی جگہ پر ہر ایک سچی ہے ــــ دولت سے کی جانے والی ــــ کرسی سے کی جانے والی ــــ عورت سے کی جانے والی ــــ بال بچوں سے کی جانے والی ــــ انسانوں سے کی جانے والی اور اپنے آپ سے کی جانے والی ۔

ان میں سے انسانوں سے کی جانے والی محبت سب سے محترم ہوتی ہے لیکن یہ بہت کم لوگ کرتے ہیں جو کرتے ہیں ان کو سولیوں پر لٹکا دیا جاتا ہے انہیں اس کی خاطر بہت سی مصائب برداشت کرنا پڑتی ہیں اور اپنے آپ سے کی جانے والی سب سے گھٹیا ہوتی ہے کیونکہ اس میں مبتلا شخص انسانوں سے کٹ جاتا ہے ۔

ثنار اللہ ڈار ، میراجی کا روپ دھار لینے کے باوجود اسی محبت کا شکار رہا ۔ اس نے بظاہر تو بنگالی لڑکی میرا سین سے عشق کا ڈھونگ رچا کر اپنا نام اس کے نام کی رعایت سے میراجی رکھ لیا مگر در پردہ وہ اپنے آپ کو ہی چاہتا رہا ۔ تبھی اس کی شاعری دوسروں کے لئے مبہم اور مافوق الفہم ہے اگر اسے میرا سین سے سچا عشق ہوتا تو وہ الیعنی زبان میں شاعری کرتا جسے دوسرے لوگ بیشک نہ سمجھتے کم از کم اس کی محبوبہ ہی سمجھ لیتی ۔ کسی کا صرف نام اوڑھ لینے سے شہیدوں کی فہرست میں نام نہیں درج ہوا کرتے ــ واقعی ، فرہاد ، مجنوں ، پنوں اور مہینوال میں سے کسی نے بھی اپنی محبوبہ کا نام نہیں اپنایا تھا ۔ اس کے باوجود مملکت محبت میں ان کو وی آئی پی والا ٹریٹمنٹ ملتا ہے ، میراجی نے اپنی ہم نام رتا چکماری میراجی سے بھی سبق حاصل نہ کیا جو اپنے محبوب بھگوان [illegible] کرشن کی زبان میں بھجن گاتی تھی ۔ اس نے ثنار اللہ ڈار سے دستبردار ہو کر اور میراجی بن کر اپنے طرف سے پبلک کو کچھ دیا تھا ۔ حالانکہ اسے میرا سین تو کیا کسی سے بھی لگاؤ نہیں [illegible] ہوتا تو میرا سین کا پیچھا نہ چھوڑتا ۔ اس کے [illegible] کا پتھر بن جاتا ۔ ہاتھوں میں کو [illegible] کو پکڑ کر اپنے وجود کی کھڑکیاں دروازے [illegible] کر لیتا ۔ دنیا میں سچے ہو [illegible]

میرا سین کو اس نے [illegible] دیکھا تھا ۔ وہ بنگالی ہونے کے [illegible] صدیوں پرانی دھرتی کے [illegible] سے [illegible] میں ہندوستان کے قدیم [illegible] سکوت [illegible] دھرتی کے پہلے سالو [illegible]

گھنگھور گھٹاؤں جیسی روشن سیاہی گھلی ہوئی تھی اور لاجونتی کی کچی ڈالیوں جیسے اس کے نازک اور ہلکے پھلکے بدن کی خوشبودار ملیح رنگت پر برندابن کرتا ریکیوں میں سے نہراتی ہوئی دھوپ کا گمان ہوتا تھا۔

سانولی، سندر، مت منوہر تیکھے ترچھے نین
چال رسیلی، دل گرماتی اور گھٹا سے بال

چنانچہ یہ اس پر مر مٹا۔ اور اس کو دیکھنے کے لیے اپنے دوست کے ساتھ روزانہ کالج جانے لگا۔ اور دور ہی دور سے اس کے ٹھیٹھ ہندوستانی حسن سے حرارتیں کشید کرنے لگا۔ اس طرح اس نے پہلے روز سے ہی میرا سین سے شکست کھا لی۔ اپنی کسی جسمانی، مالی یا علمی خامی کے باعث اس سے مرعوب ہو گیا آخر تک اس میں اتنی جرأت پیدا نہ ہوئی کہ میرا سین کو نستے ہی کہہ دے جبکہ اسے علم تھا کہ:

دور ہی دور کھڑے رہے
کام نہیں چلتے جگ میں
تنہا جذبوں میں بہنے سے
کام نہیں چلتے جگ میں

اس کے باوجود یہ میرا سین سے دور کھڑا رہا جس کی وجہ سے اس لڑکی سے یہ نہ جوابی پیار پا سکا۔ نہ گالیاں کھا سکا، نہ اسے اس کی طرف سے کسی اور قسم کا رسپانس ملا۔ اگر یہ حوصلے سے کام لے کر اس کو اپنی حالتِ زار سے آگاہ کر دیتا تو ضرور وہ اسے اکاموڈیٹ کر لیتی۔ کم از کم بھائی ہی بنا لیتی۔ لیکن اس نے اپنی نجی کمزوریوں کو ذہانت کا لبادہ پہنا دیا۔

دور ہے جو رہے دور ہی
پاس بلانا ٹھیک نہیں

آپ قدم آگے لے جا کر
اس کو ستانا ٹھیک نہیں

چنانچہ چڑھتی جوانی میں ہی یہ مرا کر رہ جانے سے یہ آئندہ کے لیے عورتوں کے آگے بالکل بھینڈو ہو گیا۔ حالانکہ یہ عمر اتنی نڈر، بے حجاب، بیباک اور بے پرواہ ہوتی ہے کہ اونچی اونچی دیواریں پھلانگنے سے باز نہیں رہتی لڑکی ملنے یا نہ ماننے، انگوٹھے دکھانے، تھوک پھینکنے۔ اس عمر والے ثابت قدمی سے اسے سر کرنے کے لیے کمندیں اچھالتے رہتے ہیں تاوقتیکہ وہ سپر ہی نہ ڈال دیتی یا اس کی شادی نہیں ہو جاتی یا ان کی اپنی شادی نہیں ہو جاتی۔ میرا جی، میرا سین سے متاثر ہو کر میرا جی تو بن گیا مگر اپنی طبعی خود پرستی کاہلی اور سہل انگاری کے باعث اس کا شوہر نہ بن سکا حتیٰ کہ اس کے بعد بھی کسی کا شوہر نہ ہو سکا۔ جس کا الزام یہ اپنے دل کو دیتا ہے۔

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے عمر گزاری جس نے
کتنی سونغتی جو بھی کہو یہ دل ہے

حالانکہ موصوف کا دل اسے روزانہ کشاں کشاں کالج تک لے جاتا تھا۔ لیکن یہ خود وہاں پہنچتے ہی ہاتھ پیر چھوڑ دیتا تھا۔ جبکہ اوائل عمر میں ہی اس نے زندگی کو متعدد بار فیس کیا تھا کبھی درخت پر بیٹھ کر ______ اکرتی ہوئی گو اور کبھی سورج کی شعاعوں کی مہربانی سے زیریں جسم کے خطوط کو آشکارہ کرتی ہوئی کو۔ اس کا ذاتی نظریہ بھی یہ تھا کہ بدی بنفسہ میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر نہ جانے کیوں جوانی سے ہمکنار ہو کر عورت کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ سرد و گرم چشیدہ تھا اسے تو چاہیے تھا بڑا ہو کر خوب پر پرزے نکالتا مگر اس نے بچپن کا سارا کھایا پیا ضائع کر دیا میرا سین کو مسز میرا ڈار بنانے کے بجائے خود میرا جی بن گیا اس کے بعد غصے میں آ کر ہندوستان کا قدیم لڑیچر پڑھنے لگا کہ دیکھوں تو میری مٹی کہاں کی ہے اس کھوج میں نگر نگر کی خاک چھاننے لگا حتیٰ کہ گھر کا رستہ بھول گیا۔

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

بچپن میں تو والد کے ریلوے میں ملازم ہونے کی وجہ سے اسے ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ خود مختار ہو کر اس نے خود سنیاس لے لیا اور اپنی عمر عزیز کے چار دن بے دردی سے ضائع کرنے لگا۔ ایک نظم یعنی کنواری میرا سین کو نہ پا کر اس نے بعد میں دو غزلوں یعنی بیاہتا عورتوں ملی خانم اور بدلی بیگم سے لو لگائی مگر خود پیدا کردہ کمزوریوں کے باعث کچھ نہ کر سکا۔ اور پیچھے ہٹتا ہٹتا بالآخر اپنے ہاتھوں میں گر پڑا

اب نہیں دل میں میرے شوقِ وصال
اب ہر شے سے فراغت ہے مجھے

دوسری طرف عورت کو صدمہ قرار دینے کے باوجود اس نے اس سے بھرے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ کہہ کے چھٹکارا حاصل نہ کیا بلکہ آہستہ آہستہ اپنے ہوش و حواس سے چھٹکارا پا لیا۔ وہی اگر یہ ٹھوکر کھا کے عوام میں اتر آتا تو پھر اسے نہ ہاتھوں میں گولے پکڑنے پڑتے اور نہ ہی پتلون کی جیبیں پھاڑنی پڑتیں، کیونکہ اوپر تو خلا ہی خلا اور تنہائی ہی تنہائی ہے جو انسان کو انسان نہیں رہنے دیتے۔

تو پھر کوئی کہہ دے یہ کیا ہے وہ کیا ہے
خلا ہی خلا ہے خلا ہی خلا ہے

ہر انسان پر ایک وقت ایسا پڑتا ہے جس کے بعد اسے کسی پناہ گاہ کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی ہے اس وقت اس کے سامنے تین پناہ گاہیں ہوتی ہیں۔ اپنی ذات، نادیدہ طاقت اور باقی انسان۔ اگر وہ اپنے آپ کو تنہا کر لے تو یہ پناہ گاہ اس کا دماغ الٹا دیتی ہے۔ پھر وہ ہذیان بکنے لگتا ہے۔ ایسی زبان بولنے لگتا ہے جسے دوسرے نہیں سمجھ پاتے چنانچہ ستر سال کی عمر میں مرنے کے بجائے سینتیس سال کی عمر میں ہی مر جاتا ہے۔

ہے۔ کہ جو شخص اکیلا رہتا ہے اسکی منزل فنا ہی فنا ہے
اگر نادیدہ طاقت کے آگے گھٹنے ٹیک دے تو اس
کے اندر غرور بیدار ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے
اس کی ہوس، تو ند اور داڑھی بڑھ جاتی ہے
اور وہ خود غرض بن کے مزے کرنے لگتا ہے اور
اگر دوسرے انسانوں کے لیے جینے لگے تو مرنے
کے بعد اس کی پوجا ہونے لگتی ہے۔ اس کی قبر
مرجع خلائق بن جاتی ہے۔

میرا جی نے اپنے آپ کو پیغمبر کیا اور منادی
کرنے لگا۔

غیر آباد جزیروں میں چلا جاؤں گا
عمر بھر لوٹ کے میں پھر کبھی نہ آؤں گا

اس کا خیال تھا لوگ میرے پیچھے آتے جائیں گے
اور کارواں بنتا جائے گا۔ مگر بدقسمتی سے ایسا
نہ ہوا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں ہی الجھے رہے۔ بال
بچوں والے جو تھے۔ اگر اس طرح چھڑے چھانٹ
ہوتے تو شاید اس کے تعاقب میں چل پڑتے۔ یہ
اپنی ہی دھن میں، بہت آگے نکل گیا۔ جہاں سے
واپسی اس کے لیے مشکل ہو گئی۔ اس نے گرمی سردی
میں کسی منزل کا تعین تو کیا نہیں تھا۔

یونہی پاؤں میں کھڑاؤں پہن کر نکل پڑا تھا
بستی بستی پھرنے والا، میں سیلانی آوارہ
یہ جگ ہے اک نیلا منڈل میں اس میں سیارہ
اس کے ہاتھ باگ پر تھے نہ پاتھے رکاب میں
اس لیے جلد ہی ایک کھڈ میں گر گیا۔ جس کے اندر
آرام تھا نہ آرام زادہ۔ نہ حجام تھا نہ دھوبی چنانچہ
اس کے بال بھی بڑھ گئے اور کپڑے بھی میل میں
اٹ گئے۔ وہاں یکہ و تنہا ہونے کی وجہ سے ہر
طرف اسے اپنی ذات نظر آنے لگی جدھر دیکھتا
ادھر اپنے آپ کو پاتا۔ پہلے ہی اپنی ذات سے
پیار کرتا تھا۔ ہجوم میں رہتے ہوئے بھی سب
سے الگ تھلگ تھا۔ اب بیچ بیچ اکیلا ہوا تو گویا
نیم پر چڑھ گیا۔

نہ تھا کوئی معبود، پر رفتہ رفتہ
خود اپنا ہی معبود، بنتا گیا دل

اور وقت کو کل کرنے کے لیے شعور کی جگہ لاشعور
سے کام لینے لگا۔ لاشعور میں لذت نہ رہی تو
تحت الشعور کو استعمال کرنے لگا۔ اس نے
بھی اپنی افادیت کھو دی تو تحت تحت الشعور
کی چسکیاں لینے لگا۔ اجنتا کے غار میں داخل ہو
کر چندر گپت موریہ یا مہاتما بدھ صاحب کے
عہد میں جا نکلا اور بجائے اس کے کہ چندر گپت
وغیرہ کو کسی بہانے اپنے دور میں لاتا اور انہیں
فن برائے زندگی پر لیکچر دیتا الٹا موجودہ
دور کے انسانوں کے آگے ان کے فلسفے کا پرچار
کرنے لگا یعنی راگ درباری میں ادب برائے
فن گانے لگا۔ لوگ اس کی تقلید ضرور کرتے
اگر وہ سرسبز و شاداب رہتا لیکن اس کی ہیئت
کذائی اس کی تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔
لوگ ایسے فن سے نفرت کرنے لگے جس نے
اچھے خاصے مرد ثناء اللہ ڈار کو مجہول میرا جی بنا
دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم اور پھر دوسری جنگ عظیم
نے زندگی کی چیخیں نکال دی تھیں اس پر مستزاد
انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد
کی جا رہی تھی ایسے عالم میں بھلا کون اس کی
طرف توجہ دیتا۔ بادشاہ تو رہے نہیں تھے جو
فنکاروں کے وظیفے لگا دیتے تھے تاکہ انہیں
فکر معاش نہ ستائے اور وہ جس کام میں مصروف
ہیں یکسوئی سے اسے کرتے رہیں۔ اسی جیسے
عوام تھے جن کو اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے
تھے۔ اس لئے اس کے نالہ شیون پر کسی نے
کان نہ دھرے۔ بایں ہمہ اس کی سیکسوئل پرورش
خطرے کے نشان کو کراس کر گئی۔ اس کے ہاتھ
تیزی سے حرکت کرنے لگے۔

ننھا میدان، دو ٹیلے، ٹیلوں میں امرت وادی
اور تمناؤں میں جلتے ہونٹ ہیں جو پیاسے

مصیبت تو یہ تھی کہ یہ اپنی ڈیمانڈ کو ایسے
ادق زبان میں پیش کرتا تھا جو لوگوں کے
سروں پر سے گزر جاتی تھی۔ کسی کی گرفت میں
نہیں آتا تھا کہ حضرت شادی بنانا مانگتا ہے۔

ایک بے ساختہ انداز میں بجلی کی طرح
جل پری گوشۂ خلوت سے نکل آئی تھی

اور

جل پری آئے کہاں سے وہ اسی بستر پہ
میں نے دیکھا ابھی آسودہ ہوئی لیٹ گئی
لیکن افسوس کہ میں اب بھی کھڑا ہوں تنہا
ہاتھ آلودہ و نمدار ہے دھندلی ہے نظر
ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو تو نہیں پونچھے تھے

اور

تیری زرد گلابی سی
چھوٹی سی مرغابی سی
اور یہ میرا طوطا ہے
یہ آدم کا پوتا ہے

اور

اس کا ہے اک ہی مقصود، وہ استادہ کرے
بحر اعصاب کی تعمیر کا اک نقش عجیب

اور

جس کی صورت سے کراہت آئے
اور وہ بن جائے ترا مدِ مقابل پل میں
ذہنِ انسانی کا طوفان کھڑا ہو جائے
اور وہ نازنین بے ساختہ لے لاکھ ارادے کر نغیر
اک گرتی ہوئی دیوار نظر آنے لگے
شب کے بے روح تماشائی کو
بھول کر اپنی تھکن کا نغمہ
مختصر لرزشِ چشم ور سے
ریگ کے قصر کے مانند سبکسار کرے
بحر اعصاب کی تعمیر کا اک نقش عجیب
ایک گرتی ہوئی دیوار کے مانند کھا جائے

عوام یہی تصور کرتے تھے کہ جناب بھی
انگریزوں کو گالیاں دے رہے ہیں۔ اپنی شاعری
سے خلقت کو ہوشیار کر رہے ہیں کہ سلطنت انگلیشیہ

آ تصر کی دیواریں بل رہی ہیں اشو اور کارخانے
کے ددو دیوار ہلا دو۔ کیونکہ اس وقت سارے شہر
ہی کہہ رہے تھے لوگوں کو اصل حقیقت کا تو بہت دیر
بعد میں جاکے پتہ چلا۔ جب مختار صدیقی، قیوم نظر
نذیر آغا، عبادت بریلوی، سعادت حسن منٹو
اور اخلاق احمد دہلوی وغیرہ کے مضامین ان کی
نظروں سے گزرے۔ مگر اس وقت پانی سر
سے گزر چکا تھا۔ میرا جی بمبئی میں دفنایا جا
چکا تھا۔ ساتھ ہی انہیں غصہ بھی آیا کہ عجیب
شخص تھا جو ایک ایسے وقت میں جس میں فراموش
کردہ عشق والا معاملہ درپیش تھا جنس اور
جذبات میں الجھا رہا۔ اگر عورت کے بنا اسکی
حالت واقعی غیر ہو گئی تھی تو اسے اتنے پردوں میں
چھپا چھپا کے کیوں رکھتا تھا۔ اختر شیرانی کی طرح
ڈنکے کی چوٹ پہ اعلان کیوں نہیں کرتا تھا اسطرح
اس لیے بھوکا تو رہنا ہی تھا کیونکہ ان الفاظ میں
مدد مانگی جائے تو کہاں ملے۔

چاند ایک بھی بہت ہے گلزار شکم کے لیے
تین ہو جائیں تو اور بھی اچھا ہے۔
میں گزارہ تو صرف دیکھ کے بھی کر سکتا ہوں
پر کیا کروں کئی دنوں سے بھوکا ہوں

بچے کو تو معاف کیا جا سکتا ہے چونکہ اس
کے پاس الفاظ ہوتے ہیں نہ ذہن لیکن ایک
جوان جہان شخص اگر غوں غاں کرنے لگے تو اس
کا سارے مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ اس نے میرا جی
نام اپنی محبوبہ میرا سین کے نام پر رکھا تھا اسے
چاہیئے تھا اس قول کو نبھاتا۔ میرا میرا پکارتا رہتا
مگر اس نے دعویٰ یہ کر کے کہ،

پریم ہے دو دھاری تلوار
گہرا گھاؤ ہے کاری وار

عمل اس کے برعکس کیا۔ لوہے کے گولوں اور
گولیوں سے کھیلتا رہا۔ جس کی بنا پہ
یودا نجے، نیوں، مجنوں اور مہینوال والے
فہرست سے خارج ہو گیا۔ میرا سین کے بعد
بی خانم اور بدلی بیگم سے دل بہلاتا رہا۔ اور میرا سین
سے ایکسکیوز کرتا رہا۔

پھر کیوں تجھ سے دوری ہے
تیرے سپنوں سے بھی دوری ہے
اوروں سے بھی دل بہلانا پڑتا
ہے۔ یہ مجبوری ہے

جبکہ آج تک کسی سچے عاشق نے اپنے محبوب
سے انحراف نہیں کیا۔ خواہ اس کی خاطر پہاڑ
کھودنا پڑا ہو۔ بھینسیں چرانی پڑی ہوں،
صحراؤں کی خاک چھاننی پڑی ہو یا تھانے میں جاکر
چھتر کھانے پڑے ہوں۔

میرا جی شاید محبوب کا نام ہی پہن لینے کو
عشق کی معراج سمجھتا تھا تبھی آگے چل کر وہ کسی اور
طرف کو نکل گیا۔ محبت کی ناکامی کو طاقت میں
تبدیل کر کے سماج اور سماج کے ٹھیکیداروں سے
ٹکرانے کے بجائے علم الاصنام اور ہندو دیومالا
کا مطالعہ کرنے لگا۔ حالانکہ محبت کے اصولوں
کے تحت اسے چاہیے تھا ان وجوہات کیخلاف
علم بغاوت بلند کرنا جن کے باعث وہ اپنی
محبوبہ کو نہیں پا سکا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا
ہے کہ اس کی ناکامی کی وجہ بیرونی نہیں تھی بلکہ
اندرونی تھی۔ بہت ہی ذاتی قسم کی تھی۔ جس
کے تحت وہ خود دور دور رہنا چاہتا تھا۔

ایک تو ایک میں دور ہی دور ہیں۔
آج تک دور ہی دور ہر بات ہوتی رہی۔
دور ہی دور جیون گزر جائے گا اور کچھ بھی نہیں

نہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سماج
معاشرے کی وجہ سے محبت میں شکست کھا کر
سماج کو سپیرٹ کر دیتا اور پولیس والوں، محلے
والوں، کرسی والوں اسرمایہ داروں' اور
مولویوں کو کوسنے کے بجائے کرشن کنہیا اور
رادھا کی محبت کے گیت گانے لگتا۔
وہ وجہ کیا تھی اس کا ابھی تک علم نہیں
ہو سکا چونکہ اس نے ایسی زبان میں شاعری
کی ہے جو آب جہارت میں بولی جاتی ہے
دوسرے اس نے اپنی فیلنگز کو بیئر بہتوں
میں دفن کر دیا ہے جس میں غواصی کرنا موت
کو دعوت دینا ہے۔ زندگی کے دوسرے مسائل
نے دلوں اور ذہنوں کو کمزور کر دیا ہے اگر اس
کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو دل
کی دھڑکن بند ہو جانے یا دماغ کی شریان
پھٹ جانے کا احتمال ہے البتہ چھ سات
ہزار سال بعد کوئی نہ کوئی ماہر لسانیات اس
کی شاعری کی تہہ تک ضرور پہنچ جائے گا آخر
آثار قدیمہ کے موجودہ ماہرین نے بھی تو ہزاروں
سال قبل لکھی گئی تختیاں برآمد کر کے پڑھ لی
ہیں۔ یوں یہ مستقبل بعید کا شاعر ہے۔

اس نے جس طرح پالنے والی محبت نہیں
کی صرف خیالی محبت کی ہے۔

دل میں ہر لحظہ ہے صرف ایک خیال
تجھ سے کس درجہ محبت ہے مجھے

اسی طرح مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید
کو مدنظر رکھ کر شاعری بھی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے
جو عام ادبی حلقے اس کا نام تو جانتے ہیں
کام نہیں جانتے۔ چونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر اس
کی کتاب خرید لی تو پھر کسی میرا جی سپیشلسٹ
سے رجوع کرنا پڑے گا۔ اس نے جو یہ دعوے
کیا ہے۔

شعر کہتے تھے اپنے میرا جی
لوگ سنتے تھے آہ کرتے تھے

یونہی نہیں کیا۔ لوگ واقعی آہ بھر کر رہ جاتے
تھے کہ کاش اس نے کوئی کام تو ڈھنگ سے
کیا ہوتا۔
عشق کیا تھا تو اس میں اس قدر ڈوب جاتا کہ اسے
پھر شاعری تو کجا کسی بھی کام کا ہوش نہ رہتا پھر

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

"خوشیوں کا باغ" کتابت و طباعت کے لحاظ سے نہایت عمدہ تخلیق ہے

ہم اس کالم میں کتابوں پر نہیں، مضمونوں پر تبصرے کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ کتابوں پر اظہار رائے کے لئے انہیں پڑھنا پڑتا ہے اور مضمونوں کے بارے میں کچھ لکھنا ہو تو بعض اوقات ان کی تصویر دیکھ لینا کافی ہوتا ہے کہ صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس پرت اٹھی کی بات ہے۔ تصنیف و تالیف کا شوق رکھنے والے گو کہ بعض ادیبوں نے ہمیں اپنی کتابیں تبصرے کے لئے بھیجی ہیں اور توقع ہے کہ خدا جانے کتنے بھیجیں۔ خط لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں کہ جتنا وقت خط لکھنے میں ضائع ہوتا ہے اتنی دیر میں ایک نئی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

اب جو کتابیں موصول ہونے لگی ہیں تو پہلے مسئلہ کیا ہے کہ تبصرے لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جب آج تک کسی نے نظیر صدیقی کو شاعری سے اور مستنصر حسین تارڑ کو سفرنامے لکھنے سے نہیں روکا تو ہمیں تبصرہ نگاری سے کون روکے گا۔ جو حضرات اپنی کتابوں پر تبصرے کے خواہشمند ہوں ان سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھیں۔ (۱) کسی کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری نہیں، دو سے زیادہ بھی بھیجے جا سکتے ہیں کیونکہ موصولہ کتابیں کتب فروشوں کے ذریعے اہل ذوق حضرات تک پہنچانے کا اہتمام کر لیا گیا ہے۔ (۲) کسی کتاب پر مصنف حضرات ہمارا نام لکھ کر اپنے دستخط نہ کریں کیونکہ جن کتابوں پر یہ لکھا ہوا نہیں ہوتا انہیں دکاندار سیکنڈ ہینڈ سمجھ کر کم قیمت لگاتے ہیں۔ (۳) اگر کوئی اشاعتی ادارہ غیر اشاعتی کام بھی کرتا ہو تو اسے اپنی مطبوعات کے ساتھ دوسرے کام کا نمونہ بھی بھیجنا چاہیے تاکہ تبصرہ کرتے ہوئے اس ادارے کی کل خصوصیات مد نظر رہیں۔ مثلاً ہمدرد دواخانے والے کتابیں بھی چھاپتے ہیں اور روح افزا بھی بناتے ہیں۔ اگر وہ اپنی کوئی کتاب تبصرے کے لئے بھیجیں تو اس کے ساتھ روح افزا کی چند بوتلوں کا آنا ضروری ہے تاکہ کتاب کے مطالعے سے صحت کا جو نقصان ہو اس کی تلافی کی جا سکے یا مطالعے کو زیادہ خوشگوار بنایا جا سکے۔ مثلاً ہمدرد والوں نے حکیم محمد سعید صاحب کا تازہ سفرنامہ "جاپان ایک مسافر" تبصرے کے لئے بھیجا ہے۔ اس کے ساتھ اگر روح افزا کی بوتلیں آ گئی ہوتیں تو سفرنامے کا مطالعہ زیادہ خوشگوار ہوتا اور تبصرے میں بھی کسی قسم کی تلخی کی بجائے روح افزا کی شیرینی جاری و ساری ہوتی۔ اگر ہمدرد والے ہماری اس گزارش پر غور کریں تو انہیں حکیم صاحب کا سفرنامہ کا معاملہ کر لینا چاہیئے۔ ان کی اگلی کتاب پر ان شاء اللہ بہت اچھا تبصرہ کریں گے۔

اس مرتبہ ہم دو کتابوں پر تبصرہ کر رہے ہیں۔ باقی تبصرے پھر کبھی شائع کئے جائیں گے۔

خوشیوں کا باغ

یہ کتاب پسند ہے انور سجاد کی اور خود انور سجاد حسب الطلب (مالطلبہ) ہیں انیس ناگی کی۔ اس ابہام کی توضیح یہ ہے کہ پچھلے دنوں لاہور کے ایک اخبار میں انیس ناگی نے انور سجاد کے نام ایک خط چھپوایا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں

"برادرم تمہارے "خوشیوں کا باغ" کی ایک کاپی کمالی تاجر کے تعاون ہی سے ملی۔ اس کا وہ معتبر ایڈیشن جو اجمل کمال نے بھارت میں طرح مبین رک کے ذریعے شائع کرایا تھا۔ میں اس معتبر ایڈیشن کا حقدار ہوں کہ میں دس برسوں سے تمہارا قلمدان اٹھائے پھر رہا ہوں اور تمہارے اُن ادبی حریفوں کو کچا رہا ہوں جو تمہیں اداکار تو مانتے لیکن تمہاری ادبی حیثیت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے۔ تمہاری عدم موجودگی میں ترنگیاں کرتے آج پرگئی۔ ہمارے بعض عارضی اور ادبی مقاصد کی بدولت ہم اُن سے الگ ہو چکے۔ میں اس معتبر ایڈیشن کا حقدار ہوں کہ میرے مشورے پر تم نے ناول کو افسانے میں سائنٹیفک بنایا کیونکہ تمہیں خوب پتہ تھا کہ مکمل ناول کی صورت میں اشاعت خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ تم کسی خطرہ مول نہیں لو گے کیونکہ تم پہلے ہی اپنے طور پر حفاظتی تدابیر اختیار کر چکے ہو صرف اپنے دوستوں کو اطلاع نہیں دی۔ پھر ایک دن تم نے اعلان کیا کہ "خوشیوں کا باغ" کی اجازت نہیں ملی۔ میں نے اپنے طور پر پتا کیا کہ صرف ایک جملہ قابل اعتراض ہے، باقی کی اجازت ہے۔ تم نے یک لخت اس کی معقول تعداد میں فوٹو کاپیاں کرا کے تقسیم کیں۔ تاہم اس کی ایڈیشن نے ادبی حلقوں میں کوئی ہلچل پیدا نہیں کی۔ ایک دن پتا چلا کہ تمہارے اردو افسانے کے نام نہاد مجاہد میں عاشے بھارت میں بھی اس کا معتبر ایڈیشن شائع کیا ہے۔ وہ ناول وہاں کس طرح شائع ہوا میں اس کے بارے میں کوئی کہانی نہیں کروں گا۔ اس واقعے کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی ناول کسی نہ کسی دوسرے کے تعاون سے یہاں بھی شائع ہوا۔ اس مرتبہ تم نے کسی خطرے کا اظہار نہیں کیا۔ اس دوران تم نے جو جو ڈرامے کئے، ان سے احتراز رکھنا بہتر ہے کہ ہمارا اور میرا احباب قائم رہے۔"

اس کے آگے بھی انیس ناگی نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ہم اسے نقل نہیں کر رہے تاکہ انور سجاد اور انیس ناگی سے ہمارے قارئین کا حجاب قائم رہے۔ اس طویل اقتباس کے لئے ہم اپنے قارئین کرام سے ہی نہیں، اس کالم کے کاتب صاحب سے بھی معذرت خواہ ہیں کہ انہیں بڑی زحمت اٹھانی پڑی، لیکن یہ اقتباس نقل کرنا ضروری تھا کہ اس سے نہ صرف ناول کے پس منظر، انور سجاد اور ناگی کے باہمی تعلقات کی نزاکت یا پیچیدگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں اب تک صرف ایک قلمدان بردار کا ذکر ملتا ہے، وہ تھا مرزا سودا کا غنچہ۔ غنچہ کے بعد یہ مرتبہ انیس ناگی کو ملا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ غنچہ خود کچھ نہیں لکھتا تھا لیکن ناگی صاحب خود بھی لکھتے ہیں اور ماشاءاللہ خوب لکھتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اس تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ انور سجاد کے قلمدان بردار کی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام آ ہی جائے گا۔ البتہ ٹھیک ہے تاریخ انور سجاد خود لکھیں کیونکہ اگر کوئی دوسرا شخص تاریخ لکھے گا تو وہ انور سجاد ہی کے لئے گنجائش نہیں نکال سکے گا تو اس کے غنچے کے لئے گنجائش کہاں نکلے گی۔

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ "خوشیوں کا باغ" کتابت و طباعت کے اعتبار سے ایک نہایت عمدہ تخلیق ہے۔ کتابت ایسی ہے جیسے موتی پرو دیئے گئے ہوں اور طباعت ایسی ہے جیسے ان موتیوں کو دھوپ میں ڈال دیا گیا ہو۔ سب سے اہم مطالب تو وہ پاکستانی ایڈیشن میں نظر نہیں آتے، ممکن ہے ہندوستانی ایڈیشن میں ہوں۔ ناگی صاحب کو اگر ہندوستانی ایڈیشن کا نسخہ مل جائے تو ان سے گزارش ہے کہ ہمیں چند روز کے لئے مستعار عنایت فرمائیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ انور سجاد اس ناول کے ذریعے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے فلاڈلفیا میں ایک تصویر دیکھی تھی۔ "خوشیوں کا باغ" کے تیسرے پینل "موسیقی کا جہنم" کی تفسیر پیش

کی ہے۔ انور سجاد فرماتے ہیں کہ ہم نے موسیقی کے ضبط کو ناقابل لحاظ سمجھا۔ انہیں ناول کے سیاق و سباق میں جذب کیا ہے افسوس کہ ہمیں ناول کا سیاق و سباق ہی معلوم۔ ہو سکتا ہے ہم اس کتاب کے عمل کا اندازہ کرنے بیٹھ جائیں یہ کہا ہے۔ ہو سکتا ہے انور سجاد نے یہ گوشۂ العاطفیا ناول فرو سمانیہ میں لکھا ہوگا۔ آخر جو ناول محو غیبت آزاد ہوئے ہیں آخری زمانے میں اس قسم کی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اگر ایک کتاب انور سجاد نے بھی لکھ ڈالی تو اس میں کیا کوئی برائی یا ہونے کی کیا غرض ہے

مقالاتِ جوش

جوش ملیح آبادی کے مقالات کا مجموعہ کسی الانصاری نے مرتب کیا ہے کیوں مرتب کیا ہے؟ اس کا سبب معلوم نہیں ہو سکا۔ انصاری صاحب نے اس ضخیم کتاب میں کہیں بھی اپنے قلم سے کچھ نہیں لکھا۔ دو لفظ دیباچہ یا سطر دو توضیح بیان تک نہیں ہے۔ صدمہ یہ ہے کہ انہوں نے جوش صاحب کے کسی مقالے کے ساتھ کوئی ایسا حوالہ بھی نہیں دیا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ مقالات کہاں سے نقل کئے گئے ہیں۔ کتاب سے متعلق ضروری باتوں کو صیغۂ راز میں رکھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ انصاری صاحب کو اگر اس کتاب پر خود کچھ نہیں لکھنا تھا تو کم از کم جوش صاحب ہی کی طرف سے ایک دیباچہ لکھوا دیتے جس میں یہ وضاحت درج ہوتی۔ "میں نے اپنے کلام موزوں کے حقوق صہبا لکھنوی کے نام محفوظ کئے ہیں اور اب اپنے کلام ناموزوں کے حقوق حق سحر الانصاری کو منتقل کر رہا ہوں۔"

جوش صاحب کی نثر کو ہم نے کسی برائی کی وجہ سے کلام ناموزوں نہیں کہا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نثر ان کی شاعری کا دوسرا روپ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شاعری میں عروض کی پابندی کی گئی ہے اور نثر میں عروض سے صرف نظر رکھا گیا۔ جوش صاحب کی نثر اور شاعری میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں میں الفاظ کی کثرت سے قدرت کلام ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ جملہ یہ تاثر دیتا ہے جیسے کسی میدان جنگ میں کشتوں کے پشتے لگ گئے ہوں۔ یہ مقالات ادبی، سیاسی اور سماجی اہمیت کے ہیں۔ ان سے ادب، سیاست اور سماج کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دلچسپ مقالات ہیں۔ اگر آپ انہیں پڑھنا شروع کر دیں تو کتاب ختم کئے بغیر نہیں رہیں گے (یہ الگ بات ہے کہ کتاب کے ساتھ آپ خود بھی ختم ہو جائیں)۔ ہمیں سحر انصاری کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ ان کی وجہ سے ایک اچھی کتاب منظر عام پر آئی ہے۔

غالب کے نئے خطوط

انور سدید اور عطاء الحق قاسمی دونوں کے لئے ہم اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں، لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کے حق میں سنگدل ہیں۔ ہمارے لئے یہ مشکل آن پڑی ہے کہ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کی تعریف کی جائے تو دوسرے کے ناراض ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ ہم ان دونوں کی باہمی ناراضگی تو کسی حد تک برداشت کر سکتے ہیں لیکن یہ اچھا نہیں لگتا کہ ان میں سے کوئی ہم سے ناراض ہو جائے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ہم نے طے کیا ہے کہ جب دونوں میں سے کسی ایک سے کوئی اچھا کام سرزد ہو تو دوسرے کو مبارکباد دی جائے۔ لہٰذا اس اصول کے پیش نظر ہم انور سدید کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی کو مبارکباد دیتے ہیں کہ طنز و مزاح کے میدان میں وہ اکیلے نہیں رہے۔ انور سدید بھی اس طرف کتاب لے کر آ نکلے ہیں۔ جو عمر رسیدگی جو ان جیسے گے دلوا دے ... ہم نے صرف شعری کی وجہ سے کہا ہے ورنہ دونوں جوش مانے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے فن میں کامل۔

عطا صاحب داستانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انور سدید کا علامیوں سے تعلق ہے۔ یعنی عطا دلی ہیں، انشائیہ نگار ہیں، شاعر بھی اور طنز و مزاح نگار بھی۔ زیر نظر کتاب انہوں نے خطوط غالب کے انداز میں لکھی ہے۔ اس میں جو خطوط ہیں جو اظہر جاوید مدیر "تخلیق" کے نام لکھے گئے ہیں۔ اگر اظہر جاوید غالب کے زمانے میں ہوتے تو ان دونوں میں کسی خط کتابت نہ ہوتی کیونکہ اظہر جاوید کا تعلق ان لوگوں سے ہوتا جن پر غالب نے اپنی عقیدت کا عدم اظہار کیا تھا۔ اسے انور سدید کی کرامت سمجھئے کہ اب اظہر جاوید کا تعارف ہے غالب سے۔ غالب نے اتنی سعادت مندی کا اظہار تو کسی حسین حال سے بھی نہیں کیا تھا جتنا ان خطوں میں اظہر جاوید سے کیا ہے۔

ان خطوں میں عصری ادبی سرگرمیوں پر طنز کئے گئے ہیں جو ڈاکٹر سلیم اختر اور طاہر تونسوی کے نزدیک مکتب ہو سکتے ہیں کیونکہ ان دونوں کا ذکر اس کتاب میں جہاں کہیں آیا ہے رنگ دکھا گیا ہے۔ شاید طاہر تونسوی کل ان خطوں کو جعلی ثابت کرنے کے لئے سرگرم تحقیق ہوں۔ اگر تونسوی صاحب اپنی تحقیق میں کامیاب ہو بھی گئے تو ان خطوں کی افادیت متاثر نہیں ہوگی۔ یہ خطوط جعلی ہونے کے باوجود اپنے مطالب کے اعتبار سے اصلی رہیں گے کیونکہ ان خطوں میں جھوٹ کی مقدار اتنی ہی ہے جتنی غالب کے اصلی خطوں میں ملتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ غالب کی راست گفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور محقق قاضی عبدالودود نے کہا تھا کہ غالب اس لئے مصلحتاً جھوٹ بولتے تھے کہ اس سے زیادہ جھوٹ بولنا ممکن نہیں تھا۔ بہرحال ہمارے نزدیک زیر نظر کتاب بڑی حد تک سچی باتوں کا مجموعہ ہے۔ البتہ ناشر سے ایک شکایت ہے کہ اس نے غالب اور انور سدید کی تصویریں ایک ہی صفحے پر چھاپ دی ہیں جس سے یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ غالب کون ہے اور انور سدید کون۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم نے غالب اور انور سدید دونوں کو نہیں دیکھا۔ ایک کے عہد میں ہم موجود نہیں تھے اور دوسرے کے شہر میں ہم اس خوف سے کبھی نہیں گئے کہ کہیں ہمارے ساتھ بھی وہ سلوک نہ کیا جائے جو اس کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر سے کیا گیا ہے۔

رازوں سے بھرا بستہ

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس عہد آفریں کتاب جیسے ہی گلدستۂ ... ساقی فاروقی کی کتاب "رازوں سے بھرا بستہ" پچھلے سال شائع ہوئی تھی، لیکن ابھی تک ادبی حلقوں کو اس کی اشاعت کا علم نہیں ہوا۔ کسی جگہ کوئی اشتہار دیکھنے میں آیا ہے نہ تبصرہ۔ ساقی فاروقی سے پہلے افتتاحی ادب کو پہنچ سکتی ہے اور موصوف عقل ہیں تاکہ ایک ہی کتاب بھی شائع کرا سکتے ہیں۔

یہ کتاب تصنیف تو ساقی کی ہے لیکن اسے مرتب کیا ہے محمد سلیم الرحمٰن اور ریاض احمد نے۔ محمد سلیم الرحمٰن شاعر اور مترجم ہیں۔ جب کوئی اچھا ترجمہ کرتے ہیں تو اپنے نام سے اور برا ترجمہ کرتے ہیں تو اصل مصنف کے نام سے شائع کرا دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں بیک وقت اچھا شاعر بھی سمجھا جاتا ہے اور اچھا مترجم بھی۔ ریاض احمد کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ انہوں نے میر مہدی مجروح کے خطوط مرتب کئے جسے مجلس ترقی ادب کی طرف سے شائع کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کو شاعری سے کتنی دلچسپی ہے۔

محمد سلیم الرحمٰن اور ریاض احمد نے ساقی کا نیا مجموعہ کلام مرتب ہی نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور سلوک بھی کیا ہے۔ سرورق پر ان دونوں کے نام سے پہلے لکھا ہے "ترتیب، انتخاب اور تہذیب"۔ پہلی دو باتیں تو سمجھ میں آتی ہیں لیکن تیسری بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ان دونوں نے ساقی کی شاعری کو تہذیب کے دائرے میں لانے کی کوشش کی ہے؟ ہمیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا کیونکہ ہم نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔ پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ اس مجموعے میں جو کلام شامل ہے وہ ساقی کے پہلے دونوں مجموعوں "پیاس کا صحرا" اور "رادار" میں بھی موجود ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ساقی کے پہلے دونوں مجموعوں میں قطع و برید کے بعد تیسرا مجموعہ تیار کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ پہلے دونوں مجموعے بازار میں آسانی اور فراوانی کے ساتھ دستیاب ہیں۔

ساقی فاروقی خوش قسمت ہیں کہ وہ خود تو لندن میں بیٹھے ہیں اور ان کے عقیدت مند لاہور میں بیٹھ کر ان کے کلام کو مرتب ہی نہیں فرما رہے ہیں، مہذب بھی کر رہے ہیں۔ ایسے عقیدت مند تو غالب اور میر کو بھی نہیں ملے تھے۔

کتاب پر مرتبین نے کوئی دیباچہ یا پیش لفظ نہیں لکھا جس سے یہ معلوم ہو کہ انہوں نے اتنی زحمت کیوں اور کس لئے اٹھائی۔ غالباً محمد سلیم الرحمٰن کا یہ ایک جملہ ملتا ہے—

۔ ہو سکتا ہے کہ جو ٹک ٹک ہم ان نظموں میں سن رہے ہیں وہ گھڑی کی بجائے کسی ٹائم بم کی ہو۔" ہم نے اس مجموعے کی عام نظموں کے ساتھ کان لگایا لیکن ٹک ٹک کی کوئی آواز نہیں آئی۔ اس میں محمد سلیم الرحمٰن کا یا ان نظموں کا کوئی قصور نہیں، ہماری سماعت ہی کمزور ہے۔ کمزور سماعت والوں کو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ نہ کریں ورنہ ہماری طرح اُن کو بھی اس کتاب سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایک سو بیس صفحات کی مختصر سی کتاب کی قیمت بیس روپے ہے۔ اگلے زمانے میں تو اتنے روپیوں میں کتاب کے ساتھ مصنف اور مرتب بھی مل جایا کرتے تھے۔ آج کل ایسا نہیں ہوتا۔

اُردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ

اس کتاب پر جناب عزیز بگٹی بہت تفصیل سے تبصرہ لکھ چکے ہیں، اس لئے مزید کچھ لکھنے کی فرصت نہیں۔ صرف ایک لطیفہ سنانے کی اجازت دیجئے۔ ص ۲۴ پر طبی تصنیفات کی کتابوں کی فہرست میں شیخ محمد اکرام کی کتاب "حکیم فرزانہ" کا نام بھی شامل ہے۔ واضح رہے کہ یہ کتاب مرزا غالب کی سوانح عمری ہے لیکن "حکیم" کے لفظ کی وجہ سے مقتدرہ قومی زبان نے اسے طبی کتابوں میں شامل کر لیا ہے۔ اُمید ہے زیرِ تبصرہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں علامہ اقبال کی سوانح عمریوں کو بھی شامل کر لیا جائے گا کہ وہ تو حکیم الامت تھے۔

دوسرا البم

جلیل عارف بخاری نے اپنی اس کتاب کے ساتھ جو تصویر چھپوائی ہے وہ ۳۰-۳۵ سال پہلے کی ہے لیکن اسلوب تحریر سے کوئی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب زمانہ پیری کی تصنیف ہے۔ عارف صاحب بزرگ ادیبوں میں سے ہیں، انسان کی زندگی علم اور دماغ دونوں کی وجہ سے ہے۔ اسی لئے ادبی حلقوں میں ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عارف صاحب خود دوسروں کا خیال کم ہی احترام کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت زیرِ نظر کتاب میں جابجا ملتا ہے۔ جس سے معلوم لوگوں کی رسوائی کا اندیشہ ہے مثلاً انہوں نے بتایا ہے کہ رحیم گل کے ناول "تن تارا را" پر عارف بخاری کے نام سے جو طبع ہے وہ خود رحیم گل کا لکھا ہوا ہے۔ احمد ظفر کے بارے میں لکھا ہے۔ "اس کا ایک شعری مجموعہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے انعامی معاملے میں منتخب ہو کر بھی انعام پا سکا کہ لیکن اثر صاحب نے منصفوں کو ہموار کر کے اُسے اپنے حق سے محروم کر دیا اور یہ انعام دروازے سے خود اُٹھا لیا"۔ —— عارف صاحب نے احمد ظفر ہی کے بارے میں یہ بھی فرمایا ہے۔ "کبھی کبھار دوستوں کی صحبت میں ایک دو جام چڑھا جائے تو وہم پکڑ لیا ہوا ہے میں نے وہیں تنگی اور پھر اُس سے ایسی ایسی بداعمالیاں سرزد ہوئیں کہ کچھ نہ پوچھئے"۔ جمیل ملک کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ

اُسے یہ شکایت ہے کہ اس نے احمد ندیم قاسمی کی شاعری پر جو کتاب لکھی تھی اور اپنے خرچ پر چھپوائی تھی۔ اُس سے قاسمی صاحب نے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ یہاں عارف صاحب نے دو دھاری تلوار چلائی ہے جمیل ملک اور قاسمی صاحب دونوں کو رسوا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جمیل ملک نے اگر یہ کتاب

> **کتاب انہوں نے عہدِ پیری میں لکھی لیکن**
> **اس میں اپنی تصویر عہدِ شباب کی شائع کی ہے**

اسے خرچ سے چھپوائی لوا لیا گیا، کیا وہ اسے قاسمی صاحب کے خرچ پر چھپواتے؟ کتاب چھپی تو قاسمی صاحب نے اسے پڑھ لیا، اس سے زیادہ دلچسپی وہ کیا لیتے؟ کیا وہ کتاب کی فروخت میں مدد کرتے، ہر آنے جانے والے کے ہاتھ اس کے نسخے بیچتے؟ اس قسم کا کام تو کبھی کبھی احمد فراز نے بھی نہیں کیا تو قاسمی صاحب سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے۔

عارف بخاری نے سب سے زیادہ تو ممتاز شاعر صہبا لکھنوی کا لکھا ہے۔ اول تو اس کا عنوان ہی بہت معنی خیز ہے —— "پیر لسم اللہ" صہبا صاحب کو پیر لسم اللہ کہنا کوئی اچھی بات نہیں۔ اس سے اصلی اور نادر کی پیر لسم اللہ کی روح کو صدمہ پہنچنے کا امکان ہے۔

صہبا کا خاکہ لکھتے یا اڑاتے ہوئے عارف بخاری نے اپنی طرف سے ایک لفظ نہیں لکھا۔ سر دست سے آخر تک صہبا کی گفتگو قلم بند کر دی ہے۔ اور اُن کی زبان سے ایسی ایسی باتیں کہلوائی ہیں کہ اگر کوئی دوسرا کہہ دیتا تو صہبا صاحب اُس پر ازالۂ حیثیتِ عرفی کا دعویٰ کر دیتے صرف ایک مثال ملاحظہ فرمایئے جب فرماتے ہیں:

"باتھیوں کے جنگل میں ایک خرگوش جا نکلا تھا۔ اُسے دیکھ کر ایک ہاتھی نے پوچھا، میاں تم کس نسل سے ہو اور یہاں کیسے آ گئے۔ خرگوش نے کہا کہ میاں میں بھی تمہارا بھائی ہوں بس ذرا صحت اچھی نہیں رہی۔ اسی طرح کوئی غیر ملکی بھوپال کا دورہ کرنے کے بعد کہیں مجھ سے ملا تو میں نے پوچھا کہ بھوپال کے لوگ تو بڑے قد آور ہوتے ہیں تم کون سی مخلوق ہو۔ تو میں نے اُسے بتایا کہ میں بھی بھوپالی ہوں، بس ذرا صحت سے مار کھا گیا اور اسی لئے اب لکھنوی لکھنے لگا ہوں۔"

عارف و صہبا میں بڑی دوستی ہے لیکن دوستی کا یہ تحریری ثبوت ہمیں پسند نہیں آیا۔ دوستوں میں زبانی مذاق ٹھیک ہے تحریری مذاق سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ کتاب کے قارئین کیا لائے گی؟ اس کا کیا ہوگا؟

ہماری دیانتدارانہ رائے ہے کہ صہبا صاحب اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت سے اتنے رسوا نہیں ہوں گے جتنے رسوا وہ عارف بخاری کے مضمون سے ہوئے ہیں۔ خدا ہر شخص کو ایسے دوستوں کی دوستی سے محفوظ رکھے۔

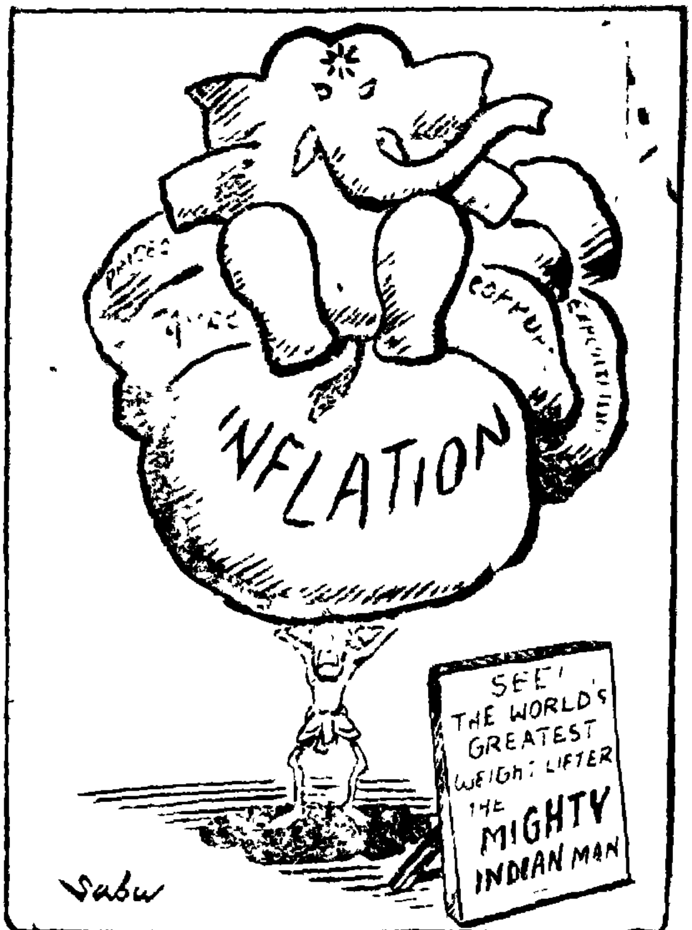
رسالہ "انکار" علی گڑھ

ایک زمانہ تھا کہ پورے برصغیر کو دینی و ملی خدمات انجام دینے والی شخصیات علی گڑھ فراہم کرتا تھا زندگی کا کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں علیگڑھ والوں نے نام پیدا نہ کیا ہو —— لیکن اب کچھ عرصہ سے علیگڑھ سے شخصیات نہیں نکلتیں، رسالے نکلتے ہیں۔ ہر سال دو تین رسالے منظرِ عام پر آتے ہیں اور ہر رسالے کا ایڈیٹر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا رسالہ ادبی خلا کو پُر کرنے کے لئے نکالا جا رہا ہے۔ ان رسالوں سے ادبی خلا پُر ہو رہا ہے، ہنگامہ آرائی اچھی خاصی ہو جاتی ہے علیگڑھی رسالوں میں تازہ ترین اضافہ "انکار" کا ہے جی ہاں رسالے کا نام —— انکار ہے رسالے کے لئے یہ نام پسند فرمانے کی وجہ ادارئیے (حرفِ انکار) میں یہ بتائی گئی ہے:

"ہماری زندگی کے منتشر مظاہر میں معنی ڈھونڈنے کے عمل اور ان کے معمولاتِ زندگی بن جانے کے نتیجے میں ہمیں ضرورت ہے ایک بڑے انکار سے گزرنے کی جو کسی ٹھوس، توانا اور مستحکم اقرار کی بنیاد فراہم کر سکے۔"

رسالے کے مندرجات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں چونکا دینے والی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ایک عام ادبی رسالہ ہے جسے بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا۔ رسالے کی جان قرۃ العین حیدر کا سفرنامہ دکن ہے۔ یہ قرۃ العین کی تحریروں میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ اس میں دکن کے حال کے ساتھ ساتھ اس کا ماضی بھی نظر آتا ہے۔

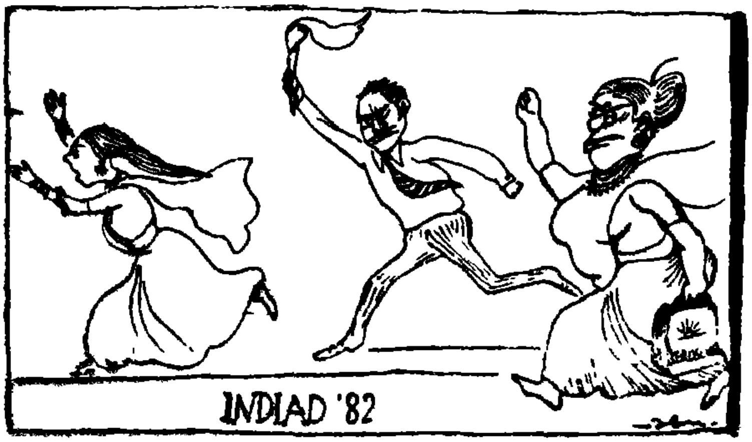
اس رسالے میں پڑھنے کے لئے اور بھی بہت کچھ ہے لیکن قابلِ ذکر تحریریں تین ہیں۔ ایک تو فہمیدہ ریاض کی نظم "شام کا منظر" جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ دھرتی میرے دل کی طرح ہے اور دل میں جہاں درد ہے، وہ میرا وطن ہے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے یہ بات اپنے سابقہ وطن کے بارے میں کہی ہے یا نئے وطن کے بارے میں۔ دوسری قابل





غریب عوام کی خدمت میں "آپو" کی سوغات


AKALIS vs THE CENTRE
WILL BE BACK AFTER ASIAD


INDIAD '82

انہوں نے غالب کی سوانح عمری کا شمار طبی کتابوں میں کیا ہے

ذکر تحریر شمیم حنفی کا مضمون ہے جس کا عنوان ہے "پاکستان کی شعری صورتِ حال"۔ یہ مضمون اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی موضوع پر ضروری معلومات حاصل کئے بغیر کوئی مضمون کس طرح لکھا جاتا ہے۔ پاکستان کی شعری صورتِ حال کے بارے میں ایسا مضحکہ خیز مضمون آج تک کسی پاکستانی نقاد نے بھی نہیں لکھا۔ اس میں جن پاکستانی شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے بیشتر خود پاکستان میں محتاجِ تعارف ہیں۔

اس رسالے کی تیسری تحریر وارث علوی کی کتاب "تیسرے درجے کا مسافر" پر تبصرہ ہے۔ اس تبصرے کا آخری پیراگراف ملاحظہ کیجئے، اس سے معلوم ہو جائے گا کہ پورے تبصرے میں کیا کچھ ہوگا۔

" . . . اس طرح کے ادیبوں اور بازیچوں پر جن میں وارث علوی بھی شامل ہیں، کا مجموعہ اردو بازاری (ادب) کے شائع کرنے پر قومی ملکیت کے اتلاف کے جرم کے تحت مقدمہ چلایا جائے لیکن اس سے خطرہ یہ ہے کہ سب سے کاتب، ناشر، پریس کا عملہ یا دانش گاہوں کے استاد بیکار ہو جائیں گے اور ملا دھے رو رو گاروں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا اس لئے وارث علوی کا یہ مجموعہ احتمالی مفادات کے پیشِ نظر معاف کر کے قارئین کرام کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ایک بار اس مجموعے کے مضامین ضرور پڑھ ڈالیں اور اگر چالیس روپے خرچ کر کے کتاب خرید بھی لیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ آپ یوں بھی بہت سے نیک و بد کام کے لئے چندہ دیتے ہیں نہیں جھجکتے۔ یہاں بھی ادب پر کچھ ایسا ہی وقت آن پڑا ہے لہٰذا ادب کو ترقی پسندی سے بچانے اور نئے ادب کے تحفظ کے لئے دل کھول کر اس کتاب کو خرید لیجئے۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔"

اس رسالے کے مدیر شہزاد منظر ہیں جو شمیم حنفی کے "ادبی ہم رتبہ" ہیں اور یہ رسالہ انھیں کے نام سے جاری کیا گیا ہے۔ شمیم حنفی "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" نامی کتاب کے مصنف ہیں اور اس کتاب پر وارث علوی نے ایک نہایت جارحانہ قسم کا طویل تبصرہ لکھا تھا، مذکورہ تبصرہ وارث علوی کے تبصرے کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

سیماب بنام ضیاء

حضرت سیماب اکبر آبادی مرحوم نے اپنے شاگرد ضیاء فتح آبادی کے نام جو خطوط لکھے تھے، ان کا مجموعہ حال ہی میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ خطوط بڑے دلچسپ ہیں۔ سیماب مرحوم اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے تھے اور لمبے احوال کی اصلاح کے لئے شاگردوں سے تحفے طلب فرمایا کرتے تھے۔ ان خطوں میں بعض خاص خاص شاگردوں (مثلاً ساغر نظامی) کے بارے میں خاصی سنسنی خیز معلومات ملتی ہیں۔ بعض مشاہیرِ ادب کے بارے میں کارآمد اطلاعات بھی موجود ہیں مثلاً ایک مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے سیماب کی کسی نظم پر کچھ اعتراضات کئے۔ سیماب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ضیاء کو لکھا:

"عبادت بریلوی اپنی ایک کتاب کی وجہ سے چل نکلے ہیں ورنہ ان میں تنقیدی صلاحیت مفقود ہے۔ مضحکہ اڑانے دیجیے۔ اس پر لوگ خوش ہو جاتے ہیں . . .

حقیقت یہ ہے کہ ان کے کسی اعتراض میں منطق جان نہیں"

عبادت صاحب کی نظر سے یہ اقتباس گزرے تو وہ آزردہ نہ ہوں۔ سیماب مرحوم کی رائے انھیں کے بارے میں نہیں۔ اپنے فرزند مظہر صدیقی کے بارے میں بھی کچھ ایسی ہی تھی مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ادبی پریس اور کتب خانہ بند کرنا پڑا۔ پورے پانچ سو کا نقصان ہوا۔ نقصان کیوں ہوا، یہ ایک طویل داستان ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مظہر نے ایک دم دماغی ہم دہاں سے اٹھانا شروع کیا مجھے گھر پر بٹھا دیا۔ کام نہ ہو سکا، اور کام خود آ نہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین چار مہینے اپنی جیب سے ۶۴ روپیہ مہینہ دیا اور بالآخر انھیں کی رائے سے پریس بند کر دیا۔ اب وہ معتوب ہیں لیکن بے کار۔ گھر پر رہتے ہیں لیکن غیر متعلق۔ ان کے کھانے پینے رہنے سہنے کا کفیل میں ہوں اور کام وہ ایسا کرتے ہیں۔ اس سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اپنی جیب میں رکھتے ہیں۔ ناشتہ ہوتا ہے سگریٹ پئے جاتے ہیں اور اطمینان و سکون کے ساتھ (بر عم خود) ادب کی خدمت فرمائی جا رہی ہے۔ بے حمیتی اور بے غیرتی کی یہ ایک ناقابلِ نظیر مثال ہے۔"

بدلتے چہرے

عموماً یہ ہوتا ہے کہ جب اہلِ قلم کوئی کتاب شائع کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ایک رد شیر بھی چھاپ دیتے ہیں تاکہ جو لوگ کتاب نہ خرید سکیں۔ وہ رد شیر مفت حاصل کر کے مصنف اور مصنف کے درجات کی بلندی سے واقف ہو جائیں۔ منظر علی خان منظر کی کتاب "بدلتے چہرے" اور اس کا رد شیر دونوں ہمیں مفت ملے ہیں۔ اس لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کتاب کی وجہ سے رد شیر چھاپا گیا ہے یا رد شیر کی وجہ سے کتاب شائع کی گئی ہے۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لئے ہم نے کتاب اور رد شیر دونوں کو پڑھا۔ عمرِ عزیز کا ایک حصہ ہم نے اسی طرح سے ضائع کیا ہے۔ اگر منظر صاحب کے لئے کچھ وقت ضائع ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے خوشی کی بات ہے کہ وقت ہمارا ہی ضائع ہوا۔ منظر صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے لاجواب کتاب لکھی ہے اور بے مثال رد شیر شائع کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دونوں کو پڑھنے کے بعد بھی اصل مسئلہ اپنی جگہ موجود رہا اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کتاب اور رد شیر میں سے کون سی چیز بنائے فساد ہے۔

کتاب میں کچھ طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہیں اور کچھ سنجیدہ لیکن مزاح اور سنجیدگی میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے اس لئے کہ منظر صاحب کا مزاج سنجیدہ اور سنجیدگی پر مزاح ہوتی ہے۔ پڑھتے وقت کبھی پیٹ میں بل پڑتے ہیں اور کبھی ماتھے پر۔

عام طور پر جو رد شیر چھاپے جاتے ہیں ان میں اشتہار کے سوا کچھ نہیں ہوتا کچھ اشتہار تجارتی اداروں کے ہوتے ہیں اور کچھ مصنف کے اپنے، جن میں اسے عظیم فنکار ثابت کیا جاتا ہے مثلاً ایک صاحب نے منظر صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ وہ پہلے شعر کہتے تھے اب نثر بھی لکھتے ہیں۔ اس سے نثر کا بھلا ہو نہ ہو شاعری کا بھلا ضرور ہوا ہے۔ دوسرے صاحب لکھتے ہیں منظر صاحب نے اپنی عبارت میں مرکبات کو چابکدستی سے برتا ہے اور مجازِ مرسل سے کام نکالا ہے۔ "مرکبات" والی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ "مفردات" کی طرح ایک طبی اصطلاح ہے لیکن مجازِ مرسل سے کام نکالنا واقعی بہت بڑا کارنامہ ہے۔

اس پر ہم منظر صاحب کو تہہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اس کارنامہ پر انھیں ماسٹر رگلڈ کا آدم جی انعام مل جائے کہ انعامات ایسے ہی کارناموں پر ملا کرتے ہیں

انہوں نے ایک مطبوعہ مقالہ کو نقل کیا اور اسے

پی ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کرلی

آجکل ہندوستان کے کئی ادیب کراچی میں موجود ہیں ان میں بعض خاصے معروف ہیں جیسے نکیل اسا، بعض کم معروف ہیں جیسے حسن الدین احمد اور بعض بالکل غیر معروف جیسے ڈاکٹر رندی، گزشتہ ہفتے بعض مہمان ادیبوں کو ایک استقبالیہ دیا گیا تھا، اس میں ڈاکٹر رندی بھی شریک تھے، استقبالیہ میں جو تقریریں ہوئیں ان میں ڈاکٹر صاحب کا پورا نام بتایا گیا نہ ان کی کسی کتاب کا حوالہ دیا گیا۔ بس یہ کہا گیا کہ بڑے عالم فاضل آدمی ہیں۔ بعض دوستوں نے ہم سے پوچھا ہے کہ ڈاکٹر رندی کون ہیں، ہم خود کچھ نہیں جانتے تو انہیں کیا بتائیں؟

ہاں ہم نے ڈاکٹر سید محمد علی رندی نامی ایک ہندوستانی ادیب کا نام ضرور سنا ہے اور ان کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ انہوں نے داغ پر تحقیقی کام کیا تھا اور ان کا مقالہ "مطالعۂ داغ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس مقالے پر انہیں راجستھان یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔ جب یہ تحقیقی مقالہ شائع ہو گیا تو معلوم ہوا کہ معاملہ تحقیق مزید کا محتاج ہے۔

"مطالعۂ داغ" پر پی ایچ ڈی ۱۹۷ء میں ملی اور یہ مقالہ ۱۹۷۴ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "مطالعۂ امیر" کے نام سے شائع ہو چکا تھا جس میں انہوں نے امیر مینائی کی شخصیت اور شاعری کو موضوع ... "مطالعۂ داغ" اور "مطالعۂ امیر" کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر رندی نے ڈاکٹر سحر کے مقالے کو لفظ بلفظ اپنا لیا ہے۔ بس یہ کیا ہے کہ جہاں کہیں امیر کا نام آیا ہے وہاں داغ کا نام درج کر دیا ہے۔ حالات زندگی اور تصانیف والے ابواب کو ازسرنو لکھ ڈالا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

دونوں مقالوں کی ترتیب و تنظیم یکساں ہے، عنوانات ایک سے ہیں۔ تمہیدی مباحث مشترک ہیں۔ بس اتنی زحمت کی گئی ہے کہ جہاں امیر کا شعر تھا، وہاں داغ کا شعر درج کیا ہے اس کاریگری کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بطور نمونہ ایک مثال ملاحظہ کیجئے۔

"مطالعۂ امیر"

بادہ و ساغر کے مضامین کی غزل میں ایک مستقل جگہ ہے ان میں کبھی رندی و سرمستی کی اصل کیفیات بیان کی جاتی ہیں، اور کبھی ان کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کی جاتی ہے لیکن بعض شعراء نے خمریات کو ایک رنگ کی حیثیت سے اپنایا ہے اور باوجود اس کے کہ ان کی شراب نوشی کے متعلق کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا۔ اس میں خاصے کامیاب ہوئے ہیں۔ بڑی حد تک شراب اور اس کے متعلقات کا بیان علامتی حیثیت رکھتا ہے جس طرح تصوف و آشتاں کے مضامین لکھنے کے لئے شاعر کا پیر ہونا ضروری نہیں، اسی طرح رندانہ مضامین کو نظم کرنے کے لئے شرابی ہونا بھی لازمی نہیں۔ امیر نے مسائل حق کی گفتگو کیلئے اس رنگ کو بڑی کامیابی سے اپنایا ہے۔ یوں تو ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کو معمولی شغل مے و مینا تک محدود رکھ کر بھی پورا لطف لیا جا سکتا ہے مثلاً

بے گل رنگ نہیں ہے اے امیر
دہن شیشہ لعل اگلتا ہے

(مطالعۂ امیر ص ۱۸۹)

مطالعۂ داغ

اردو غزل میں بادہ و ساغر کے مضامین کی بھی بہت سی صورتیں ہیں، کبھی ان کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کی جاتی ہے اور کبھی محض رندی و سرمستی کی کیفیات کو بیان کیا جاتا ہے لیکن بعض شعراء نے خمریات کو ایک رنگ کی حیثیت سے اپنا کر اسے برتنے میں کمال حاصل کیا ہے۔ ... دراصل شراب اور متعلقات شراب کا بیان ایک علامتی حیثیت رکھتا ہے جس طرح مسائل تصوف یا تصوف و آشتیاں کے مضامین نظم کرنے کے لئے شاعر کا صوفی یا پیر ہونا ضروری نہیں، داغ کی خمریات بھی اسی ضمن میں آتی ہیں ... داغ نے بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو نہیں کی ہے بلکہ اس کو شغل مے و مینا تک ہی محدود رکھا ہے ... مثلاً

روح کس مست کی پیاسی گئی مے خانے سے
مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

(مطالعۂ داغ، ص ۱۶-۲۱۵)

مذکورہ دونوں اقتباسات سے آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر رندی نے ڈاکٹر سحر سے کس دیدہ دلیرانہ انداز میں استفادہ کیا ہے۔

بعض لوگ پوچھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر رندی نے یہ کام ہتھیلی پر چراغ رکھ کر کیوں کیا، مقالے پر ڈگری مل گئی تھی تو اسی پر قناعت کرتے، مقالے کو چھپوانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ راز جلد ہی فاش ہو جائے گا، کیونکہ ڈاکٹر سحر بھی زندہ ہیں اور ان کی کتاب بھی نایاب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے ایک رسالے میں شائع شدہ مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر رندی بیچارے اپنی سادگی اور معصومیت کی وجہ سے مارے گئے۔ انہیں اپنی کتاب کے چھپنے تک معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ان کی کتاب کسی اور کتاب کی نقل ہے ان کا تو صرف اتنا ہے کہ انہوں نے کسی صاحب سے اجرت پر مقالہ لکھوایا اور ان صاحب نے ڈاکٹر سحر کے مقالے کو سامنے رکھ کر ایک "نیا" مقالہ لکھ دیا۔ ڈاکٹر رندی کے ممتحن پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر احتشام حسین مرحوم تھے۔ ڈاکٹر سحر کی کتاب مطبوعہ ہونے کے باوجود ان کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس لئے انہوں نے سفارش کر دی کہ ڈاکٹر رندی کو ڈگری دے دی جائے۔

یہ کہانی ہم نے اس لئے بیان کی ہے کہ عام لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یونیورسٹیوں میں تحقیق کس طرح ہوتی ہے اور چراغ سے چراغ کس طرح جلتا ہے۔

لفظوں کا آدمی

دوسرے ہندوستانی مہمان حسن الدین احمد ہیں یہ پڑھے لکھے آدمی ہیں ان کی کتاب "الفاظ شماری" خاصی مشہور ہے۔ ہندوستان میں امیر خسرو کی سات سو سالہ قومی تقاریب کی مرکزی کمیٹی کے جنرل سیکرٹری بھی یہی صاحب تھے ہم نے ان کی کتاب دیکھی ہے۔ یہ اتنی ضخیم ہے کہ اسے بطور آلۂ ضرب و حرب بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حسن الدین احمد صاحب کے بارے میں ہم جو کچھ جانتے ہیں، وہ ہندوستانی مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے حوالے سے جانتے ہیں۔ مجتبیٰ صاحب نے موصوف کا شخصی خاکہ "لفظوں کا آدمی" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس خاکے کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ اس سے آپ کو حسن الدین احمد کی شخصیت کا بھرپور اندازہ ہو جائے گا۔

"میں نے ان سے اپنی ملاقات کو دو ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک دور خسروی اور دوسرا دور الفاظ شماری۔ مؤخر الذکر دور میں وہ الفاظ شماری کے مختلف اسرار و رموز سے مجھے واقف کرا رہے تھے جو ہر بڑی کا موضوع ہے۔ دوسرا ایک کہ الفاظ شماری کے دام میں گرفتار کرانا چاہتے تھے جب بھی ملاقات ہوتی الفاظ شماری کے فوائد بیان کرنے لگ جاتے۔ ایک دن، میں نے کہا ایک اصاغت سے الفاظ شماری دراصل لفظوں کی مردم شماری ہے یعنی ایک ایک لفظ کو گن گنے چلے جاتے۔ میری بات کو سن کر انہوں نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ کس احمق سے

پالا پڑتا ہے کہ اچھا بھلا کام کو مردم بیزاری سے چلا جاتا ہے
میں اور مجھے درست تراکیب کے دعاؤں پر اعتماد
ہماری کچھ اس طرح بحالی ہوتی تھی کہ لگتا تھا کہ تم بھی ایک دن
لغو ہی الفاظ بن کر رہ جاؤ گے۔ انہی دنوں میرے مزاحیہ
مضامین کا تیسرا مجموعہ "حقہ مختصر" چھپ کر آیا تو میں نے
اس کا نسخہ حسن الدین احمد صاحب کو دیا۔ سوچا تھا کہ دوسرے
دن وہ ملیں گے تو میری مزاح نگاری کے بارے میں ضرور
اظہار خیال کریں گے مگر دوسرے دن ملتے ہی کہنے لگے
میں نے آپ کی کتاب کل رات پڑھی۔ دیکھا یہ ہے کہ آپ
اپنی تحریر میں "لہٰذا" اور "البتہ" کا زیادہ استعمال کرتے ہیں
رحم دلی کرکے دو فقروں بالی ٹوکا۔ بس میں نے منع کر
کہا "یہ تو ہے آپ میری کتاب ... جیسے ... بات ... الفاظ
شماری کرتے رہے" کہنے لگے "دراصل کا ذکر بار بار میں
نے کیا کہ البتہ کا استعمال اس لیے کیا ... البتہ کا
لفظ مجھے پسند ہے۔ البتہ میں ... کی
استعمال میں کر رہا البتہ یہاں البتہ کی ضرورت نہیں ہے
ومیں البتہ کو مضموں میں شامل رکھتا ہوں۔ البتہ میں آپ
سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بادجود ان الفتوں کے میرے
مضامین آپ کو کیسے لگے"
کہنے لگے "آپ کے مضامین سے جب سے آپ البتہ
ان میں کم لکھنے لگے ہیں لگتے ہیں"

احمد ہمیش توجہ فرمائیں

محض حسن کا ذکر چلا ہے تو سا کے حوالے سے

ایک پاکستانی ادیب کا تذکرہ بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں
رسالہ "امی نعوی" سہ ماہی کے مشہور مزاحیہ شاعر ہیں ... نے
خاکے میں کچھ یوں لکھے ہیں
"ان دنوں حیدرآباد دکن میں ایک مزاحیہ شاعر رہتے
تھے۔ جدید شاعری اور افسانہ نگاری میں آج بھی وہ ایک
اہم شخصیت کے مالک ہیں مگر اب پاکستان چلے گئے ہیں۔ ان
کی جوانی بھی کچھ سی شاعری کرتے تھے دیسا ہی اسے آپ کو
رکھتے تھے حالانکہ شاعر کے قول اور فعل میں کوئی مطابقت نہیں
ہوتی کبھی کبھی دو دن غسل نہیں فرماتے تھے۔ ہر دھوپ تیز کھا
کھا لیتے تھے۔ کپڑوں کو دیکھئے تو لگتا تھا پہننے کے لحاظ سے تعلق
ہیں۔ واہی صاحب کی ان سے حیدرآباد میں ملاقات ہوگئی
اب واہی صاحب نے ان میں دلچسپی لینی شروع کی تو ہم سب
حیران کہ واہی صاحب کو جدید شاعری سے اتنا دلچسپ لگاؤ
کیونکر ہوگیا۔ سارا سارا دن اپنے "موضوعِ بحث" کو ساتھ لئے
مارے مارے پھرتے۔ ایک دن مہمانِ خصوصی ہوگئی تو عرض کیا ...
... شہر میں لوگ آپ کے لئے پریشان ہو رہے گے واہی
کا کیا ارادہ ہے؟ فرمایا۔ آپ کے شاعر دوست کو غسل
کرنے کے لئے راضی کر رہا ہوں، جیسے ہی غسل کیا یہ معرکہ
ہو جائے گی، میں اس فرض سے سبکدوش ہو کر شہر واپس
چلا جاؤں گا۔ چنانچہ واہی صاحب کے مہم معاصروں کے بعد
موضوعِ بحث غسل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر یہ ... کوئی
معمولی غسل نہیں تھا اس کے لئے ایک باضابطہ تقریب منعقد
کی گئی۔ واہی صاحب مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اس میں
شریک ہوتے بلکہ انھوں نے ہی بال کا پہلا لوٹا موضوع

بحث کے سر پر ڈال کر غسل کا باضابطہ افتتاح فرمایا۔ اس کے
بعد کا سارا کام عقیدت مندوں نے انجام دیا۔ موضوعِ شاعر کو خوب رگڑ
رگڑ کر نہلایا گیا۔ کسی نے واہی صاحب کو سمجھایا کہ اُجلے کو
چاہے آپ کتنا ہی نہلائیں، وہ اُجلا ہی رہے گا۔ مگر واہی
صاحب ارادے کے ایسے پکے نکلے کہ شاعر کو نہلا کر ہی دم لیا
مزاحیہ شاعر کے جو ستو تیں لگائی گئیں۔ اس سے کپڑے بس سے
گئے۔ مزاحیہ شاعر کے غسل کی تقریب کے بعد واہی صاحب نے
اطمینان کا لمبا سانس لیا اور کہا۔ "اب یوں لگتا ہے جیسے
میں نے گنگا نہالی ہے۔ اب میں پیشہ جاؤں گا۔ تاہم مجھے،
اطلاع دیتے رہنا کہ اس غسل کے بعد ان کی شاعری اور
افسانہ نگاری میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔"
اس اقتباس میں جس جدید پاکستانی افسانہ نگار اور
شاعر کا ذکر ہے کوشش کے باوجود ہمیں اس کا نام معلوم نہیں
ہوسکا۔ جدید افسانہ نگاروں کی فہرست دیکھی تو اس میں کوئی
ایسا شخص نظر نہ آیا جو شعر بھی کہتا ہو اور حیدرآباد دکن میں
واہی صاحب کے ہاتھوں گنگا بھی نہایا ہو۔ اگر احمد ہمیش صاحب
اس سلسلے میں رہنمائی فرمائیں تو شاید معمہ حل ہو جائے، بس
یہ جن دنوں میں مذکورہ واقعہ پیش آیا تھا، ہمیش صاحب
حیدرآباد دکن ہی میں تھے۔

(بقیہ میراجی کی محبتیں)

دیکھتا دنیا اسے مجنوں، رانجھا، مہینوال والا
لائن میں کس طرح کھڑا نہ کرتی۔ اس کی زندگی
فلمیں کس طرح نہ بنتیں اور اگر شاعری کی طرف
آیا تھا تو محض حلقۂ ارباب ذوق قائم کر دینے
کو ہی شاعری نہ سمجھتا بلکہ باقاعدہ شعر کہتا
پھر دیکھتا پبلک اسے کیسے نہ غالبؔ، میرؔ
طرح پسند کرتی، پھر وہ اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ
ساحرؔ، ندیمؔ، قتیلؔ، اختر شیرانی کی طرح
گھر گھر کیسے نہ پڑھا جاتا۔ اب اس کے حوار
بیچارے مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ انہیں
اسے شاعر ثابت کرنے کے لیے ایڑی سے
تک کا زور لگانا پڑ رہا ہے۔ مگر کیا کریں
میں رتی بھر جان نہ ہو اس کو بیروں پر کھڑا
کرنے کے لیے کوئی کہاں تک مونڈھ اور لے سکتا
اگر یہ واقعی شاعر ہوتا تو آج تک اس پر
کے بیچاروں نے جتنے مضامین لکھے ہیں ان
سے زیادہ پڑھا جا رہا ہوتا۔



– Five Star hotel

One Star hotel

دکھ کی پیاس

آغا سہیل

یہ میرا نیا پڑوس تھا اور نیا مکان۔

گو ہم مکانوں کی قلت کے دور سے گزر گئے ہیں پھر بھی ملک کے شہر شہر گھوم کر دیکھیے۔ نت نئے مکانات اگ رہے ہیں۔ بستیاں لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کے مانند زمین سے پھوٹ رہی ہیں۔ فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ کاریں اور موٹر سائیکلیں تو برساتی مینڈکوں کی طرح زمین سے ابل رہی ہیں۔ کیونکہ یہ صنعتی دور ہے اور صنعتیں اس تیزی سے وبا کی طرح پھوٹ پڑی ہیں کہ زراعت بھی صنعت بنتی جا رہی ہے۔ ایک سال پہلے جہاں سچ مچ کے کھیت اور کشت زار نظر آتے تھے، اب وہاں کالونیاں سر بفلک بلڈنگیں اور فلیٹس زمین میں پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ بس ایک ایسی ہی بستی کا یہ نیا مکان تھا اور نیا پڑوس۔

پڑوس سے آپ کو کہیں پرانے محلوں، پرانی بستیوں کے پڑوس کا تصور نہ گزرے کہ دیوار سے دیوار جڑی ہوئی۔ کھڑکیاں دیواروں میں کھلی ہوئی یا چھجے دو مکانوں کو جوڑے ہوئے، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سالہا سال سے ساتھ نبھاتے چلے آ رہے ہیں۔ اور مکانوں کی طرح مکین بھی دلوں کے رشتوں میں بندھے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک، بدن میں دوڑتی ہوئی رگوں میں گردش کرنے والے خون کی طرح گھوم پھر کر ایک ہی مرکز پر لوٹ لوٹ کر آ جاتے ہیں۔ اور وہ مرکز ہے دل۔ ان بستیوں میں نہ کھڑکیاں ہیں نہ چھجے اور نہ پڑوسیوں میں کوئی ناطہ ہے نہ رشتہ۔ یہ مکان اور مکین سب کے سب مشینوں کی طرح بے جان، بے حس صنعتی معاشرے کے ہیں۔ جو اقتصادی تحریک پر گردش کرتے ہیں۔ اور تحریک میں ذرا بھی تعطل پیدا پیدا ہو جائے تو خود بھی معطل ہو جاتے ہیں۔

میں اس نئے مکان میں آ بسا۔ یا یوں کہیے کہ میری روزی نے اس جگہ کھینچ کر لا باندھا اور میں بندھ گیا۔

اس مکان سے میرا کوئی آبائی رشتہ نہیں ہے۔ میرا کوئی ثقافتی رشتہ بھی نہیں ہے۔ کہنے کو تو یہ مکان ہے لیکن اگر سچ پوچھیے تو اس میں مکانوں والی کوئی بات موجود نہیں ہے۔ نہ مٹی نہ درخت نہ کوٹھا نہ چوبارہ، نہ باغ نہ چمن۔ بس سیمنٹ کی چار دیواری ہے۔ نیچے فرش اوپر چھت یا چھت سے لٹکتا پنکھا۔ پہلو میں غسل خانہ، سنگ مرمر کا ٹھنڈا بے مروت فرش۔ سپید سنکس لگی شدہ چمچاتی ٹونٹیاں، کنگھے، تیونگ کا سامان، شیمپو اور کاسمیٹکس، گویا صنعت، صنعت اور صرف صنعت اور اس کے درمیان ایک جسد خاکی۔ خاکی، کیا سچ مچ خاکی؟ مجھے شبہ ہوتا کہ شائد میں بھی کسی فیکٹری سے ڈھلا ڈھلایا نکلا ہوا کوئی پرزہ ہوں اور اس مکان میں (اگر یہ واقعی مکان ہے) کہیں نہ کہیں پر فٹ ہو گیا ہوں۔

تو یہ میرا نیا پڑوس۔ یہ بھی ایک ایسا ہی فلیٹ ہے۔ فرق یہ ہے کہ ادھر جو مکین ہے وہ کوئی مرد نہیں لڑکی ہے اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ ہمارے مابین نہیں ہے۔ وہ اپنے حالات میں مگن ہے یا مجبوراً حالات کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے اور میں ادھر اقتصادی ڈور سے بندھا ہوا اپنے مختصر سے فلیٹ میں گزارا کر رہا ہوں۔ وہ اُدھر تنہا ہے میں اِدھر تنہا ہوں۔ ہم نے تنہائی میں اکثر اپنی تنہائی پر کافی سوچا ہے اور ایک دوسرے کی تنہائی کے بارے میں بھی چوری چوری خوب سوچا ہے۔ ہماری تنہائیوں نے سوچوں کے حرم میں نقبیں لگائی ہیں۔ اور پھر چپکے چپکے ان دیواروں کے سوراخ بھر دیئے ہیں۔ کیونکہ ہمارا اقتصادی ڈھانچہ مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ نازک ہے۔ ذرا سی پھونک یا تپش سے بھی ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے۔

وہ کہاں ملازم ہے؟ مجھے خبر نہیں۔ میں کیا کام کرتا ہوں، اسے علم نہیں۔ وہ کون ہے؟ کب سے رہتی ہے؟ کب تک رہے گی؟ مجھے معلوم نہیں بلکہ ان میں سے بعض باتوں کا اسے بھی علم نہیں کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ یہاں کب سے رہتا ہوں اور کب تک رہوں گا؟ ہمیں کیوں معلوم نہیں؟ شائد ہم دونوں کے پاس ان باتوں کے جاننے کے لئے وقت نہیں اور اگر وقت نکال بھی لیا جائے تو شائد مناسب نہیں۔ کیونکہ ہم جس معاشرے میں سانس لیتے ہیں وہاں کسی بات پر اعتبار



ہیں۔ سائے تک پر شبہ کیا جاتا ہے۔ اور ہم اپنے سائے تک سے ڈرتے ہیں۔ ڈرتے نہ ہوتے تو وہ میرے پاس آتی یا میں اس کے پاس جاتا۔ ہم باہر والوں سے زیادہ اپنے آپ سے ڈرتے ہیں اپنے اندر سے ڈرتے ہیں۔ ہمارے اندر بیٹھی ہوئی ہماری نیت، ہماری کھوٹ ہمیں ڈراتی ہے۔ کبھی ہماری نگاہیں تک چار نہیں ہوسکیں۔ ہم دونوں نظریں چرا لیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کن انکھیوں سے گھورتے ہیں۔ میں اخبار پڑھتے پڑھتے بالکونی میں کھڑا ہو کر شیو بناتے ہوئے غسل خانے کی کھڑکی کھول کر اسے کام کاج کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں وہ بھی اپنے اپارٹمنٹ میں رہتے ہوئے چھوٹے موٹے کاموں کے مابین مجھے دیکھتی ہے۔ اور بس شاید اس بستی کے تمام لوگوں کے آپس کے رشتے ناطے میکانکی ہیں۔ ان میں جذبات کی کوئی لہر نہیں، کوئی رمق نہیں دودھ والا، اخبار والا، چائے والا ہیں اور ان سب سے ہمارے سب کے احتیاجی رشتے اللہ اللہ خیر سلا۔

میں نے کبھی کبھی یہ بھی غور کیا ہے کہ صنعتی زندگی کی جو عمارت اونچی اور اونچی ہوتی چلی جا رہی ہے اس سے ہماری نظریں چھوٹی ہوئی اونچی اور اونچی ہوتی آسمان تک جا پہنچی ہیں زمین سے ہمارا ناطہ روز بروز ٹوٹ رہا ہے۔ زمین پر مٹی، خاک دھول، ذرات، کاتیں، کھیتیاں، درخت سبھی کچھ تو ہوتے ہیں۔ اور ان سے ثقافتیں پھوٹتی ہیں۔ ہم جنم لیتے ہیں — موسموں کے گیت آبشاروں کی طرح ابلتے ہیں پھر یہی نہیں ہم بھی تو مٹی سے خمیر کی صورت میں اُٹھے ہیں۔ اور اسی میں جا ملیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا صنعتی زندگی ایک لعنت ہے۔ صنعت کو پنپنا چاہئے۔ مگر ہمارا ناطہ زمین سے قائم رہنا چاہئے۔ کالونیوں، در بستیوں میں رشتہ ہونا چاہئے۔ یہ رشتہ خواہ گیتوں کا ہو، رقص کا ہو۔ فنونِ لطیفہ کے دوسرے مظاہر کا ہو لیکن ہونا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے گاؤں سے پنگھٹ ختم ہو رہے ہیں۔ اور ٹیوب ویل لگتے جا رہے ہیں۔ کھیتیاں بھی صنعت بنتی جا رہی ہیں لیکن وہ جو پنگھٹ کے گیت کنواریوں کے دلوں کی دھڑکنیں سناتے تھے کہاں دفن ہو گئے ہیں؟ ان صنعتوں میں اجتماعی زندگی کے شعور کے ساتھ ساتھ اجتماعی جذبات بھی لاؤ ورنہ اس کارگاہ میں اتنی گھٹن ہو جائے گی کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو جائے گا۔

یہ لڑکی اپنے معمولات انجام دیتے دیتے ایک دم تیار ہو کر لباس بدل کر ایک دم باہر نکلتی ہے جہاں ایک ویَن آتی ہے اور اسے لے جاتی ہے پھر اسی طرح اسے اسی موڑ پر پھینک جاتی ہے۔ میں بھی اسی طرح اپنے معمولات میں جُٹا رہتا ہوں۔ کالونیوں میں بچے ہوتے ہیں۔ بچے نہ ہوں تو کالونیاں بانجھ ہو جاتیں مگر اس کالونی میں بچے بہت ہی کم ہیں۔ اور جو ہیں وہ صبح تڑکے اسکول چلے جاتے ہیں۔ سہ پہر کو لوٹتے ہیں تو تھکے ماندے اک ذرا کی ذرا کبھی گلیوں کوچوں میں کرکٹ کھیل کر تھوڑی سی زندگی کی حرارت پیدا کر دیتے ہیں یا کبھی سائیکلنگ کرکے یا تھوڑا سا غل شور مچا کر ورنہ ادھر سورج مغرب میں جھکا اور اُدھر ٹی وی کی بساط بچھی۔ اور بچے جوان بوڑھے سب کے سب جُٹ گئے۔ رات گئے تک یا ٹی وی ہے یا مطالعہ صبح تک خدا حافظ۔

میں بھی نہ چاہتے ہوئے بستر میں پڑے پڑے یا پڑھتا رہوں، ریڈیو سنوں، ٹی وی دیکھوں، اخبار پڑھوں، چائے پیوں، دوست احباب اوّل تو ہیں نہیں کوئی بھولا بھٹکا آ بھی جائے تو اس سے ذرا سی مغز پچی کر لوں۔ میرے پڑوس میں شام پڑتے ہی وہ سناٹا ہوتا ہے کہ الامان والحفیظ۔

ایسے ہی ایک دن کی بات ہے کہ میں اپنے کمرے میں پڑا تھا۔ کوئی کتاب کھلی ہوئی تھی کہ کسی سُریلی آواز نے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے نگاہ اُٹھائی تو سامنے ایک مرد پیکر جینز اور قمیض میں ملبوس بال کھلے سُلگتا ہوا سگریٹ انگلیوں میں دبا ہوا۔ میں بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ میں نے غیر ملکی ہپّیز لڑکیوں کو بہت دیکھا تھا۔ ہپّیز لڑکوں کو بھی دیکھا تھا لیکن پاکستانی ہپّیز لڑکیوں کو اس طرح دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا سنتا وہ خود بخود فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اور میرے شانے پر ایک مُکّا جماتے ہوئے بولی۔ "یار تم تو باوا بنے ہوئے ہو۔ لو سگریٹ پیو۔" قبل اس کے کہ میں انکار یا اقرار کروں، سگریٹ میرے ہونٹوں میں ٹھونس دیا۔

سُلگتے ہوئے سگریٹ سے سخت بدبو نکل رہی تھی۔ قریب تھا کہ مجھے اُلٹی ہو جائے مگر لڑکی آنکھیں بند کرکے اور سر نیہوڑا کر میرے بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ میں نے سگریٹ کو سونگھا اس میں یقیناً چرس بھری ہوئی تھی میں نے سگریٹ کو پھینکنے کے لئے ہاتھ بلند ہی کیا تھا کہ وہ کن انکھیوں سے دیکھ کر مجھے مسکرائی اور اشارے سے سگریٹ واپس مانگ لیا۔ اور اس کے خوب گہرے گہرے کش لگانے لگی۔ میں اس صورت حال سے خاصا پریشان تھا کہ یہ بلائے بے درماں کہاں سے آن ٹپکی۔ ابھی میری سراسیمگی کم نہیں ہوئی تھی کہ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "جاؤ گلاس لاؤ۔"

میں ٹھٹھک کر سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس میں میری ذرا بھی مرضی نہیں ہے لیکن یہ سب کچھ میرے گھر میں ہو رہا ہے۔ اس نے فہمائشی انداز میں کہا۔ "ہری اپ یو سلی بوائے۔"

اور میں مسمریزم کی کسی خفیہ قوت کے تحت غسل خانے میں گیا اور گلاس اُٹھا لایا۔ اس نے بستر پر پڑے پڑے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "ایک گلاس اور لاؤ۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے جواباً کہا، "بس یہی ایک ہے اکلوتا گلاس۔"

وہ ہنسی اور سگریٹ کو احتیاط سے بجھا کر کان کے پیچھے اُڑستے ہوئے بولی۔ "سو یو آر آل الون پر؟"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ وہ اٹھی تھیلے سے برانڈی نکال لائی اور بے تکلفی سے گلاس میں انڈیلنے لگی۔ "تم مجھ کو جانتے ہو؟"

میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"اور اگر تم جانتے بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ جانتے بھی ہو، تو نہیں جانتے، کوئی نہیں جانتا، یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ سب اجنبی ہیں۔ لو اسے پی لو۔ اسے پی کر تم خود کو جان لوگے۔ خود کو جان لینا بھی تو کمال ہے۔"

میں نے پھر انکار میں گردن ہلا دی۔

"اوہ کم آن ڈارلنگ" بولتے "یہ شراب ہے۔ یہ تو کیمیائے سعادت ہے۔ رگوں میں دوڑ جائے گی۔ لو...." اس نے ایک جرعہ چڑھا لیا۔

پھر میرے حلق کو کاٹتی ہوئی کوئی تے سینے میں اتر گئی۔ دوسرا جرعہ اس نے خود چڑھایا اور پھر تیسرا مجھے دیا اور اس طرح جب ساری بوتل خالی ہو گئی۔

مُکا تان کر بولی "میں تمہاری پسلیاں توڑ دوں گی۔ کیا سمجھتے ہو؟ میں تمہاری نیت سمجھتی ہوں۔ بدمعاش"

میں ہکا بکا اسے دیکھنے لگا کہ یہ اچانک کیا ہوا۔ یا اللہ یہ کوئی نوسرباز تو نہیں۔ مجھے لوٹنے تو نہیں آ گئی۔ پھر سوچا کہ میرے پلے ہے ہی کیا۔ ساتھ ہی سوچا کہ اگر وہ بلیک میل کر کے مجھ سے کچھ اینٹھنا چاہے تو کیا ہوگا۔ بہرحال ہرچہ باداباد اب تو میری گردن اوکھلی میں پھنسی ہوئی تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا میں گھگھیانے لگا "میں۔ میں"

"سوٴر کے بچے پہلے بھی کتنی بار تم میری عزت سے کھیلتے رہے ہو"

"میں؟ میں؟؟؟" اب تو میں سچ مچ حیران رہ گیا۔ یا اللہ! اس عورت کو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے اور یہ اتنی بڑی تہمت مجھ پر دھر رہی ہے۔

"ہرگز نہیں، قطعی نہیں" میں لوکھلا گیا۔ "دیکھئے دیکھئے۔ میں تو.. میں تو ایک شریف آدمی ہوں"

"شریف آدمی: بڑا آیا شریف آدمی بن کر مجھے دھوکے سے شراب پلا کر رات بھر میری عزت سے کھیلا اور جب میں ماں بننے لگی تو اس مردود نے آپریشن کر کے مجھے ہمیشہ کے لئے بانجھ بنا دیا۔ میں تجھے معاف نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں کر سکتی" یہ کہہ کر اس نے پتھر کا گلدان اٹھا لیا اور قریب تھا کہ میرے سر پر دے مارتی کہ میں نے پھرتی سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر سے دروازہ بولٹ کر کے لاک کر دیا۔

بالکونی میں کھڑے ہو کر میں تمام صورتحال پر غور کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ میں نے دیکھا میری پڑوسن بھی اپنی بالکونی میں کھڑی ہو کر میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن میرے کان اندر کی طرف لگے تھے۔ اندر وہ دروازہ ہلا ہلا کر چیخ رہی تھی اور پھر تھک ہار کر وہ رونے لگی۔ ہچکیوں میں صرف اتنا سنائی دیا۔ "اوہ پلیز اگیوی اسے بیبی"

●●

بقیہ سفالِ ہند کے مینا و جام

خزانوں کے منہ کھل جاتے ہیں۔ روپیہ پانی کی طرح بہتا ہے۔ روپیہ تو اپنے ہی ٹکسال کا بنا ہوا ہوتا ہے لیکن کہاں سے آتا ہے اور کتنا آتا ہے کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے غریب امیر بن جاتے ہیں۔ اور رنک ونیتا بن جاتے ہیں۔

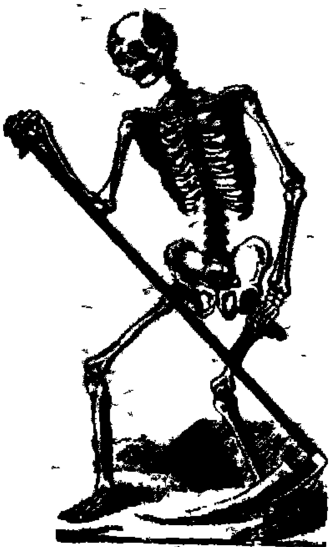
ابھی پچھلے دنوں بھارت کی چار ریاستوں میں ایک ہی دربار لگا تھا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کھیل تو ہریانہ میں ہوا۔ یہاں دھرتی کے دو لال (یا لعل) ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔ لالوں کی اس لڑائی میں ایک لال قدرے غالب آیا اور اپنے حواریوں کی اپنے کھیت گھر (FARM HOUSE) میں خاطر تواضع کا انتظام کیا۔ ایک حواری کو تو اس کی بیوی سے سب کے سامنے بھی بات تک کرنے نہ دی۔ یہ لال اسی خاطر تواضع میں لگے رہے کہ دوسرے لال نے بھجن منڈلی سجالی۔ اسی گہما گہمی میں بی جمہوریت کا اغوا ہو گیا۔ پہلے لعل ہاتھ ملتے رہنے کے بجائے پنڈت جی پر برس پڑے۔ لیکن اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ کھیت گھر کی سیاست دھری کی دھری رہ گئی۔

سبق اس کا یہ ہے کہ اب جمہوریت ہمارے گھر کی لونڈی ہے! موم کی ناک ہے جس طرف چاہو موڑ لو۔

ایک اور فرنگن بھی ہمارے دیس میں آئی۔ اس کا نام ہے صحافت۔ فرنگ میں چونکہ ایک مرد ایک ہی عورت کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہاں صحافت اور جمہوریت سہیلیاں بنی رہیں۔ اور ایک دوسری کے حقوق کی حفاظت کرتی رہیں۔ لیکن ہمارے دیس میں نہ صرف ایک سے زیادہ شادیوں کا رواج ہے بلکہ تیسری قرار والی داشتائیں بھی جائز ہیں۔ تو یہاں آ کر جمہوریت اور صحافت ایک دوسرے کی سوکنیں بن گئیں۔ اور دونوں میں روز روز کے جھگڑے۔ سوتاپے۔ جلاپے وغیرہ سب کا دور دورہ ہے۔ اور یہ دونوں بی بیاں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہیں۔ دونوں کی جنگ آج کل بڑے زوروں پر ہے ایک کی چوٹی دوسری کے ہاتھ ہے۔ ننگی کا یہ ناچ بہار میں شروع ہوا اور سارے بھارت میں اس کی نمائش زوروں پر ہے۔ ہر جگہ ہو نٹل چل رہی ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے فرزندانِ صحافت نے دلی پریس کلب سے بوٹ کلب تک جلوس بھی نکال دیا۔ غنیمت کہ فرزندانِ جمہوریت پٹھنر کی طرح لاٹھیاں لے کر ان پر نازل نہیں ہوئے۔ دیکھیں فرزندانِ جمہوریت اور فرزندانِ صحافت کی یہ جنگ کیا رنگ لاتی ہے۔

بجھتے ہیں چراغ

شہناز پروین



میرے چاروں طرف کفن پہنے ہوئے لوگ ہیں، میں ان کے درمیان ڈری سہمی بیٹھی ہوں۔ خود سے کفن پہننے والوں کے چہروں پر اتنی مایوسی تو نہیں ہوتی، پھر یہ لوگ تو ہر سال سر سے کفن باندھ کر آج کے دن یونہی نکلا کرتے تھے۔ ان کے چہروں پر عزم اور حوصلے کی روشنیاں ہوتی تھیں مگر آج یہ لوگ مرگھٹ دل اور افسردہ کیوں ہیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

" امی امی —" میری ننھی سی بچی بھاگی ہوئی آتی ہے۔ "جشنِ آزادی کیسے کہتے ہیں ؟"

میں اس کے سوال کا جواب نہیں دے پاتی نہیں دے سکتی، میں نے آزادی دیکھی ہی نہیں ہے۔ یہ لفظ محض کتابوں میں پڑھا ہے، وہ دوبارہ پوچھتی ہے۔

"اس بار ہر طرف جشن منایا جا رہا ہے، امی ہم بھی منائیں گے نا ۔ ؟"

میں اپنے سامنے کفن میں لپٹے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھتی ہوں اور کانپ جاتی ہوں۔ میں اپنی بچی کو کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں کہ یہ لوگ جنھوں نے اپنے جسموں پر پرچم کا کفن سجایا ہے جشن ہی تو منا رہے ہیں۔ وحشی اور جنگلی لوگ اپنی موت کا بھی جشن مناتے ہیں۔

میری بچی مجھ سے روٹھ جاتی ہے۔

" امی آپ تو کسی بات کا جواب نہیں دیتیں، ہمارا ملک کہاں ہے ؟ ہم کب اپنے وطن جائیں گے، ہم بھی ان کے ساتھ آزادی کا جشن منانا چاہتے ہیں"

میں اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیتی ہوں اور خیالوں میں جشن دیکھتی ہوں۔ جب تک ہماری آنکھوں میں انتظار کے چراغ جل رہے ہیں، ہمارے دلوں میں اُمید کے دیئے روشن ہیں، ہم جشن ضرور منائیں گے، چاہے اس کے لئے ہمیں بڑی سے بڑی قربانی دینا پڑے۔ میں نے آزادی نہیں دیکھی مگر قربانیاں بہت دیکھی ہیں۔ سُنا ہے آزادی اور قربانی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ہمارے اگلوں نے بھی قربانی دے کر آزادی حاصل کی تھی۔ آزادی کی سزا بھی ملتی ہے۔ میں اپنے آپ سے سوال کرتی ہوں اور پھر کانپ جاتی ہوں۔

" نہ جاؤ میرے بھائی نہ جاؤ، تم قومی پرچم کی حفاظت کرو گے نا۔ تم اسے لپیٹ کر کہاں جا رہے ہو؟" میں جانے والوں میں سے ایک کا ہاتھ تھام کر رو پڑتی ہوں۔

"ہمیں نہ روکو اس سال بھی ہم اپنا حق مانگیں گے کھلی فضا میں سانس لینے کا حق، ہم نے سُنا ہے ہمارے ملک میں دھوم دھام سے آزادی کا دن منایا جا رہا ہے۔ ہم نے بہت خواب دیکھ لئے اب ہم اس کی تعبیر دیکھیں گے، اس سال ہم بھی جشن منائیں گے اور دھوم دھام سے منائیں گے"

اس کے چہرے پر مجھے وہ آنکھیں نظر نہیں آتیں، ان آنکھوں میں میں نے ہمیشہ شمعیں روشن دیکھی تھیں مگر مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ شمعیں گل ہونے والی ہیں۔ میں اس کی آنکھوں کے گرد اپنے دونوں ہاتھوں سے حلقہ سا بنا لیتی ہوں جس طرح موم کی شمع کو ہواؤں کی زد سے بچائے رکھنے کے لئے ہاتھوں سے کٹورا سا بناتے ہیں مگر ہواؤں پر کس کا بس چلا ہے۔ تیز ہوا کا ایک ہی جھونکا ہمیشہ کے لئے دیئے کو بجھا دیتا ہے۔ اس کی ویران آنکھوں کو میں اپنے ہاتھوں سے بند کرتی ہوں۔

" تم نے اتنی جلدی انتظار کے دیئے گُل کر دیئے ؟"

میں سوال کرتی ہوں، میں اس کے جلنے پر روتی بھی نہیں ہوں، کیونکہ میں اپنے سارے آنسو بہا چکی ہوں۔ ہر روز میرے سامنے سے بوڑھے، بچے اور جوان اُٹھتے جاتے ہیں۔ کچھ فاقوں کی تاب نہ لا کر، کچھ مزید انتظار کی ہمت نہ رکھنے کی بنا پر اور کچھ ذلت کی دہشت سے خوف زدہ ہو کر، مگر میں اور میری بچی زندہ ہیں۔ میری بچی کہتی ہے۔

"آپ نے مجھے پیار سے پالا ہے امی"

"ہاں اس لئے کہ میری ماں نے مجھے نفرت اور خوف سے دُور رکھ کر پالا تھا، میں بھی یہی چاہتی ہوں تمھیں نفرت کے معنی معلوم ہوں نہ خوف کے، معلوم بھی کیسے ہوں۔ کیمپ اور قید میں پیدا ہونے والے بچوں کو اتنی تمیز ہی کہاں ہوتی ہے کہ محبت اور نفرت کے فرق کو سمجھ سکیں۔ خوف اسے اس لئے نہیں آتا کہ وہ اپنی چھوٹی سی عمر میں بڑے سے بڑا حادثہ دیکھ چکی ہے اتنے سانحوں سے گزری ہے کہ مجھے اس کی عمر پچاس سال اور اپنی ہزار برس معلوم ہوتی ہے پیدا ہونے کے ساتھ اس کے کانوں میں بموں اور بندوقوں کی گولیوں کی گونج پیدا ہوئی تھی۔ میں کتنا چاہا تھا کوئی مل جائے جو اس کے کانوں میں اذان دے دے مگر اس وقت ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ وہ اپنی زندگیوں کی حفاظت میں ادھر سے اُدھر بھاگتے پھرتے تھے۔ زمین آگ اگل رہی تھی اور آسمان سے موت کے بادل برس رہے تھے۔ ایسے ماحول میں آنکھیں کھولنے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ دہشت زدہ ہوتی وہ ان باتوں کی اتنی عادی ہو چکی ہے کہ تشدد کی باتیں اس کی زندگی میں خوف کا شائبہ تک پیدا نہیں کرتیں۔ یہ تو معمولاتِ زندگی ہیں۔ لیکن آج اتنے سالوں کے بعد پہلی بار اس نے محبت بھرے انداز میں مجھ سے جشنِ آزادی کے معنی پوچھے ہیں، اسے محبت کس نے سکھائی ؟ میں نے تو اسے کبھی پیار نہیں کیا، کرتی بھی کیسے ؟ مجھے اتنی مہلت بھی کہاں ملی کہ اس کی طرف توجہ دوں وہ محبت سے کیوں نہیں جانے

کوئی میرے کانوں میں آہستہ سے کہتا ہے۔

آج سے چند سالوں پہلے جب اس نے میرے کانوں میں سرگوشیاں کی تھیں "مجھے تم سے محبت ہے، میں آج ہی تمھاری ماں سے تمھیں اپنے لئے مانگ لوں گا" تو میرے چہرے پر حیا کی لالی آگئی تھی۔ میں ایک لفظ بھی نہ بول سکی تھی۔ لیکن میں سوچتی ہوں میری بچی سے کل کوئی کہے گا تو اس کے چہرے پر رنگوں کی قوس قزح نہ بکھرے گی اس لئے کہ اس نے تو کیمپ میں شادی کو بھی معمولاتِ زندگی میں دیکھا ہے۔ تیرہ سال کی ہر لڑکی کی شادی بغیر کسی تقریب کے چوری چھپے کسی کیمپ ہی کے لڑکے سے کردی جاتی ہے تاکہ وہ اس کی آبرو کا محافظ بن جائے اور اس کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کرسکے اور بس۔ شادی محبت نہیں ضرورت بن گئی ہے۔ میری بچی یہ تمام باتیں اپنی ننھی سی عمر میں خوب جانتی ہے۔ پھر اس کے دل میں اچانک جشنِ آزادی اور محبت جیسے جذبے کیسے بیدار ہوگئے۔ تیسرے درجے کے شہریوں کو ویسے بھی ان باتوں سے ناآشنا ہی رہنا چاہئے۔ انھیں تو دوسروں کو جشن مناتے دیکھ کر ہی خوش ہوجانا چاہئے اور محبت ان کے لئے لایعنی ہی رہے تو بہتر ہے ورنہ یہ تو بن موت ہی مرجائیں گے۔ اس بار وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال دیتی ہے۔

"امی جاوا کو وطن سے بہت محبت تھی نا۔؟"

میرا جواب نہ پا کر وہ دوبارہ پوچھتی ہے۔

"آپ کے پاس کوئی چھوٹا سا پرچم ہوگا ہمارے اپنے ملک کا۔؟"

"کوئی پرچم چھوٹا نہیں ہوتا۔" "میرا مطلب ہے اتنا بڑا جو میرا کفن بن سکے۔؟"

میں سہم جاتی ہوں، اسے پتہ چل گیا ہے کہ کتنے سارے لوگ پھر پھریرے جھنڈے، علم اور پرچم لئے شہر کی طرف جارہے ہیں تاکہ جشن منائیں۔ یہ پرچم انھوں نے بڑی حفاظت سے چھپا رکھے تھے۔ سارے عزیز گنوانے کے باوجود پرچم کی حفاظت کی تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ قابلِ دید جشن منائیں گے۔ یہ بھی اسی جشن میں شریک ہونا چاہتی ہے۔ میری آنکھوں کے سوتے خشک ہوچکے تھے مگر بے اختیار سیلاب کی صورت میں میری آنکھوں سے دھارا بہہ نکلتا ہے۔

"کیا محبت کرنے والوں کو آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔"

میری بچی بھی محبت کے جذبے سے آشنا ہوئی تو اس نے کفن کی تمنا کی۔ میں اسے اپنے سینے میں چھپا لینا چاہتی ہوں، وہ میرے آنسوؤں سے ذرا متاثر نہیں ہوتی۔

"امی بہادروں کی مائیں رویا نہیں کرتیں آپ بھی چلیں نا ہمارے ساتھ۔ یہ تو خوشی کا دن ہے!"

وہ پُرعزم لہجے میں کہتی ہے، میں جانتی ہوں وہ نادان ہے، نہیں جانتی اسے اس کا کوئی صلہ نہیں ملے گا، کبھی نہیں۔ لیکن میں اسے کیسے سمجھاؤں جس نے زندگی اور موت کو کھیل سے زیادہ سمجھا ہی نہیں ہے، اسے نفع اور نقصان کون سمجھا سکتا ہے۔

"بیٹی، میری گڑیا اپنی آنکھوں کے دیوں کو نہ بجھاؤ۔ زندگی سے اگر انتظار کو نکال دیا جائے تو کیا رہ جاتا ہے۔"

انتظار۔ لیکن کس بات کا انتظار کیسا انتظار آزادی کا نا۔ وہاں سارے لوگ یہی تو کہہ رہے ہیں کہ اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو آجائیں گی۔ وہ آزاد ہونے کے لئے جارہے ہیں، میں بھی آزاد ہونا چاہتی ہوں، مجھے کیمپ سے گھٹن ہوتی ہے۔

"مجھے اس کی آنکھوں میں آزادی کی قندیلیں جلتی نظر آتی ہیں اس لئے اپنی گٹھری کھول کر میں اسے ایک چھوٹا سا پرچم تھمادیتی ہوں، جسے دیکھ کر وہ خوشی سے بے قابو ہوجاتی ہے اور اسے سر سے باندھ کر آزادی کے متوالوں کی صف میں شامل ہوجاتی ہے۔ پھر وہ سب آہستہ آہستہ خود اپنی صلیبیں سجائے شہید مینار کی طرف بڑھنے لگتے ہیں آج ان کے حوصلے ناقابلِ فہم ہیں۔ یہ کیسی آزادی ہے جس کی خوشی ان کے چہروں پر نہیں ہے مگر ننھے بچوں کے چہرے فرحاں و شاداں ہیں۔ شاید اس لئے کہ پہلی بار انھیں اپنے بڑوں کے ساتھ قدم ملاکر چلنے کی اجازت ملی ہے، ورنہ انھوں نے تو سورج کی کرنوں کو بھی دیکھا ہی نہیں تھا کیونکہ ان کی ماؤں کو ڈر لگتا تھا کہ باہر نکلتے ہی دوبارہ انھیں زندہ دیکھنا شاید ممکن نہ ہو۔

پانچ سو افراد پر مشتمل یہ گروہ شہر سے متصل جا رہا تھا کہ لوگوں میں شور مچ گیا۔

"پکڑو، انھیں پکڑو، گرفتار کرلو انھیں، ان کے ہاتھوں سے آتشیں سامان چھین لو یہ دیوانے مرنے جارہے ہیں، انھیں آزادی کی تمنا ہے انھیں آزاد مت ہونے دو۔"

ہر طرف شور بپا ہوتا ہے، ان کے ہاتھوں سے آتشی سامان چھین لئے جاتے ہیں اور ان دیوانوں کو ایک بار پھر کال کوٹھری میں بند کردیا جاتا ہے جہاں سورج کی کرنیں بھی ان تک نہیں پہنچ پاتیں۔ کچھ سرفروش شور مچاتے ہیں، چیختے ہیں، چلاتے ہیں، ایک ساتھ بہت سی گولیاں چلتی ہیں، گولیوں کی آوازیں سن کر میں بھاگ کر باہر آتی ہوں۔

"میری بچی۔!"

میں چیختی ہوں، ایک گولی اس کے سینے میں پیوست ہوجاتی ہے، اس کی آنکھوں کے سامنے خواب اور آزادی کی قندیل روشن رہتی ہے۔ مگر اس کی نبض ایک دم سے ڈوب جاتی ہے۔ میں اس کی آنکھوں کو ہاتھوں کے کٹورے سے چھپا لیتی ہوں بالکل اسی طرح جس طرح تیز ہواؤں کی زد سے شمعوں کو گل ہونے سے بچایا کرتے ہیں مگر سرکش ہواؤں پر کس کا بس چلا ہے۔

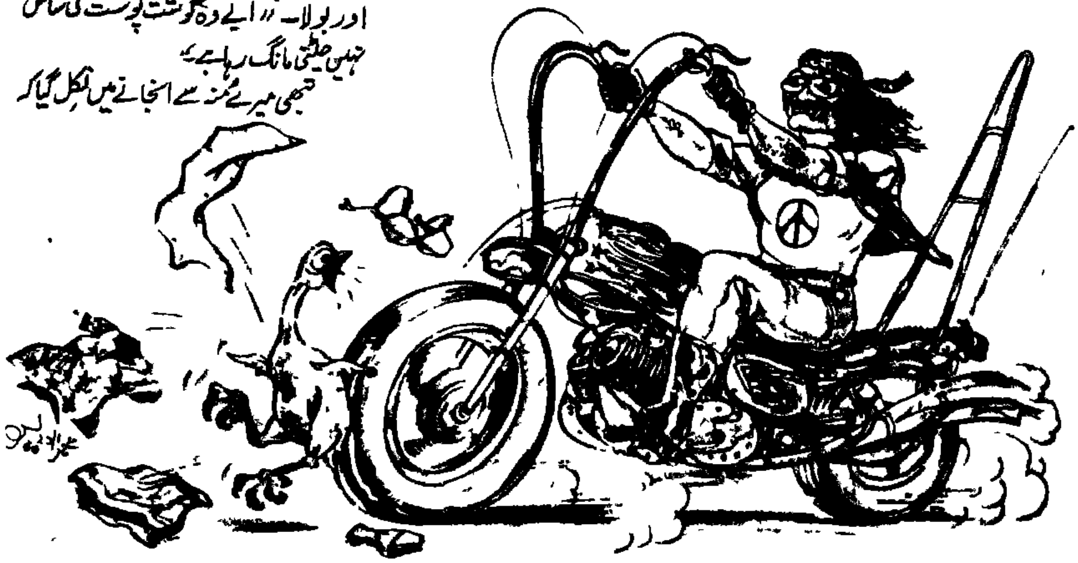
●●



"موجودہ صدی کا چنگیز خاں"

کنواری بیوی کی لاش

طنزیہ
انیس
احمد
خاں



جُھگی سر چھپانے کی اس اکائی کا نام ہے جو کہ گرمیوں میں گرم سردیوں میں ٹھنڈی اور برسات میں لگاتار برستی رہتی ہے۔ ایسی ہی کئی اکائیوں کے بے ترتیب جھنڈ کو جھونپڑپٹی کہتے ہیں جو کہ ہر مہانگر کے خوبصورت قالین پر جگہ جگہ بے وجہ اُگ کر ٹاٹ کے پیوند کا کام کرتی ہے۔

ایسے ہی ایک پیوند کی ایک ایئر کنڈیشنڈ جھگی میں میں پچھلے کئی برسوں سے ایک مریل بیوی دو سوکھے بچے اور ایک مٹی کی ہانڈی کے ساتھ رہائش پذیر ہوں۔ بیوی ایک ضرورت کے تحت لائی گئی تھی بچے خواہ مخواہ ہی آگئے تھے جنہیں بہلانے کی خاطر ایک مٹی کی ہانڈی لانی پڑی تھی جو کہ آج تک کنواری ہے۔ میرے لئے کنواری تو میری بیوی بھی ہے کیونکہ مجھے یعنی کہ اس کے مجازی خدا کو اس کے ساتھ رات گذارنے کا ایک بھی موقع نہیں ملا تھا۔

پچھلی بار جب سردیوں کی ایک رات پولیس نے غیر دستوری دھندوں کا پتہ لگانے کی خاطر جب اس جھونپڑپٹی پر اچانک چھاپہ مارا تو میری جھگی سے ایک پولیس والے کو صرف چڈی بنیان میں برآمد کر لیا۔ اس پر اس کے ساتھیوں نے مجھے اتنا کوٹا اتنا کوٹا کہ کوٹتے کوٹتے سڑک بنا دیا۔ ساتھ ہی مجھے اور میری شریکِ حیات کو بغیر لائسنس جسم فروشی کے الزام میں چھ مہینے کی قید با مشقت بھی عطا کی۔

وہاں جا کر مجھے پہلی بار یہ علم ہوا کہ ہمارے علاقہ کا غیر قانونی دھندہ فقط ان چیزوں کو سستے داموں میں مہیا کرانے کا نام ہے جن کو سرکار لائسنس لگا کر مہنگے داموں میں فروخت کرتی ہے۔

اب آپ میرا نام جاننے کے لئے بے چین ہوں گے میرا نام اے، او تے نادکھتے ہے میں نے دھندے بھی کئی اپنائے ہیں۔ اور ہر دھندے کے ساتھ میرا نام بدلا ہے۔ ہوٹل میں بیرا گیری کی تو "ابے" یا اچھے لفظوں میں بیرا بھی کہلایا۔

مگر ایک مرتبہ جب ایک پڑھے لکھے صاحب نے سموسوں کے ساتھ کھانے کے لئے ساس کی مانگ کی تو میں انہیں آدم خور سمجھ کر جھٹ سے کاؤنٹر کے پیچھے دُبک گیا۔ میری اس حرکت پہ مالک نے وجہ جاننی چاہی تو میں نے کھلے لفظوں میں اُسے بتایا کہ ٹیبل نمبر فلاں فلاں پر بیٹھے ایک صاحب آدم خور قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ وہ اپنی ساس کو سموسوں کے ساتھ ملا کر کھانا چاہتے ہیں۔ مالک میری اس حالت پر بہت زوروں سے ہنسا۔ اور بولا۔ "ابے وہ گوشت پوست کی ساس نہیں چٹنی مانگ رہا ہے۔"

تبھی میرے مُنہ سے انجانے میں نکل گیا کہ "بابو جی جب یہ چٹنی کو ساس کہتے ہیں تو سسر کو تو شائد سِل بٹہ کہتے ہوں گے۔"

میرے الفاظ گاہک کے کان میں جیسے ہی پڑے ویسے ہی اس نے ٹیبل سے اُٹھ کر مجھے جوتوں لاتوں اور گھونسوں سے یہ کہتے ہوئے پیٹنا شروع کر دیا کہ "سالا دو ٹکے کا بیرا۔ اپنی قابلیت جھاڑتا ہے" اور جاتے جاتے ہوٹل کے مالک سے یہ سفارش بھی پیل دی کہ "ایسے گستاخ کو فوراً برخاست کر دو ورنہ آپ کو ایک شریف پڑھے لکھے گراہک سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

گاہک بھگوان کا روپ ہوتا ہے۔ اور بھگوان کی بات ہوٹل کا مالک ٹال نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے مجھے اُسی وقت میرے ہی ساتھیوں سے دھکے دلوا کر باہر نکال دیا۔ ساتھ ہی میری ایک مہینے کی تنخواہ بطور ہرجانہ ضبط کر لی۔

لیکن بھوکوں مرنے کی نوبت ہمارے اوپر کم ہی آتی ہے کیونکہ شہر میں آئے دن بڑی بڑی دعوتیں ہوتی رہتی ہیں جہاں میں اپنی بیوی اور

دو بچوں کے ساتھ نظر بٹو کی مانند حاضر ہوتا ہوں اور دعوت ختم ہو جانے کے بعد بیرے جو جھوٹن کا کاک ٹیل تیار کرتے ہیں اسے شاہانہ انداز میں کھاتا ہوں۔ مگر کبھی کبھی بڑے کنجوسوں سے پالا پڑ جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں میں تین چار دن کا باسی کھانا بانٹ دیا گیا جسے دیکھ کر ہمارا ایک ساتھی بولا — "دیکھا بھیا ان کی کنجوسی! ہم لوگوں کو باسی کھانا دیا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو بھیا۔ یہاں تو ایسی عزت افزائی کی گئی ہے۔"

"وہ کیسے — ؟"

"دیکھو دعوت والوں کا کھانا تو آج ہی پکا ہوگا ہمارے لئے تو کئی دن پہلے ہی تیار کر کے رکھ دیا گیا تھا۔" میں نے پایۂ ہماروٹی کا ٹکڑا پھپھوندی کی ورق چڑھی سبزی میں ڈبو کر کسی انٹرکانٹی نینٹل ڈش کی مانند چٹخارے لے لے کر کھانا شروع کر دیا۔

ارے صاحب! میں تو ٹھہرا جنم کا بھیک منگا۔ میرا کیا — جہاں اتنی عمر آپ لوگوں کا جھوٹن کھاتے گذر گئی باقی بھی نکل جائے گی۔ بھگوان آپ کو اسی طرح پھلتا پھولتا رکھے — پر ہماری نئی پیڑھی کی عادتیں بڑی خراب ہیں۔ ہر وہ کام کرنا چاہتی ہیں جو آپ لوگ کیا کرتے ہو۔ اب میری بیوی کے دونوں بیٹوں کو ہی لے لیجئے۔ ابھی پدی پدی سے ہی ہیں کہ ضد کرنے لگے کہ ہم بھی بس میں بیٹھ کر اسکول پڑھنے جائیں گے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ پڑھائی لکھائی کوئی اچھی چیز نہیں ہے تو انھوں نے زبان لڑانا شروع کر دیا اور بولے کہ اگر یہ اچھی چیز نہیں ہے تو بابو صاحب لوگوں کے بچے کیوں جاتے ہیں۔ ان کی یہ مجال دیکھ کر وہ ہمارے ان داتاؤں کی باتوں میں مین میخ نکالتے ہیں۔ میں نے انھیں خوب پیٹا۔ جس پر باغی ہو کر بڑا تو بھکاریوں کے بین الاقوامی ٹولے میں شامل ہو کر "بھارت بھرمن" کو نکل گیا ہے۔ اور دوسرے نے سڑک کے بیچوں بیچ بسوں، اسکوٹروں، ٹیکسیوں اور کاروں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اخبار بیچنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنی کمائی بھی ہمیں نہیں دیتا ہے کہتا ہے کہ میں اسے جوڑ رہا ہوں اور ایک دن جب بڑا آدمی بن جاؤں گا تو روز اسکول جایا کروں گا۔

لیکن اس کا حشر کہیں ان صاحب کی طرح نہ ہو جو کہ زندگی بھر ایک ایک پیسہ اکٹھا کرتے رہے کہ ایک دن جب میرے پاس خوب پیسے ہو جائیں گے تو دوپہر کے کھانے میں روز ایک مرغا کھایا کروں گا۔ لیکن صاحب جب ان کے پاس پیسے ہوئے تو ان کے منہ میں دانت نہیں رہے بھگوان نے چاہا تو اس حرامی کا بھی یہی حشر ہوگا۔

لیکن پچھلے تین دنوں کی چھپر پھاڑ بارشوں نے جہاں ایک طرف مہا بھوجوں کا سلسلہ بند کر کے ہم جیسے لوگوں کو بھوکا مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ وہیں میری جھلنگی چارپائی سی بیوی جو کہ مختلف لوگوں کی سماجی برائیوں کو اپنے اندر چھپاتے چھپاتے خود ایک سماجی برائی بن گئی تھی اور کئی طرح کے پوشیدہ اور ظاہری امراض کا ایک چلتا پھرتا اسپتال تھی۔ انہی دنوں نمونیہ سے دوچار ہو گئی۔

میرے لئے بڑی مصیبت تھی۔ جھگی کے اندر ایک کونے میں پڑے لعلوں سے محروم گودڑ پانی میں بھیگ بھیگ کر کچھوا بنے تھے۔ فرش کیچڑ ہو گیا تھا اور میں کنول۔

پوری جھگی میں صرف ۲/۲ فٹ کی جگہ ہی ایسی تھی جہاں پر میں اور میری بیوی بیٹھ کر پانی سے بچ سکتے تھے۔ سو ہم پچھلے تین دنوں سے یہی کر رہے تھے۔ لیکن تین دن کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اور وہ بھی بھوکے پیاسے۔ اور بھوک پیاس بھی اس طرح کی جس کے مٹنے کا بھی کوئی چانس نہ ہو۔ پھر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر کار میری بیوی نے اپنی پیلی پیلی ملگجی آنکھوں سے میری طرف تکتے ہوئے کہا — "اب اور نہیں برداشت ہوتا ہے۔ اس سامنے والے پل کے نیچے کیوں نہیں چلے چلتے۔"

"وہاں رحمت نہیں ٹکنے دے گا۔ جانتی نہیں وہ پل آج کل اس کے ٹھیکے میں ہے۔"

"مگر ہم لوگ وہاں بیٹھ کر بھیک مانگنے تو نہیں جا رہے، جو رحمت ہمیں بھگا دے گا۔" اس نے بخار سے تپتے بدن پر چڑھائے ایک برساتی کپڑے کو کانپتے ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"لیکن آج کل تیری شکل ہی ایسی ہو رہی ہے کہ اگر بابو لوگ تجھے خواہ مخواہ ہی بھیک دینی شروع کر دیں گے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ ایک کراہ کے ساتھ بولی۔ "سنو! چلو چلتے ہیں پل کے نیچے۔ اگر رحمت کچھ کہے گا تو میں اس سے نپٹ لوں گی۔"

"تجھ میں اب بچا ہی کیا ہے۔"

میرا یہ جملہ اس کے چہرے پر مردنی پھیرتا چلا گیا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر مجھے ایک دھچکا سا لگا اور بات سنبھالنے کی خاطر جلدی سے بولا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے پل پر ہی چلتے ہیں۔ رحمت پیسے ہی تو لے گا وہ ہم اسے دے دیں گے۔ آخر کبھی تو آسمان کھلے گا" اور سہارا دے کر اسے اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا۔

آگے آگے میں اور میرے پیچھے پیچھے برساتی کا ٹکڑا اوڑھے وہ اس پل کی طرف بڑھ لئے۔ صاحب! ہم لوگوں کے لئے پل کی ایک خاص اہمیت ہے جہاں یہ برسات میں ہم جیسے لوگوں کو پناہ دیتا ہے وہیں عام دنوں میں روکھی روٹی بھی دیتا ہے۔ یعنی آپ پل کے اوپر بھیک مانگ سکتے ہیں۔ بچے جوا کھیل سکتے ہیں۔ لہٰذا اس قدر اہم مقام کا ٹھیکہ ہونا لازمی تھا۔ اور ٹھیکیدار یہاں پر بزنس کر رہے تھے ہم جیسے "بزنس مینوں" سے بطور کرایہ اجرت وصول کرتا تھا۔ ابھی پل کوئی سات آٹھ قدم ہی ہوگا کہ اچانک مجھے اپنے پیچھے ایک چیخ سنائی دی اور بغل سے ایک لمبی سی کار زناٹے سے گذرتی چلی گئی۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو میری بیوی سڑک سے کوئی چار فٹ کے فاصلے پر اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ میں بھاگ کر اس کے قریب پہنچا اور خون ملے لال لال کیچڑ میں لت پت برساتی لپٹے اس کے جسم کو سیدھا کیا لیکن تب تک جسم لاش بن چکا تھا۔

گھٹنائیں کچھ ایسی تیزی سے گھٹی تھیں کہ میرا دماغ شل ہو کر رہ گیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں بڑی تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ پل کافی پیچھے رہ گیا تھا کیونکہ لاوارث لاشوں کی ڈاکٹر اور اس کے رشتہ داروں کی پولیس بہت درگت بناتی ہے۔

دولت کی ہار

خوشتر مکرانوی

وہ شہر کے قطعی خوشحال محلہ میں رہتے ہوئے بھی اکثر بھوکوں رہ کر اپنی اولاد کے شکم کی محرابیں گہری بناتا رہا۔ ...... مگر اس کے ہم مزاج چہروں اور ایاپ ہاتھوں نے کبھی ریگستان کے تپتے ہوئے سرابوں کے آگے خشک ہونٹوں پر اوک لگانا نہیں چاہا۔ ان کے منہ پیٹ کی کلفتیں آوارہ اور بیانو جانوروں کی استراحت دیکھ کر بھڑکتی بجھتی رہیں۔ . . ... لیکن امیر لوگ ندیوں میں روٹیاں پکھالیں اوڑھ کے سلیقہ سے رہے ..... بھوک، پیاسی بستیوں کے بوجھل دماغ چکراتے رہے مگر پھولوں پر عطر پاشیاں ہوتی رہیں ..... حریص، پاپی مالدار اپنے مخفی کرتوت چھپانے اور مٹانے کے واسطے دھیرواندوز جیونٹیوں کے قافلے کو مختلف غذاؤں کی خیرات تقسیم کرتے رہے لیکن دار گھر کے افراد بھوک کا کرب دبا کر سو جاتے ہیں۔ . .. اور بیدار آنکھیں شب کی تاریکیوں میں آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کے ذریعے تھپڑے درختوں پر ساون کا مظاہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر بھی یہ کچھ نہیں سمجھ سکیں، خزاں رسیدہ بڑھوں کے چمکدار چہروں سے کتنے خوبرو دکھائی دے رہے تھے جیسے یہ بھی ستارے ان ہی درختوں کے برگ ثاقب ہوں ... ... سلسال اپنے پنکھوں سے بہاروں کا وجود سوکھے ہوئے پودوں کو سونپتی رہیں ... .. لیکن ایک نزدحن خاندان کی زندگی کو محلے کے تمام روشن چہرے اپنی قربتوں سے نہیں جگمگا سکے .... . ، مایوس اور ضعیف چہرہ کی عمیق لکیریں جو توں کے مختلف رنگین عکسوں کی دھنک میں نہیں چھپ سکیں ... ... ، آخر اس نادار باپ کی بیٹی نے نوجوانی کا سورج طلوع کیا ... . . ذرات جگمگا اٹھے۔ لیکن اس کی داخلی و

خارجی زندگی کے قرب و جوار میں آسیبوں کی طرح اور مرگ کے سفر کی ہماسی گرم ٹھنڈے ماحول میں کئی سلسلے مسلف اشکال میں ابھرنے پھیلنے لگے۔ ، رات اس کے واسطے تندرستی ہو چلی تھی ... ۔ لیکن اب کا بڑھاپا نگہبانی کا کام انجام دینے میں مصروف تھا۔ بھوکے ریچھوں کا شب خوں مارنا آسان ہی نہیں، غیر ممکن تھا ..... تاہم نزدحن لوگ سماجی درندوں اور خوشحالی کے عفریتوں سے ہر طرح ہوشیار رہتے ہیں ... . ، اس کا آنگن برائے نسبت کتنی ماؤں کی آنکھوں کا مرکز بنا .. اور تندرست باپوں نے اپنی جوانیوں کا حسن جدید منانا چاہا ... ، جس گھر کی طرف کبھی کسی بدمست آنکھوں نے اپنے دریچوں سے جھانک کر نہیں دیکھا اب اس معصوم دوشیزہ کو لمس کرنے کی غرض سے چاند، سورج کی امتزاجی کرنوں کی مانند پھیل گئیں ... .. بوسیدہ ملبوس اور جھکی ہوئی پلکوں نے اسے جاذب نظر سا رکھا تھا۔ پھر بھی اس کی آنکھوں کے سورج سے کس شخص میں نگاہیں ملانے کی توفیق و جرأت تھی۔ لیکن اس کی راتوں کا پاکیزہ سکون کتنے خوابوں کا مہمان بنا رہا . . ... . اور دن کی گویائی کے تھپیڑوں نے اس کی خداترسی کو مجروح کرنا چاہا۔ . .. اس نے ان بدظنوں اور ناکردہ گناہوں سے واقف ہو کر بھی اپنی باوقار زندگی پر کہیں داغ نہیں آنے دیا ... ، اسے اپنے خاندان کی توقیر کا احترام کرنے اور عورت سماج کی فصیلت کا ہر موضوع احساس تھا۔ .... ،

ہر طرف خوشحال گھرانوں میں کئی مہذب اور قبول صورت دوشیزائیں موجود ہونے کے باوجود ایک تنگدست باپ کی بیٹی کو بہو بنانے میں ذہنی و قلبی اطمینان محسوس کیا جا رہا تھا ... . جیسے وہ سب اپنے ہم وضع خاندان کی بیٹیوں کے کردار پر مشکوک ہوں ... . لیکن کسی طرح باغوں کے مختلف پھول گلدانوں میں سجائے نہیں جا سکے ... ... ایک غریب آنگن کے موسم سے نسل لینا رہتی ... ، لیکن بوڑھے نادار نے آخر نفرت سے نفرت ظاہر کرتے ہوئے سختی سے انکار کر دیا ۔

. میں آپ لوگوں کی تہذیب و طبعات سے قطعی مطمئن نہیں ... . . اپنی بیٹی کا رشتہ میں جلی جوابیوں سے نہیں جوڑ سکتا ۔ ... شہد کو سکر میں تحلیل نہیں کر سکتا ۔ .. ، ان سے پیدا شدہ بچے سماج میں پھیل کر کئی خاندان کو ذہنی و قلبی بیماریوں میں مبتلا کر سکتے ہیں ..... خون کا امتزاج بدل سکتے ہیں ... .. اشرف المخلوقات کی زندگیوں کا بھی رواج تبدیل کر سکتے ہیں ..... ، میں پانی میں نمک نہیں گھول سکتا ... .. ، مجھے ان چیزوں کا بامقصد استعمال کرنا آتا ہے ... ... ، مجھے بادل اور دھوئیں کی تفریق معلوم ہے ... ، سنگ نگراز اور سرفلی چٹانوں سے خوب واقف ہوں مگر پیاسا دولت مند اپنے حوص کا بالی محفوظ کر کے پتھروں کو نچوڑ کر اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے ... . اسے خوف ہے بند حرہ ختم ہو گیا تو مگر کیسے حاصل کیا جا سکے گا ... ... اسی جذبے کے تحت ایک مالدار کو نزدحن کہا جا سکتا ہے .. . مگر محتی نادار کو دائمی خوشحال کہا جا سکتا ہے، اس کے ذہن پر کسی حرص و خوف کا دباؤ نہیں ہوتا ..... ، یہی وجہ ہے کہ وہ تشنہ دکھائی نہیں دیتا ..... وہ بہاروں میں پھولوں کو مسل، سونگھ کر پھینک نہیں دیتا، خزاں کا مقابلہ کرنے کے لیے علاحتی کشید کر لیتا ہے یوں اسے ہر موسم میں بادیتاف مدد چنا آتا ہے ...... ، کوئی مجھے پیاسا سمجھ بنانا پسند کرنا ہے تو میری چند شرطیں قبول کرنی ہوں گی میں برات بلا دری کے ساتھ نہیں دوں گا ۔ جہیز

قطعی نہیں ہو پائے گا۔ کینیڈا کے چند افراد کے ساتھ برات بغیر بینڈ پیدل یا نجی موٹروں میں آئے گی۔ ٹیکا "مہر کے" مبلغ پچاس ہزار نقد روپے دلہن کے نام سے بینک کھاتہ کھلوا کر جمع کروانے ہوں گے ... مذہبی اصولوں کے تحت شریکِ حیات کے ساتھ رات دن گزارنے ہوں گے ...، زنا، شراب، جوا، تمباکو تلون مزاجی اور اسراف کی بیماریوں سے بچنے کے واسطے خود دولہا بھی اپنا نجی بچت کھاتہ کھولے گا ...، رنج و خوشی کی تقریبات میں

مٹھائیاں اور دوستوں کو پارٹی نہیں نہیں دے کر محلہ شہر کے نادار طلباء اور قابلِ رحم مساکین کا تجسس کر کے ان کی ضرورتیں پوری کرنی ہوں گی ... ، لیکن وہ جانتا تھا یہ دولت مند لوگ ایک قوم کو سیاسی جماعتوں میں تقسیم کر کے ملکی وحدت اور اتحاد کا شیرازہ بکھیرنے میں پیش پیش رہتے ہیں ..انتخابی حلقوں سے برسرِ اقتدار پارٹی اور حزبِ اختلاف کے نمائندے ایوانوں میں پہنچ کر برائے ملک و قوم کولیشن بحال نہیں رکھ سکتے ... ایک ہی قوم کے افراد مختلف امیدواروں کو اپنی آراء سے کامیاب بناتے ہیں لیکن ایک پارٹی ریاستی و مرکزی اقتدار سنبھال کر باقی جماعتوں کے فاتحین کی عوامی نمائندگی کو مفلوج بنا دیتی ہے ..... کاش کہ سبھی جماعتیں ایوانوں میں پہنچ کر ایک ہو جائیں پھر ان میں سے انھیں کے بجٹ کے مطابق ہر پارٹی کے منتخب شخصیات کو وزارت سونپی جائے .... لیکن یہاں بھی مساوات نہیں ... کیسے امید کی جا سکتی ہے مفلسوں اور امیر لوگوں کے پاس سوشلزم قائم ہو سکتا ہے اور جمہوریت پنپ سکتی ہے ... ... کیسے ان کاریگروں کو قومی حمایت اور حب الوطنی کا ثبوت کہا جا سکتا ہے ...، مفلس لوگوں کی مصیبتیں احساس کرتے ہوئے بھی گھٹانے اور مٹانے کی سعی نہیں کرنے والا دولت مند طبقہ انسانی سوسائٹی کا کھلم کھلا قسطوں میں زہر ملانے والا ظالم

و قاتل، مجبوریوں کے وقتوں میں ذاتی فائدہ اٹھانے والا انسان نما حاسد حریص اور بزدل درندہ ہے ... ...، خود نادار لوگ اپنے دکھ درد کا حل تلاش نہیں کرنے والے اپنی زندگی کو خودکشی پر مجبور کر دینے والے ہوا کرتے ہیں ... خودکشی اور قتل سے دو چار قدم آگے بڑھ کر یہی مالدار ذخیرہ اندوز بیوپاری پوری نسلِ انسانی کی عیشوں اور تندرستیوں کو برباد کر رہے ہیں ...، یہ تازہ اشیاء دبا کر برسوں اور مہینوں کی چھپائی ہوئی چیزیں مہنگے بھاؤ سے مارکیٹ میں فروخت کرتے رہتے ہیں ... اگر حکومت چاہے تو ایسے تمام کے تمام ذخیروں کو ناقابلِ استعمال چیزیں تسلیم کر کے سرکاری خزانے کو اسراف سے اور قومی افراد کو بیماریوں سے بچا سکتی ہے۔ لیکن گورنمنٹ محکموں کے چھوٹے بڑے افسران اپنے ذاتی مفاد کی خاطر پالتو سماجی درندوں اور سانپوں کو بچا کر کے چیونٹیوں پر تلوار کا وار کرتے ہیں ... ، لیکن دودھ سے مٹھائیاں بنانے والے حلوائی اور چائے ہوٹلوں کے مالکوں کا دھندا ہے، چھاچھ، مکھن اور گھی سے محروم کر کے انسانی صحت مندیوں کو نقصان پہنچا رہا ہے پھر بھی مٹھائی چائے کے رواج کو روکا نہیں جا سکتا ...، فسادیوں کو قصاب کی چھری برداشت نہیں، چاہے ذکی الودے کے قتل سے قوم و ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دیا جائے کوئی غم و افسوس نہیں ... ... یہ کیسے بڑے لوگ ہیں جو دھرم ست اور مفلسی کا بالکل احترام نہیں کرتے، انھیں محسوس کرنا چاہیے کہ قومی اتحاد میں سبھی زمینوں اور آسمانوں کی آسودگیاں موجود ہوتی ہیں ... ...، اسے اکثر اس بات کا شدت سے احساس ہوتا رہا ہے کہ دو جسموں کے ہم مزاج اور یکساں اور چہرے بھی ایک دوسرے سے نفرت برتتے ہیں ... وہ اپنے خوشحال حقیقی بھائیوں کی طبیعتوں کا مشاہدہ کرتا تو اسے اس راز کا

بھی انکشاف ہو جایا کرتا تھا کہ وہ اکثر اپنی ضرورتیں انھیں معلوم ہوتے ہوئے بھی پوری نہیں کر سکتا ... ...، بے دست و زبان حاجت مند گرہستوں سے بے خبر ہو کر بھکنگوں کے تعلقات سے متاثر ہو کر خیرات دان، اور زکوٰۃ دینے میں دانی اور بخیر جیسی بے ثوابی آوازیں سننے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور یہی تونگر دریوزہ گر اپنے ڈیروں میں زندگی کا لطف اٹھانے میں کوئی کمی باقی نہیں رکھتے ......، گر اکثر لوگ سماجی حاجت مندوں کی حق تلفیاں کر رہے ہیں ... ..دولت مند لوگ دھرموں کی زکاتوں اور حکومتوں کے ٹیکسز کی بھرپور چوریاں کر کے قوم و ملت کی ضروریات میں کسر ڈال رہے ہیں ... ...پھر بھی یہ لوگ سرکار و مذہب کے مجرم ہونے کے باوجود رئیس، بڑے آدمی اور سیٹھ ساہوکار کہلاتے ہیں. ، یہی ساہوکار لوگ اپنے انسانی فرائض اور لہو، دودھ کا رشتہ فراموش کر چکے ہیں .. ..ان کے یہاں دوسرے رشتے ناطے اور پڑوسی، محلے کے کم پیسے والے خاندان کے افراد شب و روز چاکری میں مصروف رہنا اپنا فخر تصور کرتے ہیں لیکن ایسا ہی سلوک اپنے حقیقی نردھن بھائی کے کنبے سے چاہتے ہیں اور ان امیروں کی اولادیں پالتو جانوروں کی طرح اپنے مالکوں سے غلامی میں کھڑے رہنے کی سوچتی رہتی ہیں .....، خود کے شوق و تحفظ کی خاطر کتے بوزنہ پال کر تنگدست رشتہ داروں کی انسانی حاجتیں نظر انداز کر کے اپنے شہزادوں کی غذاؤں میں سے پالتو جانوروں میں تقسیم کرنے والے بہت جلد اپنی نسلوں کو مسکنت کی دلدل میں پھنسا دیتے ہیں، لیکن امیروں کی اولادیں نہیں سوچتیں ..... امیر و غریب دو بھائیوں کی محبتوں میں کسی درجہ تفاوت ہو جایا کرتا ہے پھر بھی آدمی دولت کے سرابوں کے پیچھے دوڑ، ہانپ کر بھی تشنگی نہیں بجھا سکتا

باقی صفحہ ۳۴۷ پر



غزلیں

عجب خوشی ہے کہ غم کا گمان ہوتا ہے
ترے کرم پہ ستم کا گمان ہوتا ہے
خدا ایک ایسا بھی پایا خداؤں کے صف میں
کہ جس پر اپنے صنم کا گمان ہوتا ہے
نگاہ بت کدہ جھک جاتے وہ تراش خراش
وہ سادگی کہ حرم کا گمان ہوتا ہے
نگاہ یار تری پاسداریاں نہ گئیں
ملیں تو اب بھی کرم کا گمان ہوتا ہے
یہ التفات کا خنجر خلوص کا نشتر
وہ دھار ہے کہ قلم کا گمان ہوتا ہے
غزل میں وقت کی آئینہ داریاں اجمل
ہمیں تو ساغر جم کا گمان ہوتا ہے

آزمائش کے کتنی موڑ سفر میں آئے
پھول بھی خار کی مانند نظر میں آئے
میں نے تعمیر کیا ہے جو یہ شیشے کا مکاں
میری خواہش ہے کہ پتھر مرے گھر میں آئے
لائق دید رہی ہو گی شباہت ان کی
جو بھی جنگل سے کبھی گھومنے آئے
بارہ برسوں میں ہو جائیں گے راضی بخدا
ہم تو ہر حال میں ہو جائیں اثر میں آئے
شرط یہ ہے کہ وہ صبح کی کرن کی مانند
جس کی یاد آتی ہے راتوں میں سحر میں آئے
اب وہ خوشبو کی طرح یاد سحر میں آئے
میں نے نام عزم و فکر کو دی ہے تہذیب
اب مرا نام بھی تو اہل ہنر میں آئے

یوں تو ہزار سیل گراں سہ گئے ہیں لوگ
لفظوں کی زد میں آکے مگر ڈھ گئے ہیں لوگ
منہ بند نالیوں کا تعفن بنے ہوئے
جس سمت کو بھی ہے ہوا بہہ گئے ہیں لوگ
کچھ اتنا تیز رو بھی نہ تھا اپنا قافلہ
اب کیا بتائیں راہ میں کیوں رہ گئے ہیں لوگ
جن کی تپش سے نطق کے سانچے پگھل گئے
خاموش انکھڑیوں سے وہ سب کہہ گئے ہیں لوگ

ڈاکٹر اجمل اجملی

غزلیں

اپنا گھر ہے کہ ایک دشتِ یاس
زندگی ہے کہ رام کا بن باس
راکھ کا ڈھیر بن گیا ہوں میں
جب بھی جاگا ہے شعلۂ احساس
کوئی ہلچل نہ زیست کے آثار
کسقدر شہرِ آرزو ہے اداس
اپنے عالم میں ہم مقید ہیں
خستہ دل، خستہ حال، خستہ لباس
تلخیوں سے بھرا ہے جامِ حیات
کام آئی نہ اُن لبوں کی مٹھاس
دربدر ہم بھٹکتے پھرتے ہیں
معرِ حاضر ہے کتنا قدر شناس
ے تو پھر سے ہے بار ہا واحد
زہر سے بھی بجھی نہ اپنی پیاس

ساقی کے فیضِ عام کا جب یہ اثر نہیں
محفل میں آج کوئی بھی کیوں باخبر نہیں
جس کی نظر تغیرِ حالات پر نہیں!
بے شک وہ کامیابِ زمانہ بشر نہیں
اتنے فریب کھائے ہیں راہِ حیات میں
میری نظر میں آج کوئی معتبر نہیں
واعظ کے قول و فعل میں خوفناک تضاد ہے
اُس کی نصیحتوں میں نہیں تو اثر نہیں
وہ ذاتِ پاک جب سے مری ناخدا ہوئی
طوفانِ زندگی کا مجھے کچھ خطر نہیں
دنیا کے سامنے جو کبھی خم نہ ہو سکے
اُس سر سے بڑھ کے فخر کوئی اور سر نہیں

قوت تو کھو چکے ہیں ہم اونچی اڑان کی
ہے آرزوئے سیر مگر آسمان کی
جس کو بھی چاہا پیار سے اپنا بنا لیا
خوبی یہی ہے دوستو اُنکی زبان کی
جس سمت چاہے لیکے سفینہ اُدھر چلے
مرضی پہ ہم نے چھوڑ دیا بادبان کی
ہر اک ستم یہ سوچ کہ برداشت کر لیا
شاید یہی گھڑی ہے مرے امتحان کی
ہم وہ امیرِ دل ہیں خریدارِ حُسن ہیں
زینت بڑھی ہے جن سے تمھاری دکان کی
شعر و سخن کے فخر ہیں یوں تو ہزار رنگ
کچھ بات اور ہی ہے ہمارے بیان کی

فخر واحدی (قنوج)



غیر ممکن ہے کہ مٹ جائے صنم کی صورت
دل کا یہ نقش نہیں نقشِ قدم کی صورت
رات بیمار پہ بھاری ہے کہیں تارِ نفس
ٹوٹ جائے نہ ترے قول و قسم کی صورت
میکشو خوب پیو اتنا مگر ہوش رہے
جام چھلکے نہ کبھی دیدۂ نم کی صورت
کون ہے جس سے ہمیں پیار کے دو بول ملیں
آج کے لوگ ہیں پتھر کے صنم کی صورت
ہم سا بدبخت زمانے میں کوئی کیا ہوگا
ہم کو خوشیاں بھی ملیں درد و الم کی صورت
مے پرستوں نے جلائے جو عقیدت کے چراغ
شامِ میخانہ سجی صبحِ حرم کی صورت
فکر و احساس کی آنچوں سے پگھل کر واحد
مثلِ شمشیر ہوئی اپنے قلم کی صورت

واحد پریمی۔



غزلیں

اپنے جیسوں کی سائبانی میں
لطف آتا ہے لامکانی میں
جو زمیں کی تلاش میں نکلا
کھو گیا شہر آسمانی میں
اس نے صدیوں کی داستاں کہہ دی
ایک لمحے کی بے زبانی میں
آئنے ریت میں نمایاں تھے
عکس ابھرے ہوئے تھے پانی میں
ہم اداسی کے زرد پودے تھے
سبز موسم کی حکمرانی میں
ہر طرف حادثوں کا دریا تھا
اور ہم لوگ تھے روانی میں
ایک مدت کے بعد آیا ہے
نام اس کا مری کہانی میں

دیویندر گوتم

واقع پر جال یوں شبہات کا تانا گیا
قتل کرنے والے کو ابتک نہ پہچانا گیا
سنگباری میں بچا تھا بس وہی اک آئینہ
ہر کوئی اس کی طرف بے اختیارانہ گیا
تجربوں نے دور کیں فکر دں کی ناہمواریاں
ہوگئے کنکر الگ مٹی کو جب چھانا گیا
خود کو جب دیکھا نکل کر میں نے اپنے خول سے
جسم کیا مجھ سے تو چہرہ تک نہ پہچانا گیا
دیر تک ٹھہری رہی پرچھائیں اسکی ذہن میں
میرے سر پر جھک کے جو پنچھی بھی انجانا گیا
اجنبی تیروں کی زد پر تھا جہاں میرا شکار
ڈھال بن کر میں وہیں بے اختیارانہ گیا
جس جگہ کوئی نہیں تھا یاسؔ میرا روشناس
اس جگہ مجھکو مرے لہجے سے پہچانا گیا

نور محمد یاس

روز ڈوبے ہوئے سورج کو اگا دیتی ہے
رات کس کس کو اندھیرے میں صدا دیتی ہے
آگ ہر خواب کے جنگل میں لگا دیتی ہے
وقت کی دھوپ مجھے کیسی سزا دیتی ہے
آبشاروں سے ابھرتی ہوئی شاداب صدا
دل میں غالیچۂ خواہش کو بچھا دیتی ہے
تلخ سانسوں کے سفر کی ہی سزا ہے کافی
زندگی کیوں مجھے احساس خلا دیتی ہے
یوں تو جنگل سے سسکتی ہے ہوا صدیوں سے
خشک شاخوں کو مگر رنگ ہرا دیتی ہے
کرد وے حالات کے گرداب سے ہستی میری
لذت ساحل طفلی کو صدا دیتی ہے
تجھ سے بچھڑے ہوئے عرصہ ہوا پر جان کنول
تیری سوغات مجھے اب بھی رلا دیتی ہے

رمیش پرساد کنول

وہ دیکھے تو بہت
بنے تھے نہ ہم کبھی
اُن کی غزل سُنی تو یارو
وہ سنگ تراش نِکلا

دُرگاوتی سِنگھ

"تلاش ایک زندگی کی"

کیا پتہ تھا ہم کو
اس قید خانے کا
جہاں لے کے چلا فیض
ہمیں آج اس طرح
وہ تھے ہم تھے
کچھ لوگ اور بھی
ایک حسن گویا
چل رہا چپ چاپ اس طرح
کچھ ان کے لب پر آیا
کچھ ہم مچل گئے
وہ کہہ نہ سکے اپنی
کچھ ہم سمجھ گئے
اس خاموشی کا عالم
ایک شور بن گیا
تو کہہ دے یا کر چپ رہ
وہ ہو گیا بیاں
کچھ شوخیاں بھی دیکھیں
دیکھا ہے وہ ہنگامہ
وہ سُرخیاں بھی دیکھیں
جس کا بجا دمامہ
یہ شمع تو جلے گی
لے کے لہو جگر کا
ہے چاند کو بجھا دے
زمانے میں کوئی ایسا

ہر لمحہ قید ہوں گے
قتلِ عاشقی میں ہم
کرنے کو مگر چاہت
مجھ کو ہے ایک بار
یہ جسم کرائے کا ہے
جب چاہے قید کر لو
ہر سانس مگر اس کی
کہتی ہے بار بار
کچھ توڑ بنائیں گے
ایک دریچی ایک مینار
دیکھے گا وطن اپنا
ہو جائے گا دیدار

ہندی سے





غزلیں

اگرچہ ناگ سے شہ ناگ کو ڈسا نہ گیا
تناتنی کے تماشے بنا رہا نہ گیا
کبھو نہ ہم کو نوائے شکستِ عزم کہ ہم
فسوں طراز نہ تھے، آگ پر چلا نہ گیا
حصارِ ہفت بلا میں اسیر تھے ہم بھی
فرار سہل تھا لیکن ہوا بنا نہ گیا
مسافروں کی صعوبت کو کچھ تو کم کرتے
چراغ راہ گزر کی طرح جلا نہ گیا
وگرنہ طائرِ عصیاں کی مات ہو جاتی
شکاریوں سے کوئی جال ہی بُنا نہ گیا
اگرچہ موم نے گھل گھل کے بات سمجھائی
ہمیں تھے خوف گزیدہ کبھی کھلا نہ گیا
ہمیں گھٹن نے کچھ ایسے دبوچ رکھا تھا
شگفتگی کا فسانہ کبھی لکھا نہ گیا
تمام عمر اندھیرے مکاں میں بیت گئی
کسی بھی طاق پہ کوئی دیا دھرا نہ گیا
باختیار سے ملتے رہے تو کیا حاصل
بے اختیار سے با اعتنا ملا نہ گیا

فضا کوثری

میں آئینہ ہوں نہ پتھر مجھے تلاش نہ کر
مرے زمانے کے آذر مجھے تلاش نہ کر
میں کٹ چکا ہوں ترے ہاتھ کی لکیروں سے
مرے عزیز مکرر مجھے تلاش نہ کر
میں اپنی پیاس کا دیتا ہوں واسطہ تجھ کو
سراب ایسے سمندر مجھے تلاش نہ کر
میں روشنی کی کتابوں کا اک مصنف ہوں
سیاہیوں کے پیمبر مجھے تلاش نہ کر
اڑان بھرنے کی ہمت نہیں ہے اب دل میں
خیال و فکر کے شہپر مجھے تلاش نہ کر
جو ڈھونڈنا ہے مجھے ڈھونڈ تو غریبوں میں
کسی امیر کے گھر پر مجھے تلاش نہ کر
تری نظر کا تجسس ہے معتبر پھر بھی
مری بساط سے بڑھ کر مجھے تلاش نہ کر
مرے مزاج کو اب سرخیاں نہیں بھاتیں
لہو لہان سے منظر مجھے تلاش نہ کر
بکھر گیا ہوں میں اوراق کی زمینوں میں
نذیر نقطے کے اندر مجھے تلاش نہ کر

نذیر فتح پوری

اس شہر میں ہم جیسا بھی بدنام نہیں ہے
ہر ایک کی قسمت میں یہ انعام نہیں ہے
ہر دار کی قسمت میں مسیحا نہیں ہوتا
ہر شورشِ خوں اتنی خوش انجام نہیں ہے
پردیس سے گھر آکے بہت روئے جو دیکھا
دیوار پہ لکھا تھا جو اک نام نہیں ہے
ہم ساتھ ہی رکھتے ہیں چراغِ لب و عارض
"ہم جیسے مسافر کے لئے شام نہیں ہے"

انعام الحق علمی
گورنمنٹ کالج۔ سکوٹو۔ نائجیریا

گوشۂ بام سے، دہلیز سے، در سے ٹوٹے
جانے اب کے مری دیوار کدھر سے ٹوٹے
صرف انکار سے یا ذوقِ نظر سے ٹوٹے
دل ہی ٹوٹے گا بہر حال جدھر سے ٹوٹے
میں کہ تھا شیشہ صفت شیشہ بدن شیشہ مزاج
آستاں کتنے مرے کاسۂ سر سے ٹوٹے

شیث محمد اسمٰعیل اعظمی
گورنمنٹ کالج۔ سکوٹو۔ نائجیریا

کتابوں کی باتیں

کچھ نئی اور کچھ پرانی مطبوعات

• کتاب: میری دھرتی میرے لوگ (نادیشمونا پہ جلو)
• نوعیت: تلگو جدید رزمیہ • قیمت: چار روپے پچاس پیسے (دسمبر ۱۹۷۶ء)
• مصنف: ششندر شرما • ترجمہ: اختر حسن
• ناشر: انڈین لینگویز فورم۔ گوشۂ محل، حیدرآباد ۳۰۰۰۱۲

"ششندر اس دور کا ساز بھی ہے اور مغنی بھی وہ صرف اپنے عصر کا ترجمان ہی نہیں بلکہ شعور عصر کا معمار بھی ہے فن برائے فن کے ماننے والوں کو اس کتاب سے یہ سبق مل سکتا ہے کہ کس طرح ایک فن کار شاعرانہ اظہار جذبات میں بہ یک وقت عوامی بھی ہو سکتا ہے اور انقلابی بھی"۔

(ڈاکٹر شومبر ناتھ اپادھیائے)

ایک بلند قامت شاعر کی بلند قامت تخلیق میرے سامنے ہے۔ یہ بات قابل رشک ہے کہ تلگو زبان میں ایسی دولت ہے اور اس حقیقت میں میرے لیے ایک حیرت ناک مسرت ہے کہ تلگو زبان کا یہ حساس اور جمال پرس شاعر جو انقلابی جلال کی بلندی تک جاتا ہے اور جس کا دل انسانی محبت کے نور سے جگمگا رہا ہے میرا ہم عصر ہے۔ شاید یہ کہنا بہتر ہو کہ میں اس کا ہم عصر ہوں"۔

اس خوب صورت اور شاندار نظم کے لیے جس کی تخلیق شاعر نے صرف نو دن میں کی ہے شرما ہزاروں مبارک باد کے مستحق ہیں، اور میں اختر حسن کا شکر گزار ہوں جنھوں نے تلگو زبان کی اس دولت کو اردو پڑھنے والوں تک اس خوبصورتی سے پہنچایا ہے۔

(سردار جعفری)

اس شاہکار نظم نے شاعر کو موجودہ صدی کے ممتاز ترین شاعروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔
نظم کے ان ابتدائی مصرعوں

سحر کے افق سے ایک ہاتھ اٹھتا ہے
وقت کے مزدور کا ہاتھ

سے شاعر کی فکر آگے بڑھ کر یہاں تک پہنچ جاتی ہے

لمحے صرف وقت کے سپرد نہیں ہوتے
ایسا بھی ایک لمحہ آتا ہے
جو انسانی زندگی کا ایک فیصلہ کن موڑ بن جاتا ہے۔

اس کے بعد شاعر ایک تھمے ہوئے لہجے میں براہ راست شہری تہذیب کو نشانہ بناتا ہے۔ شہر کو

کتاب۔ لمس ہوا
نوعیت۔ غزلوں کا مجموعہ
شاعر۔ کیلاش ماہر
قیمت۔ دس روپئے
ناشر۔ اردو سماج جامعہ نگر نئی دہلی۔

" آزادی کے بعد جن نوجوان شعرا نے ترقی پسند شعری روایت کے زندہ اور درخشاں عناصر سے فیض اُٹھایا اور انھیں اپنی آواز میں سمو کر تخلیق فکر کے لئے افق تلاش کئے ان میں کیلاش ماہر بلاشبہ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ امتیازی اس لئے کہ معاشیات اور دوسرے سماجی علوم کی آگہی نے ان کے شعورِ حیات پر جلا کی ہے اور ان کی دردمندی کو انسان دوستی کا ایک ایسا آفاقی شعور بخشا ہے جو ان کے معاصرین میں خال خال نظر آتا ہے۔ اس شعورِ حیات کے نقوش ان کی نظموں میں زیادہ واضح اور روشن ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں مگر وہ غزل کے بھی حق آشنا ہیں اور اس بات میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ غزل، خواہ وہ کسی دور کی ہو شعری اظہار کی اس زندہ روایت سے اپنا رشتہ توڑ نہیں سکتی جس میں زبان کی چاشنی، محاورہ کی چستی اور لہجہ کی پُرکار سادگی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ حسن ادا کے یہ پہلو ہی غزل کا امرت رس ہیں"۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے یہ الفاظ لمس ہوا کے پیش لفظ سے ماخوذ ہیں انھوں نے اپنے پیش لفظ میں کیلاش کی فنکاری پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اور امید ظاہر کی ہے کہ یہ مجموعہ اہلِ نظر کو متوجہ کرے گا اور واقعی اس مجموعہ نے اہلِ نظر کو متوجہ تو کیا مگر کتاب کا اتنا ذکر نہیں ہوا جتنا ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ اہلِ نظر کئی گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ترقی پسندوں کے ایک حلقہ نے جان بوجھ کر فن کاروں کو نظر انداز کیا تو جدیدیوں نے ایک طرف قدآور شخصیتوں پر کیچڑ اچھالنے اور شب خون مارنے کا وطیرہ اختیار کیا۔ دوسری طرف ہر اس فن کار کو کوتاہ قد کرنے کے لئے گرد و غبار اُڑائے جن پر انھیں ذرا بھی یہ شبہ ہوا کہ وہ ترقی پسندوں سے قریب ہے۔

جدیدیوں نے خود محنت کرنے اور زندگی

شاعر شیطانی جبڑوں سے تشبیہہ دیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ

انسانوں کے شہر میں
اس کے باوجود کہ لاکھوں لوگ بھنبھنا رہے ہیں
وقت کو بالادستی حاصل ہے۔
دھرتی ایک قدرتی عجائب گھر ہے
جہاں درختوں اور جانوروں کی نسلیں ڈھلتی ہیں
اور ہمارے بچے — بال و پر طائر بھی ڈھلتے ہیں
شام کے سورج کی شعاعوں کے مانند

وقت کا مورخ جب اپنا فیصلہ سنائے گا تو ہندوستان کی اس عظیم شاہکار تخلیق کو امتیاز کی سند عطا کرے گا کہ یہ نظم ایک عہد کی آواز ہے جس کے گنبد میں تخلیق نو کی صدا گونج رہی ہے۔

(اندرا دیوی دھن راج گیرجی)

جب میں نے کچھ لکھا ہے تو اپنے لیے نہیں، صرف پانچ کروڑ تلگو والوں کے لیے نہیں، بلکہ ہمیشہ میں نے اپنے دیس کے ساٹھ کروڑ لوگوں کے لیے لکھا ہے۔ نیلگری کی کوکھ میں بیٹھ کر میں نے علم اور تجربے کی دو آنکھوں سے دنیا کے لوگوں کا، ان کی تواریخ کا، ان کی ہار جیت کا، ان کے عروج و زوال کا اور ان کے ماضی و حال اور مستقبل کا مشاہدہ کیا ہے اور اس طرح ایک آفاقی بصیرت سے یہ عصر کشید کیا ہے۔" ششندر شرما۔

- کتاب : اُردو شاعری میں قومی یک جہتی کی روایت
- مصنف : ڈاکٹر رام آسرا راز • سنہ اشاعت : ۱۹۷۷ء
- قیمت : پچیس روپے
- پتہ : عصری بک سنٹر ۱۴۱۰/۳ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲۔

یہ مصنف کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر بنارس ہندو یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انھوں نے موضوع کے ساتھ واقعی انصاف کیا ہے انھیں معلومات جمع کرنے، ان سے صحیح نتائج کرنے اور انھیں علمی طور پر پیش کرنے کا طریقہ آتا ہے۔ وہ منطقی اور علمی ذہن رکھتے ہیں۔ جابجا انھوں نے متوازی تنقیدی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے یہ مقالہ اردو کے تحقیقی اور علمی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ثابت ہوگا۔

اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ تعلیم یافتہ طبقے میں مروج بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے بلکہ اس سے قومی یکجہتی کے فروغ میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

رام آسرا صاحب کی دونوں قابل قدر کتابیں اس قابل ہیں کہ انہیں ہندی میں بھی ضرور شائع ہونا چاہیے۔

کا شعور حاصل کرنے کی بجائے دوسروں کو گالیاں دے کر اپنے کو نمایاں کرنا چاہا۔ علاوہ از ینا انھوں نے بے معنی الفاظ کو ہی جدیدیت کی علامت سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف قارئین ادبی رسائل سے دور ہو گئے دوسری طرف ادیب لوگوں سے کٹ کر رہ گئے اور سارد و بچاری جو پہلے ہی اپنے اور غیروں کے ستم کا نشانہ تھی اس شب خوں سے بالکل لہو لہان ہو گئی۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا کہنا یہ ہے کہ کیلاش ماہر کی غزلیں ذہن و جذبہ کی تسکین، تہذیب اور تطہیر کا بہترین ذریعہ ہیں اور ملس ہرا کا مطالعہ ہر خوش ذوق قاری کے لئے باعث انبساط ہوگا چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل کے زخموں پہ نہ جاؤ کہ بڑی مدت سے
یہ دیئے یوں ہی سر شام جلا کرتے ہیں

ہم نے بھی زہر پیا، ہم بھی ہوئے ہیں مصلوب
کون لیکن ہمیں پوجے گا رسولوں کی طرح

کبھی برگد کا سر راہ نہ احسان لیا
اپنا سایہ تھا کڑی دھوپ میں خود تان لیا

ایک دیوار تھی خوشبو کی جو حائل ہی رہی
جسم در جسم مرے سامنے آیا کوئی

یہ ذکر صنم، دیدہ نم، پرسش غم کیا
دل والے تو بے وجہ بھی رنجیدہ رہے ہیں

● ● ●

کتاب۔ پرچھائیوں کا جلوس۔
شاعر۔ جگن ناتھ پرساد داس۔
ترجمہ۔ شاہدہ سعید۔
ناشر۔ مرکز معاشی ترقی۔ ایوان غالب مارگ نئی دہلی۔
قیمت۔ دس روپے۔

سعید سہروردی تعارف کے عنوان سے لکھے ہیں سچے۔ پی داس کی شاعری پرچھائیوں کا علا ہے جس میں ہمیں اپنی اور اپنے معاصرین کی پرچھائیاں مل جائیں گی۔ سہروردی کے بیان میں صرف اتنا اضافہ ضروری ہے کہ یہ پرچھائیاں اصلی بھی ہیں طلسمی بھی، جام جم کی طرح ان پرچھائیوں سے

کچھ موہوم ہے کبھی یہ تصویریں فرضی ہیں، کبھی پھول، کبھی آئینہ، کبھی نقلی چہرہ، کبھی پہلا پیار اور کبھی انتظار۔ اس کتاب میں کل ۲۶ عنوانات ہیں اور ہر عنوان قاری کو مسحور کر لیتا ہے۔ یہ نظمیں ایک مکمل وجود رکھتی ہیں اس لئے ان کے اقتباس سے کام نہیں چلے گا نمونہ کے طور پر ایک مختصر نظم ملاحظہ کیجئے۔

لاش

سڑک کے درمیان
کسی کی لاش پڑی ہے
دوسری طرف لوگوں کی بھیڑ جمع ہے
کچھ لوگ پاس سے گزر گئے
کچھ نے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا
کچھ لوگوں کے قدم رک گئے
کچھ لوگ خاموش رہ گئے۔

کوئی اس راہ سے
منتر پڑھتا گزر گیا
یہ کس کا بچہ تھا
جس نے پھول توڑا؟
کس نے قہقہہ لگایا

کس نے ہاتھ پھیلا کر
وقت کو روکنے کی کوشش کی

سنسان سڑک پر
کسی کی چیخ گم ہو گئی
روشنیوں کے سیلاب میں
کوئی سڑک پر غائب ہو گیا
گہری آہ کے ساتھ
کسی نے اپنے خواب جلا دئیے
کوئی اُف کر کے رہ گیا
کسی نے شمع سے
زندگی کا تصور لیا
کسی نے دھندلکے میں
اپنا راستہ تلاش کیا

سب چلے گئے
سڑک سنسان ہو گئی
لمحے ابدی خلا میں گم ہو گئے

سڑک کے درمیان
ایک لاش بدستور پڑی ہے۔
اور میں ایک سنسان جزیرے میں سو رہا ہوں

اس نظم کا انتخاب محض اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ مختصر ترین نظم ہے۔ دوسری نظمیں ذرا طویل مگر جب ہم نظم پڑھتے ہیں تو طوالت کا احساس نہیں ہوتا۔ پڑھتے جائیے اور دنیائے تجربات کے اسرار کھلتے جاتے ہیں ایک طلسم ہوشربا ہے جس میں آدمی محو ہو جاتا ہے کھو جاتا ہے بہت کچھ پانے کے لئے۔ مجھے نہیں معلوم اڑیا شاعروں میں جے پی کا کیا مقام ہے مگر یہ طے ہے کہ اردو میں ایسے شاعر بہت کم ہیں جنھوں نے اس طرح کی نظمیں ہیں۔ اور ان میں بھی سب سے نمایاں ہیں اختر الایمان۔ تجربے اور TREATMENT دونوں اعتبار سے جے پی اور اختر الایمان میں کئی انداز مشترک ہیں، حیرت، بے خودی بے بسی اور ہشیاری کے علاوہ دونوں شاعر اپنی ذات کے واسطے سے بیرون ذات کا سفر کرتے ہیں اور بیرون ذات کے رہ گزر سے اندرون ذات کی سیر دونوں شاعر حدیث دل سے زیادہ اس پرندے کی بات کرتے ہیں جو ان کے اندر محبوس ہے تڑپتا ہے مگر اڑ نہیں سکتا۔ دونوں سوچتے

"میرے جسم کے اندر
جو پرندہ چیختا ہے
وہ کیا کہہ رہا ہے؟"

دونوں کے نزدیک ہے۔

"آسمان، ہوا، سمندر کی ریت
اور بہت سے سوالات"

"پرچھائیوں کا جلوس" کے مطالعہ کے بغیر آپ زندگی کے بہت سے نادر و نایاب تجربات سے محروم رہ جائیں گے۔ چلتے چلتے چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

وقت کی بکھری بکھری ریت پر
سنبھل کر چلتا ہوا
میرا حافظہ
گزرے ہوئے لمحوں کے
ٹوٹے ہوئے کھلونے
اور قربت کی راتوں کی نشانیاں
تلاش کرتا ہے
میں اپنا سب کچھ تمھیں دے جاؤں گا
اگر ایک بار مجھے مل جائے
کامیاب محبت
جو میری ساری زندگی ہو گی!

"میری محبوبہ تمھارے نام"

●●●

کتاب۔ کاروباری خط و کتابت۔
مصنف۔ محمد احمد ابن مخدوم ایم۔ اے۔
ناشر۔ کرناٹک اشاعت گھر۔ بنگلور۔
قیمت۔ دس روپئے۔

اس کتاب کے تعلق سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب اس لئے نہیں لکھی گئی کہ مصنف کو کوئی کتاب لکھنی تھی بلکہ یہ کہ اس کتاب کی ضرورت تھی۔ اردو میں خط نویسی اور مضمون نگاری پر یوں تو کئی کتابیں ہیں مگر کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کا موضوع کاروباری نوعیت کے مضامین اور کاروباری خط و کتابت ہو اس کتاب نے اس کمی کو پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کاروباری خط کے اہم نکات، کاروباری خط نویسی کے قواعد، زبان، تجارتی خطوط اور سفارش نامے، گشتی نامہ نگاری کے علاوہ کاروباری خطوط کے موضوعات، مضمون نگاری وغیرہ کے علاوہ بھی کئی ایسے امور پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی عدم واقفیت سے کاروبار پر برا اثر پڑتا ہے۔ بعض چھوٹی چھوٹی باتیں کاروبار کی ناکامی اور کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ مصنف نے اپنے تجربے کا نچوڑ اس کتاب میں پیش کر دیا ہے۔ اس نے کاروبار کی تنظیم اور خطوط کے شعبہ کی تنظیم و تہذیب کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ اصطلاحات بھی پیش کی گئی ہے۔ کئی اصطلاحوں کے اردو مترادف غالباً پہلی بار پیش کئے گئے ہیں۔ البتہ چند اصطلاحات کے ترجمہ میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے مثال کے طور پر AGREMENT کا ترجمہ اقرار نامہ کیا گیا ہے جب کہ اس کا ترجمہ عام طور پر معاہدہ کیا جاتا ہے۔ COMMISSION کا ترجمہ حق شراکت

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

ہمارے مسائل

ڈاکٹر احسان اللہ

مفکرین عالم صدہا سال کے تجربے اور مشاہدے کے بعد اس وقت اس نتیجہ پر متفق ہیں کہ خدا تمام عالم کو ایک منظم نظام کے تحت چلا رہا ہے اور وہ اس کا سختی سے پابند ہے۔ انسان کو خدا نے نائب کی حیثیت سے دُنیا کا نظام چلانے کے لئے پیدا کیا اور یہ تاکید بھی کر دی کہ ایک انسانی گروہ کو نیابت کا مقام اسی وقت تک حاصل رہے گا جب تک وہ خدا کے احکامات کا خود پابند رہے گا اور ان قدروں کو لوگوں پر نافذ کرے گا اور جب وہ کاہلی یا انحراف کا رویہ اختیار کرے گا تو خدا ان کو نیابت کے درجے سے ہٹا دے گا اور ان کی جگہ پر دوسرے انسانی گروہ کو بٹھا دے گا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا لہٰذا کوئی انسانی گروہ، قوم یا مذہبی طبقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خدا کا عزیز ترین بندہ نہیں رہے گا بلکہ اس کی کارکردگی کی بنا پر مقام کا تعین ہوگا۔

اب یہ معلوم کرنا ہے کہ آخر وہ کون سے خدائی احکامات ہیں جن کی پابندی سے نیابت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مسلم مفکرین نے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حق اللہ (عبادت اور مذہبی رسومات) اور حق العباد (سماجی قوانین کی پابندی) ان حقوق کی ادائیگی میں جو وقت صرف ہوتا ہے اگر اس کا تعین کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق اللہ میں ۲۴ گھنٹوں میں سے محض ایک گھنٹہ صرف ہوتا ہے اگر محض فرض کی ادائیگی تک محدود نہ ہو اور سنتوں کو ملا بھی لیا جائے تو کُل دو گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔ اس طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ حق اللہ اور حق العباد میں دال اور نمک کا تناسب ہے۔ یہی تناسب جب تک کسی قوم میں برقرار رہتا ہے وہ نیابت کے مقام پر فائز رہتی ہے۔

پانچ ہزار سال قبل سے جب کہ انسانی تہذیب کا آغاز ہوا اور اس وقت تک قوموں کے عروج اور زوال کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم میں عروج کے وقت تقسیم اوقات اسی طرز پر تھے جس طرح مسلم مفکرین نے کہا ہے۔ اگرچہ حق اللہ کے معاملہ میں ابتدائی قوموں میں خدا کی پرستش فطری طاقتوں اور دیوی دیوتاؤں کی شکل میں ہوتی تھی مگر حق العباد کے معاملہ میں ہر قوم نے عروج یا نیابت کے لئے انصاف پسندی، جفاکشی اور ایمانداری کو بُنیادی ستون کی حیثیت دی اس لئے کہ جب انصاف ہوگا تبھی ہر فرد جفاکشی سے کام کرے گا کیونکہ ان کو یقین ہوگا کہ اس کو اس کی محنت کا صلہ ملے گا اور کوئی بے ایمانی کرنے کی جرأت نہ کرے گا اور اس طرح پوری قوم ہر میدان میں سبقت لے جاتی ہے مگر اپنے عروج کے دور میں ہر قوم ان بُنیادی اصولوں کی بنا پر سماجی قوانین مرتب کرتی ہے اور حالات کے بدلنے پر اس میں ترمیم بھی کرتی رہتی ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اس قرآنی حکم کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ قحط کے زمانہ میں چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع کر دیا اور اس قرآنی حکم کہ کتابیہ عورتوں سے شادی کرو اس حکم کو روک دیا جب مسلم فتوحات شام وغیرہ علاقوں میں مسلمانوں نے وہاں کی خوبصورت کتابیہ عورتوں سے عرب کی کم خوبصورت مسلم عورتوں کے مقابلے میں شادی کرنی شروع کر دی لیکن جب قوم میں قوانین کی روح ختم ہو جاتی ہے تو وہ قوانین کے الفاظ پر عمل کرنے لگتی ہے اور دھیرے دھیرے جس طرح حالات بدلتے رہتے ہیں اسی طرح یہ قوم دھیرے دھیرے زوال پذیر ہوتی رہتی ہے اگر لوگ انھیں قوانین کی پابندی ہی کو ترقی کا راز سمجھتے رہتے ہیں تو پھر دوسری قوم نیابت کی حق دار ہو جاتی ہے اور زوال پذیر قوم پر نئے سماجی قوانین کا غلبہ ہوتا ہے لہٰذا ایسی حالت میں تنزل پذیر قوم حق اللہ کی جانب زیادہ راغب ہوتی ہے اور وہ اپنی ترقی محض دُعاؤں کے ذریعے حاصل کرنی چاہتی ہے اور پوری قوم عملی طور سے معطل ہو جاتی ہے۔ ایسی مثالیں تاریخ میں بھری پڑی ہیں مثلاً یہ کہ جب مسلمانوں نے یروشلم پر حملہ کیا تو وہاں کے عیسائی علماء گرجا میں مسلمانوں کی ناکامی کی دُعائیں مانگ رہے تھے اور اسی طرح جب محمود غزنوی سومناتھ پر حملہ کرنے کے لئے فوج کشی کر رہا تھا تو سومناتھ کے پجاریوں نے اس علاقے کے ہندو راجاؤں کو جنگ کرنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ وہ مندر میں دیوتا سے دُعا کر کے غزنوی کی فوجوں کو ہرا دیں گے ــــ اس طور پر آج تمام مسلم دنیا میں مسجدوں میں مسجد اقصیٰ کو اسرائیل کے قبضے سے حاصل کرنے کے لئے دُعائیں کی جا رہی ہیں۔ بجائے اس کے کہ اپنے اندر ایسی قوت حاصل کریں کہ جس طرح عیسائیوں سے یروشلم حاصل کیا تھا اسی طرح یہودیوں سے بزور شمشیر حاصل کر سکیں۔

جب قومیں رو بہ زوال ہوتی ہیں یا جب رو بہ عروج ہوتی ہیں تو اس درمیانی وقفہ میں جس ادارہ کا حاکم اعلیٰ سمجھدار اور باصلاحیت ہوتا ہے تو وہ ادارہ ترقی کرتا ہے اور جس ادارہ کا حاکم اعلیٰ کمتر درجہ کا ہوتا ہے تو اس ادارہ کا حال بھی کمتر ہو جاتا ہے۔ اس کو مزید سمجھنے کے لئے مسلم اداروں کا تقابلی مطالعہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

اب تک ہم نے اصولی بحث کی ہے اب ہندوستان میں مسلم مسائل کیا ہیں اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ اوّل یہ کہ ہندوستان میں مسلمان تنزل پذیر قوم کی حیثیت سے ہیں لہٰذا یہ مجموعی طور سے جدوجہد سے کامیابی حاصل کرنے کے بجائے دُعاؤں سے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس بنا پر دن بدن پیر اور قبر پرستی بڑھتی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں عقل سے کام لے کر کسی مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے اسلاف پرستی اور تقلید پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ کسی قوم نے آج تک

بقیہ دولت کی ہار

. خوشحالی کا کبھی اتحاد قائم نہیں رہ سکتا
کیا ان کی اولادیں اپنے چچا، تایا کی جدائی کا درد نہیں جانتیں.... استنے تجربوں اور مشاہدات کے بعد وہ چاہے کتنا ہی نادار سہی ایسی نوجوان بیٹی کا کیسے رشتہ قائم کر سکتا تھا جب کہ اسے مہذب نادار جوان اور بیٹی کی گھر کی تجسس تھا اور آخر غریب باپ کے تمام تصورات کی روحوں نے بدن بدل لیے شہر، محلہ کی خوشحال آنکھیں دیکھتی رہ گئیں اور دودھ شہد کے دریا میں جا کر تحلیل ہو گیا بوڑھے باپ کی دیرینہ خواہشوں کے خشک پیڑوں کی شاخیں سرسبز ہو گئیں ... ذہن پر رہا ہوا بوجھ اتر گیا وہ اب اپنے مالی معاملات بیٹے کی زندگی میں راحتوں کے امکانات پانے کی نگہبانی کی تھکانیں بے خوف ہو کر اپنے میں مصروف . . . ، اور اس کی اکلوتی بیٹی نے سسرال میں داخل ہو کر ساس کی شفقتوں میں اپنی مرحومہ ماں کی ممتا پانے لگی. اور ساس کے اکلوتے بیٹے سے شوہر کی تمام خوبیاں حاصل کرنے کے ساتھ ایک نیک سیرت اور مہذب خاوند کی شخصیت پر دولت کے معاملے میں زیادہ مغرور نہ تھا ... وہ ایک غریب باپ کی بیٹی ضرور تھی مگر اب ایک ملکیت ہوں بھی ہے۔ یوں وہ اکثر سوچتی رہتی ہے کہ قلاش لوگوں میں مالداروں کا تذکرہ اعلیٰ سیٹھ تصور کیے جانے کا ثبوت ہے..... اور دولت مند لوگوں میں مفلس مہذب لوگ بیٹھے ہیں ان کی معصومیت اور دانشوری کی دلیلیں ہیں...... اور اس سے بڑھ کر دولت کی ہار کیا ہو سکتی ہے۔ ••

بقیہ ہمارے مسائل

دُعائیں۔ معجزات اور جذبات میں بہہ کر ترقی

[illegible] ہے اور [illegible] مسلمانوں کی ترقی کے لئے وہی مشکل طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔

دوسری طرف ہندوستان اس وقت ترقی کرنے کو شش کرنے والے ملکوں میں ہے لہٰذا یہاں پر جفاکشی انصاف پسندی اور ایمانداری کی وہ قدر و قیمت نہیں ہے جو ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ اس بنا پر اس وقت یہاں پر وہی لوگ زیادہ کامیاب ہیں جو اغراضی طریقہ اختیار کرتے ہیں اور مسلمانوں میں بھی وہی کامیاب ہیں جو مروجہ طریقوں کو اپناتے ہیں مگر برادرانِ وطن میں زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے عناصر ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ اپنے فوائد کے ساتھ ساتھ قوم کی ترقی کے لئے اپنے وسائل استعمال کرتے ہیں مگر مسلمانوں کے بارسوخ اور باثروت حضرات محض اپنی ذاتی ترقی میں لگے ہوئے ہیں ان میں سے مشکل سے کوئی ایسا ملے گا جس کو اصلی قومی درد ہو اور اگر کوئی صاحب ایسا کرتے بھی ہیں تو زیادہ تر اس میں ان کی کوئی ذاتی غرض شاملِ حال ہوتی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں جو واقعی صحیح ترقی کے خواہاں ہیں ان کو ہر جگہ مشکلات کا سامنا ہے کیونکہ انصاف کی کمی کی بنا پر مسلم طلباء جفاکشی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے ہیں جو برادرانِ وطن کے لڑکوں میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ برادرانِ وطن کے لڑکوں کو پورا یقین ہے کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے گا اور اگر ناانصافی بھی کی گئی تو وہ کم تر نہ ہوگی جب کہ مسلم طلباء میں اس یقین کا فقدان ہے جو کہ اب تک کے تجربہ کی بنا پر ہے۔ یہی حال کم و بیش تجارت۔ زراعت اور صنعتی میدان میں بھی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جب ہندوستان عروج پر ہوگا اور انصاف پسندی عام ہوگی تو مجھے ہندوستانی مسلمان برادرانِ وطن سے کسی میدان میں بھی کم نہ ہوں گے۔ لیکن اگر ہندوستان میں یہ درمیانی وقفہ لمبا ہو گیا تو مجھے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مشکلات اور بڑھ جائیں گی۔

کتابوں کی باتیں

کیا کہا ہے جب کہ صرف رعایت یا چھوٹ کافی ہے۔ اسی طرح FOREIGN EXCHANGE کا ترجمہ زیادہ تر شرح زر کی بجائے زرمبادلہ کیا جاتا ہے۔ KNOW-HOW کا ترجمہ صلاحیت کی جگہ مہارت ہونا چاہئے۔

کہیں کہیں زبان و بیان کی بھی لغزش نظر آتی ہے مگر ان باتوں سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اُمید ہے کہ کتاب نہ صرف کاروباری حلقوں میں بلکہ عام قارئین کے لئے بھی مفید مطلب ہوگی اور اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ اور صاحب کتاب اپنے تجربات کو تحریری زبان دے کر معاشیات اور کاروباری تنظیم کے موضوعات پر مزید تصنیفات پیش کریں گے۔ ب۔ا

"راجندر سنگھ بیدی" ہاتھ میں ہے، ساتھ میں ہے۔ ذرا بھی مریضوں سے دقفہ پاتا ہوں پل پڑتا ہوں۔ اور آج تو رات کے قریب دو بجے ایک سیریس آپریشن کی تیاری ہے۔ مریضہ بار بار چیخ اٹھتی ہے۔ میرا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ "لاجونتی" افسانے کے اوراق کھلے ہیں۔ زندگی در زندگی۔ زندگی از زندگی۔ ایک سلسلہ ہے جو آدم سے شروع ہوا اور حوا کے توسط سے اب تک جاری اور ساری ہے۔ وہ جو آدم کا سیل "کن فیکن" سے مصداق سے بنا، جاری و ساری ہے۔ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتا۔ اور اس لئے سب انسان ایک ہی سیل کے ہیں۔ سب انسانوں کے آنے اور جانے کے مارگ بھی ایک ہی ہیں۔ ایک جیسے

آپ نے کاوش کی ہے۔ جو محنت کی ہے وہ قابل تعریف ہی نہیں بلکہ زبان و ادب پر ایک بے مثال احسان ہے اور زبان اردو پر ریسرچ کرنے والے طالب علم ہمیشہ آپ کو دُعائیں دیں گے۔

ایک بات کی شکایت ضرور ہے اتنی اچھی کتاب اور اس کی جلد اتنی کمزور۔ جناب بیدی صاحب کے الفاظ میں "پگڑی کی طرح مگڑی" ہونی چاہئے تھی۔ پھر بھی۔

بقیہ خیریت ہے۔ میری "سہیل بنام اسری" کتاب آپ کو مل گئی ہوگی کیسی ہے اور ہماری کاوشوں سے ادب و سہیل صاحب کی ذاتیات کی کیسی خدمت ہوگی۔ از راہِ کرم جواب مرحمت فرمائیں۔

اسری ارشد

نوید عشرت ۔ ایک خط

میرے غم گسار ۔ ہمیشہ سلامت رہو

اس مرتبہ آپ مجھے اس قدر یاد آرہے ہیں کہ شاید شادی ہونے کے بعد کبھی اتنی بے قرار ہوئی ہوں۔ جعرات سے میں بہت زیادہ بے چین ہوں۔ آج تک ایسی پریشانی نہ ہوئی تھی۔ اور نہ خدا کرے آئندہ ہو۔ کاش یہ پریشانی کسی کے دور کرنے کی ہوتی، تو اس کی تمام عمر احسان مند رہتی۔ دل کو سکون اس لئے نہیں کہ آخر یہ ہوا تو کیا ہوا۔ دماغ چکر میں ہے۔ میں اپنی گود پھیلائے ہوئے تھی۔ اور آپا زیور کی پوٹلیاں رکھتی جا رہی تھیں۔ میں کم بخت لیتے وقت اگر انہیں گن لیتی یا پھر کھول کر دیکھ لیتی تو اچھا تھا۔ افسوس اتنا بھاری الزام دوسرے چوری کی بدنامی۔ اگر اور کوئی بات ہوتی تو برداشت کر لیتی۔ یہ ایک ڈیڑھ سو کی رقم کا ڈانڈ تو بھر دیتی گی لیکن دل کو قرار اسی وقت آسکتا ہے جب مجھے پورے طریقے سے یہ معلوم ہو جائے کہ خطاوار میں ہوں یا آپاٹ۔ انہوں نے مجھے دیا بھی ہے۔ یا نہیں۔ دل کا یہ شبہ دو ہی صورتوں میں دور ہو سکتا ہے۔ اوّل تو استخارہ کراؤں کہ یہ کس کا کام ہے۔ پھر حلف خود بھی اٹھاؤں گی یعنی میں نے قطعی کھول کر نہیں دیکھا کہ کس پوٹلی میں کیا ہے دوسرے میں نے ٹیکا آنکھ سے بالکل نہیں دیکھا۔ میری آنکھوں بھر کی یہی دعا ہے کہ یا اللہ جس کسی کا اس ٹیکے میں ہاتھ ہے۔ اس کو آنکھوں سے اندھا اور ٹانگوں سے اپاہج کر دے۔ خون اس کے بدن سے جھڑنے لگے۔ دنیا میں رہ کر جذامی ہو اور تندرستی سے بیکار ہو کر بیٹھے میرے دوست کاش دل چیر کر دکھانے کا ہوتا۔ میں اس صدمے سے کس قدر گھائل ہوں۔ میرا دل کتنا بے چین ہے رات کو بھی کئی کئی دفعہ ہڑبڑا کر آنکھ کھلتی ہے بس زبان سے یہی نکلتا ہے کہ یہ کیا ہوا۔ میں چور کہلاؤں گی۔ یہ محمد احمد کو بُرا سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ چوری کی وجہ سے دوسروں کو بُرا سمجھتی تھی۔ خود چور بن گئی۔ اب گھر والے مجھے بھی چور تصوّر کریں گے۔ میں خوشی سے اس کی قیمت ادا کر دوں گی۔ خواہ مجھے اپنا تن پیٹ کاٹنا پڑے یا پھر سب زیوروں میں زیور میرے پاس چھوٹے ہی ہیں، ان کو دے دوں گی۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ آپا سے ہی کہیں رہ گیا ہے۔ اور کسی کی نظر پڑ گیا۔ جب یہ چاندپور چلی گئی تھیں۔ اس وقت میں والدہ کے گھر تھی۔ ہو سکتا ہے گھر میں بھائی شدّو، محمد احمد یا اور کوئی فریق ہو۔ یہ تو اللہ ہی جان سکتا ہے کہ کس نے اٹھایا۔ غیب کا حال کسے معلوم۔ یہ نہیں کھلتا کہ یہ بھید کیا ہے۔ مگر اتنا یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ میرے ہاتھ میں سے گرا کہیں نہیں ہے میری گود میں زیور تھا۔ اور ہاتھ میں روپے تھے۔ اپنے گھر لا کر نوا کے سامنے ہی ان کے صندوق میں چار پوٹلیاں گن کر رکھیں اور اسی طرح نوا نے وہ چاروں پوٹلیاں انہیں لوٹا بھی دیں آپا کہتی ہیں کہ پانچ میں پوٹلی میں ٹیکہ تھا۔ میری غلطی یہ ہے کہ لیتے وقت میں نے یہ پوٹلیاں نہیں گنیں آپا نے یہ ضرور جتایا تھا کہ اس میں ٹیکہ بھی ہے۔ گھر جا کر گنا تو چار عدد تھے۔ میں نے بھی نوا سے یہی کہا کہ اس میں ٹیکہ ہے۔ لیکن ہم نے پھر بھی کھول کر ایک چیز نہیں دیکھی۔ بتائیے کیا بات قائم کی جائے۔ میں نے بتاتے ہیں کہ پوٹلی میں آپا نے مجھے نہیں دیا۔ اس غلطی کے کارن کیا کیا سن رہی ہوں۔ خدا جواب دے گا مفت میں بدنام ہوئی۔ عقل پریشان ہے کیا کروں۔ خدا جانے اب تم بھی میرے متعلق کیا رائے قائم کرو۔ یا اللہ مجھے موت دے دینا مگر دنیا میں رہ کر چور مت کہلوانا بخدا میں نے آج تک ایسی حرکت کبھی نہیں کی۔ کیا محب، میرے دل کے چین، میرے سکون، میری تھوڑی سی مدد کر سکتے ہو مجھے کچھ سکون دے سکتے ہو۔ نہیں۔ علاوہ اللہ کے، اس میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا کیا ہی اچھا ہو اگر غیب سے اس ٹیکے کا سراغ مل جائے۔ آخر کہاں گیا۔ کس کے پاس ہے۔ کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسا شخص ہے جو فال نامے یا کسی اور ترکیب سے یہ بتا دے کہ ٹیکہ آپا سے کھو گیا یا مجھ سے لیکن آپ تو ان باتوں کو مانتے ہی نہیں، آپ کا اعتقاد ہی نہیں۔ ان چیزوں پر صرف گھبرانا بدنامی سے ہے۔ دنیا کی باتیں تو الگ رہیں۔ خاص گھر کے لوگ کیا سمجھیں گے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں ابھی تک بالکل خاموش ہوں بھائی اور بھابی کو بھی یہ بات معلوم نہیں خدا اپنا رحم کرے۔ اور مجھے ہر طرح کی بدنامی سے بچائے۔



ٹ آپا ۔ مراد ساس

آج کے دور میں پیغام سے زیادہ اس کو پیش کرنے کی اہمیت ہے۔ عظیم دانشور میکلوہان کا خیال ہے کہ میڈیم کو دراصل پیغام سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ لکھتا ہے کہ پیغام اسی وقت پر تاثیر ہو سکتا ہے جبکہ اس کے لئے صحیح میڈیم استعمال کیا جائے چنانچہ میکلوہان نے ریڈیو کو ٹیلی ویژن پر ترجیح دیتے ہوئے کہا ہے کہ ریڈیو —— HAT MEDIE اور جبکہ ٹیلی ویژن COOLMEDIA کہا تا ہے بصری طاقت کے مقابلہ میں آواز زیادہ اثر دکھاتی ہے۔ ٹی وی اور فلم کا تجزیہ کرتے ہوئے میکلوہان لکھتا ہے کہ جب آپ فلم دیکھتے ہیں تو آپ کی حیثیت کی ہو جاتی ہے لیکن ٹی وی دیکھتے وقت یہ حیثیت اسکرین کی ہو جاتی ہے اس بحث سے یہی نتیجہ نکلا کہ پورا ترسیلی عمل چار اجزا پر مشتمل ہے ترسیل کا پیغام، وسیلہ اور سامعین ناظرین یا قارئین اس کو نامور فلسفی ہیرالڈ لاسویل نے اس طرح پیش کیا ہے WHO SAYS WHAT IN WHICH CHANNEL TO WH OM WUK WHAT EFFECT کون کہتا ہے، کیا، کس میڈیم کے ذریعہ، کس کو اور کس انداز سے

ماس کمیونیکیشن یا ترسیل عامہ کی اس حقیقت کو جاننے کے بعد ہم مختصر طور پر اس کی اہمیت کا بھی جائزہ لیں گے۔

ہماری زندگی کی تعمیر و تشکیل، رہن سہن کے انداز افکار اور رویوں پر ترسیلی ذرائع کا اثر ہے۔ ہمارے شب و روز اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے رہین منت ہیں ہمارا دن اخبار سے شروع ہوتا ہے اور ریڈیو ٹیلی ویژن یا فلم پر ختم ہوتا ہے۔ میکانیکی اور مصروف زندگی نے انسان کو اس قدر الجھا دیا ہے کہ اب وہ کسی جلسہ میں پہنچ کر اپنے لیڈر رہنما کی تقریر سننے کے بجائے اس کو اخبار میں پڑھنے یا ٹی وی دیکھنے سے دلچسپی [illegible]

میں تو یہ رجحان عام ہو گیا ہے اس لئے وہاں انتخابات میں امیدواروں کو اخبار ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا سہارا لینا پڑتا ہے ابھی ہندوستان کے عوام اس قدر مصروف نہیں ہوئے لیکن بڑے شہروں کی زندگی میں رفتہ رفتہ نمایاں تبدیلیاں آ رہی ہیں معلومات کا حصول، ذہنی تربیت، تفریح طبع شخصیت کی تعمیر و تشکیل، بول چال کے انداز سماجی رویہ اور انداز فکر پران ہی ترسیلی ذرائع کے اثرات نمایاں ہیں۔

ریڈیو پر بجنے والے گیت ہمارے لئے ذہنی مسرت کا باعث ہیں عظیم فنکاروں کے فن سے لطف اندوز ہونے کا ہمیں موقع بھی ملتا ہے ریڈیو پر تشہیر ہونے والے اشتہارات ہمارے معیار زندگی کو زیادہ بنانے میں معاون ہوتے ہیں اور یہ ہمارے کے استحکام کا باعث بھی ہیں۔

موجودہ دور میں فلموں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فلم آج ایک موثر میڈیم بن چکا ہے۔ ہمارے طرز زندگی فیشن لباس اور رہن سہن کے انداز پر فلموں کا اثر نمایاں ہے۔

ہندوستان میں فلموں کے ذریعہ ذہنی انقلاب لانے میں بڑی مدد ملی ہے سماجی رویوں میں بھی تبدیلی کے لئے ہماری فلمیں ذمہ دار ہیں۔ اس کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ تعلیم نسواں اور عورتوں کے لئے ملازمت کو ناپسند کیا جاتا رہا لیکن آج عورتوں کو زیادہ آزادی حاصل ہے سماجی امتیازات بھی بڑی حد تک کم ہوئے ہیں محبت کی شادی گناہ سمجھی جاتی تھی لیکن اب وہ عام ہوتی جا رہی ہے یہی حال لباس اور طرز زندگی کا ہے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ آج کے دور میں فلم تفریح و نشاط کا ذریعہ ہی نہیں ہیں بلکہ ہماری زندگی کی تعمیر تہذیب [illegible] کا حصہ ہے۔

رائے عامہ ایک ایسا انجن ہے جو جمہوریت کی گاڑی کو چلائے رکھتا ہے اس کا واحد وسیلہ اخبارات ہیں رائے عامہ کی تشکیل میں اخبارات کا اہم رول ہے۔ یہ حکومت کے لئے واچ ڈاگ WATCHDOG کا کام انجام دیتے ہیں فکسن کا واٹر گیٹ پروفیومو اسکنڈل موشے دایاں سے مرارجی کی خفیہ ملاقات اور اس طرح کے بے شمار واقعات کا انکشاف اخبارات کے ذریعہ ہوا ہندوستان کی تحریک آزادی میں صحافت کے رول کو بھلایا نہیں جا سکتا، جمہوریت کے تحفظ کے لئے صحت مند صحافت ایک موثر ہتھیار ہے بس اس پر بحث نہیں کروں گا کہ ہندوستان میں صحافت کس حد تک ذہنی تحفظات کا شکار ہے لیکن بہر حال عصری سماج میں صحافت ایک ناقابل تسخیر قوت بن چکی ہے۔

آج کے دور میں سیاسی پروپگنڈہ ہو کہ مذہبی تبلیغ شعر و نغمہ ہو کہ افکار و نظریات کا پرچار، اظہار کے ان وسیلوں کے بغیر ایک خطہ کے انسان کا دوسرے خطہ میں رہنے والے انسان سے تعلق ممکن ہیں ترسیل کے یہ ذرائع اب موجودہ انسان کی ضرورت ہے

عصری سماج اور ذرائع ابلاغ

عابد صدیقی

ترسیل کے نظام پر ہی دراصل ہماری عملی زندگی کا انحصار ہے۔ ابتدا ہی سے ہر انسان اپنے خیالات اور احساسات کو دوسروں تک پہنچانے کا خواہاں رہا ہے۔ آدم کے لئے حوا کی رفاقت کا انتظام شاید ترسیل کی اسی فطری خواہش کی بنا پر ہوا۔ غذا لباس اور رہائش جیسی طبعی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اب ترسیل بھی زندگی کی لازمی ضرورت بن گئی ہے۔ انسان نے اپنی ارتقائی منزلیں اظہار کے مختلف وسیلوں کے ذریعے طے کی ہیں۔ سنگیت کے سروں، مصوری کے خطوط، ادب اور شاعری کے الفاظ، غرض ہر طرح کی تخلیق میں ترسیل کی کوئی نہ کوئی شکل موجود ہوتی ہے۔

ترسیل ایک خیال کو ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک اس طرح منتقل کرنے کا نام ہے جس سے کہ پہلے ذہن کے محرکات اور اس سے اخذ کردہ دوسرے ذہن کے تاثرات اور جوابی عمل کی نوعیت کا یقین ہوتا ہو۔ ترسیل، اظہار اور افہام کے مجموعی عمل کا نام ہے ادب کا مکمل نظام بھی ترسیل کے عمل پر ہی انحصار کرتا ہے ابتدا میں تحریر و تقریر کے ذریعہ ترسیل کا یہ عمل محدود رہا چنانچہ قبایلی زندگی میں قبیلے کا سردار اپنے پیروؤں کو کوئی پیغام دینا چاہتا تو وہ ایک سے دوسرے اور اسی طرح سارے قبیلہ میں پہنچ جاتا۔ استاد اور شاگرد کے مابین ترسیل کا یہ عمل سینہ بہ سینہ علم کی حد تک محدود رہا کلاس کا تصور قائم نہ ہو سکا۔ مذہبی تحریکیں بھی اپنے محدود دائرہ کار میں سرگرم رہیں لیکن جیسے جیسے کرہ ارض پہ انسانی آبادیاں پھیلتی گئیں، ترسیل کی ضرورت کا دامن کشادہ ہو گیا ضرورت ایجاد کی ماں ہے کے مصداق ذہن و فکر نے نئی راہوں اور نئی منزلوں کے نشان ڈھونڈ نکالے اور صنعتی انقلاب نے ترسیل کے امکانات کو زیادہ وسیع تر کر دیا۔

الکٹرانکس اور ٹکنالوجی کی تیز رو ترقی اور انسانی ذہن کی قوت پرواز نے ترسیل کے نت نئے سامان اور ذرائع فراہم کر دیئے الکٹرانک سائنس نے ترسیل کے ان محدود وسیلوں کو بے پناہ وسعت عطا کر دی۔ ان سائنسی ایجادات کے ذریعہ انسانوں کے مابین بڑھتے ہوئے فاصلوں کو کم کرنے میں مدد ملی۔ دوریاں ختم ہوئیں اور ترسیل کا المیہ کم ہوا آج انسان چاند کو چھو رہا ہے۔ آسمانوں کی خبر لا رہا ہے۔ خلاؤں کے چکر لگا رہا ہے ہی نہیں بلکہ اپنے تجربات کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ آسمان سے زمین تک پہنچا رہا ہے۔ انسانی ترقی کا یہ سلسلہ بہم دراز ہے ترسیل آواز، اصارت، تحریر اور لمس کے ذریعہ بھی ہوتی ہے جب ہم کسی کو دیکھ کر مسکراتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس سے دوستی کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح آواز کی مدد سے سلام یا آداب عرض کہتے ہیں تو یہ بھی ملاقات کی خوشی کا اظہار ہے مصافحہ کے ذریعہ لمس خلوص اور گرمجوشی کی علامت بن جاتا ہے۔ آنکھوں میں چمک، آنکھوں کے اشارے یہ سب ترسیلی عمل میں شامل ہیں ایک عرصہ دراز تک ترسیل کا یہ عمل جاری رہا شخصی ملاقاتوں اور تبادلہ خیال وغیرہ کے ذریعہ انسانی تعلقات اور روابط کا سلسلہ قائم رہا اور آج بھی قائم ہے لیکن نئے ...

سماج اور میکانکی زندگی نے انسانی تعلقات کو اب زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اب ایک فرد کا دوسرے فرد سے راست تعلق ناممکن سا ہوتا جا رہا ہے ہم جو کچھ سوچتے ہیں اس کے اظہار کے لئے ترسیل کے وسیلوں کا سہارا لینا ہوگا۔ ایک گاہک چینی کی مہنگائی پر دو تین افراد سے تبادلہ خیال کر کے انہیں بائیکاٹ کرنے پر اکسا سکتا ہے لیکن یہ کوئی موثر اقدام نہیں ہوگا لیکن اگر وہ کسی مقامی اخبار میں اپنا خط چھپواتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا نقطہ نظر سیکڑوں لوگوں تک پہنچے گا اور یا تا عامہ رائے عامہ کو ہموار کرنا ممکن ہوگا انتخابات میں ایک امیدوار کے لئے مشکل ہے کہ وہ ہزاروں رائے دہندوں سے انفرادی طور پر ملاقات کر کے انہیں اپنے نقطہ نظر سے آگاہ اور مطمئن کرے اس کے برخلاف اگر وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تقریر کرتا تو ایک بڑے طبقہ تک وہ اپنی بات پہنچائے گا۔ دراصل یہی ترسیل عامہ یا MASSCOMMVNICATIN ہے ترسیل خیالات معلومات اور رویوں کو ایک فرد سے دوسرے فرد یا افراد تک پہنچانے کا عمل ہے۔ ترسیل دوطرفہ عمل ہے جدید نظریات کی رو سے کسی بھی خیال کا مفہوم اظہار کرنے والے کے یہاں نہیں بلکہ سننے والے کے یہاں ہوتا ہے۔

ترسیل عامہ کا فن رو بہ رو بات کرنے کے مقابلہ میں زیادہ مشکل ہے ہزاروں کی تعداد پر مشتمل ایک مجمع کو مخاطب کرنے والا مقرر سامعین میں سے ہر ایک کے رد عمل سے واقف نہیں ہو سکتا [illegible] ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا ہے اس لئے ترسیل عامہ سے تعلق رکھنے والوں کی ذمہ داریاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں [illegible] پڑھنے والوں [illegible] خیال رکھنا ہو [illegible]

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت

★ پندرہ روزہ چنگاری ایک ایسا رسالہ ہے جسے خاص و عام دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے اور زرِ سالانہ ۴۵ روپے ہے۔

★ راجندر سنگھ بیدی نمبر کی قیمت ۶۵ روپے ہے۔

★ سعادت حسن منٹو (ایک نفسیاتی تجزیہ) کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

★ لوکاچ اور مارکسی تنقید مصنفہ اصغر علی انجینئر، کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

چنگاری، منٹو، بیدی اور لوکاچ کی مجموعی قیمت ۱۷۰ روپے ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمیں ۱۲۰ روپے ارسال کردیں تو بیدی نمبر، منٹو اور لوکاچ آپ کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیج دیا جائے گا اور ایک سال کے لیے چنگاری آپ کے نام جاری کردیا جائے گا۔

اب تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ

★ اگر آپ پندرہ روزہ چنگاری یا ماہنامہ عصری آگہی کے سالانہ خریدار ہیں تو آپ کو ہر کتاب کی خریداری پر پندرہ سے بیس فیصد کمیشن دیا جائے گا چاہے آپ ہمارے ادارے کی کتاب خریدیں یا ہمارے توسط سے کسی دوسرے ادارے کی کتاب

عصری آگہی پبلی کیشنز، ۳/۱۴۱۰ - رام نگر، شاہدرہ دہلی ۳۲

اکتوبر ۱۹۸۳

پندرہ روزہ

چنگاری

دہلی



[illegible]

[illegible]

غلام
حسین
خیال



اردو تھا اصل گھر دلی تھا اس لئے دلی والوں کو اس کا احساس تھا کہ یہ ان کی ہے اس کے بانکوں نے کی طرح قدر کی ہے چکر یا قلعہ معلی کے محلوں میں پلی ہو کر بڑی ہوئی یا ان امیروں کے گھروں میں جنھیں قلعہ سے واسطہ اور وہاں کی زبان سے رابطہ تھا۔ کیونکہ وہ ہمارے شاہوں، شہزادوں شہزادیوں اور ان کے اوّل درجہ کے امیروں کی گود میں پلی اور ان کی صحبت اٹھا کر اور ادب قاعدے سیکھ کر باہر نکلی اور ہماری تہذیب بنی ہے!

پڑھ چکے ہو کہ بیدل نے کس طرح اس زبان کا بول بالا کیا اور سن چکے ہو کہ ان کے مقلد و شاگرد امیروں نے کیونکر اسے سکہ لگایا؟

ان امرا میں بزمانہ فرخ سیر ایک امیر باتدبیر تھا جسے تاریخ زبان عمدۃ الملک کہتی اور خلقت نواب محمد امیر خاں کے نام سے یاد کرتی اور بزم شعرا انجام کے لقب و تخلص سے پکارتی ہے۔ اس شاگرد بیدل نے ادھر دل دیا تو اور امرا نے بھی ان کا ساتھ دے کر اردو کی طرف رخ کیا اور پھر تو دلی میں اس کی آوازیں گونجیں کہ سارے ملک میں پہنچی اور ہر طرف سے اس کی صدائے بازگشت (ایکو) آنے لگی!

نواب عمدۃ الملک نہ صرف عربی و فارسی ہی کے استاد تھے بلکہ بھاشا پر بھی قدرت رکھتے تھے اور بقول صاحب سیر المتاخرین

نواب غلام حسین خاں عظیم آبادی خلف نواب ہدایت علی خاں اسد جنگ، مشیر محمد شاہ اور دوست خالص عمدۃ الملک، ان کی ہندی نظمیں، ٹھمریاں اور دوہے دلی کے باہر بھی گونجتے اور زبانوں اور گلوں سے نکل کر ملک پر چھا جاتے۔ عمدۃ الملک گو فرخ سیری امیر ہیں مگر ان کی عظمت و شہرت محمد شاہ کے وقت میں ہوئی اور جب کہ وہ وزیر دربار مقرر ہوئے تو اقتدار اور بڑھا اور بادشاہ کے منظور نظر ہو گئے۔ نادر (شاہ) تک نے ان کی عزت کی اور اس قہرمان کی نظر بھی ان پر پڑنے لگی۔

کہتے ہیں کہ ایک روز محمد شاہ و نادر شاہ ایک ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ قہوہ کا وقت آگیا بادشاہ نے انھیں (نواب) اشارہ کیا۔ عمدۃ الملک قہوہ کی دو پیالیاں بنا کر اور کشتی میں رکھ کر حضور میں

لہ نواب سید غلام حسین خاں کی امارت و علمیت اور ان کی زباں دانی و تاریخ دانی جریدہ عالم پر ثبت ہے۔ سیر المتاخرین ایک ایسی تاریخ ہند و بنگال وہ چھوڑ گئے جو مستند مانی جاتی اور اس کے بعد کی تاریخیں اس کے حوالے سے پُر نظر آتی ہیں۔ اس تاریخ میں بنگالہ کے زوال کے وقت کے وہ کل واقعات موجود ہیں جو نواب صاحب کی نظر کے سامنے سے گزرے۔ وارن ہیسٹنگ کے متعلق کچھ ایسا تحریر فرما گئے کہ برک کے مقابلہ میں ان کا بیان پارلمنٹ میں پیش ہو کر ہیسٹنگ کا وکیل بنا رہا۔

نواب صاحب دہلی کے ان امیر زادوں میں سے ہیں جن کا دیوان خانہ وہاں (دہلی) اردو کا گھر بنا رہا۔ امرائے پانی پت کے ساتھ ان کے خاندان کی زبان بھی عظیم آباد میں اردوئے معلیٰ مانی گئی۔ صوبہ بہار میں پرگنہ جیلا، نواب صاحب کی جاگیر تھا وہاں کے محلات کے علاوہ، عظیم آباد (پٹنہ) میں بھی وہ گھر بنا کر رہے۔ حاجی گنج (محلہ) کی بڑی حویلی اس خاندان کے نام سے سو برس آباد رہی۔ ہمارے بچپنے میں یہ کھڑی تھی مگر اب گری پڑی ہے۔ نواب بہادر سید ولایت علی خاں مرحوم (پٹنہ کے مشہور رئیس)، اور سید الشعرا جناب شاد علیہ الرحمہ، نواب سید جعفر حسین خاں مغفور اور میرے والد نواب سید نوروز حسین خاں مرحوم اسی حویلی میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائے؟

نواب صاحب کے خاندان کی جہت سے، حاجی گنج (پٹنہ) کی زبان شہر (عظیم آباد) میں مستند تھی اور جہاں تک یاد ہے اس محلہ کا یہ رتبہ سدا قائم تھا۔ نواب صاحب اپنی آخری عمر میں مسند مرشد آباد سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے دم سے لٹا ہوا مٹتی امارت بگڑنے پر بھی بنی رہی۔ مرحوم وہیں مرحوم ہوئے اور نواب ہدایت جنگ کے مزار میں دلا اپنے خاندان کی تعلق کی وجہ سے اپنے مزار سے ہیں۔ عظیم آباد اور مرشد آباد کے ذکر میں نواب مرحوم اور ان کے

اٹھے۔ لیکن سوچ کر دونوں نے کسی
بادشاہ کے آگے پہلے پیالی رکھ دی۔ محمد شاہ
کو پیش کرتا ہوں تو فرماں روائے ایران بھیت [illegible]
چھوڑ دے گا۔ اور اگر اس کی تواضع کرتا
ہوں تو اپنے آقا کی کسرِ شان ہوتی ہے اور
اور یہ امر نمک حلالی سے دور ہے۔ آخر
ان دونوں شاہوں کے بیچ میں کشتی
رکھ کر بادب عرض کی کہ دستِ خانہ زاد
کوتاہ، شاہ ہی شاہ کی تواضع کر سکتا ہے۔
اس فقرے پر محمد شاہ مسکرایا اور نادر نے
بے ساختہ کہا کہ "محمد امیر غضب کردی،
از فراست و تمیز تو خیلے خورسندم!"
پھر دونوں بادشاہوں نے اپنی اپنی
پیالیاں اٹھالیں اور قہوہ نوش کرنے لگے۔

غزلیں پڑھی جاتیں اور ادب کی شمعیں روشن کی
جاتیں۔ نواب عنایت خاں راسخ اور نواب
محمد شاکر خاں شاکر (صاحبِ ارمغان خان
صادق) تک پانی پت سے شہر (دہلی) آتے
شریکِ بزم ہوتے۔ نواب صفدر جنگ
و نواب سالار جنگ (اودھ) کے سے امیر
تک ان صحبتوں سے لطف اٹھاتے اور نواب
سید ہدایت علی خاں اسد جنگ بھی جب عظیم آباد
سے دلی تشریف لے جاتے تو ان جلسوں میں شرکت
کرتے۔ دہلی کے امرا میں نواب نوازش علی خاں
و نواب اشرف علی خاں اور ان کے فرزند رشید
نواب فضل علی خاں فضلی (جنھوں نے ۱۱۴۵ھ
میں کربل کتھا اردو نثر میں لکھی) بھی خاص ذکر
کے لائق ہیں جو عمدۃ الملک کے ہم نوالہ و ہم پیالہ

[illegible]
امرا کی زبان سے ٹکسال بنتی تھی اور یہی وہ لوگ
ہیں جو اپنے وقت کے استاد اور نقاد کے طور پر
گنے گئے ہیں۔

عمدۃ الملک کی زبان اور شاعری کے
اس وقت بڑے چرچے تھے۔ ان کی یہ غزلیں
شاہد ہیں کہ وہ اردو کے استاد اور مجتہدِ فن تھے
ان میں ذرا زبان کے انداز اور طرزِ ادا کو
دیکھنا اور اپنی دو سو برس کی اردو پر نظر کرنا۔

غزل

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم
منہ ترا تکتے ہیں سب اقلیمِ حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم
دل تو ہے داغِ غلامی سے تری طاؤس وار
سامنے قمری کے گو ہیں سرو ساں آزاد ہم
اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر مانندِ شرر سب کر چلے برباد ہم
ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ حکمت
فکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ فولاد ہم

یہ تھا اس وقت کے امرا کا روزمرہ اور
یہ تھی وہ ٹکسالی اردو جو ہمہ شمہ کے گھروں میں
نہیں بلکہ ان امیروں کے محلوں میں پلی اور
وہاں سے نکل کر ہمارے شعرا کے منہ میں پہنچی۔
نواب کی ایک غزل اور سن لو، سو دل سے
داد دو ؎

نادر کے قہر و غضب کی آگ بھی انھیں
عمدۃ الملک نے بجھائی۔ دلی میں جس روز قتلِ
عام ہوا اور نادر سنہری مسجد میں آکر اور تلوار
میان سے نکال کر اپنی فوج کو حملہ و غارت کا
حکم دے کر وہاں بیٹھ گیا تو کہتے ہیں کہ صبح سے
دوپہر تک لاکھ آدمی سے زیادہ مارا گیا؟ اور
خون کا دریا بہہ گیا۔ کسے جرأت کہ نادر کے پاس
جائے اور رعایا کی جان بچائے۔ آخر
عمدۃ الملک کمر کس کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر
اس قہرمان کے سامنے آئے۔ نادر نے پوچھا
"خیر باشد محمد امیر چہ میخواہی؟" انھوں نے
دستِ بستہ عرض کی کہ ؎

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

یہ برجستہ اور باموقع شعر سن کر نادر نرم
ہوا، تلوار میان میں کر کے کہا کہ "خیز بخشیدم"
شہر میں امان امان کی منادی ہوئی اور دلی
زیادہ کشت و خون سے بچ گئی۔

نواب عمدۃ الملک کی خوش مزاقی
اور ہر دل عزیزی نے اس وقت کے امرا
اور اہلِ فن کو اپنا بنا رکھا تھا اور ان کا
گھر اپنے دوستوں کے لیے وقف اور ان کی
آرام گاہ تھا۔ موسیقی کے دلچسپ جلسوں کے
علاوہ شعر و شاعری کی صحبتیں بھی ہوتیں۔ قائم [illegible]

اور ان بزموں کے بڑے دلدادہ رہے ہیں۔
حضرت شاہ گلشن علی اور خواجہ ناصر عندلیب
(پدرِ بزرگوار خواجہ میر درد) نے بھی ان جلسوں
میں پائے اعتبار پائی۔ اور شاہ حاتم (مرزا رفیع
سودا کے استاد) اور میر ضاحک (والدِ بزرگوار
[illegible]

غزل

کیوں بلایا بھیڑ میں مجھ سے یہ نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ کر شرم سے پانی ہوئی
کل محیطِ عشق کے صدموں سے پانی تھی [illegible]
[illegible]

ہری پری [illegible] رکھتا ہوں
ٹوٹتے ہی دل کے یہ کو سخت حیرانی ہوئی
لاش میری دیکھ کر مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی
کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو
دوست داروں کی محبت دشمن جانی ہوئی

آج کون کہہ سکتا ہے کہ یہ محمد شاہی اردو وہ زبان ہے کہ اب بھی جوان ہے۔ افسوس کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے اپنے امرا کو چھوڑ کر صرف ان شعرا کو پکڑ لیا جو اس وقت کسی وجہ سے ذرا امتیاز نظر آتے تھے۔ مگر یہ وہ ہیں جنھوں نے ان امیروں کے گھروں میں پرورش پائی اور وہاں سے زبان سیکھ کر نکلے اور اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ اور تو اور ہمارے تذکروں میں میاں ولی (دکھنی) اردو غزلوں کے باوا آدم کہے جاتے اور کم نظری کی وجہ سے آج تک وہ سراہے جاتے ہیں مگر ایک یہ ولی کیا کسی ولی نے زبان کی یہ کرامت کبھی نہیں دکھائی۔ غزلوں سے کہ ولی محمد شاہ کے شروع زمانہ میں [illegible] چلے ۔ کچھ لوگ دکھن سے شناخت کے لیے دکھن سے دلی کے ٹکسال گھر تک آئے اور اردو سیکھنے لگے۔

دلی بچارے کو وہ زبان کہاں نصیب جو اردو معلی کہی جاتی اور قلعہ معلی اور دہلی کے امرا کے محلوں سے ابھی باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ تو وہی زبان بولتے تھے جو اس وقت دکھن میں کرشنا اور نربدا (دریا) کے ادھر بولی جاتی رہی۔ ہاں ولی نے شعرائے ایران کی طرح اپنا دیوان بیشک ترتیب دیا اس میں ضرور پہل کی۔ یہ طریقہ بھایا اور پھر شعرائے دہلی نے اس میں ان کی تقلید شروع کردی۔ نواب کی ان غزلوں نے اس وقت کی زبان کو بتایا کہ اب اس میں خیالات و جذبات کے بیان کا کثیف مادہ آچکا ہے۔ مگر اس لحاظ سے کہ ابھی نارس تھی اور کسی قاعدہ کے ساتھ اردو تک پہنچی نہ تھی، اس کے پختہ اور باقاعدہ بنانے کی فکر ہوئی۔ عمدۃ الملک نے اور امرا کے مشورہ سے دہلی میں ایک اردو انجمن قائم کی۔ اس کے جلسے ہوئے۔ زبان کے مسئلے چھڑے۔ چیزوں کے اردو نام رکھے جاتے، لفظوں اور محاوروں پر بحثیں ہوتیں اور بڑے رگڑوں، جھگڑوں اور چھان بین کے بعد انجمن کے دفتر میں وہ تحقیق شدہ الفاظ اور محاورات قلم بند ہو کر محفوظ کیے جاتے۔ اور بقول صاحب سیر المتاخرین ان کی نقلیں ہند کے امرا اور رؤسا کے پاس بھیج دی جاتیں اور وہ اس کی تقلید کو فخر جانتے اور اپنی اپنی جگہ ان لفظوں اور محاوروں کو پھیلاتے۔

یہ تھی وہ انجمن اور یہ تھا وہ مدرسہ جہاں طفل اردو کی بسم اللہ ہوئی اور یہ تھا وہ مکتب جہاں ہمارا ریختہ پختہ ہوا۔ اور یہ تھا وہ اسکول جہاں شاہ حاتم و میر صاحب اور دلی کول کے سے زبان دانوں نے تعلیم پائی اور پھر اس کی خدمت میں اپنی جان کھپائی۔ عمدۃ الملک کا اس زبان پر احسان بھلایا نہیں جا سکتا کہ ان کی تن دہی سے اردو اردو معلی بن کر اطراف ہند میں پھیلی اور وہ امرا و رؤسا کے منہ لگ کر پختہ اور شستہ اور رفتہ ہوگئی۔

تحریر
سر سید احمد خاں

اقوالِ زریں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱- خدا سے غافل نہ ہو۔
۲- دنیا کی محبت میں اپنے آپ کو خراب نہ کرو
۳- ہر اس آدمی کے ساتھ جو جذبہ تعلق رکھتا ہو اس کے ساتھ نیکی کر۔
۴- جاہلوں کی صحبت میں رہنا بدبختی کی دلیل ہے۔
۵- علم سیکھ اور اس پر عمل کر۔
۶- خلق خدا کے ساتھ نیکی کرنا نصف علم ہے۔
۷- علماء کی صحبت اور حکماء کا کلام سیکھنا خود پر لازم کر۔
۸- اپنی تقصیر کا اقرار کرنا نیک اور پسندیدہ ہوتا ہے۔
۹- دنیا کی محبت دل کی تاریکی ہے اور آخرت کی فکر دل کا نور ہے۔
۱۰- خلق خدا کو نفع پہنچانے سے زیادہ اچھی چیز کوئی نہیں۔
۱۱- دنیا کی خوبی مال سے ہے اور عقبیٰ کی خوبی نیکی سے ہے۔
۱۲- تارک الدنیا خدا کو محبوب ہے۔

کام

رضیہ فصیح احمد

"اندر آنے کی اجازت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آجائیے"۔ اندر سے آواز آئی۔

"یا اللہ! یہ کیسا اُجالا ہے۔ ساری قبر جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔"

"آپ کے ساتھ کیا خصوصیت ہے۔ آپ کی قبر میں یہ روشنی کیسی ہے"؟ میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"قبر! کیا میں کسی قبر میں ہوں؟" ان کی آواز میں مجھ سے بھی زیادہ حیرت تھی۔

"تو کیا آپ کو یہ خبر نہیں کہ آپ کہاں ہیں؟" میں نے اور بھی تعجب سے پوچھا۔

"قسم اللہ کی، مجھے بالکل خبر نہیں کہ یہ قبر ہے۔"

"تو آپ کے روز و شب کیسے گزرتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم، کیا روز و شب اب بھی ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ صدیوں پرانی۔"

میری حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ "آپ کو یہ نہیں معلوم کہ آپ کہاں ہیں، آپ کو یہ نہیں معلوم کہ شب و روز اب بھی ہوتے ہیں۔ تو اپنے خیال میں آپ کہاں ہیں اور آپ کے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے؟"

"میں نے عرض کیا نا کہ مجھے نہیں معلوم۔"

"تو آپ نے معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی؟"

"نہیں... مجھے فرصت ہی نہ ملی تھی۔"

"کس چیز سے؟"

"اپنے کام سے۔"

"آپ کا کام کیا ہے؟"

"آپ نے کہا تھا کہ آپ کی قبر میں روشنی کیسی ہے۔ بس یہی دیا جلانا میرا کام ہے۔" انھوں نے کہا۔ "مگر میں نے جب یہ کام شروع کیا تھا تو وہ قبر کی دیواریں نہیں تھیں۔"

[illegible]

تھا [illegible]

تھا [illegible]

[illegible]

تھے۔ میں نے ان پتھروں کو گننا شروع کر دیا۔ [illegible] شروع ہوتی اور رات جب تک [illegible]

بعد نیند آ جاتی اور دوسرے دن پھر یہی کام شروع ہو جاتا۔ اسی طرح وقت تیزی سے گزرنے لگا [illegible] بہت زیادہ [illegible]

اور ان کی گنتی [illegible] کا فرق تھی۔ کمرے میں [illegible] اور رات دن کا فرق اب بھی رہتا تھی۔

ایک دن مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں دیواروں کو پینٹ کرنا شروع کر دوں۔ میں نے دیکھا تھا کہ آئینہ وسعت کا احساس دلاتا ہے۔ اگر ایک دیوار میں آئینہ ہو اور اس میں وہ سب کچھ نظر آ رہا ہو جو کمرے میں [illegible] تو کمرہ بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ دیوار میں ایک دریچہ بنائیں اور اس میں ایک اور در، پھر اس میں ایک اور در تو کمرے میں ایک لامحدودیت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے پتھروں کو گننے کا کام چھوڑا۔ قید خانے میں پڑے ہوئے کاٹھ کباڑ سے ایک برش اور پینٹ بنائے اور دیواروں کو پینٹ کرنا شروع کر دیا۔ میں دیواروں پر آئینہ بناتا اور پھر ان آئینوں میں آئینہ بناتا۔ اسی طرح وہ چار دیواریں اور ان میں پڑی ہوئی گنتی کی چیزیں لامحدود ہوتی گئیں۔ میں اس کام میں اتنا محو ہو گیا کہ دن اور رات کی کوئی قید نہ رہی۔ [illegible] کب کھانا آتا اور کب جاتا۔ مجھے کچھ پتہ نہ رہا۔ دیواروں کا [illegible] کب جلتا اور کب بجھتا مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ اپنے قد تک کا کام ہو گیا تو میں نے اسی کاٹھ کباڑ پر چڑھ کر دیواروں کے بالائی حصوں پر آئینے بنانا شروع کر دیے۔ نہ مجھے وقت کا احساس تھا نہ کسی کے میرے پاس آنے کا کہ مجھے وقت کا احساس ہوتا۔ رفتہ رفتہ میری ساری محدود تھیں ساری [illegible] ہو گیا، اور اب مجھے دیواریں پینٹ کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اب مجھے دیواریں پھلانگنے کا ہنر آ گیا ہے۔ دیواریں جگہ [illegible] چیزوں کا عکس اس میں جھلملانے لگتا ہے۔"

"کبھی آپ باہر نکل کر بھی تو دیکھئے، قبرستان کی بھی ایک فضا ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا ... مگر میں حیران ہوں کہ مجھے قید سے آزادی کب ملی۔ یہ کب ہوا کہ وہ دیواریں ہٹ گئیں۔ اور یہ دیواریں آ گئیں۔"

"دیکھئے آپ کا دروازہ کھلا ہے۔ آپ قید میں نہیں ہیں — جب چاہیں باہر جا سکتے ہیں۔"

"اچھا مگر میرا کام ابھی باقی ہے۔ کام ختم کر لوں تو نکلوں۔"

مجھے لگا ان کا کام کبھی ختم نہیں ہو گا۔ وہ [illegible] ہوئے۔

"آپ کی باتوں سے میرے ذہن میں ایک نہایت [illegible] خیال آیا ہے۔ کیوں نہ [illegible] اور [illegible] سکوں پھر مجھے باہر جانے کی ضرورت ہی [illegible] سب کچھ دیکھ سکوں گا۔"

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ اپنے کام میں مصروف ہو چکے تھے۔ "اچھا میں چلوں۔ خدا حافظ" کہہ کر [illegible] دروازہ بند کرتے ہوئے [illegible] ہو گیا۔

حیات اللہ انصاری اب اور تب

مسیح الحسن رضوی

۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۳ء تک میری اور حیات اللہ انصاری کے بیچ کا سلسل اور متواتر خط و کتابت ہوتی رہی [illegible] خطوط کچھ ہیں لیکن بعض خطوط ایسے ہیں جو اس زمانے کے سیاسی سماجی اور ادبی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان سے حیات اللہ کی وہ شبیہ بنتی ہے جب وہ جوان تھے اور ملکی آزادی کے لیے انھوں نے اپنا ایک راستہ منتخب کر لیا تھا۔ یہ راستہ گاندھیائی فلسفہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کا تھا۔

اس چالیس سال کے عرصہ میں سب کچھ بدل چکا ہے۔ ملک کا بٹوارہ ہوا، آزادی ملی، گاندھی جی شہید کیے گئے پنڈت پنڈت نہرو کی وزارت عظمیٰ کا زمانہ کم و بیش دو دہائیوں تک چلا لیکن ملک ابھی تک اس سوشلزم کی راستہ پر گامزن نہیں ہو سکا ہے جس کی حیات اللہ کو آرزو تھی۔ بہرکیف یہ ایک الگ بحث ہے جس کا اس خط سے، جسے آپ ابھی پڑھیں گے کوئی بلاواسطہ رشتہ نہیں ہے۔ یہ خط تو محض اس جدوجہد کی طرف اشارہ کرتا پایا جاتا ہے جس کے لیے یہ باحوصلہ انسان ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس میں اس کے خواب ہیں اور آرزوئیں اور ملک کو آزاد دیکھنے کی دھندلی دھندلی سی تمنا۔

یہ خط اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب دوسری جنگ عظیم پوری شدت سے جاری تھی۔ مشرق میں جاپان اور مغرب میں ہٹلر ملکوں کو تاراج کر رہا تھا روس پر حملہ کے بعد اسٹالن نے بھی جنگ کا اعلان کر دیا تھا اور ریڈ آرمی ہر محاذ پر بے جگری سے لڑ رہی تھی۔ بنگال میں بھیانک قحط تھا، جہاں ایک روٹی کے لیے انسان اور کتے میں چھینا جھپٹی ہوتی تھی۔ لیکن اس صورت حال سے ملک کی آزادی کے دن قریب آتے محسوس ہوئے تھے۔ ملک کے بعض ممتاز لیڈروں کا خیال تھا کہ جاپان کی حمایت کی جائے۔ چنانچہ نیتاجی سبھاش بوس نے جاپان کی مدد سے آزاد ہند فوج بنائی تھی اور اس فوج کے نشری ریڈیو کو اثر سے ہندوستانیوں کو جاپان کی مدد کرنے اور برطانوی سامراج کا جوا اتار پھینکنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی نے روس کی جنگ میں شرکت کے بعد جنگ کو عوامی جنگ بنا دیا تھا اور اس کے لیڈر روس کی مدد کو آگے آ رہے تھے۔ چنانچہ پارٹی کے لیڈر چھوڑ دیے گئے تھے اور وہ زور شور سے اتحادیوں کے حق میں پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ اس سیاق و سباق میں حیات اللہ کے نظریات کو جاننا اور سمجھنا ایک تاریخی ضرورت ہے۔ کیونکہ اب حیات اللہ انصاری ۱۹۴۳ء کے حیات اللہ نہیں ہیں، وہ اب ملک کے نامور ادیب ہیں اور انہوں نے اردو میں اس صدی کی سب سے بڑی ناول 'لہو کے پھول' تصنیف کی ہے۔ اردو کے لیے مورچہ لیا ہے اور ۲۰ لاکھ افراد کی دستخط سے شدہ کی دہائی میں صدر جمہوریہ کو ایک میمورنڈم پیش کیا ہے۔ آج اردو کے حق میں جو باتیں کی جا رہی ہیں ان میں حیات اللہ کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔

جن لوگوں نے اس زمانے کے ہفتہ وار "ہندوستان" کا مطالعہ نہیں کیا ہے وہ جان ہی نہیں سکتے کہ حیات اللہ اس کے بادمنک قوم پرست تھے سخت نازی دشمن تھے۔ وہ ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ملک پر نازیت اپنی گھناؤنی شکل میں مسلط ہو جائے۔ جیسی کہ وہ یورپ کے بعض ملکوں پر ہو چکی تھی۔ اس سے بہتر ان کے خیال میں روس علیہ تھا جو کم از کم ملک کو اپنی غلامی نہیں بناتا بلکہ کمیونزم یا میں کمیونزم لا دیتا" حیات اللہ انصاری کی سیاسی شخصیت کو پیش کرنے کے لیے میں ان کا یہ خط پیش کر رہا ہوں تاکہ ان کے متعلق اب تک ادبی اور سیاسی حلقوں میں جو بدگمانیاں چلی آ رہی ہیں ان کے دور ہونے میں مدد ملے۔ اس خط میں قحط بنگال کے سلسلہ میں آپ ہندوستانی کمیونسٹوں کے رویہ پر بھی بحث دیکھیں گے جن میں انھوں نے کمیونسٹوں کی مجبوریاں بیان کی ہیں اور یہاں ان کے دل کا چور ابھر کر سامنے آ گیا ہے بہرکیف ان پر رجعت پسندی کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا میرے پاس حیات اللہ انصاری کے ایسے خطوط بھی ہیں جن میں انھوں نے صرف مسلمانوں کے مسئلہ سے بحث کی ہے اور بار بار انھیں اپنے نرم لہجہ میں پاکستان بننے کے خطرہ سے ہوشیار کیا ہے میں نے حیات اللہ سے چھوٹا اٹھا ملکی مسائل مجھے بھی پریشان کرتے تھے (اس وقت کی فضا ہی ایسی تھی) کبھی تشکیک کا دورہ پڑتا اور میں انھیں سوال نامہ کی شکل میں خط لکھتا۔ وہ میرے خطوں کا جواب بالکل مساوی درجہ پر دیتے اور میرے شکوک دور کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کے خطوط [illegible] لکھنا شروع کیے۔

ایک بار میں نے ان سے مسٹر جناح کی شخصیت کا ذکر کیا۔ وہ مسلم لیگ کے بیرونی اجلاس کی شرکت کر کے بعد واپس آئے تھے۔ بڑے خوبصورت انداز میں وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ "بھائی ان میں تاج محل کا وہ سارا وقار ہو جو بے حس پر مسلمان جان دیتا ہے" میرا خیال ہے کہ کوئی بھی شخص جو مسٹر جناح کی سیاست سے اختلاف رکھتا ہو وہ اتنا بے لاگ تبصرہ نہیں کر سکتا تھا شاید اس کا سبب یہ ہو کہ حیات اللہ انصاری سیاستداں سے زیادہ ادیب ہیں اور انھوں نے جو تشبیہ دی تھی وہ ایک سیاست داں اور صحافی کی نہیں تھی ایک ادیب کی تھی جو آگے چل کر 'شکستہ کنگورے'، 'موزوں کا کارخانہ' اور 'لہو کے پھول' لکھنے والا تھا۔

آخر میں اتنا اور عرض کر دوں کہ خط کے بعض حصے تشریح طلب ہیں مثلاً ہمالیہ والی بات۔ ایک زمانہ میں حیات اللہ انصاری اور ان کے دوستوں نے جن میں محمد حسن قدوائی مرحوم اور گوکل چند سنگھ پیش پیش تھے۔ ایورسٹ کو سر کرنے کی اسکیم بنائی تھی یہ اسکیم جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے تن سنگھ اور ہلیری نے سر کی۔ مجھے جب اس اسکیم کا حال معلوم ہوا تو میں نے حیات اللہ صاحب کو لکھا تھا کہ "آپ کی اسکیم تو ہمالیہ سے بھی بڑی ہے۔ زیر نظر خط ان دنوں کا ہے جب ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑو" تحریک کے بعد ہفتہ وار 'ہندوستان' بند ہو گیا تھا اور حیات اللہ تلاش معاش میں شہر در شہر مارے پھر رہے تھے۔ اس زمانے میں ان کی ایک فلم بنی تھی گرچیتن آنند نے بنائی تھی خط میں جس دانش محل کا ذکر ہے ان دنوں وہ نسیم صاحب کی ملکیت نہیں تھا۔

اب زمانہ کی ایک ستم ظریفی سنتے چلیے کہ وہ حیات اللہ جو سیکڑوں میل دور رہ کر بھی مجھے یاد رکھے تھے اور میرے خطوں کا جواب دیتے تھے اب مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر ریور بنک کالونی میں رہتے ہیں اور ملاقات برسوں نہیں ہوتی۔ اور ہوتی بھی ہے تو اس میں کوئی گرم جوشی یا چاشنی نہیں ہوتی۔ کیا اس کا

[illegible] دونوں [illegible] بتیس سال [illegible] کر گیا ہے اور اسی مجبوری نے اجنبیت کی دیواریں کھڑی کردی ہیں۔ جی نہیں میرے خیال میں ایسا نہیں ہے حیات اللہ انصاری "مصور ہند" آدمی ہیں۔ جس نے ان میں بے رحمانہ حقیقت پسندی پیدا کردی ہے۔ اور اس حقیقت پسندی نے ہم دونوں کو دور کردیا ہے۔ اتنا دور کہ شاید کچھ دنوں میں (اگر زندگی رہی) ہم ایک دوسرے کو پہچاننے سے بھی انکار کردیں گے۔ لیکن یہ قصور ہم دونوں میں سے کسی کا نہیں ہے، تیرھویں صدی ہجری کا زمانہ ہے" اپنے سے مطلب رکھو یا پھر اس سے جو تمہارے کچھ کام آسکے"

دیکھیے آخری سطور لکھتے وقت میں جذباتی ہوگیا اور بالکل نجی باتیں لے کر بیٹھ گیا جن کی ان تعارفی سطور میں ضرورت نہیں تھی لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ گذشتہ کل آنے والے کل سے جڑا ہوا ہے۔

اب میں آپ سے اور حیات اللہ انصاری کی دنیا سے رخصت ہوتا ہوں اور اس امید سے رخصت ہوتا ہوں کہ یہ خط نوجوانوں کو عزم و حوصلہ دے گا۔ اگر میری یہ کوشش کچھ بھی پسند کی گئی تو میں قارئین کے سامنے وہ خط بھی پیش کروں گا جن میں حیات اللہ انصاری نے ان مسائل کو اٹھایا ہے جن کا میں نے مضمون میں ضمناً ذکر کیا ہے

۹، فروری ۴۴ء

ڈیر مسیح صاحب۔ آپ کا پوسٹ کارڈ ملا۔ ابھی تو آپ سے بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے خیال ہوا کہ ایک مفصل خط لکھ دوں۔ آپ کی ناگواری کی شکایت بھی جاتی رہی۔

بمبئی اور دہلی کی سیاحت کے بعد ہم نے مجبوراً لکھنؤ کو مرکز بنایا تھا۔ دانش محل نے بچوں اور بالغوں کے لیے کتابوں کا ایک سلسلہ تیار کرنے کا آرڈر دیا تھا۔ مگر میں چار مہینہ رہے۔ دانش محل دغا دے گیا۔ گیا کا سلسلہ پڑا ہے۔ پبلشر صاحب روپوش ہیں۔ خط کے جواب ملا رد۔ اس دھوکے سے اقتصادی شکست پہنچا۔ اور تھوڑا سا زبردستی کا سکون حاصل کیا تھا پارہ پارہ ہوگیا۔

ترقی اردو سے وعدہ کیا تھا کہ "[illegible]"، [illegible] اصلاحی [illegible] ایک کتاب لکھ دوں گا۔ اس کتاب کے نوٹ ہیں۔ مقدمہ جو ابھی ادب میں [illegible] لکھنا شروع کیا۔ لیکن دراصل بات یہ ہے کہ ہزاروں جذبات کچلے پڑے ہیں جن کو کوششوں سے دبا کر بہت سے بیٹھے ہیں ذرا سے دھکے سے کوشش کرو پڑ جاتی ہیں اور سطح کے خیالات آجاتے ہیں۔ اگر اس وقت سکون ملتا تو ہم بہت کچھ لکھتے۔ ایک ناول چند افسانے اور مختلف قسم کے سیاسی مضامین تب جاکر جی ہلکا ہوتا۔

بنگال کی حالت نے دماغ بہت پریشان کردیا اور کتاب کا کام رک گیا۔ پھر "بمبئی والی اردو اصلاح ادب" کی کانفرنس کی روداد منزل پڑھی۔ ترقی پسند ادب پر ایک پمفلٹ لکھ ڈالا اس میں ہر پہلو سے بحث کی ہے۔ اس کی پہلی قسط ادب لطیف میں بھیجی ہے۔ کل مضمون بڑی بڑی قسطوں میں پورا ہوگا۔ بہت کم امید ہے کہ آج کل کاغذ کے زمانے میں وہ اپنے رسالے کا اتنا بڑا حصہ اتنے دنوں کے لیے گھیرنا پسند کریں۔ ابھی تک انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا ہے۔

اس کی تیاری کے سلسلہ میں میر، سودا، درد اور میر حسن پر اچھی تنقید تیار ہوگئی ہے۔ اگر اس پر کچھ دنوں کام کریں تو "اردو کا دور اول" بہت اچھی کتاب بن جائے گی۔

ایک افسانہ 'شکستہ کنگورے' نامکمل پڑا ہوا ہے یعنی پلاٹ مکمل تیار ہے۔ ابتدا، انتہا لکھی ہوئی ہے۔ اب وہ مسلسل موڈ نہیں آرہا ہے جو سب کو ایک لڑی میں پرو دے۔

کل ترقی اردو کا خط آیا "اجی حضرت کتاب کا کیا ہوا؟ براہ کرم وعدے کی تجدید کیجیے" پھر کتاب کی طرف جھک پڑا ہوں۔

خبر ملی ہے کہ پھلواری والے میری تلاش میں لکھنؤ آئے تھے۔ اسٹوری رائٹر کی خدمت دینا چاہتے ہیں۔ معقول تنخواہ پر بھی ملازمت مجھے پہلے نامنظور ہوتی کیونکہ ڈرامے کے میں ادبی ان کے ۹۵ فی صدی پر سر ہے۔ ۵ فی صدی جو بچا ہے وہ سستے قسم کے محبت کے جذبات ہیں اپنے دماغ کو ایسی چیزوں کے لیے جھونکنے پر طبیعت راغب نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ جیسی حالت ہی ہوں اس [illegible] کی زندگی بہتر رہے گی۔ زیادہ اہم کو ترقی مل جائے گی۔ لیکن وہ مجھے تلاش کرتے تھے دسمبر میں اب فروری ہے پتہ نہیں کہ دو مہینے کے اندر ان کو کوئی مل گیا یا نہیں بہرحال ایک خط آج لکھ رہا ہوں۔ امید کم ہی نظر آتی ہے۔

ہمارے کمیونسٹ بھائیوں کا حملہ دو مورچوں پر ہے فاشزم کے خلاف عملی۔ امپیریلزم کے خلاف زبانی لیکن پہلے مورچے پر کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکے اس لیے بھی زبانی ہوکر رہ گیا ہے بنگال کے قحط کے موقع پر بھی انھوں نے زبانی خدمت بہت کی۔ اور کچھ چھوٹی موٹی گاندھیائی قسم کی باتیں بعض لنگر خانے جاری کرادئے۔

بنگال کا قحط بتاتا ہے کہ وہاں مویشی سب مرچکے ہوں گے۔ آدمی سے پہلے وہی مرتے ہیں۔ اب کھیتی کیسے ہوگی؟ کسان بری طرح برباد ہوچکے ہوں گے۔ زمینداروں کا اثر بڑھ گیا ہوگا۔ پتہ نہیں اب بھی وہاں مسلمان اکثریت ہے یا نہیں۔ غریبی مسلمانوں میں ہی زیادہ ہے۔ کمیونسٹوں کی ایک مجبوری ہے ان کا زور مزدوروں پر ہے۔ اور ہندوستان صنعت کا ترقی سے اگر کسی کی حالت سدھری ہے تو مزدوروں اور سرمایہ داروں کی۔ اس لیے وہ کوئی عملی کاروائی کرہی نہیں سکتے۔ اور یہ بھی ان کا خیال ٹھیک ہے کہ ہم کو دنیا کی جدوجہد سے مل کر چلنا چاہیے۔

لیکن جو بات سمجھ میں نہیں آتی ہے وہ یہ کہ ہندوستان کی 'بیداری' کو کیوں فنا کردیا جائے اگر اس وقت ہندوستان میں صرف کمیونسٹ ہی کمیونسٹ ہوتے تو ہماری خودداری کبھی کی مرچکی ہوتی۔ عجب یاس کا عالم ہوتا۔ ابھی یہ امید تو ہے کہ ہماری طرف سے بھی بولنے والا کوئی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابھی دنیا کا بہت بڑا طبقہ فاشزم اور امپیریلزم کی جدوجہد میں شامل نہیں ہے۔ امریکہ کے کالے، ہندوستان اور برما کے غلام۔ جاوی ترا کے غلام۔ چین کے عوام تک کے بارے میں کوئی صاف فیصلہ نہیں ہوا ہے۔

روس کی پالیسی شاہانہ ضرور ہے۔ مگر ایک بات ہے۔ کیا جن ملکوں پر وہ قبضہ کرے گا اسی کو اپنا باجگزار بنائے گا جیسا کہ امریکہ یا برطانیہ چاہتا ہے؟ اس لیے ملک کے

[illegible]

... اور بعد میں ملک تقسیم کے ...

... بھی ... ہوں ...

دنیا میں اس وقت ... پہلو ہے تو دوسری طرف ... ایک تو ایسی ... اور ... قبضہ کر لیں ... اس ... میں ... ہو سکتا ہے۔

... نے اپنے دستور ... میں ... ریاستوں کو زیادہ ... اختیارات دیے ہیں ... کی شکست ہندوستان کی سیاست پر ... اثر ڈالے گی۔

... پارٹی بنا کر ہندوستان پر قبضہ کرنے ... اور مسلم پارٹی ... سب ایک ... ہیں ... اپنے بھائیوں کا ... ضرور ... اور ... کی

[illegible]

... ایک ... ایک ... مسلمان ... کا ... ہے ...

... سے ... ایران ... کی ... دو ... ہیں ... زیادہ ...

... اعظم ... آپ کی تعزیت ... زیادہ ... جانی ... آپ ...

[illegible]

... کر ... بھی ... اپنی ...

... کو لا جو ... کیا مگر وہ ... بیٹے ... ہی کو ... آدمی ... ہندوستان کے ... گی۔

... حیدرآباد سے ... جلد جلد ... کے سامنے۔

... جلت۔



کرشن موہن

شباب و شیب

شباب غرور آشنا و حسین تھا
مرا ارا ... کہ
مسلط ہوا تھا
وہ اب شیب ... ہو
مرے دل کے ... آشنا ہے
مرا شیب مسکیں
شرافت میں جلوہ نما ہے

عیب آسیب

... لیکن ... کس
یہ شہوت کا شہرت آسیب کا عیب تو ہے
جہالت کے زیتون
شرارت کے لیموں
جسارت کے انگور کیا تھے
... ہوس کے مظاہر
جوانی کی سرکش حرارت کا افسوں
... شوخ منظر تھا ...
تماشا سر راہ دیکھا تھا ہم نے
جوانی جو گزری
تو گھیرا ہے اب دل کو ... نے

ایک گستاخانہ سوال

بشکریہ
نیا دور
پاکستان

آج سے کم و بیش چالیس برس قبل جب ادبی ملفوظات اور غیر ادبی مغلظات میں فاصلہ کم ہونا شروع ہوا تو مرحوم مغفور "ساقی" دہلی میں ایک قطعہ شائع ہوا۔

"دیوں کی بھونڈی نہیں کہ ادب پر کیا نہ کیا ادب بے ادب ہوا، ہماری گستاخی نہیں کیا"

اس زمانے میں یہ قطعہ اکثر قارئین کی نظر سے گزرا ہوگا اور اکثر سے مراد ایک دو نہیں بلکہ کئی ہزار ہے کہ "ساقی" کے خریداروں کی تعداد سے قطع نظر اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بلا مبالغہ کئی ہزار تھی۔ پھر بھی اس قطعہ یا اس میں جس خدشہ کی نشاندہی کی گئی تھی اس کی بازگشت اس زمانہ میں یا اس کے بعد کی گذشتہ تین چار دہائیوں میں سننے میں نہیں آئی۔ ہاں کبھی کبھی کسی مولوی یا خود ساختہ محتسب کے احتجاج یا اخباری بیان کے حوالے سے ادب میں بڑھتی ہوئی عریانی کی خبر مل جاتی تھی۔ اسی اثنا میں ادب کی ہوسیلیوں کا جو حال ہوا وہ سب کے سامنے ہے اور معاشرے کی قسمت جس طرح بلٹی یا بگڑی وہ بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔"

ساقی" کو ختم ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ ان ادیبوں یا قارئین سے، جو قیام پاکستان کے بعد کی پیداوار ہیں اور اب ماشاء اللہ پینتیس چالیس کے پیٹے میں ہیں اور خود بال بچے دار ہیں۔ یہ توقع کہ وہ "ساقی" سے واقف یعنی صحیح طور پر آشنا ہوں گے، عبث ہے۔ یوں بھی "نقشے بندی" کے بعد سے اس طرح کی توقعات بے معنی سی ہیں پھر بھی آج کے ادب، ادیب اور معاشرے کی جو اٹھان ہے اس کے پیش نظر ایک بہت اہم سوال بار بار ذہن پر ابھرتا ہے اور باوجود کوشش کے اس کا قطعی تشفی بخش جواب نہیں مل پاتا۔ جو یہ ہے، کیا ہمارے معاشرے کے اپنے قطعی اور فعال معیار ہیں؟ اگر ہیں تو کہاں ہیں؟

یہ سوال خصوصاً اس وجہ سے اہم ہے پینتیس سال کی قومی منصوبہ بندی، اپنے قومی تشخص اور مملکت کی نظریاتی بنیاد اور سرحدوں کے بارے میں بے تکان لفاظی کے بعد کم از کم اتنا تو ضرور ہونا چاہئے تھا کہ زندہ رہنے اور کارکردگی اور ہنر مندی کو پرکھنے کے ہمارے اپنے معیار اب تک متعین ہو جانا چاہئیں تھے۔ کچھ پیمانوں کا یقین ہو جانا چاہئے تھا تاکہ یہ ممکن ہو جاتا کہ ہم پست و خوب کی صحیح تمیز، آپس میں دست و گریباں ہوئے بغیر اور ایک دوسرے پر لعن طعن کئے بغیر کر سکتے۔

مثلاً زبان کے مسئلے کو ہی لیجئے یہ مسئلہ قیام پاکستان سے قبل محض ہندی اور اردو والوں کے درمیان متنازعہ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ مسئلہ پاکستان کے صوبوں اور علاقوں کے درمیان متنازعہ ہوا اور اس کے جو کچھ نتائج شکست و ریخت کی شکل میں ظہور پذیر ہوئے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس مسئلے کی کیا حیثیت تھی؟ کیا ہونی چاہئے تھی؟ اور کیا ہونی چاہئے؟ اس کا تعین اس لئے ممکن نہ ہو سکا اور آئندہ بھی ممکن نہ ہو سکے گا کہ اس تعین کے لئے معلموں، سیاست دانوں، سرکاری افسروں، مفکروں اور دانشوروں کو فکر اور اس کے اظہار کے جس معیار کی ضرورت ہے، اس کا فقدان ہے، فقدان ہی نہیں بلکہ اس "معیار" کا کوئی تصور ہی سرے سے موجود نہیں ہے۔



پاکستان میں مخصوص معاشرتی حالات ہیں اس بات سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہاں ہر سو آدمیوں میں کم از کم نوے آدمی لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ ان کو معاشرے کی طرف "اقراء" کا حکم کب ملے گا اور اس حکم کی بجا آوری کے لئے جو انتظامات درکار ہیں کب کئے جائیں گے، یہ الگ بات ہے فی الحال ہمارا تعلق اس حقیقت سے ہے کہ زبان کا مسئلہ کاروباری، سرکاری، فکری اور عملی سطح پر ملک کی صرف سولہ فی صد آبادی یا اس سے بھی کم کے لئے کوئی معنی رکھتا ہے۔ باقی آبادی بے زبان ہے اور حرف عطف سے نا آشنا ہے۔ زباندانی اور بے زبانی کے اس معاشرتی تناسب میں ظاہر ہے کہ زبان کے مسئلے پر کسی رجز و توبیخ، طعن و تشنیع، کھینچا تانی اور تصادم، دنگا فساد کا اس معاشرتی تناسب میں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہئے اور وہ

اس لیے کہ اس ... وہ ملک کا خود ... نسبتاً آسودہ حال اور قابلِ فخر یا دوسرے لفظوں میں طبقہ کہا جاسکتا ہے ایسا طبقہ جو ... سے احتراز کرتا ہے اور مسائل کا حل ٹھنڈے دل سے پُر امن اصولوں اور معقول انداز میں، غور و فکر کے ذریعے تلاش کیا کرتا ہے اب اگر اس اصول کو کلیہ قرار دے دیا جائے تو پھر کسی بھی معاشرے میں اس اصول کے تحت معیار قرار دیا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں تعلیم یافتہ طبقہ امن پسند اور سنجیدہ ہے اور مسائل کو مثبت انداز میں پرکھنے اور برتنے کا شعور رکھتا ہے اور کیونکہ ''جاہل'' اور تہذیبی طور پر ''پس ماندہ طبقہ'' ساری دنیا میں ہی انتشار کا شکار رہتا ہے اور جھگڑے فساد میں بہت آسانی سے مبتلا ہو جاتا ہے اس لیے پاکستان میں بھی ان معاملات پر، جن کا تعلق ''پس ماندہ'' طبقے سے ہے، جھگڑے فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ ان باتوں پر جن کا تعلق اس طبقے سے نہیں ہے، کسی قسم کی بدمزگی، بدامنی اور نامعقولیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

مگر حیران کن بات یہ ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے پچھلے پچیس سال میں۔ وہ تمام مسائل جن کا تعلق پس ماندہ اور جاہل سوادِ اعظم سے ہے مثلاً بھوک، افلاس، بے روزگاری، مہنگائی، ناانصافی، ظلم، زیادتی، جبر وغیرہ سب نہایت تحمل مزاجی کے ساتھ پاکستان میں برداشت کیے جاتے رہے ہیں اور یہاں تشدد کی بدترین مثالیں وہ ہو رہی ہیں جن کا تعلق زبان سے یا ملازمتوں میں صوبائی اور علاقائی تناسب سے تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ پاکستانی معاشرے میں ''پس ماندگی'' کے اخلاقی اور سماجی معیار ''ترقی'' کے اخلاقی اور سماجی معیار سے نسبتاً بہتر اور با شعور۔ اس حقیقت کا مظاہرہ وسیع پیمانے پر برپا ہونے والے انتشار کی صورت میں ہی نہیں ہوتا بلکہ ذہنی کرختگی، ہیجانی اور وحشیانہ کیفیت میں بھی روزمرہ زندگی میں یہی بات دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ لوگ جو تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ اعلیٰ سماجی اور معاشی حیثیت بھی جنہیں حاصل ہے اور جو اربابِ اختیار بھی کہلاتے ہیں اس بات میں قطعی عار محسوس نہیں کرتے کہ ان کی گفتگو بالعموم لغو، ناشائستہ ہوتی ہے! نہ صرف یہ کہ اغلاط لہجے کی کرختگی، تلفظ کے بھونڈے پن اور زبان و بیان کی بے ترتیبی اور ناہمواری کے بلکہ اس لیے بھی کہ اس میں گالی گلوچ اور ابتذال کی آمیزش بکثرت ہوتی ہے اور یہ بات کسی بھی سطح پر مذموم نہیں سمجھی جاتی۔ ہم یہاں انگریز معاشرے کی وکٹورین اقدار کی روشنی میں اس کیفیت کا جائزہ نہیں لے رہے ہیں۔ انگریز تو بیٹلز (BEATLES) اور (ROLLING STONES) رولنگ اسٹونز سے آگے بڑھ کر اب پوری قوم (PUNKS) طائفہ کی غلاظت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ ہم تو اس وقت خود اپنی ان اقدار و رہن سہن کے طریقوں کی روشنی میں بات کر رہے ہیں جن کا اظہار نعروں، تقریروں اور تحریروں میں ہمارے یہاں ہمہ وقت جاری رہتا ہے اور جن کے مطابق رکھ رکھاؤ، احتیاط، لحاظ، حیا اور شائستگی کے کچھ مخصوص اور شناسا تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کے برعکس جب کہ محفلوں میں اور عوامی جلسوں میں ہمارے معاشرے کی سربرآوردہ شخصیات تک اپنی گفتگو اور تقریروں تک اور انتہائی گھٹیا گالیاں تک شامل کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تو پھر اس پہلو پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ اور ادبی گفتگو، مجلسی اور بازاری زبان اور شکستہ اور مبتذل بیان کے رائج الوقت معیار ہمارے یہاں کیا ہیں؟؟

یہ سوال جب ہمارے ذہن میں ابھر رہا ہے تو ہمیں اس کے اظہار میں کسی قدر جھجک محسوس ہو رہی ہے کیونکہ ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ اس قسم کے خدشات میں مبتلا ہونے یا اس طرح کے سوالات اٹھانے پر ہم پر رجعت پسندی کا الزام لگ سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہم عوامی اقدار کی مخالفت اور بورژوائی اقدار کی حمایت کر رہے ہیں۔ ہم سامراجی تحریکوں کی کاسہ لیسی چاہتے ہیں۔ ہم فرسودہ اور گرتی ہوئی طبقاتی عمارت کو قائم رکھنے کی مذموم حرکت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہم عوامی طرزِ معاشرت اور خواص کے طریقۂ زندگی میں بُعد قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ الزامات صحیح ہوں کیونکہ ہمیں معاشرے میں اپنے مراعات یافتہ ہونے کا اعتراف ہے تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اگر ''عوام'' کی طرزِ معاشرت اور رکھ رکھاؤ کا جائزہ لیا جائے تو ''خواص'' کے موجودہ عادات و اطوار کو ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور اگر ہم ان عادات و اطوار کو عوام کی بہتری کی تحریک اور ایک خوش آئند صورتِ حال قرار دیں۔ تو خواص کو تو غالباً کوئی نقصان نہیں ہوگا، عوام پر البتہ ایک اور تہمت بھی لگ جائے گی کہ وہ جاہل۔۔ پس ماندہ اور بے حس ہونے کے ساتھ ساتھ زشت کلام، انتشار پسند اور بیہودہ گو بھی ہیں۔

مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ عوام اور خواص کا طبقاتی فاصلہ پچھلے پچاس سال میں کم ہونے کی بجائے بڑھتا گیا ہے۔ ذہنی طور پر عوام اور خواص کا آپس کا تعلق جتنا اس وقت کم ہے اب سے چالیس پچاس سال پہلے اتنا کم نہ تھا۔ اس کی ایک نئی شکل ہمارے خیال میں ادیبوں کی ان نگارشات، طرزِ فکر، اطوار اور

(باقی ۲۶۶ پر)



کرپشن چاہے چھوٹا ہو یا بڑا سماج کے لئے گھن کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ چاہے جس صورت میں ہو معاشرے کو کھوکھلا کرتا ہے۔ لیکن کوئی بُرائی اپنا تنہا وجود نہیں رکھتی بلکہ اس کے ساتھ اور کئی طرح کی بُرائیاں جڑی ہوتی ہیں۔

صاف ستھری زمین پر کرپشن (بدعنوانی) کا پودا پنپ نہیں سکتا اس کے لئے زمین بھی "زرخیز" ہونی چاہئے۔ ہمارا ہندوستانی معاشرہ بھی کرپشن کے پھلنے پھولنے کے لئے بڑا زرخیز ہے۔ رشوت آٹھ آنے بلکہ ایک عدد بیڑی سے لے کر لاکھوں کروڑوں روپے تک عام ہے۔ چاہے یک پولس کانسٹبل کسی رکشے والے سے ایک بیڑی لے۔ چاہے اعلیٰ ترین کرسیوں پر متمکن جلیل القدر ہستیاں کروڑوں روپے لیں دونوں راشی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس حمام میں سب ننگے ہوں بہت سے لوگوں نے کپڑے پہن رکھے ہیں اور بعض اوقات حمام کے ننگوں کو بھی شرم آتی ہے اور ان کا بھی جی کپڑے پہننے کو مچلنے لگتا ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔

حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ چھوٹے اخبارات کی حامی ہے۔ فی الحال اس دعوے کے سلسلے میں کچھ کہنا مقصود نہیں۔ البتہ ایک بات کا اظہار ضروری ہے کہ کوئی بھی حکومت چھوٹے اخبارات ورسائل کا گلا گھونٹ کر انہیں اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہیں کر سکتی اور اگر خدانخواستہ ہماری حکومت کا یہ مقصد ہے بھی تو یہ اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ یہ چھوٹے پرچے ان کا کچھ بنا یا بگاڑ نہیں سکتے۔ اس کے باوجود جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ کاغذ دینے کے لئے، ڈاک کی سہولت دینے کے لئے، اشتہار دینے کے لئے اس نے اس طرح کے نامعقول قاعدے اور ضابطے بنا رکھے ہیں جو دیانت دار لوگوں کو پریشانیوں میں مبتلا کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں بُرے لوگوں کے لئے، بددیانت لوگوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے وہ دھڑلے سے بے ایمانیاں کرتے ہیں اور ہر ایک کو خوش رکھتے ہیں اور کچھ لوگ لطف اٹھا رہے ہیں

نہ یہ سمجھیں کہ معاشرے اور انسانیت کے تئیں ان کی کچھ ذمہ داریاں ہیں کچھ فرائض ہیں وہ جو کچھ آج کر رہے ہیں اس کا پھل کانٹوں کی صورت میں ان کی اولاد کو بھگتنا پڑے گا اور اس کے لئے کسی جفر کی ضرورت نہیں (جفر میں تو جیسا اس کا بہت لوگوں کو یقین نہیں، بہتوں نے اس کی پیش بندیاں کر لی ہیں، بہت سے اپنی ناقص اور کرپٹ عقل کے مطابق بھگوان کو بھی خوش کرنے کے لئے کچھ کر رہے ہیں) اسی دنیا میں آئندہ نسل کو اس گناہ کے پھل چکھنے پڑیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ لوگ کیا کریں جو کرپشن سے بچنا چاہتے ہیں؟

مثال کے طور پر چنگاری کو رشوت دینے سے نفرت ہے چاہے یہ دس روپے ہوں چاہے دو سو روپے چاہے دو ہزار روپے۔ چنگاری اصولی طور پر اس کے خلاف ہے۔ نتیجہ؟

اسے ڈاک کی وہ سہولت نہیں ملی جو ہر اخبار ورسالے کو ملتی ہے۔ جنوری ۱۹۸۱ء میں اس نے چار سو روپے رشوت نہیں دیئے اور اب ہر اشاعت میں اسے سینکڑوں روپیہ کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ چار مہینے سے ڈاک والے اس معاملے پر غور تک ہی نہیں کر سکے ہیں۔ ایک سینیئر آفیسر پوسٹ آفس سے ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک بھلا شریف آدمی ہے اس نے کہا کہ آپ نے اچھا کیا، معاملہ بڑھا دیا اب تو دیر ہو گئی ہے یہ پہلا سا فیصلہ ہے پھر اس نے بتایا کہ کس طرح سے ایک ادارہ نے بیس روپے رشوت نہیں دی اور انہیں اسے نو سو روپے اور ایک سال کی بھاگ دوڑ کی درد سری مول لینی پڑی اس نے بتایا کہ رشوت قبلہ حاجات ہے۔ اگر آپ رسالہ نکالتے ہیں تو رشوت دینا بھی پڑے گا اور لینا بھی پڑے گا۔ بات ٹھیک تھی رسالے والے

رشوت لینے پر بھی اور دینے پر بھی مجبور ہیں۔ اس رشوت کی شکلیں کئی ہیں نام کئی ہیں مگر رشوت بہرحال رشوت ہے ایک گھناؤنا جرم ہے چاہے آپ اسے کسی بھی صورت میں دیں۔

چنگاری نہ رشوت لے گا نہ دے گا۔ چاہے اسے کاغذ ملے یا نہ ملے، اشتہار ملے یا نہ ملے، ڈاک والے رعایت دیں یا نہ دیں، پارلیمنٹ کے ممبران اس کا نوٹس لیں یا نہ لیں، قارئین اسے خریدیں یا نہ خریدیں، اچھے ادیب اس کے لئے لکھیں یا نہ لکھیں، حکومت اور اس کے کارندے اس کی آواز پر کان دھریں یا نہ دھریں ہمیں یقین ہے اس حمام میں سب ننگے نہیں ہیں۔ حمام میں چنگاری بھی ہے مگر یہ کبھی ننگا ہو کر ننگوں کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھائے گا۔ ہمیں یقین ہے ہمارے بھی دوست ہیں، ہم خیال ہیں، ہم مسلک ہیں ہم زبان ہیں، اور ہمیں یہ بھی یقین ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر

غلام عباس کا فن

غلام عباس جیسے حلیم الطبع انسان ہیں ویسے ہی حلیم الطبع مصنف بھی ہیں ان کے بیشتر کیریکٹر بے بضاعت لوگ ہوتے ہیں جنہیں راہ چلتے میں آپ شاید نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ غلام عباس کو ان کی تنگ و تاریک زندگی میں طرح طرح کی دلچسپیاں نظر آتی ہیں اور ان کی صحبت میں انہیں ایک مشفقانہ لطف حاصل ہوتا ہے وہ ان کی حقیر سی آرزوؤں کو خوب سمجھتے ہیں اور ان کی کمزوریوں اور فریب کاریوں کو بھی جانتے ہیں لیکن ان پر برہم نہیں ہوتے بلکہ مسکرا دیتے ہیں ان کی تحریر میں ایک ہلکا سا ہیومر اکثر پایا جاتا ہے جو اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ انہیں انسانوں سے الفت ہے اور وہ زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔

ج: بعض شاعری الہیہ میں بہ چھاکر کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہیں پہ آ کر ادب صحافت کے قریب آ جاتا ہے اور موضوع کے تحت کہانیاں لکھنے میں اور روز کی کالم نویسی میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔

س: اس ضمن میں آپ ایک بزرگ اور منجھے ہوئے افسانہ نگار کی حیثیت سے نئے افسانہ نگاروں کو کیا مشورہ دیں گے؟

ج: مجھے یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ بہت سے نئے افسانہ نویسوں نے اچھے ہی فن کے افسانے کا مطالعہ کچھ زیادہ نہیں کیا۔ نئے افسانہ نگاروں میں جو سب سے بڑی کمی ہے وہ یہ کہ انہوں نے افسانے لکھنے سے پہلے اچھے افسانوں کو اچھی طرح سے نہیں پڑھا۔ میری مراد صرف اردو افسانوں سے نہیں ہے بلکہ دنیا کے بلند القدر افسانوں سے ہے۔ یہاں پر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں افسانے کو نثری ادب کی سب سے بڑی صنف سمجھتا ہوں۔ ناول سے بھی بڑھ کر۔ ناول خواہ کتنا ہی بلند اعلیٰ پایہ کا اور اسکیل کا ورثہ لئے ہوئے کیوں نہ ہو۔ مگر کئی مقام ایسے آتے ہیں کہ پڑھنے والا پڑھتے پڑھتے زچ ہو جاتا ہے۔ اس میں سب سے عمدہ مثال ٹالسٹائی کا "وار اینڈ پیس" ہے افسانے کا اختصار اور تھوڑی پوائنٹ ہونا اسے ادب کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ دنیا کے عظیم ناول کتنے ہیں تو شاید میں سات آٹھ سے زیادہ نام نہ گنوا سکوں۔ لیکن اگر آپ یہی سوال افسانے کے بارے میں کریں تو میں بغیر توقف کے پچاس ساٹھ نام گنوا سکتا ہوں۔

س: کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اچھا ناول لکھنا نہایت مشکل، صبر آزما اور محنت طلب

نئے افسانہ نگار اپنے کل وقت کا ۸۰ فیصد مطالعے میں اور ۲۰ فیصد تخلیقِ ادب میں صرف کریں

کام ہے اس کے برعکس افسانہ ایک نشست میں لکھا جا سکتا ہے اور اسی لئے افسانے زیادہ لکھے گئے اور ناول کے مقابلے میں اچھے افسانوں کا تناسب بھی زیادہ ہے۔

ج: شاید یہی بات ہو لیکن میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ناول پڑھتے پڑھتے آپ اکتا جاتے ہیں لیکن افسانہ بہت جلد ہی ختم ہو جاتا ہے طوالت ناول کی برائی نہیں لیکن اختصار افسانے کی عظمت ہے۔ جرمنی، روسی اور انگریزی زبان میں بلند پایہ افسانے لکھے گئے ہیں

میری نے افسانہ نگاروں کو یہ نصیحت کی ہے کہ اگر وہ صحیح معنوں میں اچھے افسانہ نگار بننا چاہتے ہیں تو جو وقت لکھنے اور سوچنے کے لئے وقف کرتے ہیں اس کا تناسب اس طرح ہونا چاہئے

مطالعہ ۸۰ فیصد

تخلیقِ ادب ۲۰ فیصد

اور یہ سلسلہ عمر بھر جاری رہنا چاہئے

س: آپ نئے افسانہ نگاروں کو کن مغربی ادیبوں کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کی سفارش کریں گے؟

ج: نئے افسانہ نویسوں کو میں خاص طور پر ڈی ایچ لارنس کو اور خاص طور پر اس کی The woman who rode away اور Captain's Doll اور کونراڈ کا The heart of darkness ایچ جی ویلز کا The death رومین رولاں کا ... Death in Venice والس ... Duil De Suif ... روس میں چیخوف کا ... ٹالسٹائی کا The death of Ivan Ilich اور اسی زبان میں IVAN BUNIN کی کہانی The gentleman from San Francisco کا مطالعہ کرنا چاہئے

ظاہر ہے ناول ایسی کہانیوں کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتا ہے

س: آپ کے تجویز کردہ افسانوں کے بیشتر عنوانات میں "موت" کا لفظ مشترک ہے اس کا کوئی خاص سبب؟

ج: یہ محض اتفاق ہے۔ اچھا، پھر ایسا کریں کہ اس میں گوگول کی کہانی "اوور کوٹ" شامل کر لیں اور ایک آدھ نام کم کر دیں جس میں موت کا ذکر ہو۔

س: کافکا نے آپ کو متاثر نہیں کیا؟

ج: ہاں یاد آیا۔ آپ کافکا کی کہانی "قلبِ ماہیت" کو ضرور شامل کریں۔ نئے افسانہ نویس کافکا کو ہر صورت میں پڑھنا چاہئے

س: کہا جاتا ہے کہ عظیم ناول لکھنے کے لئے زندگی کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھنے کا ڈھنگ آنا چاہئے جبکہ افسانہ زندگی کے کسی ایک گوشے، حقیقت کے کسی ایک رخ کو پیش کرتا ہے اس لئے ناول نگار کی ذمہ داری کو قبول کرنا بہت ہمت اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: ناول میں کینوس بڑا ہوتا ہے اس میں زندگی کا ایک رخ دیکھا جاتا ہے۔ ناول میں ہر جیتی جاگتی دوڑتی، رینگتی ہستی نظر آتی ہے کہ جلو میں بہت سے کردار ہوتے ہیں اس لئے اکثر بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ناول لکھنے کی ابتدا کیوں ہوئی؟ لوگ اپنا وقت KILL کرنا چاہتے تھے اور آج تک کر رہے ہیں چنانچہ جاسوسی ناول وغیرہ اسی دھن میں بکثرت لکھے گئے لیکن ادبی ناول میں آرٹ اور فن کا



بہت اچھا ہوتا ہے۔ ایک اچھا ناول اگر آپ نے پڑھا ہے تو عمر بھر یاد رہتا ہے۔ مثلاً ٹالسٹائی کا "وار اینڈ پیس"، "اینا کرینینا"، "کرائم اینڈ پنشمنٹ"۔ انہیں اگر آپ ایک دفعہ پڑھ لیں تو عمر بھر نہیں بھول سکتے۔ آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ دوستوئیفسکی نے نہایت کم وقت میں بیشتر ناول ڈکٹیٹ کرا کے مکمل کئے تھے۔

س: ادب میں اور بحیثیت افسانہ نگار بھی ادب میں اپنا مقام بنانے کی کتنی اہمیت ہے؟

ج: (ہنس کر) یہ آپ نے نہایت مشکل سوال کیا ہے۔ جب میں نے "آنندی" لکھا تو بہت لوگوں کو مدتوں یہ خیال رہا کہ میں نے "آنندی" کا خیال کہیں سے چرایا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اتنا اچھا افسانہ جسے دوسری زبانوں میں بھی سراہا گیا ہے وہ پاکستان کے کسی رائٹر کے ذہن میں کیسے آ سکتا ہے۔ چنانچہ فرض کر لیا گیا کہ ہو نہ ہو یہ ضرور کسی ماہر کے رائٹر نے "آنندی" جیسی کہانی لکھی ہوگی۔ آخر میں نے "آنندی" کا پس منظر لکھ کر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ میری نئے افسانہ نگاروں کو ہدایت ہے کہ وہ اپنے افسانوں کا مقابلہ صرف اپنی زبان کے افسانوں سے نہ کریں بلکہ دنیا کے سب سے بڑے ادبا کے افسانوں کو پڑھ کر ویسا لکھنے کی کوشش کریں۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں نے "اوور کوٹ" لکھا تو مجھے پتا تھا کہ روسی استاد گوگول کا بھی اسی نام سے ایک بے حد مشہور افسانہ ہے۔ اسی طرح ماجد رشگری سیٹھی کا افسانہ "گرم کوٹ" کے نام سے بھی چھپ چکا تھا لیکن میرا "اوور کوٹ" مشاہدے کے لحاظ سے ان دونوں افسانہ نگاروں سے قطعی مختلف تھا میں نے نہایت بے باکی اور جرأت مندی سے لکھا۔ اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا تو اسے انعامات سے نوازا گیا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اگر عنوان یکساں ہو تو سرقہ کے ذیل میں نہیں آتا۔

س: یوں تو ایک ادیب کو اپنے سارے ہی بچے عزیز ہوتے ہیں اور پیارے لگتے ہیں لیکن پھر بھی آپ سے یہ پوچھنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آپ کو اپنا کونسا افسانہ سب سے زیادہ پسند رہا ہے؟

ج: (مسکرا کر) ایک ماں کو اپنے شریر بچے زیادہ پیارے لگتے ہیں مجھے اپنا افسانہ "حمام میں" بہت اچھا لگتا ہے۔ "کتبہ" اور "اوور کوٹ" کلاسیکل انداز کے ہیں۔ "آنندی" میں ایک بالکل نیا تجربہ کیا ہے کہ اس میں کوئی کردار نہیں ہے۔ سارا شہر اس کے کردار ہیں۔

س: "آنندی" کی ایک اور حوالے سے بات کی گئی ہے کہ اس میں ایک شہر کو عدم سے وجود میں آتے اور آباد ہوتے دکھایا گیا ہے جو ظاہر ہے بالکل نیا تجربہ تھا۔

ج: جی ہاں "آنندی" پر بہت اچھے مضامین لکھے گئے اور اس کا بہت چرچا ہوا۔

س: آل احمد سرور نے اپنے ایک مضمون میں کرشن چندر کو منٹو سے بڑا فنکار قرار دیا ہے جبکہ حسن عسکری مرحوم کی رائے منٹو کے حق میں ہے۔

"آنندی" کا خیال اتنا بڑا تھا کہ لوگوں نے اسے سرقہ قرار دے دیا

آپکی کیا رائے ہے کہ افسانے کے فن میں بڑا مرتبہ کس کا ہے؟

ج: یہ تو ہر دور میں ہوتا ہے کہ چند نقاد ایک ادیب کو سراہتے اور چند کسی اور کو۔ جہاں تک میری پسند کا سوال ہے میں اردو افسانہ نویسوں میں محمد حسن عسکری، عصمت چغتائی اور بیدی کے بہتر افسانوں اور سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر اور نئے لکھنے والوں میں انتظار حسین اور خالدہ حسین کے افسانوں کو پسند کرتا ہوں۔

س: قرۃ العین حیدر کو "آگ کا دریا" اور "میرے بھی صنم خانے" کی وجہ سے صرف ناول نگار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور ان کے افسانوں کو کسی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے جبکہ ان کے افسانے بھی نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانوں کے بارے میں آپکی کیا رائے ہے؟

ج: جب اردو رسائل میں افسانے چھپنے شروع ہوئے تو ان کا انداز زیادہ تر رومانی تھا۔ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، ل احمد اور دیگر ایسا لکھنے والے افسانہ نگار مثلاً آسکر وائلڈ، لارڈ ڈنسانی، ٹیگور وغیرہ رومانی ادب کے دلدادہ تھے اور لکھتے بھی اسی قسم کا ادب تھے۔ ہمارے افسانہ نویس بھی ان کی پیروی میں ایسے ہی افسانے لکھنے لگے۔

ہمارے افسانہ نویسوں کو جھنجھوڑ دیا۔

گورکی کے افسانوں کو پڑھ کر حقیقت پسندانہ ادب لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ منٹو، عصمت چغتائی، پریم چند، علی اختر حسین رائے پوری نے اس دور میں لکھنا شروع کیا۔ قرۃ العین حیدر کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سجاد حیدر یلدرم اور حجاب امتیاز علی کے انداز میں رومانی ادب سے زیادہ شغف رکھتی ہیں۔ چنانچہ ترقی پسند نقادوں نے ان کا مذاق بھی اڑایا۔ اور ایک مضمون "پوم پوم ڈارلنگ" لکھا گیا جس میں ان کے افسانوں کا مذاق اڑایا گیا۔ رفتہ رفتہ قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں کا انداز بدلا۔ پت جھڑ کی آواز ان کا پہلا افسانہ ہے جس میں انہوں نے مغربی افسانہ نویسوں کی پیروی کی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے خاصے طویل افسانے لکھے ہیں جس کی وجہ سے ان کے افسانہ ناولٹ کا روپ اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن اب ... مجموعی طور پر جدید افسانے کے سلسلے میں اردو سے بہت کچھ توقعات وابستہ کی جا سکتی

ہیں۔

س: "آگ کا دریا" کو اردو کا سب سے بڑا ناول سمجھا جاتا ہے آپ کا کیا خیال ہے۔

ج: "آگ کا دریا" اچھا ناول ہے۔ لیکن جیسے بہت اونچے مقام پر بٹھا دیا گیا ہے اس کے باوجود "آگ کا دریا" اور میرا بھی خیال ہے کہ بیس خواتین ناول نگاروں نے کمال دکھایا ہے۔ (قدرت اللہ شہاب صاحب کے اس جملے کو قرۃ العین حیدر جینا ہوں شاؤنسٹ کا ایک ناؤسیلنا قرار دیں گی) اور جہاں تک بڑے ناول کا تعلق ہے "آگ کا دریا" اردو کا سب سے بڑا ناول ہرگز نہیں ہے سب سے بڑا کہنا بہت مشکل ہے۔

ہاں شیکسپیئر کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ بڑا ہے سب سے بڑا ڈرامہ نگار ہے۔

س: آپ ترقی پسند تحریک میں شامل کیوں ہوئے ہیں؟

ج: میری چیزیں ترقی پسند رسائل میں چھپیں ہیں لیکن لگانا پسند نہیں کیا۔ اس تحریک کے بعض پیروں کو اپنی طرح نہیں رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ ادب کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنا غلط ہے کسی سیاسی نقطہ نظر کو ادب پارے کے نیچے چھپا دیا تو میں اسے ادب نہیں سمجھتا۔ ترقی پسند تحریک روحانی کیفیت تحریک تھی اور اسی لئے پروفیسر احمد علی اور اور میرا جی جیسی تحریک چھوڑ کر بھاگ گئے کیونکہ کمیونسٹ نہ تھے۔

س: کافی عرصے سے "اردو ادب پر جمود طاری ہے" کا نعرہ لگایا جا رہا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ادب اور بالخصوص افسانے کا مستقبل کیا ہے؟

ج: تیس چالیس برس کا عرصہ دنیا کے ادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا نصف صدی سے کسی ملک میں بڑا ادب پیدا نہیں ہوا کیونکہ ادب میں آنا جانا تو یونہی لگا رہتا ہے۔ جیسی ہماری خواتین سے بہتر کوئی نہیں ہوتا اب دیکھئے کہ برنارڈ شا اور سارتر کے بعد کون ہے؟ امریکہ نے پچھلے ایک سو سال میں کتنے ادیب پیدا کئے ہیں۔ ہنری جیمز، ارنسٹ ہیمنگوے، ولیم فاکنر اور اس کے بعد ادب میں جمود آ گیا۔ برنارڈ شا کے بعد کوئی ڈرامہ نویس سامنے نہیں آیا۔ خود اردو میں میر کے بعد غالب اور اقبال ان تینوں شعراء کے درمیان طویل وقفے حائل ہیں تو ان وقفوں کو ہم جمود کہیں گے؟ ادب میں جانشینیاں ہیں جیسے بادشاہوں کی بیٹیاں جو ہوتی تھیں تاج نہیں پہنا۔

س: ادب میں اس "وقفے" کی آپ کیا توجیہ پیش کریں گے؟

ج: اس کی کوئی توجیہ نہیں ہے۔ ایک زمانے میں انگریزی میں سینکڑوں ادبی رسائل نکلتے تھے اب ایک رسالہ بھی نہیں چھپتا۔ اس کی کیا وجہ ہے کیا لوگ نالائق ہو گئے ہیں کیا سبب ہے۔ میرا خیال ہے کہ بڑا ادب ادوار میں پیدا ہوا ہے جو خوشحالی کے ادوار تھے اور ادب کا تاج ہو یا پہلی جنگ عظیم جبر و تشدد اور کساد بازاری کے زمانے میں تو ادب پیدا نہیں ہوا۔ تاریخ افلاس، تشدد اور جبر کے نتیجے میں جنم لیتی ہے۔ تیرہ سے ساٹھ تک کا مطالعہ کر لیجئے، آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔

امریکہ اور انگلستان میں بڑے ادیب ادوار کی معاشی حالت کے دور میں پیدا ہوئے۔ برنارڈ شا صاحب کا ایک فیصلہ کہ آئندہ ادب میں آلہ نہیں کیا جا سکتا تھا منتخب ہو کر اس بات کا تعین جائز پیش کرنا ناممکن ہے بہت سے اسباب ہیں مثلاً لوگوں کا شوق بدل گیا ہے ہمارے ملک میں لوگ ڈائجسٹ پڑھنے لگے ہیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے۔

۱۹۵۰ء میں میری شادی ظہیر بابر سے ہو گئی۔ اب ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی ماں ہوں۔ ازدواجی زندگی کافی پرسکون ہے میں عام بیویوں کی طرح ہی جان نثار کر رہی ہوں مگر لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ افسانہ نگار ہو کر ازدواجی زندگی کیا گزارتی ہوں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

۵۰ء ہی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی لاہور شاخ کی سکریٹری منتخب کی گئی۔ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں کی رپورٹ لکھنا پڑتی۔ مگر بعد میں لکھنا شروع کر دیا۔ ان کی وجہ سے رسالوں کی مہربانیاں نازل ہو گئیں۔ یہ سب صرف ہفتہ وار اجلاسوں کی رپورٹ لکھنے کی رہ سے ہوا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ گناہ بھی ہوتا ہے مجھے نہیں۔ یہ بہن اور بھائیوں سے بہت محبت ہے مگر جانے کیوں مجھے لاہور سے زیادہ عزیز ہی رہا ہے۔ شادی بھی ایک ہی روز کی شادی کے بعد بھی لاہور میں مرتے مگر الگ ہو گئے تھے۔ مگر روز ملنا ہوتا۔ اب جب سے ظہیر کراچی میں مقیم ہیں۔ تو مجھے لاہور پردیس لگنے لگا ہے جانے یہ پردیس کب دیس بنے گا۔

(حریت)

نئی بجلی معذوروں سے کہہ رہے ہیں ... گونگے بہرے "شعبہ شکایات" کے لیے اور اندھے کانے ... بجلی کے بل بنانے والے شعبے کے لیے چاہئیں



ہم

بقیہ انھوں نے سفرنامہ نہیں لکھا

یوسف کامران: "انتہائی شہوانی نظموں کے خالق اور خود مرکز پن سے آزاد" اس جملے میں کتابت کی ایک واضح غلطی ہے۔ جملے کو اصل میں "نظمیں" لکھا گیا تھا کاتب نے "نظموں" لکھ دیا۔ انتہائی شہوانی نظمیں صرف یوسف کامران ہی لکھ سکتے ہیں ورنہ اس حد تک خود مرکز پن سے آزاد نہ ہوتے)

حسن رضوی: "پہلی ملاقات ... اعجاز قامت ہیں ان کی بہت ملاقاتیں: (اچھا ہوا کہ برادرم کو اس بار دوسری مرتبہ یہ ملے۔ دوسری ملاقات میں ان کے قد تو وہی رہے ہیں ملاقات کرنے والے کے بدل رہتے ہیں)

(جسارت)

بقیہ خدیجہ مستور

اس حوصلہ افزائی کے بعد میں نے اور بھی سنبھل کر لکھنا شروع کیا۔ اور اب تک لکھ رہی ہوں۔ اور ایک ناول اور افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک ناول بیتا دم ہی انعام بھی ملا تھا۔ اپنے لکھے سے آج تک مطمئن نہیں ہوئی شاید میں ایک ایسا بھی لکھ سکوں جس سے خود بھی مطمئن ہوں۔

انہوں نے سفرنامہ نہیں لکھا، ادیبوں کی ڈائرکٹری مرتب کی ہے

پچھلے ہفتے ہم نے وعدہ کیا تھا کہ منقولات اشاعت سے طراج کومل کے سفرنامہ پاکستان کے بارے میں ایک کالم لکھیں گے جو بمبئی کے رسالے "شاعر" میں شائع ہوا ہے۔ اس وعدے کو پورا کرنے کے لئے جب ہم نے طراج کومل کے سفرنامے کو دوبارہ پڑھا تو اندازہ ہوا کہ اس کی خوبیوں کا احاطہ کرنے کے لئے ایک کالم سے کام نہیں چلے گا، پوری کتاب لکھنی پڑے گی۔ ہم تو کتاب لکھنے کے لئے وقت نکال سکتے ہیں لیکن اخبار میں اتنی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ لہٰذا ہم اپنی گفتگو کو محدود کرتے ہوئے مختصراً عرض کریں گے کہ طراج کومل نے ۔۔ مرتب کر کے ہمارے سرگودھا کے ادیبوں کی ایک ڈائرکٹری مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سفرنامے کو ان دونوں شہروں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری بھی کہا جا سکتا ہے۔ کاش طراج کومل پاکستان کے دوسرے شہروں کو بھی اپنے قدم سے نوازتے تاکہ پاکستانی ادیبوں کی مکمل ڈائرکٹری تیار ہو جاتی اور ہمیں آپ لیٹر والوں کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ہمارے ادیب کس طرح کے جاتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ طراج کومل سرد سیاحت کے مقصد سے پاکستان تشریف لائے تھے اور انہوں نے محض سفرنامہ لکھنے کے لئے سفر کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ہمارے بعض ادیب تو سفرنامہ لکھنے کے لئے کیسے سفر کرتے ہیں۔ سفر لوگوں کا روز ۔۔ ختم ہو جاتا ہے لیکن سفرنامہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ادیب حسب ضرورت غیر ملک میں جاتے ہیں سفرنامہ لکھتے تھے۔ لیکن اب غیر ملکوں میں جانے کی رسم ۔۔ پاکستان کے ایک شہر سے دوسرے شہر جا کر جب اچھا سفرنامہ لکھا جا سکتا ہے تو پھر ملک سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔

تین سال ہوئے، میرزا ادیب چند دنوں کے لئے کراچی تشریف لائے تھے۔ کراچی میں قیام کے دوران ہی انہوں نے اپنا سفرنامہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ جناب ۔۔ میں اس کی قسطیں شائع ہوئی تھیں۔ ان قسطوں میں انہوں نے لاہور ایئرپورٹ تک پہنچنے کی داستان بیان کی ۔۔ گزری رو سے یہ سفرنامہ مکمل نہیں ہو سکا اور اس کی قسطیں اس لئے شائع ہو رہی ہیں اور میرزا صاحب کراچی ایئرپورٹ سے گزر کر شہر جانے کے لئے ٹیکسی تلاش کرنے کا واقعہ بیان کر رہے ہوتے ماقی واقعات پر مشتمل قسطیں آئندہ تین برسوں تک شائع ہوتی رہیں۔

طراج کومل نے میرزا صاحب کی طرح طوالت سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے اپنے سفر کی طرح سفرنامے کو بھی مختصر ۔۔ رکھا ہے اور اسے ایسا اشارہ اور علامتی اعلامیہ اختیار کیا ہے جو عموماً ٹیلیگرام لکھتے وقت اختیار کیا جاتا ہے۔ طراج کومل کا اشاراتی و علامتی نظام خاصا پیچیدہ ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہمارے سفرنامے کی تشریح کی جائے۔ بہرحال سفرنامے کی جن عبارتوں کے بارے میں ہم سمجھ سکے ہیں، ان کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کریں گے۔ طراج کومل نے بے شمار ادیبوں کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ تاثرات ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔ تشریحی عبارتیں قوسین میں درج کی جا رہی ہیں۔

کشور ناہید: "مستورات کی سرتاج کشور ناہید تھیں۔" (لفظ "سرتاج" کا استعمال توجہ طلب ہے۔ اردو میں یہ لفظ طراج کومل سے پہلے کسی نے ان معنوں میں استعمال نہیں کیا)

انور سجاد: "کشور ناہید کے ۔۔ ڈھیروں باتیں کر ڈالیں، ہم نے مختصر سی ملاقات میں لیکن تشنگی باقی رہ گئی۔" (تشنگی باتوں ہی میں نہیں انور سجاد کے افسانوں میں بھی پائی جاتی ہے)

اسحاق احمد: "وجیہہ اور خوبصورت ہیں، عمر کے سفر میں کسی حد تک مذہب کی جانب مائل ہیں۔" (عمر کے سفر ہی میں نہیں ادب کے سفر میں بھی یہی حال ہے)

عطاء الحق قاسمی: "ملاقات تو ہوئی لیکن مختصر۔" (کالموں کے معاملے میں بھی یہی بہتر ہے)

ڈاکٹر وحید قریشی: "کشادگی طبع اور کشادگی جسامت ان کی دلآویز خصوصیات ہیں۔ صرف ذہن کے بادشاہ نہیں بلکہ دل کے بھی شہنشاہ ہیں۔ اورینٹل کالج کے طلبہ و طالبات سے جلوائے کے وعدے کرتے رہے لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے ایفائے عہد نہ کر سکے۔" (کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں عادت کی بنا پر ایسا ہوا ہوگا۔ کشادگی طبع اور کشادگی جسامت کے ساتھ کشادگی دماغ کا ذکر بھی ہوتا تو اچھا تھا۔ آج کل ڈاکٹر صاحب کا زیادہ وقت شعر کہنے میں صرف ہوتا ہے۔ سنا ہے کہ وہ اپنے تحقیقی مضامین کو بحر میں منظوم کر رہے ہیں)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری: "طلعہ ایسا ۔۔ روق کے مقالے ۔۔ میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا راشد کی شاعری پر مقالہ بڑا اثرانگیز تھا۔ لیکن سراسر منطق اور گمراہ کن تھی۔ سوانحی تفصیلات نے شاید مقالے کو غلط فہمیوں میں ڈال دیا۔" (اسی ایک مقالے پر موقوف نہیں تبسم کاشمیری اپنے ہر تنقیدی مقالے کو غلط فہمیوں میں ڈالنے کے عادی ہیں)

رام لعل: "صرف کتابیں پڑھتے ہیں سنتا ہوں میں بیٹھتے ہیں اور نظمیں لکھتے ہیں۔" (لیکن ادب کی تاریخ میں ان کا نام صرف شاعروں میں بیٹھنے کی وجہ سے آئے گا۔ اردو میں کہا ہے کہ ادب کی تاریخ زاہد ڈار خود لکھیں)

انیس ناگی: "محفلیں کے ایڈیٹر، صاحب جواب تا کہ ہم نے تخلیق کے متعلق ہمارے کالموں کا ایک سیٹ پیش کیا۔ اس کے ساتھ بل بھی تو ہوگا، اس کا ذکر بھی کیا جانا چاہیے تھا)

سجاد باقر رضوی: "میری نظم 'اکیلی' کے مصرعے دہراتے ہوئے میرے وجود میں اتر جاتے ہیں۔" (طراج کومل شاید پہلے اور آخری شاعر ہیں جن کے مصرعے سجاد باقر رضوی کو یاد ہیں۔ ویسے ادب کا معاملہ ہو تو رضوی صاحب وجود میں تو کیا دل میں اترنے سے بھی دریغ نہیں کرتے)

صلاح الدین محمود: "ان کا نقشہ احباب نے میرے ذہن میں کچھ اس قسم کا مرتب کر رکھا تھا کہ وہ انتہائی مستعلق قسم کے معروف شاعر ہیں۔ بیٹھنے کی جگہ تو خوب اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں، ٹٹولتے ہیں اور پھر اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔ گفتگو شروع کرنے سے قبل دو بار گلا صاف کرنے کے لئے کھنکھارتے ہیں اور پھر نپی تلی مہذب زبان میں صرف مطلب کی بات کرتے ہیں۔" (کاش صلاح الدین محمود اپنی شاعری میں بھی کبھی کوئی مطلب کی بات کرتے)

شہزاد احمد: "دلی کا لاہور کے بہت پرانے افسر ہیں۔ تصویر میں میرے ہم عمر دکھائی دیتے ہیں۔ گفتگو انتہائی شگفتہ کرتے ہیں۔" (اب شگفتگی گفتگو کی حد تک ہی رہ گئی ہے۔ شعر تو دلی کا ۔۔ کی روٹیوں کی طرح صرف دو مرے روز تک تازہ رہتے ہیں)

مستنصر حسین تارڑ: "جب تعارف ہوا تو میں حیران سا رہ گیا۔ دہلی میں یار لوگوں نے پہلے ان کے سر پہ ان کی تعریف کر کے سے منع کر دیا تھا۔" (لاہور کے ادبی یار لوگ "تو اتنے محتاط ہیں کہ سر پر کسی کی برائی بھی نہیں کرتے، ایسے لوگ بھلا کسی کے منہ پر تعریف کیسے کر سکتے ہیں۔ حیرت ہے کہ طراج کومل تعارف کے بعد صرف حیران ہوئے حالانکہ یہ موقع پریشانی کا تھا۔)

انتظار حسین: "۶ اکتوبر کی شام کو مسلسل قربت اور اپنائیت کی حدوں کو وسعت دیتے رہے۔" (آج کل وہ یہی سلوک کشور ناہید کے حوالے سے سلیم احمد سے بھی کر رہے ہیں)

عبدالعزیز خالد: "ان کی زبان کو تر و تسنیم سے دھلی ہوئی ہوتی ہے۔" (لیکن کہیں کہیں دھلائی زیادہ ہو جاتی ہے)

تحسین فراقی: "ابھرتے ہوئے نقاد۔" (تحسین اور نقاد دونوں میں سے ایک ہی ابھر سکتا ہے)

خدیجہ مستور — آپ بیتی



برصغیر کی ممتاز ادیبہ خدیجہ مستور ۲۶ جولائی ۱۹۸۲ء کو لندن میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئیں۔ خدیجہ مستور کی وفات سے اردو زبان میں افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا ایک زریں دور ختم ہو گیا۔ بظاہر وہ ہم سے جدا ہو گئیں لیکن درحقیقت وہ اپنی خوبصورت تحریروں کے ذریعے ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گی۔ ہم اس موقع پر خدیجہ مستور کی خود نوشت آپ بیتی شائع کر رہے ہیں جو اٹھارہ سال پہلے ایک ادبی ماہنامہ میں شائع ہوئی تھی۔

اپنی عمر کے لئے کوئی اندازہ نہیں رکھتا تقریباً ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ اگر عمر خضر نہ پائی تو ساٹھ ستر سال تو ضرور ہی جی لیں گے۔ کل کی کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی، اور نہ کل کی آنے والی موت کے لئے سوچ سمجھ کر کوئی دھلنا پسند کرتا ہے میرا بھی یہی خیال تھا کہ عمر کے اسی حصہ میں آپ بیتی لکھوں گی جسے بڑھاپا کہتے ہیں اس وقت لے دے کے انسان کے پاس صرف یادیں رہ جاتی ہیں وہ اذیت ناک ہوں یا فرحت بخش مگر اڈیٹر نقوش میرے برادر محترم طفیل صاحب مصر ہیں کہ کچھ نہ کچھ لکھ دیجئے۔ سو میں جو کچھ لکھوں گی وہ میری آپ بیتی کم صرف چند تاثرات ہوں گے آج اگر میں بہت کچھ لکھنے کی کوشش کروں تو وہ قبل از وقت ہو گا۔ مجھے اس دنیا کو کچھ اور دیکھنے دیجئے کچھ اور سیکھنے دیجئے اور وہ زمانہ بھی آنے دیجئے جب یادوں کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا جب کہ ان میری ننھی سی اکلوتی بچی مجھے چھوڑ کر ایک نئے گھر آباد ہو جائے گی اور میرا اکلوتا بیٹا پرویز ابراہیمی دلہن کے وجود میں کھو کر مجھے بھول جائے گا اور ظہیر بابر شاید عینک لگا کر گہرے مطالعے میں غرق رہا کریں گے تو پھر میں کچھ تھکن اور تنہائی محسوس کروں گی اس وقت میں احساس تنہائی سے بچنے کے لئے اپنی آخری کتاب لکھوں گی جسے آپ بیتی کہا جائے گا۔

میرا بچپن ان غریب بچوں سے کھیل کر گذرا۔ جنہیں لوگ اپنی زبان میں نیچ کہتے ہیں میری رشتے کی ایک پھوپھی ایسے بچوں سے کھیلنے دیکھ کر کہتی تھیں کہ وہ نیچوں کے گھر سوت سہ پیدا ہوتی ہے۔ میرے کھیل زیادہ سب سنوں اور بہائی سے بالکل مختلف ہوتے تھے۔ گلی ڈنڈا، کبڈی، گیڈی، آتالاب میں لڑکوں کے ساتھ تیرنا، درختوں پر چڑھنا۔ بچپن میں مجھے جنون سا تھا کہ اونچے سے اونچے درخت سر کر دوں مگر یہ عجیب بات ہے کہ میں کبھی گری نہیں۔ ہاں کبھی کبھی وہ ایک چھت جاتی تھی جس پر گھر میں مار

گھنٹوں روتی تھی۔ بچپن میں جب میں نے کھیلنا سیکھا تو عام لڑکیوں کی طرح گھروندے بنا کر کھیلتی تھی۔ مگر جلدی ہی مجھے گھروندے بنانے سے

مگر کوئی نہ کوئی شریر بچہ لات مار دیتا میرے لئے بچوں کی یہ حرکت بڑی اذیت ناک ہوتی تھی۔ گھروندا بنا کر میں نے خود کبھی نہیں توڑا۔

آٹھ سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کر کے فوراً چھوڑ دیا اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو بھی قرآن شریف پڑھایا جاتا تھا دو تین مہینے تک سب بچے میں اولی بچا کر

بچوں کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سبق پڑھانے اور ابھی ان کا ایک پارہ بھی ختم نہ ہو سکا تھا کہ ان کی کند ذہنی سے تنگ آ کر سب کو بھگا دیا۔

[illegible]
معلوم کر لیا۔ اس کے بعد لکھنا شروع کیا کیونکہ میرے دماغ میں تو سینکڑوں پلاٹ ہیں۔ عجیب مذاق اڑاتی تھیں [illegible]

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں کھلا بستان نام کی تعمیر کھلی ہوئی تھی۔ ابا میاں نے اپنے ایک عزیز دوست کے ساتھ مجھے، باجرہ اور عائشہ بجیا کو لکھنؤ بھیج دیا تاکہ بچوں کی تفریح ہو جائے وہاں شوکت تھانوی مرحوم ملے ہمارے گھر میں ان دنوں شوکت صاحب کی سودیشی ریل کا چرچا تھا میں سخت مِنیائی سے ملی اور انہیں بھی بتایا کہ میرے دماغ میں بہت سے پلاٹ ہیں۔ میں بھی کہانیاں لکھوں گی۔ شوکت صاحب مرحوم دوسروں کی طرح ہنسے نہیں (پتہ نہیں دل میں وہ بھی ہنس رہے ہوں) بلکہ بڑی سنجیدگی سے فرمایا کہ تم ضرور لکھو گی۔

۱۹۳۷ء میں ابا میاں کا انتقال ہو گیا، ان کے مرنے کے بعد راز کھلا کہ یہ ایک معقول قسم کی تنخواہ پر حاتم طائیوں جیسی زندگی گزارنے والے ابا میاں اپنے اوپر تلے کے سات عدد بچوں کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑ گئے۔ اس کے بعد ایک لمبے عرصے تک زندگی کس طرح گذری یہ ایک پوری داستان ہے سوچتی ہوں کہ جب وہ سب تفصیلیں لکھوں گی تو کلیجے کا کیا حال ہو گا ایک ننھا سا قصبہ تھا ہوں والد کے انتقال کے بعد ہم سب لکھنؤ آ گئے ہمارا مکان اس جگہ تھا جہاں والد کے پیر نانا کا مزار تھا مزار پر روز شمعیں کے چراغ جلتے۔ جانے کہاں کہاں سے عورتیں آتیں اور مزار کا طاق گلگلوں سے بھر کر چلی جاتیں۔ ایک رات ہمارے گھر فاقہ تھا کیونکہ

ماموں میاں کا منی آرڈر آنے میں دیر ہو گئی تھی میرا چھوٹا بھائی توصیف جو صرف چھ سات سال کا تھا بھوک سے بلبلا کر طاق پر سے گلگلے اٹھا لایا۔ باجی اماں (میری امی) نے اسے سمجھایا کہ یہ گلگلے تو مجاوروں کے لئے ہوتے ہیں اور یہ سنتے ہی صابر بچے گلگلے اسی طرح طاق پر رکھ آیا ہم نے دکھوں کا وہ زمانہ انتہائی خاموشی اور غرور سے گزارا۔ کسی کو ہمارا حال کبھی معلوم نہ ہو سکا جو ہمارے دکھوں کی ٹوہ میں رہتے تھے، ہم کبھی ان کے سامنے شرمندہ نہیں ہوئے اس زمانے میں ہم سب بے حد حساس ہو گئے تھے ہم کو ماموں دولہے خلوص اور محبت کی نمی کی کرن

کا ایک بیٹا تھے ... کے ساتھ میں قدم اٹھاتے تھے اس جنگ میں ایک ادھوبار دھوکہ بھی کھایا۔ مگر میں آج تک سوچتی ہوں کہ کیا دھوکہ دینے والے کامیاب رہے، کیا انہوں نے خود اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دیا تھا! کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ان کے دھوکوں کے بعد بھی میرا ایمان محبت اور انسان کی عظمت پر سے نہیں اٹھا! میرے ابا میاں مرحوم، میرے ماموں میاں مرحوم، میرے سوتیلے والد مولانا مصطفیٰ خاں صاحب مداح راحتی پھپھوندوی مرحوم، میری سوتیلی والدہ، میرے پیارے سوتیلے بھائی میرے منہ بولے ماما سید ناصر حسین صاحب مرحوم، کیا محبت اور ایثار کی ایسی مثالیں مل سکتی ہیں؟ جب میں اپنی آپ بیتی لکھوں گی اور جب بیس (۲۰) یا پچیس (۲۵) سال بعد آئندہ نسلیں اسے پڑھیں گی تو وہ یقیناً اسی طرح حیران ہوں گی جیسے میں حاتم طائی کے قصے پڑھ کر دنگ رہ جاتی ہوں۔ ان کے لئے میرے اکلوتے ماموں میاں کتنے عجیب سے انسان ہوں گے جو نازو نعم میں پرورش پانے کے بعد بیوہ بہن اور بھانجیوں کو سنبھالنے کے لئے، اپنے مستقبل کو تاریک کر کے اٹھارہ انیس سال کی عمر میں نوکری کرنے پردیس چلے گئے اپنی ساری کمائی ہمارے پیٹ کے جہنموں میں

جھونک کر جانے خود کس طرح گزارہ کرتے رہے۔ اور پھر سال کے اندر اندر آنتوں کی دق لے کر وطن واپس آ گئے۔ اور وہیں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ اور یہ نئی نئی کوٹھیاں بنانے کے لئے ہزاروں جتن کرنے والے کیسے یقین کریں گے کہ ناصر ماما نے اپنے سر چھپانے کا سہارا، اپنے باپ دادا کی یادوں کا مرکز، اپنا گھر لکھنؤ سے لاہور آنے کے سلسلے میں کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ لکھنؤ کے حکیموں کے خاندان کا یہ معزز فرد ہم سے ملنے کی خاطر ایک دن کی جیل بھی جھیل آیا مگر جیل اور مقدمے سے فرصت پاتے ہی پاکستان آ کر رہا۔ ناصر ماما کو مرے ہوئے پورا ایک سال ہونے کو آ رہا ہے مگر آج بھی جب میں اپنے ملکے، اپنے لاڈلے بھائیوں، بہنوں اور ماں کو دیکھنے جاتی ہوں تو وہاں مجھے ناصر ماما نظر آتے ہیں، لحاف اوڑھے، بستر پر بیٹھے کھانس رہے ہیں، سانس پھول رہی ہے، مگر آنکھوں سے خوشی ٹپک رہی ہے وہ سر اونچا کر کے کہتے ہیں "دیکھو بیٹیا کیا میں نے جھوٹ بولا تھا۔ جب میں نے پاسپورٹ

بنوانے کی درخواست دی تو اس میں لکھا تھا کہ میں اپنی بیٹی اور بھانجی (میری امی) سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ تحقیق کرنے کے بعد ان ظالموں نے کہا کہ تمہاری کوئی بیٹی نہیں مجھے حوالات میں بھیج دیا۔ یہ سالا تو میری بیٹی ہیں۔۔۔ دیکھ میں تو آ۔۔۔! روک لیتے تو جانتا۔"

اور پھر احمد ندیم قاسمی، میرے بھیا میرے سرپرست" میرے شوہر کے ماموں اور سسرال والوں کی نظروں میں میرے خسر بھیا کے لئے صرف میں اتنا ہی لکھوں گی۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے سب کچھ لکھنا شروع کر دیا تو ان گنت صفحے بھر جائیں گے۔ ہاں صرف ایک بات ضرور کہوں گی کہ بھیا ندیم کی سرپرستی پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ سب نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق سوچا مگر مجھے آج بھی ان باتوں کا ملال نہیں۔ ظالموں نے میرے ناصر ماما کو جیل بھیج دیا تھا۔ صرف اسلئے کہ وہ سچ بولے تھے۔ ندیم بھیا۔ بھیا ہی رہے سچ پر کون پہرہ بٹھا سکتا ہے۔۔۔؟

۱۹۴۲ء میں لکھنا شروع کیا۔ اور ایک رسالے کو (جس کا نام اب یاد نہیں) اپنی کہانی چھپنے کے لئے بھیج دی۔ کہانی تو فوراً چھپ گئی مگر میرا نام رسالہ آ گیا۔ اس قدر خوشی ہوئی کہ نہ تو اس دن کھیلنا یاد رہا اور نہ کھانا۔ رسالے پر سے پیسے کی چٹ اتار کر بڑی احتیاط سے بکس میں رکھ دی۔ پھر بہت سوچ سمجھ کر ایک مضمون لکھا اور وہ ایک پرچے میں بھیج دیا جو چھپ گیا۔ یہ مضمون پردے کی حمایت میں تھا۔ اور ثابت کیا کہ پردہ اٹھانا کتنے بے حیائی کی بات ہے۔ کہانیوں کے ساتھ ساتھ دو چار شعر بھی کہہ لیتی تھی۔ مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ شاعری اپنے بس سے باہر ہے۔ کہانیوں کا بھی یہی حال رہا جانے کتنی لکھیں اور پھاڑ دیں۔ مگر پھر بھی "خیام" اور "عالمگیر" میں ابتدائی کہانیاں برابر چھپتی رہیں۔ ۱۹۴۵ء میں ذرا سنبھل کر لکھنا شروع کیا۔ اور اس روز بڑی مسرت ہوئی جب سید احتشام حسین صاحب کا مضمون لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔ اور اس مضمون میں میری کہانی "منجو" کی بڑی تعریف تھی۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اتنے بڑے نقاد میری کہانی کی تعریف کریں گے۔

[illegible]

مرزا ادیب

خدیجہ مستور

توانائیوں کا ایک طوفان، ایک ناتواں انسانی پیکر میں

دیارِ غیر سے ایک بار پھر ایسی دلخراش خبر آئی کہ سینے میں دل ڈوب ڈوب گیا۔

اردو ادب کی ایک بہت پیاری ہستی بحالیٔ صحت کے لئے لندن گئی تھی ... مگر وہاں رہی سہی زندگی بھی دے آئی۔

ابن انشاء بھی علاج کے لئے ادھر گیا تھا اور صندوق میں بند ہو کر کراچی کی ایئرپورٹ پر لوٹا تھا۔ خدیجہ مستور بھی ایک صندوق ہی میں مستور ہو کر لاہور ایئرپورٹ پر پہنچی یہ سوچ کر دل کو ایک دھچکا سا لگتا ہے کہ اس میں اور وہ سب لوگ جو خدیجہ مستور سے محبت کرتے تھے ... اس کا ناول پڑھ کر اس کے افسانوں کا مطالعہ کر کے اس کے شیدائی ہو گئے تھے .. اب خدیجہ مستور کو اس بھری دنیا میں کبھی نہیں کہیں نہیں دیکھ سکیں گے۔

خدیجہ مستور ایک ایسے خاندان کی فرد تھی جس سے کئی نامور شاعر، ادیب اور صحافی تعلق رکھتے تھے . مگر اس کا انتقال صرف اس کے خاندان کے لئے ایک غم انگیز واقعہ نہیں ہے بلکہ ادب کے اس وسیع خانوادے کے لئے بھی ایک غم انگیز حادثہ ہے جو سارے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک رکن میں بھی ہوں۔

میں اس وقت خدیجہ مستور کے ادبی کارناموں پر گفتگو نہیں کروں گا۔ اس کے لئے کئی مواقع ملیں گے۔ میں تو ان لمحوں میں دورِ ماضی کے دھندلکوں سے لپٹی ہوئی کچھ یادوں کو آواز دینے کی کوشش کروں گا۔

خدیجہ مستور کا نام سب سے پہلے میں نے اپنے مرحوم دوست عبدالرحیم شبلی کی زبانی سنا تھا۔

میں "ادبِ لطیف" کے ادارتی فرائض انجام دے رہا تھا اور شبلی ماہنامہ "عالمگیر" اور ہفت روزہ "خیام" کا ایڈیٹر تھا۔ ہماری ملاقات قریب قریب روزانہ ہو جاتی تھی۔ کبھی ادبِ لطیف کے دفتر میں اور کبھی ارشد ٹی سٹال میں۔

خیام کا سالنامہ زیرِ ترتیب تھا۔ شبلی مختلف ادباء کی تحقیقات فراہم کرنے میں بڑی مستعدی سے مصروف تھا۔ وہ ہر روز بتا دیتا تھا کہ آج فلاں فلاں ادیب کی چیزیں ملی ہیں۔ ایک روز اس نے بتایا۔

آج ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے افسانے ڈاک سے آئے ہیں اور دونوں کمال کے افسانے ہیں۔

دونوں نام میرے لئے نئے تھے۔

"یہ کون ہیں؟" میں نے شبلی سے پوچھا۔

شبلی کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ میں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور سے واقف نہیں ہوں۔ اس نے بتایا کہ یہ دونوں بہنیں ہیں اور ان کی چیزیں "عالمگیر" اور "خیام" میں چھپتی رہتی ہیں۔ دوسرے روز میں عالمگیر کے دفتر میں جا پہنچا اور ان کا پتہ لے آیا۔ یہ پتہ اب تک میرے ذہن پر نقش ہے ... جھوائی ٹولہ۔ لکھنؤ۔

میری خط و کتابت شروع ہو گئی۔ ہاجرہ مسرور کا تو نہیں خدیجہ مستور کا افسانہ مل گیا اور ادبِ لطیف میں چھپ گیا۔

میں نے اس افسانے سے اندازہ لگا لیا کہ اس کی مصنفہ کو زبان و بیان پر تو قدرت ہے ہی۔ شاید اس وجہ سے کہ لکھنؤ کی پروردہ ہے ... مگر یہ اس کی اصل خوبی نہیں ہے۔ اس کی اصل خوبی مشاہدے کی گہرائی، جزئیات نگاری اور بے باکی اظہار میں ہے۔

پھر ہاجرہ اور خدیجہ کا خاندان قیامِ پاکستان کے گرد و پیش کے زمانے میں ہجرت کر کے لاہور میں آ گیا اور چودھری نذیر احمد جو ادبِ لطیف کے منیجر تھے انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ خاندان نسبت روڈ دیال سنگھ پبلک لائبریری کے عقب میں ایک مکان کے اندر رہتا ہے۔ جہاں احمد ندیم قاسمی بھی ہیں۔

یاد پڑتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی سے ملاقات کے لئے گیا تو ہاجرہ اور خدیجہ کے علاوہ شاید عائشہ جمال سے بھی ملاقات ہو گئی۔

خدیجہ کو دیکھ کر یہ باور کرنے کو جی نہ چاہا کہ اتنی توانائی ایک کمزور سی، نحیف و نزار سی لڑکی در آسکتی ہے۔

خدیجہ ایک چھوٹی سی گٹھری بنی میرے سامنے کرسی میں سمائی ہوئی تھی اور میں بار بار سوچتا تھا کہ کیا یہ واقعی خدیجہ مستور ہے۔

دونوں بہنوں نے یا غالباً تینوں بہنوں نے برقعے اوڑھ رکھے تھے۔

یہ ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا ... ادب کی ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی۔ دونوں بہنیں اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں جلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ میٹنگوں میں حصہ لیتی تھیں۔ اور تمام سرگرمیوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔

رومانیت یا محض خیال آفرینی اور خواب تراشی تو پہلے بھی ان کی تحریروں میں نہیں تھی مگر اس دور میں ہوا یہ کہ ان کے افسانوں میں زیادہ بے باکی، زیادہ جرأت آ گئی۔ وہ زندگی کے تند و تلخ حقائق کے اور قریب ہو گئیں۔ یہ دور ان کی افسانہ نگاری کے عروج کا دور ہے۔

ہاجرہ تو کراچی چلی گئی۔ خدیجہ یہیں رہی اور اس سے بارہا ملاقات کا موقع ملا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے خلاق ذہن نے ہمارے ادب کو جو کچھ دیا ہے وہ تو ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بطور انسان کے ایک بہت پیاری، بہت محبت کرنے والی اپنے ہم عصروں کا احترام کرنے والی ہستی تھی جس ادیب سے بھی اس کے تعلقات استوار ہوتے تھے وہ خود کو اس کے خاندان کا ایک رکن سمجھ لیتی تھی۔

میرے سامنے کارنس پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں میری بڑی بیٹی عذرا دلہن بنی بیٹھی ہے اور اس کے ساتھ میری کوئی عزیزہ یا عزیزی موجود کے خاندان کی کوئی خاتون نہیں ہے بلکہ خدیجہ مستور ہے۔

یہ اس پیار، اس محبت اور اس خلوص کا نتیجہ ہے جو اس نے میری بچی کو دیا تھا۔

(باقی صفحہ ۲۶۶)

میری شاعری کی عورت

میری شاعری کا آغاز جس نظم سے ہوا یعنی ری پہلی نظم جو چھپی، وہ مولانا محمد علی جوہر کی ت کے بارے میں تھی، اس سے آپ اندازہ لیں کہ میرا ماحول اور میری تربیت کیسی ں۔ یہ نظم میں نے چودہ پندرہ سال کی عمر لکھی تھی۔ اس کے بعد جو ابتدائی دور کی عری ہے وہ زیادہ تر قدرتی مناظر اور فطرت ے حوالے سے ہے کیونکہ میں دیہاتی علاقے ے تعلق رکھتا تھا اس لئے مناظر قدرت ے براہ راست متاثر ہوتا تھا۔ ان مناظر انسان سے جو رشتہ ہے اس کے مدنظر میں اعری کرتا تھا۔ کسان کا زمین سے، دھوپ ے، بادل سے، بارش سے کیا، مجموعی طور پہ طرت سے جو تعلق ہوتا ہے وہ اس دور کی لموں میں نمایاں ہے۔ رومانی تجربے کل ہی نہیں تھے ان نظموں میں ——— رمیں رسمی شاعری سے آغاز کرتا، تو کوئی لوئی محبوب ضرور ہوتا میرا بھی لیکن۔ شش میں نے یہی کی ہے کہ جو تجربات حاصل وتے ہیں انہی کو فن کی صورت میں پیش روں۔ فرضی تجربے ڈالنے سے گریز کروں ں دوران میں کہیں اگر عورت کا ذکر ا لکھی ہے تو وہ کسان عورتوں کا ان کی ت مشقت کی زندگی کے حوالے سے۔

بعد میں وہ جذبہ جو گویا انسان کی لت میں ہوتا ہے، بیدار ہوا تو غزل اور ظم میں ایسی چیزیں لکھیں جن میں رومانیت ی عورت کا ذکر تھا۔ میں جب تک کسی رے سے نہیں گزرتا اس کو فن کی صورت یں دیتا۔ اپنے تجربے کی حدود سے باہر ل کر لکھنا، چاہے وہ تجربہ کتنا ہی محدود وں نہ ہو، اپنے ساتھ فریب کرنا ہے۔

میں اس خود فریبی میں کبھی مبتلا نہیں ہوا بعض چہروں کو دیکھ کر میرے اندر وہ احساس جاگا ہوگا جس نے محبت کی ۔ شاعری کی صورت اختیار کی وہ کچی عمر تھی، کچے مشاہدات اور تجربات تھے عمر کے ساتھ ان کی تہذیب ہوتی رہی۔ میری رومانی شاعری میں دونوں صورتیں ہیں۔ ایک جمال کا وسیع تجربہ ہوتا ہے وہ تو موجود ہی ہے۔ لیکن کسی خاص فرد کے سلسلے میں بے انتہا وابستگی کا تجربہ بھی ہے۔ گو وہ زیادہ پختہ نہیں۔ میری شاعری کی عورت میری محبوبہ سمجھیئے۔ وہ شوخ و شنگ نہیں ہے ایک صفت ہے میری تحریر کی ہر عورت میں۔ چاہے وہ افسانے میں ہو یا نظم میں۔ اور وہ ہے وفا۔ بے وفائی کہیں نہیں ملے گی اسی لئے میری شاعری اثبات کی شاعری ہے نفی کی نہیں اس میں محرومی ہے — حزن و ملال ہے — تنہائی بھی ہے۔ لیکن بے وفائی کا تذکرہ نہیں۔ اس کیفیت سے میں گزرا ہی نہیں۔ انسان کا مقصد اور منتہا ہوتا ہے رومانی زندگی میں بھی۔ جب وہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو محرومی، درد اور تنہائی تو ہوگی ہی۔ لیکن وہ شکایتیں گلے شکوے، کہ تم مجھے چھوڑ گئیں، تغافل کیا بے رخی کی، جفا کی۔ یہ میری شاعری میں نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ مجھے ہمیشہ وفا ہی نصیب ہوئی ہے۔ ہر رشتے میں عورت کو میں نے تین چار روپ میں دیکھا ہے سب سے اہم ماں کا، پھر بہن کا، پھر بیٹی کا پھر محبوبہ کا ——— میرا نقطہ نظر، یہ رہا ہے کہ یہ جو تصور ہے شاعر کا محبوب کے بارے میں اس میں شاعر کو توحید

پرست ہونا چاہئے۔ ایک واحد شخصیت جس کے ساتھ یہ قلبی اور روحانی وابستگی عمر بھر قائم رہے۔ اس کے علاوہ عورت ذات کو دوسرے تین روپ، میں دیکھا ہے۔ اس لحاظ سے میری نظر میں عورت محض حظ، لذت یا لطف اندوزی کی چیز نہیں ہے بلکہ میرے نزدیک عورت بحیثیت ایک تخلیق کار کے، احترام اور تقدیس کی مستحق ہے۔ میں ان شاعروں میں سے نہیں ہوں جو کسی محفل میں اچھی سی شخصیت دیکھتے ہیں تو رات کو اس کے فراق میں نظم کہہ ڈالتے ہیں۔

ایسی خواتین موجود ہیں جنہوں نے مجھے بیٹا کہا اور میں نے ماں کی طرح ان کا احترام کیا۔ میری اپنی ماں کا انتقال چند برس پہلے ہوا ان کی طرف سے نہایت بھرپور محبت نصیب ہوئی۔ پھر جو خواتین میرے قریب آئیں وہ بہنوں کے روپ میں آئیں۔ خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، تسنیم سلیم وغیرہ جب خدیجہ اور ہاجرہ سے میں ملا، تب تو میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ جوانی کا زمانہ تھا۔ ان دونوں کی شادیاں میں نے خود کرائیں۔ اب اس عمر میں اگر کوئی بھی میرے بہت زیادہ قریب آجاتی ہے۔ اپنے اچھے مزاج، اچھے کردار یا اچھے شعر کے حوالے سے تو میرے نزدیک اس کا رشتہ بیٹی کا سا ہوتا ہے ——— پروین شاکر مجھے عمو کہتی ہے منصورہ ہے۔ دونوں میرے لئے بیٹیوں کی طرح ہیں۔

ابھی میرا آخری مجموعہ "دوام" چھپا ہے۔ اس کا انتساب بیوی اور بچوں کے نام ہے۔ اور ان بچوں میں منصورہ اور پروین بھی شامل ہیں۔ اس سے ثابت ہو سکتا ہے کہ جس کو میں بیٹی، بہن یا ماں کہتا ہوں وہ بن کے دکھاتا ہوں۔

میرے بعض معاصرین کے نزدیک عورت

کے بارے میں میرا یہ طرزِ عمل حیران کن بھی ہے اور وہ اس کی تضحیک بھی کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے معیاروں پر اعتماد ہے۔ میں انسانی رشتوں کو عبادت کا درجہ دیتا ہوں۔ عین ممکن ہے کہ میرا یہ رویّہ مشرقی گھرانے کی تربیت کی وجہ سے ہو۔ میں پانچویں میں تھا جب میں نے قرآن کی تفسیر پڑھی۔ یہ تھا میرا ماحول پھر اس میں کچھ جبلت کی بھی کانٹری بیوشن ہے جہاں تک محبوبہ کا تعلق ہے تو اس کے ساتھ میرا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس رشتے میں عورت کا احترام اور تقدیس تو اپنی جگہ ہوتی ہے لیکن تخاطب کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ الزام تراشی اور بے وفائی نہیں ہوتی۔ بس ایک سرشاری کی ایسی کیفیت ہے جیسے بہت کچھ کھو کے بھی بہت کچھ پا لیا ہو۔

میری ایک نظم ہے طوائف کے موضوع پر۔ یہ نظم دشت وفا، میں شامل ہے۔ اس میں میں نے تاریخی پس منظر میں دکھایا ہے کہ عورت طوائف کیسے بنی؟ —— ہر عہد میں وہ کسی نہ کسی طرح اپنے مقام سے گرتی رہی۔ اور آج طوائف ہے۔ اس میں ذمہ داری میں نے مردوں پر ڈالی یا مروّجہ نظام پر۔

جذبہ جینوئن ہو تو کسی بھی عمر میں انسان کے وجود سے خارج نہیں ہو سکتا۔ محبت کے جذبے کے بہت احسانات ہیں انسان کے کردار پہ، شخصیت پہ، یہ جو عشق ہے یہ کردار ساز جذبہ ہے۔ ایک شخص سے پیار ہو تو اس کی برکت سے ہر چیز پہ پیار آنے لگتا ہے میں نے جب عشق و محبت کی باتیں کیں تو پوری سچائی سے کیں۔ میرے شروع کے مجموعہ کلام "رم جھم" میں جو قطعات ہیں، وہ رومان سے بھرپور ہیں۔ یہ رومان "صبوحی" کی ذات میں مجسم ہو گیا ہے۔ صبوحی کسی خاص لڑکی کا نام نہیں۔ اس زمانے میں اختر شیرانی کی وجہ سے فیض چل نکلا تھا۔ نظموں میں ایک شوخی نام لینے کا۔ عذرا، سلمیٰ وغیرہ۔ یہ نام فرضی ہوتے تھے۔ جو بھی نیا شاعر آتا تھا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ نام لے کر مخاطب کرے ہر شاعر کا ایک معیار ضرور ہوتا ہے۔ ایک آئیڈیل، جس کا وہ اظہار کرتے تھے۔ صرف رومانی ہی نہیں، انقلابی شاعری میں بھی محبوب کو نام لے کر مخاطب کیا کرتے تھے میں نے بھی اپنے آئیڈیل کو نام دیا صبوحی کا نام اس لئے چنا کہ یہ باقی عام ناموں سے مختلف تھا۔ جہاں بھی کہیں خوبصورتی نظر آئے وہ شاعر کے ہاں اجتماعی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ضروری نہیں کہ جس کا ناک نقشہ پیش کیا جا رہا ہے وہ کوئی ایک فرد ہو یہی صورت میری شاعری میں بھی ہے۔

صبوحی کوئی ایک فرد نہیں۔ تسنیم سلیم چھتاری نے صبوحی کے تذکرے ترکیب دے کر جمع کر کے ایک افسانہ لکھا تھا جو ان قطعات پر BASED تھا۔ لیکن یہ نام زیادہ عرصہ چلا نہیں۔ پھر جو میری شاعری میں عورت کا ذکر کم ہوتا گیا تو اس کا میری ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں۔ میری ترقی پسندی مختلف نوعیت کی ہے۔ میں فخر محسوس کرتا ہوں اپنے نظریات پر —— لیکن میں ڈائرکٹ شاعری کا قائل نہیں ہوں۔ اظہار اس طرح کرنا چاہئے کہ فن کے تقاضے پورے ہوتے جائیں۔ لیکچر یا تلقین نہ بنے۔ نظم، نظم ہی رہے۔ میں نے ترقی پسندوں کی اس بات کو کبھی قبول نہیں کیا کہ عشق اور محبت غیر ترقی پسندانہ ہے۔ اب فراق گورکھپوری کی غزل اور فیض کی شاعری دیکھیں۔ دونوں ترقی پسند ہیں۔ لیکن دونوں رومینٹک ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سطحیت نہیں ہونی چاہئے شاعری میں۔ فکر کی گہرائی ضروری ہے۔ میرا ایک مصرعہ ہے یہ

فکر کا شاعر ہوں لیکن حسن کا قائل بھی ہوں!

ان دونوں چیزوں کی آمیزش ہو جائے تو شاعری کا معجزہ تخلیق پا سکتا ہے۔ اسی لئے میں کلاسیکل شاعروں میں غالب کو اہمیت دیتا ہوں۔ وہ پہلا شاعر ہے جس نے عقل کو رد نہیں کیا۔ فطرت انسانی کے بنیادی جذبے کو اہمیت دی ہے بلکہ مربوط کر دیا ہے۔ کائنات میں اہم ترین چیز انسان ہے عورت اس انسان کا جمیل ترین روپ ہے۔ میری فکری شاعری میں عورت کے وجود سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ اس کو اپنی گرفت میں لاؤں میری شاعری میں عورت کا وجود بڑا ٹھوس ہے۔ غیر محسوس اس لئے لگتا ہے کہ لوگ جس محبوبہ کے بارے میں صدیوں سے سنتے رہے ہیں اس سے میری شاعری کی محبوبہ کافی مختلف ہے۔ وہ ایک جیتے جاگتے وجود کی مالک ہے لیکن اس سے اس قسم کی حرکات سرزد نہیں ہوتیں جو ہماری روایت بن چکی ہیں —— باتیں میں بھی وہی کہتا ہوں جو باقی عشقیہ شاعری میں ہیں۔ کہنے کا انداز شریفانہ کہہ لیجئے جذبے کا اظہار اہمیت رکھتا ہے بجائے اس کے کہ جنسی تجربے کی یا جسم کی تفصیلات میں چلے جائیں میں نے سراپے کا ذکر کیا ہے لیکن ہوس کے حوالے سے نہیں بلکہ تخلیق حسن کے حوالے سے۔ میرے ہاں یہ ذکر اس طرح ہے جیسے کسی وینس کا بنو ڈ مجسمہ ہو۔ تخلیق کا شاہکار جسم کے جسم کی بات کرتا ہوں، اس لئے لوگوں نے مجھ پر شرافت کی مہر لگا دی ہے۔ بڑی زیادتی محسوس کرتا ہوں بھئی ترقی کوئی بری بات تو نہیں۔ لیکن بے حس پتھر ہونا مجھے ناپسند ہے میری جیسی ہیں۔ یہ بات دو چار سال پہلے فہمیدہ نے کہی تھی کہ:

ابھی میں کافی تو بھلے مانس ہوں اور بھلا مانس اچھی شاعری نہیں کر سکتا یا کو فہمیدہ کہتی ہے کہ اس نے یہ بات اس طرح نہیں کہی۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ اچھی شاعری کرنے کے لیے اوباش یا بدمعاش ہونا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ میری شرافت میری شاعری میں رکاوٹ نہیں بنتی۔

ایک طویل فہرست ہے میری زندگی میں آنے والی خواتین کی میری ادبی زندگی کوئی چالیس پینتالیس برس پر محیط ہے اس میں زیادہ عرصہ ادبی پرچوں کی ادارت میں گزرا پاکستان اور ہندوستان کی جتنی بھی معروف لکھنے والیاں تھیں ان سے میرے رابطے رہے۔ سب سے بدستور اچھے تعلقات ہیں۔ اور سب کا احترام کرتا ہوں۔ اس میں کسی خاص عورت کی تخصیص نہیں کر سکتا۔ کہ وہ زیادہ اہم تھی۔ باقیوں کی حق تلفی ہو جائے گی۔ محبت کے جذبے نے مجھے توڑ پھوڑ کی بجائے تعمیر کی طرف راغب کیا۔ میرے کردار پہ محبت کے مثبت اثرات پڑے۔ ایسے وقفے ضرور آئے جب میرا ذہن تشکیک کا شکار ہو گیا نراجیت (ANARCHY) کی کیفیت رہی لیکن اس پہ جلد ہی قابو پا لیا۔ اب تک اس کے بعد دوبارہ کیفیت طاری نہیں ہوئی۔

میرے جو موضوعات ہیں ان میں نمایاں ترین موضوع انسان ہے۔ پھر انسان کا حسن و جمال ہے۔ خوبصورت جذبے ہیں۔ عورت یہیں داخل ہوتی ہے "میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا" والی غزل کا ایک شعر ہے

تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا صحرا میں بکھر جاؤں گا

دیکھئے، عورت آ گئی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ میرے ہاں عورت DOMINATE نہیں ہے بس رواں دواں ہے۔ شعروں میں غیر محسوس طریقے پر۔ انسان ہے تو یہی میرا موضوع ہے لیکن انسان وہ جو بے حس نہ ہو جو عشق کر سکے۔ رو سکے۔ حسن و جمال سے متاثر ہو سکے۔ میں چاہتا ہوں ہمارے معاشرے کی قدامت پرستانہ قدریں بدلیں یہ سارا نظام بدل جائے۔ ہر انسان اس طرح کی زندگی بسر کر سکے کہ اسے زندگی سے پچھتاوا محسوس نہ ہو کہ کیوں زندہ رہا۔ اس حوالے سے عورت میرے لئے برابر کی ساتھی ہے۔ ہم قدم ہم سفر ہے رفیق ہے۔ میرے ہاں عورت کو کمزور سمجھنے یا پچھلی صف میں رکھنے کا تصور ہی نہیں —— عورت کے اتنے ہی حقوق ہیں جتنے مرد کے۔ جب تک ہم عورت کو برابری اور مساوات کا درجہ نہیں دیں گے یہ نظاموں کی تبدیلی اور انقلاب محض ہوائی چیز رہے گی۔

بقیہ ایک گستاخانہ سوال

اخلاق سے بھی ہے۔ جو اس پورے دور میں شعبۂ ادب نے اس برصغیر میں پیش کیا ہے۔ اور جسے نئے رجحانات۔ نئی فکر۔ نئے تجربات اور نئی اقدار کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ خود اس رسالے کا نام "نیا دور" پچھلے پچاس برس کی ادبی تحریکوں اور امنگوں کی عکاسی کرتا رہا ہے یہ دور نیا تو ضرور تھا اور اس میں جو تجربات اور تخلیقات پیش کی گئیں، وہ بھی اپنے نوع سے نئی تھیں لیکن پچاس برس کے اس طویل عرصے میں تعلیم یافتہ معاشرے کی آراستگی اور ذہنی و فکری نشوونما اس دور کی تحریکوں اور تجربوں نے جو کردار ادا کیا اس کے نتائج کو پرکھنے اور ان پر غور کرنے کا غالباً اب وقت آ چکا ہے، کیونکہ اگر اس دور کی کاوشوں کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد انہیں معتبر اور مثبت قرار دیا جائے تو کیونکر اور رد کیا جائے تو کس طرح کہ اس فیصلے کے لئے ہمیں کسی نہ کسی رائج الوقت یا خاطر خواہ اور متعینہ معیار کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا۔ اس قسم کے قابل اور واضح معیار کی تلاش اور تعین ہی ہمارے خیال میں۔ آج ادب کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ نظریاتی نعرہ بازی اور مغرب زدگی کے ذریعے حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ کہ پچھلے پچاس برس میں یہی کچھ تو ہوتا رہا ہے یہی مسئلہ، بصورت سوال، آج "تاریخ" کے صدر دروازے پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔

بقیہ خدیجہ ......

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ خدیجہ سے میری ملاقات ہوئی ہو اور اس نے عذرا کے متعلق دریافت نہ کیا ہو۔ اسے عذرا کے ایک ایک بچے کا علم تھا اور اس کا نام لے کر حال پوچھتی تھی۔

میں نے جس کمزور اور نحیف ڈھانچے کو دیکھا تھا جو خدیجہ مستور کہلاتا تھا۔ اس میں بلا کی توانائی تھی وہ توانائیوں کا ایک طوفان تھی۔ میں نے خود کو ایک پتلے دبلے انسان پیکر میں محدود کر لیا تھا۔ ایسے طوفان کی طرف موت کیسے اپنا ہاتھ بڑھا سکتی ہے؟ مگر موت نے آخر اپنا ہاتھ بڑھا لیا اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

وہ پہلے لندن کے ایک ہسپتال میں جا کر ہم سے سینکڑوں میل دور ہو گئی تھی۔ اور اب؟ اس دوری کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ خدیجہ مستور اپنا کرب دوسروں سے بلکہ خود اپنی ذات سے مستور رکھ کر ہمیشہ مسکرایا کرتی تھی۔ اب یہ مسکراتا ہوا چہرہ کہاں ملے گا؟

...میں ... نوں درست کون دکھائے
...ادر چنا پر دھول جمی ہے روپ کہاں سے آئے
...وجوں نے ایسے گھیرا ہے، دل بھو توں کا ڈیرا
...یرانی کا سناٹا بھی کتنا شور مچائے

ق

...را میرا جوبن بیتا، جانے کے دن آئے
...ھر بھی تیری مستی ساری بستی کو مہکائے
...یری کومل کایا میری چنچل چاہت مایا
...اون کی آیا میں بھی تو میرا من بھرمائے
...ام نہ چھوڑے صبح پیری کی دلگیری میں بھی
کرشنا موہن جوبن ہی کیوں کام رتو کہلائے

رشنی مسرہن

...یند ... آئے شعر کہو
یا دستائے دل گھبرائے شعر کہو
چاہ سجن سے ملنے کی
رہ رہ کر من کو تڑپائے، شعر کہو
غزلی شاعر ادنچا اڑنے والے طائر ... کا معلوم
تم ان کے افکار چرا ؤ اور دہرائے شعر کہو
نرددشوں پر اتیاچار ہے کیسا ہے سنسار
آنکھوں میں آنسو بھر آئے
یہ حسن ایجاز کا فن ہے، پھیلاؤ کا دشمن ہر
کوزے میں دریا جو سمائے تو گھبرائے اور لطف آئے شعر کہو
رنگ و بو سے، جادو سے
خلوت جلوت کو چمکائے اور مہکائے شعر کہو
اور تو کوئی کام نہ تم سے ہو پائے
کرشنا موہن تم عمر ائے شعر کہو

کرشن موہن

...
آنکھاں بھیڑاں لرزاں ترساں حیراں حیراں تنہا تنہا

کیا رنج ہے کیا دکھ جھیلے کیا سوانگ رچے میلے میلے
کیا خوار پھرے ہم تیرے لئے بستی بستی قریہ قریہ

کوئی خود سے جواب سوال میں ہے کوئی مایا موہ کے جال میں ہے
کوئی جیون کے جنجال میں ہے ٹوٹا ٹوٹا بکھرا بکھرا

گلیوں گلیوں رسوائی ہوئی گالی کھائی بدنام ہوئے
اے عشق ترے کارن ہم کو پہچان گیا بچہ بچہ

وہی ایک سے غم آنگن آنگن بھیگی پلکیں چلمن چلمن
کانٹوں سے بھرا دامن دامن اترا اترا چہرا چہرا

تم میر ہوئے نہ وزیر ہوئے تم باغ میں بے توقیر ہوئے
والی تمہیں کیا پہچانے گا، پتا پتا بوٹا بوٹا

والی آسی



پرتیھا شت پتھی

اطہر عزیز

اڑیا نظم

آدھے دن کا سایہ ہو
یا
آدھی رات کا سناٹا
دونوں ہی زخموں کو جگائیں
دونوں کا غم سے ناتا
ہرے بھرے کھیتوں پر اٹھلاتی بل کھاتی
میلی دھوپ
یا سونے کا سا شیشہ
یا بہتا سایہ گم اٹل چاند
دونوں ہی طوفان اٹھائیں
دونوں ہی سب ڈسنا جانیں
ایک سجائے خاموشی
ایک کرے بس سرگوشی
بچوں کے معصوم لبوں پر منڈلاتے یہ
بھونرے
کیا سمجھیں خاموش صدا کو
کیا سمجھیں کھو جانے کی ادا کو
درد کا سرمایہ تو گویا اپنا اپنا لاشہ
ہے
ساگر کتنا بھول بھی جائے
گہرے بادلوں کی سانسیں
سورج گر برسائے ساون بھادوں
کی سوغاتیں
دل کا یہ سنسان کھنڈر اور شکوے
کی بارات
جانے کتنی بوجھل پلکیں
کتنی ہیں زخموں کے ہاتھ
نیل گگن پر اڑتے بادل
جیسے روئی کے پہاڑ
درد کی ساری سرحدیں ابھریں
گویا گرد و غبار
یادوں کی منحوس صدائیں
سونا دن ہے صحرا میں
سانسوں کے پر ہول بھنور میں
ڈوبے ہے آہوں کے دیپ
پانی کے رنگیں نقوش
اور ہوا کے یہ جانے پہچانے ہاتھ
جیون کیا ہے جمنا دھارا
طوفانوں سے لڑتے ہی رہنا ہے۔
بس اب ایک سہارا
ریت ہی میرے رنگ محل اور ریت ہی
میرے سپنے
آدھے دن کا سایہ ہو یا
آدھی رات کا سناٹا
دونوں کا ہے غم سے ناتا
دونوں لگتے ہیں اپنے

محمد الفیتوری (سوڈانی شاعر)

ترجمہ: شاہین مفتی

ہفتے کی اُداس رات

آج کی رات اے اُداس آنکھوں والی لڑکی
کیکٹس کا شجر بار آور ہوا ہے
ہماری پرانی قبر پر
کیکٹس کا پودا پھل پھول رہا ہے
اس نے ہمارے بچے کھچے وجود پر اپنا سیاہ
سایہ پھیلا دیا ہے
شائد یہ بات اس کی تشفی کے لئے کافی نہیں
کہ ہمیں ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا گیا
چنانچہ اب وہ ہماری روحوں سے رستا لہو
چوسنے پر مامور ہے
اُس نے ہماری بے کفن لاشوں کو ڈھانپنے
کے لئے
شاخ در شاخ اپنا جال بُن دیا ہے
آج کی رات میری جان
میری آنکھیں بادلوں کے ساتھ ہیں
اور میں اپنی دیوار کے پیچھے ہوں
ایک لاش جسے دیوار نے محبوس کر لیا ہے
عظیم تر ہے اس سارے نظر سے جسے
تم دیکھتی ہو
اے اداس آنکھوں والی لڑکی
رات تاریک ہے اور دن تاریک تر
ہماری قبر دن میں دوبارہ کھودی جاتی ہے
اور یہ ہمیں بار بار دفن کرتا ہے
حالانکہ ہم فقط دو لاشیں ہیں
یہ کرب نہیں جو میری آنکھوں کو آنسوؤں
سے بھر دیتا ہے
آنسو، درد بھرے آنسو
آنسو، نامرد آنسو
یہ رحم نہیں جس کی وجہ سے میرا گلا جذبات
سے رُندھ جاتا ہے
جذبات، جھنجھوڑتے ہوئے جذبات
جذبات، تکلیف دہ جذبات
وہی یہ لطف ہے

جن کے چہروں پر تلخ مسکراہٹ ہے یا
موت کی سسکی
آج کی رات آنسوؤں اور پچھتاوے کی
رات ہے
لاکھوں پھول پیروں تلے مسلے جا چکے ہیں
ایک مقتول چہرہ مسکراتا ہے
ایک لہو لہو سورج خون اگلتا ہے
اذیت بے زاری میں ڈھل گئی ہے
ہونٹوں پر مہریں ثبت ہیں
پیشانی زخم خوردہ ہے
خدائی اسرار جل چکے ہیں
میرے لئے میرا جامِ ابدیت ایک ایسا ظرفِ
مقدس ہے
جو ریزہ ریزہ ہو چکا
اور یہ دکھ کس قدر ناقابلِ برداشت ہے؟
اے اُداس آنکھوں والی لڑکی!

صنعتی تہذیب کے خطرے

"سائنسی ایجاد اور مشینی دور کے آغاز سے انسانی تہذیب کے سامنے یہی سوال رہا کہ کیا سائنس یا صنعت تہذیب کی ہلاکت کا باعث ہوگی یا اسے حیاتِ نو سے دوچار کرے گی "

غریبی کو دور کرنے کے لیے صنعتی ترقی بے حد ضروری ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مشینیں ہم پر حکومت کریں بقول ڈاکٹر اقبال :

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ کبھی نہیں ہوگا۔ نہ ڈاکٹر اقبال کے زمانے میں ہوا تھا اور نہ ہی بوگس حیدر آبادی کے عہد میں ہوگا۔ تہذیب کی بیماری کا علاج نہ ہومیوپیتھی میں ہے اور نہ ہی آیورویدک میں۔ اس کا علاج صرف ضمیر میں ہے۔ جب تک یہ ضمیر زندہ ہے۔ تہذیب زندہ رہے گی۔ جس دن انسانی ضمیر مر جائے گا۔ تہذیب کا بھی جنازہ اٹھ جائے گا۔

اور پھر ہندوستانی تہذیب ہی تو ایک ایسی تہذیب ہے جس کا آرٹ گیلریوں اور عجائب گھروں میں مطالعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تہذیب ایک زندہ تہذیب ہے۔ اور صنعتی ترقی کے باوجود زندہ رہے گی۔

انسانی تہذیب کا مقصد امن کو فروغ دینا ہے۔ تو یہاں سے ہجر چھاڑ نہیں اور نہ ہی وصل کے بجائے حسرت سے دل بہلانا۔ آج کل ادب اتنی ترقی کر گیا ہے کہ منہ مانگی موت بھی نہیں ملتی۔ کیونکہ حسرتیں کم اور وصل زیادہ ہے۔

اور پھر آخر موت سے بھی کیا ایک واپسی ٹکٹ جو صنعتی دور میں انسانوں کو لاشوں کی سوشلسٹ اسٹیٹ یعنی شمشان گھاٹ لے جاتی ہے۔ بجلی کے شمشان گھاٹ بھی ہیں جہاں ایک منٹ میں لاش راکھ بن جاتی ہے۔ وہاں بھی مشین ہے اور مشین کو شعر میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔ صنعتی تہذیب کوئی فیض کی غزل تو ہے نہیں جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے ___ لیکن امن کو فروغ دینا اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم ترقی کو اخلاقی ترازو میں تولیں۔ چند لمحوں کے لئے مان لیا جائے کہ صنعتی انقلاب کی وجہ سے تمام ملک میں مکمل طور پر مساوات آگئی۔ تمام شوہروں کو ایک جیسی خوبصورت بیویاں مل گئی ہیں۔ ہر گھر میں تین بچے ہیں ۔ کالجوں اور کلبوں میں لڑکیاں اپنی کلائیوں پر ایک جیسی گھڑیاں باندھتی ہیں، ایک جیسی ساڑھیاں پہنتی ہیں۔ بسوں میں ان کے لیے علیحدہ سیٹیں نہیں ہیں تو ایسی مساوات میں کیا امن و امان قائم رکھا جا سکتا ہے؟

نہ بتکدوں میں چراغاں نہ میکدوں میں ہجوم
تمام شہرِ مسلماں ہے دیکھیے کیا ہو

قینچی اور سوئی کی مثال ہی لیجئے ۔ دونوں صنعتی ترقی کی علامتیں ہیں لیکن ایک کاٹتی ہے تو دوسری سیتی ہے۔ جب کسی نے شیخ فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کو قینچی پیش کی تھی تو انہوں نے کہا تھا مجھے قینچی کے بجائے سوئی دو کیونکہ میں کاٹتا نہیں سیتا ہوں۔ "جدید دور کا صوفی بھی نہیں کاٹتا لیکن سوئیاں ضرور چبھوتا ہے۔ جب سنٹرل سکریٹریٹ کے تھڑے پر بیٹھے ہوئے سادھو کو میں نے اطلاع دی تھی کہ چھٹے پلان میں بھیک منگوں کے لیے ایک کروڑ روپیہ الاٹ ہوا ہے تو اس نے بے اختیار پوچھا تھا کیا چھٹے پلان میں مجھے بھیک زیادہ ملے گی....؟"

"اب جبکہ چھٹا پلان بن چکا ہے وہ ایک بس اسٹاپ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے، کہیں سے بھیک کہیں سے بقایا اور کہیں سے چندے کے حصول میں لگا ہوا ہے۔ صنعتی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے کرشن چندر نے اپنے ناول "مشینوں کا شہر" میں جو چیکوسلواکیہ کے ڈرامہ نگار کارل چیک کے ڈرامہ "آر یو آر" کا ترجمہ ہے، لکھا ہے،

واضح رہے کہ اقبال نے صنعتی آلات کے استعمال کے لیے منع نہیں کیا۔ لیکن یہ کیا ہے کہ آلات اور مشینیں ہمارے دل و دماغ پر حکومت کریں۔ انسانی مسرت جی۔ این۔ پی اور فی کس آمدنی کے ترازو میں نہیں تولی جا سکتی۔ انسانی خوشی ایک علیحدہ قسم کا جذبہ ہے جس میں عدل جہانگیری کا کوئی دخل نہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک بار کہا تھا،

" سائنس نے ہمیں سمندر میں تیرنا اور ہوا میں اڑنا تو سکھا دیا ہے لیکن زمین پر چلنا نہیں سکھایا۔ سائنس اور صنعت کو تہذیب کو ختم کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا سائنس مفاد پرستوں اور خود غرض سیاست دانوں کی آلۂ کار نہ بن جائے۔ سائنس امن کو فروغ دے۔ ملک کی غربت کو دور کرے۔ سائنس ہندوستان کے غم کو خوشی میں بدل دے۔ اس کی اداسی، تھکن، بھوک اور توہین کو دور کرے۔ انسان ایک اور ہیروشیما یا ناگاساکی کی تاب نہ لا سکے گا۔ گاندھی جی بھی یہی چاہتے تھے۔ انہوں نے مشینوں، گھڑیوں اور بائیسکلوں کے استعمال کو ہمیشہ سراہا۔ وہ کہا کرتے تھے ___ کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے دروازے اور کھڑکیاں چاروں طرف سے بند رہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے

گھر میں باہر سے ہر طرح کی ہوائیں آئیں لیکن ان تیز اور تند ہواؤں کے باوجود میرے پاؤں نہ لڑکھڑا جائیں۔ گاندھی جی تازہ ہواؤں کے دل دادہ تھے وہ کھلے آسمان کے خواہاں تھے وہ کھلی زمین پسند کرتے تھے .....''

سائنس نے ہمیں فطرت کے بے شمار راز بتائے ہیں۔ سائنس نے ہمیں زندگی کی بیش قیمت سہولتیں دی ہیں۔ جدید سڑکیں، بسیں، ریلیں، ہوائی جہاز ــــ یورپ کے ممالک ہر کام کمپیوٹر سے کرتے اور کرلتے ہیں۔ لیکن روبو ROBOT یا کمپیوٹر COMPUTER سوچ نہیں سکتا احساس اور سوچ صرف انسان کو عطا ہوئی ہے۔ روبو کو بھوک نہیں لگتی، روبو کو آرام نہیں چاہیئے۔ انسان کو بھوک لگتی ہے۔ اسے آرام بھی چاہیے۔ اگر روبو کے لیے بھی غذا اور آرام ضروری ہو جائے تو انسانی تہذیب ختم ہو جائے گی۔

صنعتی ترقی سے فائدے ہوئے ہیں ان سے کوئی منکر نہیں ہے۔ ذات پات اور مشترکہ خاندان کا نظام دم توڑتا نظر آتا ہے ــ زندگی کا معیار بھی بدلتا نظر آتا ہے سماجی قدریں بدل گئیں۔ جماعتی زندگی ادھوری رہ گئی۔ گاؤں کی تہذیب کا خاتمہ ہو رہا ہے لوک گیت جو ہندوستان کی روح ہیں ـ صنعتی اور تکنیکی انقلاب کے دھوئیں میں چھپ گئے ہیں وہ گرام گیت جنھوں نے ہندوستانی تہذیب کو برقرار رکھنے میں ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ آج فلم کی موسیقی کے بوجھ کے تلے دبے ہیں، ایسے ماحول میں ادیب کا رول اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔

ایک صحت مند سماج کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کا ادب اور ادیب بھی صحت مند ہوں۔ سماجی غیر ذمہ داری آج کے صنعتی دور میں آج کل کی ادبی دنیا کا حصہ بن چکا ہے، ادیب کو چاہیے کہ ادب اور سماج کو مشینی قہر کے شکنجے سے آزاد کرائے

صنعتی ترقی کے زیر اثر جدید ادب دن بہ دن کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔ آزاد نظم ہر پابندی سے آزاد ہو چکی ہے۔ افسانے کا کوئی سر پیر نہ رہا۔ نقاد گھاس کاٹ رہے ہیں۔ تہذیب آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ رہی ہے۔ انسان مشینوں کا حاکم نہیں بلکہ محکوم ہو گیا ہے احساسات بھی آہستہ آہستہ جذبات سے عاری ہو رہے ہیں۔ ہر طرف سے مانوس صدائیں آتی ہیں اتنے آرام کے بعد بھی انسان تھکا تھکا سا ہے۔ نفرتیں بڑھ رہی ہیں، قربتیں کم ہو رہی ہیں ــــ شہر تہذیب سے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر آدمی تنہا ہو گیا ہے اس کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ صنعتی ترقی کی سمت موڑ دی جائے۔ نقلی اور جعلی انسانوں کے وجود کو ختم کر کے اصلی انسان کو واپس بلایا جائے۔ اخلاقی اور روحانی انقلاب لانے کے لیے ہمیں ایسے ادیبوں کی ضرورت ہے۔ جو مرغ باد نما یا آلہ مقیاس الحرارت کا درجہ رکھتے ہوں:

بقول صادق:

کوئی سنتا ہی نہیں اک دوسرے کی بات اب
اس مشینی شہر میں ہر شخص بہرا ہو گیا

ترقی پسند تحریک نے بھی روحانی قدروں کو چھوڑ کر مادیت پرستی پر زور دیا اس نے ادب کے رویئے تو بدل دیئے سائنسی نظریے کا بھی اعلان کیا لیکن یہ سارے کا سارا ادب اپنے عہد کے غم میں گھرا ہوا ہے اور جہاں پہلے ہمیشہ دھوپ اس کے سر پر سایہ تھی۔ اب یہ سایہ بن کے ذہن پر پڑا سو رہا ہے۔ شعور زندگی کے پہلے پڑاؤ میں ہی ترقی پسند شکست کھا گیا۔ لیکن پھر بھی شراب کا مزہ پانی میں لیتا رہا۔ وہ سمجھتا تو یہ تھا کہ اس کی آہ سے پتھر پگھل جائیں گے لیکن جب تاریخی پس منظر میں جائزہ لیا تو وہ زرد پتے کو بھی نہ ہلا سکا۔ لوگوں نے سوچا تھا کہ اندھیری رات میں کوئی راستہ نکل آئے گا۔ لیکن زمانے کی زلفوں میں اتنے زیادہ پیچ و خم تھے کہ راستہ اور ٹیڑھا ہو گیا۔ ادھر انسانیت کا خون ہو رہا تھا اور ادھر بازار کا بھاؤ بڑھ رہا تھا ــ سڑک پر کسی کی لاش پڑی ہوتی ہے۔ لیکن ادیب بمبر گر کھا رہا تھا۔

عمیق حنفی نے اپنی طویل نظم "سند باد" میں کچھ اسی قسم کا تجربہ بیان کرتے ہوئے استفسار کیا ہے:

آدمی ٹرین کی پٹریاں بن گئے
ٹرین کی پٹریاں آدمی بن سکیں گی کبھی؟

اگلی نسل کے بچے شاید آم کا درخت نہ دیکھ سکیں۔ اور شاید گلاب کے پھول سے بھی محروم رہیں ایک ملک معاشی ترقی کی کس منزل میں ہے یہ جاننے کے لیے فی کس آمدنی کے علاوہ اور بھی طریقے ہیں۔ معاشی ترقی کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ کس ملک کو کتنی مشینی قوت حاصل ہے اور بشری قوت بھی کتنی ہے لیکن معاشی ترقی اور بڑھتی ہوئی آبادی کی بڑھتی ہوئی شرح ایک دوسرے کی نفی کرنے والے حالات پیدا کر رہی ہے خسارے کی مالیات پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے لیکن خسارے کی انسانیت کے لیے کوئی دوا نہیں نکلی ہے ایسے ادیب کہاں ہیں جو ان حالات کے باوجود ایسا ادب پیدا کریں جو ترقی یافتہ ہو۔ انسان دوست ہو نئے نوٹ چھاپ کر ہم خسارے کی مالیات پر قابو پا سکتے ہیں۔ حالانکہ یہاں بھی اعتدال کی ضرورت ہے لیکن محض نئے نئے چھاپے خانے کھولنے سے یا نئی نئی کتابیں چھاپنے سے ادب کا گھاٹا پورا نہیں کیا سکتا۔

ادبی اور ذہنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسا اخلاقی معیار قائم کرنا ہوگا جس سے خسارے کا اخلاق جو اس صنعتی ترقی کے ساتھ وجود میں آیا ہے، اپنے آپ ختم ہو جائے۔ اس لحاظ سے قومی منصوبوں میں ادیب کی شرکت بے حد اہم اور ضروری ہو جاتی ہے اور اسی طرح ادب میں چھائے ہوئے جمود کو توڑا جا سکتا ہے۔ ایسے نظام میں غالب جیسا شاعر قرض کی مے نہ پیتا اور نہ ہی اس کے تصور میں ہر برس کے دن پچاس ہزار ہوتے۔

ایسے ماحول میں ادیب یا فن کار، سماج سدھارک یا سوشل ورکر بھی نہیں ہوتا اور نہ کافی ہاؤس میں انقلاب کی باتیں کرتا اور نہ ہی اپنے دفتر میں باغیانہ خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ دفاتر یا اکاڈمیو میں کام کرنے والے شاعر اور ادیب بھی اتنی دیر تک انقلاب کی باتیں کرتے ہیں جتنی دیر تک ان کی محکمہ جاتی ترقی کا پینل نہیں بن جاتا۔ یا جتنی دیر تک وہ سرکار سے قرضے کر اپنا مکان نہیں بنا لیتے۔ یا اسے اونچے کرائے پر نہیں چڑھا لیتے۔ ویسے اپنے آپ کو "سرخا" سمجھتے ہیں۔ لیکن آنگن چرائے بیوی کے نام سے دیوی جاگرن کراتے ہیں اور ہر سنیچر کو دس پیسے تیل میں بھگو کر سنیچر دیوتا کی نذر کرتے ہیں۔ ایسے صحت مند ادب کے نقاد یہ چاہتے ہیں دنیا میں کوئی غم یا بیماری نہ ہو۔ کسی ہسپتال یا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کی ضرورت نہ ہو۔ کوئی زکام میں بھی مبتلا ہو تو درجن بھر نوکر موجود ہوں۔ ایک ٹیلیفون کرنے پر گھر میں دواؤں کے انبار لگ جائیں۔ ایک ایسی سوسائٹی جہاں کوئی بیماری نہ ہو۔ یا پھر ایسی سوسائٹی جہاں سبھی ایک جیسی بیماریوں میں مبتلا ہوں ایسی صحت مند سوسائٹی میں پھر ادب کی کیا ضرورت ہے۔ جاپانی لوگوں کا دعوا ہے کہ ان کی ترقی کا راز یہ بھی ہے کہ انہوں نے

اپنے ملک میں زیادہ شاعر پیدا نہیں ہونے دیئے۔

مشینی عہد کی ضروریات میں منی کہانی بھی شامل ہے۔ کیونکہ طویل کہانی پڑھنے کا وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ منٹو نے سب سے پہلے، سیاہ حاشیے، میں اس کی طرح ڈالی تھی۔ جوگندر پال اور دوسرے بہت سے لکھنے والے اس روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ چلتی ہوئی ریل گاڑی میں ایک مسافر نے اپنے ہمسفر سے پوچھا، "کیا آپ بھوتوں کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔۔ ؟" اس کے انکار کرنے پر سوال کرنے والا دفعتاً غائب ہو گیا۔ یہ دنیا کا مختصر ترین مشینی افسانہ ہے۔ حالانکہ یہ مشینی دور میں نہیں لکھا گیا۔ ویسے بھی ایسا افسانہ ہر ایرا غیرا نہیں لکھ سکتا۔

وارث علوی لکھتے ہیں کہ اگر دنیا کی تمام صنعتیں مل کر بھی کام کریں تب بھی عورت کو حسین نہیں بنا سکتیں اور مرد کی انگلیوں کو وہ حرارت نہیں دے سکتیں جس کی آنچ سے جسم پگھل جاتے ہیں۔ جب بھی ادب نے مشین کو اپنا موضوع بنایا ہے تو روکھا پھیکا اور بے مزہ ادب ہی تخلیق کیا ہے بقول ایک روسی شاعر: "اس سے صرف مشینیں ہی لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔"



دو شعر

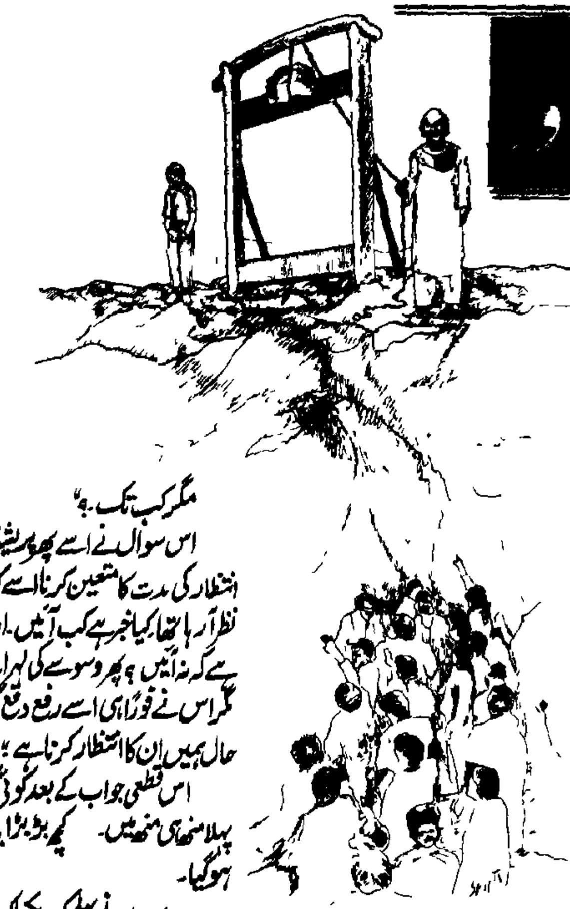
ہوا ہے حکم ہمیں، بے زبانیاں نہ کہو
زمانے بھر سے ہماری کہانیاں نہ کہو
جہانِ بے در و دیوار زندگی اپنی
سِتم ہے دل کا، اسے مہربانیاں نہ کہو

نازش انصاری

افسانہ

خیمے سے دور

انتظار حسین



"یہاں کب تک بند بیٹھے رہیں۔ اب نکلنا چاہیئے۔" اکتا کر پہلے نے کہا۔

"نکل کر کہاں جائیں" دوسرے نے تھوڑا چڑ کر کہا۔ اصل میں پہلے نے اتنی بار نکل چلنے کا سوال اٹھایا تھا کہ دوسرے نے سوچا کہ کسی طور اس کا منہ بند کرنا چاہیئے اور واقعی تھوڑی دیر کے لئے تو اس کا منہ بند ہو ہی گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ تو ابھی تک اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہاں سے نکل کر جائیں گے کہاں۔ سوچتا رہا سوچتا رہا۔ جب بیت الجمعہ گیا تو بولا "نکل کر کہیں بھی جائیں باہر تو نکلیں۔"

"مگر باہر کے متعلق کچھ پتہ تو چلے۔ یوں بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونا عاقبت اندیشی تو نہیں ہے۔" اس نے سمجھانے کے لہجہ میں کہا وہ جو تھوڑا چڑچڑا پن اس میں پیدا ہو گیا تھا اس پر اب اس نے قابو پا لیا تھا۔ اس کا تحمل اور تامل واپس آ گیا تھا۔

"باہر کے متعلق ہمیں پتہ کیسے چلے گا۔ اندر اسی طرح بند بیٹھے رہے تو بے شک دنیا بدل جائے ہمیں کیا خبر ہو گی۔"

دوسرے نے پھر اس تحمل کے ساتھ جواب دیا جیسے اسے سمجھا بہلا رہا ہو "جو گئے ہیں واپس آ جائیں ان سے کچھ پتہ چلے گا۔ پھر نکلنے کے متعلق سوچیں گے۔"

پہلا اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ بولا "کب کے گئے ہیں پلٹے ہی نہیں۔ آخر کب تک ان کا انتظار کیا جائے۔" رکا پھر بولا "اگر وہ نہ آئے تو۔؟"

اس اچانک سوال پر دوسرا تھوڑا بوکھلا گیا۔ اگر وہ نہ آئے تو؟..... اگر وہ نہ آئے تو پھر کتنی دیر تک یہ سوال اس کے اندر گونجتا رہا۔ اس امکان پر تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ ایک تشویش کی لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ اسے خیال آیا کہ واقعی اب تک تو انہیں آ جانا چاہیئے تھا۔ پھر کیوں نہیں آئے۔ کوئی ایک تو آ جاتا۔ کیوں؟ اور وہی تشویش کہ اگر وہ نہ آئے تو۔ مگر اس نے اپنی اس تشویش کو بالکل ظاہر نہ ہونے دیا بظاہر اعتماد کے لہجہ میں بولا "نہیں، وہ آئیں گے۔"

"ہاں انہیں آنا تو چاہیئے۔ لیکن اگر نہ آئے تو۔؟" پھر وہی سوال پھر وہ اُٹھنے لگا تھا۔ مگر پھر اس نے اپنے آپ کو تھاما "نہیں وہ آئیں گے۔" اور پھر قطعی لہجہ میں کہا "ہمیں ان کا انتظار کرنا ہو گا۔"

"مگر کب تک۔؟"

اس سوال نے اسے پھر پریشان کر دیا انتظار کی مدت کا متعین کرنا اسے کتنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ کیا خبر ہے کب آئیں۔ اور کیا خبر ہے کہ نہ آئیں؟ پھر وسوسے کی لہر اٹھنے لگی تھی۔ مگر اس نے فوراً ہی اسے رفع دفع کر دیا "بہر حال ہمیں ان کا انتظار کرنا ہے۔"

اس قطعی جواب کے بعد کوئی کیا کہتا۔ پہلا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور چپ ہو گیا۔

دوسرے نے پہلے کو دیکھا کہ وہ چپ تو ہو گیا ہے مگر کتنا بے اطمینان ہے۔ سمجھانے کے لہجہ میں بولا "میرے یار، تجھے باہر کے حالات کا اندازہ نہیں مجھے ہے۔ میں یوں بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

پہلا بولا "میرے دوست تجھے باہر کے حالات کا تو اندازہ ہے، اندر کے حالات کا اندازہ نہیں ہے۔ اب تو مجھے دو ٹانگوں پہ کھڑا ہونا دوبھر لگتا ہے۔ چلنے کی خواہش ہی ختم ہو گئی۔ تھوڑے دن اور یہاں بند رہے تو ٹانگوں پہ چلنا بھول ہی جائیں گے۔

رینگنا شروع کر دیں گے" یہ کہتے ہوئے اسے یکلخت خیال آیا کہ پچھلی رات جب اس بند گھٹے سے بہت خفقان ہوا تھا تو اس کا جی چاہا

تھا کہ وہ سمٹ جائے اتنا کہ کواڑ اور چوکھٹ کے بیچ جو دراڑ ہے اس میں سے رینگ کر نکل جائے

تیسرے نے جو کتنی دیر سے آنکھیں موندے اوندھے منہ ان دونوں سے بے تعلق بے سُدھ پڑا تھا۔ جیسے وہ ان کے بیچ ہے ہی نہیں، آنکھیں کھول کر غور سے پہلے کو دیکھا۔ عجیب نظروں سے کہ پہلا پسینہ پسینہ ہوگیا۔ مگر اس نے دم بھر دیکھ کر آنکھیں موند لیں اس کے آنکھیں موند لینے کے بعد پہلے نے اسے غور سے دیکھا پھر جیسے کسی شک میں پڑ گیا ہو۔ دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر دوسرا اسے کچھ کہتے کہتے اچانک دم بخود ہوگیا جیسے اسے کچھ سنائی دیا ہے۔ پہلا چونکا اور وہ بھی دم بخود ہوگیا۔ تیسرے نے آنکھیں کھولیں اور خلا میں تکنے لگا تو واقعی کچھ آہٹ ہوئی تھی کان اس آہٹ پہ لگے ہوئے تھے ایک ساتھ وہ کتنے چونکے، کتنے خوفزدہ ہوگئے تھے۔

"کوئی ہے۔" پہلے نے کسی قدر شک کے ساتھ کہا۔

"لگتا نہیں ہے کوئی ہے۔"

"پتہ نہیں کون ہے۔" پہلے نے وسوسے کے ساتھ کہا

وسوسہ دوسرے کو بھی تھا۔ مگر اس نے وسوسہ پر قابو پاتے ہوئے متانت کے ساتھ کہا۔ "وہی ہوں گے۔"

"ہاں ہونا تو انہیں ہی چاہئے۔ لیکن اگر وہ نہ ہوئے تو پھر کون ہو سکتا ہے۔"

پھر کون ہو سکتا ہے، یہ کہتے ہوئے وہ خود بھی خوفزدہ ہوگیا اور دوسروں کو بھی خوفزدہ کر دیا۔ دل کس طرح دھڑکنے لگے۔ اور دھیان کس کس طرف گیا۔

دروازے پر بہت ہلکی دستک ہوئی وہ دم بخود رہے۔ پھر دستک ہوئی، اتنی ہی ہلکی۔ آخر دوسرے نے ہمت کی۔ آہستہ سے اٹھائے پاؤں دروازے تک گیا دراڑ میں سے جھانکا کسی نے سرگوشی میں کہا، "کھولو۔" دوسرے نے شاید آواز پہچان لی تھی آہستہ سے دروازہ کھولا۔ جو داخل ہوا وہ ان کا چوتھا تھا۔ اسے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔

"تم اکیلے؟" دوسرے نے تعجب سے کہا۔

"اچھا وہ ابھی تک نہیں پہنچا ہے؟" چوتھے نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

"نہیں ابھی تک تو آیا نہیں ہے۔"

"پھر آتا ہوگا۔" چوتھے نے اطمینان کے لہجہ میں کہا

"باہر کیا حال ہے؟"

"بہت ہجوم تھا، مشکل سے نکل کر آیا ہوں"

"ہجوم ہے؟" پہلے اور دوسرے نے اسے تعجب سے دیکھا

"ہاں بہت ہجوم تھا لوگ ہی لوگ۔"

"عجب بات ہے۔" پہلا بولا: "اس وقت تو کوئی دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا نہ کوئی آواز دے رہا تھا۔ نہ کوئی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ جیسے یہاں لوگ ہیں ہی نہیں۔"

"مگر اس وقت بہت لوگ ہیں اور بہت شور ہے۔"

"کہاں سے آ گئے اتنے لوگ؟" پہلا بدستور حیران تھا۔

"میں خود حیران تھا کہ یا اللہ یہ لوگ پہلے کہاں تھے۔ اور اب کیسے اور کہاں سے نکل آئے۔ پتہ نہیں کن کن کونوں کھدروں سے نکل آئے ہیں۔ بہت لوگ ہیں اور چوک میں تو دوسروں کا سیلاب امڈا ہوا ہے۔"

"پھر ہمیں بھی نکلنا چاہئے۔ ہم یہاں کیوں بند بیٹھے ہیں۔" پہلے نے بے کل ہو کر کہا۔

اس پر چوتھا چپ ہوگیا۔ تامل کے بعد بولا: "ہاں نکلنا تو چاہئے۔ سوچ لیں۔"

"سوچنے کی اس میں کیا بات ہے میرے خیال میں اب یہاں سے نکلنا ہی چاہئے بند بیٹھے بیٹھے تو پھپھوندی لگ گئی۔ کتنے دن سے آسمان نہیں دیکھا بس اب نکلنا چاہئے"

چوتھا چپ رہا۔ پھر بولا "پہچانے نہ جائیں۔"

"اتنے ہجوم میں کون کسی کو پہچانتا ہے"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" چوتھے نے جواب دیا "ہجوم تو بہت ہے مگر پہچاننے والے سب جگہ ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" دوسرے نے چوتھے کی تائید کی "ہجوم تو بہت ہے لوگوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی نے پہچان لیا تو۔؟"

"اس کا بہت خطرہ ہے۔" چوتھا اب زیادہ اعتماد سے بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسی طرح بند بیٹھے رہیں، لوگ باہر نکلے ہوئے ہیں۔ ہم اندر گھٹے بیٹھے رہیں۔" پہلے نے غصے سے کہا۔

"نہیں۔ اب زیادہ دیر تو اندر بند ہو کر نہیں بیٹھ سکتے۔" دوسرے نے تحمل سے جواب دیا۔ "مگر عجلت نہیں برتنی چاہئے۔ ذرا سی عجلت ہمیں کسی بڑی مشکل میں پھنسا سکتی ہے تو بہتر یہ ہے کہ تھوڑا انتظار کر لیں اور جو قدم اٹھائیں احتیاط سے اٹھائیں۔"

"انتظار، احتیاط۔" دوسرا ہونٹ چباتے ہوئے بڑبڑایا

تیسرے نے آنکھیں کھولیں، چوتھے کو گھور کر دیکھا "تجھے کسی نے پہچانا۔؟"

چوتھے نے اب تک اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ جیسے وہ تھا ہی نہیں۔ اب جو اس نے گھور کر دیکھا اور سیدھا سوال کیا تو اس نے اسے دیکھا۔ اس کے لئے وہ اجنبی تھا۔ مگر اس کے پاس یہ سوچنے کی کہ یہ کون ہے زیادہ مہلت نہیں تھی۔ ایک سیدھے سوال نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اور اب اسے خیال آیا اور کسی قدر تعجب کے ساتھ کہ وہ اتنے بڑے ہجوم سے گزر کر آ رہا ہے جہاں ہر قسم کے آدمی سے اس کا

دیر ہوئی اور کسی نے اسے نہ پہچانا۔" مجھے، ہاں مجھے تو کسی نے نہیں پہچانا۔ بس نظروں میں نہیں آیا۔ بچ ہی گیا۔ اتفاق کی بات ہے حالانکہ سگریٹ کے لئے بیچ چوک میں رکنا پڑا۔ البرٹ سینما کے سامنے پان سگریٹ کی جو دکان ہے وہاں کتنے اپنے جاننے والے کھڑے رہتے ہیں اتفاق کی بات کہ اس وقت کوئی ایسا تھا ہی نہیں جو مجھے پہچانتا۔"

"میرے ساتھ دمشق میں یہی ہوا تھا" تیسرا بولا۔

"دمشق میں" تینوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ہاں دمشق میں بازار اس روز کتنے سجائے گئے تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم تھا جلوس کا انتظار تھا۔"

"تو دمشق کب گیا تھا۔؟" پہلے نے طنز بھرے لہجہ میں پوچھا۔

"بس اسی روز پہنچا تھا جس روز سر اس شہر میں پہنچے ہیں۔"

"سر۔ کیسے سر"؟

"نیزوں پہ بلند باوقار سر" یہ کہتے کہتے تیسرا کسی تصور میں کھو گیا جیسے ان کے بیچ سے نکل کر کہیں دور چلا گیا ہو پھر بڑبڑایا "اونچے نیزے پہ بلند باوقار معتبر سر، منور چہرہ گرد میں اٹا ہوا، لب ہلتے ہوئے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے۔"

چوتھے نے غور سے کسی قدر رشک سے اسے دیکھا۔ سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے پہلے اور دوسرے کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون ہے۔

دوسرا کچھ کہنے لگا تھا کہ اچانک دم بخود ہو گیا۔ پھر سرگوشی میں پہلے اور چوتھے سے مخاطب ہوا۔

"تم نے سنا۔؟"

"کیا"؟

"قدموں کی آہٹ"

"اچھا"؟

"ہاں" کہتے کہتے چپ ہوا اور کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا "سنو"

"ہاں کوئی ہے" پہلے نے اس کے شک کی توثیق کی۔

"اسے آنا تھا۔ وہی ہوگا" چوتھا بولا۔

"ہاں ہونا تو اسے ہی چاہئے" پہلا بولا

"مگر کیا خبر ہے" دوسرا چوتھے سے مخاطب ہوا۔

"تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں تھا"؟

"نہیں اصل میں مجھے کسی نے پہچانا ہی نہیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ دیکھتا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔"

"پھر تو اسے ہی ہونا چاہئے" دوسرے نے کسی قدر بے یقینی کے ساتھ کہا۔ تامل کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دبے پاؤں چل کر دروازے تک گیا۔ کواڑ کی درازوں سے جھانکا۔ پھر دستک ہوئی اور دبی سی آواز "کھولو"

اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آگیا۔ وہ وہی تھا، ان میں کا پانچواں "یار، تم نے آنے میں بہت دیر لگائی۔ مجھے تو فکر ہو گئی تھی" چوتھے نے کہا۔

پانچواں ابھی اپنے حواس درست کر رہا تھا۔ اس نے اس سوال کا فوراً جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ دوسرا بیچ میں بول پڑا "اتنے بڑے ہجوم کے بیچ سے نکل کر آنے میں بھی تو وقت لگتا ہے۔ دیر تو ہونی ہی تھی۔"

"ہجوم؟" پانچویں نے تعجب سے دیکھا "کیسا ہجوم؟ شہر شہر خموشاں بنا ہوا ہے۔ تم ہجوم کی بات کر رہے ہو۔"

"کیا؟" اب دوسرے نے پانچویں کو تعجب سے دیکھا اور پھر فوراً چوتھے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"یار کیا بات کر رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی میں آیا ہوں۔ بہت بڑا ہجوم تھا۔ شہر خلقت سے ابلا پڑ رہا تھا" چوتھا بولا۔

پانچویں نے حیرت سے یہ بات سنی۔ پھر بولا "یار، تم نے خواب تو نہیں دیکھا تھا"

"میں واقعہ بیان کر رہا ہوں۔"

"اچھا" پھر بولا "میں نے تو ہو کا عالم دیکھا۔ عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بس تھا اور میرے قدموں کی آواز۔ باقی سب سنسان۔"

چوتھا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "تم چوک کی طرف گئے تھے۔"

"ادھر ہی سے ہوتا ہوا آیا ہوں۔ چوک میں الو بول رہا ہے اور البرٹ سینما جہاں اتنی چہل پہل رہتی تھی بند پڑا ہے۔"

"البرٹ سینما بند پڑا ہے،" چوتھا اب بالکل چکرا گیا تھا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہاں ٹکٹوں کے لئے قطاریں لگی ہوئی تھیں۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہاں تو سناٹا ہے۔"

"دم کے دم میں سناٹا" چوتھا بڑبڑایا "کہاں گئے لوگ۔"

"یہی میں سوچ رہا تھا کہ لوگ کہاں گئے۔"

"پہلا ہنسا اور بولا "اس شہر کے لوگ تو جن بھوت ہو گئے۔ دم میں حاضر دم میں غائب" پھر ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ "شاید ہم لوگ بھی ... کم از کم میں سایا بن چکا ہوں۔"

"سائے تو نہیں ہیں" دوسرا بولا "بن جائیں گے۔"

تیسرے نے اسی طرح اوندھے پڑے پڑے آنکھیں کھولیں، ایک ایک کو گھور کر دیکھا "اچھا تم لوگ بھی۔"

چوتھے کو ایک دم سے پھر خیال آیا کہ یہ کون شخص ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے دوسرے کو دیکھنے لگا تھا جیسے کچھ پوچھنے

والا ہو۔ اتنے میں پہلا بول پڑا۔ ویسے اچھا ہی ہے۔"

"کیا اچھا ہے؟"

"یہی کہ اس وقت کوئی نہیں ہے۔ نکل چلیں، موقع اچھا ہے۔"

"دوسرے پس وپیش میں پڑ گئے۔ مگر پانچویں نے اس کی بات کاٹ دی۔ کیا باتیں کرتے ہو۔ اس وقت نکلو گے؟"

اس سے بہتر وقت اور کون سا آئے گا کوئی دیکھنے والا ہے ہی نہیں۔" پہلے نے اپنے موقف کے حق میں دلیل پیش کی۔

"بات یہ ہے" پانچواں بولا۔" لوگ چل پھر رہے ہوں تو نکلنے میں آسانی رہتی ہے۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا کہ کون جا رہا ہے لیکن سڑکیں خالی ہوں اور شہر میں سناٹا ہو اور پھر کوئی گذرتا نظر آئے تو خواہ مخواہ شک ہوتا ہے۔"

دوسرے نے تائید میں سر ہلایا۔ ٹھیک کہتے ہو۔

پہلا بولا: جب کوئی ہے ہی نہیں تو کون دیکھے گا۔ اور کون شک کرے گا۔"

پانچواں طنزیہ ہنسی ہنسا۔" تم بہت سادے ہو۔ ایسے ہی وقت میں جب کوئی نظر نہیں آتا۔ آدمی کو زیادہ دیکھا جاتا ہے اور زیادہ شک کیا جاتا ہے۔"

تیسرے نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھولیں۔ پانچویں کو گھور کر دیکھا۔" تجھ پہ کسی کو شک ہوا۔؟"

اس آن پانچویں کو خیال آیا اور اس خیال پر وہ ششدرہ گیا کہ وہ سائیں سائیں کرتے رستوں سے گزر کر آیا ہے مگر کسی کو اس پر شک نہیں ہوا۔ بولا" میرے ساتھ تو کمال ہوا۔ سڑکیں خالی۔ بس میں اکیلا چل رہا تھا۔ ادھر کا دم ادھر پیچھے کا دم پیچھے کہ کسی نے تاڑ لیا تو۔ مگر بچ گیا۔"

"میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔" تیسرا سوچتے ہوئے بولا۔ جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔"

وہ رات بہت ویران تھی چاروں طرف سناٹا۔ بس صحرا کے سانس کی آواز تھی، مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ قریب ہی فرات پہ لشکر پڑا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو؟..... مگر بچ گیا۔"

"فرات۔؟"

"ہاں فرات۔" رکا، پھر سوچتے ہوئے بولا" میں سمجھا کہ کوئی نکلتے ہوئے نہیں دیکھے گا کہ چراغ تو اس جناب نے گل کر دیا تھا۔ مگر جب میں نکلنے لگا تو میں نے دیکھا کہ خیمہ تو منور ہے اور سب نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ بس جیسے میں سب کے سامنے برہنہ ہو گیا ہوں منہ چھپا کر تیزی سے نکل آیا۔"

رکا خیالوں میں کھو گیا۔ پھر بڑبڑایا "فرات کے کنارے لشکر پڑا تھا۔ قدم قدم پہ پہرہ۔ دھڑکا کہ اب پکڑا گیا۔ مگر کسی نے دیکھا ہی نہیں۔"

وہ بول رہا تھا اور چاروں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر جیسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا ہو،" اچھا تو تم وہ آدمی۔"

ہاں اس نے مشکل سے کہا۔ اور اس کا سر جھک گیا۔ دوسرے نے تامل کیا پھر کہا۔ "اگر تو وہی ہے؟" اس نے فوراً بات کاٹی" نہیں، میں وہی نہیں ہوں۔"

"تو وہی نہیں ہے؟" دوسرا چکرایا "مگر ابھی جو تو نے بیان کیا اور اقرار کیا۔"

"عزیزو، میں نے صحیح بیان کیا اور صحیح اقرار کیا۔ ہوا یوں کہ جب میں دمشق پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اہل تقویٰ مشکل میں ہیں۔ ان پر شک کیا جا رہا ہے۔ انہیں پکڑا جا رہا ہے۔ میں ڈرا کہ کہیں میں پہچانا نہ جاؤں۔ مگر عجب ہوا کہ کسی نے مجھے نہ پہچانا۔ کسی کو مجھ پر شک نہیں گذرا۔ تب مجھے دھیان آیا کہ جب میں خیمے سے نکلا تھا تو نکلتے نکلتے۔ جیسے کہیں میں اپنے بیچ سے نکل گیا تو جب میں خیمے سے باہر آیا تو میں وہ نہیں تھا۔ کوئی اور تھا...... ہاں بالکل۔ پھر میں کوئی اور تھا۔"

وہ چاروں اسے تکنے لگے۔ پریشان کہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر وہ انہیں تکنے لگا۔ ایک ایک کی صورت کو غور سے دیکھا۔ حیران ہوا" تم وہی ہو۔"

"ہم؟" وہ ایسے چونکے جیسے ان پر اچانک حملہ ہو گیا ہو۔ بوکھلائے۔ ایک دوسرے کو دیکھا جلدی سے دفاعی انداز میں بولے ہم وہی ہیں ..... جو تھے۔"

"اچھا؟" وہ اور حیران ہوا۔ ایک دفعہ پھر باری باری چاروں صورتوں کو غور سے دیکھا۔" تو گویا جب تم خیمے سے نکلے تھے تو تم......"

"خیمہ سے؟ کس خیمہ سے۔؟" انہوں نے بیک زبان عجلت سے اس کی بات کاٹی وہ کچھ نہیں بولا۔ حیران انہیں تکتا رہا۔ وہ خود ہی چکر میں پڑ گئے۔ آپس میں ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا سرگوشی میں ایک دوسرے سے پوچھا" یار ہم کس خیمے سے نکلے تھے۔؟"

اس باہمی سوال نے انہیں مزید چکرایا کچھ حیران کچھ پریشان ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس عالم میں دوسرے نے خود اعتمادی دکھائی۔ بڑے تیقن سے کہا" عزیزو ہم کس خیمے سے نہیں نکلے۔"

دوسرے نے فوراً تائید میں سر ہلایا "ٹھیک بات ہے ہم کسی خیمے سے نہیں نکلے ہیں۔"

پھر وہ چپ ہو گئے آگے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہا جائے یہ بھی چپ رہا۔ بس انہیں تکتا رہا۔ بڑبڑایا "عجیب بات ہے" چپ ہو گیا۔ پھر بڑبڑایا "مجھے کم از کم یاد تو ہے"

آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے سبطِ حسن سے ملاقات۔

راتیں

ـــــ کملیشور

شاردا بائی، سندری بائی اور تارا بائی کی
کہانی تم نے نہیں سنی۔ تو تم تھے کہاں؟ کس ملک
میں رہ رہے تھے؟ اگر ان تینوں کی داستان
الگ الگ سنو گے تو شاید کسی انجام پر نہ پہنچو گے،
کیونکہ طوائف طوائف ہی ہوتی ہے۔ طوائف
بنی رہنے کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ اگر ان
کو یہ بتادیا جائے کہ وہ اونچے گھرانے کی ہیں تو
اُن میں ایک قدرتی فخر آجاتا ہے۔

شاردا بائی ویسے ہی مشہور تھی جیسے متھرا
کی باسوندی تارہی تھی۔ شاردا بائی کے روپ، حسن
اور شباب کی کہانیاں دور دور تک پھیلی ہوئی
تھیں۔ آل انڈیا طوائف بازار میں یہ بات زور
پکڑتی جارہی تھی کہ شاردا بائی جیسی حسینہ صرف
ایک ہی بازار میں اپنا تمام وقت نہ گزار دے
اس کو ملک کے دوسرے بازاروں میں بھی آکر
رہنا چاہیئے تاکہ جگہ جگہ کے بازار جی اُٹھیں۔

طوائف منڈی کے عالموں کا تو یہاں تک
کہنا ہے کہ طوائف کی جگہ بدل بدل کے پیشہ کرنے
کی روایت شاردا بائی سے ہی شروع ہوئی۔

وہ اپنے اس عالم و فاضل کی عزت کرتے
ہیں جس نے یہ نیا منصوبہ بنایا کہ طوائفیں بھرے
نقلِ مکانی کرتی رہیں اور نئی جگہوں کی سیر و تفریح



کرتی رہیں۔

اس منصوبے کے تحت طوائفوں کے پیشہ میں ایک انقلابی تبدیلی آئی عورتیں بھی کچھ نہ کچھ کمانے کے قابل ہوگئیں۔ بہرحال یہ مسئلہ دوسرا ہے بات شاردا بائی کی ہو رہی تھی۔

شاردا بائی جب پندرہ سال کی ہوئی تو اس کے حسن کا ڈنکا بجنے لگا۔ اساتذہ موسیقی اور علمائے رقص میں یہ مقابلہ ہونے لگا کہ شاردا بائی کو موسیقی کون سکھلاتے اور کون رقص۔ سبھی کو بھروسہ تھا کہ شاردا بائی قیامت ڈھائے گی اور استاد کا نام روشن کرے گی۔ آخرکار شاردا بائی کے خاندانی استاد کی ہی جیت ہوئی۔ کیوں کہ شاردا بائی کی ماں نے اپنی روایت توڑنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

آخرکار جب شاردا تمام مراحلوں سے پوری ہو گئی تو ایک روز اس کی پہلی رات کا اصولاً اعلان کیا گیا۔ بسنت کا دن مقرر کیا گیا۔ تمام شہروں میں یہ بات آناً فاناً پھیل گئی کہ شاردا بائی کی پہلی رات بسنت کی رات ہوگی۔ شہر سے باہر بھی یہ خبر پھیل گئی اور اس حسینہ کی پہلی رات کے لیے طرح طرح کے دوڑے لگائے گئے اور نئی نئی خبریں اڑیں۔ کبھی کہا جاتا کہ کسی مہاراجہ نے اس کی پہلی رات خرید لی ہے کبھی کسی راجکمار کا نام لیا جاتا۔ یہ خبر تو یہاں تک پھیل گئی کہ ایک مہاراجہ اور اس کے خزانچی میں جھگڑا ہو گیا اور خزانچی نے مہاراجہ کو روپے دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ خود پہلی رات خریدنا چاہتا تھا۔

نوابوں، راجاؤں، مہاراجاؤں، راجکماروں امیروں، زمینداروں، جاگیرداروں کے درمیان اندر ہی اندر یہ رسہ کشی چل رہی تھی کہ شاردا بائی کس کو ملتی ہے۔ ایک طرح سے یہ عزت کا سوال بن گیا تھا جوں جوں بسنت کا دن قریب آ رہا تھا قیاس آرائیاں بڑھتی جا رہی تھیں مسلسل یہی ذکر چلتا رہتا کہ شاردا بائی کی ماں نے فلاں راجہ یا نواب کی بات ٹھکرا دی ہے یا فلاں تعلقہ دار کے آدمیوں کو گھر میں نہیں گھسنے دیا۔

آخرکار ایک روز سب کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں جب پتہ چلا کہ تمام نوابوں اور راجاؤں کی کوششیں بیکار ہو گئی ہیں ان کے بجائے ایک اٹھارہ سالہ جوشیلے نوجوان نے بازی جیت لی ہے۔ اس کا نام ہے مکھن لال چکن لال دارو والا۔ یہ نوجوان اپنے کروڑپتی باپ کے پیسوں پر ہی عیش کر رہا تھا۔ خاندان بہت اونچا تھا۔ طرح طرح کے کام دارو والا کے ہاں ہوتے تھے آسام اور نیل گری کے چائے کے باغات میں خاصہ حصہ بھی ان کے پاس تھا۔ بنگال کے پٹ سن بازار میں اس گھرانے کا اجارہ تھا۔ کپاس بازار میں اس گھرانے کا طوطی بولتا تھا۔ امریکی تیز بازار بھی دارو والا خاندان کی خرید فروخت پر نظر رکھتا تھا۔ کئی بینکوں میں اس کی حصہ داری تھی۔ جاوا، سماترا اور ادھر افریقہ کے بازاروں کے بیوپار میں ان کا پچپن پیسے کا حصہ تھا۔

ان تمام باتوں کا بھی لوگوں کو آہستہ آہستہ تب پتہ چلا جب ایک ایک کرکے مہاراجوں میں مقابلہ شروع ہوا تھا۔ ورنہ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ دارو والا نام کا خاندان اتنا پُرعظمت اور بڑا ہے۔ جیسے جیسے ان کا نام مکھن لال چکن لال دارو والا کا نام گونجنے لگا اور شاردا بائی کی قسمت کی تعریف ہونے لگی۔ آخر بسنت کا دن آیا۔ سہیلیوں نے شاردا بائی کا ہار سنگار کیا۔ مکھن لال چکن لال دارو والا کی دلچسپیوں کا پتہ لگا کر عطر اور پھولوں کا انتخاب کیا گیا بال سنوارے گئے اور پوری دھوم دھام کے ساتھ شاردا بائی کو دارجلنگ والی کوٹھی میں شام سے پہلے پہنچایا گیا اور شاردا بائی نے اپنی پہلی رات گزار دی۔

اس وقت شاردا بائی سولہ سال کی تھی اور مکھن لال چکن لال دارو والا اٹھارہ سال کا۔ یہ وہی وقت تھا جب جاپان نے روس پر فتح پائی تھی اور ہندوستانی سیاست میں ایک نامور آیا تھا ۱۹۱۴ء کی کڑاکے کی سردی میں فلینڈرز اور فرانس کے میدانوں میں ہندوستانی فوجیں مقابلہ کر رہی تھیں۔ سر نیندر ناتھ بنرجی اور اینی بیسنٹ قومی افق پہ نمودار ہوئے تھے انہی دنوں۔ گوکھلے کا دیہانت ہوا تلک مانڈلا جیل سے رہا ہوئے۔ لالہ لاجپت رائے نے امریکہ میں جلاوطنی کا وقت گزارا ہوم رول لیگ کا قیام ہوا۔ لکھنؤ کا کانگرس اجلاس ہوا۔ ہندوستانیوں نے ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کیا۔ انگریزوں نے پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کو شکست دی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جہاد تیز ہوا۔ رولٹ بل پیش ہوا۔

گاندھی جی نے ستیہ گرہ ختم کیا جلیانوالہ میں قتل عام ہوا۔ عدم تعاون کا جنم اور رحمان ستیہ گرہ کی بنیاد رکھی گئی۔ گاندھی جی کا اپنڈے سائٹس کا اپریشن ہوا۔ موتی لال نے سوراج کی بات اٹھائی سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا لاہور کانگریس میں جواہر لال نہرو نے صدارت کی۔ ڈانڈی یاترا اور نمک ستیہ گرہ ہوا۔ موتی لال نہرو سورگباش ہوئے بہار میں خوفناک بھونچال کی وجہ سے بیس ہزار لوگ مارے گئے۔ دس لاکھ گھر برباد ہوئے۔

غرض کہ اٹھارہ سال گزر گئے۔ اس دوران اور بہت کچھ ہوا۔ شاردا بائی نے اپنی پہلی رات گزارنے کے درمیانہ طرز کے ساتھ اپنا پیشہ شروع کیا پھر مکھن لال چکن لال دارو والا کو فرصت۔ لیکن کہ وہ شاردا بائی کی بات دل میں لاتے۔ ایک رات تھی سو گزر گئی۔ شاردا بائی اسے دھندے میں لگ گئی۔

اسی دوران [illegible] لال چھگن لال نے بھی
گھر کا کاروبار سنبھالا۔

ایک کروڑپتی گھرانے میں ان کی شادی ہوئی
باپ کا دیہانت ہوا اور وہ تمام دولت کے مالک بن گئے۔

ان دنوں شاردا بائی کی بیٹی سندر بائی کی دھوم
بازار میں شروع ہوئی۔ کہتے ہیں کہ بیٹی نے حسن میں اپنی
ماں کو بھی دس قدم پیچھے چھوڑ دیا۔ سندر بائی کی خوبصورتی
کا مقابلہ شاردا بائی اپنی جوانی میں بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ابھی سندر بائی سترہ سال کی ہی تھی لیکن اس کے
روپ اور حسن کا چرچا بگھر ہونے لگا تھا۔ آخر شاردا بائی
نے اپنی بیٹی سندر بائی کی پہلی رات کا اعلان کیا۔

پھر نوابوں، راجاؤں، مہاراجوں،
امیروں زمینداروں میں مقابلہ ہوا۔ سندر بائی
کی پہلی رات خریدنے کے لئے پھر ست کی پہلی رات
طے ہو گئی۔

آخر کار وہ دن بھی آیا کہ سب کی آنکھیں
پھٹی رہ گئیں۔ جب معلوم ہوا کہ سب راجاؤں
مہاراجوں کی کوششیں پھر دھری رہ گئیں۔
ان کی بجائے ۲۵ سالہ ایک دولت مند نے
بازی جیت لی ہے۔ اس دولت مند کا نام بھی
لوگوں کو معلوم ہوا۔ سیٹھ مگن لال چھگن لال
داروو الا۔

شاردا بائی نے اپنی تقدیر کو سراہا۔
اپنی بیٹی سندر بائی کو سیٹھ کی تمام عادتوں اور
نفاستوں سے آگاہ کیا۔ طرح طرح کی نصیحتیں
کیں اور اس کے تابناک مستقبل کے لئے نیک
خواہشات ظاہر کیں۔ اسے یہ بھی بتایا کہ آدمی
کو جو عادتیں جوانی میں پڑ جاتی ہیں وہ برقرار
رہتی ہیں۔ لہٰذا سیٹھ سے گھبرانے یا ڈرنے کی
ضرورت نہیں، وہ بہت نازک مزاج اور
حسن پرست دوستیلا آدمی ہے۔

پوری طرح تیار ہو کر سندر بائی نے
اپنی ماں شاردا بائی سے دعا لی۔ اس مرتبہ
پہلی رات کا انتظام داروو الا کے اوٹی والے
بنگلے میں کیا گیا۔ اور سندر بائی نے اوٹی بنگلہ
میں مگن لال داروو الا کے ساتھ اپنی پہلی
رات گزاری۔

اس وقت سندر بائی سولہ سال کی

[illegible] کانگریس [illegible] ان دنوں [illegible]
کر گئے

یہ وہ زمانہ تھا جب کوریا کا بھونچال
آیا۔ جاپان نے ایشیا پر حملہ کیا اور ہندوستان
میں شہری آزادی تقریباً ختم کر دی گئی تھی۔
جارج پنجم کی موت ہوئی اور ایڈورڈ ہشتم
شاہی تخت پر بیٹھا۔ روس کے کریملن محل میں
دو ہزار چالیس نمائندے نئے آئین پر سوچ و
بچار کے لئے جمع ہوئے۔ فیض پور میں کانگریس
کا اجلاس ہوا۔ جواہر لال نہرو نے خان عبدالغفار
خاں اور ایم این رائے کا سواگت کیا اور
جنگِ عظیم چھڑ جانے کے امکان پر ملک کو تیار کیا۔
انتخاب ہوئے اور پانچ صوبوں میں کانگریس کو اکثریت
حاصل ہوئی۔ دو کروڑ اسی لاکھ لوگوں نے ووٹ
ڈالے۔ کانگریس نے صوبائی حکومتیں بنائیں۔ ہری پور
میں کانگریس کے لئے سبھاش چندر بوس نئے پردھان
منتخب ہوئے۔ دنیا میں فاشسٹ جنگ کے بادل
منڈلانے لگے۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تا گاساکی
اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے گئے۔ جناح صاحب نے
پاکستان کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۴۷ء کی کرانتی ہوئی۔ ہندوستان
آزاد ہوا اور عوام کی حکومت شروع ہوئی۔ گاندھی جی
کا قتل ہوا۔

ہندوستان میں جمہوری حکومت کا اعلان کیا
گیا۔ جنتا راج شروع ہوا۔

اور طوائف بازار میں شاردا بائی کے گھرانے
کا خوب نام ہوا۔ وہ ایک ایسی طوائف تھی جس کے
خاندان میں ہر مرتبہ بیٹی ہی پیدا ہوتی تھی۔ اور وہ
اپنی ماں سے زیادہ خوبصورت۔ اس بیچ سیٹھ
مگن لال چھگن لال نے بھی بہت نام کمایا۔ چائے کے
باغات، پٹ سن، بینکنگ، کپاس منڈیاں اور
غیر ملکی کاروبار کے علاوہ انھوں نے کئی صنعتوں
میں ہاتھ ڈالا۔ جہاں انھوں نے ہاتھ ڈالا وہیں
سونا برسنے لگا۔ سیٹھ داروو الا نے کپڑے کے
کارخانے لگائے۔ اور اپنی عظمت کو سات سمندر
پار تک پہنچا دیا۔ اب ان کا نام بھی سیٹھ ایم سی
داروو الا ہو گیا۔ سرکاری صنعتی کمیٹیوں میں ان
کی آؤ بھگت شروع ہو گئی اور وہ سال کا تین
چوتھائی حصہ غیر ملکوں میں گزارنے لگے۔

اس دوران سندر بائی کی بیٹی تارا بائی جوان
ہو گئی اور اس کے حسن کے افسانے پھیلنے لگے۔ تارا بائی

کی پہلی رات کا اعلان ہوا تو پھر ہل چل مچ گئی۔ اب امیر
امراء، راجے نواب، زمیندار، مہاراجے نہیں رہ گئے
تھے چنانچہ سبھی نئے رئیس کی خبر رکھنے کے منتظر تھے۔

آخر کار وہ دن بھی آیا اور سب کی آنکھیں کھلی رہ
گئیں۔ جب پتہ چلا کہ تمام نئے نئے رئیسوں، لیڈروں،
صنعتی شیئر ہولڈروں کے راجاؤں، محکمہ انکم ٹیکس
کے نوابوں، ٹھیکے داروں اور وزیروں اور ان کے
رشتہ داروں وغیرہ کی کوششیں فیل ہو گئی ہیں ان کے
بجائے ۵۱ سالہ کروڑپتی سیٹھ نے بازی جیت لی ہے۔

اس کروڑپتی کا نام بھی لوگوں تک پہنچا۔ سیٹھ ایم سی
داروو الا۔

اب شاردا بائی اور سندر بائی نے اپنے اپنے
تجربوں کی ہدایتیں اپنی بیٹی تارا بائی کو دیں اور اس
مرتبہ یہ پہلی رات گزارنے کا انتظام سرینگر کی کوٹھی
میں کیا گیا۔

اور سرینگر میں ایم سی داروو الا کے ساتھ
تارا بائی نے پہلی رات گزار دی۔

اس وقت تارا بائی سولہ سال کی تھی اور سیٹھ
ایم سی داروو الا (۵۱) سال کے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ اور روس میں کشمکش
چل رہی تھی۔ ایٹم بموں کے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔
فرانس میں انقلاب آیا۔ ہندوستان میں تعمیری کام
شروع ہوئے۔ بانڈونگ کانفرنس ہوئی۔ کئی سال
غیر جانب دار قوموں میں بیداری آئی۔ اور پنچ شیل
کی بنیاد رکھی گئی۔ تبت میں تباہی آئی۔ کشمیر پر حملہ ہوا۔
ویتنام کی آزادی کی جدوجہد نے نیا موڑ لیا۔ چین
نے ہندوستان پر حملہ کیا۔۔۔۔۔ پردھان منتری
نہرو کی موت ہوئی۔ پاکستانی حملہ بھی ہوا۔ تاشقند
میں لال بہادر شاستری کا دیہانت ہوا۔ اندرا گاندھی
وزیرِ اعظم ہوئیں۔ کئی صوبوں میں اپوزیشن پارٹیوں
کی سرکاریں بنیں۔ بہار اور راجستھان میں قحط
پڑے۔ گجرات میں سیلاب آیا۔ اور تب تک تارا بائی
کی بیٹی گیتا بائی جوان ہو گئی وہ ابھی پندرہ سال کی
ہی تھی کہ اس کی پہلی رات کا اعلان کیا گیا۔ اور تب
لوگوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ان کو معلوم تھا کہ
کیا ہونے والا ہے اور یہ رات کہاں اور کس کے



گدھ

محمد طارق

وہ اُن گدھوں کا رکھوالا تھا۔

جب گدھ انڈوں میں سے نکلے تب ہی سے اس نے ان کی دیکھ بھال شروع کردی تھی، ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتا تھا۔ بے حد محبت تھی اسے ان گدھوں سے۔ جب تک وہ ان کا پیٹ نہیں بھر دیتا خود لقمہ منہ میں نہیں ڈالتا تھا اور گدھ

جب ان کی مڑی قوس نما چونچیں، نوچنے اور پر اڑنے کے لائق ہوگئے تب وہ بھی اسے بھولے نہیں۔ وہ بلاناغہ اس کی چوکھٹ پر آکر اپنی وفاداری کا ثبوت دیئے جاتے تھے۔

وہ ان کے اس ثبوت کو تسلیم کرکے مسرور ہوتا اور سوچتا... پیارے گدھو! اب تم اپنی غذا خود تلاش کرکے اپنا پیٹ بھر لیتے ہو، اب تمہیں میری مطلق ضرورت نہیں رہی۔ پھر تم مجھ سے ملنے ہر روز آتے ہو۔ یہ تمہاری بے غرض ملاقات تمہاری احسان مندی، وفاشعاری کا اظہار ہے جو میرے لیے گراں قدر ہے کیونکہ آج اس دنیا میں تمام اخلاق و کردار، تمام جذبات و خیالات غرض کے ترازو میں تولے جارہے ہیں۔ اور ایک تم ہو کہ غرض پرست دنیا میں رہنے کے باوجود بھی بے غرض آتے ہو مجھ سے ملنے!

میں کچھ دنوں سے بیمار ہوں۔

تمہیں میری بیماری کا جب علم ہوا تو تم میرے گھر کا طواف کرنے لگے۔ کس قدر پریشان ہوگئے تم مجھے بیماری دیکھ کر جیسے تم خود بھی بیمار ہوگئے ہوں۔ یہ کیسا رشتہ ہے تمہارا اور میرا، میری بیماری نے تمہیں بیمار بنا دیا!

تم میرے اطراف بیٹھے ہوں، بالکل خاموش۔ رنجیدہ، اداس ـــــ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو جیسے تم پر، کتنی محبت ہے تمہیں مجھ سے جبکہ میں جانتا ہوں تمہاری یہ محبت مجھے کچھ نہیں دے سکتی نہ تندرستی نہ زندگی، شاید تم بھی یہ بخوبی سمجھتے ہونگے پھر بھی تم مجھ سے محبت جتا رہے ہو شاید رسم کے تحت! ؟ نہیں رسم کے غلام تو وہ ہوتے ہیں جو محبت نہیں کرتے اور تم تو مجھ سے برسوں سے محبت کرتے آئے ہو بالکل اسی طرح جس طرح میں تم سے محبت کرتا آیا ہوں۔

وہ بستر مرگ پر لیٹا اپنے گرد بیٹھے ہوئے رنجیدہ گدھوں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کا ذہن سونے لگا.... آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ یکلخت اس کے تمام بدن میں درد کی زوردار لہر دوڑی اور زندگی ہچکی بن کر اس کے لبوں سے نکل گئی اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔ اور گدھ ـــــ

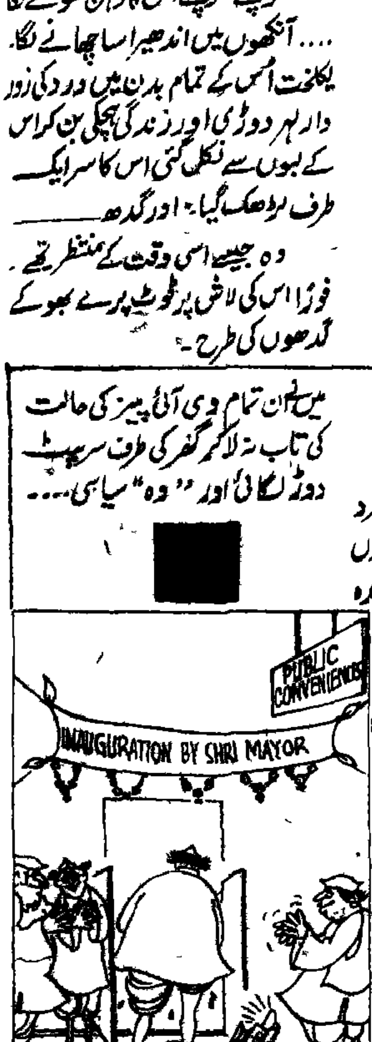
وہ جیسے اسی وقت کے منتظر تھے۔ فوراً اس کی لاش پر ٹوٹ پڑے بھوکے گدھوں کی طرح۔

بقیہ اور وہ سیاسی ہوگئے

کردیا اور سیاسی ہوگیا۔ اب میں محلے کا فرد نہیں رہا ہوں۔ نیشنل پراپرٹی بن گیا ہوں (تالیاں اور زندہ باد کے نعرے) میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے لیے یعنی اپنے محلے کے لیے ایک لائبریری دو اسپتال اور تین قبرستان بنواؤں گا۔ ورہی دعا آپ کی تو آپ کو دفن بھی کرادوں گا میں پورے شہر میں محلہ باد پھیلاؤں گا۔ "دھنیہ واد" یہ کہہ کر وہ منڈیرے کود کر گھر میں چلے گیے۔

میں نے آس پڑوس میں وی آئی پی بینچ پر بیٹھے ہوئے بدرو بھائی چنی لال نتھو شاہ پر نظر ڈالی ان کے چہرے خوشی اور فخر کے مارے پھٹے پڑ رہے تھے

میں نے ان تمام وی آئی پیز کی حالت کی تاب نہ لاکر گھر کی طرف سرپٹ دوڑ لگائی اور "وہ" سیاسی...



طنز

اور وہ سیاسی ہوگئے

انیس احمد خاں



ہندوستانی سیاست میں بھیڑ کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ خواہ بس کے انتظار میں کھڑی بھیڑ ہو یا ریل گاڑی کا ٹکٹ لیتے ہوئے سواریوں کی یا راشن کی دکان کے سامنے راشن والے کے دیدار کو ترستی ہوئی عقیدتمندوں کی ہر بھیڑ کے اپنے بے ترتیب سیاسی تبصرے ہوتے ہیں — "ہندوستانی سیاست ایک ایسی دیسی کتیا ہے جو کسی بھی وقت مع اپنے مالک کے کسی کو بھی بھنبھوڑ سکتی ہے!" یہ فقرہ میں نے راشن کی بھیڑ سے چرایا تھا۔ جہاں راشن کم اور لوگ زیادہ تھے۔ وہیں پر ایک سرکاری نیتا بھیڑ کو سمجھا رہے تھے کہ ہماری پارٹی غریبی ہٹانے میں اس لئے تاخیر برت رہی ہے کہ جلد بازی میں غریبی کی جگہ کوئی ایسی چیز نہ ہٹ جائے جس کا ہمیں زندگی بھر افسوس ہوتا رہے — وغیرہ وغیرہ

اسی ادھیڑ بن میں ایک روز دفتر سے گھر میں داخل ہوا تو گھر والی کو پورے صوفیانہ موڈ میں دیکھ کر میں نے آسمان کی طرف رحم طلب نظروں سے تاکا اور ڈرتے ڈرتے ان کی جانب نظریں گھمائیں تو انہوں نے بغیر کسی تمہید کے چودھویں صدی کے خاتمے اور کسی بھی لمحے قیامت کی آمد کی اطلاع دے دی میں نے شکر منایا کہ چلو سستے میں چھوٹے کہیں وہ مٹی کا تیل لانے کا حکم دے دیتیں تو ۔۔۔ پر کیا کریں دن کا سنا رات کو خواب بن کر [illegible]ل ہوتا ہی ہے لہٰذا کافی رات تک قیامت کے ہی خواب

آتے رہے۔ بڑی مشکل سے نیند آئی تھی کہ زوردار دھڑ دھڑاہٹ سے میری آنکھ کھل گئی سمجھتے دیر نہ لگی کہ قیامت آ ہی گئی۔ اچھل کر بستر سے نیچے کود پڑا اور چیختا ہوا گھر کے پچھواڑے سے محلے والوں کو قیامت کی خبر دینے کے لیے بھاگنا چاہا لیکن میری بیوی کو شاید یہ خدمت خلق گوارہ نہ ہوئی اس نے مجھے جھنجھوڑ کر ہوش میں آنے کے لیے کہا جب نیند کا غلبہ کم ہوا اور کچھ سمجھنے کے قابل ہوا تو انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کرکے قیامت کا صحیح راستہ بتا دیا۔ اپنے اس ڈرپوک پن پر نظر پڑتے ہی میری شرمندگی اور بڑھ گئی اور صبح صبح دروازے پر دستک دینے والے کی دوستی پر اپنے آپ کو کوستا ہوا آگے بڑھا اور بیٹھک کا دروازہ کھول دیا نظر پڑی تو دیکھا کہ سامنے بڑے جوش و خروش سے اپنی باچھیں پھیلائے دھلے دھلائے بدرو بھائی کھڑے ہیں مجھے دیکھتے ہی انہوں نے بغیر کسی تمہید کے مبارکباد کے دو تین بم ایک ساتھ چھوڑ دیے میں مجسم سوالیہ نشان بنا ان کی طرف تاک رہا تھا کہ انہوں نے جھٹ سے اطلاع دی کہ "وہ یعنی کہ وہ ۔۔۔ سیاسی ہوگیے" یہ خبر سن کر مجھے اس سے بھی کہیں زیادہ حیرت ہوئی جتنی کہ ہندوستان میں بے روزگاری اور مہنگائی ایک ساتھ ختم ہونے پر بھی نہ ہوتی بات دراصل یہ تھی کہ "وہ" ایک بہت سیدھے سادھے اور نیک انسان تھے۔ کسی سرکاری دفتر میں ایماندار کلرک تھے ان کی ایمانداری کی ضمانت محلے کے لالہ کی دوکان پر ان کا ادھار کھاتہ تھا۔ جو کبھی بند ہونا نہیں جانتا تھا۔

دوسرے ان کی وہ سائیکل تھی جو بقول محلے کے منچلے بزرگوں کے ان کے پڑدادا کو پہلی جنگ عظیم میں بطور انعام ملی تھی۔

میں نے بدرو بھائی سے جب اس حادثے کی تفصیل جاننی چاہی تو انہوں نے فخریہ انداز کو ادھر چوڑا کرکے کسی پریس کانفرنس کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے لیڈر کی طرح سنجیدہ ہو کر فرمایا۔

اب آپ سے کیا بتائیں صاحب ہم لوگ یہ کوشش کافی دنوں سے کر رہے تھے ان کے پاس مستقل محلے بھر کی دستخط کی ہوئی اپیلیں اور وفد بھیجے جا رہے تھے لیکن وہ راضی ہی نہیں ہو کر دے رہے تھے پر جب ان کے پاس مستقل چندہ اگاؤ کمیٹی کے چیرمین چنی لال مہان مذہبی رہنما تھوشاہ اور دادا پاؤ سنگھ پہلوان پہنچے تو بھلا ان کے آرگومنٹ سے کیسے موبیلائز نہ ہوتے اور انہوں نے ترس کھا کر اور ساتھ ہی محلے کی عزت کے لیے سیاسی ہونا منظور کرلیا:

نہ جانے کیوں مجھے "وہ" کے اوپر بڑی شدت سے ترس آنے لگا۔ لو ایک شریف تھا بے چارہ گیا۔ لیکن ان کو سیاسی بنانے کی آپ لوگوں کو کیا ضرورت پڑ گئی؟ میں نے بدرو بھائی سے پوچھا بدرو بھائی نے میری نا سمجھی پر تقریباً افسوس سا کرتے ہوئے اور کچھ زیادہ ہی ڈپلومیٹک انداز میں مسکراتے ہوئے انکشاف کیا "ارے آپ اتنی بات

[illegible] بھائی وہ کچھ [illegible]
[illegible] کوئی چاہیے تھا لہٰذا ان سے اچھا [illegible]

بدرو بھائی کی بات پوری طرح [illegible] میں ڈوبی ہوئی تھی جملہ سنتے ہی [illegible] کھلا اٹھی بدرو بھائی نے میری [illegible] کیفیت نظر انداز کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

"بھئی آج شام کو وہ اپنے گھر کی منڈیر سے محلے کو خطاب کرنے والے ہیں۔ آپ ضرور تشریف لائیے گا۔ یہ تاریخی موقع ہے دیکھیے بھولیے گا نہیں۔"

ٹھیک چار بجے میں ڈھڑکتے ہوئے دل سے "ان" کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ میری عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی اس سے پہلے مجھے ان کے گھر جاتے ہوئے ایسا کچھ نہیں لگتا تھا۔ ان کے گھر کے پچھواڑے دو بڑی بڑی میلی چاندنیاں بچھا کر پبلک کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جس کے اوپر اسی رنگ کے ہر سائز کے ننگے ادھ ننگے بچے گبر سنگھ کے ڈائیلاگ دہراتے ہوئے دھینگا مشتی کر رہے تھے۔ ایک طرف غفور چائے والے کی دکان سے اٹھائی گئی بنچ پڑی ہوئی تھی جس کے آگے وی۔ آئی۔ پی کا بورڈ لٹکا ہوا تھا جہاں ابھی صرف بدرو بھائی جو حد درجہ سنجیدہ ہو رہے تھے۔ اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے مجھ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے وہیں سے با آواز بلند مجھے پکارا اور وی آئی پی گیلری میں بیٹھنے کی دعوت دی میں ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ دھیرے دھیرے محلے کی بھیڑ جمع ہونے لگی کچھ لوگ خوش تھے اور کچھ پریشان کیونکہ ان کی سمجھ میں یہ ماجرا نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ میرے ہی جیسے عام لوگ تھے۔ سامنے منڈیر کی جس دیوار سے "وہ" خطاب کرنے والے تھے۔ گوبر اور سفیدی سے لیپ پوت کر صاف کی گئی تھی۔ جس پر بڑے حروف میں "سیاست [illegible]" خرید ہے۔" لکھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں جب یہ بھیڑ پاس پڑی ہوئی نالی کی طرح پورا ابھر گیا تو اسی وقت ایک آدمی ہانپتا ہوا بدرو بھائی کے پاس آیا اور ان کے کان میں کوئی خبر انڈیلنے لگا جسے سن کر بدرو بھائی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہونٹ مسکرانے کے لیے پھڑکنے لگے اور سینہ کچھ کہنے کے لیے دھڑکنے لگا۔ وہ اچھل کر کھڑے ہوئے اپنے ہمدرد کو علی الاعلان کھول کر ٹائٹ کیا۔ شور مچاتی ہوئی بھیڑ کی جانب اشارہ کر کے کچھ کہنا شروع کیا۔

"بھائیو دیکھا آپ نے ان کی تعریف" ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ جس چھاپے خانے میں "وہ" کا پہلا انقلابی خطبہ چھپ رہا تھا وہ مشین ٹوٹ گئی ہے آپ پوچھیں گے ایسا کیوں ہوا۔۔۔ تو اس کا ایک ہی جواب ہے کہ ہمارے "ان کی" تقریر کا کڑا پن اور بلندی وہ بے زبان مشین نہ برداشت کر پائی۔۔۔ اور بے چاری ٹوٹ گئی۔ بھائیوں دیکھا آپ نے اپنے لیڈر کا پہلا کارنامہ کیسا عبرت ناک ہے پر آپ گھبرائیں نہیں ہمارے سیاسی بھائی کیسی لکھی لکھائی اور چھپی چھپائی تقریروں کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کو زبانی بھی بہت کچھ یاد ہے۔ جس کا مظاہرہ "وہ" چند ہی لمحوں میں اسی منڈیر پر نمودار ہو کر کریں گے اور بتلائیں گے کہ آج دیش کو ان کی ضرورت اچانک کیوں آن پڑی۔۔۔!

پورا پچھواڑہ تالیوں نعروں اور بچوں کی ملی جلی کلکاریوں سے گونج اٹھا یہ سب ابھی رک بھی نہیں پایا تھا کہ میری نظر سامنے منڈیر پر پڑی وہاں جو کچھ بھی دکھا اسے دیکھ کر میرے پیٹ کے اندر کئی قہقہے کھولنے لگے۔

منڈیر پر وہ برسوں پرانا سفید کرتا پائجامہ جو کر صاف کرنے کی کوشش میں [illegible] پہنے کھڑے نظر آئے [illegible] اور مسکراہٹ لانے [illegible] کو چھوڑ رہا تھا۔ ناک کے اوپر ان کا اپنا کالا چشمہ لگا ہوا تھا۔ جو کر گھبراہٹ کے پسینوں سے پھسل پھسل کر ناک کی پھنگی تک آ کر ٹکا تھا سر پر بالکل جھک جھک کرتی ہوئی کھادی آشرم سے خریدی ہوئی گاندھی ٹوپی لگی ہوئی تھی انہوں نے منڈیر پر اٹینشن کھڑے ہو کر ایک عجیب سے انداز میں بھیڑ کی طرف ہاتھ اٹھایا جو یک بارگی نمسکار آداب اور سیلوٹ لگ رہا تھا۔ آخر انہوں نے کھانس کھنکار کر اپنی تقریر شروع کی۔

بھائیوں! بہنوں اور ننگ دھڑنگ بچوں، تمہیں ہمارا نمسکار، دھمسکار، چمسکار، گمسکار۔ دوستوں [illegible] کے ساتھ میں نے تین اسکار جوڑ کر محلے کی سیاست کو تین نکاتی موڑ دیا ہے ہم آپ کے سامنے صرف تقریر فرمانے نہیں آئے ہیں بلکہ نعروں کے ساتھ ساتھ کچھ حل بھی لے کر آئے ہیں جس میں پہلا ہے غریبی ہٹانے کے بارے میں۔ اس کا واحد طریقہ ہے سیاسی ہو جانا اور آپ مجھے دیکھیے میں سیاسی ہو گیا جلد ہی منتری ہو جاؤں گا پھر وہ دن دور نہیں جب میری ہی کیا میرے تمام رشتے داروں کی غریبی دور ہو جائے گی (تالیاں اور زندہ باد کے نعرے) خواہشوں کو عملی جامہ پہنانا ہے تو سیاسی ہو جائیے مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے کہ مرنے کے بعد یہیں محلے میں میری ایک سمادھی بنائی جائے گی جس کے اوپر میری اٹلس سائیکل میں سوار گھر واپس آتا ہوا لائف سائز مجسمہ بھی لگوایا جائے گا۔

(تالیاں۔۔۔ جس کی پہل بدرو بھائی کر رہے تھے) آج سے پہلے سیاست میرے نزدیک س۔ی۔ا۔س۔ت سے زیادہ نہیں تھی لیکن جب مجھے اس کی [illegible] خصوصیات معلوم ہوئیں تو میں نے ان [illegible] حروف کو ایک جگہ

(باقی صفحہ ۲۷۹ پر)

طنز

ہم کہ مجاہدِ اردو

عظیم اختر

قارئینِ کرام! اس مضمون کا عنوان دیکھ کر آپ یقیناً چونک گئے ہوں گے۔ حیرتوں کو بڑھانے اور چونکا دینے والا یہ عنوان بظاہر خودستائی، خودپسندی اور خودستائش کے پہلوؤں کا حامل ہے۔ ممکن ہے پہلی نظر میں آپ اسے ہماری بے جا خودپسندی اور اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا نام دیں، لیکن بخدا یقین مانیے اس وقت ہم اپنے دل پر بہت جبر کر کے اور بہ حالتِ مجبوری اردو کے تئیں اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں اور ادبی خدمات کو قلمبند کرنے کے لیے بیٹھے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم ہر قسم کی تعریف و توصیف اور شہرت پسندی سے بے نیاز ہمیشہ علمی اور ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھا ہے۔ نہ صرف اپنی ادبی زندگی میں بلکہ اپنی نجی زندگی میں بھی اس قسم کی انکساری اور خاکساری سے کام لیا ہے کہ علامہ مشرقی کے خاکسار بھی ہم سے شرما جائیں۔ لیکن اس دورِ پُرآشوب میں جبکہ ہر شخص اپنا اپنا راگ الاپ رہا ہے، اپنی ڈفلی بجا رہا ہے، اپنی تعریف میں قصیدے لکھنا اور پڑھوانا معیارِ سخن ٹھہرا ہے، گروہ بندی کی بے ساکھیوں کے بغیر ادب میں اپنی شناخت کرانا تو کجا کسی بہتر اور ادبی رسالے میں چھپنا بھی ممکن نہیں۔ ہم اگر گونگے کا گڑ کھاتے رہے یعنی اسی روش پر گامزن رہے تو کل خلقِ خدا تو کیا ہماری اپنی اولاد بھی اردو زبان و ادب کے لیے ہماری انتھک خدماتِ جلیلہ کے علم سے بے بہرہ رہ جائے گی۔

یہی جذبہ ہمارے اس مضمون کا محرک ہے ورنہ ہم تو چپ چاپ ادبی خدمات کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ میں سے اکثر حضرات نے ہمارے مضامین وغیرہ پڑھ کر جب بھی بیرنگ خطوط بھیجے، ہم نے جرمانے کو بھی ادبی خدمات تصور کرتے ہوئے ہنسی خوشی بھگتا اور زبان پر حرفِ شکایت نہیں لائے — لیکن اس وقت ہم اس شش و پنج میں ہیں کہ لکھیں تو لکھیں اور کس طرح لکھیں۔ دوسرے لوگ تو اپنی تعریف اپنے آپ کرنے کے فن میں طاق ہیں، مبالغے اور تعلّی سے کام لینا خوب جانتے ہیں، رائی کا پہاڑ بنانے کے فن میں ماہر ہیں لیکن یقین مانیے ہمیں یہ سب کچھ نہیں آتا۔ اس معاملے میں ہم سفید لٹھے کی طرح کورے ہیں۔ ممکن ہے ان گذارشات کو پڑھ کر ہمارے لیے آپ کے ذہن میں جوش کا یہ مصرع کلبلانے لگا ہو:

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

حقیقت تو یہ ہے کہ جوش نے بھی اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ مبالغے سے کام لیا ہے ورنہ دراصل یہ مصرع تو ہم ایسے گوشہ نشیں خاکساروں اور شرافت کے پتلوں پر ہی صادق آتا ہے جو بنیادی طور پر انکساری اور خاکساری کے قائل ہیں ——

اظہار ہماری زندگی کے ہر پہلو سے ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ چند ابتدائی ملاقاتوں کے بعد ہی دوسروں پر ہماری قابلیت اور علمیت کے جوہر کھلتے ہیں اور کھلتے ہی چلے جاتے ہیں، ہم سے ملنے کے بعد اکثر حضرات کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر آ جاتا ہے:

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ہماری ظاہری ہیئت ہے ہی کچھ ایسی کہ اگر ہم کسی محفل میں خاموش بیٹھے رہیں اور زبان نہ کھولیں تو کسی ایجنٹ ہاؤس کے کارندے یا لاؤڈ سپیکر کے میکنک سمجھے جاتے ہیں۔ اب یہی دیکھیے ہم ایک مقامی کالج میں لڑکے پڑھاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اردو بھی پڑھاتے ہیں، اپنے نام سے پہلے موٹے موٹے حروف میں بالالتزام پروفیسر لکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس طرح کرتپور، بجنور، نہٹور، جلال آباد اور منگلور کے انٹر کالجوں کے بہت سے ادیب و شاعر استاد پروفیسر لکھتے ہیں اور کہلائے جاتے ہیں، ہمیں بھی لوگ پروفیسر کہہ کر مخاطب کیا کریں، کیونکہ ہم تو خیر سے راجدھانی کے ایک بڑے کالج میں علم کی کاشت کرتے ہیں، لیکن وائے محرومی ماسوائے ہمارے بیوی بچوں کے ہمیں ہر شخص ماسٹر جی ہی کہہ کر مخاطب کرتا ہے، اور پروفیسر کہہ کر مخاطب کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جس کے ہم یقیناً مستحق ہیں۔

گو علم نجوم میں ہمیں جو مومن خاں مومن اور اطہر مظفر نگری کی طرح دسترس حاصل ہے، لیکن پھر بھی اس کے تھوڑے بہت علم کی روشنی میں ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اپنوں کی بے اعتنائی اور غیروں کی بے توجہی کا سبب ہمارے اور اردو کے ستاروں کی حیرت انگیز یکسانیت ہی ہے۔ ہم اردو پڑھاتے اردو پڑھاتے ہیں گویا اردو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے، اور چونکہ گذشتہ تیس بتیس سال سے اردو پر سنیچر سوار ہے، راہو کیتو پر بھاری پڑ رہا ہے، جس کے نتیجے میں ہزاروں وعدوں کے باوجود اردو کو اس کا مقام و مرتبہ دینے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں، اسی طرح ہم پر بھی سنیچر سوار ہے ... بہرحال اردو کو اس کا جائز مقام و مرتبہ ملے کہ نہ ملے، یا چند فصلوں

کی محدود غلط داری دے کر اردو والو
کو خوش فہمی میں مبتلا کر دیا جائے
ہماری تمنائیں ناآسودہ ہی رہ جائیں،
ہم اردو کے تئیں اپنی ہی خدمات میں
کوئی کمی نہیں آنے دیں گے، کیونکہ ہم
جگر کے اس مصرعہ میں یقین رکھتے ہیں

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

ویسے بھی اردو سے ہماری روزی روٹی
کا مسئلہ جڑا ہوا ہے، کیونکہ کالج
میں ہماری ملازمت کا انحصار اردو
پڑھنے والے طلبا کی تعداد پر ہی رہتا
ہے اور ہمارے سر پہ ہمہ وقت دو
دھاری تلوار لٹکی رہتی ہے۔ اردو
پڑھنے والے طلبا کی تعداد کے کم ہوتے
ہی کالج کے حکام اور ہمارے ساتھی اساتذ
ہمارے اعزاز میں الوداعی پارٹی دینے کی
تیاری کرنے لگتے ہیں۔ آخری سال کے
طلبا کے رخصت ہوتے ہی نئے تعلیمی
سال کے آغاز تک ہماری آنکھوں کے
سامنے چھوٹے بڑے تمام ستارے اور
سیارے کوندنے لگتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ
اس دور جبکہ طلبا اور ان کے والدین
کالج میں داخلے کے حصول کے لیے بھاگتے
پھرتے ہیں، سفارشیں کراتے ہیں ظاہری
اور پوشیدہ عطیات بھی دیتے ہیں، انگریزی،
کامرس، سائنس اور دوسرے زندہ
مضامین کے اساتذہ داخلے کے خواہشمند
طلبا کو منہ لگانا تو درکنار ان سے بات
کرنا بھی گوارا نہیں کرتے اور ادھر ہم
تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والے
اردو داں طلبا کے ناموں کی فہرست لیے
ان کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں تاکہ بہلا پھسلا کر
ان کو اپنے کالج میں داخل کرا سکیں۔

کالج میں اردو پڑھنے والے طلبا کی
نفری بڑھانے اور اپنی نوکری برقرار رکھنے
کے لیے ہمیں کس قدر بے چارگی کے ساتھ
دلی کے گلی کوچوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے،
یہ کوئی ہم سے پوچھے [illegible] سو سیانی ہیں
چونکہ استعمال عام ہے، اس لیے تعلیمی
لحاظ سے خاکسار اور کمتر قسم کے یہ لڑکے
بھی اس موقعہ پر ہمارا استعمال کرنے سے
نہیں چوکتے۔ عام طور پر جس طرح لڑکی
والوں کو ہونے والے داماد کی ہر جائز و ناجائز
خواہش کو پوری کرنے کے لیے جھوٹے سچے
وعدے کرنے پڑتے ہیں، اسی طرح ہمیں
بھی ان لڑکوں کو، جو ہمارے لیے نعمت
غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتے، رجھانے کے لیے
انگنت وعدے کرنے پڑتے ہیں، نہایت
ہی روشن اور تابناک مستقبل کے سبز
باغ دکھانے پڑتے ہیں، اردو پڑھ کر شہابِ
ثاقب کی طرح چمکنے اور کاملیت کی حدود
کو پہنچنے کی یقین دہانیاں کراتے ہیں
(اللہ ہمیں اس فریب دہی کے لیے معاف
فرمائے)۔ اکثر و بیشتر کالج کی فیس اور اسی
قسم کے دیگر اخراجات بھی ہم کو اپنی جیب
سے ادا کرنے پڑتے ہیں، یقین مانیے ان
اخراجات کا بار اٹھانے کے لیے ہمیں کئی بار
اپنے پراویڈینٹ فنڈ سے قرض بھی لینا
پڑا ہے۔

بہر حال یہ تو ایک جملۂ معترضہ کے طور پر
نوکِ قلم پر آگیا ورنہ ہم تو پیسے کو ہاتھ کا میل
سمجھتے ہیں اور ہاتھ کے میل کا تذکرہ بھی کیا
ہم تو خلوصِ دل سے اردو کی خدمت کے
لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔

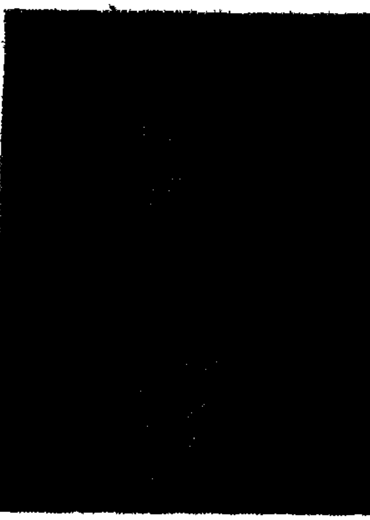
ہم اردو پڑھاتے ہیں، چونکہ اردو کے
ہر استاد کا اہلِ قلم ہونا از بسکہ ضروری ہے،
اس لیے ہم بھی خیر سے اہلِ قلم ہیں اور اہلِ قلم
بھی ایسے کہ ادب کی ہر صنف میں قلم دوڑاتے
ہیں۔ شاعری، افسانہ نگاری، تنقید و تنقیص
(کیونکہ تنقیص اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ
ہے)، تحقیق، غرض ہر میدان میں لکھتے ہیں
اور خوب لکھتے ہیں، نہ صرف اپنے نام سے
لکھتے ہیں بلکہ اکثر اپنے احباب کے نام سے
بھی لکھتے ہیں۔ اس GHOST WRITING –
کے لیے بہت [illegible] میں پہنچنے
ہوئے دوستوں [illegible] ضروری دماغ
[illegible] بلکہ اردو کی زیادہ
سے زیادہ خدمت کرنے کی لگن بھی پوشیدہ
ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری اس لگن اور ادنیٰ
سی خدمت کی بدولت آج ہمارے بہت سے
دوست اردو ادب کے معتبر نام سمجھے جاتے ہیں،
اور ان میں سے اکثر کی تصنیفات، جو یقیناً
ہمارے ہی کاوشوں کا نتیجہ ہیں، انعام و اکرام
سے نوازی گئی ہیں اور ادب میں قابلِ قدر اضافہ
سمجھی جاتی ہیں۔

بہر نوع ہم خاموش خدمت کے قائل
ہیں اور کسی نہ کسی عنوان سے ادب میں اضافے
کرتے ہی رہتے ہیں۔ اب یہی دیکھیے اردو
میں گیت نگاری پہ زیادہ توجہ نہیں دی گئی،
ہندی گیت کے میدان میں مالا مال ہے، ہم
چونکہ ہندی کے چھندوں سے بھلی بھانتی
واقف ہیں، اس لیے ہم آج کل ہندی کے
نرم لب و لہجے میں گیت لکھ رہے ہیں اور
اپنی نصف بہتر کے نام سے اردو کے موقر
جرائد میں اشاعت کے لیے بھیجتے ہیں اور
اپنے تنقیدی مضامین میں ان گیتوں کے اسلوب
اور انفرادی لب و لہجہ کی خوب تعریف و توصیف
کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی گذشتہ تصنیف میں
اردو شاعری کا ایک نئے اور اچھوتے زاویہ
سے تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان گیتوں پر
ایک بھرپور اور تفصیلی مضمون بھی شامل کیا
ہے جو اب تک مختلف رسائل میں متعدد بار
چھپ چکا ہے، ممکن ہے آپ کی نظروں سے
بھی گذرا ہو، بہر حال آج ہماری نصف بہتر کا
اردو کی معدودے چند مستند شاعرات
میں شمار کیا جانے لگا ہے اور اچھی خاصی
شہرت حاصل ہو گئی ہے (حالانکہ وہ
غریب ہم کو آج بھی دوسروں سے خط
لکھواتی ہے) اور اب ہم اپنی
ان گیتوں کا مجموعہ شائع کرنے جا رہے ہیں، ہم ادب!

باقی صفحہ ۲۸۸ پر

ایک مسیحا نفس کی بات

تحریر
بشیر احمد



ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

آج ہندوستانی معاشرہ بھی بازار بن گیا ہے پہلے پورا ملک ایک گھر تھا ایک خاندان تھا جہاں لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ اس ملک میں جتنی طریقۂ زندگی بھی مروج ہوا جس میں کسی بھی جاندار کو نقصان پہنچانے سے گریز کے انتہا پسند طریقے بھی اپنائے گئے۔ یہیں بودھ طریقۂ زندگی بھی شروع ہوا جس میں انسان کو ہر قسم کے تشدد سے روکا گیا اور خود پر قابو پانے کی اہمیت اجاگر کی گئی۔ شروع سے ہی یہاں کا طرز زندگی راہبانہ رہا ہے۔ انسانیت کی خدمت اور سیوا یہاں کا طرۂ امتیاز رہا ہے یہاں افراد نے کبھی اپنی شخصیت یا کارنامے کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اجنتا اور ایلورا کے فن کاروں کی نامزدگی نسل ریاضت نے جن شہ کاروں کو وجود دیا وہ یہاں کے غیر انفرادیت پسندی اور ایثار و رہبانیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

یہاں کے درویشوں کا انداز ہمیشہ خسروانہ رہا اور خسروؤں کا انداز ہمیشہ درویشانہ رہا۔ مگر آج یہ ملک بھی سرمایہ دارانہ نظام حکومت کے تحت بازار بن گیا ہے جہاں ہر چیز بکاؤ ہے۔ کوئی اخلاقیات، نہ مروت، نہ خلوص ہر چیز بازار میں قابل فروخت ہے۔ محبت، نفرت، انسانیت، حیوانیت سبھی جنس بازاری ہیں ——— ایک گہرا اندھیرا ہے جسے دیکھ کر محسوس کر کے روح کانپ جاتی ہے مگر نہیں اسی وحشت کدے میں آج بھی کوئی درویش ابھر ہوا کی تندی و تیزی کی پرواہ کئے بغیر چراغ جلانے میں مصروف ہے ایسے ہی لوگوں میں ایک ہیں۔ ڈاکٹر اگروال اس مسیحا نفس نے آج تک لاکھوں لوگوں کو دکھوں سے تکلیف سے درد و کرب کی اذیت سے نجات دلائی ہے۔ اور معاوضے میں صرف یہ احساس کہ میں خدا کے بندوں کی خدمت کر رہا ہوں۔ لیکن کے دکھ دور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ قدرت نے جب جب اسے کچھ کے لگائے وہ اور زیادہ دلچسپی کے ساتھ لوگوں کو بیماریوں سے نجات دلانے میں مصروف ہو گیا۔

دو جگ بیت گئے۔ دن نکلنے کے بعد سے مریضوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ ایک کے بعد ایک مریض آتے ہیں اور ڈاکٹر کے ہاتھوں سے شفا یابی کی گولیاں لے کر چلتے رہتے ہیں۔ دیکھنے والے تھک جاتے ہیں مریضوں کی بھیڑ سے خود مریض اکتا جاتے ہیں مگر بوڑھا جسم نہیں اکتاتا۔ دوسرے مریض جب شکایت کرتے ہیں تو مسکراتا اور سمجھاتا ہے، دیکھو میں کس طرح صبح سے بیٹھا ہوا ہوں اور تھک جانے کے بعد بھی بیٹھوں گا اکتانے سے کام نہیں چلے گا۔

اگروال صاحب ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر ہیں اور اپنی پنشن کا زیادہ سے زیادہ حصہ دواؤں پر صرف کر دیتے ہیں۔ اچھی سے اچھی دوائیں لاتے ہیں انھیں دینے کے لئے پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں لاتے ہیں۔ اور دواؤں کے دام تک نہیں لیتے۔ اپنی ذات پر کچھ خرچ نہیں کرتے۔ بیوی بچوں پر بھی کوئی خرچ نہیں ہے بیوی بچے الگ رہتے ہیں اور اگروال صاحب اکیلے اپنے مریضوں اور چڑیوں میں مگن۔ آپ کبھی تلک برج کے قریب سے گزریں اور ... چڑیوں کا جھنڈ کا جھنڈ اگر نظر آئے تو سمجھ لیجئے یہیں ڈاکٹر اگروال کا گھر ہے اور چڑیاں ان کے یہاں دانے چگنے جا رہی ہیں وہ ان چڑیوں کو بھی محبت سے کھلاتے ہیں اور اس طرح شاید خود تنہائی کی پوری کرتے ہیں۔ کھانا تو الگ رہا ڈاکٹر صاحب کپڑوں پر بھی پیسے خرچ نہیں کرتے انھوں نے ایک بار بتایا یہ قمیض میں پانچ برسوں سے پہن رہا ہوں اسے بھی ایک مریض دے گیا تھا مریض تو ڈاکٹر صاحب کو وہ سب کچھ دینے کو تیار ہیں جو ڈاکٹر صاحب چاہیں مگر انھیں اپنے لئے کچھ نہیں چاہئے۔ بھلا اس درویش صفت کو کوئی کیا دے سکتا ہے جو خود بستر مرض پر ہوتے ہوئے بھی دوسروں کو شفایاب کرنے میں مصروف ہے۔ سڑک کے حادثے میں ڈاکٹر صاحب زخمی ہوئے چوٹیں آئیں مگر انھیں اس کی پرواہ کب ہے انھیں بس ایک ہی فکر ہے لوگوں کو بیماریوں سے نجات دلاؤ دکھوں سے بچاؤ۔

اس مسیحا نفس کی کون کون سی بات کی جائے اس کی تو ہر ادا قابل تقلید ہے۔ اسے نہ تو ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پرواہ نہ نام و نمود کی خواہش نہ پروپیگنڈا یا پبلسٹی اور پیسہ و شہرت کا خیال۔ ایسے لوگوں کو [illegible] میں [illegible]

ہی نہیں ملتا یا شائستگی اور شرافت، خدمت [illegible]
جذبہ، ایثار و قربانی کے جذبات کا شمار [illegible]
میں ہونا چاہیے شاید اس طرح کے لوگ [illegible]
کرتے ہیں وہ اس سے اپنے آپ کو [illegible]
شاید ایسے لوگوں کو کسی انسانیت کے پاگل کتے نے [illegible]
کھایا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اگروال بھی ایسے ہی [illegible]
گزیدہ ہیں تبھی تو اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ بیماروں
کو صحت دینے میں صرف کر دیا یہاں تک کہ جب
ایک بار میں نے ان کے مریضوں کی بھیڑ کو بتایا
کہ ڈاکٹر صاحب ایک سڑک حادثہ کا شکار
ہو گئے ہیں تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ ایک روتے
کہا کہ خدا نخواستہ انھیں کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہوگا۔
میں نے انھیں بتایا کہ بہر حال وہ دوا تمہیں دیں گے
اس لیے کہ روح قبض کرنے والے فرشتے کو بھی
ڈاکٹر صاحب کہیں گے ذرا ٹھہرو میں انھیں
دوا دے دوں تو پھر لے چلنا۔

ڈاکٹر صاحب بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ پوجا
پاٹ کے ذریعے تسکین قلب حاصل کرتے ہیں

[illegible] دنیا سے بھی پوری طرح [illegible]
اور توجہ سے اخبار پڑھتے [illegible]
پر عمدہ تبصرہ کرتے ہیں

ڈاکٹر صاحب کا اردو سے عشق [illegible] ان
کا کہنا ہے کہ اس زبان میں جو شیرینی اور شگفتگی
ہے۔ جو رس ہے وہ کسی جدید ہندی میں کہاں
ہے۔ نقلی اور مصنوعی سرکاری زبان اب
پر چلت ہے ورنہ پہلے تو بچے اردو ہی پڑھتے
تھے ہندی بھی پڑھتے تھے مگر اردو ضرور جانتے
تھے۔ خاص طور پر اردو کے شعری ادب کا تو
جواب نہیں ہے۔

فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں وہ کہتے
ہیں کہ یہ جہالت، ناسمجھی اور سیاست دانوں
کی حماقت کا نتیجہ ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ گزشتہ برسوں میں لوگوں
کا معیار حیات بڑھا تو ہے مگر غریب اور غریب
ہو گیا ہے امیر اور امیر ہو گیا ہے۔ پہلے لوگوں
کے پاس وسائل نہ تھے اس لیے وہ چیزوں کو

[illegible] عقیدت
[illegible] ہیں
[illegible] خلاف
[illegible] کے چند
[illegible] اور فرض
شناسی کے بڑے قائل ہیں حالانکہ انگریزی
راج کے وہ سخت خلاف تھے اور کہتے ہیں کہ
بہت سی خرابیوں کے بیج انھوں نے ہی بوئے تھے
مگر اب ہمارے لیڈر تو ان سے بھی دو چار قدم آگے ہیں

مشہور صحافی اور ادیب سلامت علی مہدی
ان کے بڑے عزیز دوست ہیں انھوں نے ان کے
بارے میں بعض بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز باتیں
بتائیں مگر ڈاکٹر صاحب ان کی تشہیر ناپسند کرتے ہیں
اگر کبھی انھوں نے اجازت دے دی تو آپ تک
پہنچا دی جائیں گی اور اس کے ساتھ ان سے ایک
طویل ملاقات کا حال بھی گوش گزار کر دیا جائے گا۔

ہمارے مسائل

شہباز حسین

گذشتہ شمارے میں ہم نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید حامد کا مضمون شائع کیا تھا اور اہل نظر کو دعوت تحریر دی تھی۔ ہم ان حضرات کے ممنون ہیں جنھوں نے اس موضوع پر اپنے مضامین ارسال کئے ہیں۔

اس شمارے میں ماہنامہ آج کل کے سابق مدیر اور ترقی اردو بیورو کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر شہباز حسین کا مضمون پیش خدمت ہے۔

سید حامد صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا مضمون جو "چنگاری" کے حالیہ شمارے میں نقل ہوا ہے بڑا ہی فکر انگیز ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی جائے اور ان بنیادی مسائل کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔

سرسید احمد اور ان کے رفقا کے کارنامے مسلمانوں کے ملی انتشار کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا سید حامد صاحب نے بھی تقریباً ان ہی مسائل کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ معاشرے میں جو خرابیاں سیکڑوں برسوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں وہ ستر اسی سال میں دور نہیں ہو سکتیں۔ پھر بھی صورت حال اس لحاظ سے بڑی تکلیف دہ ہے کہ ہمارے قومی مزاج میں گذشتہ سو سال کے اندر کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے۔ حالانکہ سرسید کے زمانے کی دنیا اب بالکل بدل گئی ہے۔ لیکن اس جدید سائنسی دور میں بھی آئین نو سے ڈرنے اور طرز کہن پہ اڑنے میں زیادہ شدت آ گئی ہے۔ سرسید کی تفسیر پڑھی گئی اور برداشت کی گئی لیکن اب ہم ٹوائن بی اور ایچ۔ جی ویلز وغیرہ کی تصانیف پر پابندیاں لگا رہے ہیں۔ ہمارا ایمان اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ہر اختلافی تحریر سے لرزاں ہے۔ ہم دوسروں کی بات سننے کو تیار نہیں ہیں ذہن کے دریچے بند ہیں۔ عمل کی راہیں مسدود ہیں اور ہر طرف تاریکی ہے۔

اس صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے مختلف مکتب فکر کے لوگوں نے مختلف نسخے تجویز کئے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ جب بھی کوئی قوم زوال اور انحطاط کا شکار ہوتی ہے تو جب تک اپنا چکر پورا نہیں کر لیتی، نہیں ابھرتی، یعنی اس کو ابھارنے کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہوتی جب تک کہ وہ انحطاط کے پورے دور سے گذر نہ جائے۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال یہ کہ جب تک سائنس کی برکتوں سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھایا جائے اور جہاں سائنس اور مذہب کا تصادم ہوتا ہے وہاں سائنس کی بالادستی تسلیم نہ کر لی جائے، ترقی محال ہے۔ اور تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ جب تک مذہب کی صحیح تعلیمات پر پوری طرح عمل نہیں کیا جائے گا مسلمانوں کو سربلندی نصیب نہ ہوگی۔ ان تینوں آراء سے قطع نظر کرتے ہوئے دیکھا جائے تو بنیادی مسئلہ توازن کا ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی زندگی بنیادی طور سے عدم توازن کا شکار ہے۔ عقیدہ ذاتی چیز ہے۔ اور عمل سماجی، یہ ہمارا عمل ہی ہے جو ہمیں معاشرے میں ممتاز اور پسندیدہ بناتا ہے۔ لیکن ہوا یوں کہ سارا زور عقیدہ پر آ گیا اور عمل بڑی حد تک نظر انداز ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ایک ملے جلے معاشرے میں مسلمانوں کی سماجی حیثیت گر گئی۔ کیونکہ انھیں اپنے عمل کی بدولت ہی امتیاز حاصل ہوا تھا اور ہو سکتا تھا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ جن لوگوں کے عقیدے میں ظاہری طور پر بڑی صلاحیت تھی ان کا حوصلہ ان کے عقیدے کی نفی کرتا ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر نسخہ کیمیا کے مسلسل استعمال کے باوجود مرض اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے تو خرابی نسخے میں تو نہیں۔ علامہ ابن تیمیہ سے ایک بار پوچھا گیا کہ آپ فاسق مدبر اور غیر دانش مند مومن میں سے کس کو ترجیح دیں گے تو آپ نے فرمایا کہ فاسق مدبر کو آپ نے یہ دلیل دی کہ فاسق مدبر کا فسق اس کی ذات تک محدود رہے گا اور اس کے تدبر سے خلق اللہ کو فائدہ پہنچے گا اور غیر دانش مند مومن کا ایمان اس کی ذات تک محدود رہے گا اور اس کی غیر دانش مندی سے خلق اللہ کو تکلیف پہنچے گی۔ تاریخ اسلام میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جو علامہ کی رائے کو صحیح ثابت کرتی ہیں۔

ہم جب کسی مذہب، فرقے، یا پارٹی کے افراد کو دیکھتے ہیں تو اس کے ذاتی عمل کی بنیاد پر اس کے مذہب، فرقے یا پارٹی کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس شخص کے عمل کو نہ دیکھو اس کے مذہب کی کتابیں پڑھو، یا پارٹی کا دستور اور مینی فسٹو پڑھو، آج کے مسلمانوں کو نہ دیکھو بلکہ قرآن اور حدیث پڑھو۔ مذہب کو اس طرح سمجھنے اور پرکھنے والے چند ہوتے ہیں اور رائے عوام کی اکثریت بناتی ہے

صرف عقیدے پر زور دینے کی وجہ سے مسلمانوں میں جو مذہبی فرقے ہیں ان کے اختلافات میں شدت آ گئی۔ ہم لوگوں سے اس لئے متنفر ہیں کہ وہ عقیدے کے لحاظ سے شیعہ، یا سنی یا وہابی یا اسماعیلی ہیں۔ ہمیں ان کے عمل سے ان کے اچھے انسان ہونے سے معاشرے کے لئے کارآمد ہونے سے کوئی سروکار نہیں

انحطاط اور ٹھہراؤ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے دنیا اور دین کو ۲ حصوں میں بانٹ دیا ہے حالانکہ اپنے عروج کے زمانے میں عربوں نے ہر قسم کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ مشہور مورخ طلیبے کے حتی نے لکھا ہے کہ عربوں نے جن کتابوں کی طرف جب بھی توجہ دی وہ ادبیات کی تھیں لیکن جدید علم کی کوئی کتاب نہ چھوٹی جس کا عربی میں ترجمہ نہ ہوا اور اس پر مزید اضافے نہیں کئے گئے ہوں۔ مگر ہمارے دینی مدارس دنیاوی علوم نہیں پڑھاتے۔

پھر ہم نے فقر و استغنا، راضی بہ رضا اور قناعت پر اتنا زور دے دیا کہ اس نے ہماری قوت عمل کو بڑی حد تک متاثر کر دیا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور فطرت پذیری اور موت کے بعد کی زندگی ہمارے مزاج میں اس حد تک اثر انداز ہوئی کہ ہم جینے کا انداز ہی بھول گئے۔ اسی عدم توازن کی وجہ سے علامہ اقبال نے تصوف کے خلاف آواز اٹھائی تھی، حالانکہ ہمارے سامنے اسلامی تاریخ اور تعلیمات کا جو ذخیرہ ہے وہ دنیا سے روگردانی نہیں سکھاتا۔ شاید ہندستان

کے مخصوص حالات کی وجہ سے جس میں رہبانیت کا عنصر غالب ہے ہمارے مزاج میں ترکِ دنیا کو اتنی اہمیت حاصل تھی۔ وہ کاوش اور محنت وہ جدوجہد جو ترقی کے لئے ضروری ہے عام طور سے ہم میں نظر نہیں آتی۔ جن لوگوں کو مسلم اداروں میں کام کرنے کا تجربہ ہے وہ اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان کارکنوں میں محنتی کارکنوں کا تناسب دوسروں کے مقابلے میں کم ہے۔ اسی طرح تعلیمی شعبوں میں جہاں سخت محنت کی ضرورت ہے مسلمان طلبا نسبتاً کم نظر آتے ہیں۔ تاریخی اسباب کی وجہ سے مسلمان انتظامیہ میں پیش پیش رہے صنعت تجارت اور زراعت کو ثانوی حیثیت حاصل ہوگئی۔ نئے حالات میں صنعت تجارت اور زراعت کو اولین حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ مسلمان دستکار اور اہلِ حرفہ بہت بڑی تعداد میں ہیں اور صناعی اور کاریگری میں اپنا جواب نہیں رکھتے مگر چونکہ منظم نہیں ہیں اس لئے استحصال کا شکار ہیں اور بیچ کا آدمی سارا منافع بٹور لیتا ہے۔ نئی دہلی میں ٹیلرنگ کی بڑی سے بڑی دکانوں میں مسلمان کاریگروں کی اکثریت ہے۔ ہوٹل کی صنعت میں کھانے پکانے والے کی مانگ ہے۔ اسی طرح مسلمان ہر صنعت میں موجود ہیں، مگر کاریگر یا ملازم کی حیثیت سے، ان کی اپنی دکان، اپنے ہوٹل، اپنا شوروم خال خال ہیں۔ جنوبی ہندوستان، مہاراشٹر اور گجرات میں کچھ مسلمان صنعت کار مل جائیں گے مگر شمالی ہندوستان میں شیروانی انٹرپرائز اور ہمدرد کے علاوہ بڑے صنعت کار مشکل سے ملیں گے۔ مسلمانوں کی کوئی پبلک لمیٹڈ کمپنی آج تک قائم نہ ہو سکی۔ مالیاتی اداروں میں بھی مرکنٹائل بنک ایک چھوٹا سا ادارہ ہے جس کی سرگرمیاں بعض علاقوں تک محدود ہیں۔ اس کے مقابلے میں پنجاب اور سندھ بینک نے (جسے اب سرکاری تحویل میں لے لیا گیا ہے) جو مفید خدمات انجام دی ہیں ان سے سبھی واقف ہیں۔ مسلمانوں کے لئے ایک خصوصی مالیاتی ادارے کی سخت ضرورت ہے جو صنعت اور تجارت کے لئے سرمایہ اور رہنمائی دونوں مہیا کر سکے۔

باقی صفحہ ۲۸۸ پر

شعرستان کی نئی نسل

رضا نقوی واہی

ملک کے شاعروں نے اپنی ذمہ داریوں سے بچنے اور نقادوں کی دسترس سے محفوظ رہنے کے لئے ایک ہوم لینڈ کی مانگ کی جسے حکومت نے منظور کر لیا۔ ملک کے چند غیر آباد جزیروں کو ریاستِ شعرستان کا نام دے دیا گیا اور ملک کے دو کروڑ [illegible] شعر خوشی خوشی وہاں بس گئے۔ لیکن یہ حضرات اپنے بال بچوں کو ساتھ نہیں لے گئے تھے کیونکہ اولاً تو وہ شاعر نہیں تھے دوسرے یہ کہ ان کی موجودگی سے مشقِ سخن میں خلل پڑتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا کی تعداد منجمد ہو کر رہ گئی اور یہ خطرہ محسوس کیا جانے لگا کہ کہیں یہ مخلوق نیست و نابود نہ ہو جائے چنانچہ گھٹتی ہوئی آبادی کو روکنے کا حل تلاش کیا گیا۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مملکت میں غیرِ شاعر کا جو آنا تھا محال
ساتھ لاتے ہی نہیں تھے اہلِ سخن اپنے عیال

خلد سے نکلے تھے آدم ساتھ حوا کو لئے
جس سے فطرت کے توازن میں نہ آیا اختلال

جوشِ آزادی میں لیکن اہلِ شعرستان کو
اپنے مستقبل کا آیا ہی نہیں مطلق خیال

نسل کیوں کر بڑھ سکے گی بنتِ حوا کے بغیر
قوم ساری جب مجرد ہو تو کیا ہوگا مآل

زندگی کے اس اہم پہلو پہ سوچا ہی نہ تھا
ذہن میں ان کے نہ آیا تھا یہ بنیادی سوال

ایک مرتا ہے تو دس ہوتے ہیں پیدا ہر جگہ
شاعروں کی اس ریاست میں مگر الٹا تھا حال

کچھ گروہی جنگ سے کچھ سختیٔ حالات سے
رات دن مرنے لگے جب شاعرانِ خستہ حال

منجمد تو تھی ہی آبادی، فشارِ موت سے
مملکت میں پھیلنے بڑھنے لگا قحط الرجال

قوم کے اربابِ حل و عقد مشکل میں پڑے
کیسے روکا جائے آبادی کا پیہم زوال

صفحۂ ہستی سے مٹ جائے نہ قومِ شاعراں
ہو رہا تھا دمبدم پیدا دلوں میں احتمال

اک پرانے وقت کے شاعر کو سوجھی دفعتاً
پڑھ چکے تھے جو کسی قصے میں جل پریوں کا حال

جو اڑا کر لے گئی تھیں اپنی شہزادی کے پاس
ایک شہزادے کو سندر تا میں تھا جو بے مثال

کیوں نہ گہرے پانیوں میں انکی کی جائے تلاش
کیوں نہ جل پریوں سے ہو اہلِ سخن کا اتصال

چند غوطہ خور شاعر اس مہم پر چل پڑے
لے کے مچھلی مارنے کے درجنوں مضبوط جال

اتفاقاً ایک دن ہو کر رہے وہ کامیاب
اک نئی مچھلی پکڑ لائے وہ اصحابِ کمال

نصف دھڑ تھا آدمی کا نصف دھڑ مچھلی کا تھا
ناک نقشہ عورتوں کا لانبے لانبے سر پہ بال

روپ میں مچھلی کے بالآخر وہ ظاہر ہو گئی
جل پری، اب تک جو تھی اک پیکرِ خواب و خیال

ایک شاعر نے، کہ جس کے جال میں آئی تھی وہ
جل پری کو اپنے حق میں کر لیا فوراً حلال

اک نئی مخلوق اس کے بطن سے پیدا ہوئی
ساتھ شاعر کے ابھی گذرا تھا کوئی نصف سال

یہ نئی مخلوق یعنی وارثِ اہلِ سخن
خشک و تر کا ایک سنگم تھی عجیب [illegible]

جسم تھا انسان کا فطرت مگر مچھلی کی تھی
دیکھ کر پانی لگاتا تھا چھلانگیں نونہال

دو برس میں ہو گئی نشو و نما اس طفل کی
عام انساں کے لئے درکار رہتے بیس سال

مادری بھاشا میں اپنی شعر بھی کہنے لگا
گرچہ ان اشعار کا مطلب سمجھنا تھا محال

پیروانِ افکارِ جالب و احمد ہمیش
اس نئی مخلوق سے ملتی تھی جنکی بول چال

بس وہی حضرات سر دھنتے تھے سن سن کر کلام
بس انہی حضرات سے مانوس تھا وہ نونہال

اختلاطِ شاعر و ماہی کا پہلا تجربہ
قوم کے حق میں بنا المختصر اک نیک فال

پھر تو گہرے پانیوں کو چھان مارا قوم نے
پھر تو سب کے دل میں آیا گھر بسانے کا خیال

پھر تو ہر شاعر کے حصے میں ملی اک جل پری
پھر تو ہر گھر میں نظر آنے لگے اہل و عیال

شاعروں کی نسل نو تیار پھر ہونے لگی
محفلِ شعر و سخن گلزار پھر ہونے لگی

بقیہ ہمارے مسائل

مسلمانوں میں بنیادی طور پر ایک نفسیاتی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں مذہبی رہنماؤں کو بھی نہایت اہم رول ادا کرنا ہے۔ انھیں مذہب کا ایک ایسا متوازن نظریہ پیش کرنا چاہئے جو دین اور دُنیا کو دو خانوں میں نہ بانٹے، جو زندگی کی جدوجہد میں حصّہ لینے کا حوصلہ پیدا کرے۔ مایوسی اور دل شکستگی سے بچنے اور معاشرے کے بارے میں ایک صحت مند رویہ اپنانے پر زور دے۔

ایسے سماجی کارکنوں کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کو بڑی تعداد میں مقابلے کے مختلف امتحانوں میں شریک ہونے کے لئے آمادہ کریں۔ ایسے رفاہی اداروں کی ضرورت ہے جو ٹریننگ کا انتظام کریں اور سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ لڑکیاں تعلیم حاصل کریں تاکہ مسلم معاشرے میں تعلیم کی برکتوں کے طفیل صحیح توازن پیدا ہو اور خوراک، لباس، رہن سہن، تعلیم اور شادی بیاہ، ختنہ و عقیقہ کے اخراجات کی معاشی اہمیت اور ضرورت کے لحاظ سے طے ہوں، جذباتیت کے تحت نہیں۔

بقیہ ہم کہ مجاہد اردو

... سا قرار دیا جائے گا اور انعام و اکرام سے نواز ا جائے گا۔ کیونکہ ریاستی سرکاروں کی اردو اکیڈمیاں ہر قسم کی اردو کتابوں پر آنکھ بند کر کے انعام دینے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھی ہیں، بڑا اور اچھا انعام حاصل کرنے کے لئے ممبران جیوری کے ساتھ اچھے تعلقات کی شرط لازم ہے کیونکہ بڑے انعامات کے لئے تخلیق کی بجائے صاحب تخلیق کو تعلقات کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے، جب سے اس نکتے کا ادراک ہوا ہے، ہم نے اس بات کو سختی سے نہ صرف خوشگوار بلکہ برادرانہ اور ... سلسلے شروع کر دیئے ہیں۔

قارئین گرامی، اردو کے تئیں یوں تو ہماری خدمات کی فہرست طویل ہے لیکن ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں، اب آپ ہی حلفاً کہئے کہ کیا ہم صحیح معنوں میں مجاہد اردو کہلائے جانے کے مستحق نہیں ہیں۔



بار ہا ٹوٹ کر بنا ہوں میں
ڈوبتی ناؤ کی انا ہوں میں
خود ہی ملزم ہوں، خود ہی منصف بھی
اپنے ہی رو برو کھڑا ہوں میں
میری مٹی بھی کیا عجب شے ہے
برف باری ہے۔ جل رہا ہوں میں
جس طرف سے بھی آئے، آئے ہوا
اپنے گھر کی طرح کھلا ہوں میں
جن پہ رنج و الم کے پہرے ہیں
ان گھروندوں کا مدّعا ہوں میں
پھر رہا ہوں ازل سے خانہ بدوش
اس بگولے کی انتہا ہوں میں
حرف آئے گا مجھ پہ کیا ناداںؔ
ایک درویش کی صدا ہوں میں

اندر سروپ دت ناداںؔ

ارزاں کچھ اس صدی میں ہوا اس قدر لہو
ہر بام و در پہ آتا ہے ہم کو نظر لہو
مخصوص ہے مرے لئے انعامِ وقت یہ
چہرے پہ ہیں خراشیں تو ہے جسم پر لہو
ایسا لگا تمدّن و تہذیب مر گئی
غارت گری کی جب بھی لایا خبر لہو
ہر فکر، ہر خیال ہے زخمی، کہ ان دنوں
خواہش لہو ہے، خواب لہو ہے، نظر لہو
جب بھی گرے زمین پہ شعلے بھڑک اٹھیں
پیدا کرے زمانے میں ایسا اثر لہو
سب کے بدن میں ایک طرح دوڑتا ہے جب
پھر کیوں ہر اک نظر میں نہیں معتبر لہو
شاید زمیں پہ اب کہیں حاصل نہیں پناہ
مدّت سے ڈھونڈتا ہے خلاؤں میں گھر لہو!

ظہیرؔ غازی پوری

جدید افسانہ

شہزاد منظر

ادب کی افادی اور مقصدی تخلیق کی تاویل کی بات ہمارے یہاں ایک عرصے تک رجعت پسند حلقوں میں ترقی پسند ادب اور ادیبوں پر کیچڑ اچھالنے کا سب سے سستا نسخہ بنی رہی۔ بات یہ تھی کہ افادیت اور مقصدیت کا تصور ہوا میں پیدا نہیں ہوتا۔ افادیت اور مقصدیت برائے خود گمراہ کن الفاظ ہیں۔ ان میں معنویت معاشرہ (یعنی انسانوں) کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے۔ ادب کی ترقی پسند تحریک نے جب اس حوالے سے فنی اور ادبی تخلیق کی بات چھیڑی تو ظاہر تھا کہ اس میں سارے ہی معاشرتی پہلوؤں سیاست، اخلاق، حسن و جمال کی تاریخ، معیشت، معاشرت، تاریخ، مذہب وغیرہ وغیرہ میں جاری و ساری نظام اور انفرادی سطح پر نظریات، تصورات اور اقدار و روایات کے سلسلے میں ردِ عمل کا آنا ضروری تھا۔ یہ بات ہم سب ہی جانتے ہیں کہ اس صدی کی تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے برصغیر کے سماجی اور معاشرتی ڈھانچے میں افادیت کا تصور، ماضی کی جذباتی رسوم و رواج پرستی کی جگہ لے چکا تھا۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ افادیت پسند معاشرہ وجود میں آنے لگا تھا۔ ترقی پسند ادب نے اس افادیت کے تصور کو سماجی نفسیات کے دائرے سے نکال کر جب نظریاتی مقصدیت سے ہم آہنگ کیا تو رسوم و رواج اور روایت پسندوں سے لے کر مجرد افادیت پسندوں تک کی صفوں میں بھونچال آ گیا۔

پہلے پہل اس ادب پر روایات سے بغاوت اور ماضی کو تہس نہس کرنے کے الزامات عائد ہوتے رہے، جب اس سے بھی بات نہ بنی تو ادب دشمنی کا نعرہ لگایا گیا (یعنی ان کے نزدیک نظریاتی ادب، ادب کے زمرہ ہی سے خارج ہوتا ہے) اور آخر آخر میں نعرہ بازی اور سیاست گردی کا ادب ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ ترقی پسند ادیب نہ ادب میں حسن تخلیق سے منکر تھے نہ بے شعور روایت دشمن اور نہ اندھا دھند ماضی شکن، بلکہ وہ ادب کا معاشرہ سے ایک سا تعلق اور رشتہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو بحیثیت مجموعی معاشرہ کی صحتمند تعمیر میں ہاتھ بٹا سکے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ تعمیرِ معاشرہ میں ہمیشہ وہ منفی تخریبی قوتیں زد میں آتی ہیں جو معاشرتی بگاڑ کی ذمہ دار ہوتی ہیں اور اپنی منفعت اور اپنے مفاد کی خاطر نہ کبھی اصلاح احوال چاہتی ہیں اور نہ اصلاحِ احوال کی کوششوں کو پسند کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اصلاح و بگاڑ کی مثبت اور منفی قوتوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کا قصور یہ تھا کہ وہ اس ٹکراؤ میں مثبت قوتوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ترقی پسند ادب کے معاشرتی رشتوں کی بنیاد یہی جانبداری تھی۔ وہ محض لذت تخلیق کے نام پر ادب کی فعالیت یعنی افادی مقصدیت کا جھٹکا نہیں گوارا کرتے تھے، اس لیے معاشرے کی منفی قوتوں کے ساتھ لذتِ تخلیق کے رسیا بھی ان کی مخالفت پر اُتر آئے۔

ترقی پسند ادب کے ان تعمیری اور نظریاتی رشتوں اور رجعت پرستی کے مجادلے کی یہ روداد چالیس پینتالیس برس کے عرصے کو محیط اس جنگ کا نقشہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے جس کے آخری نتائج کو سامنے رکھیے تو آج کی صورت حال یہ بنتی ہے کہ ترقی پسند ادیب تو آج بھی معاشرے کی منفی قوتوں سے برسرِ پیکار نبرد آزما ہے، لیکن معاشرہ کی منفی اور طاغوتی قوتوں کے تخریبی مظاہروں سے بے تعلق اور بازوئے قاتل کو نظر نہ لگ جانے کی دعائے خیر مانگنے والوں میں سے کچھ تو الف لیلوی داستانوں کی غلام گردشوں میں جا پناہ گزیں ہو گئے اور کچھ دھرتی پوجا کا Cult تراش کر اگلے پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کیلیے "میں" کے گنبد میں حصار بند ہو گئے۔ ذرا سا غور سے دیکھیے تو یہ بات صاف سمجھ میں آ جائے گی کہ توشہ اور گوشہ مسافرت بہر حال دونوں جگہ مقصدیت اور افادیت سے خالی نہیں ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اس افادیت اور مقصدیت کا ادب پڑھنے والوں اور معاشرہ کی فکر سے زیادہ ذاتوں کے نہاں خانوں کی تاریکیوں کو شہرت کے اُجالوں سے اُجالنے کی تنگ حدود میں بندھی ہوئی ہیں۔ یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے۔

رہ گیا ترقی پسند ادب میں افادیت اور مقصدیت کا تصور تو ایک بات اور سُن لیجیے کہ اس سے مراد نکوس کی مائیکرو فائینڈ اسپرین قسم کی کوئی دوا تجویز کرنا کبھی نہیں تھی کہ آج کوئی ترقی پسند ادیب افسانہ، نظم اور غزل لکھے گا تو اس کے پیچھے ہی روتے بسورتے چہرے مسکراہٹوں کے پھول کھلانے لگیں گے۔ جس بات کو اس ضمن میں رجعت پسندوں نے ترقی پسند ادب پر حملہ کرنے کے لیے دمدموں اور خندقوں کے طور پر استعمال کیا وہ "سُرخ سویرا" "سُرخ پرچم" اور "نیا انسان" وغیرہ ایسی دو چار ادبی ترکیبیں تھیں جو ترقی پسند ادب میں مستعمل رہی ہیں نہ پہلے کبھی ترقی پسند ادیبوں نے ان کے دماغ میں انفعالی منطق کا سہارا لیا نہ آج اس کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ تخلیق ادب انسانی عمل ہے، جس میں عقل اور شعوری ادراک و اکتساب کے ساتھ ساتھ انسانی احساسات اور جذبات کا عمل دخل فطری بات ہے۔

احساسات اور جذبات کی ابتدائی کیفیتوں کے بغیر تخلیقی تحرک نہ ممکن ہے نہ قرینِ قیاس و فہم۔ ہر دور میں تخلیقی عمل کی اس کیفیت نے لکھنے والوں کو اظہارِ مدعا کے لیے دو راستے فراہم کیے ہیں۔ یا تو لکھنے والا پورے طور پر پہلے سے موجود و منتقل تراکیب، اصطلاحات، تشبیہات اور اشاروں کنایوں کے حامل الفاظ یا پھر ان کے ساتھ ساتھ روحِ عصرِ موجود کی مناسبت سے کچھ نئی تراکیب، تشبیہات، اظہارات اور سمبلز وضع کر لیتا ہے۔ ترقی پسند ادب میں مذکرہ بالا تراکیب کا بھی یہی پس منظر ہے کہ وہ بھی روحِ عصرِ موجود کے کلیدی اشاروں کے سوا نہ خالی خولی رومانٹیزم تھی، نہ مبالغہ آمیزی اور نہ معاشرے کے لیے کسی نسخۂ کیمیا کی تجویز۔ اردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک کے علاوہ چار پانچ اہم موڑ اور بھی آئے ہیں جن کی نمائندگی میر، نظیر اکبر آبادی، غالب، اکبر الٰہ آبادی اور اقبال کرتے ہیں۔ کیا انھوں نے اپنے عہد کے کلیدی اشارے وضع نہیں کیے؟ اور کیا آج کا ادب اور شعر اس عمل سے خالی اور عاری ہے؟

جدیدیت پسند ادب کے معاشرتی رشتوں کی ان بنیادی باتوں کو سمجھنے کے سلسلے میں اٹھائی گئی ہیں جن کو مسخ کر کے نوجوان نسل کے سامنے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ ان اشاروں سے کہ جو اوپر کیے جا چکے ہیں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ادب کے معاشرتی رشتے دراصل اس ربط و ضبط کا احوال تو یوں سمجھ لیجیے کہ یہ محض ایک طرفہ خیرسگالی کا مشن نہیں ہے کہ جس کا جب جی چاہے معاشرے کو اپنی ہمدردی اور واہ واہ کے دو ٹکڑوں سے نواز دے جب جی چاہے اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ جائے یا وہ معاشرہ کا حقہ پانی بند کرنے پر اتر آئے۔

یہ بات کتنی سامنے کی ہے کہ ادب کے ناطے سے انسان خواہ کوئی حیثیت رکھتا ہو یعنی یہ کہ خواہ وہ لکھنے والا یا ادب کا موضوع (یعنی کردار) جب ہم اس کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنا ہوتی ہے کہ خود انسان اور انسان کے ذاتی تعلقات میں کتنی غلط فہمیاں، کتنی رنجش اور دشمنیاں اور ایسے ہی کتنے درجنوں پیچ و خم ہوتے ہیں۔ اور یہ سب کیفیتیں مل جل کر جب ایک معاشرہ ہمارے سامنے لاتی ہیں تو یہ انفرادی باتیں انفرادی اور نجی ہوتے ہیں بلکہ معاشرے کی اجتماعی نفسیات کا نہایت الجھا ہوا روپ دھار جاتی ہیں۔ گویا ہزار پگڈنڈیوں کا جال لیے ہوئے ایک انتہائی دل کش باغ لکھنے والے کے سامنے ہوتا ہے جس میں قدم قدم پر راہ بھٹک جانے کے دل شکن امکانات بھی ہزار پگڈنڈیوں والا جال ہوتا ہے اس طلسماتی جال سے نکلنے کا راستہ صرف ایک ہی ہے کہ لکھنے والا اہم عصر تاریخ کے اس پہلو پر نظریں جمائے رکھے جو معاشرے کے حوالے سے انفرادی نفسیات، انفرادی رویّوں اور انفرادی سطح پر قول و فعل کی تشکیل اور تعمیر پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے کہ یہی تمام عناصر معاشرے کی اجتماعی نفسیات کے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ ادب کے فتویٰ گیروں کی نظر میں ترقی پسند ادیبوں کا سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ وہ ان کے بتلائے ہوئے نسخۂ کیمیا، یعنی "نہ رو کے لیے راہ کی ہمواری شرطِ سفر ہے" پر عمل نہیں کرتے اور معاشرے سے سطحی روابط کا اعلان نامہ تحریر کرنے کے بجائے اس کی ناہمواریوں کی نشاندہی کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

ترقی پسند کا سکھایا ہوا یہی سبق نئی نسل کے حصے میں آیا۔ چنانچہ ہماری جدیدیت پسند ادبی نسل کے لہجے سے روایتی مروت اور نمائشی اخلاق کی غیر موجودگی ادب میں شخصیت کش فتویٰ گیروں کے لیے بالخصوص اور بڑی عمر کے لیے بالعموم خاصی سوہانِ روح بنی ہوئی ہے۔ یہ صورتِ حال ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور یعنی "انگارے" کے دور کی یاد تازہ کرتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ جدیدیت پسند ادیبوں کا نقطۂ آغاز بھی اسی "خلاف ورزی" سے ہوا ہے جو جدید اور قدیم کی آویزش میں ہمیشہ ہی مقہور و مردود رہا ہے۔ دوسری بات اس ادبی رویّہ میں قابلِ توجہ یہ ہے کہ یہاں بھی مصلحینِ ادب کی طعنہ زنی کے باوجود پوری جرأت کے ساتھ یہ نسل اپنا ادبی مواد گرد و پیش کی ترش و تلخ حقائق ہی سے اخذ کر رہی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں دھرتی پوجا یا "حبِ وطن از ملکِ سلیمان خوشتر" کا خالی قومی نعرہ ٹیپ کا بند نہیں ہے وہ اس سرزمین کو اپنے پاؤں کے نیچے زندہ حقیقت جان، مان اور سمجھ کر آگے بڑھنا چاہتی ہے لیکن اس کے نزدیک اس آگے بڑھنے میں کچھ روڑے اور رکاوٹیں ہیں۔ اسی ہی نسل کے ایک حساس فرد نے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ اس تلخ حقیقت کو کچھ اس طرح بیان کیا تھا:

> "اس کٹے پھٹے شہر میں کچھ لوگ اپنے زندان سے بھاگ نکلتے ہیں تو معاشرے کی سرخ بتی ان کا راستہ روک لیتی ہے۔ وہ واپس زندان میں گھس آتے ہیں اور خوب شور مچاتے ہیں، غل غپاڑہ کرتے ہیں۔ ذہنی اور جسمانی ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ایک بحران کھڑا کر دیتے ہیں جس کی آواز ادب میں بھی سنائی دیتی ہے جس سے شریف اور نستعلیق قسم کے لوگ مضطرب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مریضانہ عمل ہے لیکن اس مریض کی عیادت کو نہیں جاتے اور اور نہ ہی پھول پیش کرتے ہیں بلکہ چالان کرنے کے لیے لپکتے ہیں۔"

(اصغر ندیم سید۔ روزنامہ امروز ملتان۔ ۱۰ دسمبر ۸۵ء)

ان اقتباسوں کا منشا صرف بتانا نہیں ہے کہ یہ آواز کسی کا ذاتی مسئلہ ہے۔ یہ آواز پاکستانی معاشرے کے جدیدیت پسند لکھنے والے نوجوانوں کی آواز ہے اور لہٰذا یہ آواز اس اجتماعی احساس کی آواز ہے جو یہ نسل اپنی تحریروں کے ذریعے، اور ان تحریروں کے پس منظر کے طور پر بلند کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے میں اس آواز کو قابلِ اعتبار سمجھتا ہوں اور لائقِ اعتماد بھی۔ اور اعتبار اور اعتماد کیے بغیر ابہام و تعمیم کا کوئی دوسرا ہے بھی نہیں کہ بے اعتمادی اور نا اعتباری فاصلوں کی خلیج کو پاٹتی نہیں بلکہ اور زیادہ کاٹتی ہے۔

اس آواز میں اس زخمی روح کا نغمہ ہے جو معاشرے کی سرخ بتی یا احتساب کے خلاف احتجاج کی چیخ بنتی سنائی دیتی ہے۔ اس کی بیباکی، بے مروتی یقیناً بہت سوں کے نزدیک بد اخلاقی گردانی جا رہی ہے، مگر مروت، اخلاق اور نیازمندی اچھے برخوردار کی نشانیاں تو ہوتی ہیں، اچھے ادب اور ادیب پیدا کرنے کے سلسلے میں یہ نشانیاں منافقت کی میٹھی چھری سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ یوں بھی یہ نوجوان لوگ ہیں جن کے قلموں سے حکایاتِ سعدی کا نزول بے عمر کی راگنی ہوگی اور تلخ و ترش کی زبان شیر و شکر بنانے کے لیے نوجوانی کا ظرف، خالی برتن کے مانند ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ آج کے نوجوانوں نے اپنی بات ہر عہد کے باغی نوجوان کی زبان میں اٹھائی ہے، ساٹھ برس کے بعد کرم خوردہ بوڑھے کی بیٹھی آواز میں نہیں اٹھائی۔

آج کی نسل سراسر مظلوم اور مقہور ہے۔ چلیے ٹھیک ہے سوال یہ ہے کہ اس صورت میں اس مظلوم اور مقہور نسل کے تخلیق کردہ ادب اور اس کے معاشرتی رشتوں کی سمت کیا متعین ہوتی ہے جبکہ یہی کہ مظلوم معاشرے کے ساتھ ایک اور مظلوم کی کارگزاری؟ اب دونوں ہی رو رہے ہیں تو بات کیسے آگے بڑھے؟ ایک پہلے کی مظلومیت میں اپنی مظلومیت کا اضافہ کیا بات ہوئی؟ اصل بات تو ظلم کا مداوا ہے، وہ کیسے ہو؟ بات ساری یہ ہے کہ اکتساب اور ادراکِ حقیقت کا چھوٹا حصہ۔ مگر جب وہ اپنے معاشرے کے متعلق اظہارِ حقیقت کا فرض اپنے ذمے لیتا ہے تو پہلی فرصت میں اسے معاشرے میں ظلم و جبر کی طاقتوں کا بے رحم نقاد بننا پڑتا ہے اور دوسرے یہ کہ اپنی ذات کو مسئلہ بنانے کے عمل سے چھٹی پا لینا ہوتا ہے۔ سو اگر جدید نسل کے نوجوان لکھنے والے اپنے عہد اور اس کی مظلوم نسل کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں، ظلم مٹانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انھیں اپنی مفعول جانبداری کو ختم کرکے فعال قوت بننا چاہیے۔ اگر سارے غموں کا مداوا غم کھاتے رہنا ہوتا تو رونے اور بسورتے رہنے والے لوگ اس طبقۂ ارض کے عظیم انقلابی ہوتے۔

جدیدیت پسند نسل مدعی ہے کہ وہ نئی نسل کی احتجاجی مظاہروں (شور، غل غپاڑہ، ذہنی، اخلاقی اور روحانی ضابطوں کی خلاف ورزی اور بحران پیدا کر دینا وغیرہ) کو قلم بند کرکے دراصل معاشرہ کی احتسابی "سرخ بتی" کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کر رہی ہے۔ اس دعوے کا یہ رخ تو دیکھا جا چکا ہے کہ اس طرح سے آج کا جدیدیت پسند لکھنے والا خود انفعالی صورتِ حال کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر وہ اپنے سے الگ معاشرے کی جدید نسل کے اس احتجاجی رخ کو آدھے پونے، نامکمل، انفعالی اور مجہول قسم کے انسانوں کا احتجاج ثابت کرنا چاہتا ہے تو پھر اس کا اصل احتجاج کس کے خلاف ہے؟ یہ وار خود اس نئی نسل کے اوپر پڑتا ہے، جس کی وکالت کا بیڑا وہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ایک تیسری صورت یہ ہے کہ وہ پرانی نسل کے "شریف اور نستعلیق" لوگوں کو آدھا پونا اور مجہول نسل کے لوگ سمجھتے ہیں جو نئی نسل کی راہ روکے کھڑے ہیں۔ "اظہارِ حقیقت" کی یہ اتنی بہت سی تاویلات کیوں بن رہی ہیں؟ جدیدیت پسند نسل کو خود سے بھی اس بارے میں پوری سنجیدگی سے سوال کرنا چاہیے کہ اس کا اصل نشانہ کیا ہے؟

موجودہ صورتِ حال سے جو بات واضح ہوتی ہے اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ابہام کی ذمہ داری اس پیرایۂ اظہار پر بھی ہے جو جدیدیت پسند ادیبوں نے شوقِ جدت اور شوقِ امتیاز کے لیے اختیار کر رکھا ہے۔ اس پیرایۂ اظہار کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ تپائی پہ رکھے ہوئے گھڑے اور عورت کو ہمشکل کر دیتی ہے۔ صاف لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ اس پیرایۂ اظہار نے حقیقت اور مجاز کی سرحدوں کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ دوسری اہم بات ادراکِ حقیقت میں اس نقطۂ نظر کی نشاندہی کا فقدان ہے جو حقیقت کو مجاز اور رومانویت کے خول سے باہر نکال کر اس کی اصل شکل سے روشناس کرا دیتا ہے تاکہ ان معاشرتی بدشکل حقیقت کے پس پشت ان محرکات اور اسباب و علل کا پتہ چل سکے جو سات پردوں کے پیچھے رہ کر بھی ان کو جنم دے رہے ہوتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر جدیدیت پسند ادیب واقعتاً انسان کو آج کے معاشرے کی احتسابی سرخ بتی کا اس ہی قدر شکار سمجھتے ہیں جتنا کہ وہ اپنی ادبی تصویر میں دکھاتے ہیں تو پھر اس سنگین صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے اس صورتِ حال کو جنم دینے والے عناصر کی نشاندہی سے کیوں آنکھیں چرا رہے ہیں؟ کیا وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اس صورتِ حال کی ذمہ داری آج کی جارحیت پسند سرمایہ داری اور ان کے گماشتوں کی پیدا کی ہوئی ہے؟ اگر وہ باخبر

[illegible] انضمامی تحریکات عمل" نہ سہی ایک بہت بڑی سازش کا شعوری یا غیر شعوری حصہ تو بن ہی جاتا ہے۔

یہ سازش "خود جدیدیت" کا وہ ایکٹ ہے جس کے لیبل کو آج کی ادبی اور غیر ادبی نسل نے اپنا طرۂ فرق و امتیاز بنا رکھا ہے۔ نوجوان نسل کی جدیدیت پسند نسل اس تحریک کی تاریخ سے باخبر ہوتی کہ اس کا آغاز کم و بیش اب سے دو سو برس پہلے انقلاب فرانس کی راہ ہی دراصل اس دور کے ان جدیدیت پسندوں نے ڈالی تھی جنھیں انسائیکلوپیڈیسٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ تحریک کیتھولک اور پروٹسٹنٹ چرچوں کی چپقلش کے نتیجے میں فرانسیسی معاشرے کے اندر مذہب کی راہ سے داخل ہوئی ہے۔ ادب میں اس کا داخلہ فن مصوری کی اس تحریک کی وساطت سے ہوا جو Impressionism یا تاثریت کی تحریک کہلاتی ہے۔ اس تحریک کا محرک کیمرہ کی ایجاد تھا، جس کے ردعمل کے طور پر برش اور رنگوں سے پینٹ کرنے والوں نے کیمرہ کی حسن کارکردگی (Precision) کا مقابلہ اپنی تصویروں میں جزویات کشی اور رنگوں کے نت نئے امتزاجات سے یوں کرنا چاہا کہ ان کی بنائی ہوئی تصویریں زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائیں اور کیمرے کا فن پھیکا پڑ جائے۔ بعد کو اس میں تحریک سے الگ سے 'Post-Impressionists ،Vorticism۔ (ویشانیت) دوآریت، فیوچرزم نے اور کیوبزم وغیرہ کی تحریکیں پھوٹیں اور اس طرح سے یہ رجحان فراریت پسندی کے جذبوں میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ پھر ایک عرصے تک عالمی سطح پر ترقی پسند تحریک نے ان فراری تحریکوں کا مقابلہ کر کے ان کو گمنامی کے گوشوں میں ڈال دیا لیکن موجودہ صدی کے نصف آخر سے ترقی پسند ادب کی تحریک سرمایہ دار اور استعماریوں کے [illegible] بنا [illegible] تحریک کمزور پڑنا شروع ہوئی تو سرمایہ دار اور استعمار پسندوں نے نئی نسلوں کو لایعنیت اور بے سمتی کے جال میں اسیر کرنے کی خاطر جدیدیت کے ایکٹ کو پھر سے فعال کر دیا۔ چونکہ ان کے مقابلے کی مزاحمتی تحریکیں غیر مجتمع ہوتی چلی جا رہی تھیں اس لیے جدیدیت کے ایکٹ کو کھل کھیلنے کا موقع بھی ملتا چلا گیا موجودہ دور میں اس کی تجدید جدید جدیدیت کو استحصالی قوتوں نے گھٹیا (cheap) بنا کر کپڑوں، جوتوں اور بالوں کے فیشنوں، رفتار اور گفتار کے انداز تک میں تحلیل کر دیا۔ ادب میں موجودہ کیفیت یہ ہے کہ آج کی جدیدیت، ایمپریشنزم سے لے کر ان تمام ذیلی رجحانات کا ملغوبہ بن کر سامنے آئی ہے۔ جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔

اتنی الجھی ہوئی ادبی تحریک کو ہوا دینے کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جدید معاشروں کی انتہائی سائنسی اور سائنٹفک فضا میں پرورش پانے والی نسل کے ان تمام امکانات کو ختم کر دیا جائے جن کے سہارے یہ نسل اس "شریف اور نستعلیق" قسم کی نسل کا تختہ الٹ دے جو سرمایہ داروں اور استعماریوں کے حلقوم پر پھانسی کا پھندا بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ نہایت عیاری سے یہ خفیہ ہاتھ تو جدیدیت کی پرورش میں مصروف ہیں اور ان کے گماشتے ایک ہی نسل کے دو گروہوں کا آمنا سامنا کرائے ہوئے ان کی انقلابی قوتوں کا زیاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ اب یہ نسل یا تو ذات کی ٹوٹ پھوٹ پھر معاشرے میں آدھے اور پونے بے جہت [illegible] اور بے مقصد لوگوں کی پیدائش کا مرثیہ لکھنے میں مصروف اور مگن ہے ـــــ اور بعض ذاتی محرومیوں کے اظہار کو معاشرے میں انقلاب پسندی کا گیت سمجھ کر گا رہی ہے۔

آج کی نسل کے جدیدیت پسند ادیبوں کی نظروں سے نہ جانے یہ حقیقت کیوں اوجھل ہے کہ جہاں سے یہ جدیدیت کی تحریک آئی ہے۔ وہ وہی خطے ہیں جہاں ذات کی ٹوٹ پھوٹ کرانے کا منصوبے زرکثیر کے صرف سے بنتے ہیں اور اس منصوبے کی ڈھکی چھپی نیتوں کو وہ جدیدیت کے نام پر فروخت کرتے ہیں۔ ان کے اس حربے کو استعمال کر کے خود انھیں شکست دینا ممکن نہیں ہے البتہ اس حربے کا آلۂ کار بن جانا بہت سہل ہے۔ اور نہ جانے یہ بات بھی جدیدیت پسند نوجوانوں کے ذہن سے کیوں محو ہے کہ مارکس نے خود اپنے فلسفے کی بنیاد شخصیت کی اس ہی ٹوٹ پھوٹ کے مداوے اور یکتائی شخصیت یعنی Wholeness of man کی تعمیر کے اصولوں پر رکھی ہے۔ مارکسزم میں ذرائع پیداوار کو عوام کے ہاتھوں میں دے دینے کے مطالبے کی اصلیت یہی ہے کہ محنت فروخت کرنے والے کے پاس جب ذرائع پیداوار یا محنت کو عملی شکل دینے والے ذرائع ہوں گے تو اس کی شخصیت مشین اور محنت خریدنے والے ظالمانہ رویوں سے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوگی۔ ہم ذرائع پیداوار میں صرف مشینوں کو گنتے ہیں

آج کی جدیدیت پسند نسل اگر ان تلخ حقائق کو سامنے رکھے ہوتی تو اس کی ادبی تخلیقات کے معاشرتی رشتے ابہام پسندی کے نہیں۔ دوٹوک حقیقت کے اظہاری رشتے ہوتے، ان کے ادبی نقطۂ نظر میں حقائق سے اغماض نہیں بلکہ ان سے آنکھیں چار کرنے کی سکت ہوتی اور ان کا ادبی لہجہ گمراہی کے ایکٹ چلانے والوں کا نادانستہ پردہ پوش نہیں بلکہ دانستہ ان کا گریبان پکڑ لینے والا لہجہ ہوتا۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہے تو یوں لگتا ہے کہ جو نسل دن رات معاشرے میں حرص و ہوس کی گردان کرتی رہتی ہے، اس کے اندر لو کی دعا مانگنے کی جرأت ہی سلب کر لی گئی ہے۔


MICO MICO MICO MICO
MICO MICO MICO MICO
MICO MICO MICO MICO
MICO
REGD
MICO
10
MICO
41
LEVER LOCKS
MICO MICO MICO MICO
MICO MICO MICO MICO
MICO MICO MICO MICO

[illegible]

شماره [illegible] ۳۲ [illegible]

پندرہ روزہ

چنگاری

دہلی

ایڈیٹر

جمیلہ احمد

ادبی حصے کی ترتیب

بشیر احمد

انیس احمد خاں

شمارہ نمبر —— ۲۷

قیمت: دو روپیے

سالانہ: ۴۵ روپیے ۔ ۳۰ امریکی ڈالر

پتہ: ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

جمیلہ احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے جے کے آفسٹ پرنٹرس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲ سے شائع کیا۔

ہر زمانے سے زیادہ آج آدمی کو فنون لطیفہ کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر ادب (شاعری افسانے، داستان) مصوری رقص وغیرہ کی اس لئے کہ آج علم کے تاریک پہلوؤں نے دنیا کو پاگل خانے میں بدلنے کی پوری تیاری کر لی ہے۔ ایک طرف تباہی کے وحشت و بربریت کی توسیع کے مہیب سائے تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ دوسری طرف ابھی تک کچھ لوگ بہت سارے لوگوں کو آپس میں لڑانے کے لئے غلط فہمیاں پھیلانے میں مصروف ہیں۔

چراغوں کی روشنی اتنی کم ہے کہ دم گھٹتا ہے۔

اس شمارے میں



دامن نگاہ کا

"چنگاری" کے شمارے اپنی دلچسپی کے لحاظ سے خاصے کی چیز تھے اور میں نے اسی وقت ایک سیٹ عطاء الحق قاسمی کو لاہور بھجوا دیا۔ ان پرچوں میں پاکستانی ادیبوں اور کالم نویسوں کی نگارشات دیکھ کے مزید خوشی ہوئی کہ آپ یہاں کے لکھنے والوں کی نمائندگی بھی وہاں کر رہے ہیں اور یہ آپ کے حسنِ نیت اور خلوصِ دل کی دلیل ہے۔ چنگاری کے "کالم نگاری نمبر" کا اشتہار دیکھ کے دل بہت مچلا کہ آپ سے درخواست کروں کہ ایک شمارہ ممکن ہو سکے تو بھجوا کر ممنون فرمائیے۔ فکر تونسوی صاحب کا اداریہ بے حد پسند آیا۔ اُن کے قلم کی شگفتگی برقرار ہے اور اُن کی ذہنی اُپج اور لطیف طنز اُنھیں اِس عہد کے ادیبوں میں ایک اعلیٰ مقام دیئے ہوئے ہے۔

منیر احمد شیخ

• • •

'چنگاری' پابندی کے ساتھ مل رہا ہے۔ جس کے لئے آپ حضرات کا شکر گزار ہوں۔ مواد کی تنوع کاری کے اعتبار سے یہ رسالہ اردو رسالوں میں منفرد نوعیت کا حامل ہے۔ آپ اسے جس فن کارانہ چابک دستی اور نفاست سے نکال رہے ہیں وہ بہر صورت قابلِ تحسین ہے۔

قضا ابن فیضی

• • •

چنگاری کے لئے ایک دلچسپ مضمون بھیج رہا ہوں۔ ابھی اس مضمون کو اور پھیلایا جا سکتا ہے۔ میں اس کی دوسری قسط بھی جلد ہی لکھوں گا۔ آپ اسے چنگاری کے اگلے شمارے میں لے لیں جیسے ہی دوسری قسط مکمل ہو گی میں بھجوا دوں گا۔ دوسری قسط فوراً اگلے شمارے میں جانا ضروری نہیں ہے۔

ویسے یہ بھی اپنی جگہ مکمل مضمون ہے۔ اسے تو آپ فوراً شائع کر دیں۔

اصغر علی انجینیر

• • •

چنگاری بلاناغہ مل رہا ہے۔ ہر سٹرے بُسے اور دو کوڑی کے پرچے کو انفرادیت، معیار اور صفِ اوّل کے تاج پہنا کر عظمتوں کی مسندوں پر بٹھانے کی رسم سی چل رہی ہے۔ ایسے میں انفرادیت اور معیاری قسم کے الفاظ اپنی معنویت کھو بیٹھے ہیں ورنہ اس حقیقت کی تردید نہیں کی جا سکتی کہ ہر پہلو سے منفرد کہلانے کا مستحق اگر کوئی رسالہ ہے تو وہ چنگاری ہے۔ خدا آپ کے حوصلوں کو استحکام بخشے، وسائل میں فراوانی عطا فرمائے اور ارباب اردو کو توفیق دے کہ وہ آپ کی پُر خلوص خدمات کی قدر کرتے ہوئے کھوکھلی تھو بازی کا چلن چھوڑ کر آپ کے ساتھ تعاون کریں۔

محبوب راہی

• • •

مضامین کا انتخاب داد کا مستحق ہے۔ خاص طور پر آپ کے رسالہ کی اشاعت کا معیار۔ میری دلی خواہش ہے کہ ایسا خوبصورت رسالہ کسی صورت میں بھی بند نہیں ہونا چاہئے اور میرا یقین ہے کہ رفتہ رفتہ آپ کو ایک ہزار سبسکرائبر مل ہی جائیں گے۔

انجم لدھیانوی

• • •

کافی عرصہ ہوا دھنباد کے ایک بک اسٹال پر "چنگاری" کے چند پرانے شمارے دیکھنے کو ملے تھے۔ پہلے تو میں نے اسے کاکوئی نشرکی پرچہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا لیکن جب کوئی اور پرچہ نظر نہیں آیا تو بے دلی کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اب تک میں اس سے محروم کیوں تھا اور مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے اس زمانے میں بھی اور تا ہنوز "چنگاری" کا کہیں کوئی اشتہار بھی نظر سے نہیں گذرا۔ میں نے تین شمارے خرید لئے۔ ان تینوں شماروں میں مجتبیٰ حسین کا سفرنامہ "جاپان چلو۔ جاپان چلو" کی قسطیں شریک تھیں۔ مجتبیٰ حسین کا میں عقیدت مند ہوں لیکن مجتبیٰ صاحب مجھے دوست تصور کرتے ہیں۔

بہر کیف میں کافی دنوں تک "چنگاری" کو بھلا نہ سکا تھا۔ اسے ریگولر پڑھنے کی خواہش ضرور تھی لیکن بیچ میں اسی درمیان کاروباری خسارے میں ایسی جان پھنسی میں ٹوٹ کر بکھر گیا۔ معاشی طور پر تا ہنوز وہی عالم ہے۔

اِدھر ۲۰ جولائی کو ایک مشاعرے میں اپنے ایک شاگرد دوست فردوس گیاوی کے ہاتھوں میں "چنگاری" کا شمارہ نمبر ۱۹ دیکھا۔ پرانی یادیں پھر تازہ ہو گئیں۔ بے قراری کے ساتھ پرچہ لیا اور گھر آکر اطمینان سے پڑھا۔ موصوف ہی کے ذریعے معلوم ہوا کہ GAYA میں "چنگاری" آتا ہے۔ حیرت ہے آپ دھنباد کیوں نہیں بھیجتے۔ خط ہذا میں ایک بک اسٹال کا پتہ درج کر رہا ہوں آپ انھیں پانچ یا دس کاپیوں سے جاری کر دیجئے۔

شمارہ ۱۹ میں "امرتا پریتم سے ملاقات" اور امرتا پریتم کسی کے لئے امرت کسی کے لئے زہر" پڑھ کر مصنفہ کے کچھ ایسے ذاتی اور تخلیقی گوشے بھی سامنے آگئے جو کہیں اور نظر نہیں آئے تھے۔ "سخن در سخن" "شوخیٔ تحریر" اور ایک نئی ادبی صنف "اشتہار سازی" ایسے مضامین کی بھارت میں بے حد ضرورت ہے۔ اردو ادب میں کیسے کیسے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور یہاں کے لوگ ہیں کہ قطعی ناواقف، کتنی محرومی ہے....!

محسن زیدی کی شاعری پر مختصر مختصر چند مضامین شاعر کو سمجھنے میں بڑا معاون ثابت ہوئے۔ مجتبیٰ حسین کا "میرا پہلا ہوائی سفر" خاصہ مزہ دے گیا۔

شعری حصّے کا انتخاب بڑا گراں قدر ہے۔ ہر غزل فنّی تقاضوں سے مزین اور موجودہ مزاج سے ہم آہنگ ہے۔

شان بھارتی

• • •

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

بقیہ خطوط

پیارے بھائی صاحب السلام قبول کریں۔ (میرا اردو لکھنا ٹھیک نہیں ہے معاف کریں) مجھے چنگاری پہنچ رہا ہے۔ بہت اچھا پرچا ہے۔ جب سے گفتگو بند ہوا ہے مجھے کوئی پرچا نہیں آتا۔ میں روز یہ زبان پڑھ نہ لوں تو مجھے چین نہیں پڑتا۔ میرے پاس بہت ادب ہے۔

دو باتیں اور ہیں۔ ایک تو میں فقیر لکھاری اور شاعر ہوں۔ آپ نے جس طرح سے مجھے بیدی نمبر بھیجا تھا اسی طرح یہ بھی رعایت کریں۔ میں تیس روپے ارسال کر دوں گا آپ کے جواب آنے پر۔ اور یہ بھی لکھیں کہ آپ "کالم نگار نمبر" کا مجھ سے کیا وصول کریں گے؟

ایک بات اور ہے چنگاری کی باریک چھپائی مجھے پڑھنے میں کافی تکلیف ہوتی ہے۔ میری عمر ۷ سال ہے۔ بہت حیلیں کاٹی ہیں۔ آنکھوں میں موتیا اتر رہا ہے۔ مگر ابھی دو تین سال بات چل سکتی ہے۔ میں کیا ہوں یہ میرا ایڈ کسی سے پڑھوا کر سن لیں۔ اردو لکھنے کا محاورا نہیں رہا۔ ویسے اردو زبان کا شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر ہو گا جسے میں نے نہیں پڑھا ہے۔

ایک بات میرے دکھ کا کارن بن رہی ہے۔ یہ جادو کر دینے والی زبان سے میرا سارا پریوار دور کا غذ ہے۔ میں مر گیا میرا گھر اس انمول ہیرے سے بانجھ ہو جائے گا۔ چھوٹے لڑکے کو کوشش کر رہا ہوں کہ وہ کچھ نہ کچھ میرا بیج قائم رکھے۔ "ترقی" بھی میرے گھر میں گھر نہیں بنا پائی۔ فانی کوہی میں نے سرداری دی ہے۔ میں پکا ترقی پسند ہوں۔ مارکس وادی ہوں مگر کسی پارٹی کا ممبر نہیں ہوں۔ گزارے کے لئے سارے مزدوروں کا ٹھوٹا بہت جانتا ہوں۔ لاہور میں میرا پہلا پنجابی شاعری کا استاد "استاد گام" جی تھے۔ چھوڑیے دکھتی رگوں کی باتیں!!

آپ سب کو میرے پریوار کی طرف سے آپ کا پریوار کو "امر سکھ" ملے۔

جسونت سنگھ راہی

ادارایہ

برہنہ حرف

چنگاری کے ۲۶ شمارے آفسٹ پر شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک چنگاری کی اشاعت خاطر خواہ نہیں ہوئی۔ اشاعت کا مطلب ہے کتب فروشوں کے اسٹال سے فروخت اور سالانہ خریداری۔ ان دوستوں کے بارے میں کیا کہا جائے جو بڑے شرمی کے ساتھ کہتے ہیں ہاں بھائی رسالہ مل گیا۔ یا بھائی چنگاری نہیں ملا یا شمارہ نمبر ۲۱ پھر سے بھجوا دو کوئی دوست اٹھا لے گیا۔ مگر اتنی زحمت نہیں کرتے کہ سالانہ خریداری کی رقم بھیج دیں۔

چنگاری ابھی تک اس پوزیشن میں نہیں آیا کہ اس کا معیار اور زیادہ بلند کیا جا سکے اچھے مضامین معاوضہ دے کر حاصل کئے جا سکیں اور اس میں لکھنے والے لوگ یہ محسوس کریں کہ لکھنے سے کوئی مالی فائدہ بھی حاصل ہو سکتا ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ ہم لکھنے والوں کو معاوضہ دیں، ہم چنگاری کو ایک ایسے رسالے کی شکل دیں جو کم سے کم ہندی کے مقبول رسائل کے ساتھ رکھا جا سکے۔ مگر ظاہر ہے ہم تنہا کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگا کر رسالہ نکالیں پھر تمام اردو والوں تک یہ پہنچائیں اور یہی نہیں انھیں پڑھ کر سنائیں بھی اس لئے کہ زیادہ تر لوگ پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ بڑی حیرت کی بات ہے ہم اردو اردو چلاتے ہیں مگر اردو کے اخبارات و رسائل تک نہیں پڑھتے۔ وہ اخبارات و رسائل بھی نہیں جو انھیں مفت ملتے ہیں۔

ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اردو والے ایک نشے کے عالم میں نیم خواب ہیں۔ کوئی زور زور سے چیخ چیخ کر انھیں جھنجھوڑے تو آنکھیں کھولتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اکثر اساتذہ کا رول زیادہ مجرمانہ ہے۔ وہ نہ خود پڑھتے ہیں اور نہ ہی طالب علموں میں پڑھنے کا ذوق پیدا کرتے ہیں۔ وہ ادارے جو اردو کی ترویج و ترقی کے لئے قائم کئے گئے تھے آج اردو کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے ہیں۔ وہ لوگ جو اردو کے نام پر مختلف جگہوں پر با اثر حیثیت میں ہیں اس طرح کے غلیظ، گھناؤنے، جوڑ توڑ میں مبتلا ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اور مصیبت یہ ہے کہ اگر آپ نے ان کی طرف انگلیاں اٹھائیں تو آپ کے ہاتھ قلم کر لئے جاتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے سامنے ہمیشہ نظریں نیچی کر کے ہاتھ باندھے کھڑے رہیں اور ان کی تعریف و توصیف کریں۔ یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ جو لوگ اپنی انا، اپنے ضمیر پر دباؤ ڈال کر مصلحتاً ان زعما کی تعریف و توصیف کرتے ہیں وقت آنے پر اس جبر کا انتقام بھی لیتے ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ ترقی پسند حلقہ اس سلسلے میں زیادہ قصوروار ہے۔ جدیدیوں سے شکایت بے معنی ہے اس لئے کہ وہ بے چارے تو استغنا کی آخری مثال ہیں البتہ یہ استغنا صرف دوسروں کے لئے ہے۔

آئیے ہم عہد کریں

- اردو رسائل، اخبارات اور کم سے کم ایک کتاب کی خریداری ہمارے ماہانہ بجٹ کا لازمی جزو ہو گا۔
- ہم تحفے کے طور پر اچھی کتابیں خود پیش کریں گے اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دیں گے۔
- ہم زیادہ سے زیادہ لائبریریاں کھولیں گے۔ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں میں پڑھنے کی عادت کو بڑھاوا دیں گے۔
- شعر و ادب کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی اردو میں کتابیں خریدنے کی کوشش کریں گے۔
- فلمی اور مذہبی رسائل کے ساتھ ساتھ غیر فلمی اور ادبی رسائل کے خریدار بنیں گے۔
- کتابیں مانگنے کی غلط عادت ترک کر دیں گے۔ وہ تمام لوگ جو اردو پڑھنا چاہتے ہیں یا اردو پڑھانے کے لئے مشترکہ طور پر کوئی ادارہ قائم کریں گے اور کلاسس شروع کریں گے۔

تفریح ——— معلومات ——— اور ادب

• چنگاری صالح، صحت مند اور بامقصد بامعنی ادب کی ترویج پر زور دیتا ہے۔
• چنگاری ہندایمانی ثقافتی ورثے کی خوبیوں کو اُجاگر کرتا ہے۔
• چنگاری سائنٹفک نقطہ نظر کی تبلیغ کے لئے کوشاں ہے۔
• چنگاری مشترک انسانی ورثے کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔
• چنگاری اپنی تحریروں کے ذریعہ باہمی منافرت، غلط فہمی اور کمتری یا برتری کے احساسات کی اصلیت پر روشنی ڈالتا ہے تاکہ مختلف فرقوں اور گرہوں میں ہم آہنگی پیدا ہو۔
• چنگاری اسی غرض سے مختلف فرقوں، مختلف ریاستوں، مختلف ملکوں، مختلف زبانوں کے خوب تر عناصر پیش کرتا ہے۔
• چنگاری نئی ایجادات اور تازہ واقعات کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے تاکہ لوگوں کا ذہنی اُفق وسیع ہو۔
• چنگاری نئے ادب کے ساتھ ساتھ اپنے کلاسیکی سرمائے کی بھی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔
• چنگاری کہنہ مشق ادیبوں کے ساتھ ساتھ نئے ادیبوں کو بھی جائز مقام دیتا ہے۔
• چنگاری مغرب سے ہو بیزار نہ مشرق سے حذر کر، کا داعی ہے۔
• چنگاری تجارت نہیں مقصد ہے۔
• چنگاری تفریح بھی فراہم کرتا ہے معلومات بھی۔
• یہ قارئین کو نئے دور سے ہم قدم بھی کرتا ہے اور پرانے زمانے سے استوار بھی۔

اگر آپ چنگاری سے جزوی طور پر بھی متفق ہیں تو ہمارا ساتھ دیجئے۔ زبانی نہیں عملی۔ اس کی تعریف مت کیجئے۔ اس کی توسیع کیجئے۔ قیمت بھی محض معمولی ہے۔ اس سے سستا پرچہ جو آفسٹ پر چھپتا ہو۔ پندرہ دن پر ۲۴ صفحات پابندی سے پیش کرتا ہو۔ ہر قسم کی گروہ بندی اور ذاتی پروپگنڈے سے ابا کرتا ہو۔ بے باک اور بے خوف ہو۔ کوئی دوسرا اگر ہے تو بتائیے۔

پندرہ روزہ چنگاری رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

اصغر علی انجینئر

صارفی سماج اور ادب کے چند مسائل

ہم ادب اور اس کے مسائل کو بڑے ہی محدود دائرے میں رہ کر دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان مسائل سے متعلق ہماری بحث عام طور پر ترقی پسندی اور جدیدیت کے تنازع کے آس پاس گھومتی رہتی ہے۔ اسکی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ترقی پسندی اور جدیدیت کا نزاعی مسئلہ بنیادی طور پر نظریاتی ہے اور ہم اپنی زندگی اور سماجی مسائل کا احتساب کسی نہ کسی نظریئے کی مدد سے ہی کر سکتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے فن کاروں اور تخلیق کاروں کے تجربات بڑی حد تک متوسط اور نچلے طبقوں کے مسائل تک محدود ہوتے ہیں۔ بہر حال فن میں صداقت اور تاثیر تجربے سے پیدا ہوتی ہے۔ آج بھی ہمارے شعرا اور کہانی کار۔ خصوصاً قصباتی شہروں میں — نچلے متوسط طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اکثر اسی قصباتی ماحول سے انہیں اپنی تخلیقات کے لیے خام مواد ملتا ہے ظاہر ہے اسکا اثر ان کے ادبی نظریات پر بھی پڑتا ہے۔ شعوری طور پر اور غیر شعوری طور پر بھی۔ اسی نظریئے کو وہ اپنے فن میں برتتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں غزل کی روایت آج بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ شمالی ہند میں متوسط درجوں کے کئی شہروں میں۔ مثلاً مرادآباد، بنارس، فیروزآباد، علی گڈھ، مئو ناتھ بھنجن، اعظم گڈھ، برڈو وغیرہ وغیرہ۔ دستکاروں کی بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ ایسے شہروں میں تبدیلی کی رفتار دھیمی ہے۔ اور ان کا ماحول آج بھی کئی اعتبار سے نیم جاگیردارانہ ہے قدریں بھی اسی معاشرے سے جڑی ہوئی تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا ان شہروں اور قصبوں میں آج بھی روایتی قسم کی شاعری کرتے ہیں۔ ان کو اپنی زندگی یہی فنی اور ادبی نظریہ دیتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ انہی شہروں کے چند تعلیم یافتہ متوسط گھرانوں کے — قدرے خوشحال۔ ادیب اور شعرا اپنے مطالعے کے ذریعے نئے ادبی اور فنی رجحانات کو شعوری طور پر قبول کرتے ہیں اور انھیں اپنی تخلیقات میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ تجربہ زندگی کا صادق تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک میکانکی صورت اختیار کر لیتا ہے اور نتیجتاً ہم اچھے فن پارے اور دل پر گہرا تاثر پیدا کرنے والی تخلیقات سے اکثر محروم رہتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی ادب کی تخلیق میں دو پہلو بڑے اہم ہوتے ہیں۔ نظریاتی اور تجرباتی نظریہ حالانکہ تجربات کی ہی پیداوار ہوتا ہے (THEORY GROWS OUT OF PRACTICE) لیکن اس کی اپنی خود مختاری ہوتی ہے اس خود مختاری کا بڑا گہرا اور دیرپا اثر ہوتا ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام مذہبی — نظریات اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ویسے سیاسی اور فلسفیانہ نظریات بھی اتنی آسانی سے اپنی خود مختاری نہیں کھوتے۔ فن کار اور ادیب بھی کسی نہ کسی مذہبی، سیاسی یا فلسفیانہ نظریئے اور اس کی پیدا کردہ اقدار سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی تخلیقات پر ان کا یقیناً اثر پڑتا ہے۔ دوسرا اہم پہلو ادبی تخلیقات کا، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا انسان کے اپنے زمانی اور عصری تجربات ہیں — نظریات اور تجربات میں ٹکراؤ بھی ہو سکتا ہے — اور اکثر ہوتا بھی ہے۔ نظری تجربات سے میل نہ کھاتے ہوئے بھی اپنی خود مختاری جتاتا ہے اور نظریئے اور تجربے میں باہم تناؤ کئی تخلیقی شہ پاروں کو جنم دیتا ہے۔ اس تخلیقی تناؤ ([illegible]) میں جتنی زیادہ شدت ہوگی، فن پارہ قارئین پر اتنی ہی شدت سے تاثر پیدا کرے گا۔ لیکن یہ تاثر اسی صورت میں پیدا ہوگا جب کسی ایک پہلو پر زور دینے کی شعوری کوشش نہ کی جائے کیونکہ تخلیقی محرکات لاشعور سے ابھرتے ہیں اور شعوری سطح پر آ کر ایک خاص ہیئت اختیار کرتے ہیں۔

اکثر ہوتا یہ ہے کہ ہمارے ادیب اپنے نظریئے پر — وہ ترقی پسند ہوں یا جدید — شعوری طور پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس کی کئی وجہ ہو سکتی ہیں، نظریئے پر گہرا یقین ذاتی مفاد یا کچھ اور۔ لیکن نظریئے پر زور دینے کی شعوری کوشش اور خاص کر تجرباتی حقائق کا منہ چڑھاتے ہوئے۔ فن پارے کو بہت کمزور بنا دیتی ہے کیوں کہ اس تخلیقی کوشش میں تخلیقی تناؤ کی شدت ختم ہو جاتی ہے۔ یا کم ہو جاتی ہے اور اسی تناسب سے اس کا تاثر بھی کم ہو جاتا ہے آج ہمارا ترقی پسند ادب ہو یا جدید، اسی کمزوری کا شکار ہے دونوں قبیلے کے ادیب نظریئے پر زور دینے کی شعوری کوشش کرتے ہیں اور اپنے فن پاروں کو پھیکا اور سپاٹ بنا دیتے ہیں۔ اگر وہ ایمانداری سے اپنے نظریات اور تجربات کو ایک خاص طے کردہ نہج پر شعوری طور پر گامزن کرنے کے بجائے، انھیں اپنی داخلی گہرائیوں سے اٹھنے والے محرکات پر چھوڑ دیں تو زیادہ بہتر ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ادب کی تخلیق میں انسانی شعور کا کوئی رول نہیں ہوتا یہ تو بڑا خطرناک موقف ہوگا۔ فن کو محض خلاف عقل (irrational) قوتوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ شعور کی اور

عقلیت پسندی (Rationalism) کی اپنی اہمیت ہوتی ہے جسے ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل فن پارے کی اہمیت کا دار و مدار بڑی حد تک عقلی اور غیر عقلی قوا کی جدلیات اور باہم آویزش پر ہے۔ محض غیر عقلی قوا کے حوالے کردیا جائے تو فن پارہ گہرا تاثر تو پیدا کر سکتا ہے لیکن سماجی اور انسانی سطح پر وہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ نازی یا فاشسٹ نظام میں پیدا ہونے والے ادب سے اسکی مثال دی جا سکتی ہے یونگ نے ادب کی تخلیق میں اجتماعی لاشعور (Collective Consciousness) کی اہمیت پر خاصہ زور دیا تھا۔ کئی قوموں میں جو اقتدار کے شدید احساس (Power Complex) کا شکار رہی ہوں اور جن کا اس کامپلیکس کے باوجود دوسری قوموں کے ہاتھوں اہانت ہوئی ہو، یہ اجتماعی لاشعور خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اور یہی نازی جرمنی میں ہوا بھی۔ اس لیے ادب کی تخلیقات کو محض لاشعوری محرکات کے رحم و کرم پر بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ایک اچھے اور موثر فن پارے کی تخلیق کے لیے جہاں نظریات اور تجربات کے درمیان تناؤ ضروری ہے وہاں شعوری اور عقلی قوا اور لاشعوری محرکات میں شدید تناؤ پیدا ہونا بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔

جس ادب میں محض نظریے پر زور ہوگا۔ وہ ترقی پسند ہو یا جدید۔ وہ ادب میکانکی اور بے اثر بن کر رہ جائے گا یہی آج ہم دیکھ بھی رہے ہیں۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کی نزاع میں ہم یہ بھول گئے ہیں کہ ادب کی اپنی (Autonomy) ہے، نظریہ اسے سمت عطا کرتا ہے یا فوکس جدیدیت کے حامیوں نے ترقی پسندوں پر خاص طور سے نظریاتی اعتبار سے حملہ کیا اور ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ ادب کو اپنے نظریے کی تبلیغ کا ذریعہ بناتے ہیں اور تخلیقی ادب کی اپنی اقدار کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ الزام چند ادیبوں کی حد تک صحیح بھی تھا لیکن اتنی ہی شدت سے یہ الزام جدیدیت کے حامیوں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ ان کی تخلیقات کو بھی اس زمرے سے خارج کرنا مشکل ہے۔ اس بات کی کچھ وضاحت ضروری ہے۔

ایک نظریہ وہ ہوتا ہے جو اسٹبلشمنٹ اور وضع موجود (Status quo) کے خلاف ہوتا ہے۔ جو ادب اس نظریئے کو لیکر تخلیق ہوگا وہ نہ صرف احتجاجی ادب کے زمرے میں آئے گا بلکہ اسکی نظریاتی بنیاد زیادہ نمایاں اور شدید ہوگی دوسرے وہ نظریہ جو وضع موجود کا حامی ہو زیادہ انتشاریت (Diffusedness) لیے ہوئے ہوتا ہے اور وہ غیر نظریاتی مواد میں اس طرح تحلیل ہو جاتا ہے کہ بادی النظر میں اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہو پاتا اس کے برخلاف ہر احتجاجی نظریئے میں شدت (Sharpness) ہوتی ہے۔ جو اپنی موجودگی کا فوراً احساس دلاتی ہے۔ اور باتوں کے علاوہ نظریاتی امتیازات کی بحث میں اس (Sharpness and Diffusedness) کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے جس نظریئے میں احتجاج کی لے جتنی ہو گی، اپنی شدت سے وہ موجودگی کا احساس بھی بڑی آسانی سے پیدا کر دے گا۔ وضع موجود پر مبنی نظریات (Status quoist ideas) اپنی انتشاریت (Diffusedness) کی وجہ سے بڑی آسانی سے نظریاتی تسلط کے الزام سے بچنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں جدیدیت کا نظریہ وضع موجود کی حمایت کرنے والا ہے اور اسی لیے یہ زیادہ منتشر اور نظریاتی فوکس نہیں رکھتا اور جدیدیت کے حامی نظریاتی قید و بند کی رہائی کے دعویدار بن بیٹھے ہیں۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جدیدیت کے حامی دراصل وضع موجود کے حامی نہیں ہیں وہ تو ہر طرح کے اسٹبلشمنٹ کے خلاف ہیں۔ اس بات میں ایک حد تک سچائی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ پوری سچائی نہیں ہے۔ بعض جدیدیت کے حامی شعوری طور پر موجودہ اسٹبلشمنٹ کے خلاف بھی ہو سکتے ہیں اور ہیں۔ لیکن معاملہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے اور اس لیے زیادہ غور طلب ہے۔

وہ لوگ جو ہر قسم کے اسٹبلشمنٹ کے خلاف ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ انسانی جدوجہد بے معنی ہے کیونکہ ہر جدوجہد کے بعد ایک اسٹبلشمنٹ وجود میں آجاتا ہے اور یہ اسٹبلشمنٹ بھی عام آدمی کی طرف جابرانہ اور استحصالی رویہ اختیار کر لیتا ہے، دراصل انسانی جدوجہد اور اس میں مضمر اقدار کی ہی نفی کرتے ہیں اور اس طرح (Status quo) بنائے رکھنے میں معاون ہو جاتے ہیں۔ اگر وضع موجود کو جدوجہد کے ذریعے بدل بھی دیا گیا تو یہ سعی لاحاصل ہوگی کیونکہ اس کے بعد جو بھی اسٹبلشمنٹ بنے گا وہ بھی جابرانہ اور استحصالی ہوگا۔ اس سے جو نتیجہ پیدا ہوگا وہ ظاہر ہے یعنی وہ عوام کو جبر و استحصال کی ناگزیریت اور حتمیت کا قائل بنائیں گے اور ہر جدوجہد کو بے معنی قرار دیکر بالآخر (Status quo) کے شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر حامی ہو جائیں گے۔ یہ ہمیں ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ انقلابی نظریئے کی نفی موجودہ حالات کو قائم رکھنے کا جواز فراہم کرتی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اگر انقلابی جدوجہد کے بعد بھی کوئی ظالمانہ اسٹبلشمنٹ وجود میں آیا ہے یا آگے چل کر وہ ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اسکے خلاف آواز نہ اٹھائی جائے اور محض انقلاب کے نام پر اس کے تقدس کو قبول کر لیا

جائے؛ جس ادب کی وابستگی زندگی کے اقدار سے ہوگی وہ ادب ہرگز اس رویے کو قبول نہیں کرے گا۔

ادبی نظریئے میں تحرک اور تبدیلی کی ہی بنیادی اہمیت ہے۔ ہر وہ ادب یا ادبی نظریہ جو تبدیلی کا ساتھ نہ دے سکے اور تحرک نہ ہو صحت مند نہیں ہو سکتا۔ تبدیلی اور حرکت نہ صرف زندگی کے جمود کو توڑتے ہیں بلکہ نئے امکانات پیدا کرکے اس کی ثروت (Richness) کو نمایاں کرتے ہیں تحرک اور تبدیلی سے انکار زندگی کی تمام (Potentialities) کی نفی ہے۔ ایک ادیب یا فنکار موجودہ حقیقت سے زیادہ ابھرتی ہوئی حقیقت کا علمبردار ہوتا ہے کیونکہ ابھرتی ہوئی حقیقت موجودہ حقیقت کے مقابلے میں مثالی حقیقت سے قریب تر ہوتی ہے۔ جس طرح موثر ادب کی تخلیق کے لیے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا عقلی اور غیر عقلی قوا میں جدلیاتی تعامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک اچھے یا عظیم ادب کی تخلیق کے لیے 'ہے' اور 'چاہئے' (Is and ought to be) میں تصادمی تناؤ (Confrontational tension) بہت ضروری ہوتا ہے. یہ تناؤ جتنا شدید ہوگا' فن پارہ عظمت کی اتنی ہی بلندی کو چھونے لگے گا۔ ہر عظیم فنکار کے یہاں (OUGHT) اور (IS) کے اس تناؤ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

'ہے' اگر موجودہ حقیقت کا شعور دیتا ہے تو 'چاہیئے' مثالی حقیقت کا. یہاں اسی سلسلے میں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ تبدیلی اور تحرک وسیلہ ہیں، بذاتہ مقصود نہیں تحرک اور تبدیلی کی سمت انسان کی زندگی کی مثبت اقدار سے جڑی ہوئی ہونی چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو نئی ابھرتی ہوئی حقیقت موجودہ حقیقت سے بدتر اور انسانی سماج کے حق میں مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک بحران میں مبتلا جمہوری نظام یقیناً اطمینان بخش نہیں ہے لیکن اگر سرمایہ دارانہ جمہوریت ..... کے بحران سے نمٹنے کے لیے سماج کی فاشسٹ نظام کی طرف حرکت دی جائے اور اس قسم کی تبدیلی لانے کے لیے جدوجہد شروع ہو تو یہ تبدیلی اور ابھرتی حقیقت ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اس بحران زدہ نظام سے انقلابی تبدیلی کے ذریعے نمٹا جا سکتا ہے۔ اس لیے تبدیلی کی سمت اپنے آپ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

زندگی کے امکانات لامحدود ہیں۔ امکانات بہتر بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی بحران زدہ سرمایہ دارانہ جمہوریت میں فاشزم کے ابھرنے کے بھی امکانات ہوتے ہیں۔ اور انقلابی تحریک کے ابھرنے کے بھی۔ امکانات کی سمت انسان اپنی شعوری جدوجہد سے ہی مقرر کرتا ہے. اس میں کامیابی اور ناکامی کے پیچیدہ عوامل کارگر ہو سکتے ہیں' ادبی نظریئے میں اس بات سے بحث نہیں کی جا سکتی یہ سیاسی حکمت عملی کی بحث کا موضوع ہے۔ اچھا ادب مثالی حقیقت کا متقاضی ہوتا ہے اور بس اور اپنے قارئین کو اس مثالی حقیقت کی طرف رغبت دلاتا ہے' ان کی پلکوں پر مثالی حقیقت کے خواب سجاتا ہے۔ اس کے برخلاف جدیدیت قارئین میں مایوسی کا جذبہ پیدا کرتی ہے کیونکہ ہر تبدیلی اور ہر ابھرنے والی حقیقت گھوم پھر کر اسی حقیقت کی طرف لوٹ آتی ہے جو موجودہ حقیقت ہے. زندگی میں لامحدود امکانات سرے سے ہیں ہی نہیں' ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف شکلوں میں ابھر کر فریب نظر (Illusion) پیدا کرتی رہتی ہے اور انسانوں کو سعئ لاحاصل کے دائرے میں جکڑے رکھتی ہے. وہ اپنی جدوجہد سے آگے نہیں بڑھتا بلکہ اسی حقیقت کے دائرے کے احاطے (Periphery) پر گھومتا رہتا ہے جس کا نقطۂ ارتکاز ظلم جبر اور استحصال ہے۔

ہر وہ نظریہ۔ وہ ادبی ہو' سیاسی یا مذہبی۔ جو صحت مند تبدیلی کے لیے جدوجہد پر زور دیتا ہے وہ مایوسی کو گناہ اور رجائیت کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا مطلب نہیں کہ تخلیقی جمالیات میں مایوسی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے یا المیہ اس زمرے سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے۔ انسانی حقیقت بہت پیچیدہ ہوتی ہے۔ ادبی تخلیق کے محرکات بھی اتنے ہی پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اکثر المیہ زیادہ جمالیاتی اپیل کا حامل ہوتا ہے. زندگی کے پیچیدہ عمل میں حوصلہ شکن حالات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ اور ایسی ذہنی حالت میں المئے کی اپیل طربیہ کی اپیل سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور ہمارا معاشرہ تو ایسا ہے جو مسلسل جبر و استحصال کا شکار رہا ہے اور اس کی طبقاتی ساخت نے یا فطری حوادث نے مسلسل المناک حالات پیدا کئے ہیں۔ اس لیے۔ ہمارے معاشرے میں مصیبت زدہ انسانوں کی بڑی تعداد المئے کے گہرے تاثر کی قبولیت پر آمادہ رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی طوالیت موج (Wave length) ایک ہی ہوتی ہے۔ ہم اگر اپنے کسی عزیز کی موت پر سوگوار ہوں یا اپنی غربت اور فلاکت پر ماتم کناں تو المیہ نظم کہانی یا ناول کا تاثر ہمارے لیے بہت بڑھ جائے گا۔ یوں بھی المئے کی اہمیت ہر دور میں ــ ایسے دور میں بھی جب جبر و استحصال کا خاتمہ ہو چکا ہو ــ باقی رہے گی کیونکہ موت اور فطری حوادث کے المیوں پر قابو پانا ابھی ممکن نظر نہیں آتا۔

المئے کا تاثر اور جمالیاتی اپیل اپنی جگہ، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مایوسی کو المئے کا عضوی جز قرار دینا چاہئے؟ ہمیں المئے اور مایوسی میں فرق کرکے ان کے

دائروں کو الگ الگ مقرر کرنا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ المیہ مایوسی کا میلان بڑھا دیتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ میلان انسانی فطرت کا جز بن جائے یا ایک فلسفیانہ نظریے کی صورت اختیار کر لے ان دونوں باتوں میں فرق کرنا بہت ضروری ہے۔ وہ ادب جو زندگی کرنے کا حوصلہ دیتا ہے اور حوصلہ شکن حالات کو سعیٔ مسلسل کے ذریعے بدل کر نئی اور مثالی حقیقت کو اپنے فن کے ذریعے ابھارتا ہے، وہ زیادہ دیرپا ثابت ہوتا ہے ایسا ادب اسی جمالیاتی نظریے کے تحت پیدا ہوگا جو مایوسی اور المناکی کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا توڑ پیدا کرنے کا حوصلہ بھی عطا کرے۔ جدیدیت اور ترقی پسند ادب میں یہ بنیادی فرق ہے۔ جدیدیت مایوسی اور المناکی کو قطعی اور حتمی حقیقت تصور کرتا ہے جبکہ ترقی پسند ادب اس حقیقت کو قبول کرتے ہوئے اس کی حتمیت کو اپنے آپ پر مسلط نہیں ہونے دیتا بلکہ اس کی نفی کرنے کے لیے اور اس سے رستگاری حاصل کرنے کے لیے اپنے قارئین کو (INSPIRE) کرتا ہے۔

یہاں میں پوشکن کی ایک مشہور نظم (THE BRONZ HORS MAN) (تانبے کا گھڑ سوار) کی مثال دینا چاہوں گا یف گینی بے حد مجبور ہے، جیسے پیٹر (روس کا عظیم شہنشاہ جس کا یہ پتلا بنا ہوا ہے) کے ہاتھوں بے انتہا مصیبتیں جھیلی ہیں اور ان آفات سے نجات پانے کی اسے کوئی فوری صورت بھی نظر نہیں آتی۔ یف گینی کی کیفیت پوشکن یوں بیان کرتا ہے!

Arou Around the pedestal, dejected
Poor, sick yevgeny made his way
His gaze on him who had in sway
Held half the world in

[illegible] dark
His chest fell tight, Against the rail [illegible]
He pressed his burning face
His blood flamed and his heart [illegible] still
And Pounding [illegible] facing [illegible]
Wild eyed his fingers clenched [illegible]
The giant

اور پھر اس عالم میں اس کی زبان سے صرف دو لفظ ادا ہوتے ہیں جو نہایت بلیغ ہیں "[illegible]" اپنی مٹھی بھینچ کر جنون کی کیفیت میں، بے بسی کے پورے احساس کے ساتھ وہ یہ الفاظ ادا کرتا ہے "ٹھہر اور دیکھ" ان الفاظ میں مایوسی کی زیریں لہر بھی ہے اور بدلہ لینے کا عزم بھی۔ مایوسی اور عزم کی یہ جدلیات اپنی پوری شدت کے ساتھ ان دو لفظوں میں تخلیق ہو گئی ہے۔ عالمی درجے کا ادب جہاں حوصلہ شکن حالات سے پیدا ہونے والی مایوسی کو نظر انداز نہیں کرتا وہاں وہ ان حالات کے سامنے ہتھیار بھی نہیں ڈالتا۔

ادب میں جہاں المیے کی اہمیت ہے وہاں طربیے کا بھی اپنا مقام ہے۔ المیہ ہمیں اپنے مشترک غموں سے آشنا کرتا ہے تو طربیہ ہمارے لیے فرحت کا سامان مہیا کرتا ہے فرحت اگر اسے قوت عطا کرتی رہے تو وہ اپنے دکھوں کا بوجھ زیادہ آسانی سے ڈھو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فرحت کے گھوڑے پر سوار ہو کر وہ اپنے دکھوں کا بوجھ ڈھو لیتا ہے۔ اس لیے ادب میں طربیے کی اہمیت بھی بڑی بنیادی ہے۔ تخلیقی ادب کی جدلیات کی دو اہم جہتوں یعنی عقلی اور غیر عقلی قوا کے درمیان اور "ہے" اور "چاہیے" یعنی حقیقی وجود اور غیر حقیقی یا امکانی وجود کے درمیان تعلق پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس کی تیسری جہت ہے المیہ اور طربیہ کے درمیان باہمی تصادم۔ یہ جدلیاتی جہتیں عظیم ادب کی تخلیق کے لیے بنیادی اہمیت کی مالک ہیں۔

طربیہ ادب کی تخلیق میں بھی سمت (عنصر tendency) کا سوال بڑا اہم ہے۔ طربیہ ادب تفریح طبع کے لیے ہے لیکن تفریح کی ایسی اقدار ہوتی ہیں جنہیں ایک صالح ادب کی تخلیق میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تفریح طبع کی نوعیت بھی بڑی حد تک طبقاتی ہے۔ دولت کا حد سے زیادہ ارتکاز ہو تو تفریح کا تصور ہی بدل جاتا ہے۔ ماضی میں جاگیردار طبقوں نے ہمارے صنعتی دور میں سرمایہ دار طبقوں نے ادب کو اپنے غیر صالح تفریحی تصورات کے لیے استعمال کیا ہے۔ آج کی صارفی تہذیب (Consumer culture) میں یہ وبار اور عام ہو گئی ہے صارفی تہذیب میں ادب کے تصورات بڑی حد تک بدل جاتے ہیں۔ اس تہذیب میں ادب کا ایک رخ اس کی تجارتی ماہیت (Commercialization) ہے۔

ہم یہاں صارفی سماج میں تخلیق ہونے والے ادب پر مختصر روشنی ڈالیں گے صارفی سماج کا وجود آج صحیح معنی میں امریکہ اور مغربی یورپ کے علاوہ تیسری دنیا کے اوپری طبقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس صارفی سماج کے انسان کو ہم ایک فرانسیسی فلسفی کی زبان میں یوں بیان کر سکتے ہیں (
Reproduce in order to live
and live in order to Produce

(زندہ رہنے کے لیے پیدا کر[illegible] ہے اور پیدا کرنے کے لیے زندہ رہتا ہے۔ اسے ہم (Circular man) دائروی انسان بھی کہہ سکتے ہیں۔ گویا صارفی سماج [illegible] زندہ رہنے کا کوئی اعلیٰ مقصد نہیں رہتا محض صرف (Consume) کرنا ہی زندگی [illegible] مقصد بن کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے [illegible] کا تخلیقی ادب کے نظریات پر بھی بہت گہر[illegible]

اتر پڑتا ہے۔

پائیدار اور عظیم ادب اعلیٰ اقدار اور نیک مقاصد کا حامل ہوتا ہے۔ انسانی دکھ درد سے گہری ہمدردی اس ادب کا خمیر ہوتی ہے۔ بہتر سے بہتر اور خوب سے خوب تر کے لیے مسلسل جدوجہد ایسے ادب کو معنی اور سمت عطا کرتی ہے۔ لیکن صارفی سماج انسان کی روح کو گھن لگا دیتا ہے، اسے محض صارفیت کا قیدی بنا دیتا ہے۔ جدوجہد کے لیے اس کے حوصلے کو پست کر دیتا ہے عیش و عشرت اور صارفیت عزم اور بلند حوصلگی کے دشمن ہیں۔ یہاں خوب سے خوب تر کی تلاش پر فوری تسکین کا جذبہ غالب آجاتا ہے۔ ایسے سماج میں انسٹنٹ سیکس (INSTANT SEX) رائج ہو جاتا ہے۔ بھوک اور شہوت کی تسکین زندگی کا منتہا بن کر رہ جاتا ہے۔ ہر شے انسانی شہوت کا آلہ ہو جاتی ہے۔ ایسے سماج میں عورت اور مرد کی مساوات بناوٹی ہوتی ہے۔ وہ محض مرد کی شہوت کا آلہ ہوتی ہے اور اس کی عریانیت کو آزادی کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسے سماج میں انسانی وقار ہر اعتبار سے گھٹ جاتا ہے۔ عورت کے حسن اور جسم کے تناسب کی جو اہمیت جمالیات میں ہے ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن صارفی سماج میں اسے محض اشتہار کی صنعت میں بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔

چونکہ فوری تسکین صارفی سماج کا اصل مقصد ہے، ادب اور فن بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ اور صارفیت کا شکار افراد INSTANT ART اور INSTANT LIT کا مزہ لینا چاہتے ہیں۔ جدید نشر و اشاعت کے ذرائع مثلاً ٹی۔ وی، ریڈیو اور روزنامے اپنے سامعین اور قارئین کی اسی ضرورت کو پورا کرنا اپنا واحد مقصد سمجھتے ہیں۔ تخلیق اور تجارت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہ جاتا۔ انسانی امنگوں کو تجارتی اجناس میں ڈھال کر ان کا سودا کیا جاتا ہے۔ استعمالی قدر (USE VALUE) قدر مبادلہ (EXCHANGE VALUE) سے بدل جاتی ہے۔ صارفی سماج میں دنیا ایک فوری حقیقت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جبکہ صحیح معنی میں تخلیقی آرٹ میں فوری حقیقت اور تخلیقی پیداوار میں تخیل اور تفکر کا توسط ہوتا ہے۔ یہ توسط ہی تخلیقی ادب اور آرٹ کی جان ہوتا ہے۔ لیکن صارفی سماج جو محض فوری تسکین کا قائل ہے، اس کی اہمیت کو سرے سے نظر انداز کر دیتا ہے۔ حسن حقیقی سے زیادہ تصوراتی ہوتا ہے، فن کار کا تخیل اسے سنوارتا اور سجاتا ہے اور اسے ماورائی سمت عطا کرتا ہے صارفی سماج اور اس میں پیدا ہونے والا ادب ماورائیت سے گریزاں رہتا ہے اور OUGHT (چاہیے) کے مقابلے میں 'IS' ہے کو ترجیح دیتا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایسے سماج میں انسان کی داخلی شخصیت بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ وہ بظاہر خوش نظر آتا ہے کیونکہ فوری تسکین اور فوری انبساط ہی صارفی سماج کا انتہائی مقصد ہے۔ لیکن صارفیت زندگی کی معنویت اور انسانی رشتوں کو گھن لگا دیتی ہے۔ کامو (CAMU) کے ناول کا ایک کردار اپنی ماں کی موت پر یہ کہتا ہے کہ میری ماں آج مری یا کل اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مرنا یا زندہ رہنا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ کامو کا یہ کردار ایک طرف زندگی کی بے معنویت کا قائل ہو چکا ہے اور دوسری طرف اس سے بیزار بھی نظر آتا ہے۔ بیزاری اور بے معنویت کا ایسا امتزاج اندر سے کھوکھلی شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔ صارفی سماج ہی ایسی مسخ شدہ شخصیتیں پیدا کرتا ہے۔ جو فوری تسکین سے آگے نہیں بڑھنا چاہتیں جو جدوجہد کر کے زندگی کا رخ بدلنا نہیں چاہتیں۔

تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملکوں میں صارفیت اور اس کے پیدا کردہ مسائل اور زیادہ گھناونی شکل اختیار کر لیتے ہیں کیوں کہ ان ملکوں میں صارفی سماج غریبی اور مفلسی کے اتھاہ سمندر میں بہتات کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہوتا ہے۔ اوپری طبقے ہر اُس عیش و عشرت میں اور اپنی ہوس کی تسکین میں مگن رہتے ہیں جنکا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری طرف عوام اپنی بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ یہ اوپری طبقہ خصوصاً شہروں میں رہنے والا صارفیت اور مغرب زدگی کو ایک طرف اپنی منزل مقصود سمجھتا ہے اور دوسری طرف پس ماندہ ملک کا حصہ ہونے کی وجہ سے فوق الفطرت عادات و اقدار اور رجعت پرست رویوں سے بھی پوری طرح نجات حاصل نہیں کر پاتا۔ زندگی کی طرف اس کا رویہ ایسی حالت میں اور مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے سماج میں پیدا ہونے والا لاجدیدیت کا حامل ادب رجعت پرستی کا بھی میلان پیدا کرتا ہے۔ فرسودہ رسوم اور مبہم عقائد کو بھی ایسا ادیب اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتا ہے

خوابوں کا شہزادہ

عصمت چغتائی

ننّھے بھائی کے نام سے موت کا رشتہ جوڑتے ہوئے وہم آتا ہے، اتنے دھیمے اور بسمل انسان کا موت سے کیا واسطہ انہیں دیکھ کر تو ہمیشہ زندگی کی لو اونچی ہو جاتی تھی۔

سب سے پہلے میں نے ننّھے بھائی کو ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی میٹنگ میں دیکھا تھا۔ میں نے لکھنا شروع نہیں کیا تھا لیکن انگارے پڑھ چکی تھی۔ رشیدہ آپا سے پرانا رشتہ تھا۔ سنا تھا شیخ میں انگارے کے افسانوں کے مصنفین کے درشن ہوں گے اس لئے ہم چند من چلے وہاں کسی طرح چکر لگا کر پہنچ گئے تھے۔ وہاں ننّھے بھائی کو دیکھ کر کچھ اداس سی پڑ گئی ہم سمجھے تھے یہ انگاروں کے تخلیق کار کچھ شعلہ اگلتے ہوئے دھواں دھار قسم کے ہوں گے۔ مگر ننّھے بھائی بڑے پیار اور نرمی سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے قطعی تیر و تفنگ سے دور کی تعمیر اور تخلیق کی باتیں کچھ احساس کمتری ہونے لگا یہ لوگ کس قماش کے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھ کر تصور کہتا ہے یہ طوفان اور بگولے ہوں گے ایک دھماکے سے آئیں گے اور بمباری شروع کر دیں گے۔ مگر یہ تو تعمیر اور تخلیق کا ذکر لے بیٹھے۔ یہ لوگ عجیب منچلے ہیں۔ ہمیشہ غیر متوقع حرکت کریں گے۔ مگر ان لوگوں کی تقریروں سے اتنا سمجھ گئی کہ یہ کچھ ڈھا رہے ہیں تو ساتھ ساتھ نئی عمارتوں کی بنیادیں رکھتے چل رہے ہیں۔ بہت کچھ ٹوٹتا جائے گا نئی دنیا کی دیواریں اٹھتی جائیں گی۔

ننّھے بھائی اس وقت بہت دُبلے اور زرد رو تھے۔ اس کے باوجود ان کے چہرے پر اس زمانے کے تمام جوشیلے نوجوانوں جیسی جھلاہٹ اور بے چینی نہیں تھی بڑی معصومیت اور سادگی تھی جیسے یہ کوئی انقلاب لانے نہیں پھولوں کا گلدستہ سنوارنے کا پروگرام بنا رہے ہوں۔ ایک دھیمی سی ازلی مسکراہٹ تو ان کے سارے وجود پر طاری ہی رہتی تھی ہر بات خوش دلی سے کرتے۔

اس دن میٹنگ سے واپس لوٹ کر اور لوگوں سے زیادہ ننّھے بھائی ہی ہماری گفتگو کا موضوع بنے کیونکہ وہ ایک معمہ تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ پرسکون تھے ان کے وجود میں کہیں کیل کانٹے نہیں نظر آتے تھے۔ ان کا کوئی جملہ دماغ میں سوئی کی طرح نہیں چبھتا تھا تو پھر وہ کیوں یاد رہے کیوں ان کی طرف توجہ مبذول ہونے پر مجبور ہوئی یاد نہیں اس وقت ننّھے بھائی کی شادی ہو گئی تھی یا نہیں لیکن جب شادی ہوئی تھی تو بھی بڑے مایوس ہوئے تھے۔ سنا تو میرج بھی نہیں تو بھلا یہ کیسے انقلابی ہیں کہ عشق بھی نہیں چلایا۔ بھلا خود انسانی حقوق کے لئے لڑتے پھرتے ہیں اتنے دن ولایت رہ کے آئے چلو میم وغیرہ سے نہیں تو اپنے دیس میں ہی کوئی عشق چلاتے۔ اس زمانے میں ہم لڑکیوں کو باغیانہ قسم کے معاشقوں سے بڑی تقویت محسوس ہوتی تھی۔ نہایت کوئی الٹ گھر میں انقلابی شادی پر بڑے ہنگامے ہوئے تھے۔ زندگی کے اور مسئلوں کا نہ کوئی تجربہ نہ دلچسپی۔ عشق سب سے چٹپٹا موضوع تھا تو سنا کہ گھر والوں نے اپنی پسند سے لڑکی ڈھونڈی اور یہ دولہا بن کے گئے اور شادی کر لی۔ کچھ یاد نہیں پڑتا مگر دلہن دولہا کا ایک تصور نہ جانے کہاں سے ہتے چڑھ گئی جسے دیکھ کر دل ڈوب گئے کہ باقاعدہ دھوم دھام سے شادی کی نہ کسی نے عاق کرنے کی دھمکیاں دیں نہ کچھ بارود بازی ہوئی۔

ایک ایسے سادھارن معمولی انسان کا پھر لوگ آپس میں تذکرہ کیوں کرتے تھے۔ ان کے چرچے کیوں تھے۔ ننّھے بھائی ہماری توجہ کا مرکز کیوں بنتے تھے۔ سنا تھا شراب بھی پی کر اودھم نہیں مچاتے۔ یا خدا یہ کیسے انقلابی ہوئے کہ ان کی شادی بھی ماں باپ کی مرضی سے ہوئی تک ہوا۔ پورے پکے دولہا بنے یہ سب نہایت غیر انقلابی حرکتیں ہیں۔

بات یہ تھی کہ ہم اس وقت گھر کی بڑی بوڑھیوں سے آزادی کے لئے لڑ رہے تھے اور ننّھے بھائی فرنٹ پر پہنچ چکے تھے۔

وہ ایک ایسا سپاہی تھے تو جو توپ تفنگ سے نہیں پھولوں کی چھڑیوں سے لڑتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارے اصلی دشمن یا ہمارے تیج تہوار ہمارے ماتھے آئیں اور جو کبھی جالا نہیں۔ ہم پر حکومت کرنے والے انگریزوں نے ہی برسوں ہمیں یہی یقین دلایا کہ ہمارے دشمن ہمارے مذہبی تو ہم ہماری تہذیب کی تاریک دعائیں اور جاہلانہ رسومات ہیں۔ تاکہ ہم اپنی ساری روایات سے متنفر ہو کر ان کی پرچھائیں بن جائیں۔ اپنا ماضی ٹھکرا کر ان کی پوجا کریں۔ ننّھے بھائی جانتے تھے کہ ہمارے اصلی دشمن کون ہیں۔ وہ اقتصادی اور سیاسی محرومیاں جو ہمارا مقدر بنی ہوئی تھیں میری دوسری ملاقات ننّھے بھائی سے ان کے گھر سکری بھون کے کمرے میں بمبئی میں ہوئی اس وقت وہ کیفی اعظمی اور موتی بیگم کا نکاح پڑھوا رہے تھے۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں مگر یقیناً موتی کے خاندان والوں نے اس شادی کی مخالفت کی ہوگی۔ موتی کے والد صاحب بڑے روشن خیال تھے انہوں نے بیٹی کو بمبئی لا کر برادری کی مرضی کے خلاف نکاح کر دیا۔ قاضی موگھے نکاح پڑھا رہے تھے ننّھے بھائی گواہ تھے جب قاضی جی نے کیفی کی مذہبیت کے بارے میں پوچھا تو ننّھے بھائی نے بڑی متانت سے جواب دیا سنی المذہب۔ وہ اس لئے کہ اگر یہ کہہ دیتے کہ کیفی شیعہ ہیں تو شیعہ مولوی کو بھی بلانا پڑتا۔ خوامخواہ تین چار گھنٹے لگ جاتے۔

ننّھے بھائی یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہمارا سو اور مذہبی روائتیں اگر ہم نہ چاہیں تو ہمارے دشمن ثابت نہیں ہو سکتیں۔ خاندان کی

روایتیں ہمارے [illegible] خود [illegible] وقت کی [illegible] ہے۔ اصل دشمن کو پہچانو، اس کا مقابلہ کرو۔

کیفی کی شادی کے بعد بنے بھائی سے سرسری سی ملاقاتیں رہیں پھر ملک تقسیم ہوا تو وہ پاکستان چلے گئے اور وہاں وہ جیل میں ڈال دیئے گئے۔ ان کے تذکرے برابر میٹنگوں میں ہوتے رہتے وہ اور فیض احمد فیض کیا کر رہے ہیں کیسے ہیں۔ یہاں ہندستان میں چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ رضیہ پر کیا بیت رہی ہے۔

یہ سب چلتی پھرتی ملاقاتیں تھیں لیکن میری اصلی ملاقات بنے بھائی سے اس وقت ہوئی جب میں لکھنو کانفرنس میں شرکت کے لئے گئی تو بنے بھائی کے گھر ٹھہری۔

وہاں رہ کر میں نے پہلی بار بنے بھائی کا بحیثیت ایک انسان کے مطالعہ کیا۔ بنے بھائی اپنی خاندانی کوٹھی کے پچھواڑے نوکروں کے کوارٹروں میں رہتے تھے صحن کے لئے دیوار اٹھی ہوئی تھی۔ کمرے پرانے اور بوسیدہ تھے۔ ایک بڑے سے کمرے میں کئی پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ سخت جاڑے پڑ رہے تھے اور ہم سب وہاں ساتھ ہی سوتے تھے۔

بنے بھائی کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا رضیہ لکھنو کرامت حسین اسکول میں پڑھاتی تھیں ان کی کمائی پر گھر کا خرچ چلتا تھا۔ گھر کو دیکھ کر تنگی ترشی کی زندگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ لحاف تھے نہ سہی مگر تازہ روئی کے اور گرم تھے۔ بڑا مزہ آتا لحافوں میں سب بچیاں گھس آتیں۔ بنے بھائی بھی ان کے ساتھ گھس کر بیٹھ جاتے اور خستہ مونگ پھلیوں کا دور چلتا جاتا اور زمانہ بھر کی باتیں ہوتی جاتیں۔ اس عسرت میں بھی بنے بھائی نہایت بھلے چنگے نظر آتے تھے۔ ان کے چہرے پر اپنے ادبی سکول اور الیاں کی سرخی جھلک آئی تھی۔ دبلے پتلے رشتہ کے بنے بھائی سے زیادہ خوش حال نظر آ رہے تھے۔

میں نے کچھ کراچی کا ذکر چھیڑا تو بڑے بھولپن سے بولے۔

"ارے بھئی ہماری تو وہاں بڑی خاطر مدارات کی گئی۔"

میں نے کہا "کچھ مارا پیٹا نہیں" بولے۔

"توبہ کرو بجو انگلی تک نہیں چھوائی ارے بھئی ہم نے کچھ کیا بھی تو نہیں شاید یہی بھول چوک میں پکڑ لیا تھا۔"

مجھے پھر وہی پرانی ناامیدی کا احساس ہونے لگا۔ بنے بھائی اپنی ہر بات کو اس قدر معمولی بنا کر پیش کرنے کے عادی تھے۔ جیسے جو کچھ قربانیاں انھوں نے زندگی میں دیں وہ کوئی حقیقت نہیں رکھتیں وہ چاہتے تو ولایت سے آ کر کوئی شاندار نوکری سنبھال لیتے لاکھوں کی جائیداد بناتے عیش کرتے۔

میں ایک واقعہ کبھی نہیں بھولوں گی۔ جن دنوں میں وہاں تھی سخت جاڑے پڑ رہے تھے۔ رضیہ نے بڑی بیٹی نجمہ کے لئے نیا کوٹ بنوا دیا کیونکہ اس کا کوٹ چھوٹا ہو گیا تھا۔ اس نے نسیم کو مل گیا چھوٹی بہن ہونا بھی قیامت ہے۔ نسیم ضد کرنے لگی کہ پرانا کوٹ نہیں پہنے گی۔ رضیہ نے مجھ سے کہا ذرا اسے سمجھاؤ نیا کوٹ بنانا مشکل ہے۔ میں نے بچی کی آنکھوں میں بغاوت کی چنگاریاں سلگتی دیکھیں۔ سمجھ گئی میرے سمجھانے پر نفرت کرے گی مجھے بھی اپنا دشمن سمجھے گی۔ میں نے کہا۔

"نسیم بیٹی چاہے جاڑے میں اکڑ کے نمونیہ میں مر جاؤ مگر یہ پرانا کوٹ نہ پہنا۔ رضیہ کو بجائے مجھ پر غصہ کے نہ جانے کیوں ہنسی آ گئی سب ہنسنے لگے نسیم بھی ہنسنے لگی۔ مگر بنے بھائی کے چہرے پر صرف اپنی وہی ادبی مسکراہٹ طاری رہی۔ مجھ سے سہم کر بولے "بھئی ہم بڑے ہی نکمے ہیں۔ اپنی لاڈلی بیٹی کے لئے نیا کوٹ بھی نہیں بنوا سکتے"

رضیہ یا تو چڑی بیٹھیں تھیں یا بنے بھائی نے خود کو نکما کہا تو بگڑ بیٹھیں الٹا اڑنے لگیں "وہ تم کماتے نہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کچھ کرتے نہیں"

بنے بھائی نے کہا "جو کما کر لاتا ہے وہی اصل مرد سمجھا جاتا ہے"

"وہ بھی جو دوسروں کا خون چوس کر کماتا ہے اور روز شراب پی کر بیوی بچوں کو جوتے مارتا ہے"

بنے بھائی نے لاجواب ہو کر سر جھکا لیا کہنے لگے۔

"دیکھو ہمیں کیسی دیوانی بیوی ملی ہے۔ بیویاں تو میاں کی جان کھایا کرتی ہیں۔ یہ نگلی نکھٹو میاں کی شکایت میں ڈٹ جاتی ہے"

حالانکہ وہ جانتی تھی کہ آج اگر سجاد ظہیر خود فروشی پر تیار ہو جائیں تو محل کھڑے ہو سکتے ہیں۔

اور ان پرانے مگر گرم لحافوں میں دبکے ہوئے الٹے ترچھے بچوں کی ٹانگوں میں الجھے ہوئے وہ علم ادب اور سیاست اقتصادیات پر بڑے غیر مقررانہ انداز میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی گتھیاں سلجھایا کرتے۔ ان کی باتیں سن کر ایسا لگتا دنیا میں ہر مشکل کتنی معمولی کتنی بے حقیقت ہے۔

بنے بھائی انتہائی سادگی پسند تھے۔ میز پر کھانے کے بعد وہیں کوئی ادبی مسئلہ چھیڑ بیٹھتے رکابیاں سرکا کر کتابیں کھول لیتے۔ خشک میوہ کھاتے جاتے حافظ اور میر پر تبصرہ کرتے جاتے اتنے میں سردار اور مجاز بھی آ جاتے ظ انصاری اور یار حیدر بھی وہیں اسٹول کرسیاں گھسیٹ کر سب گھس بیٹھتے۔ یہاں تک کہ چائے کا وقت ہو جاتا بحثیں چلتی رہیں جملے چھٹتے رہتے۔ کبھی فرمائش پر کوئی اپنا کلام سنانے لگتا۔ مجاز بھی آ جاتے اور باقاعدہ مشاعرہ شروع ہو جاتا کبھی کسی کی کہنی لگ جانے سے چائے چھلک کر کسی کتاب کو تر کر دیتی اور رضیہ بڑبڑانے لگتیں یہ مشاعرے اور مباحثے عام طور پر اصلی کانفرنس سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوتے۔

اس کے بعد بھی کئی بار میرا لکھنو جانے کا اتفاق ہوا انھیں کے ہاں قیام رہا بنے بھائی اور ادیبوں شاعروں کو جمع کر لیتے اور رات گئے تک سلسلہ چلتا رہتا۔ دیکھنے میں بڑے خاموش سے نظر آتے تھے لیکن بے تکان گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ بچوں کی شرارتوں سے لیکر بڑے بڑے ملکوں کے رہنماؤں کے کارناموں تک بالکل ایک ہی سی دلچسپی اور انہماک سے۔ ان سے باتیں کرتے وقت قطعی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ کسی اہم مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔ ذرا بھی دماغ پر زور نہ پڑتا ایک لمحہ کو طبیعت بور نہ ہوتی۔ بس دماغ کے سارے روزن کھل جاتے اور تازہ ہوا روشنی آنے لگتی۔

کبھی کبھی ان کا کراچی آنا ہوتا رہتا تھا۔ بارہا میرے ہاں بھی قیام کیا۔ وہی دھیمی دھیمی انداز گفتگو۔ کبھی لوگ جمع ہو جاتے بیٹھے باتے کا شغل شروع ہو جاتا۔ بےّ بھائی کو مدہوشی اور حواس باختہ دیکھنے کا دل میں ارمان ہی رہ گیا۔ کبھی دو من چلے آپس میں کسی سیاسی یا علمی مسئلے پر الجھ پڑتے نہ جانے کیسے ہوتے ہوئے بےّ بھائی انہیں ٹھنڈا کر دیتے نہ چہرے پر شکن آتی نہ زبان میں میں نے کبھی تلخی محسوس کی۔ میں نے کبھی انھیں غصہ میں نہیں دیکھا۔ بڑے غصہ کی بات بھی بڑی نرمی سے کرتے۔ ان میں بے جا انکساری کی عادت نہ تھی۔ ہمیشہ دوستانہ طور کی طرح ہم کلام بات کرتے تھے۔ ان کے کبھی آنے سے ایک عجیب رنگ چھا جاتا۔ جنہیں کمی میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی فرصت نہ ہوتی وہ سب ایک ساتھ جمع ہو جاتے۔ جیسے کوئی شادی بیاہ ہو رہا ہو۔ ہم سب کو ایک ساتھ جمع رکھنے اور رشتہ قائم رکھنے میں بےّ بھائی کے وجود کو بڑا دخل تھا۔ ان کے آنے سے دلوں کی کدورتیں کھلا دی جاتیں شکایتیں مٹ جاتیں اور سب مل جل کر ہنس بول لیتے۔

ان کی طبیعت میں حقیقت پسندی اور رومان کا ایک حسین امتزاج تھا۔ ان کی چال ڈھال میں ٹھہراؤ تھی۔ اور چہرہ پر پیغمبرانہ نور۔ وہ ایک پیارے دوست مشفق صلاح کار اور مکمل رہنما تھے۔ ان کی آواز انسان کو خود اپنے ضمیر کی آواز لگتی تھی۔

بےّ بھائی ایک مکمل انسان تھے۔ ان کی خامیاں بڑی پیاری تھیں اور کسی کے دل پر زخم نہیں چھوڑ گئیں مجھے نہیں معلوم کہ وہ خامیاں کیا تھیں۔

کبھی بڑی نرم آواز میں کہا کرتے تھے۔

"بھئی ہم بڑے معمولی انسان ہیں ہم نے زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ بھی انجام نہیں دیا۔ تم لوگوں نے ہمیں یونہی چڑھا دیا ہے"

میں ان سے کہا کرتی۔

"تو آپ کا خیال ہے ہم لوگ احمق ہیں"

"احمق تو نہیں مگر کسی غلط فہمی میں ضرور مبتلا ہو"

میں کہتی۔

"آپ نہیں جانتے مگر آپ نے کچھ دروازے کھولے ہیں۔ کھڑکیاں توڑی ہیں۔ راستے دکھائے ہیں کیا یہ تخلیق نہیں ہے"

"تم بہت اچھی بحث کرتی ہو" وہ بڑے خوش ہو کر کہتے۔

"اور آپ بڑا رجعت پسند جھوٹ بول رہے ہیں"

مگر وہ بارہا اپنی میٹھی میٹھی پر اثر آواز میں مجھے قائل کرتے کہ انھوں نے زندگی میں کچھ نہ کیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ خواب دیکھنے والا پل بھر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک عمر کا عرصہ بہت ناکافی پڑتا ہے۔

بےّ بھائی نے ساری عمر روشن اور جگمگاتے خواب دیکھے۔ کتنے ہی ادھورے اور دھندلے رہ گئے۔ وہ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی مگر انھیں اس کا مطلق احساس نہیں تھا کہ ان کی ناول "لندن کی ایک رات" اپنا ایک واضح مقام رکھتی ہے۔ اور وہ خطوط جو انھوں نے رضیہ کو لکھے ان میں انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ شاید رضیہ نے ان خطوں ہی کے سہارے زندگی کی تلخیوں کو اس خوبصورتی سے جھیلا۔ یہ خط انھوں نے صرف اپنی پیاری بیوی کو لکھے تھے۔ مگر دنیا کے ضمیر سے خطاب کیا ہے۔

آج بےّ بھائی اس دنیا میں نہیں۔ مگر بےّ بھائی وہ نہیں۔ کیسے ہو سکتے ہیں۔ آج پانچ نومبر ہے۔ آج وہ یہاں ہیں۔ ہمارے دلوں ہی میں نہیں ہمارے پاس ہی کہیں بیٹھے ہیں۔ ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ ہے اور بھاری بھاری روشن آنکھوں میں خواب جگمگا رہے ہیں۔

●●●

ہونٹوں سے کم

ہونٹوں سے کم،
گرم مہکتی سانسوں سے،
نم آنکھوں سے،
تم نے پوچھا:
"کیا ہم سے محبت کرتے ہو؟"
بس ایک حرف منہ سے نکلا،
"ہاں!"
کتنا معمولی،
چھوٹا سا،
یہ مکمل لفظ ہے!
کیسے دکھلائیں تم کو
اس پوشیدہ، خوابیدہ
وادی کو
جس میں
نور کی بارش ہوتی ہے،
جھرنے بہتے ہیں نغموں کے،
اور کلیے، قد آور پیڑ چنار کے،
اپنے جھل مل، سبز، خشک سایوں کو
پھیلاتے ہیں
جیسے خود جینے کے رستے!
یہ سب دولت، دل کو
تم نے ہی تو دی ہے!

●●●

آشا

آشا
اوس جیسی خاموش
تھرتھراتی،
پیار کے پہلے بوسے کی طرح
سہمی، لجاتی،
ہزاروں تمناؤں کی
مسکراتی گلابیاں
مکھڑے پر بکھیرے
کتنے دبے پاؤں آتی ہے،
اور ایسا لگتا ہے کہ
جھک کر
کان میں
کسی رہسیہ کا امرت
گھول دے گی
لیکن نیند کے دھند لکوں سے بوجھل
ڈبڈبائی آنکھیں
رہ رہ کر،
دھیمے دھیمے،
اُس سے یہی پوچھتی ہیں
بدنصیب!
تو نے میرے
اُس چمکتے ستارے کو
کہاں چھپا دیا؟
(پچھلا نیلم سے ماخوذ) سجاد ظہیر

سید سجّاد ظہیر — بامقصد ادب

دوسرے پہلو سے ہم پر اعتراض کرنے والے جدید اور "نئے" خیالات کے لوگ تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک، ادب میں افادیت اور مقصدیت داخل کر کے ادب کو اس کے اصلی منصب سے نیچے گرا رہی ہے۔ ان کے نزدیک ادیب کا یا فن کار کا مقصد ادبی یا فنی تخلیق سے صرف اپنے جمالیاتی حظ کی تسکین ہے۔ کسی بھی خیال، نظریہ یا مقصد کی پابندی سے فنکار کی تخلیقی قوت فنا ہو جاتی ہے۔ فن کار کی اپنی ایک اندرونی دنیا ہوتی ہے، الفاظ ایک الہامی کیفیت رکھتے ہیں، کوئی پُراسرار قوت (خواہ وہ الوہی ہو یا فطرت کی طرف سے ودیعت کی ہوئی ہو) فن کار کو تخلیق پر مجبور کرتی ہے۔ فن کار کی ذمہ داری اسی قوت کو کام میں لانے کی ہے، وہ اپنے سامعین، قارئین، ناظرین، سماج یا عوام یا نوعِ انسانی کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔

ان کا ملک کے عام لوگوں میں بہت کم اثر اور رسوخ تھا۔ اس نظریے کا قائل مغربی یورپ کے رجعت پرست ادبی خیالات سے متاثر تھے۔ اس بات سے کسی کو تو انکار نہیں تھا کہ آرٹ اور ادب کا ایک مقصد انسان کو جمالیاتی حظ پہنچانا بھی ہے۔ اور یہ کہ فنونِ لطیفہ کا طریقہ سائنس یا علمی تحقیقات کے طریقے سے مختلف ہے۔ سائنس (یا علم) میں تجربہ اور تحقیق کے ذریعے ہمارے سامنے واقعات اور سچائیوں کا براہ راست انکشاف ہوتا ہے، جن کی بنیاد پر پھر ہم اپنی زندگی کو بہتر اور زیادہ بارآور بناسکتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ، تجربات، مشاہدات اور علمی حقائق اور معاشرت کے رشتوں اور ان کے عمل اور ردِّ عمل سے انسانوں کے ذہن میں جو جذباتی اور نفسیاتی کیفیات پیدا ہوتی ہیں ان کے کسی پہلو کا اظہار کرتے ہیں۔

اس اظہار سے، اگر وہ خوبی سے کیا گیا ہے، ہمیں حظ بھی ہوتا ہے اور ہماری روح اور نفس کا تزکیہ بھی۔ ہم بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ سوال اصل میں یہ ہے کہ اس طرح سے ہمارے ذہن میں جو روشنی آتی ہے اور جو روحانی حظ حاصل ہوتا ہے، اس طرح سے ہم جو سیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں، اس کی نوعیت کیا ہے؟

ترقی پسندوں کا کہنا یہ ہے کہ صرف وہی حظ، وہی جمالیاتی تسکین اور وہی سیکھنا اور سمجھنا انسانوں کے لیے اچھا اور صحت مند ہے جو ان میں پاکیزگی اور طہارت، زندگی کی اُمنگ اور حوصلہ، جہتِ حیات میں صلابت اور دانش مندی اور نوعِ انسانی سے ہمدردی پیدا کرنے میں معین اور مددگار ہو۔ اور اس طرح سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی حیات ان کے ظاہر و باطن دونوں کو زیادہ حسین، زیادہ لطیف اور زیادہ بھرپور بنائے۔ ایسا حظ اور ایسی جمالیاتی تسکین جس سے ہمارے ذہن میں اُلجھنیں بڑھ جائیں، جو ہمیں اپنے عہد اور اپنے سماج کی سب سے اہم حقیقتوں کے انکشاف اور شعور سے دور لے جائے، جس سے ہماری طبیعتوں

میں کثافت پیدا ہو جو ہماری روح کو مکدّر اور بے حس کر کے ہمیں خود پرستی، جہالت، بزدلی یا مایوسی کا شکار بنا دے، جو ہماری انسانیت ہم سے چھین کر ہمیں نوعِ انسانی سے نفرت کرنا سکھائے اور جو ہمارے دلوں میں سوز و حرارت پیدا کرنے کے بجائے انہیں پتھر کا بنا دے، ہمیں قابلِ قبول نہیں، ہم اسے مسترد کرتے ہیں، ہم اس کے مخالف ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ فن کار اپنی تخلیقی قوتوں کو کام میں لا کر جب بہترین ادب تخلیق کرتا ہے تو اس سے ہم میں کیف اور انبساط پیدا ہوتا ہے اور روحانی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ہم کیف و بدمستی میں فرق کرتے ہیں۔ لذّت اندوزی اسی حد تک ٹھیک ہے جب تک اس سے آسودگی اور سرور ہو۔ جب وہ بہیمیت میں بدل کر ہمارے بدن کو چور کر دے، ہمارے ذہن کو پراگندہ اور ہماری روح کو مُردہ تو پھر وہاں پر ہم حد کھینچ دیتے ہیں۔ فن برائے فن والوں سے ہمارا بنیادی اختلاف یہی تھا کہ وہ اس حد کو کھینچنے کے قائل نہ تھے۔

دنیا میں عام طور پر اور مشرق میں خاص طور پر اور ہمارے ملک میں بھی فنونِ لطیفہ اور ادب کے ارتقا کی تاریخ ہمارے اس نظریہ کی پوری طرح تصدیق کرتی ہے۔ فنونِ لطیفہ (رقص، موسیقی، شاعری، مصوری، سنگتراشی) کی ابتدا انسانوں کے اجتماعی تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ، زندگی کو برقرار رکھنے اور سامانِ معیشت کی پیداوار کو بڑھانے اور ان کی فراہمی کو بہتر اور زیادہ جوشش اور حوصلہ مندی سے حاصل کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ زندگی میں انبساط اور حظ، کیف و سرور انسان کی بنیادی ضرورتوں اور بنیادی خواہشوں کی آسودگی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور جب انسان ان ضرورتوں اور خواہشوں کو کسی مجبوری کے سبب پورا نہیں کر سکتے تب اس لاچاری اور بے بسی کی حالت میں بھی انہیں پورا کرنے کی آمید، آسودگی کا خواب اور تمنا ان کے دلوں کو مسرور کرتی ہے لیکن اس مسرّت کے ساتھ محرومیوں کے غم کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔

اسی سبب سے ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں سے بالجبر لوٹے جانے والے اور محروم انسانوں کے نغموں اور شعروں میں درد اور دکھ کی المناک صدا ملی ہوئی ہے۔ لیکن ان رنج بھری آہوں کے پیچھے دراصل زندگی کے تقاضے ہوتے ہیں۔ ان ناجائز اور ناروا بندشوں کے خلاف شکوہ ہوتا ہے اور ظلم کی ان زنجیروں کو توڑ دینے کی خواہش ہوتی ہے جن سے نوعِ انسان کی اکثریت آج بھی بندھی ہوئی ہے۔

ہمارے ملک میں رقص، موسیقی اور ڈرامے کے فنون نے عہدِ قدیم میں غیر معمولی ترقی کی تھی۔ اور ان کے بارے میں پہلی بنیادی علمی کتاب بھرت کی "ناٹ شاستر" ہے، جو غالباً دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح میں مرتب ہوئی تھی۔ ہماری موسیقی اور رقص کی بنیاد اسی شاستر کے لکھے ہوئے اصولوں پر ہے۔ بعد کو رقص اور موسیقی ہمارے سماج کے اجتماعی تجربوں اور مشاہدوں اور ہمارے ماہرین اور عالموں کی تحقیق اور تفتیش کی بنیاد پر ایک زبردست علم کی حیثیت اختیار کر گئے۔ جہاں پر انسانی آواز کی تمام امکانی صورتوں اور ان کی مختلف ترتیب کو ریاضی کے فارمولوں کی طرح منظم کر لیا گیا ہے، جس کی مدد سے وہ ایک بچّے کو بھی حساب اور جیومٹری کی طرح سکھائی جا سکتی ہے۔

انسانی جذبات کے اظہار کو اس قدر علمی شکل میں مرتب کر لینا ہماری قوم کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ کیا فن برائے فن یا شُدھ کلا (خالص آرٹ) کے ماننے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سب سے زیادہ لطیف اور بادی النظر میں "خالص" فن کی بنیاد اور اس کا مقصد جاننے بوجھے ہوئے انسانی جذبات کا اظہار نہیں تھا؟ سنگیت اور راگ کا مقصد ہمارے شاستروں نے آوازوں کے تناسب کے ذریعے سننے والوں کو مسرور کرنا بتایا ہے۔ موسیقی کی تعریف "دلفریب آواز" کی گئی ہے اور اس دلفریبی کی بنیاد نو بنیادی انسانی جذبات پر رکھی گئی ہے:

۱۔ شرنگار رس — یعنی جذبۂ محبت

۲ - ہاسیہ رس — جذبۂ خندگی یا ہنسی
۳ - کرونا رس — جذبۂ ترحم
۴ - ویر رس — جذبۂ شجاعت
۵ - رودر رس — جذبۂ غضب
۶ - بھیانک رس — جذبۂ خوف
۷ - بی بھتس رس — جذبۂ نفرت یا تحقیر
۸ - اُدبھت رس — جذبۂ حیرانگی
۹ - شانت رس — جذبۂ امن و سکون

گویا ان جذبوں کا خوبصورتی کے ساتھ پیدا کرنا موسیقی اور رقص کے بنیادی مقاصد ہیں۔ کیا اس سے زیادہ صاف طرح سے آرٹ کے مقاصد کا جو زندگی سے بالکل وابستہ ہو اظہار کیا جا سکتا ہے؟

ہماری مصوری کا نقطۂ عروج اجنتا کے غاروں کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویریں ہیں۔ وہ سب کے سب گوتم بدھ کی زندگی، ہندوستان کے سماجی اور اخلاقی اصولوں کو زندگی اور تاریخ کے واقعات کی صوری شکل میں پیش کرکے، دیکھنے والوں کو ایک خاص مقصد کی طرف مائل کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔

گاندھار اور گپتا عہد کی بے مثال بت تراشی ایک خاص پیغام، ایک خاص مقصد کے لیے کی گئی تھی اور یہ مقصد اس عہد کا سب سے بلند سب سے زیادہ انسانی مقصد تھا۔ اور چونکہ ان مقاصد کا حسن اور اُن کی ستودگی، اور ان کی بلندی اور پاکیزگی آج بھی ہماری قوم اور نوعِ انسانی کے لیے ایک برگزیدہ پیام رکھتے ہیں، اس لیے ان کا تاثر اور دلکشی اہلِ بصیرت کے لیے آج بھی باقی ہے گو ہمارے عقائد بدل گئے، ہمارا علم بڑھ گیا ہے، ہمارے سماج کی ترتیب دوسری ہے، ہمارے سماجی نصب العین کی منزل اور ہے لیکن ہمارے پرانے آرٹ کے بہترین نمونے، ہمارے تہذیبی خمیر، ہمارے تمدنی مزاج کا حصہ بن کر آج بھی ہمیں زیادہ اونچی سماجی اور انسانی بلندیوں پر جانے کا پیغام دیتے ہیں۔

فن برائے فن کو ماننے والے فردوسی کے شاہنامے، مولانا روم کی مثنوی اور سعدی کی گلستاں اور بوستاں، تلسی کی رامائن، انیس کے مرثیوں، وارث شاہ کی ہیر، حالی کے مسدس اور اقبال کے کلام کے بیشتر حصوں کو غالباً فن ہی نہیں مانیں گے۔ اس لیے کہ ان ادبی شہ پاروں میں صاف اور کھلے طریقے سے چند اخلاقی اور روحانی اصولوں کو ان عظیم شاعروں نے پیش کیا ہے، اور ان کا کھلا ہوا مقصد اپنے عہد کے انسانوں کو بہتر انسان بنانا ہے۔

تاہم اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ فنونِ لطیفہ اور اخلاقی پند و نصائح، سیاسی تبلیغ یا محض علمی (سائنسی) واقعہ نویسی میں کوئی فرق نہیں۔ ایک کامیاب فن کار حقائق و واقعات، مختلف انسانی رشتوں کے عمل اور ردِ عمل کی کیفیتوں، سماجی زندگی سے پیدا ہونے والے بہترین تصورات اور نظریوں (یعنی تعمیات) کا مشاہدہ کرکے اور انھیں سمجھ کے اپنے دل و دماغ میں جذب کرتا ہے۔ یہ سچائیاں اس کے جذبات کا اسی قدر حصہ بن جاتی ہیں، جتنا کہ اس کے ذہن کا۔ پھر اپنے جوش، جذبے، تخیل، بصیرت اور فنی مہارت کو کام میں لاکر وہ اپنے فن پارے کی تخلیق کرتا ہے۔ اس طرح ایک نئی، خوشنما اور نشاط انگیز شے وجود میں آتی ہے۔ ایک الہامی نغمہ جس سے دل کو سرور ہوتا ہے، دماغ میں روشنی آتی ہے اور جو ہماری روح میں اہتزاز پیدا کرکے اس میں نئی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کا حوصلہ اور رجحان پیدا کرتا ہے، سچائیوں کی زمین تجربے، مشاہدے اور بصیرت کی آب پاشی، فنی مہارت کی ٹھنڈی ہواؤں اور گہرے جذبے کی گرم، تیز اور نورانی شعاعوں کے مجموعی عمل سے تخلیق کا دانہ ایک مہکتے ہوئے رنگین اور لطیف پھول کی طرح ہمارے سامنے برآمد ہوتا ہے، ان تمام عناصر پر مشتمل لیکن ان سے مختلف تخیل، تصور اور تجربے کا متعلق جوہرِ اول ایک ...

چنگاری ۱۷

جات افزا اور فلک سیر۔

بہر حال حقائق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے اس خیال کے مخالفین دراصل عظیم فن کاری کے میدان سے باہر نکل چکے ہیں۔ ہمارے وطن اور دنیا کی قدیم فنی اور ادبی روایت ہمارے نظریوں کی تصدیق اور ان کے نظریوں کی تردید کرتی ہے اور خود ان حضرات کی اپنی ادبی تخلیق یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ رجعت پرست طاقتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر فن اور ادب کے بھی وفادار نہیں رہے ہیں جس کا وہ پہلے دعویٰ کرتے تھے۔ وہی لوگ جو ہماری تحریک کے شروع کے زمانے میں ہم پر طعنہ زن تھے کہ ہم ادب کو اشتراکی خیالات پھیلانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں آج خود پاکستان میں "اسلامی ادب" کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اور ہندوستان میں "شدھ کلا" کے پجاری، ترقی پسند خیالات سے ہندو تہذیب کو بچانے کے لیے بدترین رجعت پرستی کی طاقتوں کے ساتھ صف بستہ ہو گئے ہیں۔

اس طرح یہ ظاہر ہو گیا کہ ان کی مخالفت ہم سے اس وجہ سے نہیں تھی کہ وہ "خالص" فن کے دلدادہ تھے اور ہم ان کے نزدیک فن کو اس کے منصب سے گرا رہے تھے۔ ان کی مخالفت ہماری جمہوریت، محنت کشوں کی طرفداری، ہماری انسان دوستی اور آزادی خواہی سے تھی ان کی اصلی جگہ رجعت پرست جاگیرداروں، بڑے بڑے سرمایہ داروں اور سامراجیوں کی صفوں میں تھی، جہاں پر آج وہ پہنچ گئے ہیں ان کے یورپی پیشوا آج کھلے بندوں فاشزم کے طرفدار اور سامراجی قوتوں کے ثنا خواں ہیں۔

اس نہج کا ادبی نظریہ ہمارے وطن اور ارضِ مشرق کی بہترین ادبی روایات کے بالکل برخلاف ہے اور چونکہ دنیا کے بلند ترین فن کاروں اور ادیبوں نے ہمیشہ اپنے عہد کے سب سے زیادہ ترقی پسند اور سب سے زیادہ انسانی، اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ جس نصب العین سے ہی متاثر ہو کر اپنے فن کی تخلیق کی ہے، اس لیے اعلیٰ ترین ادبی اور فنی تخلیق کو اس عہد کی سب سے برگزیدہ انسانی جدوجہد اور نظریوں اور خیالات اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ عملی حقائق سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ ایسا وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں انسانیت اور سچائی سے کوئی سروکار باقی نہ رہ گیا ہو۔ رجعت پرستوں کی بہت بڑی طاقت اور بہت زیادہ وسائل کے باوجود ان کا زوال اسی سبب سے ہو رہا ہے کہ انھوں نے انسانیت اور سچائی سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ ترقی پسند مصنفین کمزور اور کم تعداد اور کم مایہ ہونے کے باوجود اگر ترقی کر رہے ہیں تو اسی سبب سے کہ ہم نے انسانیت اور سچائی کا دامن مضبوطی سے پکڑا ہے۔ ہماری یہ گرفت جتنی ہی مضبوط ہو گی اسی تناسب سے ہماری طاقت، تعداد، مقبولیت اور فن کی تاثیر اور خوبصورتی میں اضافہ ہو گا۔

('روشنائی' سے انتخاب)

آئندہ شمارے میں • قتیل شفائی کی تین پیاری غزلیں • قمر جلال آبادی کی ایک بہت پیارے فن کار پر بہت پیاری نظم

• اصغر علی انجینئر کے مضمون کا دوسرا حصہ • عبداللہ حسین سے ...ی پریشانیوں کی وجہ اور ایک فن کار پر گوشہ۔

...و سکون کی ضرورت ہمیشہ
...ہ جان! انسان کا امتحان
...ہ اور میرے ہی لیے نہیں
...و کر تمھاری صحت اچھی ہے

سید سجاد ظہیر رضیہ سجّاد ظہیر کے نام

(اقتباسات)

سنٹرل جیل، لکھنؤ

(۱)

۱۶ر مارچ ۱۹۴۰ء

خط لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ کیوں کہ اب جب کہ تنہائی ہے بس تمھارا ہی خیال ہردم آتا ہے یہ چھوٹی سی کوٹھری جس میں اس وقت بند ہوں، شام کے سات بجے ہیں اور ہم لوگ ساڑھے پانچ بجے سے مقفل ہو جاتے ہیں بالکل خیالی معلوم ہوتی ہے۔ یقین نہیں ہوتا کہ اس میں بند ہوں اور اس وجہ سے تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ بس ایک احساس ہے۔ ایک اصلیت ہے اور ایک حقیقت۔ اور وہ یہ کہ ایک دوسرے سے جدا ہیں، دور ہیں، مجبور ہیں اور پاس نہیں ہو سکتے۔ اس وقت بڑی خوشگوار ہوا چل رہی ہے اور میں گردن کھڑکی تک موڑتا ہوں تو آسمان پر وہ ستارہ چمکتا نظر آتا ہے جو میں نے ایک دفعہ تمھیں الٰہ آباد میں جمنا کے کنارے پر دکھایا تھا۔ یاد ہے؟ غالباً زہرہ —— خوب چمکتا ہوا (یا خوب چمکتی ہوئی) ابھی تھوڑی دیر میں چاندنی بھی یہاں سے دکھائی دینے لگے گی مگر چاند دکھائی نہیں دے گا۔ اچھا ہی ہے۔ اس سے اور کوفت ہوتی ہے اور اکیلے پن کا احساس اور تیز ہوتا ہے۔ تمھاری یاد، تمھاری صورت، تمھاری ہنسی کی آواز، تمھاری سب باتیں، ایک ایک چیز، ہمارے کمرے۔ وہ صبحیں، وہ شام اور راتیں، یہ سب اتنی صاف دل و دماغ پر اپنی پرچھائیں ڈال رہی ہیں کہ میں دنیا کا نہیں بلکہ عالم خیال کا باشندہ ہو گیا ہوں۔ ان سب کے ساتھ ایک ایسا شدید روحانی درد ہے جیسے کوئی دل کے نازک ترین احساسات کو بے دردی سے مسل دے۔ اس درد کا کوئی علاج سمجھ میں نہ آئے اور درد بڑھتا ہی چلا جائے۔

مجھے قید ہوئے پانچواں دن ہے۔ ایک عجیب بات جو یہاں رہ کر معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ مشاہدے اور احساس
بصارت کو کام میں لا
الہامی تیز جس سے دل کو زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے، سب کو ہوتا ہے یا نہیں۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں یہ تبدیلی ضرور ہوئی ہے
بلندیوں کی طرف پرواز کرنے ٹا اندھیرا اور اس کا اندھیرا پن، چند ابابیلوں کا ادھر ادھر چکر کاٹنا، دوپہر میں ایک فاختہ کی آواز،
بصارت کی ٹھنڈی ہواؤں اور ں کے دیہات سے آنے والا ہونی کے گانوں اور ڈھول کا شور، میرے ساتھی قیدیوں کی چھوٹی چھوٹی
پھول کی طرح ہمارے سامنے پھر چہرے کی شکن وغیرہ۔ شاید اکیلے ہونے کی وجہ سے ایسا ہو لیکن یہ حالت ضرورت سے زیادہ ہو
شاید الجھن اس وجہ سے ہوتی ہے کہ یہاں کی دنیا اتنی چھوٹی ہے اور دل و دماغ کی دنیا بہت وسیع
دلکش کش کا عالم طاری رہتا ہے مگر یہ سب پڑھ کر تم خواہ مخواہ پریشان ہوگی، لیکن ہونا مت، کیونکہ شاید
ے ہے۔ ابھی تو بس کتابیں پڑھتا ہوں۔ جب کچھ لکھنا شروع کروں گا تو دل بہل جائے گا۔ یہاں کوئی

علمی مضمون یا کتاب لکھنا تو مشکل ہوگا۔ ایک ناول شروع کرنے کی فکر ہے۔ بہت سے پلاٹ خیال میں آرہے ہیں۔ مگر طبیعت ابھی کسی پر جمی نہیں۔

اب میرا پروگرام سنو۔ صبح کو ساڑھے چھ بجے سے پہلے اُٹھ جاتا ہوں۔ تھوڑی سی ورزش کے بعد دس منٹ باغیچے میں گھومتا ہوں۔ پھر چائے اور اخبار۔ ساڑھے آٹھ بجے تک نہا دھو کر تیار۔ نو ساڑھے نو بجے تک پھر اخبار یا کسی اور کتاب کی پڑھائی۔ اس بیچ میں اگر کوئی آیا اور اجازت ملی تو جیل کے دروازے پر گیا۔ پھر ساڑھے بارہ اور ایک کے درمیان ز گھر سے کھانا آتا ہے وہ کھایا۔ کھانے کے بعد اِدھر اُدھر ٹہلا۔ پھر پلنگ پر لیٹ کے کوئی اچھی سی ہلکی سی کتاب پڑھی، ہندی کا سبق لیا اور اونگھا یا سویا۔ اتنے میں ساڑھے تین بج جاتے ہیں۔ پونے چار سے بیڈمنٹن کھیلنا شروع کیا۔ ایک گھنٹہ کھیلنے کے بعد چائے پی —— اب اس کے ذرا دیر بعد ہی ساڑھے پانچ اور جیل پر ایک وحشت اور خاموشی چھائی" س اپنی اپنی بارک یا کوٹھری میں بند: ساڑھے پانچ سے چھ تک پھر کچھ پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد آدھ گھنٹے سے ایک گھنٹے کا وقت بڑی مشکل سے کٹتا ہے۔ نہ روشنی نہ اندھیرا، مچھر، بے ساختہ باہر نکلنے اور ٹہلنے کو جی چاہتا ہے، لیکن یہاں ساڑھے سات قدم سے زیادہ چہل قدمی بھی نہیں کر سکتے۔

سات بجے تک اندھیرا اچھی طرح ہو جاتا ہے، اور پھر سے پڑھائی شروع کر دیتا ہوں، اسی وقت ہی تمھیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آٹھ بجے کھانا (جو دن ہی کو آجاتا ہے) نکال کر میز پر سجا دیتا ہوں اور اکیلے میں جیسے بھی کھایا جاتا ہے، کھاتا ہوں، نو سے دس تک پھر پڑھائی، ساڑھے دس بجے تک بستر پر چلا جاتا ہوں۔ وہاں جب بھی نیند آئے۔

(۲)

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

میری زندگی کی بہار! تمھاری شکایتیں سر آنکھوں پر۔ میں نے کب کہا کہ میں تمھارے لائق ہوں۔ آج تمھارا دوسرا خط ملا۔ جو شاید تم نے ۱۰ مارچ کو لکھا ہو۔ کیونکہ تم نے تاریخ نہیں لکھی ہے۔ لکھنؤ کی مہر ۱۹ مارچ کی تھی۔ اور آج مجھے وہ خط دیا گیا۔ اس سے پہلے تمھارا ایک خط ۱۱ کو مجھے اور ملا تھا۔ اسی دن صبح کو میں ایک خط تمھیں بھیج چکا تھا۔ تعجب ہے کہ تمھارے دوسرا خط لکھنے کے وقت تک نہ ملا۔ بات یہ ہے کہ ایک تو جیل کی سنسرشپ، اس کے بعد ڈاک خانے والوں کی۔ خطوں میں دیر ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن میں تمھیں ہر ہفتے سنیچر کی شام کو لکھا کروں گا جو تمھیں دوشنبہ کو مل جانا چاہیے۔ تم اسی دن یا دوسرے دن جواب بھیج دیا کرو۔

مجھے اس جیل میں اگر کوئی کوفت، تکلیف اور پریشانی ہے تو اسی بات کی کہ میں تمھارے لیے کتنی پریشانیوں کی وجہ بن گیا ہوں۔

ایسی حالت میں اور ایسے وقت میں جب کہ تمھارے جسم کو آرام، دل کو مسرت اور دماغ کو سکون کی ضرورت ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ تمھارا پہلا خط تو اتنا پریشان کن تھا کہ مجھے بہت ہی تشویش بڑھ گئی۔ لیکن میری جان! انسان کا امتحان مشکل وقت میں ہی ہوتا ہے۔ یہ مت بھولنا کہ تمھیں اپنی جسمانی اور دماغی صحت کا خیال صرف اپنے اور میرے ہی لیے نہیں بلکہ اس چھوٹی سی جان کے لیے بھی رکھنا ہے جس کی تم تمام حامل اور ضامن ہو۔ مجھے اگر یہ معلوم ہو کہ تمھاری صحت اچھی ہے

اور تم اسں تکلیف دہ جدائی کے باوجود بھی اپنی نارمل زندگی بسر کرتی ہو، پڑھتی لکھتی ہو، سیتی پروتی ہو، ٹہلتی ہو، سینما جاتی ہو، لوگوں سے ملتی جلتی ہو، تو اس اسیری کا بوجھ بہت ہلکا ہوجائے گا۔ اور یہاں کی یہ خاکی دیواریں، اکیلاپن، بے کاری کم تکلیف دہ ہوں گے۔

میں نے تمھارے لیے "دیوانِ حسرت" خریدا تھا۔ وہ اسں کمرے میں میز پر رکھا تھا جس میں میں لکھنؤ میں ٹھہرا تھا۔ معلوم نہیں تمھیں ملا یا نہیں۔ عطر اور صابن تو مل گئے ہوں گے۔

دو دن سے ہماری بیرک میں ایک نئے قیدی صاحب آئے ہیں جو اینگلو انڈین ہیں۔ لکھنؤ کے رہنے والے ایک نوجوان صاحبزادے ہیں۔ کسی دکان میں نوکر تھے، کچھ روپیہ غبن کر گئے، اسں پر چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ اس غریب کو سب نے ہوّا بنا رکھا ہے۔ اسے "صاحب" کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ بے چارہ کافی سیاہ فام ہے اور ویسے بھی طرح طرح کی فقرے بازی اسں پر ہوتی رہتی ہے۔ دراصل یہاں کے رہنے والوں کی عجیب ذہنیت ہوجاتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر آپس میں لڑجاتے ہیں اور پھر من جاتے ہیں جیسے کبھی لڑے ہی نہ تھے۔ ہر شخص اسں امید میں رہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ بات ایسی ہوجائے گی جس سے اسں کو قبل از وقت رہائی مل جائے گی۔ ہمارے B کلاس میں اسں وقت پانچ قیدی ہیں۔ ہر شخص اپنے کو اہم تر اور بڑا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب، جو پولیس کے داروغہ تھے "داروغہ جی" کہلاتے ہیں۔ دوسرے صاحب جو کسی ریاست کے منیجر تھے "منیجر صاحب" کہلاتے ہیں۔ اور باوجود میری کوشش کے کہ مجھے ظہیر صاحب کہا جائے مجھے "بارسٹر صاحب" کہنا شروع کردیا گیا ہے! انسان کی خودستائی اور خودبینی کا مادّہ یہاں کافی تیز ہوجاتا ہے۔ ان رسموں کو برت کر لوگ اپنی عزت کی منہدم عمارت کو پھر سے کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن یہ جیل کا سسٹم ایک سرے سے بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ یہاں انسان کی انسانیت کو توڑ کر برباد کردینے کے تمام سامان مہیا ہیں۔ جرم کا "علاج" نہیں ہوتا بلکہ احمقانہ سزا ہوتی ہے۔ کانگریسی وزارت نے کچھ تبدیلیاں کیں لیکن وہ بالکل ناکافی ثابت ہوئیں۔

مہربانی کرکے تم پنڈت جواہرلال نہرو سے مل کر ان کی وہ کتاب واپس کردینا جو میں اسں دن اُن کے یہاں سے لایا تھا (Night on Moscow) اسں پر بادامی رنگ کا کاغذ میں نے چڑھا دیا تھا، اور وہ میری لکھنے کی میز پر رکھی تھی۔ ان کی دوسری کتاب لکھنؤ میں پڑی ہے۔ کوئی جاتا ہوگا تو واپس ہوجائے گی۔ میرا آداب بھی کہنا۔

اور ہاں تم مسٹر آغا کوتوال کو ایک خط بھیج کر ان سے میری ان کتابوں کو فوراً واپس کرنے کا مطالبہ کرو جو وہ تلاشی کے دن اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ کتابیں سب قطعی جائز طور پر رکھی اور پڑھی جاسکتی ہیں، اور اگر اس میں ڈھیل ہوئی تو پولیس والے خواہ مخواہ میری کتابیں غائب کردیں گے۔

وہ کتابیں جو منّے بھیا نے مجھے دی تھیں، اب ختم ہورہی ہیں۔ تم دھون سے بھی میری چاروں کتابیں واپس منگوا لینا۔ مجھے ان کی ضرورت ہے، کیوں کہ میں اسی فلسفے پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ اسں وقت جیل میں بند قیدی زور زور سے "ہولی" گا رہے ہیں، اور چاروں طرف سے بھی گانے کی اور ڈھول کی آواز آرہی ہے۔

اب مجھے آٹھ بجے تک اپنی کوٹھری سے باہر صحن میں نکلنے کی بھی اجازت ہے۔ آج پورا چاند نکلا ہے۔ آسمان کی نیلاہٹ تک نظر آرہی ہے۔ لیکن تم نہیں ہو تو یہ ٹھنڈی ہوا زہر معلوم ہوتی ہے۔



کھل گیا در جو ترے حسن کے مے خانے کا
جاگ اٹھا ہے مقدر مرے پیمانے کا
شمع کی لو کی حقیقت تو اندھیرا جانے
میں تو جلتا ہوا پیرہن ہوں کسی پروانے کا
آ گیا پی کے سنبھلنے کا سلیقہ ساقی
فن یہ سیکھا ہے تری زلف سے لہرانے کا
ڈال دے بحرِ محبت میں سفینہ دل
زندگی نام ہے طوفان میں گھر جانے کا
جس سے رونق ہے گلے مل کے گلستاں کی بہار
میں وہ مرجھایا ہوا پھول ہوں ویرانے کا
شیخ کیا شے ہے؟ ان آنکھوں کا اشارہ پا کر
زندگی بھول گئے راستہ مے خانے کا
مستیٔ وصل نہیں، تلخیٔ ہجراں ہی سہی
کوئی عنوان تو رکھو مرے افسانے کا
ماہ و تاباں ترے چہرے سے حسیں ہے بے شک
اس کو انداز نہ آیا ترے شرمانے کا
میرا مذہب تو محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
میں کوئی راز ہوں کعبے کا نہ بت خانے کا
جس کو ہنس ہنس کے سناتی رہی دنیا اکثر
نسیم افسانہ تھا مجھ سے کسی دیوانے کا

پریم وار برٹنی (مرحوم)

وہ اک بدن نہیں خوشبو کا ایک جھونکا ہے
جو زرد پیڑوں کے جھرمٹ پسند کرتا ہے
پرانے خط بھی بڑے کام کے نکلتے ہیں
کہ جن میں کھویا ہوا عہد مسکراتا ہے
اداس یادیں الاؤ کے گرد بیٹھی ہیں
وہی پرانی کہانی پرانا قصہ ہے
اب اس کی آنکھیں بھی لوگوں سے چھپ کے روتی ہیں
لگا کون کہ ہاتھوں میں اس کے گجرا ہے
میں سو گیا تو چلا جائے گا مرا سورج
یہ دل عجیب ہے تا صبح راہ تکتا ہے
جو تیری آنکھ میں ڈوبا تھا روشنی کے لئے
چراغ بن کے ان آنکھوں میں جھلملایا ہے
حویلیوں سے نکل کر چلی گئیں صدیاں
ہر ایک خواب مگر بام و در سے لپٹا ہے
یہ صندلوں کے مہکتے ہوئے گلستاں ہیں
یہیں وہ سانپ بھی اک پھول بن کے رہتا ہے

ایم کوٹھیاوی راہی

یہاں تو بکھری ہوئی منجمد چٹانیں ہیں
ہمارے پنکھ وہاں ہیں جہاں اڑانیں ہیں
یہ لوگ دل نہیں رکھتے فضول بولیں گے
کہ جن کے دل نہیں اُن کی غلط زبانیں ہیں
لڑھک گئے تو لڑھکتے ہی جاؤ گے ٹھہرو
قدم قدم پہ ادھر موت کی ڈھلانیں ہیں
ملے جو پیسہ تو ڈگری خرید لو صاحب
کھلی ہوئی ابھی تحقیق کی دکانیں ہیں
چہک رہے ہیں پرندے ہرے درختوں پہ
پڑی زمین پہ ٹوٹی ہوئی کمانیں ہیں

سماں یہ خواب میں اک دوسرا نظر آیا
لگی جب آنکھ رنگین مرا وطن نظر آیا
چراغ جل اٹھے جب قمقمے نہ کام آئے
ترا یہ شہر مرے گاؤں سا نظر آیا
بھری ہے آنکھ ستاروں سے ہونٹ لرزاں ہیں
وہ شخص آج ہمیں کیا سے کیا نظر آیا
لکھا ہے کیا یہی پڑھنے کو دل جلا بیٹھے
ہمیں جہاں بھی کوئی مقبرہ نظر آیا
ہوائیں اشک بہاتی ہوئی ملیں، راہی
نہ کوئی طاق نہ کوئی دیہ نظر آیا

صحن جاں سے گزر افکار کے مسکن میں آ
آج "تو" بھی نئی اقدار کے مسکن میں آ
دشت اسرار میں روپوش رہا کب تک
کبھی میری طرح اظہار کے مسکن میں آ
جنس نایاب ہے تو پر مجھے تسلیم مگر
بہر امکاں، لب و رخسار کے مسکن میں آ
عہد نو میں نئی تمثیل کا باعث بن جا
لفظ میں ڈھل کبھی اشعار کے مسکن میں آ
مجھ کو ہو جائے ترے لمس بدن کا احساس
اس طرح بھی کبھی آثار کے مسکن میں آ
اپنے شہکار سے کچھ بھی ہے اگر ربط تجھے
بن کے مہماں مرے آثار کے مسکن میں آ
فکر و جذبہ کی کوئی تازہ علامت بن جا
اک نئے تکلف سے اخبار کے مسکن میں آ

ظہیر غازی پوری

فیض وقت جو کچھ زخم بھرتے جاتے ہیں
تو ساتھ ہی نئے نشتر اترتے جاتے ہیں
کہیں وہ ہنس نہ پڑے دیکھ کر ہماری شکل
ہم آئینے کی طرف ڈرتے ڈرتے جاتے ہیں
جواز چاہتے بخشش گنہ کے کرتے جاتے ہیں
چلو خواب بھی دو چار ہیں خلوص کے ساتھ
میں بٹ رہا ہوں شناساؤں میں بکھرتے جاتے ہیں
مرے وجود کے حصے انسانیت کھلے بالوں
بھٹکتی پھرتی ہے گیسو سنورتے جاتے ہیں
سنا ہے گیسوئے گیتی تجربوں سے دھوتی ہے
حیات ذہن کو جب نکھرتے جاتے ہیں
شعور و فکر کے پیمبر کشتی حیات سے سوز
کہیں تو تو بھی ساتھی اترتے جاتے ہیں
ہر ایک گھاٹ پہ

ہیرانند سوز



یہ بھی تقدیر کا کیا طرفہ تماشا ٹھہرا
میں جہاں قتل ہوا میرا علاقہ ٹھہرا
شاید امید کی موہوم کرن باقی ہے
کیوں کڑی دھوپ میں یہ برگ شگفتہ ٹھہرا
خود بہ خود میرے سمجھنے کا پتہ دیتا ہے
یوں مری ذات کا دشمن مرا سایا ٹھہرا
مفلسی سطح سے اپنی نہ کہیں گر جائے
آپ کا ذوق مرے گھر کا کرایا ٹھہرا
کاش بے وجہ ہی پھانسی کی سزا ہو جائے
جرم جس شخص پہ ثابت ہے شناسا ٹھہرا
میرے آنگن میں جو کل رات گرے تھے پتھر
میرے سرمائے میں کچھ اور اضافہ ٹھہرا
میرا ہی دشمن جاں ہے مرا احساس شان
میں سمندر جسے سمجھا وہی صحرا ٹھہرا

شان بھارتی

کھیتوں کبھی پیپل کی چھاؤں میں
ہم گاؤں میں تھے جیسے ہوں پنچھی فضاؤں میں
لئے
دہلیز پر چراغ جلائے ہوئے گپھاؤں میں
گلشن پلٹ کے جا بھی چکے ہیں گلاب کا
جنگل سے لوٹ آئے ہیں باسی ہواؤں میں
مرجھا نہ جائے شہر کی ... کہیں نہ تھے
دل آئینہ تھے چہروں پہ چہرے عباؤں میں
لوگوں نے حسن چھپا رکھے تھے جب کہیں اُسے
پیاسوں کا اپنے دھیان ہی شاید جٹاؤں میں
گنگا کو چھپائے ہوئے ہے لیکن خبر نہ تھی
نقش تھے سر ... یہ کالی گھٹاؤں میں
ہم پوشیدہ بجلیاں بھی ہیں
خواہش، طلب، امید، ہوس، جستجو ملک
عابد گھرا ہوا ہوں کتنی داستانوں میں

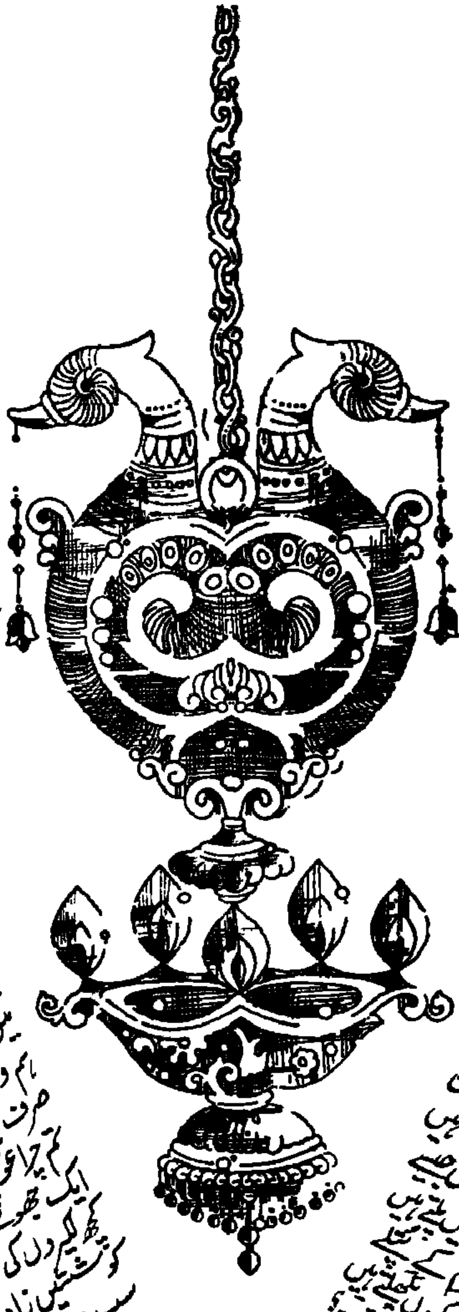
عابد مناروی

بے وفا ہے، لگے ہے، وفادار سا
ہے کوئی ایک بھی، اس اداکار سا
بک کے لوٹا ہوں، یارا رے دوستو!
میں گیا تو وہاں تھا، خریدار سا
فکر کی دیمکیں، چاٹ جائیں گی جب
گر پڑے گا تو اک روز، اشجار سا
دوستو جاں کا دشمن، وہی شخص ہے
جو نظر آئے گا تجھ کو، غم خوار سا
بیچ بازار میں، مت اچھالو مجھے
میں ترے سر پہ ہوں، ایک دستار سا
شعر کہتا ہوں یارو! میں اس وقت جب
دل میں محسوس ہوتا ہے، کچھ بار سا
مجھ پہ جس نے جو چاہا رقم کر دیا
چپ رہا میں بھی روشن جی، دیوار سا

روشن لال روشن

کھلا جب اس کا مقدر بھی پتھروں کی طرح
وہ شہرِ کفر میں پوجا گیا بتوں کی طرح
کسے خبر تھی کہ بدلے گا موسموں کی طرح
جو ساتھ ساتھ چلا دل کی دھڑکنوں کی طرح
ہمیں فرائضِ ہستی بھی یاد ہیں ورنہ
بڑے سکون سے جی لیتے جوگیوں کی طرح
تری حیات کے خاکے میں رنگ کون بھرے
تو انقلاب سے ڈرتا ہے بزدلوں کی طرح
جو بات کھل کے نہ کہہ پاؤ خط میں لکھ دینا
نہ رکھنا دل میں کوئی بات مجرموں کی طرح
اسی میں میری مسرت کا راز مضمر ہے
میں دشمنوں سے بھی ملتا ہوں دوستوں کی طرح
ہوئے ہیں وہ بھی طلب گارِ دادِ ضبط نعیم
برس رہے ہیں جو بے وقت بادلوں کی طرح

ربانی نعیم



کون ہوں، کیا ہوں، بھلا میرا حوالہ کیا ہے
یہ تو پوچھو کہ مرا درد سے رشتہ کیا ہے
چپ رہا ہوں، کچھ نہ کہوں، تیرا ارادہ کیا ہے
روز اسے ضبط نے مجھے، کوئی سکھاتا کیا ہے
میں اگر چاہوں تو خود سے بھی نہیں مل سکتا
میں گیا وقت ہوں، آواز لگاتا کیا ہے
ہم وہاں ہیں جہاں ہونے کا گماں تک بھی نہیں
صرف ہونے کے لیے ہیں تو یہ ہونا کیا ہے
تم چراغوں کی لویں اور بڑھا دو یارو
ایک جھونکے کی طرف داریِ ہوا کا کیا ہے
کچھ لکیروں کی روایت ہے کہ سرحد بن جائیں
کوششیں نادِ صفر ہیں تو جھجکنا کیا ہے
سب مناظر نے اداسی کا کفن پہنا تھا
ہر کوئی پوچھ رہا تھا کہ یہ قصہ کیا ہے
دیکھنے آئے ہیں صدیوں سے جنم تہمت
یہ شبِ درد جو ہوتا ہے تماشا کیا ہے

اندر [illegible]

[illegible] کی دھن میں ہم گھر سے جب نکلتے ہیں
حادثے بھی سڑکوں پر ساتھ ساتھ چلتے ہیں
[illegible] دلہن چاندنی کا آنچل ہیں
چاند کی جواں دلہن کے چور من مچلتے ہیں
من چلے چکوروں میں فتنے پل رہے ہیں یوں جیسے
تنگ ذہنوں میں کیڑے نالیوں میں پلتے ہیں
بھانت بھانت کے [illegible] سر دماغ نکلتے ہیں
کانچ کے مکانوں میں سنگ کیوں نظر آتے
گرم گرم سانسوں سے چہروں پر کیوں پھسلتے ہیں
چلتے چلتے سڑکوں پر پاؤں کیوں [illegible]
دیکھئے نقاب الٹے ہاتھ میں [illegible] نکلتے ہیں
جیسے برف سے [illegible]

ایس اے رحمن کمرانوی

باعث تقلید ہوگی میری ہستی ایک دن
رنگ جب لائیگی میری فاقہ مستی ایک دن
میں یہ سمجھا تھا کہ ہوگی فن کی یوں مٹی پلید
میری تخلیق گراں بھی ہوگی سستی ایک دن
اہل ثروت بھی کریں گے قدر میری دیکھنا
ہوگی جب مشہور میری تنگ دستی ایک دن
دفن ہو جائیگی جب انسانیت زیر زمیں
اپنی قسمت پر کرے گی غم پرستی ایک دن
آج تو ہیں خاک کے تودے یہاں پر جابجا
دیکھنا رشک ارم ہوگی یہ بستی ایک دن
فرق تشنہ پر رہے گا ایکدن پھولوں کا تاج
گل کھلائیگی مری جب بت پرستی ایک دن
تشنہ بلگرامی

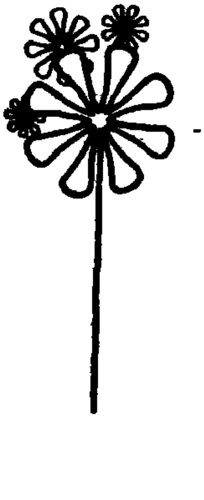
درد دل یوں چھپا گیا وہ شخص
میرا قصہ چرا گیا وہ شخص
اس کے چہرے پہ زندگی کی لکیر
کس قدر مجھ کو بھا گیا وہ شخص
رات خوابوں میں اس طرح آیا!
خوشبوؤں میں بسا گیا وہ شخص
دن کو سپنے کی اک ادا دے کر
ساری شب پھر رلا گیا وہ شخص
کیا کیا اس نے قصہ آزار
خون کے آنسو رلا گیا وہ شخص
عاصم شہواز شبلی

اچھی بہت اچھی لگی تصویر پرانی
پرزوں میں ہے اک دل کی وہی زخم پرانی
ہم دوش ہوا ہو کے پہنچ پائے خلا تک
کچھ کام نہ آئی ہمیں تدبیر پرانی
وہ لوگ کہاں ہیں جو ہمیں پڑھ کے سناتے
دیمک کی غذا بن گئی تحریر پرانی
ہم دور تلک بھاگتے رہتے ہیں نتیجہ
آنکھوں میں نئے خواب ہیں تعبیر پرانی
ابھرا ہے کے قامت کا پتہ دے نہ سکی شاہد
دیوار پہ لٹکی ہوئی شمشیر پرانی
شاہد عظیم



کتنی بے کیف ہے انداز و ادا کی خوشبو
رنگ کیا لائے گی اب دست حنا کی خوشبو
دل میں یوں تری مہکتی ہوئی یاد آتی ہے
رات کے پچھلے پہر جیسے ہوا کی خوشبو
گرچہ ماحول پہ وحشت کا اثر طاری ہے
ڈھونڈتے رہتے ہیں کچھ لوگ وفا کی خوشبو
تری زلفوں کی گھنی چھاؤں نے جو بخشی تھی
یاد آتی ہے وہی محسن عطا کی خوشبو
کس کی پر کیف نگاہوں نے غزل چھیڑی تھی
چار سو پھیل گئی جس کے نوا کی خوشبو
ساز و آواز کے جادو میں نہ کھو جا و رضا
کہیں دیوانہ بنا دے نہ فضا کی خوشبو

رضا چکدینوی



مری اے زیست

انیس جلالی



مری اے زیست
میں آج اپنی محبت کو کر رہا ہوں سلام
وہ حسرتیں کہ جو دل میں ہوگئیں روپوش
وہ دل کہ جیسے ہو مدت سے تن کے مدفن میں
وہ تن
لگے ہے جیسے
ہزار آرزوؤں، خواہشوں کا ایک مزار
مرا یہ تن ہی محبت کی یادگار ہے اب
لئے پھرتا ہوں اس یادگار کو ہر دم
اسی لئے تو ہر ایک سانس
اور ہر ایک قدم
میں آج اپنی محبت کو کر رہا ہوں سلام

میں جی رہا ہوں کہ مرنا مجھے قبول نہیں
میں جانتا ہوں کہ تن من کا رشتہ دائم
جو ٹوٹ کر بھی سدا سے رہا یونہی قائم
مجھے خبر ہے
کہ یہ مرا دل تنہا
قدم قدم پہ
ہے مرگِ ناگہاں سے لڑا
اسی لئے تو جو ہیں دفن تن کے مدفن میں
تمام حسرتوں
اور خواہشوں کو یاد رکھتا ہوں
انھیں کی یاد میں
میں آج اپنی محبت کو کر رہا ہوں سلام

یہی کیا کم ہے کہ اس زندگی سے پیار کیا
یہی کیا کم ہے
کہ مرا دل وفا شعار رہا
بلکتوں کے خزینہ کو نقدِ جاں کے عوض
سنبھالے رکھا ہے
کہ آخری دم تک
مری ہم سفر و راز داں ہو گی
صلہ کی پرواہ ہے، اے زندگی!
نہ خواہش داد

نہیں ہو ملی کوئی
مگر پھر بھی
مجھے ہے ناز کہ زندگی کا مری
ہے محبت ہی سب سے دلکش روپ۔
یہی تو روپ ہے جس کو کہ میں نے پیار کیا
بڑے جتن سے پھر اس زندگی کو رام کیا۔
قسم خلوص کی،
محبت کی اور وفاؤں کی،
تن میں مدفون آرزوؤں کی
مرے سلام کو، اے زندگی، تو کر لے قبول

تجھے سلام، محبت، تجھے ہزار سلام۔
زمانہ ساز کرے یا نہ کرے
کوئی یقین کرے یا نہ کرے
مری اے زیست!
میں آج اپنی محبت کو کر رہا ہوں سلام

شکست

یہ کمرہ
میرا قاتل ہے
مجھے ہر روز مجھ سے چھین کر
خود قتل کرتا ہے مرا
اور پھر—
میری
ریزہ ریزہ لاش اُٹھا کر
دریچوں اور دروازوں سے
باہر پھینک دیتا ہے

———×———

"شکست خوردہ آدمی"
جگنوؤں کے قتل میں ناکام ہو کر
جب وہ—
اپنے ہاتھ میں خنجر لئے لوٹا
تو اس کے گھر کے—
سارے پھول
زخمی ہو چکے تھے

———×———

"شرمندگی"
میں ——
اپنی بیٹی سے کتنا شرمندہ ہوں۔
کیونکہ —
اس کی ماں کا چہرہ
اب ——
مجھ کو بھی یاد نہیں ——!

محمد سلیم انصاری

ادارہ

اردو ادارے۔ چند سوالات

(قسط ایک)

اردو ایک زبان ہی نہیں ایک کلچر بھی ہے۔ یہ خون کی طرح ہمارے رگ و پے میں جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی دہائیوں کی مسلسل اور جان توڑ کوششوں کے باوجود اس کا چراغ گل نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی محبت اب زیادہ دلوں میں گھر کرتی جارہی ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی محبوب بنتی جارہی ہے۔ ایسی صورت میں اگر اس وقت وہ ادارے جو اردو کی ترقی کے دعوے دار ہیں آگے بڑھتے اور اس کی ترقی کے لئے تھوڑی بھی کوشش کرتے تو یہ زبان اپنا حق حاصل کرلیتی مگر افسوس اور شرم کی بات ہے کہ اردو کی ترقی کے ذمہ دار یہ ادارے بھی خاموش بلکہ تعطل کے شکار ہیں اور سارے دور اردو بولنے والے، اردو دوست اور ہمدرد بھی چپ ہیں۔

لہٰذا چنگاری کو افسوس کے ساتھ یہ ناخوشگوار فریضہ انجام دینا پڑ رہا ہے ہمیں معلوم ہے کہ ہماری اس تحریر سے ایک بہت بڑا حلقہ جو اردو والوں کی بے نیازی سے ناجائز فائدہ اٹھاکر دونوں ہاتھوں سے دولت بٹور رہا ہے ناراض ہوگا، اور چنگاری کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا اور کر بھی رہا ہے۔ مثلاً بعض بااثر حلقے چنگاری کے خلاف پروپگنڈا بھی کر رہے ہیں اور مختلف اداروں کو یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ وہ چنگاری کے ادارے کی مطبوعات نہ فروخت کریں۔

ہمیں اس کی پرواہ نہیں ہے۔ جب جنوں سے ہی سودا کرلیا تو پھر انجام سے کیا ڈرنا۔

چنگاری نے طے کیا ہے کہ اردو اداروں یا ایسے اداروں جہاں اردو کا بھی کام ہوتا ہے مثلاً ان۔ بی۔ ٹی اور سیل کمیشن ڈویژن اور یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے وغیرہ پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ ہم اپنے قارئین سے درخواست کریں گے کہ انھیں ان اداروں کے بارے میں کچھ معلومات ہوں تو ہمیں ارسال کریں اگر معلومات فراہم کرنے والے اپنے نام ظاہر نہ کرنا چاہیں تو بھی کوئی ہرج نہیں ہم ان حقائق کی جانچ پڑتال کے بعد انھیں شائع کریں گے۔

اس شمارے میں ہم انجمن ترقی اردو کے ارباب حل و عقد سے چند سوالات کر رہے ہیں ان کے جواب کی روشنی میں آئندہ شماروں میں مضامین پیش کئے جائیں گے۔

انجمن ترقی اردو کے اربابِ حل و عقد سے چند سوالات۔

- آل احمد سرور کے جانے کے بعد انجمن نے کتنی کتابیں چھاپیں ؟
- آل احمد سرور کے جانے کے بعد سے انجمن نے اردو کی تحریک کو جاری رکھنے اور اردو کی ترقی کے لئے کون کون سے اقدام کئے۔
- کیا یہ صحیح ہے کہ اردو گھر کی تعمیر کے لئے انجمن کے پاس تین لاکھ روپے تھے اور حکومت نے پانچ لاکھ روپے دیئے۔
- اردو گھر کی تعمیر میں کتنا روپیہ خرچ ہوا۔
- اردو گھر کا ایک مختصر سا حصہ انجمن کے پاس ہے اور باقی سارے کا سارا اس نے لیز پر دے دیا ہے۔ کیوں ؟
- انجمن کل ہند جماعت ہے ہندوستان بھر میں اس کے ممبر ہیں مگر مجلس عاملہ میں صرف دہلی، حیدرآباد اور یوپی کے لوگ ہی کیوں ہیں ؟ بہار کا صرف ایک نمائندہ ہے۔ کشمیر کا ایک بھی نہیں ہے تقریباً یہی حال دوسری ریاستوں کا ہے۔
- اس بار ایسے شخص کو صدر کیوں بنایا گیا جو اردو کا بدترین دشمن ہے اور جس نے ساہتیہ اکاڈمی کو مجبور کیا کہ وہ اردو کے ادیبوں کو انعام نہیں دے۔
- انجمن نے لائف لونگ باتنخواہ سکریٹری کی طرح کیوں ڈالی۔ خلیق انجم سے پہلے تو کسی سکریٹری کو تنخواہ نہیں ملتی تھی اور نہ ہی وہ زندگی بھر کے لئے سکریٹری مقرر کئے گئے تھے۔
- انجمن کے جنرل سکریٹری کیا ہندوستان سے باہر جاکر اردو کی ترقی کے لئے کوشش فرما رہے ہیں ؟۔
- انجمن کا ترجمان اس قدر خراب کیوں چھپتا ہے۔ نہ صرف پروف کی بلکہ ایڈیٹنگ کی بھی بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں ایسا کیوں ہے؟
- اگر انجمن کا دستور ہی غیر جمہوری ہے تو کیا اسے جمہوری نہیں بنایا جاسکتا تاکہ ہندوستان بھر کے لوگوں کے جذبات کی اس میں نمائندگی ہوسکے ؟۔

ہندی سے

شانی

دوزخی

ترجمہ: راجونت سنگھ رانا



میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ باہر کا گیٹ بھی میں نے آہستہ سے کھولا۔ ایسے کہ آواز نہ ہو۔ گھر کے سامنے والا دروازہ اڑکا ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ میں نے اُسے بھی آہستہ سے دھکیلا تھا۔ اصل میں میں جمیل کے سامنے بالکل اچانک آنا چاہتا تھا۔ دل کے دورے کی طرح۔

یہ بھوپال جیسے شہر کی دوپہر تھی۔ ڈھلتی ہوئی۔ دن میں اتنا سناٹا اور سستی تھی۔ کہ اکثر لوگ سو رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ جمیل کے گھر پر ملنے کا وقت تھا۔ شہر اور اس کے اپنے مزاج کے لحاظ سے ہی نہیں۔ اُس کے کام کے اعتبار سے بھی۔ اُس کا کالج صبح و شام لگتا تھا۔ اور ساری دوپہر خالی رہتی تھی۔

جمیل دیوان پر لیٹا ہوا تھا۔ دیوار کی طرف اُس نے مُنہ کر رکھا تھا۔ آہٹ سے چونک کر جب اُس نے دیکھا تو وہ ایک آدھ پل دیکھتا ہی رہ گیا "جان؟ پھر ادھر؟" کہتے ہوئے ہڑبڑا کر اُٹھا۔ ہم دونوں لپٹ گئے۔ اُس کی جکڑ زبردست تھی۔ بازو اُس کے لمبے اور مضبوط تھے۔ اور ہتھیلیاں جیسے میری پیٹھ میں دھنس جانا چاہتی ہوں۔ لیکن ہتھیلی تو گوشت پوست کی ہوتی۔ پہلی بار لگا کہ ہاتھ کی انگلیاں بھی بولتی ہیں۔

"کب آئے؟" کئی لمحے بعد اُس نے گردن گھما کر لگ بھگ رو کھے لحظ میں پوچھا۔ اُس کا چہرہ اب بھی اتنا میرے پاس تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پا رہے تھے۔

"صبح؟" میں نے کہا، "دکھن ایکسپریس سے" الگ ہوتے۔ بیٹھ گئے۔

"آج صبح ہی میں یاد کر رہا تھا" اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایسی بھرپور نظر تھی۔ جس سے آپ سبھی کچھ لینا چاہتے ہیں۔ تبھی بغل والے کمرے کا پردہ ہٹا کر بی کنیز آئی۔ ہنستی ہوئی، سلام کیا۔ پاس بیٹھی۔ بولی، پوچھا۔

خوش ہوئی۔

"باجی کیسی ہیں؟" میں نے کنیز سے کہا۔ اُن سے میرا سلام ......

"نماز پڑھ رہی ہیں" وہ اندر دیکھتے ہوئے بولی۔ "اور تمھارے لئے کیا لاؤں؟ کھانا کھاؤ؟"

"اس وقت۔؟" میں ہنسنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح۔ میں جانتا تھا۔ کہ آخر وہ کھانا لائے گی اور میں کھاؤں گا۔ وہ اُٹھ کر اندر گئی۔

"اب باجی کی طبیعت کیسی رہتی ہے؟" میں نے جمیل سے پوچھا۔

باجی کا تخت باہر سے ہی دکھائی دیتا ہے۔ اور گھر میں داخل ہوتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ سوال جیسے پریشان کن تھا جمیل سگریٹ کا پیکٹ ٹٹولنے لگا۔ ملا، تو ایک جلائی اور میری طرف دیکھ کر سر ہلا دیا۔ یعنی بس ٹھیک سے تھے۔ اور پھیکے پن سے مسکرایا۔ باجی۔ بھائی جان یعنی ماں باپ۔ باجی کئی مہینوں سے بیمار تھیں۔ گھر پر ہوئے نئے حادثے سے پہلے سے۔ شاید اسی دن سے جب ایک دن بھائی جان اچانک نہیں رہے تھے۔ رات وہ ٹھیک ٹھاک سوئے تھے۔ لیکن صبح نہیں اُٹھے۔ بس۔

"کون ہے اللّن؟" اندر سے باجی کی آواز سُنائی دی۔ وہ شاید مصلّے سے اُٹھ رہی تھیں۔ اللّن یعنی جمیل۔ جمیل نے میرا نام بتایا۔ کہا کہ "میں دلّی سے آیا ہوں" سلام کر رہا ہوں۔ انھوں نے وہیں سے دعائیں دیں۔ اُن کی آواز بہت تھکی تھکی سی تھی۔ وہ پھر کچھ بڑبڑاتی سی رہیں، کیا؟ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سوچا کہ دروازے تک جا کر انھیں دیکھ لوں۔ لیکن ہمت نہیں پڑی۔ اُن کا سامنا کرنا۔ میرے بس کی بات نہیں تھی۔

"اور؟" تھوڑی دیر بعد جمیل نے مجھے واپس لاتے ہوئے کہا۔ اُسی طرف لے جانے کے لئے۔

"تیری دلّی کیسی ہے؟"

"میری؟"

جمیل مسکرایا۔

"دلّی ایک دوزخ ہے" میں پہلے اکثر کہا کرتا تھا۔ چار سال پہلے جب میں اس شہر سے نکالا گیا تھا۔ تو میرے ذہن میں سخت تلخی تھی۔ یہ دیش نکالا پچھلی سرکار کی عنایت تھی۔ اور میرے لئے اسے بھولنا مشکل تھا۔ کہ میں دلّی آیا نہیں۔ پھینکا گیا ہوں۔ اب وہ بات نہیں رہی۔ لیکن نہ تو میں دلّی کا ہو سکتا ہوں اور نہ دلّی میری۔

جمیل یہ جانتا تھا۔

"چل میرٹھ کی مار کاٹ ہی سہی۔ کیا حال ہے؟"

"یہاں دنگے کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ سنتالیس سے بھی پرانی۔ نئی بات میں کیا بتاؤں؟ یہی کہہ سکتا ہوں۔ جو اخباروں میں تھے۔ ہاں سنا ہے کے مرادآباد اور علی گڑھ میں بہت تناؤ ہے۔"

"تجھے اخباروں پر بھروسہ ہوتا ہے؟"

میں چپ ہو گیا۔

"جو لوگ دہانے پر بیٹھے ہیں۔ وہ جانتے ہیں" اُس نے کہا۔

"کہاں ہے یہ دہانہ؟"

"دلی دہانہ نہیں ہے۔ ملک کا؟ میرٹھ کا، جمشید پور یا بھاگل پور کا...؟"

میں کمرے کی دیواروں کو دیکھنے لگا۔ جس پر کئی قسموں کی پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ کیسر کی بنائی ہوئی۔ ایک پرسکون اور پیار کا ملا جلا تاثر صاف تھا۔ ظاہر ہے کہ میں بچنا چاہتا تھا۔ شاید ہم دونوں بچنا چاہتے تھے۔ اُس سے، جس کے چھڑ جانے کا ہم دونوں کو ہی ڈر تھا۔

"تیری پرانی شکل لوٹ آئی ہے" جمیل نے بات پلٹتے ہوئے کہا "پچھلی بیماری میں جانے کہاں وہ چلی گئی تھیں۔۔؟"

"یہ ہارٹ اٹیک کا سبب ہے۔ میں نے کہا۔ اور مکارانہ ہنسی ہنسنے لگا۔ ایسے جیسے میں نے کوئی قلعہ جیت لیا ہو۔

"اب تو تو بالکل ٹھیک ہے نا" اُس نے پوچھا۔

"بالکل کا تو پتہ نہیں۔ ہاں ٹھیک ضرور ہوں۔ اتنا ہی ٹھیک، جتنے دل کے مریض ٹھیک رہتے ہیں۔"

اور یہ کہنے کے ساتھ ہی میرے لحظے میں اپنا پن آ گیا۔ میں نے پرانے مکارانہ فریب میں لوٹتے ہوئے کہا "اصل میں، اب میں نے پرواہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ موت کو جب آنا ہے۔ تو آئے گی۔ تب نہ ڈاکٹروں کی ٹالے ٹلے گی۔ اور نہ میرے روکے رُکے گی۔"

"بہت دنوں تک یہاں کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا" جمیل نے کہا "افواہ کی طرح خبر آئی تھی۔ کچھ اتنی سیدھی۔ ہم لوگوں نے گھبرا کر دلی فون کیا تھا۔ لیکن تمہارے وہاں کے دوستوں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہسپتال میں ضرور ہیں انٹینسیو کیئر یونٹ میں بھی ہیں۔ لیکن ہارٹ وہارٹ کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ تو تجھے دلی سے دیکھ کر لوٹے شکیل نے بتایا کہ سب کچھ کتنا سیریس تھا... یہ ہوا کیسے؟"

"اسی طرح جیسے یہ ہوتا ہے... اچانک۔"

"گھر پر؟"

"نہیں۔ دفتر میں۔"

"کیسے؟"

میں باتیں کر رہا تھا۔ ایک ملنے والے سے یک لخت مجھے بے چینی سی ہوئی۔ سینے میں جکڑن اور درد کے بگولے اٹھنے لگے تھے۔ اور میں پسینے میں شرابور ہو گیا میری آواز بالکل دھیمی پڑ گئی تھی۔ دل ڈوبنے لگا تھا۔ اور مجھ میں دم نہیں تھا۔ میں بیٹھنا چاہتا تھا لیکن اتنی بے چینی اور گھبراہٹ کہ... تھوڑی ہی دیر میں میں فرش پر لیٹا ہوا چھٹپٹا رہا تھا...."

کہتے کہتے میں رُک گیا۔ کیونکہ جمیل کے چہرے پر چھایا ہوا خوف میں صاف صاف دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں چاہتا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میری جس تکلیف کو یہاں معمولی ڈھنگ پر دیا گیا تھا۔ میں اُس کا حساب برابر کر رہا تھا۔ دلی کے اپنے دوستوں کے رویہ پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ الگ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک مصلحت کے تحت میری بیماری کی سنجیدگی کو چھپایا گیا تھا۔ جو میں بھی چاہتا تھا۔ لگ بھگ ایک سال کے بعد میں اِس شہر میں داخل ہوا تھا۔ ایک ایسے شخص کی طرح جو گم ہوتے ہوتے یک لخت رہ گیا ہو۔

"تمھیں یاد ہے۔ میں نے تعزیت کا خط تم کو کب لکھا تھا۔ وہ ۶ر اپریل کا دن تھا۔ اور کوئی گھنٹہ بھر پہلے میں نے تمہیں لکھا تھا۔ تب میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کہ تھوڑی ہی دیر بعد میں بھی اُس راستے پر پہنچ جاؤں گا۔ جہاں سے حسین کبھی نہیں آیا۔"

تبھی اندر سے کیسر نکل آئی۔ اور میرے سامنے روٹیوں کی رکابی رکھتی ہوئی بولی "لو کھاؤ"

پھر ایک سوال کھینچ کر سامنے ہی بیٹھ گئی۔ پہلا ہی تھوڑ ڈالنے سے پہلے مجھے لگا کہ مجھے حسین کا نام نہیں لینا چاہیئے تھا۔ شائد میں چاہتا بھی نہیں تھا لیکن بات کی جا رہی تھی۔ لیکن کیوں نہیں۔؟ کیا میں پرسے (ماتم پرسی) کے لئے نہیں آیا تھا۔؟ ماتم پرسی اصل میں بھی جمیل کی۔ یہ وہ آدمی تھا جو کبھی کل تک اسی شہر میں دوسروں کی ماتم پرسی کے لئے آیا کرتا تھا۔ اور نہیں جانتا تھا کہ اُسے کیا کہنا چاہیئے۔ وہ چپ چاپ بیٹھ جایا کرتا تھا.. سوکھی آنکھوں سے ایک طرف دیکھتے ہوئے۔

دفتر میں مجھے یہ بھی خبر ملی تھی، دلی میں، جمیل نے نہیں دی تھی۔ اس شہر سے بھی نہیں دی گئی تھی۔ بڑی تھوڑے سے سید محمود نے لکھا تھا:

"تمھیں یہ جان کر بہت صدمہ ہوگا" اُس نے خط میں لکھا تھا کہ ہم دونوں کا عزیز دوست حسین احمد صدیقی کا ناگپور میں انتقال ہو گیا ہے۔ اُس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ نسرین باجی اُس کی میت لے کر بھوپال آئی تھیں۔ اور اُسے دفنا کر کل لوٹا ہوں۔ ہم لوگوں کا جو ہونا تھا۔ ہوا۔ لیکن سوچ کر تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ رہ گئی جوان عورت کے ساتھ جو نا انصافی ہوئی ہے۔ کیا اُس کی کوئی تلافی ہو سکتی ہے؟"

بڑی دیر تک میں خط لئے بیٹھا رہ گیا۔ میں نے اُسے کوئی تین بار پڑھا تھا۔ اور حسین کے نام پر پانچ بار نظر ڈالی تھی۔ میں یقین کرنا چاہتا تھا لیکن کر نہیں پا رہا تھا۔ اور جب ہوا تو اُس پل کے۔ میں نے راحت اور چھٹکارے کی سانس لی۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ دکھ کو سمیٹ کر اپنے اندر بھر دیا تھا۔ اور یکدم دکھی ہو گیا تھا۔

"یہ بھی کوئی بات ہوئی؟" میں اُس کے بعد ہر آنے جانے والے کو بتا کر کہہ رہا تھا "کیا یہ اُس کے جانے کی عمر تھی؟ اور وہ بھی دل کے دورے سے۔ وہ تو مجھ سے بھی دو سال چھوٹا تھا۔ وہ خدا سے خوف کھانے والا اور پرہیزگار آدمی تھا اور سگریٹ تک نہیں پیتا تھا۔"

یہ سب کہتے ہوئے گویا کہ میں ڈرا ہوا تھا۔!

شائد اپنے آپ کو دور کر رہا تھا۔ حالانکہ دفتر سے
گھر لوٹنے تک۔ اُس سے کہا نہیں چھوٹتا تھا۔ وہ
کہیں اتنا دیر تک بیٹھ گیا تھا کہ اُس نے مجھے یکدم
چُپ کر دیا تھا۔ یہ خبر گھر کے لئے بھی بڑی تھی۔
لیکن یہ میں نے اُس دن بیوی سے بھی نہیں کہا۔
مجھے ڈر تھا کہ گھر پر بھی دیر تک وہی ذکر ہوتا رہے گا
اور رات کو حسین کا چہرہ مجھے سونے نہیں دیگا۔
اُس رات میں سو تو گیا۔ لیکن حسین نے تنگ بہت
کیا۔ اُس کا چہرہ چاروں طرف سے مجھ پر حملہ کرتا
رہا۔ اور سپنے میں ساری رات اُس کی میت
دکھائی دیتی رہی۔ کئی دن پُرانی میت۔ یہ اُس
دن ہی نہیں۔ اُس کے اگلے دن بھی ہوا تھا۔
اور اُس کے بھی اگلے دن۔ حالانکہ میں کسی سے
کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ تعزیت کا خط بھی تین دنوں
کے التوا کے بعد میں نے جمیل کو لکھا تھا۔ اور میں
بھی حسین کی طرح نہیں جانتا تھا۔ کہ ماتم پرسی
میں کیا کہنا چاہئے۔۔۔۔

بات عجیب سہی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ
حسین میرا دوست نہیں رہ گیا تھا۔ خاص کر ادھر
کے سالوں میں۔ جب وہ نائیجیریا چلا گیا تھا۔ یا
شائد اُس سے بھی پہلے میں آہستہ آہستہ اُس کے
چھوٹے بھائی جمیل کا دوست بن گیا تھا۔

پندرہ برس پہلے جب میں بھوپال آیا تھا۔ تو
دوستی اُسی سے ہوئی تھی۔ ہم دونوں بھوپال میں
باہر سے آئے ہوئے تھے۔ اور وہاں ہمارا کوئی گھر
نہیں تھا۔ حسین میں ایک خاص طرح کی مردانہ کشش
تھی۔ سیدھے اپنی طرف کھینچ لینے کی۔ وہ لمبا اور
چھریرا تھا اور معمولی سا گنجا بھی ہو رہا تھا۔ پہلے
ہی دن میں نے دیکھ لیا تھا۔ کہ وہ ایک حسین احساسات
والا اور غصیل اور حملہ کرنے والا شخص ہے۔ جو اپنے
آپ پر بھی ہنس سکتا تھا۔ وہ اتنے خوبصورت اور
چھوٹے چھوٹے جملے کرتا تھا کہ کوئی بھی ہنستا ہنستا
اُس کا ہو جاتا تھا۔ تب ہم پُرانے بھوپال کی امیر گنج گلی
میں رہتے تھے اور جوان تھے۔ حسین ایک پرائیویٹ
کالج میں سائنس پڑھاتا تھا۔ اور میں ایک دفتر میں
قلم گھسیٹ رہا تھا۔ محلّہ پُرانے رئیسوں اور امیروں
کا تھا اور ہم جیسے پچھڑے حال اِکّادُکّا ہی پڑے ہوئے
تھے۔ اپنے اپنے منہ چھپائے۔

اصل میں ہم دونوں کی دوستی تو تنگ دست،
مجروح، غصیل آدمیوں کا ایک ایسا ملاپ تھی، جو
دونوں کو راحت بخشتی تھی۔ خوش کر لیا تھا۔ حالانکہ
ہم دونوں الگ الگ محکموں میں کام کرتے تھے۔ وہ
سائنس پڑھاتا تھا۔ لیکن وہ دقیانوسی اور مذہبی تھا۔
اور ہنسی ہنسی میں اپنے آپ کو جنّتی کہتا تھا۔ میرا سائنس
سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ لیکن میں اُسی کے سہارے
اپنے آپ کو جدید کہلاتا تھا۔ اور ترقی پسند بنا ہوا تھا۔
حسین کا فتویٰ سر آنکھوں پر لئے ہوتے کہ میں ایک
دوزخی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے
کو دوزخی سمجھتے تھے۔ اور دونوں مل کر اُس تیسرے
کو جو ہمارے درمیان نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جسے ہم
کانڈ ڈ کہتے تھے۔

"تم مکّار ہو" ایک بار اُس نے غصّے میں کھولتے
ہوئے کہا تھا۔ "اوّل درجے کے پاکھنڈی اور
دھورت۔۔۔"

"کیا تم سے بھی بڑا؟"

"ہاں۔ میں تو تمہارے پاؤں کی گرد بھی
نہیں ہوں۔"

"وہ تو تم ویسے بھی نہیں ہو" میں نے ہنس کر
اُڑانا چاہا تھا۔

"تم دونوں جہانوں میں مزے اُڑانا چاہتے
ہو" اُس نے قریب قریب بال نوچتے ہوئے کہا۔
"ناستک واستک (لامذہب وانذہب) کچھ بھی
نہیں۔ وہ تمہارا ڈھونگ ہے۔"

"تمہارے جنّتی ہونے سے بھی بڑا ڈھونگ؟"
میں نے چبا چبا کر کہا تھا۔ "کیوں ناحق فاقے کاٹتے ہو یار؟"
میں اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ جو سچ مچ روزے دار
ہوتے ہیں۔ وہ سحری کے بعد افطار اور افطار کے بعد
سحری کی فکر نہیں کیا کرتے۔ جو لوگ رمضان کے
دنوں میں صبح و شام تھیلا لئے بازار بھاگتے نظر آتے
ہیں۔ کبھی مرغ تو کبھی تیتر کے لئے، کبھی لوا تو کبھی
بٹیر، کبھی مچھلی اور کبھی بریانی کے لئے" میں اُن کا مذاق
اُڑاتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے حسین کو
چوٹ لگتی ہے۔ کیونکہ میں یہی چاہتا تھا۔

"تم نہ مندروں میں ہو نہ مسجدوں میں، نہ یہاں
نہ وہاں، اللہ تم پر رحم کرے۔"
وہ مجھ سے کہتا۔

یہ صرف ایک دن کی بات نہیں تھی۔ اکثر
ہم دونوں کسی نہ کسی ایسی بات پر لڑتے تھے تھے
میں ایک دوسرے کو کبھی نہ بولنے کی دھمکی دیتے تھے۔
لیکن اگلے دن یا اُس سے اگلے دن ملتے تھے۔ پھر سے
لڑنے کے لئے۔۔۔۔

یہ وہ دَور تھا۔ جب ملک میں فساد کی فصل
آئی ہوئی تھی۔ اور ایک کے بعد ایک کئی شہروں
میں دنگے ہو رہے تھے۔ جبل پور، بھنڈی، جلگاؤں،
احمد آباد، جمشید پور اور۔۔۔۔

ہم لوگ بھوپال جیسے شہر میں رہ رہے تھے۔
جس میں دنگے کی کوئی تاریخ نہیں تھی۔ پھر بھی ڈرے
ہوئے تھے۔ کیونکہ شہر میں تناؤ تھا۔ سرکار با خبر
ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ پولیس اور ہوم گارڈز کے
جوان تعینات تھے۔ روز افواہیں پھیلتی تھیں۔
اور باہر سے روز خبریں آتی تھیں۔ ہیبتناک
خبریں۔ برسوں سے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔
ہندو مسلمان ایک دوسرے کو شک و شبہ اور
خوف سے دیکھنے لگے تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے
گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔

"دیکھ لو، ایک ایسی ہی شام حسین نے گھبرائے
ہوئے لفظوں میں کہا تھا۔ "سؤر کے بچّوں نے ملک
کی تقسیم کر کے کیا کر دیا ہے۔۔۔۔؟"

اُس نے صبح کے اخبار میں کچھ اور دل دہلانے
والی خبریں پڑھ لی تھیں سا اُس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔
اور بال روکھے تھے۔ اُڑے اُڑے سے۔ وہ
اور دنوں سے زیادہ گنجا لگ رہا تھا۔

"اب یہ ملک رہنے لائق نہیں رہا" وہ بولا
"کسی دن ہم لوگ بھی کاٹ کر پھینک دیئے جائیں گے۔
اور کوئی رونے والا نہیں ہوگا۔"

"کیوں؟ میں جو ہوں" میں نے ہنس کر کہا۔
"دراصل میں اپنے اور اُس کے ڈر کو ہنس کر
اُڑانا چاہتا تھا۔ اندھیرے میں گائے جانے والے
گیت کی طرح۔" "تم بھی نہیں ہوگے" اُس نے
آنکھیں تریر کر کہا۔ "کل جب کافروں کا جتھہ گنڈاسے

اور تعجب کی بات ہے کہ [illegible] آج تک کوئی نہیں پوچھے گا کہ تم کیا سوچتے ہو، کیا تمہارے خیالات کیا ہیں۔ پہچان کے لئے تمہارا نام کافی ہے۔"

"تم تو کہہ رہے تھے کہ پہچان کے لئے نام کافی نہیں ہوتا۔"

"وہ اور بات تھی۔ دوسرے سلسلے میں کہی گئی تھی۔ مسئلوں کو گڈمڈ مت کیا کرو۔ میں جانتا ہوں، تم چالاکی کر رہے ہو۔"

"ہاں، میں چالاکی کر رہا ہوں۔ جان بوجھ کر انجان بنے رہنے کی چالاکی۔ سچائی سے ڈر کر بھاگ کھڑے ہونے کی چالاکی۔ جس سے غیر متفق ہونے والے کو چوٹ پہنچانے کی چالاکی۔" میں حسین سے بالکل متفق نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ اُس کی بات ماننا، اپنے پاؤں کے نیچے کے اُس ٹیلے کو کاٹنا تھا۔ جس پر میں کھڑا تھا۔

اس درمیان ایک ایسی بات ہوئی جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا تک بھی نہیں تھا۔ حسین یک دم میرے لئے ایک درنیہ ہو گیا تھا۔ صبح اُس کا کالج ہوا کرتا تھا۔ دوپہر میں میرا دفتر۔ شام ہی کا ایک وقت تھا، جس میں اکثر ہم ملا کرتے تھے لیکن اب وہ کئی دنوں سے غائب تھا۔ میرے لئے حسین کا گھر ناواقف و ناپہچانا نہیں تھا۔ جمیل بھی میرے لئے نیا نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ حسین کا چھوٹا بھائی ہے۔ اور اُسی کالج میں پڑھتا ہے۔

جب جب میں حسین کے یہاں گپ شپ، چائے یا کھانے پر ہوتا، اکثر جمیل بھی ہوا کرتا۔ یہاں تک کہ اُس کے والد بھائی جان بھی۔ وہ اس معنی میں عجیب گھر تھا۔ کہ وہاں پہنچ کر کسی بھی دوست یا مہمان سے پورا گھر ملتا تھا۔ اور تمام لوگ بات چیت میں شامل ہوتے تھے۔ مجھے بھائی جان کا اپنے درمیان ہونا کئی بار کھلتا تھا۔ بُرا لگتا تھا کیونکہ اس سے ہماری آزادی چھنتی تھی۔ لیکن جمیل کا ہونا مجھے اچھا لگتا تھا۔ دراصل میں جمیل کو شروع سے پسند کرتا تھا۔

اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ جمیل کا پہلے مجھ سے نہ ٹکرانا، حسین کے ذریعے ملنا ایک موقعہ محل ہی تھا۔ [illegible] اُسی کا دوست اور [illegible] ہوتا۔ یہ بات تب ہی سمجھ آئی۔ جب میں حسین کا اتا پتہ کرنے کئی بار اُس کے گھر گیا تھا۔ اور جمیل مجھے اکیلے میں ملا تھا۔ پھر میں آہستہ آہستہ حسین سے کٹ گیا تھا۔

"حسین بھائی سے آج کل شام کو ملنا مشکل ہے۔" میری دو تین بار کی مایوسی کے بعد جمیل نے مجھے بتایا تھا۔ "دراصل وہ اور سعید محمود ابھی چکر میں ہیں۔"

"کس چکر میں؟"

"تعجب ہے، آپ کو پتہ تک نہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ دونوں باہر نکلنے کے چکر میں ہیں۔"

"باہر....؟" "یعنی کہیں بھی۔ مڈل ایسٹ، لیبیا، افریقہ... کہیں بھی۔ جہاں جاب ملے۔ اچھے پیسے ملیں۔ سعید محمود کی تو مجبوری ہے اس کالج کی پروفیسری سے تو وہ ویسے ہی کنگال ہے۔ چار چار بیٹیاں سینے پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور بیٹا پولیو کا شکار ہے۔ حسین بھائی کا یہ ہے کہ وہ بہتر زندگی چاہتے ہیں...."

سعید محمود تب بھوپال میں تھا۔ اور اُسی کالج میں انگریزی پڑھاتا تھا۔ وہ ہم دونوں کا دوست تھا۔ لیکن کسی کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ کیونکہ وہ ہر وقت جلدی میں ہوتا تھا۔ یہ ایسی بے چینی بھری زندگی ہے۔ جو اُسے کہیں دو پل سے زیادہ ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ وہ آتا، تو بیٹھتا نہیں تھا۔ بیٹھتا تو پر تولنے لگتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس کے آتے ہی یہ دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کہ وہ کسی بھی پل چلا جائے گا۔ حسین اور اُس کی دوستی ایک حد تک پیشے کی وجہ سے تھی۔ لیکن مزاج کے لحاظ سے وہ میرے زیادہ نزدیک پڑتا۔ پھر بھی مجھے تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ ہم دونوں ایک ہی مقصد کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ پہلے ہی وہ الگ الگ تھی

"کیوں بھاگ گئے؟" کئی دنوں کے بعد جب جمیل پکڑ میں آیا تو میں نے اُسے دبوچ لیا۔ حسین نے مجھے اُسی انداز سے دیکھا۔ جس سے اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گول ہو کر [illegible] ہو جاتی تھیں۔ اور [illegible] معلوم ہوتی تھیں۔

"کون بھاگ رہا ہے؟"

"تم اور کون۔"

"میں بھاگ نہیں رہا ہوں۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"ایک ہی بات نہیں ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "بھاگنے والے پاکستان میں ہیں۔ اور وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

"تم بھی کہاں لوٹ کر آنے والے ہو؟"

"کیوں کیا میں کالے حبشیوں کے درمیان مرنے جا رہا ہوں۔؟"

"کیا معلوم؟"

"تم کیسے دوست ہو؟ یہی دعا کرو گے، کرو...."

"میدان تو چھوڑ رہے ہو۔"

"دو چار سال کے لئے گھر سے نکلنا میدان چھوڑنا ہے، بھاگنا ہے؟" اُس نے جھلا کر کہا۔ "میں اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ سوچوں؟ یہیں پڑا سڑتا رہوں۔ اپنے آس پاس لفنگوں، بدمعاشوں اور بدکاروں کو پنپتا ہوا دیکھتا رہوں۔ اور کڑھوں.... اور خون جلاؤں۔"

"مستقبل اور بچے تو میرے بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم اگر کیچڑ میں پڑے رہنا چاہتے ہو، تو کوئی کیا کر سکتا ہے،" وہ بولا۔ "نہ تو تم اوپر اُٹھ سکتے ہو، اور نہ تم اُٹھنا چاہتے ہو۔"

"پیسوں کے پیچھے بھاگنا، اوپر اُٹھنا ہے؟"

"یہ بیماروں، تھکوں اور کمزور دلوں کی فلاسفی ہے۔" اُس نے جھلا کر کہا۔ "اسے تم اپنے ہی پاس رہنے دو۔"

اور وہ تیزی سے چلا گیا۔

باہر جانے سے پہلے حسین سے یہ میری آخری [illegible] کم سے کم اس سلسلے میں۔ اس کے بعد [illegible] لیکن ہر ملاقات سرسری تھی اور [illegible] مطلب نہیں تھا۔ ویسے

بھی تب تک ایک دوسرے سے ہم لوگ کٹ چکے تھے۔ پھر ایک دن خالد وحید آیا ۔۔۔ مجھ سے ملنے آیا اور مجھے کہیں گہری چوٹ لگاتا ہوا گیا۔ سعید محمود بھی، اُس کا جانا، ایک اُمید پر لگائی ہوئی چھلانگ تھی۔ وہ بیوی کے بچے کھچے زیور اور موروثی زمین بیچ کر سعودی عرب گیا تھا۔ جب کہ حسین کو نائیجیریا کے لئے باقاعدہ کام ملا تھا۔ اور اُس کے لئے ہوائی جہاز کا ٹکٹ آیا تھا۔۔۔۔

"اور کچھ لاؤں؟" کنیز مجھ سے کہہ رہی تھی۔ میرے سامنے پڑی رکابی کی طرف بڑھتی ہوئی۔ میں جیسے چونکا۔ "اور کیا؟"

"کباب یا ایک آدھ روٹی؟"

"بس۔ بس" میں نے کہا۔ "پہلے ہی بہت ہو چکا۔ قاعدے سے مجھے کھانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ دوپہر کا کھانا میں اکثر ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ خاص کر باہر۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اس کا قاعدہ بنا لو۔"

"اور تم نے مان لیا؟" جمیل نے مسکرا کر ٹوکا اور میں ہنسنے لگا۔ جمیل جانتا تھا۔ دلی کے وہ تین چار برس میں نے کن کن طرحوں کے پیچھے کتنی ایڑیاں رگڑی ہیں۔ ابھی دلی میں پاؤں ہی نہیں جمے تھے کہ معلوم ہوا کہ میں ایک خطرناک بیماری کی چپیٹ میں ہوں۔ کیا کرتا؟ نفرت یا اُس کے خلاف میرے بڑبولے پن نے میری کوئی مدد نہیں کی۔ اور میں ہسپتال پہنچ کر ایک فائل بن گیا۔

۔۔۔ کیس نمبر ۵۲۵۔

وہ دوزخ کے دن تھے۔

رکابی اُٹھا کر کنیز گئی نہیں۔ کھڑی رہی، پھر دو لمحے مجھے گھورتی رہی اور پوچھا۔ "ابھی پچھلے دنوں تمہارا کیا ہارٹ وہارٹ کا کچھ۔۔۔" میں نے چونک کر دیکھا۔ ہاں چوٹ لگی تھی۔ کیا کنیز کو خبر بھی نہیں تھی؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس گھر میں کبھی میرے لئے ماتم کا ماحول بنا ہوگا۔ اور جب پہنچوں گا تو مجھے ایسے لیا جائے گا جیسے لگ بھگ سویا ہوا آدمی، اچانک جاگ اُٹھا ہو۔

"اس کی بڑی حالت ہو گئی تھی۔" جمیل کنیز سے کہنے لگا۔ "میسو ہارٹ اٹیک تھا۔ کوئی کوئی پچاس گھنٹے زندگی اور موت کے بیچ جھولتا رہا۔ وہ تو دلی جیسی جگہ تھی پیس میکر لگا کر بچا لیا، ورنہ خدا جانے کیا ہوتا؟"

کنیز کا چہرہ ایک پل کے لئے سفید ہو گیا۔ ڈر سے۔ اُس کے بھائی اسی سے گزر چکے تھے۔ سسر اسی سے اور جیٹھ بھی۔ یعنی حسین بھائی۔ جانے سے پہلے وہ سنبھالتی ہوئی بولی، "اور سگریٹ پینا مت چھوڑ دینا، اچھا۔"

تھوڑی دیر کے بعد میری تپائی کے سامنے چائے کی ٹرے آ گئی۔ سٹول کھینچ کر کنیز میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اور چائے بنانے لگی۔ اندر کے کمرے میں باجی تھیں لیکن اُن کے وہاں ہونے کا احساس یہاں سے مشکل تھا۔ پہلے تو خیر وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ لیکن اتنی دیر میں نہ تو وہ باہر آئی تھیں۔ نہ مجھ میں ہی اتنا حوصلہ کہ اُٹھ کر میں ہی اُن سے مل لیتا۔ میں پھر دیواروں کو دیکھنے لگا۔ جن پر کنیز کی پینٹنگس لٹکی ہوئی تھیں۔۔۔۔ برسوں سے انہیں جگہوں پر۔۔۔۔ اور ویسی ہی۔ لیکن جیسے پہلی بار خیال آیا ہو کہ وہ ایک طغرہ کے آس پاس ہیں۔ ایک طغرا تھا اللہ۔ دوسرا تھا محمد۔ اُس دروازے کے اوپر جو گھر کے اندر کھلا تھا۔ قرآن کی ایک آیت تھی۔ اِنَّ اللّٰہ مَعَ الصّابرین یعنی صبر کرنے والوں کے ساتھ خدا ہے۔

"کیا میں نے صبر کیا تھا۔؟" چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے میں نے سوچا۔ کیا میں نے اُن دوستوں کو معاف نہیں کیا تھا جو ہسپتال میں مجھے دیکھنے یا ملنے نہیں آئے تھے۔ اور کیا میں اُن دشمنوں کے لئے بھی نرم ہو گیا تھا جو میرے پلنگ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"یا اللہ"، تبھی اندر سے باجی کی تیز آواز آئی۔

ترھا۔۔۔ بے رتی۔۔۔۔"

کنیز نے برتنوں کی ضرورت سے زیادہ آواز کرتے ہوئے انہیں سمیٹا اور ٹرے میں رکھنے لگی۔

ایک کے بعد ایک۔ پھر اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

"باجی کو کیسے سنبھالا تھا؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

"سب اپنے آپ سنبھل جاتے ہیں۔" وہ بولا "جس وقت حسین بھائی کی خبر نائیجیریا سے ملی تھی۔ باجی سخت بیمار تھیں۔ لگتا تھا بچیں گی نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ ڈاکٹر سے پوچھا، تو کہنے لگا "پتہ نہیں ایسی حالت میں یہ صدمہ برداشت بھی کر سکیں گی یا نہیں لیکن انھیں نہ بتانا بھی تو زیادتی ہوگی۔ آخر کب تک چھپاؤ گے۔" میں دو دن تک سب سے پوچھتا رہا کہ انھیں بتایا جائے یا نہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ وہ حسین بھائی کو ہم سے زیادہ چاہتی تھیں۔ میرا کہنا تھا۔ کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ انھیں کبھی پتہ ہی نہ چلے۔ جھوٹی چٹھیاں منگوائی جا سکتی ہیں یا ایسا ہی کچھ اور ۔۔ زیادہ سے زیادہ اتنی چوٹ تو نہ لگتی کہ لڑکے نے آنکھیں پھیر لیں۔ اور نالائق نکل گیا۔ لیکن آخر میں مجھے ہی ماننا پڑا۔ پھر انھیں بتایا گیا۔ اور اب سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔۔۔۔

میں نے پوچھ تو لیا لیکن پوچھنے کے ساتھ ہی مجھے اپنے سوال کے بے تکے پن کا خیال آیا۔ یہ وہی سوال تھا؟ جو ہر ملنے والا مجھ سے پوچھتا تھا۔ اور مجھے جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ میں کہنے لگا۔ "میرا مطلب ہے کہ اس سے پہلے کچھ۔۔۔؟"

"نہیں، کبھی کچھ نہیں۔ ہاں ایک دن پہلے اپنی طبیعت کے ٹھیک نہ ہونے کی شکایت ضرور کر رہے تھے۔ اُس دن وہ روز کی طرح کام پر گئے تھے۔ بھابی سے کہہ رکھا تھا کہ شام کو ڈاکٹر کے پاس چلے چلیں گے۔ شام کو تیار بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اُسی وقت ان کا ایک پاکستانی دوست آ گیا۔ ایک وی ڈی او کیسٹ کے کر لئے۔ اور وہ ٹی۔ وی دیکھنے لگے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ اب انھوں نے ہندی فلموں کے کیسٹ اور ہندوستانی سنگیت کے ایل پیز کا کتنا بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔ ہاں، میں نہیں جانتا تھا۔ سات سال پہلے جب جمیل یہاں تھا۔ تو وہ ہندی فلموں سے نفرت کرتا تھا۔ اور اُسے ہندوستانی سنگیت سے کوئی دلچسپی

نہیں تھی۔ اپنے پاکستانی دوست کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر اندر ایک کیسٹ لینے گئے تھے۔ لیکن کیسٹ دیکھتے دیکھتے انھیں بے چینی ہوئی۔ اور وہ لیٹ گئے بس مشکل سے دو منٹ لگے ہوں گے ۔۔۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اُن کا کفن دفن وہیں ہو چکا ہوگا۔ ہم لوگ رو دھو کر چپ بھی ہو چکے تھے۔ کوئی دس بارہ دنوں کے بعد جب بھابی اور بچوں کو لینے میں بمبئی پہنچا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ نا سمجھ پیارے حسین بھائی کا تابوت لے کر آئی ہیں۔ پھر سب کے زخم کھلے۔ پھر ایک بار نئے سرے سے ماتم ہوا ۔۔۔۔

"اور نصیب کی سنگ دلی تو دیکھو" تھوڑی دیر ٹھہر کر جمیل کہنے لگا۔ "ایسے تب ہونا تھا۔ جب وہ لوٹنے والے تھے۔ ابھی چھ مہینے پہلے جب وہ یہاں آئے تھے۔ تو کہنے لگے "بس اور کچھ دنوں کی بات ہے۔ اس کنٹریکٹ کے ختم ہونے کے بعد میں ہندوستان لوٹ آؤں گا" کہنے لگے "اب اور وہاں نہیں رہا جاتا۔ کچھ بھی ہو۔ کچھ بھی ہو۔ اپنا ملک پھر بھی اپنا ملک ہے ۔۔۔۔ انھوں نے یہاں "تھلہز" میں اپنی پسند کا ایک مکان بنوا لیا تھا۔ لوٹنے کے بعد وہ یہاں کیا کریں گے۔ یہ طے ہو چکا تھا۔ اور وہ بہت خوش تھے۔ تب انھوں نے کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ جس گھر کی ایک ایک اینٹ اتنے پیار سے انھوں نے رکھوائی تھی۔ اُس میں وہ کبھی نہیں رہ پائیں گے ۔۔۔

پچھلی بار ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ جب میں انھیں ایئرپورٹ چھوڑنے گیا تھا، تو زندگی میں پہلی بار ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ ایک دم دل میں آیا کہ انھیں بہت زور سے بھینچ لوں۔ ایک دم کلیجے لگا کر۔ لیکن پھر لگا کہ یہ کوئی جذباتیت ہے۔ حسین بھائی کیا ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔ اور اپنے کو روک کر میں نے وہ موقع ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ اور اب وہی تکلیف اتنی بڑی کسک بن گئی ہے۔ کہ ہر وقت مجھے تنگ کرتی رہتی ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم اکثر کسی زعم، کسی ذہنی گرہ (گانٹھ) یا ایک نامعلوم سی ضد کے تحت ایسے موقعوں کو کھو دیتے ہیں۔ جن میں اکثر وہ آدمی چھپا ہوتا ہے، ہم انھیں آئندہ کے لئے ملتوی کر دیتے ہیں۔ بنا یہ جانے کہ وہ ہماری زندگی میں پھر کبھی نہیں آئیں گے ۔۔۔؟

کنیز نے پان کی طشتری میری طرف بڑھا دی۔ وہ کب پاندان لے کر آ بیٹھی تھی، مجھے پتہ نہیں تھا۔ میں نے چپ چاپ پان لے لیا۔

میں جانتا تھا کہ جمیل نے مجھے کس گھرے میں چھو لیا ہے۔ لیکن کیا وہ صرف چھوتا تھا۔ اپنی گرفت میں لے کر نچوڑتا نہیں؟ میں سامنے کی دیوار کی طرف دیکھنے لگا جس پر طغرا لگا ہوا تھا۔ اللہ، اللہ، اللہ۔

پھر تصویریں آئیں۔ حسین بھائی اپنے باغ میں تینوں بچوں کے ساتھ۔ حسین بھائی اپنی گاڑی میں سیٹرنگ کے سامنے۔ جب کہ بھابی کار کا دروازہ پکڑے کھڑی تھیں۔ میں نے یہ تصویر اٹھائی جو حال ہی کی تھی ۔۔۔۔ شاید یہیں کی۔ اُس میں صرف حسین تھے۔ صرف اُن کا ہنستا ہوا چہرہ۔ تصویر میں وہ تیزی سے بڑھتا ہوا لگا۔ اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اُس کے چہرے پر خوشحالی کی کوئی چھاپ نہیں تھی۔ اِس کے برخلاف وہ پیڑ کی طرح سوکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ گنجا ہو گیا تھا۔ اور اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

"یہ تو یہیں کی لگتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، وہ اسی جگہ لیٹے تھے۔ اور میں نے تصویر لے لی تھی۔ ابھی پچھلی بار۔"

"اس میں داڑھی کیوں بڑھی ہوئی ہے؟"

"اب انھوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ تم اُن سے کب ملے تھے؟"

"تین چار سال پہلے یہیں پر۔ اُس بار میں دلّی سے آیا تھا۔ تو اتفاق سے وہ یہیں تھے۔ بیچ میں وہ ایک آدھ بار اپنے ویزا وغیرہ کے سلسلے میں دلّی آئے تو انھوں نے اطلاع دی تھی۔ اور میرے گھر بھی پہنچے تھے۔ لیکن نہ جانے میں کہاں الجھا ہوا تھا کہ وقت پر نہیں پہنچ سکا۔ اور وہ بنا ملے چلے گئے۔

میں جمیل سے صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ حسین سے میں ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اور انھیں جان بوجھ کر ٹال گیا تھا۔ شاید میں اُن سے بچنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں؟ حالانکہ اب میں اُن ہی کی تصویر ہاتھ میں لئے بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے بے چین کرنے والی، نامعلوم سی تکلیف ہو رہی تھی۔

معلوم ہے۔ جب مجھے دورہ پڑا تھا تو ڈاکٹر نے کیا پوچھا تھا؟ جمیل میری طرف دیکھنے لگا۔ کنیز وہاں سے جا چکی تھی۔ اور ہم دونوں اکیلے تھے۔

کہنے لگے، "بتایئے جس دن آپ کو یہ تکلیف ہوئی، اُس دن یا اُس کے دو ایک دن پہلے کیا ہوا تھا؟ کسی طرح کا تناؤ، کوئی صدمہ، کوئی ایسی ویسی خبر جس نے آپ کو ڈسٹرب کیا ہو؟"

میں نے کہا "نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرٹھ میں دنگے ہو رہے تھے۔ لیکن وہاں میرا کوئی عزیز نہیں تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ پرانی دلّی میں تناؤ تھا۔ اور کرفیو لگا ہوا تھا۔ لیکن میں تو نئی دلّی میں رہ رہا تھا۔" پھر میں نے سوچ کر حسین کو بتا دیا تھا" یہ کہتے ہوئے کہ وہ میرا دوست ضرور تھا۔ لیکن اب پچھلے کئی سالوں سے ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے۔ اب لگتا ہے کہ پتہ نہیں کہ اُس بات میں کتنی سچائی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود حسین ایک صاف، ایماندار اور نیک انسان تھا۔ اور میں اُسے بہت پیار کرتا تھا۔ بہت ۔۔۔

اور یہ کہتے کہتے میں نے دیکھا کہ میرا گلا بھر آیا ہے۔ آنکھیں نم ہو گئی ہیں۔ اور میں سچ مچ رونے لگا ہوں۔

ہاں۔ سچ مچ۔

افسانہ

دُلاری

سید سجاد ظہیر (انگارے سے ماخوذ)

گو کہ بچپن سے وہ اس گھر میں رہی اور پلی، مگر سولہویں سترہویں برس میں تھی کہ آخرکار لونڈی بھاگ گئی۔ اس کے ماں باپ کا پتہ نہیں تھا۔ اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اس کے گھر والے۔ شیخ ناظم علی صاحب خوش حال آدمی تھے۔ گھرانے میں ماشاء اللہ ...ی بیٹے اور بیٹیاں بھی تھیں۔ بیگم صاحب بھی، بقید حیات تھیں اور زنانے میں ان کا پورا راج تھا۔ دلاری خاص ان کی لونڈی تھی۔ ...ریں اور نوکرانیاں اور مامائیں آتیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کام کرتیں، اس کے بعد ذرا سی بات پر جھگڑا کر نوکری چھوڑ دیتیں اور ...ی جاتیں۔ مگر دلاری کے لیے ہمیشہ ایک ہی ٹھکانہ تھا۔ اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے۔ اونچے درجے کے لوگ ہمیشہ اپنے ...ے نیچے چلنے والوں کا خیال رکھتے ہیں۔ دلاری کو کھانے اور کپڑے کی شکایت نہ تھی۔ دوسری نوکرانیوں کے مقابلے میں اس کی حالت ...ی ہی تھی۔ مگر باوجود اس کے کبھی کبھی جب کسی ماما سے اور اس سے جھگڑا ہوتا تو وہ یہ طنز ہمیشہ سنتی..... "میں تیری طرح کوئی لونڈی ...وڑی ہوں۔" اس کا دلاری کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

اس کا بچپن بے فکری میں گزرا۔ اس کا رتبہ گھر کی بیبیوں سے تو کیا نوکرانیوں سے بھی پست تھا۔ وہ پیدا ہی اس درجے میں ہوئی ...ھی۔ یہ تو سب خدا کا کیا دھرا ہے۔ وہی جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اس کا رونا کیا! دلاری کو اپنی ...تی کی کوئی شکایت نہ تھی۔ مگر جب اس کی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے اور دل کی گہری اور اندھیری ...باچینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں تو وہ اکثر رنجیدہ سی رہنے لگی لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جس کی اسے نہ تو ...وہ معلوم تھی نہ دوا۔ چھوٹی صاحبزادی، حسینہ بیگم اور دلاری دونوں قریب قریب ہم سن تھیں اور ساتھ کھیلتیں۔ مگر جوں جوں ان کا ...ن بڑھتا تھا توں توں دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا۔ صاحبزادی کیونکہ شریف تھیں ان کا وقت پڑھنے لکھنے، سینے پرونے ...یں صرف ہونے لگا، دلاری کمروں کی خاک صاف کرتی، جھوٹے برتن دھوتی، گھڑوں میں پانی بھرتی، وہ خوبصورت، کشادہ چہرہ، لمبے لمبے ...تھ پیر، بھرا جسم، مگر عام طور سے اس کے کپڑے میلے کچیلے ہوتے اور اس کے بدن سے بو آتی۔ تیوہار کے دنوں میں البتہ وہ اپنے رکھاؤں ...کپڑے نکال کر پہنتی اور سنگار کرتی۔ یا اگر کبھی شاذ و نادر اسے بیگم صاحبہ یا صاحبزادیوں کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تب بھی اسے صاف ...کپڑے پہنا ہوتے۔

شب برات تھی، دلاری گڑیا بنی ہوئی تھی۔ زنانے کے صحن میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ سب گھر والے نوکر چاکر کھڑے تماشا

دیکھتے۔ بچے غل مچا رہے تھے۔ بڑے صاحبزادے کاظم بھی موجود تھے جن کا سن بیس اکیس برس کا تھا۔ یہ اپنی کالج کی تعلیم ختم ہی کرنے والے تھے۔ بیگم صاحب انہیں بہت چاہتی تھیں مگر یہ ہمیشہ گھر والوں سے بیزار رہتے اور انہیں تنگ خیال اور جاہل سمجھتے۔ جب چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کو بحث ہی کرتے گزر جاتی۔ یہ اکثر پرانی رسموں کے خلاف تھے۔ مگر اظہار ناراضگی کر کے سب کچھ برداشت کر لیتے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

انہیں پیاس لگی اور انھوں نے اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کر کہا "امی جان پیاس لگی ہے۔" بیگم صاحب نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "بیٹا شربت پیو۔ میں ابھی بنواتی ہوں۔" اور یہ کہہ کر دلاری کو پکار کر کہا کہ شربت تیار کرے۔

کاظم بولے، "جی نہیں امی جان۔ اسے تماشا دیکھنے دیجیے۔ میں خود اندر جا کر پانی پی لوں گا۔" مگر دلاری حکم ملتے ہی اندر کی طرف چل دی تھی۔ کاظم بھی پیچھے پیچھے دوڑے۔ دلاری ایک تنگ اندھیری کوٹھری میں شربت کی بوتل چن رہی تھی کاظم بھی دیر پہنچ کر رُکے۔

دلاری نے مڑ کر پوچھا: "آپ کے لیے کون سا شربت تیار کر دوں؟" مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ کاظم نے دلاری کو آنکھ بھر کر دیکھا۔ دلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ایک بوتل اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھی کاظم نے بڑھ کر بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر الگ رکھ دی اور اسے گلے سے لگا لیا۔ لڑکی نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے تن من کو اس کی گود میں دے دیا۔

دو ہستیوں نے، جن کی ذہنی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا، یکایک یہ محسوس کیا کہ وہ آرزوؤں کے ساحل پر آ گئے اور اصل وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہے چلے جا رہے تھے۔

ایک سال گزر گیا۔ کاظم کی شادی ٹھہر گئی۔ پھر شادی کے دن آ گئے۔ چار پانچ دن میں گھر میں دلہن آ جائے گی۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہے۔ ایک جشن ہے۔ کام کی کثرت ہے۔ دلاری ایک رات کو غائب ہو گئی۔ بہت چھان بین ہوئی۔ پولیس کو اطلاع دی گئی۔ کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک نوکر پر سب کا شبہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اسی کی مدد سے دلاری بھاگی ہے اور وہی اسے چھپائے ہوئے ہے۔ نوکر نکال دیا گیا۔ درحقیقت دلاری اسی کے پاس نکلی مگر اس نے واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

تین چار مہینے بعد شیخ ناظم علی صاحب کے ایک بڈھے نوکر نے دلاری کو شہر کی ایک غریب رنڈیوں کے محلے میں دیکھا۔ یہ بیچارہ بچپن سے دلاری کو جانتا تھا۔ وہ اس کے پاس گیا اور گھنٹوں تک دلاری کو سمجھایا کہ واپس چلے۔ وہ راضی ہو گئی۔ بڈھا سمجھتا تھا کہ اسے انعام ملے گا اور یہ لڑکی مصیبت سے بچے گی۔

دلاری کی واپسی نے گھر میں کھلبلی ڈال دی۔ وہ گردن جھکائے، سر سے پیر تک ایک سفید چادر اوڑھے، پریشان صورت داخل ہوئی اور سائبان کے کونے میں جا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ پہلے تو نوکرانیاں آئیں۔ وہ دور سے کھڑی اس کو دیکھتیں اور افسوس کر کے جاتیں۔ اتنے میں ناظم علی صاحب زنانے میں تشریف لائے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ دلاری واپس آ گئی ہے تو وہ باہر نکلے، جہاں دلاری بیٹھی تھی۔ وہ کام کاجی آدمی تھے۔ گھر کے معاملات میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ انھیں بھلا ان ذرا ذرا سی باتوں کی کہاں فرصت۔ دلاری کو دور سے پکار کر کہا: "بے وقوف، اب ایسی حرکت نہ کرنا۔" اور یہ فرما کر اپنے کام پر چلے گئے۔ اس کے بعد چھوٹی صاحبزادی دو قدم اندر سے برآمد ہوئیں اور دلاری کے پاس پہنچیں، مگر بہت قریب نہیں، اس وقت وہاں کوئی اور نہ تھا۔ دلاری کے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھیں۔ دلاری کے بھاگنے کا انھیں بہت افسوس تھا۔ شریف، پاکباز، باعصمت حسینہ بیگم کو اس غریب بے چاری پر بہت ترس تھا۔ مگر ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئی لڑکی کیسے ایسے گھر کا سہارا چھوڑ کر جہاں اس کی ساری زندگی بسر ہوئی ہو، باہر قدم رکھ سکتی

ر پھر تم کیا ہوا! عصمت فروشی، غربت، ذلت، یہ سچ ہے کہ وہ لونڈی تھی، مگر بھاگنے سے اس کی حالت بہتر کیسے ہوئی؟ دلاری گردن جھکائے
بیٹھی تھی۔ حسینہ بیگم نے خیال کیا کہ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہے۔ اس گھر سے بھاگنا، جس میں وہ پلی، احسان فراموشی تھی۔ مگر اس کی اسے کافی
سزا مل گئی۔ خدا بھی گنہ گاروں کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ گو کہ اس کی آبرو خاک میں مل گئی مگر ایک لونڈی کے لیے یہ اتنی اہم چیز نہیں جتنی
کسی شریف زادی کے لیے۔ کسی نوکر سے اس کی شادی کر دی جائے گی۔ سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ انھوں نے آہستہ سے نرم لہجے میں
کہا۔ "دلاری یہ تو نے کیا کیا؟" دلاری نے گردن اٹھائی، ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک لمحے کے لیے اپنے بچپن کی ہمجولی کو دیکھا اور پھر اسی طرح
سے سر جھکا لیا۔

حسینہ بیگم واپس جا رہی تھیں کہ خود بیگم صاحب آ گئیں۔ ان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ دلاری کے بالکل پاس آ کر کھڑی
ہو گئیں۔ دلاری اسی طرح چپ، گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ بیگم صاحب نے اسے ڈانٹنا شروع کیا:

"بے حیا! آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نہ، مگر منہ کالا کر کے۔ سارا زمانہ تجھ پر تھڑی تھڑی کرتا ہے۔ برے فعل کا
یہی انجام ہے......" مگر باوجود ان سب باتوں کے بیگم صاحب اس کے لوٹ آنے سے خوش تھیں۔ جب سے دلاری بھاگی تھی گھر کا کام
طرح اتنی اچھی طرح سے نہیں ہوتا تھا۔

اس لعن طعن کا تماشا دیکھنے سب گھر والے بیگم صاحب اور دلاری کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ ایک نجس، ناچیز ہستی کو اس
طرح ذلیل دیکھ کر سب کے سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے۔ مردار خور گدھ بھلا کب سمجھتے ہیں کہ جس بے کس جسم پر وہ اپنی
غلیظ ٹھونگیں مارتے ہیں بے جان ہونے کے باوجود بھی ان کے ایسے زندوں سے بہتر ہے۔

یکایک بغل کے کمرے سے کاظم اپنی خوبصورت دلہن کے ساتھ نکلے اور اپنی ماں کی طرف بڑھے۔ انھوں نے دلاری پر نظر نہیں ڈالی۔
ان کے چہرے سے غصہ نمایاں تھا۔ انھوں نے اپنی والدہ سے درشت لہجے میں کہا "امی خدا کے لیے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجیے۔ وہ کافی
سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں کہ اس کی حالت کیا ہو رہی ہے"۔

لڑکی اس آواز کے سننے کی تاب نہ لا سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ سماں پھر گیا جب وہ اور کاظم راتوں کی تنہائی میں یکجا
ہوتے تھے۔ جب اس کے کان پیار کے الفاظ سننے کے عادی تھے۔ کاظم کی شادی اس کے سینے میں نشتر کی طرح چبھتی تھی۔ اسی خلش
اس بے دلی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اور اب یہ حالت ہے کہ وہ بھی یوں باتیں کرنے لگے۔ اس روحانی کوفت نے دلاری کو
اس وقت نسوانی حمیت کا مجسمہ بنا دیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کر کے سب نے
ہٹنا شروع کیا۔ مگر یہ ایک مجروح، پر شکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی۔

اسی دن، رات کو وہ پھر غائب ہو گئی۔

کتابوں کی باتیں

ہیرانند سوز

انور)

کچھ نئی اور کچھ پرانی مطبوعات

ستیش بترہ "اُڑتے لمحے" کے ساتھ

جناب ستیش بترہ اپنا چوتھا افسانوی مجموعہ "اُڑتے لمحوں کے پروں پر" تحریر کر کے اس بار بھی نئے پیغامات کے ساتھ بامِ ادب پر آتے ہیں: موضوعات کا اچھوتا پن اور فنی افسانہ نگاری کا رکھ رکھاؤ اُن کے اس مجموعے میں اور بھی نکھرا نکھرا نظر آتا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں بھی انھوں نے ادب کی اس صنف پر اپنے نظریات اور اعتقادات کا اظہار مکمل خود اعتمادی اور پورے تیقن کے ساتھ کیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اُن کے یہ افسانے اُن کے ان نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس سے پہلے ان کے تین افسانوی مجموعے "ویران بہاریں" "بوند بوند ساگر" اور "آڑی ترچھی لکیریں" تقریباً برابر برابر وقفوں کے بعد شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کے مطالعے سے جہاں ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ستیش بترہ شروع سے ہی مثبت تہذیبی اقدار کے علمبردار رہے ہیں اور فن میں ہمیشہ مقصدیت کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فنی ارتقا کے ساتھ ساتھ ان موضوعات پر ان کی اپروچ بھی سائیکولوجیکل اور روحانی ہوتی چلی گئی ہے۔ "ویران بہاریں" اور "بوند بوند ساگر" میں تو ہمیں شاید کہیں کہیں سطحیت یا دوسرے مستند ملکی یا غیر ملکی فن کاروں کے اثرات کی جھلک دکھائی دے مگر "آڑی ترچھی لکیریں" کے بعد کے فن میں ان کی انفرادیت ابھر کر سامنے آتی ہے اور سنجیدگی فکر کے ساتھ ساتھ لفظ شناسی نے بھی اُن کے قلم کو نیا اسلوب اور ندرتِ بیان عطا کی ہے۔ "بوند بوند ساگر" میں لگاتار آتے ہوئے "زمین اور آسمان"، "کیپٹن پرساد" اور "دوسرا "بیٹا" پڑھ کر ہمیں شاید ان میں جذباتیت اور موضوع کی یکسانیت کا احساس ہو یا "ویران بہاریں" میں یہ ہیں۔ ادھوری۔ "ایک ہی دلدل" یا ہم یا "مہا ساں" سے متاثر نظر آتی ہیں۔ مگر "آڑی ترچھی لکیریں" کے افسانے ان کی اپنی بالغ نظری کی دین ہیں۔ ان میں سے کچھ افسانوں کی چولیاں تو انھوں نے اپنے "آنگن" سے بھی چنی ہیں۔ یہ افسانے ایسے واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں جو ماضی میں ان کی اپنی زندگی کو چھو کر گزرے ہیں۔ یا پیشہ ورانہ جدوجہد میں ان کے ذہن کو جھنجھوڑ گئے ہیں۔ "برطرفی" "کرسی" "پھولوں کا کرب" اور ادھوری کہانی اسی زمرے میں آتے ہیں لیکن یہ بھی نہیں کہ اس مجموعے میں شامل دوسری کہانیاں سماج اور معاشرے کے دیگر مختلف المتنوع پہلوؤں کی عکاسی نہیں کرتیں۔ انھوں نے اس کتاب میں سماجی بگاڑ، نفسیاتی الجھنوں، اقتصادی ناہمواریوں اور معاشرے کی دیگر خرابیوں کو بڑی چابک دستی سے افسانوی قالب میں اتارا ہے۔ "نیا خون" "دو حصوں میں بٹی عورت" "ناخلف اولاد" "خدا بخش" جیسی بھرپور کہانیاں اُن کی اسی فنی مہارت اور شعور کی پختگی کی غمازی کرتی ہیں۔

"اُڑتے لمحے" کی کہانیوں میں بھی اُن کی طرزِ نگارش کا رنگ بہت زیادہ سجا سنورا اور نکھرے ہوئے انداز میں نظر آتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور بات جو ان افسانوں کو ممتاز بنا دیتی ہے وہ ہے موضوعات کا اچھوتا پن۔ اس مجموعے کی ہر کہانی اپنے اندر ایک نیا موضوع لئے ہوئے ہے اور ہم کسی بھی دو کہانیوں پر پہلے کی طرح مماثلت کا الزام نہیں لگا سکتے۔ بس ایک چیز جو اس مجموعے کی بہت سی کہانیوں میں

مشترک ہے وہ ہے ایک لطیف احساس، ایک نازک جذبہ جو بنیادی طور پر مرکزی کرداروں کے اندر کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے اور پوری کہانی اسی جذبے سے متاثر کی گئی ہے۔

پہلی کہانی "بیڈ منگ" کا "کون" تو غیر روایتی طرز کی ایک جذباتی کہانی ہے اور جذباتیت کے اعتبار سے "آڑی ترچھی لکیریں" کی ایک کہانی "مرجھے کا سہانا" کے قریب لگتی ہے مگر ستیش بترہ نے اس کے ماحول کو یکسر بدل کر اسے بالکل نئے انداز سے پیش کیا ہے۔

"ان رشتوں کو نام نہ دو" البتہ ایک نئے اور اچھوتے سبجیکٹ کو گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ نارمل ذہن ایک غیر عورت اور مرد کے رشتے کو جنسی تعلقات سے ہٹ کر نہیں سوچ سکتا لیکن ایک اور رشتہ شاید اس سے زیادہ لطیف اور مقدس بھی ہے۔ اس کہانی میں کیمرے کا فوکس اسی رشتے کی طرف ہے۔ کہانی کار کی چشمِ بینا نے قاری کو سوچ میں ڈال دیا ہے کہ یہ فرق کیا اس نیند میں بھی لیا جا سکتا ہے؟

"داستان" یوں تو ایک سیدھی سادی کہانی ہے لیکن اس میں ایک بلی کو مرکزی کردار بنا کر جدت پیدا کر دی گئی ہے۔ بلی کا رول بڑے فنکارانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ مگر کلائمکس کہانی کو روایتی سطح پر لے آیا ہے۔

"پل گھنٹہ" اس مجموعے کی بلند پایہ کہانی ہے۔ افسانہ نگار نے اس حتمی دور میں دم توڑتی ہوئی انسانی قدروں کا سرِ راہ ماتم ہوتے دکھایا ہے۔ اپنی مصروفیات اور ضروریات کے بیچ گھرے انسانوں کی بے حسی اور بے بسی اس کہانی میں فراریت پسند ذہنوں سے خود بخود واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی اس کہانی کی عظمت ہے جس کے لئے کہانی کار داد کا مستحق ہے۔

"وقت کے قدموں کا حساب" میں پھر افسانہ نگار نے ایک لطیف نسوانی احساس

کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے۔ ایک حادثہ ہوا۔ ہونا تھا ہو گیا۔ لیکن کہانی اس کے مابعد اثرات سے شروع ہوتی ہے۔ ایسے اثرات جنھوں نے ذہن میں لاوا بھر دیا۔ اور پھر کسی نے اس خاموش آتش فشاں کی ہلاکت خیزی کا اندازہ کئے بغیر اس میں چنگاری بھی پھینک دی۔ ایک دھماکہ ہوا اور سب کچھ آتش سیال میں بہہ گیا۔ کہانی کا اہم ترین نقطہ یہی چنگاری ہے۔ ایک ننگے اور بے حیا فقرے کے روپ میں سُلگتی ہوئی چنگاری۔ مگر کہانی کی لطافت اور نزاکت اس فقرے کا بوجھ نہیں اُٹھا پا رہی۔ اس لئے ڈگمگاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس خوبصورت کہانی کی یہ سچویشن تاثر میں کمی لائے بغیر کسی اور طریقے سے بھی نبھائی جا سکتی تھی۔

"یہ قربتیں یہ دوریاں" اور "کھوئے لمحوں کا کھاتہ" دونوں ہی اقتصادی محرومیت کے لطیف احساس پر استوار ہیں مگر ان کی ہیئت اور نوعیت ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ ہے ان میں جنس لطیف کی فطرت کے دو مختلف پہلو ماحول اور حالات کی روشنی میں ایک شبیہ کی طرح اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ کرداروں کی نفسیاتی ڈیولپمنٹ بھی بڑے خوبصورت انداز سے کی گئی ہے۔

"ڈیسپرائیٹ اور ہگلی" ذہنی کیفیت کی کہانی ہے۔ ایک ایسا ذہن جس کے لاشعور پر مغربی چمک دمک اور رچ دھج کی گہری چھاپ ہے اور اسے ایک پہلو سے سحر زدہ کئے ہوئے ہے۔ وہ بار بار ہگلی کے گندے ماحول اور ماضی کی یادوں میں بسے ہر پہلو کا حسین جزیرے کا موازنہ کرتا ہے مگر مغرب کی طلسماتی کشش بہرحال اپنا پلڑا بھاری رکھتی ہے حتیٰ کہ یہاں کی ایک حسین محبت بھری ملاقات جب دوبارہ پھر اس ماحول میں ہندوستانی روپ دھار کر آتی ہے تو اُسے غیر دلچسپ اور بھونڈی معلوم ہوتی ہے۔ ڈیسپرائیٹ کے ماحول کی اتنی اچھی تصویر کشی ایسے کہانی کار نے ایک لمبا عرصہ وہاں رہ کر ہر پہلو اس کے گرد و نواح کا مطالعہ کیا ہو۔

پہاڑ کی سیر بھی اپنے اندر ایک نیا انداز لئے ہوئے ہے۔ انسان اپنی انا کو تاج کی طرح سر پر سجائے پھرتا ہے۔ چاہے اس کے کونے اس کی کنپٹیوں میں چبھ رہے ہوں۔ چاہے اس کے بوجھ سے اس کی گردن دوہری ہو رہی ہو۔ مگر وہ اس بات سے مطمئن رہتا ہے کہ اس کے وجود کی چمک دمک سے دوسروں کی آنکھیں تو خیرہ ہو رہی ہیں۔ کچھ غیر متعلق جزئیات کے باوجود کہانی اس مرکزی خیال کو پوری طرح اُجاگر کئے ہوئے ہے اور کہانی کار نے تھیم کو قلم کی زد سے باہر نہیں جانے دیا۔

جذبے کی لطافت "ماں جی" کے کردار میں پوری شدت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ کہانی کا متن "ان رشتوں کو نام نہ دو" کے قریب ضرور لگتا ہے مگر دونوں کا مرکزی خیال جُدا ہے۔

ستیش بترہ نے پولیٹیکل کرداروں پر بھی کافی جرأت کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ مرن برت اس کی ایک کامیاب مثال ہے۔ پالیٹیکس بہت کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نفسیاتی عمل بھی ہے اور ستیش بترہ نے اس کا اسی پہلو سے تجزیہ کیا ہے۔ 'بوند بوند ساگر' میں 'چنگاری' اور 'آڑی ترچھی لکیریں' میں 'خدا بخشے' بھی سیاسی موضوعات کی کہانیاں ہیں اور اتنی ہی خوبصورت ہیں جتنی 'مرن برت'۔

'ہوٹل سے ہوٹل تک' میں موضوع کو گرفت میں لینے کی بجائے ہوٹل کی اندرونی منظر کشی اور اس کے معائب و محاسن کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے جس سے ایک نازک اور خوبصورت خیال ہوٹل کے بوجھل ماحول تلے دب گیا ہے۔

"ایک کشتی میں سوار" فلمی دُنیا کے دو کرداروں کی کہانی ہے۔ ترچھی تقابل کی ایک اچھی مثال جسے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس میں فلمی دُنیا سے متعلق گہرے اور نزدیکی مشاہدے کی کمی کھٹکتی ہے۔

"ایک پھول سو رنگ" کہانی سے زیادہ ایک لا اُبالی کریکٹر کا نفسیاتی تجزیہ ہے جسے نہ جانے کس جذبے کے تحت پھولوں سے تشبیہ دے کر اس کی سیمابی فطرت کو ہزار رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگر ہم "آڑے ترچھے" کا مجموعی طور پر جائزہ لیں تو ہم ستیش بترہ کی تخلیقی صلاحیتوں اور فنی معیار کو اُن کے ہم عصر مستند افسانہ نگاروں سے کسی طرح بھی کم نہ پائیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کا جھکاؤ جدیدیت کی طرف نہیں ہے اور نہ ہی انھوں نے اپنے افسانوں میں تجریدی اور علامتی تکنیکوں کو اپنایا ہے۔ مگر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ افسانہ نگاری کی پُرانی روایات سے جکڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس مجموعے میں انسانی نفسیات کے ہر پہلو کی تصویر کشی کی ہے مگر جو بات کہی ہے صاف اور واضح انداز میں کہی ہے۔ کہانی کو کہیں بھی استعارہ بنا کر پیش نہیں کیا اور نہ ہی کہیں انھوں نے خود کو یا قاری کو سٹریم آف کانشس نس کے بھنور میں پھنسایا ہے۔ انھوں نے جیسا سوچا ہے اور جو کچھ کہنا چاہا ہے براہ راست قاری کے ذہن تک پہنچا دیا ہے۔ یہی اُن کی پہچان ہے اور یہی اُن کی انفرادیت ہے۔

ہیرانند سوزؔ

●●●

امیر خسرو جنہوں نے گیارہ شاہوں کا زمانہ دیکھا۔ فارسی کے علاوہ ہندی میں چار لاکھ سے زائد اشعار کہے۔ جو شاعر ہونے کے علاوہ بیک وقت اعلیٰ پائے کے موسیقار بھی تھے اور مورخ بھی صوفی بھی اور سپاہی بھی۔ خسرو جنہوں نے غزل کے علاوہ گیت بھی لکھے اور پہیلیاں بھی، دو سخنے اور کہہ مکرنیاں بھی، انمل اور مثنویاں بھی غرض بقول علامہ شبلی نعمانی امیر خسرو کی ذات، جامع الکمالات، تھی اس کے علاوہ امیر خسرو پہلے ہندوستانی شاعر ہیں جن کے یہاں دو مختلف تہذیبیں الگ ایک دوسرے میں اس طرح مکمل مل گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا ہی نہیں جا سکتا حضرت امیر خسرو ہماری مشترکہ تہذیب کا ایک ایسا نادر نمونہ ہیں جس کی مثال اردو ادب میں ذرا مشکل ہی سے ملے گی تاہم اس کے باوجود اس صداقت سے بھی انکار مشکل ہے کہ لگ بھگ سات سو سال کے زمانی اور مکانی بعد نے خسرو کے چاروں طرف ایک ایسا ہالہ قائم

دیا ہے جس سے ان کی ذات حقیقی کم اور افسانوی زیادہ نظر آتی ہے۔ آج حضرت امیر خسرو ہم لوگوں کے لیے ایک اپنا مظہر ہیں جس کے تمام خسرو خیال اور کارنامے قیاسیات اور توہمات سے ہو کر گذرتے ہیں۔ اس خوش عقیدگی کو دور کرنے میں تحقیق نے بھی کوئی قابل قدر خدمات انجام نہیں دی۔ محققوں نے یہ ثابت کرنے میں تو کسر نہیں اٹھا رکھی کہ جو ہندی کلام خسرو سے منسوب کیا جا رہا ہے وہ دراصل خسرو کا نہیں بلکہ الحاقی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج چار لاکھ اشعار میں سے چار سو اشعار بھی ایسے نہیں رہے جنہیں وثوق کے ساتھ خسرو سے منسوب کیا جا سکے۔ اس غلط فہمی کو برقرار رکھنے میں مرحوم محمد شیرانی سے لے کر جناب وحید مرزا، ممتاز حسین اور رشید ملک جیسے کئی محقق شامل ہیں۔

زیر نظر کتاب جناب کے۔ کے کھلر صاحب کا ایک ایسا مبسوط تحقیقی مقالہ ہے جس میں خسرو کے تعلق سے بہت سی غلط فہمیوں کا سد باب ہوتا ہے۔ تقریباً ۶۷ کتابیں، رسالے، اخبار، مخطوطے، ڈکشنریاں اور دیگر معتبر وسائل سے حاصل کردہ حقائق، واقعات کا نچوڑ ہے "امیر خسرو اور ہمارا مشترکہ کلچر" اس سے پہلے موصوف نے اردو کا آخری نقاد، لکھ کر اردو کے بہت سے 'اولین' اور گمراہ قسم کے نقادوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی تھی۔ زیر کتاب بہت سے رائج الوقت محققوں کو تحقیق کے آداب سکھانے کے لیے کافی ہے۔

ایک سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ کتاب حضرت امیر خسرو کے تعلق سے نہ صرف غلط فہمیوں کا ازالہ کرتی ہے بلکہ جو حقائق اب تک پردہ خفا میں تھے اور جن پر اب تک کسی اور محقق کی نظر کم ہی پڑی تھی۔ اسے بھی پیش کرتی ہے۔ رشید ملک جیسے صاحب علم و بصیرت نے یہ لکھ کر کہا کہ ... اور خسرو جیسے ہمہ جہت اور جامع الکمالات فن کار کو موسیقی کے تعلق سے کسی راگ اور سازوں کا تنہا موجد ماننے سے انکار کر دیا جبکہ کھلر صاحب نے اپنی تحقیق کے ذریعہ اور مدلل حوالوں کے ساتھ رشید ملک کے غلط اخذ کردہ نتائج کو کمال متانت کے ساتھ رد کیا ہے۔ رشید ملک صاحب یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ قوالی اور ترانہ موسیقی کی ارتقائی منزلیں ہیں اور ستار، طبلہ، ڈھولک مسلمانوں کے ایجاد کردہ ساز ہیں مگر یہ نہیں مانتے کہ مختلف آلات موسیقی، اور راگوں کے موجد تنہا امیر خسرو تھے۔ ان کے اپنے الفاظ میں

"مندرجہ بالا امور سے پتہ چلتا ہے کہ قوالی یا ترانہ کوئی شخصی ایجادات نہیں ہیں بلکہ موسیقی کی ہیئت کے ارتقاء کی مختلف منزلیں ہیں اور مختلف عوامل کی پیداوار ہیں جو دو مختلف تہذیبوں کے غلط ملط ہونے سے بروئے کار آئے۔ اگر ہم ستار، طبلہ، ڈھول، قوالی اور ترانے کو مسلمانوں کی ایجادات یا ان کے رائج کردہ ساز کہیں تو ہم تاریخی لحاظ سے بالکل حق بجانب ہیں لیکن ان سب کی ایجاد کو صرف ایک آدمی سے منسوب کر دینا اپنی ہی ثقافت سے ہماری مکمل لاعلمی کی دلیل ہے"

اب ذرا کھلر صاحب کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

"رشید ملک صاحب کی علم دوستی پر مجھے کوئی شک نہیں لیکن سنسکرت، پالی اور پراکرت کی لاعلمی ان کی تحقیق کو غلط راستے پر لے گئی۔ ان پرانے علمی خزانوں تک ان کی رسائی نہ ہوئی اور جن ترجموں پر انھوں نے قناعت کی وہ ناقص تھے۔ وہ ستار کو ایران اور عرب کا ساز تو ماننے کو تیار ہیں لیکن جن ملتے جلتے ساز یا تار کا رگ وید میں ذکر ہے انھیں قبول کرنے سے منکر ہیں"

"امیر کی ایک اور عجیب و غریب ایجاد ڈھلکری' ہے امیر سے پہلے ہندوستان میں ڈھلکری نہ تھی امیر کا ترانہ ایسا مقبول ہوا کہ بقول فقیہ محمد خاں سننے والوں کے علاوہ خود گانے والے بھی محو حیرت رہ گئے"

"ستار کو سولو (ستار) ساز کی حیثیت میاں تان سین نے دی۔ وہی تان سین جنہوں نے امیر خسرو کو نایک تسلیم کیا۔ عین ممکن ہے کہ پکھاوج کو بیچ سے کاٹ کر دو الگ الگ ٹکڑوں کو طبلے کہا گیا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ طبلہ کی موجودہ شکل امیر خسرو کی دی ہوئی ہے"

"امیر خسرو اور ہمارا مشترکہ کلچر" بارہ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کو ایک عنوان دیا گیا ہے۔ تاہم خوبی کی بات یہ ہے کہ ہر باب ایک مکمل مضمون ہوتے ہوئے بھی دیگر ابواب سے پیوستہ ہے مقالہ کچھ اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ امیر خسرو کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا عہد بہ عہد ارتقائی منزلیں عبور کرتا ہوا نظر آتا ہے ساتھ ہی امیر کے تمام ادبی اور فنی کارناموں پر سیر حاصل بحث بھی کی گئی ہے۔ محققین کے بعض اعتراضات کا تشفی بخش جواب بھی ہے اور نئے نئے انکشافات بھی۔ اس کے علاوہ جناب کے۔ کے کھلر صاحب نے اس کتاب میں اتنے بیش بہا تاریخی حقائق پیش کئے ہیں کہ اگر ان پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے تو بذات خود ایک کتابچہ تیار ہو سکتا ہے

زیر نظر کتاب کے توسط سے امیر خسرو کی شکل نمایاں طور پر نظر آتی ہے اور ان کے فنی کمالات واقعی صورت میں جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں اور ان سب چیزوں کو روشن کرنے میں کھلر صاحب کی شگفتہ تحریر اور دلچسپ انداز بیان کا بھی دخل ہے۔ مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ کریں۔

"امیر خسرو کی حیثیت تاریخی ہوتے ہوئے بھی افسانوی ہے۔ جہاں ساون ہے وہاں

امیر خسرو ہے جہاں رومان ہے وہاں امیر خسرو ہے جہاں بیوی اپنے شوہر کا انتظار کرتی ہے وہاں امیر خسرو ہے جہاں فراق ہے وہاں امیر خسرو ہے جہاں ملاپ ہے وہاں امیر خسرو ہے جہاں جدائی ہے وہاں امیر خسرو ہے۔ امیر خسرو ہندوستانی کلچر کی ایک موہنی تصویر ہے۔ خسرو کے گیت پڑھنے کے بعد آدمی انسانیت کی بلندیوں کو چھونے کے قابل ہو جاتا ہے "

خسرو شناسی میں یہ کتاب اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں ... کے۔ کے کھلر صاحب نے بعض ایسی تاریخی اور نادر تصویریں شامل کر دی ہیں جو اس سے پیشتر دیکھنے میں نہیں آئیں۔ تصویروں کا یہ انتخابی سیٹ جس جانفشانی اور محنت سے یکجا کیا گیا ہے اس کی داد ملنی چاہیئے۔

صفدر آہ کے بعد امیر خسرو پر جناب کے۔ کے کھلر صاحب کی یہ کتاب ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ میرے نزدیک خسرو شناسی کے باب میں یہ کتاب ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تبصرہ مکمل ہو اس سے پیشتر میں اسی کتاب سے کھلر صاحب کا وہ اقتباس نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو انھوں نے بطور خراج تحسین کے امیر خسرو کے تعلق سے لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس سے بہتر معنی خیز انداز میں اور اس سے بہتر زبان میں امیر کو خراج تحسین پیش کرنا مشکل ہے۔

"خسرو ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور ادب کا ققنس ہے۔ وہ نادر الوجود پرندہ جس کا کوئی ہم سر نہیں ہوتا جس کی عمر ایک ہزار سال ہوا کرتی ہے اور جس کے پورے ہو جانے پر وہ بہت سی سوکھی لکڑیاں اکٹھی کرتا ہے اور ان پر بیٹھ کر عالم سرمستی میں ایک عجیب و غریب دلدوز راگ چھیڑتا ہے اور اپنی منقار سے ان گنت راگ اور راگنیاں نکالتا ہے۔ اپنے پروں کو بے خودی کے عالم میں پھڑپھڑاتا ہے اور جس وقت دیپک راگ پر پہنچتا ہے تو راگ کی حدت سے یکایک ان لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے جس میں جل کر وہ بھی راکھ ہو جاتا ہے۔ پھر جب مینہ برستا ہے تو وہ راکھ ایک انڈے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جس میں کچھ مدت کے بعد از خود ایک ققنس پیدا ہو جاتا ہے خسرو نے بھی اسی طرح اپنے گیتوں اور بولوں اور شعروں کی شکل میں لکڑیاں اکٹھا کیں اور فکر و فن کے راگ سے اس میں ایسی آگ لگائی جو دو آتشہ تھی اور جس میں جل کر خود انھیں ہزار سالہ زندگی مل گئی۔ خسرو آج بھی زندہ ہے "

تحقیق جیسے خشک راستے پر چل کر ایسی گل افشانی کرنا مصنف کے صاحب طرز ہونے کی بین دلیل ہے ورنہ عام طور پر ایسے تحقیقی موضوعات کی زبان کھردری اور اکتا دینے کی حد تک بوریت سے معمور ہوتی ہے

کتاب کے حسن اور معنویت کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں ۱۸۰ روپے میں بھی یہ کتاب مہنگی نہیں۔

انور

•••

شامِ یاراں سے ایک خط

" اس میں شک نہیں کہ بہت سے ادارے اس شہر میں وقتاً فوقتاً ادبی محفلوں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں اور یہ محفلیں عوام میں کافی مقبول بھی ہیں۔ لیکن اگر ہم ان اداروں کی سرگرمیوں پر غور سے نظر ڈالیں تو ہمیں اس حقیقت کا احساس ہوگا کہ ان میں سے بیشتر یا تو سیاسیات یا گروپ بندی کا شکار ہیں یا ذاتیات کے زیر اثر ہیں۔ ایسے ماحول میں فنکار کے جذبات گھٹ کر رہ جاتے ہیں اور وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، کہہ نہیں پاتا۔ اس کی ادبی صلاحیتیں سیاسی گٹھ بندی اور گروپ بازی میں ضائع کر دی جاتی ہیں۔ کئی ایک دیگر ادبی اداروں کی فضا کچھ ایسی ہے یعنی کہ جیسے وہ کسی خاص قسم کے نظم و نسق کے پابند ہوں سا تھیں ایک خاص قسم کا حکمرانہ نظم و نسق کنٹرول کرتا نظر آئے گا۔ جو ادارے ذاتیات کے زیر اثر ہیں۔ وہاں چند افراد اپنی شخصیتوں کو ابھارنے کی کوشش میں کار فرما معلوم ہوتے ہیں۔ دریں حالات ادبی محفلیں محض مطلب براری اور مصلحت کی غلام بن کر رہ گئی ہیں اور ان کا ماحول ادبیات کے پنپنے کے موافق نہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ہم ایک ایسی محفل کی داغ بیل رکھنا چاہتے ہیں۔ جو سیاسیات، گٹھ بندیوں اور تعصبات سے آزاد ہو اور جہاں اہل فن مل کر اس طرح کا ماحول پیدا کریں کہ جس میں احساسات اور تاثرات کا آزادانہ اظہار ہو سکے۔ ادبی موضوعات پر سیر حاصل گفتگو ہو سکے اور ادبی ذوق و شوق کو ابھارنے میں مدد مل سکے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر کے انسانی سماج پر خود غرضی، حرص زر، تعصبات، تنگ نظری، اخلاقی گراوٹ اور بزدلی کے تاریک بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ہمیں حق کی بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اگر شاعر اور فن کار کے دل میں حق اور صداقت کی بات کہنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو مصلحت اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے اور وہ دل کی بات زبان پر نہیں لا سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کے شاعر اور فن کار میں یہ جرأت اور ہمت پیدا ہو کہ وہ حق کی بات کہنے میں ذرا بھی تامل نہ کرے۔ ہمیں امید ہے کہ شام یاراں کی محفلوں میں شرکت کرنے والے حضرات ایسا ماحول پیدا کرنے میں ضرور متفق ہوں گے "

چرن جیت سنگھ
رگھوناتھ گھئی
"شام یاراں"
4/E/1 جھنڈے والا ایکسٹینشن
نئی دہلی ۵۵۰۰۱۱

ان نیک مقاصد کی کامیابی کے لئے چنگاری دعا گو ہے۔

ادبی نشستیں

ہیرانند سوز
سیماب سلطانپوری

۸ ستمبر ۱۹۸۲ء کا دن ادبی سنگم فریدآباد نے ایک بار پھر نہایت تزک و احتشام سے منایا۔ جب ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار جناب رام لعل نے لکھنؤ سے اور "تحریک" کے سابق ایڈیٹر جناب سرسوتی سرن کیف نے چندی گڑھ سے تشریف لاکر ہیرانند سوز کے ہاں جناب شفیق بترو کے زیرِ صدارت منعقدہ ادبی نشست کو شمولیت کا شرف بخشا۔

ان مہمانانِ خصوصی کے علاوہ جناب رام کرشن راحت، جناب بشیر بالیرکوٹلوی، ہیرانند سوز اور جناب امر ساحتی نے اپنی تازہ ترین کہانیاں پڑھ کر سنائیں۔ اس کے بعد جناب سرسوتی سرن کیف سے افسانہ سنانے کے لئے درخواست کی گئی۔ انھوں نے 'چنگاری' کے گذشتہ شمارے میں شائع ہونے والی اپنی نہایت ہی خوبصورت کہانی پڑھ کر سنائی جس نے ندرتِ خیال اور حسنِ بیان کی بنا پر داد حاصل کی۔ آخر میں جناب رام لعل نے اپنے پاکستان کے سفرنامے "درد پتوں کی بہار" میں سے کچھ اقتباس سنا کر حاضرین کو وہاں کی ادبی، ثقافتی اور صحافتی سرگرمیوں سے روشناس کرایا اور وہاں کے سماجی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

اس کے بعد مشاعرے کا دور شروع ہوا اور شعرا حضرات نے اپنے بہترین کلام سے مہمانوں کو محظوظ کیا۔

محفل کے اختتام پر جناب رام لعل نے فرمایا "میں اس محفل کو اپنا حاصلِ سفر سمجھتا ہوں۔ یہاں آکر مجھے سکون حاصل ہوا اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہاں بھی زبان کی خدمت کی جا رہی ہے اور یہ وسوسہ کہ ہماری پیڑھی کے ختم ہو جانے کے بعد اس زبان اور ادب کا کیا ہوگا۔ بےکار معلوم ہوا۔ میں نے یہاں جتنی کہانیاں سُنیں سب کی سب نہایت پختہ تھیں کسی ایک کہانی میں بھی کچا پن نہیں تھا۔ زندگی کے بارے میں اپنے اپنے نقطۂ نظر کو لوگوں نے اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔"

نشست، صدرِ محفل جناب ستیش بترہ کے شکریہ کے الفاظ کے ساتھ ختم ہوئی۔

حلقۂ تشنگانِ ادب نئی دہلی کی ۱۶۲ ویں ماہانہ نشست جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے اعزاز میں مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۸۲ء بروز اتوار جناب ہیرالال ورما کے دولت خانہ ۱۵-ل گرین پارک نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔

سب سے پہلے صدرِ حلقہ جناب جگدیش جین، صاحبِ خانہ جناب ہیرالال ورما اور دیگر مختلف ادبی حلقوں کے نمائندوں نے گل پوشی سے جناب نارنگ صاحب کا خیر مقدم کیا۔ حلقہ کے سیکرٹری جناب سیماب سلطانپوری نے ڈاکٹر صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنی تعارفی اور استقبالیہ تقریر میں ان کی ادبی خدمات کی سراہنا کی۔

اور بتایا کہ آج سے ۸ سال قبل ۱۹۷۵ء میں جب حلقہ کی پہلی ادبی پیش کش "ساز و نوا" کی رسمِ اجرا کے سلسلے میں آپ کو جب بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا تھا تو آپ بلا تکلف تشریف لائے اور اراکینِ حلقہ کو زبان و ادب کی تبلیغ و ترسیع کے لئے اپنے نیک مشوروں سے نوازا۔ اور یہ آپ کے اُن نیک اور مفید مشوروں پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ہے کہ حلقہ ادبی خدمات سرانجام دینے میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکا ہے۔

سیکرٹری حلقہ جناب سیماب سلطانپوری کی اس استقبالیہ تقریر کے بعد جناب مطیر ہوشیارپوری اور جناب رام پرکاش راہی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت، فن اور ادبی خدمات پر مبنی نہایت دلچسپ اور مؤثر مقالات کے ذریعہ خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جناب حیات جاوید نے فارسی قطعہ کی شکل میں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔

ازاں بعد بے تکلف گفتگو کے دور میں سیکرٹری حلقہ اور چند دیگر حاضرین کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے زبان و ادب کی ترقی و ترسیع پر روشنی ڈالی تقسیم ہند کے بعد کی ادبی فضاؤں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ادب کی ترسیع اور ترقی کے لئے روایتی محدودیت سے نکلنے کا خطرہ مول لئے بغیر نئی جہتیں اور نئی وسعتیں حصول ممکن نہیں۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے واضح کیا کہ کس طرح منشی پریم چند کے بعد کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو نے افسانوی ادب کو اپنے اپنے اندازِ فکر اور طرزِ نگارش سے چار چاند لگائے۔ اسی طرح شعری ادب کو ترقی پسند شعرا نے جن میں فیض احمد فیض کی آواز زیادہ نمایاں رہی، ایک نیا آہنگ بخشا۔ ادب اور سماج سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ادب کا ہر شعبہ اور فن کا ہر پہلو کسی نہ کسی طرح انسانیت کی خدمت سرانجام دیتا ہے اور انسانیت کی خدمت خود سماج کی خدمت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس دلچسپ اور دل کش ادبی تقریر کے بعد نشستِ مشاعرہ کا دور شروع ہوا جس میں درجِ ذیل شعرا حضرات نے شرکت فرمائی اور سامعین کو اپنے پُرلطف کلام سے محظوظ فرمایا۔

جناب ہیرالال ورما، جناب سیوک گورداسپوری، جناب سیماب سلطانپوری، جناب راز میرٹھی، جناب برہمانند جلیس، جناب منور سرحدی، جناب بیدل، جناب رام ناتھ کمل، جناب ترون (فرزندِ ارجمند جناب گوپی چند نارنگ) جناب حاصل سلطان، جناب اندر نکہت، جناب بیدار سرسوی، جناب جمیل چینوٹی، جناب وقار صدیقی، جناب رگھوناتھ رکھی، ڈاکٹر چندن بالا، جناب دولت مارہروی، جناب ل۔ ایل بسنت، جناب عزیز نکودری، جناب حیات جاوید، جناب کرشن مُراری، جناب رام پرکاش راہی، جناب اقبال عمر، جناب طراج حیرت، جناب کرشن موہن، جناب ڈی۔ راج کنول (سابق صدر حلقہ)، جناب طالب چکوالی اور جناب جگدیش جین صدر حلقہ۔

شام کے تقریباً ۸½ بجے اختتام پذیر ہوئی۔

اس شمارے میں



مصور پندرہ روزہ
چنگاری
دہلی ۲۲
قیمت دو روپے
۵۰ پیسے
ایڈیٹر
جمیل احمد
ادبی حصے کی ترتیب
بشیر احمد
انیس احمد خاں
تیسرا سال
شمارہ نمبر۔ ۳۰
جمیل احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے جے کے آفسٹ پرنٹرس دہلی ۶
اور سپر پرنٹرس ای ۱۵۴ اے انار کلی دہلی ۵۱ سے چھپوا کر
رام نگر دہلی ۳۲ سے شائع کیا۔



دامن نگاہ کا

چنگاری شمارہ نمبر ۲۹ ماہ ستمبر ۸۳ء جناب وہاب تسنیم نے "کتابوں کی باتیں" کے کالم میں میرے شعر۔

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گذرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

کی تشریح میں جن مباحث کو پیش کیا ہے، وہ لائق ستائش ہیں۔ چنگاری میں شعر کی تفہیم کا بھی سلسلہ ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر افضل حسین نے سہ ماہی ادیب میں میرے شعر کی جو تشریح کی ہے، وہ ان کے جدت پسند ذہن کی اختراع تو ہو سکتی ہے مگر شعر کے معنی سے اسے کوئی علاقہ نہیں۔ جناب احسن مارہروی کی تشریح ہیں تھوڑا بہت معنی کے قریب تو لے جاتی ہے مگر تشریح کرتے وقت شارح کے نزدیک میر کی محرومیوں اور انکی قنوطی شخصیت کا تصور رہتا اور اسی تصور نے شعر کو دوسرے رخ پر ڈال دیا ہے۔

احسن مارہروی نے تہ بال کے یہ معنی بتائے ہیں کہ طائر جب اڑتے ہیں تو انکے بازو پھیل جاتے ہیں اور اس شکل کے قائم ہو جانے پر زمین کا حصہ پروں اور بازوؤں کے نیچے رہتا ہے۔ اسی کو تہ بال کہا گیا ہے، یہ معنی قدرے گنجلک ہے!

میرے نزدیک اس کے معنی بال و پر یعنی آزادی ہے، جب کسی پرندے کے پر ہونگے تو وہ پوری آزادی کے ساتھ اڑ سکتا ہے۔ تہ بال کے معنی کی وضاحت کے بعد اب تشریح یوں ہوگی کہ سیکڑوں موسم گل آئے اور خوبی قسمت سے ہم تہ بال (آزاد) رہے۔ اس طرح ہم نے موسم بہار کا پوری طرح لطف اٹھایا۔ دوسرے مصرعے میں شاعر اپنی آزادی پر خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ ہمکو کبھی بے بال و پری دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ یعنی جب تک ہم زندہ رہے ہمیشہ آزادہ روی کے ساتھ زندہ رہے۔ اگر ہم سودا کے حالات زندگی کو سامنے رکھیں تو شعر کا مفہوم اور بھی واضح ہو جائے گا۔

سودا زندگی بھر درباروں سے منسلک رہے اور اس انسلاک نے انہیں ہمیشہ ذہنی طور پر قید و بند میں رکھا۔ اس شعر میں میر بظاہر اپنی آزادہ روی پر اظہار مسرت کر رہے ہیں مگر باطن سودا پر لطیف سا طنز بھی کر گئے ہیں۔

مشتاق شبنم

• • •

مجھے چنگاری گو دیر سے سہی درست۔ مل جاتا ہے۔ اور آپ کے خط ... سے متاثر ہوں کہ پیرالفلیا ختم ہونے کے باوجود آپ نے چنگاری بھیجنا بند نہ کیا اس خط کے ہمراہ آپکو ڈرافٹ روانہ کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ چنگاری مندرجہ بالا پتے پر باقاعدگی سے روانہ کرکے طلب و ذہن کو شاکستہ کرتے رہینگے۔ اس سے قبل آپ چنگاری کلیان کے پتے پر روانہ کرتے رہے تھے مگر اب دھیان سے مندرجہ بالا پتہ چنگاری کے لئے گھر کا اور لفافے پر لکھا ہوا پتہ خط و کتابت کیلئے محفوظ کر لیجئے۔

آپ کا چنگاری ہر لحاظ سے خوب ہے مگر بقول علامہ اقبالؒ اس میں ایک ہی خامی ہے کہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اس کساد بازاری میں چنگاری کا یہ دم بھی غنیمت ہے۔ اس دور میں جہاں برصغیر کے بڑے بڑے تجارتی پرچے بالآخر بے قاعدگی کا شکار ہیں آپ کا ہر پندرہ دن میں باقاعدہ دروازہ پر دستک دینا مستحسن قدم ہے۔ اس بار گوشۂ سلیم احمد دیکھ کر آپ کی چابکدستی اور مستعدی کا اور بھی کچھ قائل ہوا۔ ہندپاک کے تقریباً تمام رسائل کا پابندی سے مطالعہ کرتے رہنے کے تجربے سے یہ بات کہہ رہا ہوں جسے آپ دعویٰ بھی کہہ لیں، ہندپاک اخباروں کو چھوڑ کر یہ پہلا رسالہ ہے کہ جس نے سلیم احمد کے بارے میں اتنا سارا مواد عطا کر دیا۔ یہاں تو بات ہی رہنے دیجئے۔ یہاں کے معتبر اردو نامہ اردو ٹائمز کو یہ خبر میں نے دی تو ڈیڑھ مہینے کے بعد چھپی۔ اور انقلاب میں ابھی چار پانچ روز ہوئے یہ خبر ملی تھی۔ کاش ہمارے اخباروں کی طرح سلیم احمد ہمارے لئے بھی کچھ دن اور جیتے ہوتے۔ میں۔ سلیم احمد پر ایک مضمون جواز کے مدیر کی فرمائش پر لکھ کر انھیں بہت پہلے ہی دے چکا ہوں۔ انشاءاللہ آپکو بھی کچھ دنوں میں سلیم احمد پر کچھ نہیں تو ایک غزل ہی لکھ کر بھیجونگا۔

چنگاری روز بروز ترقی کر رہا ہے، دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے خاص کر اس کا "موا نے وقت" کا کالم زبردست ہوتا ہے جسے میں بعد میں آرام سے پڑھنے کی بجت کرکے سب سے پہلے ہی پڑھ جاتا ہوں۔ خامہ بگوش جو بھی ہوں انکے لہجے کی کاٹ تبری بے ساختہ پن لئے ہوئے ہے۔ انکی تحریروں سے میں انھیں پہچاننے کی کوشش کے مراحل میں ہوں۔ آپکا بہت کچھ قیمتی وقت لے لیا۔ امید ہے معاف فرمائیں گے۔

سلیم احمد کا ہی ایک شعر آپکی نذر کر رہا ہوں، یعنی چنگاری کے لئے۔

میں کر رہا ہوں تری چشم کم سے اندازہ
کہ آنے والے زمانے بہت حسین ہونگے

محمد فاروق ٹنکی

• • •

پہلے تو آپ "چنگاری" جیسے صحت مند ادب پیش کرنے والے جریدہ کے لئے مبارکباد قبول کریں، دیکھتے دیکھتے اس نے ادبی رسالوں میں اچھا مقام بنا لیا ہے اس کے سارے مشمولات بے حد معیاری ہوتے ہیں، اور آپ کے حسنِ انتخاب داد طلب کرتے ہیں۔

میری ایک تازہ تصنیف "صاعقہ طور" ہے یہ جناب کلیم الدین کے تنقیدی نظریات کے خلاف لکھی گئی ہے، "چنگاری" کے اشتہار میں اسے شامل کرکے ممنون فرمائیں۔ تاج پیامی

• • •

کرسچین کالج لائبریری میں "چنگاری" کا تازہ شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خوب ہے

اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

مارکس ازم اور مذہب، کھلی قبر، معاف کرنا ایشیائی، دیوان غالب نسخۂ غالب اور کتابیں جو بند کر دی گئیں خصوصیت سے پسند خاطر ہوئے،

میں مساوات کا سخت حامی ہوں، اس رسالے کے نام کے بعد جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اداریہ کی پہلی سطر "چنگاری ہر قسم کے استحصال کے خلاف ہے" تھی، لہذا اپنے مخصوص رسالوں سے ہٹ کر ایک مختصر مضمون "گلیلیو کی کہانیاں" آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔ ایاز احمد قریشی

۳۰ جنوری ۱۹۸۴ء

آیئے انہیں روکیں، ٹوکیں اور خط لکھیں

زندگی خوب صورت سے خوب صورت تر ہو سکتی ہے، مگر ہم جس نظام میں جی رہے ہیں وہاں زندگی بڑی خوفناک ہے اذیت ناک ہے۔

اور خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو حساس ہیں۔ احترام آدمیت میں یقین رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی پالتو جانوروں سے الگ ہے۔

اور جب یہ دیکھتے ہیں کہ کس طرح سے آدمی ڈھور ڈنگروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور کس طرح کچھ لوگ انسانی خون پر انسانی محنت پر پلتے ہیں اور عیش کرتے ہیں۔

اور کس طرح زیادہ تر لوگ اپنے آس پاس کے لوگوں کی بھوک، پیاس، بے لباسی اور بے مکانیت، بے علاجی سے بے خبر اپنے دکھوں کو سینے میں دبائے جی رہے ہیں۔

اور جو لوگ جانتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ یہ سب کسی تقدیر کا نتیجہ کم ہے اور انسانی نا اہلی، بد انتظامی اور ہوس کا زیادہ۔

انسان اور انسان کے درمیان یہ گہری کھائی قدرتی نہیں ہے۔ انسان نے یہ کھائی پیدا کی ہے اور انسان کی مشترکہ کاوش سے یہ کھائی پٹ سکتی ہے، انسان کا معاشرہ جنت بن سکتا ہے۔

جو لوگ بے حس، بے درد، ظالم اور درندے ہیں ان سے مخاطبت بے کار ہے۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے وہ کبھی پگھل نہیں سکتے۔

البتہ جن لوگوں کے دل پتھر نہیں ہیں، جو مشترکہ کوششوں پر یقین رکھتے ہیں ان سے یہ درخواست کی جا سکتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور ان لوگوں کو جو کرپٹ ہیں، معاشرے کی بربادی کا سبب ہیں، انسانیت کے مجرم ہیں؟ انہیں روکیں، ٹوکیں اور خط لکھیں۔ اس لئے کہ یہ جمہوری ملک ہے۔

اگر آپ ارباب حل و عقد کو، مختلف اداروں کے سربراہوں کو، ذمہ داروں کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیں گے تو یہ پھر جی بھر کے من مانی کریں گے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان پر نظریں رکھی جائیں، انہیں ایکسپوز کیا جائے، ان کی پول کھولی جائے اور یہ کچھ مشکل بھی نہیں، ۱۵ پیسے کا ایک خط کافی ہے۔ ظاہر ہے خط توپ نہیں ہے کہ وہ اڑا دے گا مگر یقین رکھیے کہ ۱۵ پیسے کا ایک خط بھی کرپٹ لوگوں کے ہوش گم کردیتا ہے، ایوان اقتدار میں زلزلے آجاتے ہیں اور اگر ۱۵ پیسے والے خط زیادہ تعداد میں آجائیں تو پھر ان کے خواب اڑ جاتے ہیں، آپ کا کچھ جاتا نہیں تھوڑا سا وقت لگتا ہے، پندرہ پیسے لگتے ہیں مگر اس طرح آپ اپنا فرض پورا کرتے ہیں۔ اور پھر ان ارباب حل و عقد کو توصلہ نہیں ہوتا کہ آپ کے ساتھ فریب کریں، آپ کو ٹھگیں۔ یہ سوچا کہ میرے لکھنے سے کیا ہوگا؟ آپ کے لئے آپ کے معاشرے کے لئے نقصان دہ ہے۔

اُردو دوستوں سے ہم خاص طور پر اپیل کریں گے کہ وہ حکومت کو خط لکھیں، اُردو ترقی بورڈ، انجمن ترقی اردو، ایس بی ٹی — این سی ای آر ٹی، پبلی کیشن ڈویژن، ریڈیو کے مختلف شعبوں، ٹیلی ویژن، مختلف تعلیمی اور تنظیمی اداروں، عدالتوں، وزیراعظم، مختلف وزرا، صدر جمہوریہ، غرض سبھی کو آپ خط لکھیں، آپ جن مسائل سے، مشکلات سے دوچار ہیں ان سے انہیں مطلع کریں، بے دلی چھوڑ دیں، ہمت کریں۔ ان خطوں کی ایک کاپی اگر آپ ہمیں بھیج سکیں تو عنایت ہوگی۔

ان خطوط میں اپنا پورا نام اور پتہ ضرور لکھیں، اپنے خطوط کے جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ تر ان خطوط کا جواب نہیں ملتا مگر آپ یقین رکھئے کہ ان کا اثر ہوتا ہے۔ آپ کس مشکل سے دوچار ہیں، آپ کو کس نے پریشان کر رکھا ہے، آپ کا کام رکا ہوا ہے۔ آپ اس کے بارے میں لکھتے رہیئے۔ ایک پندرہ پیسے کا خط، آپ کا ہر خط اثر رکھتا ہے۔

آیئے، اقدامات کریں، اُردو کے مذکورہ اداروں سے اور ان سے پوچھیں کہ آپ اردو کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ اگر یہ جواب نہ دیں تو پھر ان سے اوپر والوں سے پوچھیں۔ ممبران پارلیمنٹ کو خط لکھیں، ارباب اقتدار کو خط لکھیں — اور اس طرح اردو تحریک کو آگے بڑھائیں۔

اگر اب بھی ہم چوکنے اور چوکس نہیں ہوئے۔ نا اہلوں کی باز پرس نہ کی اور با صلاحیت لوگوں کو داد نہ دی تو پھر "ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"۔

- کالم نگار نمبر شائع ہو چکا ہے۔ عالمی ادب میں یہ نمبر منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ قیمت سو روپے ہے مگر خریداروں کو ۳۰ فی صد کمیشن دیا جائے گا۔
- پنجاب نمبر دسمبر میں شائع ہونا تھا مگر اس قدر مواد اکٹھا ہو گیا کہ اسے سمیٹ کر جلد شائع کرنا مشکل ہو گیا۔ یہ خصوصی نمبر پنجابی کی ادیب امرتا پریتم ترتیب دے رہی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی پنجابی اور اردو کے کئی ممتاز ادیب اس سلسلے میں تعاون کر رہے ہیں۔ اب اس میں صفحات بھی زیادہ ہو جائیں گے اور قیمت بھی۔
- غزل نمبر کی کتابت جاری ہے۔ اگست تک مکمل ہونے کا امکان ہے ویسے اگر اچھے کاتب اور مل گئے تو اگست سے پہلے ہی ارسال کردیا جائے گا۔

چنگاری پندرہ روزہ پابندی سے ۴۴ صفحات آفسٹ کی طباعت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔
اسمیں بلند پایہ... قلم کاروں اور نئے پرانے ادیبوں کی تخلیقات شریک اشاعت ہوتی ہیں۔
علاوہ ازیں یہ تفریح کا سامان بھی فراہم کرتا ہے اور معلومات بھی اور قیمت بھی بہت کم ہے یعنی صرف دو روپئے۔
اس کے باوجود اگر آپ اسے نہیں خریدتے تو کیوں ——— یا نہیں پڑھتے تو کیوں ——— ؟
کیا اس لئے کہ آپ ادیب، دانشور اور مفکر ہیں یا اس لئے کہ آپ کی معاشی حالت ٹھیک نہیں ہے ——— مگر کیا آپ نے سوچا ہے کہ اگر آپ رسالہ نہیں خریدیں گے تو کون خریدے گا ؟ ——— کیا حکومت خریدے گی ——— یا ہندی انگریزی والے خریدیں گے ——— اور اگر آپ رسالہ نہیں پڑھیں گے تو کیا حکومت پڑھے گی یا ہندی والے؟
حکومت پر یا دوسروں پر الزام دینے سے پہلے اپنے گریبان میں بھی جھانکئے۔
زبانیں صرف حکومت کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہتیں ——— کسی بھی زبان کو اس کے پڑھنے والے اور بولنے والے زندہ رکھتے ہیں یا مار دیتے ہیں۔
کہتے ہیں اردو کروڑوں لوگوں کی مادری زبان ہے۔ لاکھوں لوگوں کی تہذیبی زبان ہے اگر یہ درست ہے تو پھر اردو رسالوں کی اشاعت ۵۰۰ سے ——— ۲ ہزار تک محدود کیوں ہے ؟
اردو میں ہر طرح کے رسالے مثلاً سائنس، کامرس، فلسفہ، کھیل، سیاسیات اور اس طرح کے موضوعات پر اس طرح کے رسالے کیوں نہیں نکلتے جیسے کہ ہندی میں نکلتے ہیں۔
اردو ہندوستانی ثقافتی ورثے کی توسیع اور تسلسل کی امین ہے اس میں کئی نسلوں اور تہذیبوں کا رنگ اور خوشبو شامل ہے۔
اردو میں ہر مذہب کا وافر سرمایہ شامل ہے۔ جینی مذہب ہو یا بدھسٹ، سناتن دھرم ہو یا آریہ سماج ان سب کا بہت بڑا ذخیرہ اردو میں ہے۔ سکھ ازم، عیسائیت اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں شیعہ، سنی وغیرہ ان سب کا مذہبی سرمایہ اردو میں بہت زیادہ ہے۔ جہاں تک علوم و فنون کا تعلق ہے اردو میں کسی کمی کا سوال ہی نہیں ہے۔ مگر یہ سب سرمایہ قدیم ہے آزادی کے بعد سے تو اس سرمایہ میں کوئی خاص اضافہ ہوا ہی نہیں نہ نگارشات نہ سائنسی علوم۔ البتہ اردو آبادی انگار اور ساکت ہونے سے کئی گنا زیادہ بڑھ چکی ہے۔
کہتے ہیں اردو ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اسمیں دنیا کے کونے کونے سے اخبارات و رسائل نکلتے ہیں مشاعرے ہوتے ہیں ——— مگر اس کے باوجود یہ زبان بہت تیزی سے زوال آمادہ ہے۔ اور ہندوستان جو اس کی ماں ہے۔ اس کا گہوارہ ہے۔ وہاں خاص طور پر یہ زبان ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اسمیں حکومت کا بھی ہاتھ ہے اور ان فرقہ پرست فسطائی قوتوں کا بھی جو مشترکہ تہذیب سے متنفر ہیں اور اس کی سب سے نمائندہ زبان اردو کو ختم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ مگر ان سب سے زیادہ قصور اردو والوں کا ہے ——— وہ تمام اردو والے جو یہ کہتے ہیں کہ اردو کے بغیر بھی وہ اپنا وجود، اپنا تشخص، اپنی انفرادیت، اپنا مذہب، اپنا طرز حیات برقرار رکھ سکتے ہیں۔ وہ کسی زبردست غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اردو کے بغیر ان کی نسل ادھوری ہوگی۔ بیٹے کو باپ کی شناخت نہیں ہوگی "ایک مجاہد اردو اور موجودہ ایم پی نے سمپورنانند سے کہا تھا آپ نے تو اردو چھین کر میری اولاد کو گونگا بنا دیا" اس لئے اردو کو زندہ رکھنا ضروری ہے اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ اردو کی کتابیں اور رسائل خریدئے آپ نے بہت وقت ضائع کیا زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ ہندی جو کبھی اردو سے بہت پیچھے تھی آج اس سے اتنی آگے نکل چکی ہے کہ اب اردو ہندی کے مقابلے کا تصور تک نہیں کر سکتی ——— ہاں بعض لوگوں کو خوش فہمی ہے کہ فلموں میں اردو چل رہی ہے۔ مگر جنہیں شعور ہے وہ دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح فلموں سے بھی اردو ختم ہوتی جا رہی ہے۔ فلموں کی زبان بدل رہی ہے پہلے فلموں سے اردو کے پوسٹر کم ہوئے پھر تقریباً ختم ہوتے جا رہے ہیں پھر اردو رسم الخط میں دئے جانے والے فلموں کے نام ختم ہونے لگے اور اب مکالمے بھی بدل رہے ہیں ——— کٹر ہندی والے ایک ایک لفظ چن چن کر ہوشیاری سے بٹھا رہے ہیں ——— مگر ہم ہیں کہ افیونیوں کی طرح خواب خرگوش میں مبتلا ہیں ——— ہم ہی سے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر اردو ختم ہو گئی تو ——— کوئی ہرج نہیں ہماری آئندہ نسل ہندی یا انگریزی میں کام چلا لے گی۔ مگر دوستوں آپ کے اس سرمایہ کا کیا ہوگا جو اردو میں ہے ——— ؟
آج بھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ عظیم تر اردو فنکاروں کے بچے تک اردو سے نابلد ہونے کی وجہ سے اپنے باپ دادا کی عظمت سے بے خبر ہیں ——— ماضی کے مصلح عناصر سے ناواقف ہیں۔ تو افسوس ہوتا ہے۔ مگر کچھ دنوں بعد کیا ہوگا ——— ؟ اردو صرف مسلمانوں کی ایک مذہبی زبان بن کر رہ جائے گی۔ جس طرح کہ عربی سمجھے بغیر ہندوستانی مسلمان قرآن شریف پڑھتے ہیں یا سناتن دھرمی سمجھے بغیر سنسکرت کے اشلوک پڑھتے ہیں

فکر تونسوی

تواریخ دہلی کا آخری باب

اور آخر آج سے ایک ہزار سال پہلے ۹۸۳ء میں دہلی کا شہر نیست و نابود ہو گیا۔ اگرچہ اس کے سنہ انتقال پر مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کئی مورخین کا خیال ہے کہ دہلی نے ۹۸۳ء میں رحلت فرمائی اور کچھ اس ارتحال کو ۹۸۵ء کا سانحہ بتلاتے ہیں۔ مورخین میں اگر اختلاف نہ ہو تو کوئی انہیں مورخ تسلیم نہیں کرتا۔

مگر دونوں کے پاس سنہ انتقال کی حقیقت کے تصدیقی ثبوت موجود ہیں جن کی بدولت یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کونسا ثبوت غلط ہے اور کونسا صحیح؟ اس لیے ہمیں یہ سوچ کر آگے بڑھنا چاہیئے کہ یا تو دونوں غلط ہیں یا دونوں صحیح ہیں۔

لیکن مورخین میں ایک امر پر اتفاق رائے موجود ہے کہ دہلی کا انتقال واقعی ہو چکا ہے۔ انتقال یقینی ہوا ہوگا۔ اس کی ایک معقول وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تاریخ دہلی کی بنیاد دہلی کے بار بار اُجڑنے اور پھر بار بار بسنے پر منحصر رہی ہے۔ لیکن ۹۸۳ یا ۹۸۵ء میں جب وہ آخری بار اُجڑی تو دوبارہ نہیں بس سکی۔ اگر دوبارہ بس جاتی تو اگرچہ یہ بات حیرت ناک نہ ہوتی۔ کیونکہ روایات کا تسلسل حیرت ناک نہیں ہوتا۔ لیکن مرحوم دہلی جب ۹۸۳ء میں اُجڑی تو دوبارہ کبھی نہیں بسی۔ اور یوں اس نے نہ صرف اپنی روایت توڑ دی بلکہ اپنے آپ کو بھی توڑ دیا۔

روایت کا یہ صحت مند سلسلہ کیوں ٹوٹا؟ اس کے متعلق ہمیں کوئی واضح روشنی نہیں ملتی۔ ٹوٹنے کی تاریخ پر تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں ورنہ عام طور پر تاریخ ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ دہلی کی یہ انفرادی خصوصیت تھی کہ جب اس کی تہذیب اپنے عروج پر پہنچ جاتی تو دہلی کے باشندے اپنی تہذیب کو خود ڈائن بن کر کھا جاتے۔ مقصد شاید یہ ہوتا تھا کہ پرانی تہذیب کو ملیا میٹ کر دیا جائے۔ اور پھر اسی مٹی سے ایک نئی تہذیب کو اُگایا جائے ـــــ شاید اپنی مٹی کے متعلق دہلی کو یقین تھا کہ یہ بہت زرخیز واقع ہوئی ہے۔

سوال اُٹھتا ہے کہ اگر زمین زرخیز تھی تو پھر ۹۸۳ء میں اُجڑنے کے بعد دہلی دوبارہ کیوں نہیں پیدا ہوئی۔ ایک ہزار سال تک پیدا نہ ہو سکی۔ ایک ہزار سال کی مدت کوئی معمولی نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر دہلی شہر اپنی نئی تہذیب کے ساتھ دوبارہ نمودار نہیں ہوا تو یہ شبہ کرنا بھی حق بجانب ہو سکتا ہے کہ دہلی شہر کی زمین زرخیز نہیں تھی بلکہ سرے سے زرخیز تھی ہی نہیں۔ اور دہلی کی تاریخ کو شہر کی زرخیزی کے متعلق خواہ مخواہ کا ایک الیوژن تھا۔ الیوژن وہ نامراد شے ہے جس نے کئی تہذیبوں کو قعر دریا میں ڈبو دیا۔ یہ ایک الگ اُلجھاوا ہے کہ اس کے باوجود تاریخ میں اُسے عظیم تہذیب کا نام دیا جاتا ہے جیسے رومی تہذیب، یونانی تہذیب، دراوڑین تہذیب، چنگیزی تہذیب وغیرہ!

بہرکیف دہلی کا انتقال ایک حادثہ جانکاہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حادثہ کوئی بھی ہو، فرد کا حادثہ ہو یا قوم کا، وہ جانکاہ ہی ہوتا ہے۔ موت اٹل ہے، جانکاہی صرف چند لمحوں کی اشک شوئی ہے۔

۳۰ جنوری ۱۹۸۴ء

چنگاری ۷

ماضی کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی، جمنا نام کے ایک دریا کے کنارے بستی تھی۔ اس دریا کے کردار میں کوئی عظیم خاصیت نہیں تھی۔ یہ جب بہتا تھا تو یوں لگتا تھا، جیسے کوئی نحیف و نزار سانپ، بغیر کنڈلی اور زہر کے رینگتا جا رہا ہے۔ اس کے پانی میں نہ رس تھا نہ شیرینی نہ حرارت نہ حیات۔ کچھ دانش وروں کا تو یہ خیال تھا کہ جمنا کا پانی پینے کے بعد جو آدمی بے ایمان نہیں ہو جاتا، وہ دہلی کا باشندہ کہلا ہی نہیں سکتا۔

مگر دریائے جمنا کے پانی کے متعلق ہمیں یہ زاویۂ نظر کچھ انتہا پسندی اور مبالغہ آرائی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تواریخی شواہد کا بیان ہے کہ دریائے جمنا کو ایک تیرتھ ندی کے طور پر مانا جاتا تھا۔ روزانہ علی الصبح ہزاروں مرد و زن، قریب قریب پا پیادہ، جمنا ندی کی طرف اشنان کے لیے کوچ کرتے دکھائی دیا کرتے تھے۔ اشنان کرنے کے بعد ہی وہ اپنے روزانہ مشاغل کا آغاز کرتے تھے۔ مثلاً کم ناپنا، کم تولنا، جیب کتری، رہزنی، جھوٹی گواہیاں، اشیائے خوردنی میں ملاوٹ اور ایسے ہی سینکڑوں کارہائے نمایاں!
اور کہتے ہیں کہ جمنا ندی اتنی وسیع القلب تھی کہ اہلِ دہلی کے یہ سبھی بظاہر و باطن گناہوں کو فطرتِ انسانی کا تقاضا سمجھتی تھی اور صبح کے تیرتھ اشنان میں ان سب گناہوں کو صاف شفاف کر دیتی تھی۔

ایک ہزار برس پہلے جب دہلی اپنے آخری سانس لے رہی تھی تو اس وقت دہلی شہر میں ساٹھ لاکھ انسان بستے تھے۔ اس لیے ہمیں یہ تھیوری بڑی مشکوک لگتی ہے کہ ساٹھ کے ساٹھ لاکھ انسان بے ایمان ہو گئے ہوں گے۔ یہ صحیح ہے کہ ساٹھ کے ساٹھ لاکھ انسان لقمۂ اجل ہوئے۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ جمنا کی خودی اور انا نے (جس کا تاریخ میں کہیں حوالہ نہیں ملتا) اچانک علم بغاوت بلند کر دیا ہو۔ اور اپنے ہی عقیدت مندوں کو اپنے ہی طوفانی سیلابِ غضب میں ایک ساتھ غرق کر دیا ہو۔ فقط اتنی شہادت ضرور ملتی ہے کہ ساٹھ لاکھ انسانوں کے گھروں کا سارا تعفن اور کوڑا کرکٹ، مختلف میونسپل نالیوں کے ذریعے جمنا ندی کو (ہدیۂ عقیدت کے طور پر ہی سہی) بھینٹ کر دیا جاتا تھا۔ جس سے پوری جمنا ندی میں تعفن کے بھبوکے اٹھا کرتے تھے۔ اور اس کا پانی شرفا کے پینے کے لائق نہیں رہتا تھا، لیکن کہتے ہیں اس زمانے میں سائنسی ماہرین کی ایک جماعت بھی جنم لے چکی تھی جو جمنا کے بدبو دار پانی میں کچھ کیمیکلز ملا کر ہر گھر میں سپلائی کرتی تھی تاکہ ہر باشندے کو یہ احساس دلایا جائے کہ یہ واقعی پانی ہے اس کا رنگ سفید ہے، صاف ستھرا ہے، جمنا کی طرف بہتی ہوئی بھاری غلاظت، ممکن ہے، اس کی تہوں میں موجود ہو مگر سطح پر یہ صاف شفاف پانی ہی نظر آتا ہے جسے پیا جا سکتا ہے، کپڑے دھوئے جا سکتے ہیں، اشنان کیا جا سکتا ہے، آٹا گوندھا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ کئی گوالے اپنی بھینس گائے کے دودھ میں بھی اسی پانی کو ملا دیتے تھے۔ اور اگرچہ دہلی کے باشندوں کو اس دودھ میں پانی کی ملاوٹ کا شبہ ضرور ہوتا تھا لیکن وہ اسے خاموشی اور متانت سے قبول کر لیتے تھے، یہ سمجھ کر کہ بہرکیف یہ تیرتھ جمنا ندی کا پانی ہی تو ہے۔

اس اعتبار سے اہلِ دہلی بے حد متین اور امن پسند لوگ تھے۔ لیکن —— ایسے متین اور امن پسند لوگ پھر یوں کیوں اجاڑے گئے کہ پھر کبھی انہیں سانس لینا ہی نصیب نہیں ہوا۔ آخر کیوں!
یہ ایک اہم اور بنیادی مگر ادق سوال ہے اس لیے دہلی کی رحلتِ بے جا کے متعلق ہمیں کچھ اور اسباب و علل کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ اگرچہ آج دہلی غارت ہو چکی ہے۔ دریائے جمنا کا وجود تک غائب ہے۔ لیکن ہمیں کچھ عمیق گہرائیوں میں جانا ہوگا تاکہ ہم اس غارت گری اور غائبی کی حقیقی تہیں دریافت کر سکیں۔

جس زمانے میں دہلی کا دیہانت ہوا وہ اس عظیم ملک ہندوستان کی راجدھانی تھی۔ بلکہ تاریخ تو ہمیں یہاں تک بتاتی ہے کہ دہلی، ازل

سے ہی راجدھانی رہی ہے ۔ چاہے کوئی حاکم ہندوستان کے ایک تہائی حصّے پر اقتدار رکھتا ہو یا ایک چوتھائی حصّے پر ۔ لیکن وہ نہ صرف اپنے آپ کو پورے ہندوستان کا بادشاہ سمجھتا تھا ۔ (بادشاہوں کی جغرافیائی معلومات ہمیشہ مشکوک رہی ہیں) بلکہ وہ دہلی کو اپنی راجدھانی بنا کر رہتا تھا حتیٰ کہ ایک مرتبہ تو ایک بادشاہ کی پوری مملکت صرف لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی لیکن وہ اپنے آپ کو شہنشاہِ ہندوستان کا لقب عطا کیے ہوئے تھا ۔ درباری شعراء جب اُس کے قصیدے لکھتے تھے تو لال قلعے کو ہی ہفت اقلیم گردانتے تھے ۔ شہنشاہ جغرافیے میں لائق نہیں تھا تو قصیدہ گو شعراء بھی لال قلعے اور ہفت اقلیم کے فرق سے ناآشنا ہی تھے ۔

محکمہ آثارِ قدیمہ نے اُجڑی ہوئی دہلی کے بعض مقامات پر کھدائی کی ہے تو وہاں سے بعض عجیب و غریب انکشافات ہوئے ہیں ۔ مثلاً ایک عمارت کے کچھ کھنڈرات برآمد ہوئے ہیں ۔ کھنڈروں کے ایک گوشے میں ایک سائن بورڈ مُڑی تُڑی حالت میں ملا ہے جس سے لگتا ہے کہ عمارت اور سائن بورڈ کا آپس میں کوئی تعلق تھا ۔ کیونکہ سائن بورڈ سے لگتا ہے کہ یہ عمارت کوئی قدیم و جدید طرز کا کوئی ریستوران تھا ۔ قدیم اس لیے کہ سائن بورڈ کے ایک کونے پر " خُدا " کا لفظ تحریر تھا جو سائنسی اعتبار سے صدیوں پہلے کا ایک قدیم ترین لفظ ہے ۔ اور اس لفظ کو ایک قدیم طاقت کے سمبل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا ۔ یوں لگتا ہے کہ ریستوران کا مالک خُدا سے ڈرتا تھا ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس زمانے میں ریستورانوں کے کروڑپتی مالک خدا سے کیوں ڈرتے تھے ۔ ڈر چاہے کسی بھی چیز کا ہو ، اپنے ہی کسی نہ کسی گناہ سے پیدا ہوتا ہے ۔ ریستوران کا مالک کس طرح کے گناہ کرتا تھا ! اس کے کوئی واضح ثبوت نہیں مل سکے ۔ ممکن ہے وہ اپنے ریستوران میں مجبور اور بے بس حسین کنواریوں کی پاکیزہ چھپکلی نتھیں ، ہوس پرست امیروں سے اُتروا تا ہو ۔ اور اپنا بینک بیلنس بڑھاتا ہو ۔ کیونکہ ایک کھنڈر میں دو تین نیم عُریاں دوشیزاؤں کے کچھ آثار ملے ہیں ۔ اور اُن کی عصمت کی نتھیں ٹوٹی ہوئی ملی ہیں ۔

ممکن ہے ، جب اُجاڑ اور اُکھاڑ کے لیے کوئی زبردست طوفانی جھکڑ آیا ہو تو یہ سبھی دھندے باز ، دوشیزائیں ، ہوس پرست اور اللہ کا پرستار مالک ریستوران ، بیک وقت لقمۂ اجل ہو گئے ہوں ۔ اور اُنہیں یہ معلوم ہی نہ ہو سکا ہو کہ خُدا کی دو رضائیں ہوتی ہیں ۔ ایک رضا خوش پوشی سے بستے رہنے کے لیے اور دوسری رضا اچانک اُجاڑ دینے کے لیے ۔ کہنا پڑے گا کہ خُدا اپنی رضا کا علم کسی کو نہیں بتاتا اور یہ اللہ ہی جانے کہ کیوں نہیں بتلاتا ۔

اُسی تباہ شُدہ ریستوران کے سامنے کھدائی کرتے ہوئے کچھ تیس پینتیس انسانی لاشوں کے ڈھانچے بھی ملے ہیں ۔ کچھ مورخوں کا بیان ہے کہ بیسویں صدی کے کچھ ریستورانوں میں یہ عام رواج پایا جاتا تھا کہ ان کے سامنے لنچ اور ڈنر سے دو دو گھنٹے پیشتر سینکڑوں خستہ حال ، مفلس اَدھ ننگے اور بے روزگار مرد اور عورتیں ، اللہ کے نام پر اپنا بھوکا شکم پُر کرنے کے لیے اکٹھے ہو جاتے تھے ۔ ہر نتھ شکن رئیس اپنے گناہ کے خوف پر رومالی روٹیوں کی جھالر اوڑھ لیتا تھا ۔ اور پھر وہ رومالی روٹیاں ان بھوکے ننگوں کی طرف پھینک دیتا تھا ۔ اُس کے بعد ہی نڈر ہو کر نتھ کا رُخ کرتا تھا ۔ یہ رومالی روٹیاں انسان اور کتے بیک وقت ایک دوسرے سے چھین جھپٹ کر اپنے اپنے معدوں تک پہنچا دیتے تھے ـــــــ چنانچہ اُس کھنڈر میں لاشوں کے پاس ایک مُردہ کتے کا ڈھانچہ بھی ملا ہے جس کی زبان سے روٹی کا ایک ٹکڑا لہرا رہا تھا ۔ اور ایک بھک منگے انسان کا ہاتھ بھی اُس رومالی روٹی کو کھینچ رہا تھا ۔

بہر کیف جس تہذیب میں انسان اور کتے میں ایک ایک روٹی کا تنازعہ چل رہا ہو ، اُس تہذیب کو فنا ہونے میں اتنی ہی دیر لگتی ہے جتنی نتھ کی عصمت توڑنے میں ۔ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ نتھ توڑنے میں ، اور دوسرا منٹ تہذیب توڑنے میں ۔

ایک دوسرے مقام پر کھدائی کرتے ہوئے ایک پھولے ہوئے پیٹ والے شخص کی اوندھے منہ لاش بھی ملی ہے ۔ ماہرین نے اندازہ

لگایا کہ ممکن ہے اس کی موت بدہضمی کے سبب ہوئی ہو۔ لیکن جب اس کا پیٹ چیر کر دیکھا گیا تو اندر سے تین درجن سنہری اینٹیں، ڈیڑھ سو بیش قیمت گھڑیاں، بینک لاکر کی چابیوں کا ایک گچھا اور کچھ گتھے کرنسی نوٹوں کے جو چمڑے کو سی کر اندر باندھ کر رکھے ہوئے تھے، مل گئے اور بدہضمی کا اصل سبب معلوم ہوگیا۔

اُس پیٹو لاش سے دو گز کے فاصلے پر لکشمی نامی دیوی کی ایک فریم شدہ سہ رنگی تصویر بھی ملی۔ اس پُر اسرار کیفیت سے پردہ نہیں اٹھ سکا کہ جو چیزیں اس پیٹو کے پیٹ سے برآمد ہوئیں وہ لکشمی دیوی کی تصویر سے اس کے پیٹ تک کیسے پہنچ گئیں۔ کیونکہ اُس دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی اشیاء اس زمانے میں سمگل شدہ اشیاء شمار کی جاتی تھیں۔ اور اُن کی محفوظ ترین پناہ گاہ دیوی دیوتاؤں کی تصویر کی پُشت ہوا کرتی تھی۔

ممکن ہے، حکومتِ وقت کی خفیہ پولیس کا چھاپہ پڑنے کی خبر اُس پیٹو سمگلر تک چند منٹ پہلے پہنچ چکی ہو اور اس نے دُور اندیشی سے وہ اشیاء اپنے پیٹ میں سمولی ہوں۔ مگر چھاپہ پڑنے سے ایک منٹ پہلے پورے دہلی کی موت کا تیز رفتار وارنٹ آ پہنچا ہو۔ اور پیٹو اور لکشمی دونوں ان اشیاء کو بچانے کی اہلیت سے محروم ہو گئے ہوں۔ مگر مختلف دوسرے مقامات کی کھدائی سے ایسے آثار زیادہ تعداد میں مل جانے سے یہ تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ اُجڑنے سے پہلے دہلی میں غریب بھی رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ امیر بھی اس لیے رہتے تھے کیونکہ امیر لوگ غریبوں کی موجودگی کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔ امیر اس وقت تک امیر نہیں کہلا سکتے جب تک ان سے بیس گنا غریب شہر میں موجود نہ ہوں ــــــ دہلی کی آبادی اگر اس تباہی کے وقت ساٹھ لاکھ افراد تھی تو لازماً اس میں دو یا تین لاکھ امیر موجود رہوں گے۔ ان دو تین لاکھ میں سے کتنے تجوریاں توڑنے کے مشاغل میں مبتلا تھے، اس سلسلے میں اعداد و شمار مہیا کرنا مشکل ہے۔ صرف سطحی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن دنوں سوشلزم اور ڈیموکریسی کے دلفریب نام پر جو الیکشن لڑے جاتے تھے تو تاریخ مظہر ہے کہ صرف غریب اور بے روزگار انسان ہی ووٹ دینے کے لیے جایا کرتے تھے۔ کیونکہ صرف اُنہیں ہی سوشلزم اور ڈیموکریسی کی حسین تمنا دیوانہ کیے رکھتی تھی۔ اور پولنگ بوتھ پر صرف ساٹھ فی صد لوگ ہی ووٹ ڈالنے جایا کرتے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ ووٹ دینے کے لیے نہیں جاتے تھے وہ امیر طبقہ سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ پولنگ کے دن وہ گھر میں بیٹھے تاش اور جُوا کھیلتے رہتے تھے یا نشیلے مشروبوں سے چُور چُور ہو کر موسیقی اور رقص سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

اور الیکشن کے جو نتیجے نکلتے حیرت ہوتی ہے کہ نتیجے میں صاحبِ اقتدار وہی حضرات بن جاتے تھے جو ووٹ دینے کو تضیع اوقات سمجھتے تھے۔ شاید اُنہیں یقین ہوتا تھا کہ انہیں اقتدار کی گدی پر متمکن کرنے کے لیے صرف وہی غریب اور غم زدہ لوگ ہی ووٹ دے دیں گے جنہیں ہم دلیہ کی طرح کھا جاتے ہیں۔ صرف کھانے کی تکنیک میں دانش مندی دکھائی جاتی تھی کہ وہ پورے کے پورے غریب کو چٹ نہیں کرتے تھے بلکہ کسی کی آدھ ٹانگ کھا لیتے ڈیڑھ ٹانگ چھوڑ دیتے، ایک آنکھ چیر ڈالتے، دوسری آنکھ کو دیکھنے کے لیے زندہ رہنے دیتے، کسی کا پھیپھڑا کھایا، جگر چھوڑ دیا۔ آدھا جگر چھوڑ دیا تو اس کے ساتھ آدھی ناک کاٹ کر ہڑپ کر لی ــــــ تاکہ غریب چوتھائی، پونی، آدھی، غرض ہر حالت میں کسی نہ کسی طرح زندہ رہتے رہیں اور ووٹ دیتے رہیں۔

بالکل ایسی ہی فلاسفی پر آثارِ قدیمہ کی کھدائی پر ایک کتاب ملی جو نوشتۂ تقدیر کے اِردگرد گھومتی ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ اُس زمانے میں دہلی کے باشندے اپنے سے بھی زیادہ تقدیر پر بھروسہ رکھتے تھے۔

دہلی کے دیگر مقامات کی کھدائی سے کچھ اور معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ یہ شہر چالیس میل کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اور مزید چالیس میل کے رقبے میں پھیلنے کا مجاہدانہ پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ اس کی اچانک تباہی نے اس کے سارے پروگرام کو نہس نہس کر دیا ورنہ اسے وسعت کا اتنا جنون تھا

کہ پورا ملک ہندوستان اس شہر میں سما جائے۔ کچھ یوں کہ ہندوستان کا خاتمہ بالخیر ہو جائے۔ اور دہلی ہی اس ملک کا نام ہو جائے۔ راجدھانی بھی دہلی اور ملک بھی دہلی۔

ممکن ہے اس کی غارت گری کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ وہ اپنے آپ کو پورا ہندوستان سمجھنے پر تُل گئی تھی۔ جیسے کوئی چھوٹا سا ڈکٹیٹر اپنے اثا ثات دیکھنے لگے تو کائنات ہی اُسے ملیا میٹ کرکے رکھ دیتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دہلی کے ساٹھ لاکھ باشندوں نے ہی اپنے آپ کو ملیا میٹ کر دیا ہو۔ کئی ثبوت ایسے ملتے ہیں کہ یہ ساٹھ لاکھ باشندے دہلی میں رہنے کے باوجود دہلی کے اصلی باشندے نہیں تھے۔ سبھی اجنبی تھے۔ سبھی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے یہاں آن بسے تھے۔ کیوں آن بسے تھے؟ ایک تھیوری یہ ہے کہ وہ صرف دہلی کو ہی اپنی شکم پروری کا مرکزِ اعلیٰ سمجھتے تھے روٹی روزی کی تلاش میں یہاں آتے۔ اور پھر واپس جانے کا نام ہی نہیں لیا۔ نہ صرف وہ خود یہاں آجاتے بلکہ کچھ مہینوں بعد اپنے رشتہ داروں، بھا بہن، بھتیجے، خالہ، سسر، غرض سب کو یہاں بُلا لیتے کیونکہ پیٹ بھرنے کے لیے اُنہیں یہاں ہر طرح کے کام مل جاتے۔ ایک مؤرخ کا بیان کہ آپ دہلی کے پوش علاقے کے فٹ پاتھ پر اگر اُپلے اور لکڑی کی راکھ بیچنے لگیں تو خریداروں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا۔

دہلی روزی روٹی کا مرکزِ اعلیٰ بن گئی تو آبادی چار لاکھ سے بڑھتے بڑھتے ساٹھ لاکھ تک جا پہنچی۔ کھدائی سے معلوم ہوا کہ یہاں تین قسم کے مکانات پائے گئے۔ ایک تو قصر نما کوٹھیاں، جن میں مالک کے کُتّے اور بلی تک کے لیے الگ الگ کمرے تھے۔ دوسری وضع کے مکانات جن کی شہر میں بہتات تھی وہ بیس پچیس گز کے کوارٹروں اور جھونپڑیوں پر مشتمل تھے اُن کے ایک ہی کمرے میں ڈرائینگ روم، بیڈ روم، سٹور خانہ، کچن، باتھ روم، بچوں کا پلے گراؤنڈ، غرض ماڈرن ضرورت کی ہر شے پائی جاتی تھی۔ اگر اس کمرے میں کسی کی شادی رچائی جاتی تو دولہا دُلہن اپنا ہنی مون بھی چھت پر وہیں مناتے تھے ——— غرض اُن مکانات کے باسی بڑے وسیع القلب واقع ہوئے تھے۔ شاید غریبی ہی ایسی چیز تھی جو وسیع القلبی پیدا کرتی تھی

اور تیسرے درمیانہ قسم کے مکانات تھے۔ جہاں کے باسی بیک وقت اپنے آپ کو امیر اور غریب شمار کرتے تھے۔ اور امیری اور غریبی دونوں کے تعاون سے اُن میں بہو کو مٹی کے تیل سے جلانے کا عام رواج تھا۔ زیادہ تر اُنہیں سرکاری بابو کہا جاتا تھا۔ بہو کو جلانا بدعت سمجھتے تھے مگر جلا بھی دیتے تھے۔ کیونکہ اُن کے ہاں رہائشی جگہ کی قدرے قلت ہوتی تھی۔ بہو کو جلانے سے جہاں جگہ کھل جاتی تھی وہاں بہو کا جہیز اُن کے قبضے میں آجاتا تھا۔ اسی جہیز کی بدولت ہی وہ امیر کہلاتے تھے۔ ورنہ نسبی طور پر تو وہ غریب تھے۔

غریبی جہیز سے کچھ زیادہ دُور نہ ہو پاتی تو پھر اُسے رشوت لے کر دُور کرنے میں مگن رہتے تھے۔ رشوت کی قانونی سزا اس لیے نہیں دی جاتی تھی کہ سوشلزم لانے کا اس سے بہتر شارٹ کٹ کوئی اور تھا بھی نہیں۔

تاریخ کے کچھ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دہلی آخری بار کیوں اُجڑی؟ اس کا بنیادی سبب یہی نت نئی بڑھتی ہوئی رشوت اور کرپشن تھی۔ ہم اس اندازے کو سو فی صد صحیح نہ مانتے اگر دہلی کے سو فی صد مکانات کے باشندوں میں کرپشن کی یہ علامتیں نہ پائی جاتیں۔ لگتا ہے کہ ایک منزل ایسی آگئی تھی کہ دہلی کا جو باشندہ کرپشن نہ کرتا اسے احمق کہا جاتا تھا کیونکہ رشوت کو عیب نہیں سمجھا جاتا تھا، ثواب مانا جاتا تھا۔ ایک راشٹر کی کتاب میں یہ فقرہ پہلے صفحہ پر درج دکھائی دیا کہ جو بیٹا باپ کی جیب سے روپے چُراتا ہے وہ اس کہاوت کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ خیرات گھر سے ہی شروع کرنی چاہیئے۔

اور اس خیراتی کرپشن میں فقیر، غریب، رکشا والے، پُجاری، بابو، افسر، سیٹھ اور لیڈر سبھی شامل تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک لیڈر جو ہر گنگا کی پُشت پناہ تھا۔ اور کروڑوں روپے کا اقتدار رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ عوام کے جلسے میں کرپشن کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا

"بھائیو! کرپشن ہمیں دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے لیکن میں کرپشن کو خود ہی چاٹ کھاؤں گا۔ اگر نہ چاٹا، تو خدا کی قسم! آپ مجھے پھانسی پر لٹکا دیجئے۔"

اور عوام جب اس پر داد کی تالیاں بجانے ہی والے تھے کہ ایک قیامت خیز جھکڑ، ہزاروں میل فی منٹ کی رفتار سے چلنے لگا جو جلسہ گاہ کو اجاڑتا ہوا پورے دہلی شہر میں پھیلتا چلا گیا۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ساٹھ لاکھ انسانوں کا یہ عظیم شہر ساٹھ منٹ میں ہی جھونپڑیوں کے ہنگاموں اور کوٹھیوں کے نیم عریاں ڈانسوں اور عبادت گاہوں کی گھنٹی زدہ پہار تھنوں کے ساتھ راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

دہلی کی تہذیب (جو نجانے تھی بھی یا نہیں) ایک ہی جھکڑ میں زیر زمین چلی گئی۔ اور اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑ گئی سوائے ایک پرانے شعر کے کہ

دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یاد رکھئے بہت سے ادارے مثلاً ترقی اردو بورڈ انفرادی خریداروں کو کوئی کمیشن نہیں دیتے بلکہ ڈاک خرچ بھی خریداروں سے لیتے ہیں۔ ایسے اداروں کی کتابیں اگر آپ ہم سے خریدتے ہیں تو ان پر بھی ہم آپ کو کمیشن دیں گے۔ چنگاری رام نگر دہلی ۳۲

اصغر علی انجینیر کی ایک اور اہم کتاب

عالم اسلام

شائع ہو چکی ہے

- اس میں اسلامی ممالک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں اور تبدیلیات کا تفصیل اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔
- مضامین کی کتابت سے طباعت کے مرحلے تک پہنچنے کے دوران ہی کئی ایسی تبدیلیاں اور حقائق سامنے آگئے ہیں جن کی مصنف نے پیش گوئی کی تھی۔
- یہ کتاب جام جہاں نما ہے جس میں آج کے مسلم ممالک کے خط و خال واضح نظر آتے ہیں۔

آفسٹ کی طباعت۔
قیمت ۳۰ روپے۔
چنگاری کے خریداروں کو خصوصی رعایت دی جائے گی۔

پتہ: دارالاشاعت ترقی ۳ -۱۳۴۱ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲



زندگی کی بے شمار ذمہ داریوں کا بوجھ کل اس بچے کے سر پر ہوگا

بہار نو ٹانک

حکایاتِ ایسپ

محمد خالد اختر

بہروپیا کوا

ایک کوا چونے کی ایک ڈھیری میں جا اترا جس سے اس کے پر و بال اور چونچ سفید ہو گئے۔ اس سے اسے بڑی خوشی ہوئی پھر پاس ہی اسے ہنس کے کچھ پر پڑے ہوئے نظر آئے۔ وہ بھی اس نے اپنے جسم پر لگا لئے اور یوں سج سجا کر اور اترا کر چلتا ہوا ہنسوں کی ایک ٹولی میں جا پہنچا۔ ہنسوں نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا مگر اس نے انہیں بتایا کہ وہ ایک غیر ملکی ہنس ہے اور سات سمندر پار کر کے آیا ہے اسی وجہ سے اس کی وضع قطع اور بولی قدرے مختلف ہے۔ ہنسوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ ایسے جہاں نورد ہنس کو اپنے درمیان پا کر وہ نہایت خوش ہوئے۔ کوا بڑا چکی باز اور باتونی تھا۔ وہ سادہ ہنسوں میں محفل جما کر خوب بڑیں ہانکتا اور اپنی سیاحتوں کے من گھڑت قصے سناتا۔ ہنس اس سے بڑے مرعوب ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ وہ بڑھیا نسل کا اور ان سے زیادہ تہذیب یافتہ ہے، ہر بات میں اس کی نقل کرنے لگے۔ کوشش کرنے سے کیا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ چند ہی مہینوں میں اس نووارد کا رنگ ان پر چڑھ گیا اور وہ کوے کی چال چلنے لگے کچھ مدت کے بعد کوے کو اپنے گھر اور قرابت داروں کی یاد ستانے لگی۔ ایک صبح وہ ہنس کے پر جھاڑ جھوڑ کر اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ گیا اور ان کو بتایا کہ اس نے ہنسوں کو کیسے الو بنایا۔

ادھر ہنسوں نے اصلی چال بھلا دی تھی۔ وہ اب تک کوے کی چال چلتے ہیں۔ اپنے رسم و رواج اور طور طریقوں کو دوسروں کی پیروی میں ترک نہیں کرنا چاہیئے، خواہ وہ بے ہودہ اور تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہوں۔

شیر اور ہاتھی

جنگل کے بادشاہ شیر نے فرمان جاری کیا کہ ہاتھی ناپسندیدہ جانور ہے، وہ جنگل سے باہر چلا جائے۔ اعلان کے بعد لومڑی کے ہاتھ ہاتھی کو کہلا بھیجا کہ وہ جنگل چھوڑ دے، لیکن ہاتھی نہ گیا۔

ایک روز شیر لاؤ لشکر کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ ہاتھی سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ ظاہری علیک سلیک کے بعد شیر نے کہا "آپ ابھی تک یہاں ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں میں نے آپ کو ملک بدر کیا ہوا ہے؟"

"کس بنا پر؟ میرا قصور کیا ہے؟" ہاتھی نے پوچھا۔

"دیکھو بھائی میں جنگل کا بادشاہ ہوں۔ کسی کو شکار میں اپنا شریک بنانا مجھے گوارا نہیں۔" شیر نے وضاحت کی۔

"مگر مجھے شکار سے کیا تعلق۔ میں تو پھل پھول پر گزر اوقات کرتا ہوں۔"

شیر کو ہاتھی کی اس دلیل کا کوئی جواب بن نہ آیا تو کہنے لگا "دراصل تم ڈیل ڈول میں غیر ضروری حد تک بڑے ہو۔ اس جنگل میں کسی کو

اتنا بڑا ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔ دوسرے جانور اس بات کے شاکی ہیں۔"
"اُن کو میرے ڈیل ڈول پر کیا اعتراض ہے؟" ہاتھی نے پوچھا۔
"یہ تو میں نہیں جانتا۔" شیر نے کہا "لیکن جنگل میں ہر ایک کے لئے قانون کی پابندی لازمی ہے ـــــ آپ چلے جائیں تو بہتر ہوگا۔"
"قانون کس نے بنایا ہے؟"
"میں نے، میں بادشاہ ہوں۔"
"اچھا" ہاتھی نے کہا "میں سوچ کر بتاؤں گا۔ میں نے ابھی ہتھنی اور بچوں سے مشورہ کرنا ہے۔"
اپنے کچھار میں واپس آکر شیر نے اس مسئلے میں کچھ غور و خوض کیا۔ پھر ہاتھی کو راہ ہموار کرنے کی ایک ترکیب اسے سوجھ گئی۔ اس نے ہاتھی کو تحفہ ہیبت کا اعزاز مرحمت فرمایا اور اسے سراندیپ کے جنگل میں سفارت پر جانے کی پیشکش کی۔ ہاتھی نے اسے قبول کر لیا اور ہتھنی اور بچوں کو لے کر سراندیپ کا عازم ہوا۔
تحفہ اور سفارت ملنے سے بڑے بڑے سرکش رام ہو جاتے ہیں۔

حجام اور چیتا

ایک حجام ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں لوگوں کی حجامت کی خاطر جاتا تھا۔ راستے میں ایک جنگل میں سے گزرا تو دیکھا کہ ایک چیتا بڑی مضطرب حالت میں ایک بڑے سے لوہے کے پنجرے میں چہل قدمی کر رہا ہے اور پنجرے کے ایک کونے میں ایک بکری کا نصف حصہ پڑا ہے۔ (دراصل یہ پنجرہ سرکس والوں نے چیتے کے پکڑنے کے لئے وہاں رکھا تھا۔ اس میں ایک بکری باندھ دی تھی۔ اور کمانیوں والا خود بند ہو جانے والا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا کہ چیتا بکری کو کھانے کے لئے پنجرے کے اندر جست کرے تو پیچھے سے دروازہ بند ہو جائے۔)
حجام کو دیکھتے ہی چیتا لجاجت سے بولا "چچا میاں، مجھے اس قید سے رہائی دلا دو تو ساری عمر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں گا۔"
"لیکن تم پنجرے کے اندر قید کیونکر ہوئے؟" حجام نے پوچھا۔
"یہ میں باہر آنے پر بتاؤں گا۔" چیتے نے کہا۔
"لیکن میں تمہیں پنجرے سے باہر کیوں نکالوں، اگر تم مجھے کھا جاؤ گے؟"
"قسم لے لو۔" چیتے نے کہا "جو اس کا خیال بھی میرے دل میں آیا ہو۔ اتنا ناشکرا کون ہو سکتا ہے!"
حجام متامل تھا مگر چیتے نے اسے اس کی جوانی کا واسطہ دیا اور حجام جو پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا اس بات پر کھل اُٹھا اور چیتے سے واسطے میں مشفقانہ خیالات اپنے دل میں لایا۔ چیتے نے دیکھا کہ حجام نرم پڑ رہا ہے تو اپنی آہ و زاری کو زیادہ پُر رقت کیا۔
"دیکھو، چچا ابھی میری مسیں بھی نہیں بھیگیں۔ میرے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ ابا میاں تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ایک ماں ہے۔ وہ کھانا رکھے میری راہ دیکھتی ہوگی۔"
چیتے نے اس قسم کی دردناک باتیں کیں تو حجام کا دل بھر آیا۔ اس نے زور لگا کر پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ چیتا فوراً جست کر کے باہر نکل آیا۔
"میں تمہیں کھاؤں گا۔" چیتے نے غرا کر حجام سے کہا۔

"کیا تم کو اپنے قول کا مطلقاً پاس نہیں. تم نے وعدہ کیا تھا کہ باہر آنے پر تم مجھے نہیں کھاؤ گے۔"

"وہ وعدہ میں نے پنجرے کے اندر سے کیا تھا۔ اب میں پنجرے سے باہر ہوں۔"

"مجھ کو اپنی راہ جانے دو اور خواہ مخواہ نہ کھاؤ۔ میں نے آگے گاؤں میں پانچ حجامتیں کرنی ہیں۔"

"میں تمہیں کھاؤں گا ضرور" چیتا بولا۔

حجام جان گیا کہ اب چیتا اسے جیتا نہ چھوڑے گا۔ اس نے اوسان قائم رکھتے ہوئے جان بچانے کے لئے آخری حربہ کیا "چیتے جی مجھے شوق سے کھالو، مگر کھائے جانے سے پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم سا شاطر سیانا، چاق و چوبند حیوان اس پنجرے میں بند کیونکر ہو گیا۔ عملی طور پر کر کے دکھاؤ تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

چیتے نے کہا "تمہاری چالاکی میں خوب سمجھتا ہوں۔ میں دودھ پیتا بچہ نہیں۔ پنجرے کے اندر میں ہرگز دوبارہ نہیں جاؤں گا۔ تم پنجرے کے اندر داخل ہو جاؤ۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کیسے اندر بند ہوا۔

حجام نے چیتے کے تیور دیکھے تو پنجرے کے اندر جست کی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی کمانیوں والا دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔ اب حجام اندر تھا اور چیتا باہر۔

"اب باہر آ جاؤ" چیتے نے کہا۔

"میں باہر کیسے آؤں۔ تم دروازہ باہر سے کھولو۔"

چیتے نے بہتیرا زور مارا مگر دروازہ اس سے نہ کھلا۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ چیتے دروازے نہیں کھول سکتے اور حجام کو یہ بات معلوم تھی۔

"تم نے اندر جا کر مجھ سے دھوکا کیا ہے" چیتے نے شکایت کی۔

"مجھے باہر نکالو" حجام پکارا۔

چیتا کچھ دیر تو وہاں منڈلاتا رہا۔ پھر بددل سا ہو کر وہاں سے ٹل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سرکس والے اپنی بیل گاڑی لے کر وہاں آ پہنچے۔ وہ پنجرے میں چیتے کی بجائے ایک آدمی کو پا کر بڑے حیران ہوئے ـــــ ایک ایسے آدمی کو جس نے نصف بکری کچی چبا ڈالی تھی۔ کچھ سوچ کر انھوں نے حجام سمیت پنجرے کو بیل گاڑی میں رکھا اور شہر لے گئے۔

کسی پر احسان کرنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ وہ بدلے میں تم پر کیا احسان کرے گا۔

سونے کا انڈا دینے والی مرغی

ایک محکمہ پرست کے اہلکار کے پاس ایک مرغی تھی جو ہر صبح ایک سونے کا انڈا دیا کرتی تھی۔ بہت سے لوگوں کے پاس ایسی مرغیاں ہوتی ہیں۔

اس آدمی نے سوچا کہ اس مرغی کے پیٹ کے اندر خدا جانے کتنے ڈھیر سارے سونے کے انڈے ہوں گے۔ کیوں نہ اس کا پیٹ چاک کر کے ایک ہی دم سارے سونے کے انڈے حاصل کر لئے جائیں۔ چنانچہ اس نے مرغی کو پکڑ کر اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ اس کا پیٹ چیرا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بڑا پشیمان ہوا کہ زیادہ کے لالچ میں روز کے سونے کے انڈے سے بھی ہاتھ دھوئے۔ مرغی پر بھی بڑا غصہ آیا اور اسے بھون کر تکا کباب بنائے۔ کباب کھانے کے بعد وہ اپنے پڑوسی کے پاس گیا۔ پڑوسی افیون اور حشیش کا سوداگر تھا۔ پہلے شخص نے دوسرے شخص سے کہا کہ اگر اس کے پاس کوئی سونے کے انڈے دینے والی فالتو مرغی ہو تو اسے دے دے۔ دوسرے شخص کے پاس چھ ایسی مرغیاں

ہیں۔ اس نے ان میں سے ایک اسے دے دی۔ بچارے ہرن سے نے کا انڈا ملا تھا اور وہ بہت خوش و خرم ہو گیا۔
خلاصہ یہ کہ بیشتر لوگوں پر اللہ کا فضل ہوتا ہے اور ان کے پاس سونے کے انڈے دینے والی مرغیاں ہوتی ہیں۔ مگر وہ یہ بات کسی کو نہیں بتاتے۔

بھیڑیں اور بارہ سنگھے

بھیڑوں کا ایک ریوڑ ایک کسان کے کھیت میں رہتا تھا۔ اس کھیت کے گرد اونچی باڑ تھی۔ کھیت میں خوشبودار لمبی گھاس اور بوٹیوں کی بہتات تھی جسے کھا کر بھیڑیں خوب موٹی تازی اور بانکی سجیلی ہو گئی تھیں۔ ان کی پشم چکنی اور شاندار تھی۔ باڑ سے باہر جھاڑیوں سے پٹے جنگل تھے جن میں بارہ سنگھے رہتے تھے۔ بارہ سنگھوں نے دیکھا کہ انہیں ترکھانے کے لئے خشک جھاڑیوں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا اور بھیڑیں مزے اڑا رہی ہیں۔ سوچا کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہیئے کہ باڑ کے اندر کے کھیت میں چرنے اور منہ مارنے کا موقع ہاتھ آ جائے۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ ایک پیر سال بارہ سنگھے نے انہیں ایک ترکیب سجھائی جس سے وہ اپنے مقصد میں کامران ہو سکتے تھے ___ ایک بارہ سنگھا کھیت کی باڑ سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا اور بھیڑیئے کی آواز میں رونے لگا۔ ہوا ہو ہو ہوا۔ بھیڑوں نے جو بھیڑیئے کی آواز سنی تو سہم کر اکٹھی ہو گئیں اور تھر تھر کانپنے لگیں۔ اب بارہ سنگھوں کا مکھیا اپنے چند ساتھیوں کو لئے باڑ کے پچھواڑے دروازے پر بھیڑوں سے بات چیت کرنے کے لئے آیا۔ اس نے کہا۔

"بہنو بھائیو، بزرگو، تم یہ آواز جو سن رہے ہو، بھیڑیئے کی ہے۔ اور وہ تمہیں کھانا چاہتا ہے۔ ہم اس بھیڑیئے کو جانتے ہیں۔ نہایت بدطینت حیوان ہے لیکن اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہم تمہاری حفاظت کریں گے اور اس نابکار کو اپنے سینگوں سے مار کر بھگا دیں گے ___ آخر تم اور ہم میں کیا فرق ہے۔ ایک ہی ہماری برادری، ایک ہی تہذیب، ایک ہی مذہب۔ صرف ہمارے ڈکرار پھاڑنے والے سینگ ہیں اور تمہارے نہیں۔"

بھیڑیں ڈری ہوئی تو تھیں۔ بارہ سنگھے کے مکھیا کی تقریر سن کر اور اپنے خطرے احساس کر کے اور زیادہ ڈر گئیں۔ بھیڑیئے سے بچنے کے لئے وہ ان جیالے اور دوست بارہ سنگھوں کو کھیت کے پہرے دار اور محافظ بنانے پر تیار تھیں۔ یہی بارہ سنگھے چاہتے تھے وہ پچھواڑے دروازے میں سے کھیت میں جوق در جوق گھس آئے اور بھیڑیئے سے بھیڑوں کی حفاظت کرنے لگے۔ بھیڑیوں کو یہ خیال نہ تھا کہ وہ اتنے سارے ہوں گے۔ وہ کھیت میں ہر جگہ چھا رہے۔ کبھی کبھار چاندنی راتوں میں دور سے بھیڑیئے کے رونے کی آواز سنائی دیتی جس سے بھیڑیں سمجھتیں کہ بھیڑیا ابھی تک موجود ہے۔ بارہ سنگھے بھی انہیں بھیڑیئے کی سفاکی اور بھیڑ دشمنی سے ڈراتے رہتے اور کہتے کہ وہ نہ ہوں تو بھیڑیا اُٹھا لے جائے گا۔ "تم کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیئے۔" وہ کہتے "ہم تمہاری حفاظت کر رہے ہیں۔"

بارہ سنگھے مزے سے کھیت میں چرتے پھرتے اور منہ مارتے۔ جلد ہی وہ خوب فربہ اور چربیلے ہو گئے پھر رفتہ رفتہ کھیت کے ان ٹکڑوں کو جہاں گھاس اور روئیدگی زیادہ گھنی تھی انھوں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ اب بھیڑوں کو ان ٹکڑوں میں چرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ بھیڑوں پر حکم چلاتے۔ ادھر مت جاؤ، یہ نہ کرو، زیادہ نہ اچھلو کودو۔ وہ کھیت میں یوں گھومتے پھرتے جیسے کھیت انہیں کا ہو۔ کھیت میں گھاس کی وہ زرخیزی اور فراوانی نہ رہی۔ بھیڑیں خوراک کی کمی اور محافظوں کی زبرداری کے ڈر سے دبلی اور کمزور ہونے لگیں ___ پھر ایک دن بارہ سنگھے نے سینگ مار مار کر ایک معزز بھیڑ کو ہلاک کر دیا جو مسکرا کر ایک مخصوص ٹکڑے میں جا نکلی تھی۔ اس قسم کے واقعات ہر دوسرے تیسرے روز ہونے لگے۔

آخر بھیڑیں بے حد دق ہو گئیں گو بھیڑیئے کی آواز اب بھی مہینے میں ایک آدھ بار سنائی دے جاتی تھی مگر بھیڑوں نے دیکھا کہ یہ حفاظت ان کو بڑی مہنگی پڑ رہی ہے اور ان کا کھیت ان کا اپنا نہیں رہا۔ معتبرین نے ایک کانفرنس کی اور طے کیا کہ بارہ سنگھوں کو کہا جائے کہ بھیڑوں کو ان کی حفاظت کی ضرورت نہیں رہی اور وہ بخوشی اپنے ٹیلوں کو واپس چلے جائیں۔

چنانچہ ایک سرکاری بھیڑ بارہ سنگھوں کے مکھیا سے ملی اور اس سے کہا، "تمہاری حفاظت کرنے کا شکریہ۔ اب ہم حفاظت کرانا نہیں چاہتے آپ کھیت سے چلے جائیں جو ہمارا ہے۔"

"کیا بات کرتی ہو بڑھیا؟" مکھیا بارہ سنگھا بولا۔ "ہم تمہاری حفاظت سے کبھی دست بردار نہیں ہوں گے۔ ہم ہرگز نہیں چاہتے کہ بھیڑیا تم سب کو کھا جائے ــــ اس کی آواز نہیں سنی تم نے کیا؟"

"ہم بھیڑیئے کا لقمہ بننے سے نہیں ڈرتیں۔" بھیڑ نے کہا۔

"تبھی ہوتی ہے۔ ہم تمہاری حفاظت ضرور کریں گے۔ یہ ہمارا فرض ہے۔" سردار بارہ سنگھا گرجا ــــ تھوڑے توقف سے اس نے کہا "تم حفاظت کرانا نہیں چاہتیں تو اس کھیت کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤ۔"

"مگر یہ کھیت ہمارا ہے۔ ہم نے تمہیں صرف حفاظت کرنے کے لئے بلایا تھا جس کی اب ہم کو ضرورت نہیں۔"

"اب یہ ہمارا کھیت ہے۔ ہا ہا ہا" سردار بارہ سنگھا ہنسا۔

اس طرح بارہ سنگھے بھیڑوں کا کھیت چرتے اور ان کی حفاظت کرتے رہے۔

خلاصہ یہ کہ حفاظت کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔

آدمی اور شکاری کتا

کہتے ہیں ایک آدمی کے پاس ایک شکاری کتا تھا جیسا کہ بہت سے لوگوں کے پاس ہوتا ہے۔ اس کتے نے کئی برس اپنے مالک کی ہوشیاری سے خدمت کی اور ہر موسم میں خرگوش، ہرن اور جنگلی بلے شکار کئے۔ آخر وہ بوڑھا اور ناتوان ہو گیا۔ اس کے بدن میں وہ پہلے سی پھرتی اور چستی نہ رہی (آدمیوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے) ایک دن بارہ سنگھے کا شکار کرتے ہوئے یہ کتا سب کتوں سے پہلے شکار پر پہنچا اور بارہ سنگھے کی ٹانگ منہ میں لے لی لیکن اس کی بوڑھی داڑھیں بوسیدہ ہو چکی تھیں اور ٹانگ کو مضبوطی سے نہ دبوچ سکا۔ بارہ سنگھے نے اپنی ٹانگ چھڑا لی اور چمپت ہو گیا۔ اس کے بھاگنے کا مالک غصے میں آکر اسے لاٹھی سے پیٹنے لگا۔ کتا کچھ دیر تو خوف سے دبک کر پٹتا رہا پھر بولا "دیکھ مالک، مجھ غریب کو نہ مار۔ میں تیرا دیرینہ نمک حلال خادم ہوں۔ اتنا عرصہ تیری خدمت دن رات کی۔ مجھ میں طاقت رہتی تو اب بھی جان لڑاتا۔ اب میں عمر رسیدہ ہو چکا ہوں۔ اگر اب تیرے کام کا نہیں رہا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو مجھ کو پیٹے۔ میری پہلی خدمات کا کچھ تو لحاظ کر۔"

"وہ تو تو ٹھیک کہتا ہے" مالک نے اقرار کیا۔ "لیکن اب کی بات کر۔ اب تیرا کیا فائدہ؟" اور اس ظالم آدمی نے گھبرا کر خدمتگار کتے کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

کسی کو اپنی پہلی خدمات یاد نہ دلاؤ۔ بیشتر لوگوں کو یہ یاددہانی ناگوار گزرتی ہے۔

غلط فہمی سے خوش فہمی تک

حلیمہ فردوس

خدا رحیم و کریم ہے تو بندہ فہیم و نعیم ہے۔ خدا نے اپنے رحم و کرم کے ذریعہ بندہ کو جنت کی نعمتوں سے سرفراز کیا تو بندے نے اپنی فہم کی بدولت انہیں بے کار سمجھا یہاں شیطان کی پیدا شدہ غلط فہمی سامنے آگئی اور وہ خوش فہمی میں مبتلا اس دنیا میں پہنچ گیا۔ خدا کسی کو نا ممکن نہیں دیتا پر انسان کو فہم ضرور عطا کرتا ہے۔ اگر وہ فہیم نہ ہوتا تو اس صدی کا مشہور کارنامہ یعنی "ٹیسٹ ٹیوب بے بی" (بن باپ کا بچہ) بنانے میں کیسے کامیاب ہو جاتا۔

گو کہ عقل اور فہم کو ایک ہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے پر ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ عقل کے ساتھ جو کلمات جوڑے گئے ہیں آپ انہیں فہم کے ساتھ وابستہ کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔ کوئی اس مسئلہ کو آج تک نہیں سلجھا سکا کہ عقل بڑی ہے یا بھینس۔ دکن والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ "کیا تمہاری عقل پر مٹی پڑی ہے۔" اور شمال میں کوئی عقل کو چرنے بھیجتا ہے تو کوئی عقل کے ناخن پانے کی تجویز کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا ایسی تجاویز فہم کو نہیں دی جاتیں۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا ہر فرد جو فہیم ہے وہ زندگی بھر کسی نہ کسی فہمی کا شکار ضرور ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی دو فہمیاں ہیں جو انسان کی فطرت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں اگر کوئی فرد بفرض محال ان دونوں میں سے کسی فہمی میں بھی مبتلا نہیں تو آپ بلا چوں و چرا اس کی عظمت پر ایمان لے آئیے۔ صد افسوس اس صدی میں ایسی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ ورنہ اس عام میں تو سبھی ملے نظر آتے ہیں۔ بوڑھے سے بچے تک، مرد سے عورت تک، استاد سے شاگرد تک سبھی اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دراصل یہی غلط فہمی اور خوش فہمی ہے جس سے آقا، اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز باقی ہے۔ البتہ ان دونوں میں تمیز کرنا دشوار ہے۔ اکثر اوقات خوش فہمی پر غلط فہمی کا اور غلط فہمی پر خوش فہمی کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ اس بال سے باریک فرق کو محسوس کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

ہمارا بچپن شرارتوں میں بیتا، جوانی حماقتوں میں تو بڑھاپا نزاکتوں میں بیت رہا ہے۔ بچپن میں جس غلط فہمی کی ابتدا ہو چکی تھی اس کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔ مٹھائی ہم کھاتے پٹائی بھیا کی ہوتی۔ کھلونے ہم توڑتے ہوتے سہیلی کو کھانے پڑتے۔ کلاس میں ہماری ذہانت کا سکہ کچھ اس طرح بیٹھ گیا تھا کہ ہماری ہر شرارت نظر انداز کر دی جاتی۔ بس یہ سارا کرشمہ ہماری ذہانت کی غلط فہمی کی بدولت تھا۔ یہ غلط فہمی ہمارے لیے یہیں خوش فہمی جب بن گئی جبکہ ہم نے وقت سے پہلے اپنی منزل پا لی۔ اور بچارے شریف اور غریب والدین کو ہماری عمر بڑھانے کے لیے عدالت میں جھوٹی قسمیں کھانی پڑیں۔ کیوں کہ اس زمانے میں زندگی کی پندرہ بہاریں دیکھے بغیر کالج کی بہار دیکھنا طالب علم کے لیے ممنوع تھا۔ ہم نے مختصر مدت میں سانس لیے بغیر کالج اور جامعہ کی بہاریں دیکھ لیں اور ہمیشہ کے لیے طلبہ کی چار دیواری میں بحیثیت استاد قید کر دیے گئے۔ لیکن شومئ قسمت یہ کہ کوئی ہمیں استاد مانتا ہی نہ تھا کبھی کسی چپراسی کی دھتکار سننے کو ملتی تو کبھی ذی وجاہت پروفیسر ہمیں طالب علم سمجھ کر بھری میٹنگ سے نکلوا دیتے۔ ہم ایسے میں چہرے کی معصومیت کو بُرا بھلا کہتے جس کی بدولت ہر ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا۔ شاگردوں پر رعب جمانا تو ہمارے لیے ایک مشکل مسئلہ تھا۔ حوا کی بیٹی ہونے کے ناطے اس میدان میں بھی مارے گئے کیونکہ سوٹ اور نکٹائی جیسی کوئی چیز ہماری شخصیت کو پُر رعب بنانے والی نہیں تھی۔ اس لیے ہم نے ایک عدد ڈسٹر اور رجسٹر کو غلط فہمی دور کرنے کا ذریعہ بنا لیا جو آگے چل کر بہت کامیاب ثابت ہوا۔ خدا خدا کر کے پیشے کی غلط فہمی دور ہوئی پر زندگی میں اور جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی گئیں اس کا تدارک ہم نہ کر سکے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت بہت جلد ڈھل جاتی ہے۔ اس لیے عموماً اسے پانچ دس

برس بڑے مردسے بیاہ دیا جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پر سانچے میں ڈھلا ہوا جسم عمر ڈھلنے کے باوجود بھی نہیں ڈھلا۔ ہمیں اپنے سرتاج کے ساتھ (جو تاج کے بجائے ہیلمٹ پہنتے ہیں) کہیں بھی جاتے ہوئے بڑی جھجک سی ہوتی ہے۔ کوئی انہیں ہمارے چچا ابا سمجھتا ہے تو کوئی ہمیں ان کی بیٹی یا بہن کہتا ہے۔ آبائی شرافت کے تحت ہم نے اس غلط فہمی پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ پر آج کل کے بیاہتا جوڑوں کی نقل میں کبھی ہم اپنے شوہر نامدار کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہیں تو کبھی خواہ مخواہ انہیں کن انکھیوں سے دیکھ اور مسکراتے رہتے ہیں تاکہ ہماری ان اداؤں سے لوگوں کو کوئی غلط فہمی نہ ہو اور انہیں ہمارے رشتے کو سمجھنے میں بھی آسانی ہو۔ ہمیں اکثر اس حادثے کی یاد آتی ہے جس سے ہماری زندگی کی کایا پلٹ سکتی تھی۔ یوں ہوا کہ جوانی میں ایک رومانی فلم دیکھنے کے بعد ہمیں بھی یہ شوق چرایا کہ فلمی ہیروئن کی طرح سڑکوں پر چھیڑ کرنے والے لڑکوں سے عشق بازی کے بجائے جوتا بازی کی جائے جو عشق بازی کی تمہید ہوتی ہے۔ ہمیں اپنے کالج کے زمانے میں اتفاقاً ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ کہ لڑکے نے ہم پر پھول پھینکا اور ہم نے جواباً جوتا جڑ دیا۔ ردِ عمل دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ بجائے وہ جوتا لڑکے کی جیب میں ہونے کے ہمیں اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ تو ہم نے اپنے تحفظ کے لیے قدم بڑھایا۔ جس کی بدولت ہم

تو بچ گئے پر ہماری سہیلی اس کا نشانہ بنیں لیکن ہوا یوں کہ جوتا کھانے کی ادا اس لڑکے کو اس قدر پسند آئی کہ اس نے دوسرے دن ہی سہیلی کے گھر پیغام بھیجا اور چٹ منگنی اور پٹ شادی کر لی۔ اس طرح کوئی اور اس درمیان غلط فہمی کا شکار نہ ہو سکا۔ البتہ دونوں صاحبان خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ایسی موزوں جوڑی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ دراصل محبت خوش فہمی اور غلط فہمی کا مرکب ہوتی ہے۔ ورنہ محبوب اپنی محبوبہ کو آسمان سے تارے توڑ لانے کی غلط فہمی میں مبتلا نہ رکھتا اور نہ محبوبہ ہی اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی کہ اس کا محبوب شاہجہاں سے کم نہیں جو محبت کی نشانی تاج محل کے روپ میں دیتا۔ محبت کے میدان میں پہلے محبوب غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے تو محبوبہ بعد میں خوش فہمی میں مبتلا ہوتی ہے۔ حسرت جیسا صوفی منش شاعر بھی اس غلط فہمی کی بدولت ایسا شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

دوپہر کی دھوپ میں مجھ کو بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

ہمیں تو یقین ہے کہ حسرت کی شریف و غریب بیوی جب کہ بیوی نہ تھیں بال سکھانے یا اناج سکھانے کی غرض سے چھت پر آتیں ہونگی تو حسرت صاحب کو غلط فہمی ہو گئی کہ یہ ہیرا پھیری انہیں کے لیے ہے۔ بس بچاری کو رام کیا اور شادی رچالی۔

پڑھائی ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ پھر بھی ہم نے نہ سلمٰی صدیقی کی طرح تیسری جماعت میں نہ طلسم ہوشربا پڑھی نہ کبھی تکیے کے نیچے "آہنگ" (مجازؔ کا مجموعہ کلام) رکھا اور نہ لحاف میں دبکے امیتابھ کے حالات زندگی پڑھے نہ دلیپ واسمار کے طلاق کی داستان۔ پڑھتے پڑھتے اچانک ہمیں لکھنے کا شوق چرایا۔ جب ہم لکھنے لگے تو سب غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ اِدھر گھر والوں نے اس لیے بے اعتنائی برتی کہ ہمارے مضامین اُستاد کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہیں گو کہ ان کی اصلاح دال میں نمک برابر تھی اور ہمیشہ گھر کی مُرغی دال برابر ہی ہوتی ہے۔ کام ہمارا اور نام ان کا ہو گیا۔ اُدھر استاد صاحبان اور ساتھیوں نے یہ کہہ کر ہمارا مذاق اڑایا کہ کیوں بھائی صاحب تمہارے نام کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ ہم فی میل (FEMALE) ہونے کی وجہ سے خاموش ہو گئے اور لکھنے کی مشق جاری رکھی۔ آخرکار وہ دن بھی آ گیا جب ہندوستان بھر میں اُردو زبان کی طرح ہمارے مضامین کی دھوم مچ گئی۔ مداحوں سے خطوط کا رشتہ تو استوار ہو ہی گیا تھا۔ اب نووارد ان ادب ادباً، مروتاً، تحفتاً اپنی تخلیقات سے بھی نوازنے لگے۔ اس وقت ہماری خوش فہمی انتہا کو پہنچ گئی جب کہ ہمیں ایک فن کار نے اپنا کچا مال یعنی مسودہ عنایت فرمایا اور ساتھ میں پیش لفظ لکھنے کی دعوت دی۔ بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی طرح ہم نے اپنی مصروفیت کا ذکر کیا۔ بہانہ بازی سے کام لیتے رہے کیوں کہ ایسے موقع پر بے نیازی دکھانا

شریفوں کا وطیرہ رہا ہے۔

انہوں نے ہماری ایک نہ سنی، پاؤں پکڑے، مگرمچھ کے آنسو بہائے، آخر کار ہمیں ان کی درخواست قبول کرنی پڑی۔ پہلے تو پیش لفظ لکھتے وقت ہم پس و پیش ہوتے رہے لیکن جب لکھنا شروع کیا تو قلم تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔ جب سیاہی اور کاغذ ختم ہوئے تو شکریہ کی آخری سطر کے ساتھ پیش لفظ کا خاتمہ کرنا پڑا۔ ہم نے کبھی انہیں اردو کا چارلس ڈکنس قرار دیا تو کبھی رشید صاحب اور پطرس کے ہم پلہ ٹھہرایا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا کہ ان کے مضامین جا بجا ترمیم شدہ مصرعوں کی بہتات ہے۔ جس سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے پیروڈی کی طرف توجہ دی ہوتی تو میدان ان کے ہاتھ آتا کیوں کہ اردو میں پیروڈی میدان خالی ہے۔ ان کے مشہور مضامین "یتیم کی فریاد" "ٹی وی کے فیوض و برکات" "میرا شہر بدلے لوگ" پڑھ کر ہمیں غلط فہمی ہو گئی تھی۔ جس میں فلمی اشعار کو توڑ موڑ کر پیش کیا گیا تھا۔

"آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے
تو باپ بن جائے"

"ہم لائے ہیں طوفان سے ٹی وی نکال کے
میرے دیس کے بچو اسے رکھنا سنبھال کے"

"اس شہر کا ہر شخص شیطان سا
کیوں ہے"

ہم نے مع پیش لفظ مسودہ ان کے حوالے کیا اور اپنی غلط فہمی کے ازالہ کے لیے پوچھا کہ حضرت آپ نے فلمی اشعار کے استعمال سے اپنی کتاب کے دروازے ہر ایک کے لیے وا کر دیے ہیں۔ کوئی اس تصنیف کو ادبی حیثیت سے پڑھے یا نہ پڑھے لیکن فلمی شوق رکھنے والے حضرات ضرور اسے بغل میں دبائے پھریں گے۔ یہ ڈرائنگ روم میں الماری کی زینت بننے کے بجائے فٹ پاتھ کی زینت ضرور بنے گی صاحب کتاب نے فرمایا اِس گُر سے کوئی واقف نہیں تھا ہم ایسے ترمیم شدہ مصرعوں کے تصرف کے استاد ہیں۔ انھوں نے مزید یہ بھی کہا کہ کاش اس نکتہ کا حوالہ آپ اپنے پیش لفظ میں دیتیں۔ ہم نے معذرت چاہی اور وہ خوش خوش اپنا مسودہ لے کر چلتے بنے۔ ہماری غلط فہمی اور ان کی خوش فہمی کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آگئی اور اس کی رسم رونمائی بھی ہوئی پر مصنف نے ہمیں یاد نہیں کیا بلکہ دودھ سے مکھی کی طرح ہمیں نکال پھینکا۔ سُنا گیا کہ ہر محفل میں صاحب کتاب سے زیادہ صاحب پیش لفظ کا ذکر ہوتا۔ یہ سُن کر ہمارے سینے پر سانپ لوٹ جاتے۔ اتفاقاً صاحب کتاب سے ہماری ملاقات ہوئی تو ہم نے اُن سے بے رُخی کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے بڑی رُکھائی سے جواب دیا کہ میں آپ سے پیش لفظ لکھوا کر پچھتا رہا ہوں۔ ایک تو آپ نے میرے انشائیوں کے مجموعے کو مزاحیہ مضامین مجموعہ قرار دیا۔ دوسرا یہ کہ آپ نے میرے اسلوب کی تعریف میں اس قدر غلط لکھا ہے کہ " ان کا اسلوب ان کی شخصیت سے متعرف ہونے کا بہترین ذریعہ ہے"۔ ہم ان کے اعتراضات پر سر تھام کر رہ گئے۔ پہلے اعتراض کا جواب کیا دیتے جبکہ لوگ آج بھی مولانا آزاد کے خطوط کے مجموعے "غبارِ خاطر" کو انشائیوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ اگر مصنف خود انشائیوں کو مزاحیہ مضامین کہنے پر بضد ہے تو ہمیں کیا پڑی۔ اکثر میاں بیوی کی رضامندی پر قاضی جی خاموش ہی رہتے ہیں۔ ان کا دوسرا اعتراض بالکل بے جا تھا۔ دراصل ہم اسلوب کو متعارف ہونے کا ذریعہ قرار دیا۔ اور کاتب صاحب کی کرامت یہ کہ متعارف کو متعرف لکھ کر خواہ مخواہ مصنف کو غلط فہمی میں ڈال دیا۔ اس واقعہ کے بعد ہماری رہی سہی خوش فہمی ختم ہو گئی کہ ہم مستقبل کے ماہر پیش لفظ بن جائیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ پڑوسی کا بڑا حق ہوتا ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ پڑوسی زیادہ حقدار ہوتا ہے یا ہمسایہ۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمسایہ تعلقہ جات کی دین ہے تو پڑوسی شہروں کی۔ شہری زندگی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہاں سایہ میں رہنے کا شرف بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ البتہ شہروں میں (FLAT SYSTEM) کے ذریعہ سروں پر سوار رہنے کا حق سبھوں کو حاصل ہے ہمیں ہمسایہ سے کم اور پڑوسیوں سے زیادہ سابقہ رہا۔ کیونکہ ہماری بیشتر زندگی شہروں میں گذری۔ ہمارے فلیٹ میں ایک نئے پڑوسی کا نزول ہوا۔ ان کے آنے کے دو چار دن بعد ہم پڑوسی کا حق ادا کرنے کی نیت سے ان کے گھر پہنچے۔ تاکہ ان کی خیر خیریت دریافت کریں اور انہیں اجنبی ماحول سے

فارف کروائیں ۔ دروازے پر پہنچتے ہی دو تین
لں نے بغیر توپ کے سلامی دی ۔ ہم نے جب گھر
ا اپنے آنے کی اطلاع بجوائی تو دو صدر جوان
لیاں پردے سے چہرہ نکالے ہمیں تاکنے لگیں ہم
ا اپنا عرضِ مدعا بیان کیا تب کہیں صاحب خانہ
ریف لائیں ۔ دیکھتے کیا ہیں مالک بڑھاپے میں
ان بننے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں ۔ ہم نے
ت پوچھی اور اپنا تعارف کروایا ۔ ابھی پردے
پر ان کی تاریخ شناسی بھی نہ تھی کہ ایک دو سالہ
ں آئی اور تُتلاتے ہوئے کہنے لگی "امی ہمیں
ا چاہیے؟" ہم نے انہیں امی کے بجائے نانی
ھا ۔ کیونکہ آجکل نانیوں کو امی کہنے کا چلن عام
۔ فیشن زدہ عورتیں نانی کہلوا کر اپنے آپ کو
ی ثابت کرنا نہیں چاہتیں ۔ حتیٰ کہ ان کے
یں دانت رہے نہ پیٹ میں آنت ۔ ہم نے
راست سوال کرکے انہیں شرمندہ کرنے کے
ئے بڑی چالاکی سے پوچھا کہ آپ کی کتنی
ں بیاہی گئی ہیں ۔ انھوں نے منہ بنا کر جواب
ایک بھی نہیں ۔ ویسے جلدی بھی کیا ہے ۔ ان
کو سنبھالنے کے لیے تو مجھے کسی نہ کسی کی
ت ہوتی ہی ہے یہ تو خیر سے بڑی ہو گئی
آنے والے مہمان کو سنبھالنے کی باری ہے
ہوں نے شہر کے مشہور میٹرنٹی ہوم کا پتہ
ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ۔ مزید پوچھنا
ب نہ سمجھا ، کچھ تو معلومات محکمہ مردم
ں کے لیے بھی ضروری تھے ۔ چائے پی نہ پان
ا ۔ خدا حافظ کہہ کر سیدھے خاندانی منصوبہ
ا کے آفس پہنچے تاکہ ایسی اطلاع سے ان کی
فہمی دور کریں اور ان کے اگلا بچہ ابھی
، دو کے بعد کبھی نہیں" کے جواب میں
وہ دو درجن کے بعد کبھی نہیں ؛ گیارہ کے

بعد ابھی ابھی کا نعرہ لگا رہی ہے اس کی اطلاع دیں ۔ یہ ایک نہیں ایسی بے شمار غلط فہمیاں ہمارے پڑوس میں ہوتی رہتی ہیں ۔ ہماری بیٹی کی استانی گھر تشریف لائی تھیں انہوں نے لڑکی کی تعلیمی حالت کی تعریف کی پھر ہمارے افرادِ خاندان کا ذکر ہوا اس کے بعد وہ خاموش ہو گئیں ۔ تو ہم نے سلسلہ کو آگے بڑھایا ۔ کبھی تو بات سے بات نکلتی ہے اور کبھی جواباً باتیں کی جاتی ہیں جو غلط فہمی کی تمہید بن جاتی ہیں ۔ انہوں نے ہمارے متعلق سب کچھ ٹالا تو ہم نے ان کے بارے میں پوچھنا اخلاقی فریضہ سمجھا ۔ ان کی جسامت کو دیکھنے کے بعد ان کے شادی شدہ ہونے کا پورا یقین ہو چلا تھا ۔ اس لیے بڑے وثوق سے ہم نے دریافت کیا کہ آپ کے کتنے بچے ہیں ۔ اس سوال کے سنتے ہی بچاری کے پسینے چھوٹنے لگے ۔ شرماتے ہوئے انہوں نے جواب دیا اور غلط فہمی دور کی کہ میں ابھی کنواری ہوں ۔ دراصل مجھے یہ جھنجھٹ بالکل پسند نہیں ۔ وہ کس جھنجھٹ کے بارے میں کہہ رہی تھیں اس کا پتہ ہمیں آج تک نہ چل سکا ۔ ہمارے پڑوس میں داہنی جانب ایک اور پڑوسی آ گئے تھے ۔ جو دو عدد بیٹوں کے مالک تھے ۔ ہم نے سوچا کہ ایسا پڑوسی وبالِ جان نہیں لیکن ہفتہ پندرہ روز بعد حقیقت کھل گئی ۔ فلمی ہیرو کی نقل کرنا اور کھڑکیوں میں کھڑے لڑکیوں کی تاکا جھانکی کرنا ان سپوتوں کا مشغلہ تھا ۔ ہماری بیٹی صاحبہ ان کی ان حرکتوں سے تنگ آ گئیں ۔ ہمیں کچھ بتائے بنا انہوں نے راکھی اور مٹھائی منگوائی اور ہمیں لے کر پڑوسی کے ہاں گئیں ۔ نئی نسل کی پینترے بازی کو بھلا ہمارا بوڑھا دماغ کیا سمجھ سکتا ۔ ہم حیران و پریشان ان کے ساتھ ہو لیے ۔ صاحبِ خانہ سے

بیٹی صاحبہ نے آنٹی کا رشتہ جوڑ لیا ۔ اور شرافت سے ان کے بیٹوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اپنا تعارف کروایا ۔ بن بھائی کی بہن ہونے کا دکھ ظاہر کیا اور جھٹ سے مٹھائی کا ڈبہ سامنے رکھا اور ہاتھ بڑھا کر راکھی باندھی ، دعائیں دینے لگیں کہ بھائی صاحب کا مستقبل شاندار ہو ۔ ہر کامیابی آپ کے قدم چومے ۔ لڑکے نے آنکھیں نیچی کر لیں اور جواباً بہن کا منہ میٹھا کیا ۔ تھوڑی دیر بعد ہم گھر چلے آئے ۔ گھر پہنچ کر وہ خوب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی رہیں ۔ ہم نے ماجرا پوچھا تو بیان کرنے لگیں کہ امی جان اس لڑکے کی غلط فہمی کو دور کرنے کے دور میں اس کا مفہوم بدل گیا ہے ۔ ہم سوچتے رہ گئے کہ اگر مجاز کو اس کا پتہ ہوتا تو بیچارہ نیچی نظر کو عورت کا محافظ دگر دانتا ۔

یہ تو رہے غلط فہمی کے کرشمے ۔ اب خوش فہمی کے بارے میں کیا کہیں ۔ خوش فہمی کے بغیر لیڈر ، شاعر ، مقرر کسی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ ان کی ذات کا اہم عنصر ہے ۔ بلی آنکھ موند کر دودھ اس خوش فہمی میں پیتی ہے کہ اُسے کوئی دیکھ نہیں رہا ہے ۔ اس کی خوش فہمی کا بخار سر پر ڈنڈے پڑنے کے بعد ہی اُترتا ہے ۔ شاعر خوش فہمی کا شکار نہ ہوتا تو مشاعروں کا وجود ہی نہ ہوتا ۔ اس کی خوش فہمی کی معراج یہ کہ وہ واہ اور آہ کا فرق بھول جاتا ہے ۔ مقرر گندے انڈے اور سڑے ہوئے ٹماٹروں کا نشانہ بننے کے باوجود مائیک اس لیے نہیں چھوڑتا کہ اس کے سر پر خوش فہمی کا بھوت سوار رہتا ہے ۔ لیڈر ناکامی کی بدولت پارٹیاں بدلتا ہے پھر الیکشن اس لیے لڑتا ہے کہ اُسے ووٹوں کی خوش فہمی دیوانہ بنا دیتی ہے ۔

خوش فہمی ہو کہ غلط فہمی اس کا سلسلہ ازل سے ابد تک ہے ۔ اس سے کسی کو مفر نہیں ۔

کہانی پن

جوگندر پال

کہانی کے کہانی پن کا ذکر ان دنوں کچھ اس طرح روا سمجھا جانے لگا ہے کہ واقعات کو ایک خارجی تسلسل میں باندھ لیا جائے اور بس۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو اخبار کی کوئی رپورٹ بھی بہ آسانی کہانی کے زمرے میں ہی آتی۔ صحافتی اصطلاح میں اخباری رپورٹ کو اسی مفہوم میں "اسٹوری" کا نام دیا جاتا ہے، مگر ادب محض واقعات کی واقفیت سے معرض وجود میں نہیں آتا۔ ادبی اعتبار سے کوئی کہانی واقعات کے عرفان کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کہانی ہو یا نظم، اس میں ادراک و عرفان کی گزرگاہوں کی بدولت ہی تخلیقی واردات کی آبادکاری کا سماں بندھتا ہے۔

کہانی میں کچھ پیش آنا تو ضروری ہوتا ہی ہے، تاہم اگر کوئی واقعہ خیال بن کے کہانی کار کو نہ سوجھ پائے تو اس میں جان نہیں پڑتی۔ دراصل ہم جس شے کو کسی ذی جان میں اس کی جان سے تعبیر کرتے ہیں وہی شے کہانی میں کہانی پن ہے۔ باہر باہر کی صورت گری سے تصویر کو مکمل تو کیا جا سکتا ہے مگر اس تصویر میں روح نہ ہو تو وہ اپنے آپ چل پھر نہ پائے گی۔ اسی طرح کہانی کی روح بھی اس کے بھیتر ہوتی ہے، اور اگر واقعی ہوتی ہے تو وہ اپنے ہاتھ پیر کھول کر جیسے اور جدھر بھی چلتی ہے، اپنی مرضی سے چلتی ہے۔ ہمارا خدا بڑا کارساز ہے کہ اس کی ادنیٰ سی ادنیٰ تخلیق بھی بے روح نہیں۔ ہو تو ہاتھیوں، گھوڑوں، انسانوں سبھوں کی تصویریں ملبے کا ملبہ پڑی رہیں اور ان کی روحیں نامعلوم کہاں منڈلاتی پھریں۔

کہانی میں اگر واقعی کہانی پن موجود ہے تو وہ اول تا آخر اپنے زندہ ہونے کا احساس دلاتی ہے اور ساری کھلواڑ آپ ہی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اور جو ہو رہا ہوتا ہے اُسے کہانی کار بھی اپنے پڑھنے والے کے مانند دیکھتا اور جذب کرتا چلا جاتا ہے۔ سب کچھ وہ آپ ہی کر رہا ہوتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو کہانی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم سے اپنے خالق کی مرضی کے بغیر بھی کوئی حرکت سرزد ہو جاتی ہے تو وہ تخلیق کے اصولوں سے بندھے، ہمارے نازیبا عمل میں مداخلت نہیں کرتا اور نہ ہی غصے میں آکر اوپر سے کوئی سزا بھیجتا ہے، بلکہ ہم اپنے ہی احساس و فہم سے اپنے کیے کو بھگتتے ہیں۔

بڑی موٹی بات ہے کہ ادب پر زندگی کا گمان ہونا چاہیے۔ شاید اسے بے ذہنی سے دہرائے چلے جانے سے ہم اس کے معنی گنوا بیٹھے ہیں۔ کہانی کار کو بھی اپنے حروف کی کائنات میں حروف کو کچھ اس طرح کام میں لانا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر ہی اندر دُبک کر ایک سچ مچ کی کائنات کے مناظر پیدا کرتے چلے جائیں اور ان مناظر میں واقعی کہیں کچھ پیش آ رہا ہو اور یہ پیش آنے سے انھیں لکھنے اور پڑھنے والے کی ویسے ہی ترمیم ہوتی چلی جاتی ہو جیسے زندگی میں کچھ پیش آنے سے ہوتی ہے۔ تخلیق کے اسی معیار کو ملحوظ رکھنے سے کہانی رنگ اور بو اور صدا کے عناصر سے عاری نہیں ہوتی۔ ادب میں تخلیقی عمل میں کنفیوژن کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے بعض معتبر نقاد بڑی معصومیت سے تخلیقی واردات کی زبان کو بھی اسی طرح ٹٹول ٹٹول کر اپنی منطقی کرنا چاہتے ہیں جس طرح وہ اپنی تنقیدی زبان کو ٹٹول ٹٹول کر لکھتے ہیں۔ تخلیق کار کو تو اپنی واردات کی پیش کشی میں لفظوں اور لفظوں کے مفاہیم کے ٹھوس پن کو پگھلا کر زندگی کی دھڑکنوں کی رچی بسی صورت گری کرنا ہوتی ہے اور سچائی کو صرف سمجھا دینے کی بجائے اس کے سحر میں گرفتار رہنا اور گرفتار کرنا ہوتا ہے۔

سچی کہانیاں فرضی نہیں ہوتیں کہ ایک خارجی منطق کے تحت انھیں یہاں سے وہاں لا کے چھوڑ دیا جائے: سچی کہانیاں واقعتاً ہوتی ہیں اور وہ اپنے ہی سیاق و سباق کی منطق کی روشنی میں اپنے سفر کے سارے موڑ طے کرتی ہیں۔ کہانی میں لکھنے والے کی فطری اور تخلیقی سرشت کا مدار اس امر پر ہوتا ہے کہ اس میں اپنی چمڑی سے باہر آ کے وہی بنتے چلے جانے کی استطاعت ہو جسے وہ بیان کر رہا ہے۔ کرداروں کو اپنی مرضی کا پابند کر لینا قید و بند کے جبر کے مترادف ہے۔ فن کا کمال یہی ہے کہ کہانی کے کردار کھلے کھلے جیتے ہوئے محسوس ہوں۔ وہ 'اچھے' ہوں یا 'برے'، کہانی کار بھی ان کے کیے ہوئے کو بھوگتا اور سہتا ہوا سا لگے۔ اس کی اسی تسلیم کی خو کی بدولت کہانی میں 'کہانی پن' کی حیات پرور لوچ اور آنچ ابھر آتی ہے۔ اسے سچ مچ کے اپنے کرداروں کو اچھا یا برا ثابت نہیں کرنا ہوتا بلکہ انھیں اپنے آپ کو کھولتے چلے جانے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے، تاکہ ان کی کہانیاں دھیرے دھیرے اپنی ہی جمالیاتی منطق کے عین مطابق اپنی طبع زاد صورتوں میں سامنے آ پائیں۔

> افسانے کا سرچشمہ انسانی زندگی ہے۔ زندگی کا رخ کب کدھر مڑ جائے، اسے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ ٹھیک اسی طرح کوئی افسانہ نگار نہیں کہہ سکتا کہ کسی منزل پر افسانہ خود کون سا رخ اختیار کرے گا۔ بڑے بڑے افسانہ نگار کو ایسے تجربوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس نے افسانے کا ایک خاکہ ذہن میں تیار کیا ہے۔ لیکن جب افسانہ مکمل ہوا ہے، تو اصل خاکے سے بالکل مختلف ہو گیا ہے۔ کامیاب افسانہ نگار کا کمال یہی ہے کہ وہ زندگی کے دھاروں میں سے بھی نہ کہانی کو بدلنے دیتا ہے، اور نہ بنیادی خیال کو۔ بلکہ سرکش دھاروں سے ہوتا ہوا وہیں پہنچتا ہے، جہاں پہنچنا چاہتا ہے۔ — سہیل عظیم آبادی

صارفی سماج اور ادب کے چند مسائل

اصغر علی انجینیر

ہم نے اپنے پچھلے مضمون صارفی سماج میں پیدا ہونے والے مسائل اور اس کا ادب پر کیا اثر ہوتا ہے اس بات سے بحث کی تھی۔ ہم یہاں اس مسئلے کے کچھ اور پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ صارفی سماج میں ہر شخص زیادہ سے زیادہ اجناس حاصل کرنے کی فکر میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے۔ اس کی توجہ کا مرکز اپنے داخلی وجود سے ہٹ کر اجناس صرف بنا رہتا ہے۔ ایرک فرام' جو ایک مشہور تحلیل نفسی کا ماہر' فرائڈ کا شاگرد اور مارکسی مفکر ہے اسے (to have or to be) کے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ ایرک فرام کا کہنا ہے کہ آج کی مغربی صارفی تہذیب میں بنیادی زور (to have) یعنی اشیا صرف کے حصول پر ہے' (To be) یعنی اپنے وجود پر نہیں۔ مغربی تہذیب نے اس طرح انسان کو اپنے آپ سے اجنبی بنا دیا ہے۔ انسانی تخلیق کے سوتے اس کے داخلی وجود میں ہوتے ہیں اور انسان اگر اپنے داخلی وجود سے ہی بیگانہ ہو جائے تو وہ اچھے ادب کی تخلیق کیسے کر سکتا ہے۔ اسے صارفی سماج اپنے وجود کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔ ایک معنی میں ایسے سماج میں انسان زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے دنیا سے جنگ کرتا رہتا ہے۔ حصول کی اس جنگ میں جہاں اپنے آپ سے اجنبیت بڑھتی ہے' قدریں تہس نہس ہوتی ہیں۔ وہاں اس کا اپنا ایغو بھی اس پر حاوی ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے ایغو کی تسکین کے لیے اور زیادہ اور زیادہ حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے ایغو کی اسکے باوجود تسکین ہو نہیں پاتی۔ اگر اسے اپنے داخلی وجود کی طرف لوٹنا ہے تو اسے حصول کی اس دوڑ میں جنگ بندی کرنا ہوگی۔ لیکن صارفی سماج کا ڈائلمایہ ہے کہ اس جنگ بندی کے دوران بھی یہ سماج اس پر حملے کیے رہتا ہے۔ مغربی ممالک میں ہالی ڈے کے دوران سارے تفریح کے سامان بھی تجارت اور صارفیت کے زد میں آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ گویا جنگ بندی کے دوران بھی اس کی خارجی دنیا سے جنگ جاری ہی رہتی ہے۔

ایرک فرام having اور being میں فرق کرتے ہوئے لکھتا ہے!

being is life, activity, birth renewal, outpouring, flowing out, productivity. In this sense, being is the opposite of having, of egoboundness and egotism. Being, to Eckhart, means to be active in the classic sense of the productive expression of one's human powers not in the modern sense of being busy

لیکن صارفی سماج نے انسان کو ان تمام باتوں سے محروم کر رکھا ہے وہ ہر لمحے مصروف ہے لیکن اس کے باوجود بارآور (productive) نہیں ہے۔ وہ اندر سے اپنی شخصیت میں ہمیشہ ایک طرح کا خلا محسوس کرتا رہتا ہے۔

صنعتی اور صارفی سماج پر چارلی چیپلن نے ایک طنزیہ فلم بنائی تھی اس فلم کا ہیرو ایک میکینک ہے جو ایک بڑے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ یہ میکینک ایک بڑا پیار کرنے والا انسان ہے۔ اسے انسانی اقدار کا بڑا پاس ہے۔ وہ ہر شخص سے بڑے پیار سے ملتا ہے' ان کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت خرچ کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی ماں بہن سے بے حد پیار کرتا ہے۔ وہ جس کارخانے میں کام کرتا ہے وہاں اسمبلی لائن پروڈکشن کا طریقہ رائج ہے۔ ہر میکینک کو اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہ کر جیسے جیسے مشین اسمبلی لائن پر آگے بڑھتی ہے' اس کے ایک ایک نٹ کو اسپینر سے گھمانا ہوتا ہے۔ یہ کام ہر میکینک کو یوں ہی آٹھ گھنٹے تک کرنا ہوتا ہے۔ ایک دن اس میکینک کی ماں اور بہن اس سے ملنے کارخانے آ جاتے ہیں۔ میکینک انھیں دیکھ کر بے حد خوش ہوتا ہے۔ اور ان سے ملنے کے لیے دوڑ پڑتا ہے۔ انھیں ایک صوفے پر بٹھا کر ان سے باتیں کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہاں اسمبلی لائن پر یہ اپنا نٹ ٹائٹ کرنے کا کام چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ تو اسمبلی کا کام بند پڑ جاتا ہے۔ لال بتی جل جاتی ہے اور ہنگامی سائرن بجنے لگتا ہے۔ کارخانے کے محافظ دستے کے لوگ اس میکینک کی تلاش میں دوڑتے ہیں۔ اسے فوراً پکڑ کر لایا جاتا ہے اور اس کی ماں اور بہن مایوس ہو کر لوٹ جاتے ہیں۔

اس واقعے سے میکینک میں نیوراسس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اسپینر لیکر بازار میں چکر لگاتا ہے اور لوگوں کے کوٹ کے بٹن ٹائٹ کرنے لگتا ہے۔

ایک ایسے انسان کو جو اپنے مرکز سے ٹوٹ کر بیزار کرتا ہے۔ نیوراسس میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ تہذیب انسان کو اپنے داخلی وجود پر اور اپنی شخصیت کی سالمیت پر توجہ دینے کا وقت ہی مہیا نہیں کرتی۔ وہ ایسی تہذیب میں اگر کسی خانے میں فٹ ہونا چاہتا ہے تو اسکا داخلی وجود کھوکھلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور سماجی اور انسانی قدریں اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

تخلیقی سوتوں کو فعال بنانے کے لیے فن کار کے لیے سالم شخصیت (Integral personality) بے حد ضروری ہوتی ہے۔ لیکن صارفی سماج انسان کی شخصیت کو منقسم کر دیتا ہے۔ منقسم شخصیت رکھنے والا انسان صحت مند ادب پیدا کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ وہ بیمار ادب (Pathological literature) پیدا کرتا ہے۔ صارفی سماج ایک ذیلی تہذیب بھی پیدا کرتا ہے۔ جیسا کہ امریکہ نے پچھلے دہے ہپی تہذیب پیدا کی، یہ تہذیب ایک معنی میں احتجاجی تہذیب ہوتی ہے۔ لیکن صارفی سماج کے لیے یہ احتجاجی تہذیب بالکل بے ضرر ثابت ہوتی ہے کیوں کہ یہ احتجاج اس نظام سے خاموشی سے الگ ہو جانے کا نام (opting out of the system) ہے جیسا کہ ہپی تہذیب۔ جس کے لیے اسٹبلشمنٹ والے (sub-culture) کی تحقیر آمیز اصطلاح استعمال کرتے ہیں کی بنیاد ان اقدار پر ہوتی ہے جنہیں صارفی سماج نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ صارفی سماج کی بنیادی قدر صرف کرنا ہے اور ہپی صارفیت سے اس قدر نفرت کرتے ہیں کہ وہ ان تمام اشیا کو ترک کر کے کم سے کم ضرورتوں کی بنیاد پر جیتے ہیں۔ یہاں تک کہ صارفی سماج جسے "مہذب" اور "شریفانہ" لباس قرار دیتا ہے وہ ایسے لباس کو بھی ترک کر کے بعض اوقات میلے کچیلے کپڑے زیب تن کرتے ہیں اور صارفی اشیا سے حتی الامکان احتراز کرتے ہیں۔

آج مغربی سماج میں صارفیت اس قدر حاوی ہے کہ ہپیوں کا بے ضرر احتجاج بھی کامیاب نہیں ہو سکا اور بہت جلد ہپی کلٹ نے دم توڑ دیا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ ہپی کلٹ میں ڈرگس کے استعمال پر بہت زور رہا ہے۔ چونکہ صارفی سماج میں انسان کی شخصیت داخلیت اور خارجیت کا توازن کھو کر خارجیت پسند ہو جاتی ہے ذات کی گہرائی میں اترنے کے لیے ڈرگس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک اور مغربی ماہر نفسیات آر۔ ڈی لیانگ (R.D. Liang) اس بات کی سفارش کرتا ہے کہ چاہے ڈرگ کی مدد ہی کیوں نہ لینا پڑے انسان کو زندگی میں داخلی سفر کرنا چاہئے۔ اپنی شخصیت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے یہ داخلی سفر بے حد ضروری ہے۔ لیانگ کو اس داخلی سفر پر اسی لیے زور دینا پڑ رہا ہے کہ صارفی سماج خارجی اجناس سے اسے "مالا مال" کر کے انسان کی داخلی ثروت چھین لیتا ہے۔

لیکن صارفی سماج انسان کی شخصیت کو اس حد تک متاثر کرتا ہے کہ محض ہپیوں کی طرح خاموش احتجاج انسان کے اندرونی کھوکھلے پن کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اسکا بہترین ثبوت ہپی ادب اور ہپی موسیقی وغیرہ ہیں۔ ہپیوں نے پاپ (pop) موسیقی کو اپنایا۔ یہ موسیقی بھی زیادہ سے زیادہ فوری تسکین (instant satisfaction) کا باعث ہوتی ہے اور فوری تسکین یہ صارفی سماج کی ہی ایک بنیادی خصوصیت ہے اس موسیقی میں روح کو تسکین پہنچانے والی جادوئی کیفیت نہیں ہوتی بلکہ ایسا لگتا ہے کہ پاپ میوزک اور ڈسکو رقص صارفی سماج کا انسان اپنی روح کی بے چینی کو جھٹک دینے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ احتجاجی ادب کی بھی اگر کوئی سمت نہ ہو تو وہ بے بسی کے اظہار (impotent expression) سے زیادہ اہمیت اختیار نہیں کر پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہپی تہذیب صارفی سماج کے خلاف بے بس احتجاج کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی اور نہیں کوئی پائدار ادبی اور فنی اقدار دینے سے قاصر رہی۔ احتجاج اگر انسانیت کو آگے لے جانے والی سمت اختیار کرلے تو بڑا بامعنی ادب پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہپیوں کے احتجاج اور فلسطینیوں کے احتجاج میں فرق کرنا ہوگا۔

ہپیوں کا ادب اور فن۔ اگر ان کے لیے یہ اصطلاحیں استعمال کرنا جائز سمجھا جائے۔ محض رہائی کے لیے ہے یعنی صارفی سماج کے دباؤ سے فرار کے لیے تخلیق ہوتا ہے جبکہ فلسطینی ادب موجودہ حالات کے خلاف احتجاج کے ساتھ ایک نئے سماج کی تعمیر کی آرزو بھی ہے۔ ہپی ادب بے معنی (meaningless) افراط (affluence) سے پیدا ہونے والی زنگ آلود روحانیت سے بیزاری کا نام ہے جب کہ فلسطینی ادب مجاہدانہ عمل کو تحریک دینے کا۔ ہپی ادب سماج بیزاری کا اظہار کر کے بے عملی کی طرف لے جاتا ہے جبکہ فلسطینی ادب سماجی اور معاشی ناانصافیوں اور سامراج وادی مظالم کے خلاف نفرت پیدا کر کے جہاد کی دعوت دیتا ہے۔

صارفی سماج فوری تسکین پر زور دے کر صارف کو اکہرا (one dimensional) بنا دیتا ہے اور مستقبل کے کسی امکانات کی طرف توجہ مرکوز نہیں ہونے دیتا۔ یہ اکہرا انسان صرف (consume) کرنے میں ہی مصروف رہتا ہے۔ اور انسان جب صارفیت کو ہی زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے

تو اس کی ذہنی صلاحیت انتقادیت کی صفت کھو بیٹھتی ہے۔ اور موجود کی طرف انتقادی رویہ ہی ادب کی جان ہوتا ہے۔ آرٹ کا ایک بہت ہی اہم پہلو ادراک (cognition) ہے اور یہ ادراک علمی بھی ہوتا ہے اور تخلیقی بھی تخلیقی ادراک (creative cognition) ادب کو کثیر الجہات بناتا ہے تاکہ موجود کو ہی انسان سب سے بہتر متبادل (alternative) نہ سمجھ لے۔ صارفیت سب سے پہلے موجود کی طرف انتقادی رویے کو بے اثر بنا دیتی ہے۔ اور اگر فن کار انتقادی رویے سے ہی محروم ہو تو کبھی بھی بااثر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔

صارفی سماج میں ہر چیز کی قیمت قدر مبادلہ (Exchange value) اور استعمالی قدر (Use value) اور (aesthetic value) سے ہوتی ہے جمالیاتی قدر اپنا وقار کھو دیتی ہے۔ دستکار استعمالی قدر پیدا کرتا ہے اور من کا جمالیاتی اقدار تخلیق کرتا ہے۔ جمالیاتی اقدار تخلیق کرنے کے لیے داخلی کاوش کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ استعمالی قدر پیدا کرنے کے لیے محض جسمانی محنت کی دستکار (artisan) کے یہاں ایک حد تک استعمالی اور جمالیاتی قدر کا تال میل ہوتا ہے۔ لیکن صنعتی مزدور محض استعمالی قدر ہی پیدا کرتا ہے جو صارفی سماج کی بقا کی ضامن ہے۔ صارفی سماج بڑی تعداد میں پیداوار (mass production) چاہتا ہے اور یہاں پیداوار کا مقصد جسمانی یا جمالیاتی ضرورت پوری کرنے کے بجائے منافع کمانا ہوتا ہے اس لیے کوشش یہ ہوتی ہے کہ جلد پیدا کیا جائے اور جلد صرف میں لایا جائے۔ جہاں فوری استعمال مقصد ہو تو جمالیاتی پہلو ملحوظ رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

اُردو کے سادھو

قصہ پُرانا ہے مگر فرسودہ نہیں ہوا۔

ایک سادھو نے بڑی ریاضت کی دن رات ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ کھانا، پینا، سونا سب تیاگ دیا آخر ایک دن بھگوان بہت خوش ہو کر اس کے پاس پہنچے اور کہا ——— مانگ کیا مانگتا ہے۔

سادھو نے کہا "ہے بھگوان مجھے یہ بردان دے کہ جو مانگوں وہ مل جائے" بھگوان نے کہا چلو یہ بردان دیا مگر یاد رکھو تم جو مانگو گے تمھارے پڑوسی کو اس کا دُگنا ملے گا"

سادھو نے اپنے لئے ایک خوبصورت عالی شان مکان مانگا۔ اسے مل گیا مگر اس کے پڑوسی کو دو مکانات ملے۔ سادھو نے ایک خوبصورت حسین حور شمائل بیوی کی خواہش کی اسے ملی اور اس کے پڑوسی کو دو چندے آفتاب چندے ماہتاب عورتیں ملیں۔ غرض سادھو نے جو چاہا ملا مگر پڑوسی کو اس کا دُگنا ملتا گیا ———

سادھو پڑوسی کے غم میں گھلنے لگا۔ اسے اپنی خوشحالی سے بھی چڑ ہو گئی وہ پڑوسی کو تکلیف پہنچانے کی ترکیبیں سوچنے لگا اور آخر ایک دن اسے ترکیب سوجھ ہی گئی۔ اس نے دُعا کی ——— اے بھگوان میری ایک آنکھ پھوڑ دے اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ——— وہ بہت خوش ہوا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے پڑوسی کی دونوں آنکھیں پھوٹ گئیں تھیں ———

اردو کی بدقسمتی ہے کہ اس میں اس طرح کے سادھو بہت ہیں انھیں سادھوؤں نے یوپی اردو اکادمی کو عالمی اردو کانفرنس نہیں کرنے دی۔ اس تجویز کی زبردست مخالفت کی گئی میں نے جب ایک دو سادھوؤں سے پوچھا "اس مخالفت کا سبب کیا ہے" تو جواب ملا ——— "اس کا مقصد فلاں فلاں کو فائدہ پہنچانا ہے" "تو صاحب آپ کو کیا اعتراض ہے تھوڑا بہت فائدہ اردو کو بھی ہوگا" لیکن یہ لوگ ماننے نہیں اپنی ایک آنکھ پھوڑ ڈالی اور یوپی اردو اکادمی کی مجوزہ عالمی اردو کانفرنس کرنے کی تجویز پیش کرنے والوں کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں۔

ابھی عالمی ہندی کانفرنس ہوئی۔ شاندار پرشکوہ۔ سُنا کہ اس میں اوپندر ناتھ اشک نے ایک متوازی کانفرنس کرنے کی کوشش کی کہ انھیں بعض معاملات پر اعتراض تھا اس لئے انھوں نے اچھا کیا ایسا کیا۔ اخبارات میں خبریں چھپیں۔ بہت بدنظمی تھی بڑا گھپلا ہوا۔ وغیرہ وغیرہ ——— اس سے پہلے قومی یک جہتی کے مسئلے پر اردو والوں نے ایک چھوٹی سی کانفرنس کی تھی ——— بڑی بدنظمی تھی ——— کسی کو ڈھنگ سے کھانا نہیں ملا۔ کرایہ نہیں ملا۔ اب پنجابی کی عالمی کانفرنس ہو رہی ہے ——— یہاں بھی بدنظمی تھوڑی بہت ہوگی ——— شکایات ہوں گی ——— ایسا ناگزیر ہے جب بھی کوئی بڑا اجتماع ہوگا تھوڑی بہت بدنظمی اور گھپلا ہوگا ہی ——— مگر ہندی والوں نے اور پنجابی والوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس سے فلاں فلاں کو فائدہ پہنچے گا ——— دراصل ان زبانوں میں یا تو پڑوسی کے لئے اپنی آنکھ پھوڑنے والے سادھو نہیں ہیں یا وہ سادھو اردو کے سادھوؤں کی طرح موثر نہیں ہیں۔

چنگاری ان سادھوؤں کے جذبہ مخاصمت کے خلاف بے انھیں کی پول کھولنا چاہتی ہے ——— اور اگر اللہ کی مرضی شامل حال رہی تو ہم ان سادھوؤں کو اس بات پر مجبور کر دیں گے کہ وہ آنکھیں پھوڑنے والی عادت ترک کریں ورنہ اردو والے انھیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔

ابھی کچھ دنوں پہلے اس طرح کے ایک سادھو نے اُلٹے ہاتھ سے لکھ کر ایک خط ہمیں بھیجا تھا جس میں جمیل احمد اور ادارے کے دوسرے افراد کو غلیظ گالیاں دی گئی تھیں اور انھیں قتل کی دھمکی بھی دی گئی تھی ——— اس سادھو کو معلوم نہیں کہ تحریر شناخت کرنے والے ماہرین اُلٹے ہاتھ کی تحریر کو بھی پہچان لیتے ہیں۔ مگر ہم بزدلوں کی دھمکیوں سے خوف زدہ نہیں ہیں ——— اور نہ ہوں گے ——— نہ لالچ ہمیں خرید سکتا ہے نہ خوف ہمیں ڈرا سکتا ہے کہ ہم اس پر مصمم یقین رکھتے ہیں۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون"

اردو میں سفرنامے

کے۔ کے کھلر

سفرنامہ تاریخ نہیں ہوتا اور نہ ہی اردو میں سفرنامہ اردو کی تاریخ ہے۔ البتہ سفرنامہ تاریخ بن سکتا ہے۔ لیکن تاریخ طویل سفر کے باوجود سفرنامہ نہیں ہو سکتی ہاں بن سکتی ہے۔ فاہیان ہیون سانگ سات سنگ۔ ابن بطوطہ۔ برنیئر ٹاورنیئر کے سفرنامے تاریخ تو نہ بن پائے لیکن تاریخ کے ماخذ ضرور بن گئے۔ بیگم شہزادہ ادریس کے سفرناموں کو تاریخ کا درجہ عطا کیا گیا جیسے بابر کی ڈائری (تزک بابری) اور ہمایوں کے روزنامچے کو تاریخ کا درجہ دیا گیا۔ اردو میں سفرناموں کا انبار لگا ہوا ہے خاص کر ان سفرناموں کا جو پاکستان سے متعلق ہیں۔ ان سب میں لاہور چھایا ہوا ہے گوپال متل سے لے کر جگن ناتھ آزاد اور رام لعل سے ہوتے ہوئے برلاج کومل تک۔ ہر صفحے پر لاہور ہے اور ویسے بھی پنجابیوں کے کہنے کے مطابق لاہور لاہور ہے۔ سعادت حسن منٹو کے "ٹھنڈا گوشت" کے دیباچے "زحمت مہر درخشاں" میں شاید لاہور کا وہ ذکر ہے جس کی مثال سارے اردو ادب میں نہیں ہے۔ منٹو جنوری ۱۹۴۸ء میں بمبئی سے لاہور گیا تھا۔ لاہور کی اداسی کا وہ عینی شاہد ہے۔ ایک تراشہ ملاحظہ ہو۔

"بمبئی چھوڑ کر کراچی سے ہوتا ہوا غالباً سات یا آٹھ جنوری ۴۸ء کو یہاں لاہور پہنچا۔ تین مہینے میرے دماغ کی عجیب و غریب حالت رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ بمبئی میں ہوں۔ کراچی میں اپنے دوست حسن عباس کے گھر بیٹھا ہوں یا لاہور میں ہوں جہاں کئی ریستورانوں میں قائد اعظم فنڈ جمع کرنے کے سلسلے میں رقص و سرود کی محفلیں جمی ہیں۔

تین مہینے تک میرا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پردے پر ایک ساتھ کئی فلمیں چل رہی ہیں آپس میں گڈمڈ کبھی بمبئی کے بازار اور اس کی گلیاں کبھی کراچی کی چھوٹی چھوٹی تیز رفتار ٹرامیں اور گدھا گاڑیاں اور کبھی لاہور کے پرشور ریستوران۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا میں کہاں ہوں۔ سارا دن کرسی پر بیٹھا خیالات میں کھویا رہتا۔

آخر ایک دن چونکا کیونکہ جو روپیہ بمبئی سے اپنے ساتھ لایا تھا کچھ تو گھر میں اور کچھ گھر سے دور کلفٹن بار میں جذب ہو چکا تھا۔ اب مجھے قطعی طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ میں لاہور میں ہوں جہاں کبھی کبھی اپنے مقدمات کے سلسلے میں آیا کرتا تھا اور کرنال شاپ سے بہت سے خوبصورت چپل خرید کر اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔

میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا کام کیا جائے۔ تقسیم کے بعد فلمی کاروبار قریب قریب مفلوج ہو چکا تھا۔ جن فلم کمپنیوں کے بورڈ نظر آتے تھے۔ وہ ان بورڈوں تک ہی محدود تھے۔ بہت تشویش ہوئی۔ الاٹ منٹوں کا بازار گرم تھا۔ مہاجر اور غیر مہاجر دھڑا دھڑ اپنے اثر و رسوخ سے کارخانے اور دکانیں الاٹ کرا رہے تھے۔ مجھے مشورہ دیا گیا مگر میں نے اس لوٹ کھسوٹ میں حصہ نہ لیا۔

فضا پر مُردنی طاری تھی۔ جس طرح گرمیوں کے آغاز میں آسمان پر بے مقصد اڑتی ہوئی چیلوں کی چیخیں اداس ہوتی ہیں اسی طرح "پاکستان زندہ باد" اور "قائد اعظم زندہ باد" کے نعرے بھی کانوں کو اداس اداس لگتے تھے۔ ریڈیو کی لہریں اقبال مرحوم کا یک آہنگ کلام شب و روز اپنے کاندھوں پر اٹھا اٹھا کر تھک اور اکتا گئی تھیں۔ قریب قریب تمام درخت ننگے بچے تھے۔ سردیوں سے بچنے کے لئے غریب مہاجروں نے ان کی چھال اتار اتار کر کھال گرم کی تھی۔ لوگوں کی طرف دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روگ لگ گئے ہیں۔ ان کے کھیل بھی ناتمام تھے۔ بظاہر ہنستے تھے کھیلتے تھے کوئی کام مل جاتا تو کرتے تھے مگر گویا یہ سب کچھ خلا میں ہو رہا تھا۔ ایک ایسے خلا میں جو لبالب بھرے ہونے پر بھی خالی تھا۔"

میں نے لاہور سے متعلق اردو کے تمام سفرنامے پڑھے ہیں لیکن منٹو والا لاہور ان میں نہیں ہے۔ اور "زحمت مہر درخشاں" سفرنامہ نہیں ہے۔ اور پھر یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر سفرنامہ سفرنامے کے عنوان سے چھپے۔ منٹو جہاں بھی گیا اپنی چھاپ چھوڑ آیا اور جس شہر میں گیا اس شہر کے لوگوں کو زندہ کر دیا۔ اس کے افسانوں میں امرتسر کے گلی کوچے ہیں۔ بمبئی کی کوچہ گرد عورتیں ہیں دلی کے محلے کوچے ہیں اور بمبئی کی سوگندھیاں ہیں۔ دیہاتوں کا حسن اور شہروں کی گندگی ہے۔ پونا کی گلیاں ہیں اور لاہور کی لاہوریت ہے۔

سفرنامہ اور سٹے لٹریچر نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی پارٹی کا پراپیگنڈا۔ بیشتر سفرنامے جہازی اڈوں سے مفت اٹھائے ہوئے باتصویر پوسٹروں اور اشتہاروں کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ جب کبھی میں نے کسی ترقی پسند ادیب کا سفرنامہ پڑھا آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ جہاں گئے سارا ملک سرنگوں ہو گیا۔ لال قالین ان کے راستے میں بچھا دیئے گئے۔ مزدوروں کے ادیبوں کے سفرناموں میں مزدور غائب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سب ترقی پسند کام پسند ہو گئے ہیں۔ اگر ابن انشا کو چین جانے کا موقع ہاتھ لگا تو چین ان کے سفرنامے (اگر چلتے ہو تو چین چلو) میں دنیا کا سب سے عظیم ملک بن گیا اور اگر بھولے سے کہیں غلطی سے جاپان پہنچ گئے تو جاپان کی ہر چیز نرالی ہو گئی۔ ایک صاحب اپنے روس کے چار دن قیام کے سفرنامے کی کم از کم چار سو بار دھمکی دے چکے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ان کی ۶۵ سال کی ہندوستان میں بسی ہوئی زندگی بالکل بیکار ہے۔ اگر انھوں نے کچھ اچھے دن دیکھے ہیں تو وہ روس کے چار دن۔

عمر وہ انڈ مانگ کے لائے تھے چار دن دو ماسکو میں کٹ گئے دو لینن گراڈ میں غالب کے خطوط اردو میں سفرناموں کا کام دے سکتے ہیں۔ خاص کر مرزا کے کلکتے سے لکھے ہوئے خطوط۔

اردو زبان میں سب سے پہلا سفرنامہ ۱۸۴۷ء میں چھپا۔ سفرنامے کا نام "عجائبات فرنگ" ہے اور مصنف کا نام یوسف خاں کمبل پوش ہے۔ کمبل پوش نے ۱۸۳۷ء میں انگلینڈ کا سفر کیا۔ منشی نول کشور نے ۱۸۵۸ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپا۔ کمبل پوش حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ اس حیدرآباد کو اوڑھ کر دیس پردیس گھومتے رہے۔ آخر کار کمبل انھیں واپس حیدرآباد لے آیا۔ کمبل پوش کے ہندوستانی اسفار کے سفرنامے بھی موجود ہیں۔ خاص کر کلکتہ۔ ڈھاکہ۔ نیپال کے سفرنامے۔

سرسید احمد کا "سفرنامہ پنجاب" اور "مسافران لندن" بھی اعتبار کا درجہ رکھتا ہے۔ محمد عمر علی خاں رئیس کا "آئینہ فرنگ" اور سفر لنکا بھی اہم ہیں بابو ابا شنکر کا سفرنامہ یورپ "آئینہ سکندری" اور شبلی نعمانی کا "سفرنامہ روم و مصر و شام" بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ پھر وہ لوگ حج کرنے کے بعد اپنا سفرنامہ لکھتے ہیں بے حساب ہیں۔ لیکن عمر لطیف محمل شہری کا "سفرنامہ حج" ذرا دوسرے حاجیوں کے سفرناموں سے مختلف ہے۔ کچھ سفرنامے اس عہد میں دوسری زبانوں سے ترجمے کی صورت میں شائع ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی کا سفرنامہ "روزنامچہ تصویر سفر مصر شام و حجاز" نہایت دلچسپ اور دلکش ہے۔ سید احتشام حسین کا سفرنامہ "ساحل اور سمندر"۔ عابد حسین کا "رہ نورد شوق" عبدالغفار کا "نقش رنگ" اور خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ "مسافر کی ڈائری" بھی قابل ذکر ہیں۔ ادھر پاکستان میں بھی سفرناموں کی کمی نہیں۔ جو لوگ ہندوستان آتے ہیں واپس جا کر ایک سفرنامہ لکھ ڈالتے ہیں۔ یعنی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ انتظار حسین۔ فرمان فتحپوری۔ رئیس امروہی اور عطاء الحق قاسمی اس آگ میں برابر ایندھن ڈالتے رہتے ہیں۔ ان سفرناموں میں مصنف کی شخصیت تو ابھرتی ہے لیکن اور کچھ نہیں ابھرتا۔ اس لحاظ سے منیر احمد شیخ کا سفرنامہ کافی معلوماتی ہے۔ آل احمد سرور بھی اس دور میں پیچھے نہیں رہے۔ میں نے "امریکہ کو کیسا پایا" ہماری زبان ۱۹۷۵ء میں قسط وار چھپا ہے۔ اب اگر کوئی اردو کا ادیب ۱۹۸۳ء میں امریکن گرانٹ سے امریکہ جائے تو مجھے یقین ہے وہ امریکہ کو بالکل ویسا ہی پائے گا جیسے سرور صاحب نے پایا۔ اور اگر پھر واپس لوٹ کر وہ سفرنامہ لکھے تو اس کا عنوان ہوگا۔ "میں نے امریکہ کو ویسا ہی پایا" اور ضروری نہیں کہ "ہماری زبان" اس کو چھاپے۔ پھر کچھ ایسے لکھنے والے بھی ہیں جن کے عنوانوں سے خوشی بھی گھبرا اٹھے۔ یعنی "امریکہ میں اردو" (آل احمد سرور) برما میں اردو (جگن ناتھ آزاد) "ناروے میں اردو" (ہرچرن چاولہ) کنیڈا میں اردو (عبدالبخت) برطانیہ میں اردو (بہت لمبی فہرست ہے)۔

شاید سب سے بہتر سفرنامہ خواجہ غلام السیدین کا ہے "جو دنیا میرا گاؤں ہے"۔ سنتوش کمار کا "لاہور نامہ" (۱۹۸۳ء) بالکل مختلف سفرنامہ ہے۔ میرے خیال میں یہ سفرنامہ آنے والے سالوں میں ایک مشعل راہ کا کام کرے گا (اگلے دس سالوں میں اسے اعتبار کا درجہ ملے گا)۔ سنتوش کمار مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ان کی تاریخی اور ادبی بصیرت اس سفرنامے میں نمایاں ہے۔

بعض سفرنامے صرف تعارف نامے ہو کے رہ گئے ہیں۔ اکثر اپنا اپنا تعارف کرا کے صرف سفرنامے رہ جاتے ہیں۔ ایک سفرنامہ جو میری آنکھوں نے "سفر" کیا مصنف کے ان پاکستانی دوستوں اور یاروں کی فہرست ہے جنھوں نے موصوف کو دعوتیں دیں۔ پارٹیاں کروائیں۔ گل پوشیاں کروائیں اور ان کے اعزاز میں جلسے اور نشستیں کروائیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تو کسی ہندوستانی ادیب کو آج تک انٹرویو ملا نہیں۔ حالانکہ صاحب سفرنامہ نے واپس آکر یہاں افواہ گرم کر دی تھی کہ ان کا انٹرویو ہوا ہے لیکن نشر نہیں کیا گیا۔ بلراج کومل کو پاکستان کا سفرنامہ میں امرتسر تک گندی نالیوں کی بدبوئیں آئیں لیکن لاہور آتے ہی یہ بدبوئیں خوشبوؤں میں بدل گئیں۔ علی گڑھ اور جامعہ کے لوگوں کی ناکیں کچھ اپنی وضع کی ہیں۔ بہرحال ان سفرناموں کو ریلوے کے ٹائم ٹیبلوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ ٹائم ٹیبل تو پھر بھی سفر کے لئے ایک کار آمد چیز ہے۔ ان سفرناموں میں لوگ غائب ہیں۔ عوام غائب ہیں۔ کشمکش غائب ہے۔ تہذیب و تمدن اور معاشرت غائب ہے۔ اور پھر ان مقامات کا ماحول غائب ہے۔ لوگوں کے احساسات غائب ہیں۔ ان کی قدریں غائب ہیں۔ یہ سفرنامے نہیں صفرنامے ہیں۔ ریاضی میں تو صفر بھی بہت بڑی چیز ہے۔ ادب میں صفر سے نیچے کچھ بھی نہیں۔ صفر کا بلب بھی کچھ روشنی دیتا ہے لیکن یہ صفرنامے صرف تیرگی پھیلاتے ہیں۔

سنتوش کمار کشمیری ہیں لیکن پنجابی لہجے کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ روزنامہ "پرتاپ" کے نیوز ایڈیٹر اور خبر کے لئے ان کی ناک ساری دلی میں مشہور ہے۔

ویسے تو یہ سفرنامے پرتاپ ۱۹۸۱ء کے سنڈے ایڈیشنوں میں قسط وار شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن بہ یک وقت پڑھنے کے لائق ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں اندر کمار گجرال لکھتے ہیں۔

"سنتوش تو پھر بھی واہگہ پار کی نئی دنیا اور یادوں کے کھنڈر دیکھ آئے ہیں۔ میں آج تک نہیں جا سکا۔ کئی بار سوچا ہے کہ اپنے بچوں کو بیر چھائیوں کی دنیا دکھا دوں۔ سنتوش کے سفرنامے کی خوبصورتی صرف جذباتی نہیں۔ انھوں نے آج کی سیاست اور سماجی الجھنوں اور کشمکش کو نازک حس کے ساتھ سمو دیا ہے۔ ان کے کردار زندہ بولتے سوچتے لوگ ہیں جو فوجی بوٹوں کی چمک اور کھڑکھڑاہٹ میں عظمت نہیں مجبوری محسوس کرتے ہیں اور دلوں میں لائے

باندھتے ہیں کہ کس طرح تواریخ کے دھارے کو موڑ دیتے ہیں۔

سنتوش کمار نے اپنے سفرنامے میں کچھ بنیادی سوال اٹھائے ہیں۔ وہی گلیاں وہی راستے ہیں لیکن ہر چیز بدلی بدلی نظر آتی ہے۔ لاہور کے لنڈے بیوں والے بازار کا سین ملاحظہ ہو:

"وہ رونق جو پہلے ہوا کرتی تھی وہی اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے کوئی بھگوان داس مال بیچتا تھا اب عبدالرشید بیچ رہا ہے۔ پہلے بے پردہ ہندوانیوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ اب بے پردہ مسلمانیوں کے ٹھٹھ تھے۔ دکاندار پہلے بھی بہن جی کہہ کر عورتوں سے بات کرتے تھے۔ دکاندار اب بھی بہن جی کہہ کر پکار رہے تھے۔ پریم ناتھ کے شوالے کے آگے وچھو والی میں داخل ہوا۔ اب شوالہ کیسا؟

متحدہ ہندوستان کو 'نیا شوالہ' کا سندیش دینے والا اس دنیا سے جاتے جاتے برادرانِ دین کو کچھ ایسا درس دے گیا تھا کہ پرانے شوالے بھی نہ رہے۔"

لاہور بھگوان رام کے بیٹے لو کے نام سے آباد ہوا۔ پاکستان کے آثارِ قدیمہ کا گائیڈ آج بھی ہر سیاح کو لاہور کی تاریخ لو سے شروع کرتا ہے۔ سنتوش کمار پریشان ہے کہ آریہ سماج وچھو والی کے مندر کا کیا ہوا۔ مجھے شاہ کے خیراتی آیورویدک ہسپتال کو اگر یونانی دواخانہ بنا دیا تو اسے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس مندر کو چھوتی ہوئی چھوٹی سی نہر جو لاہور شہر کے کچھ دروازوں کے باہر سبزہ زاروں کو سیراب کرتی تھی وہ تو بند نہیں ہونی چاہیے تھی۔

"نہ جانے کیوں بند کر دی گئی ہے۔ بچے سارا دن نہایا کرتے تھے۔ لوہاری دروازے کے باہر والی مسجد کے نمازی اس کے پانی سے وضو کرتے تھے اور جب کبھی میونسپل نل بند ہوتے تھے تو بھائی منوہر لال کے مندر کی مورتیوں کو اسی کے پانی سے اشنان کرایا جاتا تھا۔"

لاہور میں سنتوش کمار کئی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ ایک عجیب ٹھوکر جو اس نے فاطمہ میڈیکل کالج کے سامنے کھائی پیش ہے۔

"جب خیالی صاحب نے کہا کہ یہ دیکھئے بائیں طرف فاطمہ میڈیکل کالج ہے تو ایک دم میری زبان سے نکل گیا۔ یہ وہی تو ہے جو پہلے مالک رام میڈیکل کالج تھا۔ جہاں تقسیم سے پہلے میں نے فساد کے زخمیوں کے لئے پہلی بار خون دیا تھا۔ پہلے ہال وہی ہے۔ پھر چیرنگ کراس تھانہ کے آگے سے مال روڈ کچھ پار کرتے اسمبلی ہال پر نظر پڑی۔ اس پنجاب اسمبلی کی کارروائی رپورٹ کرنے کچھ دن مجھے بھی جانا پڑا تھا۔ تب ائیر کنڈیشنگ کا طریقہ معلوم نہ تھا۔ ہال کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تہ خانے میں برف کی سلیں ڈالی جاتی تھیں۔ غیروں کے راج میں بھی کیسی کھل کر بحث ہوتی تھی۔ ایک طرف "ہے ڈیڑھ فٹ کا کمرہ قومی نشاں ہمارا" پر فخر کرنے والے یونینسٹ اور دار و رسن کی آزمائش سے گزرنے والے گاندھی ٹوپی والے اور نیلی پگڑیوں والے دوسری طرف "خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا" فخریہ گانے والے جناحی کیپ پہنے اب اپنے ہی راج میں اس اسمبلی کے باہر ایک بورڈ پر "مارشل لا زون اے" پڑھ کر بہت دکھی ہوا۔ بوک سنگین جمہوری ادارہ ختم۔ محض عمارت کی حفاظت کے لئے سنگینیں تانے بندوقچی تعینات تھے۔" بقول ایک پاکستانی ان کی فوج کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے ہی ملک کو فتح کر رکھا ہے۔

سارے پاسے ہو یاں ای ہو یاں
پاکستان وچ فوجاں ای فوجاں

سنتوش کمار کی اُستاد دامن سے ملاقات جہاں اعلیٰ نثر کا نمونہ ہے وہاں ہند پاک دوستی کے لئے مشعلِ راہ بھی ہے۔ استاد نے بوڑھی عمر میں گیتا پڑھنے کے لئے سنسکرت پڑھی۔ اُستاد جس کی کوٹھڑی ایک غار کے مانند ہے جہاں جو ہے اُستاد کا دم بھرتے ہیں آج گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

"گیارہ بج چکے تھے اور ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اُستاد سے اجازت لے کر انھیں آرام کرنے دیا جائے۔ اُٹھنے لگا تو بولے۔ کل دوپہر آ جانا۔ مل کر کھانا بنائیں گے اور مل کر کھائیں گے۔"

اُستاد کے یہ الفاظ پچھلے چھتیس سال کا المیہ ہے۔

سنتوش کمار پھر ایک بار نو گزے کی قبر سے گزرتے ہوئے پانی والے تالاب کو پار کر کے کوچہ "اورنگزیب" کا بورڈ پڑھ کر بے ساختہ پکار اٹھتا ہے "یہ تو کوچہ کالی ماتا ہوا کرتا تھا"

آخر ان دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ کالی ماتا ہو یا اورنگ زیب" ایک ساتھی نے جواب دیا۔ اور پھر یہاں تو ایک کالی ماتا کا مندر ہوا کرتا تھا۔ سنتوش کمار نے یہ جاننے کی ضرورت نہ سمجھی کہ کالی ماتا اور ان کے شیر کہاں غارت ہوئے؟

سنتوش کمار کا انکشاف ہے کہ لاہور میں پشو پالنے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف "مشرق" اخبار کے رپورٹر عمر سلیم کی زبانی سُنئے۔

"عام اجازت تو نہیں ہے لیکن مجھے خاص اجازت مل گئی تھی۔ گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل سوار خان عہدے سے ریٹائر ہو کر جا رہے تھے تو ایک روز مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ عمر میرے لائق کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ میں نے کہہ دیا کہ خدا نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ فقط ایک کمی ہے۔ مجھے گائے بھینس پالنے کا شوق ہے اس کی اجازت مل جائے تو کوئی کمی نہ رہے۔ انھوں نے اپنے خاص اختیار سے مجھے پشو پالنے کی اجازت دے دی۔ بس سارے شہر میں یہی ایک پشو سمجھئے۔"

نہ بت کدوں میں چراغاں نہ میکدوں میں ہجوم
تمام شہر مسلمان ہے دیکھئے کیا ہوگا

سنتوش کمار کی کتاب پڑھ کر مجھے بار بار سعادت حسن منٹو یاد آتا ہے جس نے پاکستان کی نو عمری میں کئی اہم سوالات اُٹھائے تھے۔ کم از کم ان سوالات کا جواب کسی ہندوستانی سفرناموں سے نہیں ملے۔ ان کو تو پاکستان میں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ حالانکہ ان میں سے ایک ساون کا اندھا نہیں ہے۔ کچھ روز پہلے دلی میں یوم اقبال پر ایک صاحب نے تو اقبال کو ٹیگور سے بھی عظیم کہہ ڈالا۔ دوسرے حلقہ بگوش نے کہا کہ کیا ہوا اقبال پاکستان کا بانی ہے تو۔ ہمارا

بھی تو ستاہے۔ آخر اور "سارے جہاں سے اچھا" گیت دینے والا اقبال ہی تو تھا۔ یہ ٹکنشن کہاں ہوا اور کون کون لوگ وہاں ہونے یہ جان کر پڑھنے والوں کو کافی تکلیف ہوگی۔ خیر جانے دیجئے ان کے اپنے ادیب کی زبانی کچھ سوالات سُنئے۔ میں پھر "زحمت مہر درخشاں" کا ایک تراشا پیش کر رہا ہوں:

"طبیعت میں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ لکھوں۔ لیکن جب لکھنے بیٹھا تو دماغ کو منتشر پایا۔ کوشش کے باوجود ہندوستان کو پاکستان اور پاکستان کو ہندوستان سے علیحدہ نہ کر سکا۔ بار بار یہ الجھن پیدا کرنے والا سوال گونجتا۔ کیا پاکستان کا ادب علیحدہ ہوگا۔ اگر ہوگا تو کیسے ہوگا۔ وہ سب کچھ جو سالم ہندوستان میں لکھا گیا ہے اس کا مالک کون ہوگا۔ کیا اس کو بھی تقسیم کیا جائے گا۔ کیا ہندوستان اور پاکستان کے بنیادی مسائل ایک جیسے نہیں۔ کیا اُدھر اردو بالکل ناپید ہو جائے گی۔ یہاں پاکستان میں اور کیا شکل اختیار کرے گی۔ کیا ہماری اسٹیٹ مذہبی اسٹیٹ ہے؟ اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت میں وفادار رہیں گے مگر کیا ہمیں حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہوگی؟ آزاد ہو کر کیا یہاں کے حالات فرنگی عہد حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے؟

پچھلے ۳۴ سالوں میں اردو کے درجنوں ادیب پاکستان کی مہمان نوازیاں کھا کے آئے ہیں۔ اپنے ساتھ کتابوں کے ٹرنک لائے ہیں کئی ادیبوں نے انھیں یہاں بیچے ہیں۔ کسی نے منٹو کے سوالات کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ ان سوالات کا جواب سنتوش نے نہایت بے باکی سے دیا ہے۔ اردو کے ہر اس ادیب کو جسے پاکستان سے دعوت نامے آتے ہیں میری درخواست ہے کہ جانے سے پہلے سنتوش کمار کا "لاہور نامہ" پڑھ لے۔ خاص طور پر اس ہندو عورت جگ مائی کا قصہ جس نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد اپنے جوان بیٹے کے انتظار میں لاہور چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ جب ۱۹۴۷ء کی دیوالی آئی تو صرف اس کے گھر میں دیئے جلے۔ خود ہی مٹھائی بنائی اور خود ہی محلے والوں میں بانٹتی پھری۔ پھر یہ ہوا کہ کسی کے گھر کوئی بیمار پڑا تو فوراً اس کے ہاں تیمارداری کے لیے پہنچ گئی۔ نہ جانے اس کے قدموں میں کیسی سچائی تھی کہ جس گھر میں قدم پڑے دلی مرادیں پوری ہونے لگیں۔ اور پھر جب اس کی شہرت اور خلوص سارے لاہور میں پھیل گیا تو جگ مائی کہلانے لگی۔ لیکن اس کا بیٹا واپس نہ لوٹا۔ آخر ۱۹۶۲ء میں یعنی پندرہ سال بعد وہ مر گئی۔ باقی سنتوش صاحب کی زبانی سُنئے۔

"محلے والوں نے اکٹھے ہو کر فیصلہ کیا کہ میت کو نہایت احترام کے ساتھ قبرستان لے جا کر دفن کر دیا جائے۔ اس شہر قدیم سے کافروں کے نکل جانے کے بعد قدیم شمشان مرامو کا باغ بند ہو چکا تھا۔ ڈولا لانے کے لئے ایک محلے دار مسجد پہنچا تو فرشتہ سیرت مولوی صاحب پوچھ بیٹھے کہ موت کس کے ہاں ہوئی ہے۔ بتانے پر کہ وہ ہندو بڑھیا چل بسی ہے اسے لے جانا ہے مولوی صاحب خود کوچہ میں آ گئے۔ اور سب کو اکٹھا کر کے بولے۔ دیکھو وہ اب مر چکی ہے اسے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اس کی لاش کیسے ٹھکانے لگتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ آخری دم تک ہندو رہی تھی اور ہمارے ایمان کا تقاضہ ہے کہ اس کی آخری رسوم بھی ہندو رواج کے مطابق ادا کی جائیں۔ مولوی صاحب کی بات لوگوں کی سمجھ میں آ گئی۔ ہندو قاعدے کے مطابق اس کی ارتھی اٹھائی گئی۔ کندھا دینے والے "رام نام ست ہے" پکارتے ہوئے اسے راوی کے کنارے لے گئے۔ محلے والوں نے چتا روشن کی اور پھر تیسرے دن اس کی سر دراکھ دریا برد کی۔"

شائد سارے سفرنامے کا لب لباب یہ ہے کہ جگ مائی کا بیٹا واپس لاہور کب لوٹے گا۔

بقول فیض

حلقہ کئے بیٹھے رہو اس شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

●●

بقیہ صارفی سماج اور ادب کے چند مسائل

صارفی سماج ہمیں یوں دیکھنے میں آزاد نظر آتا ہے۔ لیکن ہمیں مظہر [illegible] اور حقیقت ([illegible]) میں فرق کرنے کی ضرورت ہے صارفی سماج حقیقت میں [illegible] تحکمانہ تہذیب کا نتیجہ ہوتا ہے اور تحکمانہ تہذیب میں حقیقی آزادی کے پنپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقی آزادی کے سوتے دراصل انسان کے داخلی وجود سے پھوٹتے ہیں۔ صارفی سماج میں آزادی مختلف اشیا کے درمیان انتخاب کرنے تک محدود ہوتی ہے۔ موجود کی نفی کرنے کی آزادی صارفی سماج نہیں دیتا ادب کو جبری تہذیب [illegible] ([illegible]) کی فضا راس نہیں آتی نہ ہی ادب کسی طرح [illegible] ضرورتوں کو حقیقی ضرورتیں قرار دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔

متبادل نظام کو قائم کرنے کی آزادی موجود سے ماورا جا کر ہی حاصل ہو سکتی ہے اس کے بغیر آزادی کا تصور ہی بے معنی رہتا ہے۔ موجود سے انکار آزادی کی ایک انتہا ہے اور موجود کو بدلنے کے لیے مسلسل جدوجہد اس کی دوسری انتہا لیکن صارفی سماج میں موجود کی مختلف تعبیریں کرنے کو ہی حقیقی آزادی سمجھ لیا جاتا ہے۔ موجود کو بدلنے کی سعی کو وہی ادب فروغ دے سکتا ہے جو صارفانہ سماج کے فریب میں نہ آئے۔ اور انکار کرنے کی جرأت ہی حقیقی آزادی کے امکانات کا پہلا قدم ہے۔ تمنا کا دوسرا قدم موجود سے انکار کے پرے ہی ہوتا ہے۔

●●

نغمۂ بیداری

(گائتری کا ترجمہ)

اے مالکِ کون و مکاں　جلوہ گرِ حسنِ ازل　لا ابتدا۔ لا انتہا　اے لاشریک و لم یزل
اے آفتابِ آگہی　تو ہے محیطِ بیکراں　ہر جا ترا ہے دبدبہ　ہر سُو ترا سکّہ رواں
فرماں روائے بحر و بر　اے قیصرِ دشت و جبل　تو بے نظیر و بے بدل　تو ہے اجل کی بھی اجل
تو ہے حفیظ و محترم　سرچشمۂ انوار تو　مستِ ازل مشکل کشا　صبر و سکوں آثار تو
تو ہے روانِ زندگی　اے ذوالجلال و ذی حشم　تو منبعِ جود و کرم　تو دافعِ رنج و الم
ہے درد کا درماں بھی　تسکیں کا ساماں بھی تو　اس بزمِ ہست و بود میں　پیدا بھی تو پنہاں بھی تو
تو ہی ہے معبودِ جہاں　تو ہی تو ہے مسجودِ جہاں　تو ہی لطیف و مدرک و　مسرور و مطلق بے گماں
تو خالقِ ارض و سما　آئینۂ صدق و صفا　تجھ سے ہے قائم سلسلہ　ہر دم حیات و مرگ کا
عالم میں ہے تیری نمو　تجھ میں ہے عالم کی نمو　تیری ضیا ہے کُو بکُو　تیری تجلی چار سُو
تو خالقِ برق و شرر　تو سوز ساز زندگی　ہے ذرے ذرے سے عیاں　تیری ادائے دل بری
تو ہے محرک بے گماں　جذباتِ خوش انجام کا　ہر سمت ہی کونین میں　شہرا ہے تیرے نام کا
تو افضل و اعلیٰ تریں　عقدہ کشا بالا تریں　تجھ سا نہیں کوئی حسیں　تو حاصلِ دنیا و دیں
واقف دُرِ اسرارِ کُل　بخشندۂ سوزِ دروں　اے منزلِ اہلِ نظر　تو پاک اطہر پُر سکوں
روشن تجلی سے تیری　یہ مہر و ماہ کی انجمن　آلام و عصیاں سوز ہے　تیری ضیائے ذوالمنن
تو معدنِ علم و ہنر　تو نور کی برسات ہے　ابرِ کرم بحرِ صفا　گنجینۂ برکات ہے
اے مرشدِ اعظم تری　عظمت پہ ہم قرباں ہیں　تیرے جلال و جاہ کا　باطن میں کرتے دھیان ہیں
یا رب رہیں ہم گامزن　ہر آن راہِ نیک پر　تو ہو ہمارا رہنما　تو ہو ہمارا راہبر
اے قاسمِ الفضل جہاں　دل کا اندھیرا دور ہو　وا دیدۂ بینا رہے　چشمِ خرد پُر نور ہو
اے ذاتِ باری کر عطا　نورِ یقیں عقلِ رسا　بس یہ دعا یہ مدعا　ہم کو ملے فہم و ذکا
حسِ بصیرت کو مرے　سب صاف کر دو ہوا　ہم خوابِ غفلت سے جگیں　بیدار ہوں بیدار ہوں

بیدار سرسی

اعلان

(فسادات پر ایک نظم)

مسجدوں مندروں کی دنیا میں
مجھ کو پہچانتے کہاں ہیں لوگ
روز میں چاند بن کے آتا ہوں
دن میں سورج سا جگمگاتا ہوں
کھنکھناتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں
میں ہی مزدور کے پسینے میں
میں ہی برسات کے مہینے میں
میری تصویر آنکھ کا آنسو
میری تحریر جسم کا جادو
مسجدوں مندروں کی دنیا میں
مجھ کو پہچانتے نہیں جب لوگ
میں!
زمینوں کو بے ضیاء کر کے
آسمانوں میں لوٹ جاتا ہوں
میں!
خدا بن کے قہر ڈھاتا ہوں

ندا فاضلی

چہرہ

گرجتے سمندر کی لہروں میں جھانکو،
اُدھر نیل آکاش کے گنبدوں کو نظر سے کھنگالو،
ندی کی سبکدوش، چنچل ردا پر
مچلتی ہوئی جھاگ کے آگے پیچھے سرکتے ہوئے بُلبلوں کو نہارو"
سوالوں کے انداز میں مسکرا کر وہ بولی۔
"بتاؤ کہ کیا دیکھتے ہو؟"
"مجھے تو مناظر کی آوارگی میں
نظر آرہا ہے
فقط ایک چہرہ، تمہارا ہی چہرہ۔
نظر بُلبلوں کی قبا سے گزر کر
چھلکتے ہوئے بادلوں تک گئی ہے
تو دیکھا ہے پھر بھی
فقط ایک چہرہ، تمہارا ہی چہرہ۔
تمہاری بکھرتی ہنسی بھی یقیناً
وہ ہالہ ہے جس میں، سراپا اُبھرتا نظر آرہا ہے۔
فقط ایک چہرہ
تمہارا ہی چہرہ
تمہارا ہی چہرہ!"

سبرامینا بھارتی
مترجم رام پرکاش راہی

محبوبہ

مَیں نظر ہی نظر
تو نظر کا بھرم۔۔ روشنی روشنی
میں وہی دست بے تاب
جس کے لئے تُو وہی پردۂ ساز میں حسن کا ساز ہے
اک جھلک دیکھ لوں جب تری میں کہیں
میرے احساس میں
خود مری زندگی مسکراتی ہے

میں ہوں طاؤس، تو ابر باراں تمام
تو مئے ناب ہے، میں سراپا سبو
مَیں سمندر ترا، تو مرا ماہِ کامل
میں ترا گیت، تو گیت کی نرم لے
مَیں کلی، تو کلی کی سہانی مہک
مَیں فقط لفظ و جملہ کی ترکیب کا ایک روپ
تُو معانی کی رُوح
تو نہیں تو مری ابتدا، انتہا، !
بے صدا، بے زباں۔۔۔۔
ایک عجزِ بیاں۔

سُبرامینا بھارتی
متر، رام پرکاش راہی

زندگی کا موسم

میرے پڑوسی کچھ دنوں سے
پھولوں سے بھرے ہوئے
پردے
دروازے کھڑکیوں پر
لٹکانے لگے ہیں
ٹیوب کی دودھیا روشنی کے اندر
پھول اور بھی کھل اٹھتے ہیں
ہوا رنگ کو چوم لیتی ہے
ایسے میں
میری بیوی ضد کرتی ہے
ہم بھی اپنے
دروازے کھڑکیوں میں
پردوں پر پھول کھلائیں،
میں اسے ٹال رہا ہو
کیسے سمجھاؤں
یہ بیچارے پڑوسی
ہمارے گملوں سے مایوس ہوکر
پردوں پر پھول کھلاتے ہیں
مگر ——
ہمارے گملوں پر
پھولوں کے موسم میں
کھِلنے والی زندگی ہے!

جگندر رام
نیتا جوگن

مرثیہ

شاید بھیڑیا آگیا ہے
سبھی دروازے بند ہو گئے ہیں
اور سڑکوں پر کالے حرفوں میں لکھا ہے
سناٹا — بھیانک سناٹا — اور موت!
ایسے میں کوئی چیختا ہے
روشنی! روشنی!
مگر پولیس کے جوتے کی آواز
اور کانپتا اندھیرا!

شہر آشوب

انگلیوں سے نتھنوں کو دبائے

چل رہا ہوں میں
اس بستی کی مٹی
ہمارے اندر چپک گئی ہے
پاس کے اور دور کے لوگ
مجھ سے بچ کر
بھاگ رہے ہیں!

مناظر عاشق ہرگانوی

خوابوں کی موت
(یاسر عرفات کے نام)

میرے تصور میں بسی اس لڑکی کی تصویر
اس بے زبان کبوتر سے بہت ملتی ہے
جو ڈر خوف کی ایک تصویر ہے
سفید بے داغ کپڑوں میں لپٹی
گھنے آبنوسی بالوں کو کھولے
حسن تقدس سے مجھے دیکھتی رہتی ہے

اس گھڑی
وہ — غیر واضح، بہت مبہم سی لگتی ہے ۔

پچھلی شب
اس ملک کے کبوتر نے
اس کے دہکتے ہوئے جسم سے
یکے بعد دیگرے اترنے لگے
اس کے ہونٹوں پہ عجب ساحرانہ ہنسی تھی
اپنی فاتحانہ ہنسی پہ یوں گم ہوگئی تھی
اُسے اپنے گرد و پیش کی نہ کوئی خبر تھی
کہ کوئی آج کی رات عمر کی جو بیسویں منزل پر کھڑا
اس کے بے داغ جسم کو کیسی نگاہوں سے دیکھتا ہے؟

کبوتر کی اس سادگی نے مجھ میں ہلچل پیدا کی
آنکھوں کی نیند
دل کا سکون چھین کر
فضا میں بہت دور اڑ سا گیا
اطراف سے خالی شرارت پہ میں
کبوتر کے جھنجھلا گیا
میری اس نباہی سے وہ بے خبر
حالات کے مقتل کو اڑوں کی کنگھی لئے
سفر کے تسلسل میں کھو سا گیا
وہ اڑتا رہا اور اڑتا رہا
جانے اڑ کر کہاں کھو گیا — ؟

اے کاش!
کبھی مجھ کو واپس ملے
منتشر خوابوں کی تعبیر
جو فضا کے دھندلکوں میں کہیں کھو گئے
کاش ایسا بھی ہو!!
کبوتر کے بھٹکے ہوئے غول جیسے
اپنے آشیاں میں لوٹ آئیں
فضا میں بھٹکتا، بکھرا وہ منظر
وہ نگاہیں، وہ لمحات، وہ تصویر
واپس ملے
کاش! ایسا بھی ہو!!

تصنیف۔ ڈیوڈ جے۔ دیودار
ترجمہ: سلطان احمد ساحل

زہر تنہائی

شب کی انگڑائی
وحشتوں میں اسیر
ہر طرف جیسے گہرا سناٹا
وادیٔ رگ میں خون کی یورش

سر دبستر پہ پی رہا ہوں میں
زندگانی کا زہر تنہائی!

موسم سرما

ٹھٹھرتے بدن
منجمد خون
لڑکھڑاتے قدم
پھر بھی ہیں
گرم رفتار
اپنی منزل کی جانب
کیونکہ وہ منتظر ہوگی!

شوکت صبا کیفی

خلا

بند سب ذہن کے دریچے ہیں

شجر وجود کا
بے برگ و ثمر

نہ سوچ، نہ آرزو، نہ خیال
نہ طرب، نہ الم، نہ ملال
کہیں کچھ بھی نہیں
دست احساس پہ سناٹوں کا رقص طاری ہے
تپتے صحراؤں میں بگولوں کا سفر جاری ہے

اسلم پرویز
۳۰ر جنوری ۱۹۸۴ء

ڈاکٹر محمد یعقوب عامر کی چھ نظمیں

حرفِ دل

شعر کہنے کے لئے
موزوں طبع ہونا ضروری ہے
مگر دل کی بات
کہنے کے لئے
موزوں طبع ہونا ضروری نہیں

ایک رات

ایک رات ایسی بھی گزری ہے۔
جب مکمل تنہائی تھی
دروازہ مقفل تھا۔
اور وہ ہوس سے مغلوب ہو چکی تھی
میرا جسم گرم توے کی طرح جل رہا تھا۔
اور اس کی بانہوں کی جکڑ
مضبوط ہو رہی تھی
مگر میں — میرا ذہن — میری روح
اس سے بہت دور تھی۔

★ ★ ★

ایک رات ایسی بھی گزری ہے
جب مکمل تنہائی تھی
آنگن میں
چاندنی چھٹکی ہوئی تھی
اور وہ میرے قریب بیٹھی ہوئی
خاموش نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی
اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھے
اُس کا چہرہ، میری آنکھوں کے قریب تر تھا۔
اُس کے جسم کی نرمی، میرے لمس کو گویا گدگدا رہی تھی
فضا میں، ہر طرف آسودگی تھی
اُس کی گفتگو کی حلاوت
میرے احساس کی وادی سے گزر کر
میرے دل میں سمائی جا رہی تھی
وہ ہنس ہنس کر
بار بار
اپنی پُرسکوں پلکوں کو گرا لیتی تھی
وہ میرے جسم میں اُتر رہی تھی
مگر میری روح۔ اُس کو ڈھونڈ رہی تھی
اور میری چاہت
اِن قربتوں میں بھی
میرے بدن کے ہر ذرّے سے
اُس کو پکار رہی تھی۔

بچّوں کا فخر

مجھے یقین ہے
دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت
بڑی سے بڑی عزت
بڑی سے بڑی شہرت
مجھے خاک کا ڈھیر ہونے سے بچا سکے گی
اور اس وقت
نہ میری دولت میرے کام آئے گی
اور نہ میری نام آوری
مجھے کوئی فائدہ پہنچا سکے گی
مگر ہاں، ایک خیال
میری روح کو جِلا بخش دیتا ہے
اور میری تمام توانیاں
میرا عزم و حوصلہ بن کر
مجھے زندگی سے سرشار کر دیتی ہیں
جب سوچتا ہوں
کہ کسی ایسی جگہ
جہاں بہت سے بچّے اکٹھے ہوں
اور وہ سب آپس میں
اپنے آبا و اجداد کا نام لے کر
اُن کے کارناموں کا ذکر کر رہے ہوں
کہیں اس وقت
میرے بچّے
میرا نام لے کر
چپ نہ ہو جائیں

اصرار

شام گہری ہو گئی
ہر مخلوق کی طرح
اب میں بھی گھر جانا چاہتا ہوں
مگر برگد کے نیچے کا
وہ پتھر کہتا ہے
کیا مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے

خدایا

خدایا — مجھے تیرے وجود سے انکار نہ
مگر یہ خیال ضرور آتا ہے
کہ اگر تو کہیں موجود ہوتا
تو اُس دن ضرور آتا
جس دن میں نے تجھے
بے چارگی کے عالم میں پکارا تھا

کبھی کبھی

مجھے معلوم ہے
اب وہ واپس نہ آئے گی
پھر بھی
میں کبھی کبھی اسٹیشن پر پہنچ جاتا ہوں
اور پلیٹ فارم کے
آخری مسافر کے ساتھ
واپس لوٹتا ہوں
مجھے معلوم ہے
اب وہ کبھی خط نہ لکھے گی
مگر پھر بھی
کبھی کبھی میں پوسٹ آفس پہنچ جاتا ہوں
اور آخری ڈاک دیکھ کر
واپس لوٹتا ہوں

غزلیں

ہر مسافر ہے تھکن سے چور، خالی
نقشِ پا گم، راستے مجبور، خالی
چہرہ چہرہ، کربِ خال و خط مسلسل
سینہ سینہ، زخم کے انگور خالی
صف بصف خوابوں کے زنداں و جگر
اور آنکھوں کے سفالِ نور خالی
تھا جہاں ہیں اب وہاں [illegible]
عرشِ لامکاں، دور سے تا دور خالی
کھوٹے سکے کی طرح بازار کے بیچ
جیب میں لے کر پھرے مقدور خالی
شہر میں اب کے پڑا قحطِ حرف ایسا
سب ہوئے مصرعہ، قلم، منشور خالی
برف کرنے لگ گئیں ہیں لو کی شدت
جل رہے ہیں دھوپ کے تنور خالی
زیب دے، اشخاص ذہنوں کی تقسیم
اور پھر بھی کاسۂ جمہور خالی
کون دے کس کو سزا، مجرم ہیں منصف
سولیاں فارغ ہوئیں، منصور خالی
ڈھونڈ اپنا اب فضا خود گھر کے دیکھو
ہم کہ ہو جاتے شنیدہ مستور خالی
خسروِ تحت اللفظ پڑھتے ہوں غزلیں
ہر سماعت جائے گی بے طنبور خالی

اب کوئی تہمت نہ لفظوں کی سیاہی پر لگا
میں بھلا آئینہ سے مجھ کو دیوارِ مٹی پر لگا
دائرے حرفِ دگر کے نیم روشن ہیں ابھی
لے، ذرا میرے قلم کا خون انگلی پر لگا
کس کے قابو میں رہی وہ سرپھری چنچل ہوا
زور سب کا بس اسی لاچار مٹی پر لگا
زندگی بھی اک سفر ہے گہرے پانی کی طرف
اس سمندر میں ہوا کا پہرہ کشتی پر لگا
رات پہلے بھی کھلی تھی تیرے اقبال کا دریچہ، اب بھی ہے
فائدہ ہی کیا، جو کرفیو دن کا، بستی پر لگا
کیا ضروری، رائگاں ہی جائیں سب کی دستکیں
تو بھی اک آواز اب دہلیزِ ہستی پر لگا
آسماں خالی پڑا کیا کمندیں پھینکنا
بات تو جب ہے، نشانہ اڑتے پنچھی پر لگا
جھیل سی وہ نیلی آنکھیں بھی چپ رہنے لگیں
آئینے کی بھی شرارت، داغ پانی پر لگا
چاہیے اس دور کے قاری کو دیباچہ نیا
شاہ سرخی کوئی اور، اپنی کہانی پر لگا
یوں ہی رفتہ رفتہ تجھ میں پختہ کاری آ گئی
تو حساب اپنا، کسی بچے کی تختی پر لگا
دوسروں کے آسماں سے کیا تجھے لینا فضا
ہے لگانا جست، تو اپنی بلندی پر لگا

مجھے اسے کہ صلہ خوش نگاہیوں کا ملا
جو داغ تجھ کو قلم کی سیاہیوں کا ملا
نہ پوچھ! ہم جو سمندر کھنگال کر نکلے
صدف صدف، وہی منظر تباہیوں کا ملا
تمام جرم مرے نام لکھ دیئے اس نے
یہ فائدہ مجھے جھوٹی گواہیوں کا ملا
تمام عمر کٹی، منصفانِ شہر کے بیچ
نہ موقع پھر بھی ہمیں عذر خواہیوں کا ملا
اک امتحاں ہے فرشتوں کے درمیاں رہنا
مجھے عذاب یہ کن بے گناہیوں کا ملا
مری قلندری، میزانِ وقت ہے پھر بھی
خراج کب تری عالم پناہیوں کا ملا
وہ مدح خوانوں سے اپنے بہت خوش تھا
اک آئینہ تو اسے کم نگاہیوں کا ملا
مرے انا کی جبیں پہ تھی گرد ہی کتنی
مگر سراغ تو زرّیں کلاہیوں کا ملا
فضا کو مصلحتوں سے غرض نہیں کہ اسے
قلم ادیب کا، تیور سپاہیوں کا ملا

• • •

ہیں رقص میں یہ لفظوں کے طاؤس کس لئے
ہم تم ہیں اس طلسم میں محبوس کس لئے
اتنی مہیب رات تو کاٹی ہے بے چراغ
آنگن میں اب یہ دیپ کے فانوس کس لئے
میں آج بھی ہوں اپنی روایت سے مطمئن
یہ لوگ تجربوں سے ہیں مایوس کس لئے
ہر آگہی، بہ حلقۂ آغوشِ جہل کیوں
ہر ارتقا، بہ صیغۂ معکوس کس لئے
آئینہ خانہ شوخیِ آبِ رواں کا تھا
میرے لئے سراب کے ملبوس کس لئے
دونوں ہیں خاک خاک، وہ خوشبو ہو یا کہ رنگ
لیکن دکھ ان کا ہم کریں محسوس کس لئے
رکھتے اگر الگ بھی یہ اپنی ذرا شناخت
دریا، سمندروں سے ہیں مانوس کس لئے
آؤ اسی میں ڈھونڈیں لغت لفظ کا سراغ
اپنی جگہ وہ شخص ہے قاموس کس لئے
میری زباں پہ ہیں فضا جب اسی کے حرف
یہ امتیازِ قدسی و قدوس کس لئے

۳۰ جنوری ۱۹۸۴ء

فضا ابن فیضی

غزلیں

اے طالبِ نظارہ کس سوچ میں ڈوبا ہے
آنکھیں بھی اسی کی ہیں جلوہ بھی اسی کا ہے
ماضی کے اندھیروں سے نکلا ہوں تو دیکھا ہے
ہر روز کے ہاتھوں میں آئینہ فردا ہے
اس شہر میں رہتے ہیں قاتل بھی لٹیرے بھی
لیکن میری نظروں میں ہر شخص فرشتہ ہے
اس راہ سے پہلے بھی گذرے ہیں یقیناً ہم
جو کچھ نظر آتا ہے دیکھا ہوا لگتا ہے
پالا ہے چمنؔ مجھ کو سورج کی شعاعوں نے
گنجان درختوں کا سایہ مجھے ڈستا ہے

ڈی آر چمنؔ دینانگری

یارب الم کو ذہن سے اپنے اتار دے
اس مختصر حیات کو ہنس کر گذار دے
میں نے بھی آرزوؤں کے پودے لگائے ہیں
یارب مرے چمن کو بھی فصلِ بہار دے
میں اپنا کہہ سکوں تجھے دنیا کے سامنے
اے میرے ہم نشیں یہ مجھے اختیار دے
تیرے لئے جیوں تو مروں بھی ترے لئے
توفیق وہ مجھے مرے پروردگار دے
غم سے نڈھال شخص کی ہمت بڑھایئے
منزل سے پیشتر کہیں ہمت نہ ہار دے
اے سیفؔ یا ہے خدا سے شب و روز یہ دعا
جو مضطرب ہیں ان کے دلوں کو قرار دے

سیفؔ سحری

بُرا ہو دردِ دل تیرا کہاں تک بات جا پہونچی
گذر کر ضبط کی حد سے فغاں تک بات جا پہونچی
پسِ پردہ صبا بھی گوش بر آواز رہتی ہے
گل و بلبل سے ہو کر باغباں تک بات جا پہونچی
لرز کر گر پڑے تنکے مری شاخِ نشیمن سے
قفس میں ساتھیوں کی آسماں تک بات جا پہونچی
میں سمجھا تھا محبت مشغلہ ہے دل بہلنے کا
بڑی مشکل ہوئی دردِ نہاں تک بات جا پہونچی
ہوا تھا باغباں سے تذکرہ نازش نشیمن کا
نہ جانے کس طرح برقِ تپاں تک بات جا پہونچی

[illegible]

دل میں کسی کا درد چھپائے ہوئے ہیں ہم
اجڑے ہوئے جہاں کو بسائے ہوئے ہیں ہم
اک بے وفا سے آس لگائے ہوئے ہیں ہم
دانستہ کچھ فریب سے کھائے ہوئے ہیں ہم
جو زخم تو نے دل کو دئے پھول بن گئے
پھولوں سے اپنی بزم سجائے ہوئے ہیں ہم
کیا جانے کن خلاؤں میں کھو جائیگی حیات
طوفاں میں اک چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم
راہیں وفا کی ہم سے منور ہیں دوستو!
دشمن کو اپنے دل سے لگائے ہوئے ہیں ہم

چرنؔ جیت سنگھ ایڈوکیٹ

دوہا

جگ کے پالن ہار کا یہ کیسا اُپکار!
جیسے کو ووٹ دئے موت کو یوم ہزار
دوست ہیں دشمن ہیں پھر کیا پسار
اڑتے پتوں کا لگا آندھی میں بازار
ڈھگ ڈھلاں۔ رستہ کٹھن سا اور ہاں تکان
گاڑی کی یہ ری کا بیچ کی لو ہے کا ساساں
منزل کتنی دور ہے کہاں پڑے گی رات
کانپے مرے سوال پر کوچواں کے ہاتھ!!

بھگوانداس اعجازؔ

اُداس ہے دِل

غموں کو اشکوں سے دھو لوں بہت اداس ہے دل
کہیں اندھیرے میں رو لوں بہت اداس ہے دل
کسی میں گا کے بھلاتا ہوں اپنے دل کا دکھ
کبھی خدا کو سناتا ہوں اپنے دل کا دکھ!
یا آنسوؤں میں بہاتا ہوں اپنے دل کا دکھ
مگر جہاں سے چھپاتا ہوں اپنے دل کا دکھ
ستا رہیں ہیں گو لو لوں بہت اُداس ہے دل
کہیں اندھیرے میں رو لوں بہت اداس ہے دل

فزائے شام غریباں ہے دورِ غربت ہے!
یہ دل ہے پہلو میں یا حسرتوں کی تربت ہے
فسردہ دل جیوؤں دنیا میں میری قسمت ہے
خموشی گوشۂ تنہائی اپنی جنت ہے!
خموشیوں سے ہی پالوں بہت اداس ہے دل
کہیں اندھیرے میں رو لوں بہت اداس ہے دل

جو راز غم ہے زباں پر میں لا نہیں سکتا
کسے سناؤں کسی کو سنا نہیں سکتا!
کسی کو کیا میں انہیں بھی بتا نہیں سکتا
جو زخم دل پہ لگا ہے دکھا نہیں سکتا
دبا کے سینے میں سو لوں بہت اداس ہے دل
کہیں اندھیرے میں رو لوں بہت اداس ہے دل

وفورِ درد میں عشق و وفا کو بھول گیا
میں ان کے حسن کی اک اک ادا کو بھول گیا
خدا بچائے مجھے میں خدا کو بھول گیا
خود اپنے آپ کو ارض و سما کو بھول گیا
اداسی میں ڈولوں بہت اداس ہے دل
کہیں اندھیرے میں رو لوں بہت اداس ہے دل

کہیں قرار نہیں بے قرار رہتا ہوں
چھپی سی دل میں لئے اشکبار رہتا ہوں
ستم گزیدہ ہوں آشفتہ کار رہتا ہوں
جہاں بھی رہتا ہوں بے گانہ وار رہتا ہوں
شرابِ غم میں بھگو لوں بہت اداس ہے دل
کہیں اندھیرے میں رو لوں بہت اداس ہے دل

نگاہِ یاس میں دردِ نہاں چھپائے ہوئے
دلِ گداز میں آتش کدے جلائے ہوئے!
غبارِ نفس میں برقِ تپاں بسائے ہوئے
فقط اجل سے امیدِ وفا لگائے ہوئے
یہ تیر دل میں چبھو لوں بہت اداس ہے دل
کہیں اندھیرے میں رو لوں بہت اداس ہے دل

رگھوناتھ گھئی
۳۰ جنوری ۱۹۸۴ء

غزلیں

سچے دل سے مل لینا ہی سب سے بڑی دلداری ہے
رستہ ہاتھ ملانے تک رہنا یہ تو فقط عیاری ہے!
سچ کو جھوٹ عدو کو اپنا مجبوراً ہم کہتے ہیں
شہر میں پل بھر جی لینا بھی ایک بڑی فنکاری ہے
وار پہ وار سہے جانا تو کام ہے ہم دل والوں کا
ہاتھ عدو کے ہاتھ میں دینا اپنے سے غداری ہے
تم تو اسے معصوم سمجھ کر جان نچھاور کر بیٹھے
اسکی زباں سے نکلا ہوا ہر لفظ مگر دو دھاری ہے
خون کی لذت ہم بھی چکھیں گے لاؤ ہمکو خنجر دو
پہلے اس نے وار کیا تھا اب کے ہماری باری ہے
قطرہ قطرہ شبنم شبنم اسکی آنکھوں سے پیکر
جانے کیا پی لی تھی میں نے ابتک نشہ طاری ہے

نور پیکر

تری یاد کے نقش پا بھیڑ میں
کیا روشن ہوئے بار ہا بھیڑ میں
مرا نام میرا پتہ بھیڑ میں
نہ جانے کہاں کھو گیا بھیڑ میں
مری بندگی بے اثر ہو گئی
ہر اک حرف جاں کھو گیا بھیڑ میں
قدم در قدم راہ بھٹکی رہی،
مٹتا رہا فاصلہ بھیڑ میں
ملفظ منور نہ آیات دل سے
ہر اک حرف جاں کھو گیا بھیڑ میں
بھی مڑ کے اپنی طرف دیکھتا
ئی شخص ایسا نہ تھا بھیڑ میں
ئی روز ممکن سا لگتا رہا،
ے کھو کے پھر ڈھونڈھتا بھیڑ میں

پونم شری واستو

کون دل پائے گا دنیا میں مرے دل کی طرح
یہ تو جلتا ہے ہرے بانس کے جنگل کی طرح
گیلی لکڑی کی طرح دل کو جلایا تم نے!
کل تو یوں جاتا اسے آپ نے پیپل کی طرح
جب بھی چاہے مجھے چھن چھن سے بجانے لگتی
میں تو تقدیر کے پیروں میں ہوں پائل کی طرح
اب جدھر چاہے ہوا لے کے چلی جاتی ہے
میری حالت تو ہے برسے ہوئے بادل کی طرح
ہر گھڑی اک نیا ارمان مچلنے لگتا!
دل بھی ہو جیسے کسی گھاس کے جنگل کی طرح
مجھ کو رخسار پہ بکھرا ہوا غازہ نہ سمجھ،
مجھکو آنکھوں میں لگا پھر سے تو کاجل کی طرح
سارے عالم کو میں دامن میں چھپا لوں اپنے
پھیل جاؤں گا کسی دن ترے آنچل کی طرح
یہ ترا جسم ہے خوشبوں کا امڈتا ساگر
اب تو آتی ہے مہک اس سے بھی صندل کی طرح
کوئی منزل ہے نہ پرویز ٹھکانہ کوئی ہے
میں بھٹکتا ہی رہا ہوں کسی پاگل کی طرح

کرشن پرویز

جس کا نہیں جواب کوئی وہ صدا ہوں میں
دشت طلب میں کب سے اکیلا کھڑا ہوں میں
کس کی تلاش ہے مجھے اپنے وجود میں
وہ کون کھو گیا ہے جسے ڈھونڈھتا ہوں میں
یہ میں نے کب کہا ہے کہ ٹھہرو۔ مگر سنو
دیکھو کبھی تو مڑ کے کہاں رہ گیا ہوں میں
ہے کس کا انتظار تجھے راہ رفتگاں
تیری حدوں سے دور بہت آ چکا ہوں میں
مدت کے بعد لوٹ کے گھر آئے بھی تو کیا
اب سوچنے لگا ہوں کوئی دوسرا ہوں میں

اقبال انجم

تری کتاب میں سوکھا گلاب رکھا ہے
بہت سنبھال کے ہم نے یہ خواب رکھا ہے
یہ زندگی کی عنایت ہے اس نے میرے لئے
ہر ایک موڑ پہ تازہ عذاب رکھا ہے
وہی سفر ہے وہی تذکرے ہیں باتوں میں
سروں پہ اپنے وہی آفتاب رکھا ہے
ہم اپنے آپکو معنی نہ دے سکے کوئی!
ہمیں تو وقت نے مثل حباب رکھا ہے
یہ اہتمام ہے بستی کا میری آمد پہ
قدم قدم پہ چراغ عتاب رکھا ہے

شرون کمار ورما

اب خوف مرگ کا بھی کسی پہ اثر کہاں
حرص و ہوا سے پاک ہوا ایسا بشر کہاں
میں ڈھونڈھتا ہوں چاند ستاروں میں زندگی
کیا ہے مرا وجود، مجھے یہ خبر کہاں
ہر شے تھی جسکے واسطے حیرت سرائے حسن
یارب وہ کھو گئی مری پہلی نظر کہاں
جس نے ازل سے غم میں گذاری ہو زندگی
ہوگا فریب شوق کا اس پہ اثر کہاں
میرا وجود وجہ تجلیٔ آفتاب ہے
میرا نہ ہو ظہور تو شمس و قمر کہاں!
سننے کے واسطے اسے اک عمر چاہیئے،!
روداد حسن و عشق بھلا مختصر کہاں،
سینے میں کچھ دھڑکتا ہے اتنا ضرور ہے،
پہلو میں میرے دل بھی ہوا ایسا مگر کہاں،
دیوانگی شوق میں یہ کس کو ہوش تھا
ہے منزل مراد کہاں، رہ گذر کہاں
کچھ حادثات زیست ہیں ایسے بھی اے سرور
کوشش کی بھول جانے کی بھولے مگر کہاں

ستیہ پال سرور



سخن در سخن

★ افتخار عارف سے پہلے غالب پر بھی سرقہ کا الزام لگایا جا چکا ہے!

★ پہلے بھینسیں چوری ہوتی تھیں اب ردیفیں چوری ہوتی ہیں

افتخار عارف خود بہت اچھے گیت نگار ہیں۔ ان کا
شاعری میں بہت بیشتر اچھا ہے اور جب سے ان کا مجموعہ
کلام "مہر دو نیم" شائع ہوا ہے، یہ بات صاف ہو گئی ہے۔
ابھی ابھی انہیں کسی دوسرے کی چیزیں نقل کرنے کی
سال نادری کا علم رکھا ہے۔ ہمارا تصور صرف اتنا ہے کہ ہم
افتخار عارف کو اچھا شاعر مانتے ہیں اور ان کے شعروں پر اپنا
ایمان کے حوالے سے سر دھنتے ہیں۔ ہمارا اس خیال کو لوگ
معاف کرنے کے لیے کسی ثبوت رہنا نہیں ہوتے۔ کوئی افتخار
عارف سے نہیں کہتا کہ بھائی تم اسے اچھے شاعر کیوں ہو، سب
یہی کہتے ہیں کہ عارف گویا سیاں ڈھونڈ دو راہ راست پر
آ جائے۔

شاہد صداللہ نامی ایک صاحب نے تو کہیں شرمندہ
کرنے کے لئے ایک مراسلہ بھی لکھ مارا ہے جس میں انہوں نے
ثابت کیا ہے کہ افتخار عارف کے مجموعہ کلام میں دو مصرعے کا مال بھی
خاصی مقدار یا تعداد میں موجود ہے۔ عطا ان باتوں سے ہم کہیں
شرمندہ ہوتے ہیں افتخار عارف کو بھی ہم مشورہ دیں گے کہ شرمندہ
ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ مراسلہ نگار نے آپ کے دیوان
سے دو مصرعوں کے علاوہ سو سو آمد کئے ہیں، اس سے کہیں زیادہ
دو مصرعوں کے شعر تو میر اور غالب کے یہاں مل جاتے ہیں۔ غالب
کے ہاں دو مصرعوں کے ایک سو سے زیادہ فارسی شعروں کو اردو کا
جامہ پہنایا گیا ہے اور میر نے ایک برابر سے زیادہ شعروں کو
اپنایا ہے۔ مال مسروقہ کے برآمد ہونے سے میر و غالب کی
عظمت کم نہیں ہوئی۔ اسی طرح مانے جایا تو افتخار عارف کی
مقبولیت میں بھی کمی نہیں آئے گی۔

حیرت ہے کہ شاہد صداللہ کو "مہر دو نیم" میں صرف
کمی کے چند شعر ملے جو دو مصرعوں کا مال ہیں۔ اگر موصوف مراسلہ
بھیجنے سے پہلے ہم سے مشورہ کر لیتے تو ہم "دو نیم" کی معصومیت
کو واضح کرنے ہوئے افتخار عارف کے آدھے کلام کو سحر انصاری
اور جدید شاعر کو خیرات ثابت کر سکتے تھے۔ ہم جیسے
بلکہ یہ بھی ثابت کر سکتے تھے کہ سحر انصاری اور جدید شاعر نے
بھی دوسروں کے چار خاصے اچھے اچھے مال اڑائے ہیں۔ اپنی اس
بات کو واضح کرنے کے لئے ہم صرف دو مثالیں پیش کریں گے۔
کہا گیا ہے کہ افتخار عارف کا یہ شعر:

کیا بیعت کریں کہ اب تو صاحب
مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

جدید شاعر کے اس شعر کا چربہ ہے

جینے کی نہ آرزو ہی کب تھی
مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

لیکن ماشاءاللہ غزل کے دانہ مسلط چراغ آبادی کا یہ شعر دونوں
شاعروں کی پیدائش سے پہلے کا ہے

ہم زندہ ہیں لیکن اس طرح سے
مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

افتخار عارف کا شعر ہے

کریں تو کس سے کریں نارسائیوں کا گلہ
سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا

اس شعر کو سحر انصاری کے مندرجہ ذیل شعر کی آواز بازگشت
کہا گیا ہے

کہوں تو کس سے کہوں آ کے اب سر منزل
سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا

ان دونوں شعروں سے بہت پہلے یہ دو بہت پہلے یہ شعر
کہا:

بچھڑ گئے سر منزل ہم اپنے آپ سے جب
سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا

ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ صرف افتخار عارف پر سرقے
کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ دو شاعر بھی اس جرم میں برابر
کے شریک ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ یہاں
سرقہ العوامی فعل نہیں، اجتماعی کاوش ہے۔ افتخار عارف،
جدید شاعر اور سحر انصاری نے ایک دوسرے سے نہیں مشترک
ماخذ سے استفادہ کیا ہے۔

اس وضاحت کے بعد بھی اگر مراسلہ نگار شاہد صداللہ
کو اس پر اصرار ہو کہ افتخار عارف نے سرقے کا ارتکاب کیا
ہے تو ہم اس بحث کو ختم کرنے کے لئے ایک واقعہ سامنے
رکھتے ہیں۔ ایک نوجوان کسی ہم جیسے فقیر گوشہ نشین کے ہاں
پڑھنے کے لئے پہنچا۔ جہاں سوائے فقیر کے اور
اس کے کشکول کے کوئی چیز سرقے کے قابل نہ تھی۔ ظاہر ہے
تو جانا مناسب نہ تھا، اس نوجوان نے کشکول اٹھا لیا۔ وہ
جب اپنی محنت کا ثمرہ لے کر اپنے استاد کی خدمت میں حاضر
ہوا تو استاد نے کہا۔ "کیا فضول چیز اٹھا لائے ہو" تو نوجوان
نے جواب دیا۔ "اس گھر میں سوائے اس کشکول کے کوئی اور
چیز نہیں تھی" تو استاد نے کہا۔ "برخوردار، یاد رکھو، چوری
ہمیشہ کسی صاحب ثروت کے گھر میں کی جاتی ہے۔ گناہ بے
لذت میں کوئی فائدہ نہیں؟"

افتخار عارف کو اپنے مجموعہ کلام کا نام "گناہ بے
لذت" رکھنا چاہئے تھا۔

مراسلہ نگار شاہد صداللہ نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ
افتخار عارف نے جون ایلیا کی دو ردیفیں چوری کر لیں۔ بھینسوں
وغیرہ کی چوری کے واقعات تو سننے میں آتے رہتے ہیں، لیکن
ردیفوں کی چوری کا واقعہ پہلی مرتبہ سننے میں آیا ہے۔ معلوم
نہیں جون ایلیا نے اس چوری کی رپورٹ تھانے میں درج کرائی
تھی یا نہیں، بہرحال واقعہ افسوسناک ہے۔ افتخار عارف کو آئندہ
ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کسی غزل کی ردیف چوری ہو جائے تو
متعلقہ غزل کسی کام کی نہیں رہتی۔ ہم جون ایلیا سے بھی عرض
کریں گے کہ وہ اپنی ردیفوں کی چوری کا غم نہ کریں۔ اگر پرانے شاعروں
کے دیوان نادر ردیفوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ افتخار عارف
ایک ردیف لے اڑیں تو اس کے بدلے میں پرانے دیوانوں
سے دس ردیفیں اڑائی جا سکتی ہیں۔

ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ مراسلہ نگار کا نام فرضی ہے
اور اس پردے میں کوئی اور شخص سرگرم عمل ہے۔ بعض لوگوں
کا خیال ہے کہ یہ مراسلہ جون ایلیا نے لکھا، یا لکھوایا ہے۔ کیونکہ
اس میں ایک ایسا واقعہ درج ہے جو افتخار عارف اور جون
ایلیا کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ جب "شام
بخیر" والی غزل افتخار عارف نے "فنون" میں چھپنے
کے لئے بھیجی تو اس پر "بہ عنوان ایلیا" کے الفاظ لکھ دیئے
تھے تاکہ جون کی ردیف سے استفادے کا اعتراف ہو جائے۔

(بقول افتخار عارف) جناب احمد ندیم قاسمی سے منسوب کر دیئے۔ یہ بات جب عارف اختر نے جون ایلیا سے کہی تھی تو اس وقت کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ ایسے میں اس بات کا ذکر ہونے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ مراسلہ جون ایلیا نے لکھوایا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ صرف جون ایلیا ہی کیوں کیا جائے۔ افتخار عارف بھی تو یہ مراسلہ لکھوا سکتے ہیں۔ جب وہ متحرک ہو کر مخالفت مول لے سکتے ہیں تو اپنے خلاف مراسلہ کیوں نہیں لکھوا سکتے۔ فرضی نام سے مراسلہ لکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کسی اصلی نام سے اس کی تردید بھی چھپوائی جا سکتی ہے۔ ایک سیاستدان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب بہت دنوں تک اُن کے متعلق کوئی خبر اخباروں میں شائع نہیں ہوتی تو وہ اپنے خلاف کوئی خبر چھپواتے ہیں اور پھر اس کی تردید میں بیان جاری کر دیتے ہیں۔ اتنی سیاست تو افتخار عارف کو بھی آتی ہوگی۔

ایک صاحب کا خیال ہے کہ یہ مراسلہ سحر انصاری نے لکھا یا لکھوایا ہے۔ ان صاحب کی دلیل یہ ہے کہ مراسلے میں سحر انصاری کے تین شعر درج کیے گئے ہیں اور اتنی بڑی تعداد میں سحر انصاری کے شعر خود اُن کے سوا کسی کو یاد نہیں ہو سکتے۔ یہ دلیل نہایت کمزور ہے۔ ہمیں سحر انصاری کے درجنوں شعر یاد ہیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو سہو کاتب سے میر یا انیس کے کلام میں شامل ہو گئے ہیں۔

فرضی نام سے چھپے ہوئے مراسلے کا اصلی نام سے جواب چھپوانے والی بات ہم نے اس لئے کہی ہے کہ شاہد عبداللہ کے مراسلے کا جواب لسانیات ظہور احمد صاحب نے لکھوایا ہے۔ یہ جواب گزشتہ ہفتے جسارت میں شائع ہو چکا ہے۔ ظہور احمد صاحب نے افتخار عارف کی حمایت میں روشنی میں ثابت کر دکھایا ہے کہ متنازعہ اشعار افتخار عارف نے پہلے کہے تھے، بعد میں شاکر اور سحر انصاری نے ان کو چرا کر سرقہ کیا۔ سرقے کے مجرم افتخار عارف نہیں ہیں بلکہ معاملہ برعکس ہے۔ اسی قسم کی منطق سے ایک مرتبہ غالب نے بھی کام لیا تھا۔ غالب پر الزام لگایا گیا کہ آپ نے قدیم اساتذہ کے مضمون پر ہاتھ صاف کیا ہے۔

غالب نے کہا، میں نے سرقہ نہیں کیا بلکہ قدیم اساتذہ سرقے کے مجرم ہیں۔ پوچھا گیا وہ کیسے؟ غالب نے جواب دیا، روز ازل کو جب شاعروں میں مضامین سخن تقسیم ہو رہے تھے تو بعض شاعروں نے میرے حصے کے مضامین اڑا لیے۔

اس واقعے کو غالب نے ایک فارسی قطعے میں بیان بھی کیا ہے۔ غالب کا یہ قطعہ آپ بھی سنیئے۔ ہر شعر کے بعد اس کا اردو ترجمہ بھی لکھا جا رہا ہے تاکہ کسی کو ہمارے کالم کے طویل ہونے کی شکایت نہ ہو۔

ہزار معنیٔ سرجوش خاص نطق من است
کہ اہل ذوق دل و گوئے از خیال بردہ است

(ہزاروں بلند پایہ معنی میرا خاص حصہ ہیں جنہوں نے اہل ذوق کا دل چھین لیا ہے اور جن کی مٹھاس شہد سے زیادہ ہے۔)

زرد شتگاں سبکے گرتوارد زدہ باد
مراں کہ جائے آمائش غزل بردہ است

(اگر اگلے زمانے کے شاعروں میں سے کسی کے ساتھ مجھے توارد ہو گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میری غزل کا حسن زائل ہو گیا ہے)

مراست ننگ و سے فخر اوست کاں بیکس
ز معنی فکر رسا جادہ ہاں بجل بردہ است

(توارد میرے لئے رسوائی کا باعث ہے لیکن جس شاعر کا مضمون میرے شعر میں آیا ہے، اُس کے لئے یہ امر باعث فخر ہے کہ وہ اپنی فکر رسا کی کوشش سے اُس جگہ پہنچا جہاں میری رسائی ہوئی)

مبر گمان توارد یقیں شناس کہ دزد
متاع من ز نہان خانۂ ازل بردہ است

(توارد کا شبہ نہ کرو بلکہ یقین کرو کہ چور نے میرا وہ مال چرا لیا ہے جو ازل کے خزانے میں رکھا تھا)

غالب کے ان اشعار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ شعروں کا سرقہ کوئی معیوب بات نہیں۔

ظہور احمد نے اپنے جوابی مراسلے میں یہ بھی بتایا ہے کہ افتخار عارف کے لانگ پلے ریکارڈ کی خوبصورت تعارفی عبارت پروین شاکر نے لکھی تھی معلوم نہیں اس سے وہ کیا بات کہنا چاہتے ہیں۔ پروین شاکر بھی ہماری آپ کی طرح انسان ہیں۔ کیا ان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی؟

لیکن... معاف کیجئے گا جملہ پورا نہیں ہو رہا، اس لئے ایک لطیفہ سن لیجئے۔ ایک نقاد نے ایک شاعر سے کہا ”تم اپنی شاعری کا حق ادا نہیں کر رہے۔“ شاعر نے جواب دیا، ”جناب میں ابھی تک نقادوں ہی کا حق ادا نہیں کر پایا تو شاعری کے واجبات کیسے ادا کر سکتا ہوں۔“

سرشار صاحب کو ہم اپنے بزرگوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جب ہم نے پڑھنا شروع کیا تو انہوں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ ہمیں پڑھنا چھوڑے ہوئے مدت ہو چکی لیکن انہوں نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ وہ گزشتہ چالیس برس سے مسلسل لکھ رہے ہیں جس سے اور کچھ نہیں تو ان کی مستقل مزاجی کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ ایک آدمی کا چالیس برس تک لکھتے رہنا مستقل مزاج ہونے کا بین ثبوت ہے۔ مزید کچھ عرض کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ سرشار صاحب کے تینوں مجموعوں کی تفصیلات پیش کر دی جائیں تاکہ بعد میں کلام کہنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگا۔

۱۔ ابجد ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۲ء تک کا کلام
۲۔ بہتر کی لکیر ۱۹۶۲ء تک کا کلام
۳۔ بے نام ۱۹۸۲ء تک کا کلام

ان تینوں مجموعوں میں شاعری تو ایک جیسی ہے لیکن مصنف کی تصویریں مختلف ہیں۔ ”ابجد“ میں جو تصویر ہے اس میں لڑکپن کی رخصت اور جوانی کی آمد آمد کے آثار جھلکتے ہیں۔ ”بہتر کی لکیر“ والی تصویر بذات خود بہتر کی لکیر معلوم ہوتی ہے گویا یہ تصویر جب کھنچی گئی اُس وقت آتش جوان تھا۔ ”بے نام“ کی تصویر میں سرشار صاحب پختہ عمر کے دانشور نظر آتے ہیں کیونکہ اس تصویر میں سر کے بال بہت کم ہو گئے ہیں۔ تصویروں کے ... بارے میں ... اگر کتابوں پر سن اشاعت یا ان کا زمانۂ

وہ ان کا شمار اساتذۂ فن ہی میں نہیں، متروکاتِ سخن میں بھی ہوتا ہے۔

سرشار صدیقی کی کتابیں

ہم شعر اور ایک آدھ مجموعہ چھپوا کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کوئی بڑی اہم تیر کی لیکن سرشار صدیقی نے تین مجموعے ایک ساتھ شائع کر کے بھی انتہائی انکسار کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان مجموعوں کا اخباروں میں چرچا ہوا ہے نہ ادبی حلقوں میں دھوم مچی ہے۔ کسی نقاد نے کوئی مضمون لکھا ہے نہ کہیں تبصرہ شائع ہوا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اکثر روزناموں کی ... نہیں ہوئی حالانکہ اس کام سے ان کی مالی حیثیت مستحکم ہو جاتی اور کچھ نہیں تو بروشر کے اشتہاروں سے ان مجموعوں کے اخراجات طباعت نکل آتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرشار صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ شاعری کرنا اور شاعری چھاپنا کسی جیالے کا کام ہے۔

سرشار صاحب کا سرکاری تعلق پبلک ریلیشنز کے شعبے سے ہے۔ اسی لئے کہ اداروں کی ذاتی پبلک ریلیشننگ کا کام کرتے رہے وہ نقادوں سے اپنے بارے میں مضامین نہیں لکھوا سکتے تھے۔

تصنیف نہ لکھا ہوتا تو صرف ان تصویروں سے اندازہ کر لیا جاتا کہ کلام کس زمانے کا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر سرشار صاحب اپنی تصویروں کے ساتھ میر و سودا کی تصویریں بھی شائع کر دیتے تاکہ زمانے کا تعین کرنے میں مزید آسانی ہو جاتی کیونکہ ان کے کلام کا ایک حصہ ایسا ہے جو میر و سودا ہی کے زمانے میں لکھا جا سکتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سرشار صاحب اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق شاعری نہیں کرتے۔ کرتے ہیں اور وہ کیا خوب کرتے ہیں۔ بلاشبہ وہ ہر اعتبار سے جدید شاعر ہیں اور ان کے کلام کا بڑا حصہ ہماری جدید شاعری کے انتخاب میں شامل ہونے کے لائق ہے۔ یہی بات دوسرے لفظوں میں اس طرح کہی جا سکتی ہے کہ سرشار صاحب عمر اور مشق سخن کی اس منزل میں ہیں جہاں ان کا شمار اساتذہ فن یا متروکات سخن میں ہونا چاہئے۔ لیکن وہ اس سے بھی آگے کے منصب پر فائز ہیں یعنی وہ ایک ایسے شاعر ہیں جس کے کلام میں اس کے عہد کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

شعر گوئی کا آغاز بہت پہلے ہو چکا [illegible]
[illegible]

[illegible] ہوتا اور مرشد صاحب کی شاعری کو [illegible] جہاں تک [illegible] ہے۔ پہلے مرشد صاحب کے [illegible] کو [illegible] اور دلی کے ساتھ ضرور ہے کہ [illegible] ہے۔ شعر سے ان کے کہ شاعری جانا جاتا [illegible] [illegible] تو مرشد صاحب [illegible] کے بعد ہوں [illegible] مشکل کام ہے اور پھر شاعری تو مرشد صاحب کی شخصیت کی طرح صاف ستھری [illegible] شاعری ہے جس میں [illegible] کا فرق معلوم ہو۔

شخصیت کی بات چلی ہے تو ہم یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ ان کے [illegible] مرشد صاحب کو [illegible] حاصل ہے۔ انہوں نے [illegible] سے ہم آہنگ کرنے میں [illegible] اپنی تحریریں [illegible] مرشد صاحب ایک [illegible] شاعر ہیں۔ کالم نگار ہیں۔ [illegible] اگرچہ اس میں [illegible]

[illegible] مرشد صاحب [illegible] ہیں اطمینان ہوتا ہے کہ [illegible] کو مرشد صاحب [illegible] مرشد صاحب کا کالم [illegible] قارئین کی تعداد میں ایک [illegible] ہوتا ہے۔ مرشد صاحب کی کالم نگاری ہر [illegible] کالم کے [illegible] صاف ظاہر ہے [illegible] کرشمے ہوتے ہیں:

یہ پوچھنے پر کہ ایک صاحب نے کہا جب آپ کے کالم میں [illegible] ہوتا تو آپ کالم [illegible] اتفاق [illegible] غالب کی تو کہہ گئے [illegible] مرشد صاحب [illegible] اس کا اعتراف انہوں نے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے؟

رنگ [illegible] حرف [illegible] مفہوم [illegible]
پاس [illegible] غالب [illegible] مفہوم [illegible]!

کے ساتھ منافقت [illegible] تھا۔ یہ [illegible] کے خلاف ہوتے۔

...... اس [illegible] کہ ہم اپنے قارئین کو مرشد صاحب کے چند [illegible] شعر [illegible] غالب [illegible] مرشد صاحب کو [illegible] اہم شعراء میں شمار کرتے ہیں۔

مرے وجود کو اس نے عجب کمال دیا
کہ مشت خاک تھا افلاک پہ اچھال دیا
مکاں کو جو رنگینیوں سے پاک کیا تھا
سو میں نے پلٹ کے ہر اک [illegible] کو نکال دیا
بدل کے رنگ [illegible] کے مفہوم
مجھے تو اس نے بڑی کشمکش میں ڈال دیا

خیال [illegible] خاک ہوتے رہے
ہم اپنے زہر سے [illegible] ہلاک ہوتے رہے

نہ خواب میں نہ طلسم شکست خواب میں ہوں
میں اپنی روشنی [illegible] کے حساب میں ہوں
صلیب و زہر کی تاریخ کے حوالے سے
شعور عصر [illegible] کتاب میں ہوں

حسن نعیم

انگلیاں فگار اپنی

اس کالم کی رونمائی کیوں نہ اس اعلان سے کروں، کہ ان میں مرقوم خیالات، تصورات اور تعصبات کی ساری ادبی اور غیر ادبی ذمہ داری کاتب صاحبان کی ہوگی، اور ان سے اتفاق، اختلاف قطعی غیر ضروری ہوگا،

کاتب سے مراد یہاں خوشنویس صاحب کے علاوہ راقم الحروف سے ہے، کبھی کبھی خطاط صاحبان بعض حروف کو ناپسند کرتے ہوئے ان کا بدل لکھ دیتے ہیں، ادبی رسائل میں پروف ریڈر نام کی کوئی مخلوق نہیں ہوتی، اور اگر اتفاق سے جز وقتی، پروف ریڈر ہوں بھی تو وہ اپنی ذمہ داری صرف اس حد تک سمجھتے ہیں کہ خوش خطی کا معائنہ کر کے یہ نشاندہی کریں کہ کون سا لفظ دیکھنے میں بھلا نہیں لگتا، اس معائنہ کے دوران اگر کسی تبدیل شدہ لفظ پر نظر پڑ گئی تو پڑ گئی ورنہ تو وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں پروف ریڈر کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ اس بات کا پروف موجود ہو کہ انھوں نے کتابت شدہ مسودہ پڑھا ہے، اسی باعث اخلاقی اور اور قانونی پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے میں نے قلم کی لغزشوں کے سلسلے میں مدیران کرام اور پروف ریڈر صاحب کو بری الذمہ قرار دے دیا ہے اور ذمہ داری کاتب اول اور کاتب دوم کے درمیان بانٹ دی ہے،

حنگاری ۱۳

معروف اردو صحافی عبدالسمیع بوبیرے نے کسی سیمینار کے افتتاحی مقالے میں اپنا ایک تجربہ بیان کیا ہے جو عام معلومات میں اضافہ تو نہیں کرتا لیکن عام ردعمل کو فوکس میں فوراً لے آتا ہے، ایک اردو اخبار میں اس تین کالمی سرخی کے چھپتے ہی سارے شہر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں،

"فلاں صاحب نے فلاں صاحب کی لیڈی قبول کر لی" پبلک کو ایجاب و قبول کے ان رنگین مسائل میں خاصی دلچسپی ہے اس لئے چائے خانوں میں رونق آگئی اور فون کی گھنٹی بار بار بجنے لگی، معاملہ صرف اتنا تھا کہ پہلے صاحب نے دوسرے صاحب کی لیڈری قبول کر لی تھی، غالباً پروف ریڈر صاحب اس نوعیت کے ذاتی معاملات میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے،

کچھ باشعور لوگ ہر بات سے اتفاق، اختلاف ضروری سمجھتے ہیں، لیکن ادبی کالم میں محض حقائق، یا تنقیدی فکر سے واسطہ نہیں رکھا جاتا اس لئے کہ ان باتوں کو جانچنے کے لئے تحقیق و تنقید کے شعبے پہلے ہی سے موجود ہیں۔ اور نہ محض رائے زنی کو محترم سمجھا جاتا ہے، اس لئے کہ چائے خانے اور کافی ہاؤس بھی شہر شہر کھلے ہوئے ہیں جہاں ایسی ایسی سنسنی خیز رائیں سننے کو ملتی ہیں، کہ ادب تو کیا ادیب بھی غیر اہم قرار پاتا ہے، ادبی کالم نگاری رفتار ادب کا خاکہ ہوتا ہے اور رفتار ادب کا معنی خیز خاکہ ہوتا ہے اور بس، ادبی کالم نگاری ایسے ادبا کرتے ہیں جو کسی اور کام کے اہل نہیں ہوتے، اسی کام کو ایک انداز جنون سمجھ لیتے ہیں، ویسے ادب کالم نگاری ایک فن شریف کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے!

اس کی بنیادی ضروریات یہ ہیں کہ چند دلچسپ نکات اور کچھ ضمنی باتوں کو یوں پیش کیا جائے کہ وہ بذات خود اہم اور ضروری معلوم ہونے لگیں، ویسے فی الواقع کچھ ایسی صورت حال ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، مثلاً ۱۹۴۹ء میں اچانک حسن عسکری نے ماہنامہ ساقی، کراچی میں اپنا مشہور کالم "جھلکیاں" لکھتے ہوئے اعلان کر دیا کہ پاکستان کو بالآخر ایک شاعر میسر آگیا ہے اور پھر اس کا نام پتہ قوم کو نوٹ کروا دیا، ان کے مطابق گویا ناصر کاظمی نے ہجرت کے جملہ مسائل کو غزل میں حل کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی، اور تقسیم ملک کا کوئی نکوئی معقول جواز ان کی غزلوں کی وجہ سے نکل آیا تھا عسکری کے انداز تحریر نے یہ تاثر دیا تھا جیسے کوئی تحقیقی جماعت پاکستان کے شہروں، جنگلوں اور دور دراز علاقوں میں کسی حقیقی شاعر کی تلاش میں برسوں سے سرگرداں تھی کہ وہ شاعر موعود کسی گلی کے نکڑ پر نظر آگیا، اس مشن کے ڈائرکٹر نے فوراً حسن عسکری سے رابطہ قائم کیا اور عسکری صاحب نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے قوم کو یہ مژدہ سنا دیا کہ بالآخر ایک عدد شاعر پاک دستیاب ہو چکا ہے،

"مزید تفتیش" میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، اسی تعلق سے ایک روایت ہے کہ چند مشہور پاکستانی شعرا بے بسی اور بے چارگی

۳۰ جنوری ۱۹۸۴ء

کے عالم میں مع فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور عزیز حامد مدنی پاپیادہ جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری کے پاس بغرض اصلاح شعر حاضر ہوئے اور اس ادبی گزٹ کو دکھاتے ہوئے استفسار کیا، قبلہ کیا ہم لوگ شاعر بھی نہیں کیونکہ اعلان صرف کسی شاعر کے پائے جانے کا ہے، حفیظ جالندھری صاحب نے غور سے اعلان پڑھنے کے بعد انکشاف کیا کہ پاکستان میں بڑے شاعروں کی آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ شاعر محض کا پایا جانا یقیناً ایک سنسنی خیز بات ہے، اس لئے آپ لوگ یوں پریشان نہ ہوں آپکی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ اس طرح کی باتوں کا نوٹس لینے کی ضرورت ہے،

چنانچہ تمام بڑے شعراء مطمئن ہوکر اپنے اپنے گھروں کی طرف پیدل روانہ ہوگئے،

اس ایک چھوٹے سے جملے کے ذرا سا اختصار پر گہری نظر ڈالئے گا، تو حسن عسکری کی ذہانت کا قائل ہونا پڑے گا، وہ تحقیق و تنقید سے بے نیاز، اپنی پسند اور ناپسند کو اتنی خوبصورتی سے لکھتے تھے، کہ عام قارئین پر انکی چھاپ جس کا سکہ جم جاتا تھا وہ جب تک زندہ رہے اپنے قارئین پر غنودگی طاری نہ ہونے دی،

بعد میں جب حسن عسکری صاحب ناصر کاظمی سے ناراض ہوگئے تو انھوں نے اپنے کسی مضمون یا غالباً کسی تقریر میں اعلان دیگر بھی کر دیا کہ شاعر اپنی غزلوں میں کثرت سے گھاس اور جانور کا ذکر کرنے لگا ہے، چنانچہ انکی خوش فہمی اب دور ہو چکی ہے لوگ نوٹ فرمائیں، بس سارے ادبی حلقوں میں خیال آرائی ہونے لگی، اور بہت سے لوگ جو زحمت مطالعہ نہیں اٹھاتے ناصر کو ڈیڈ فورس، یعنی از کار رفتہ سمجھنے لگے، بیچارہ شاعر ایک ہی جنبش قلم سے چارے گھاس پر اتر آیا، ناصر کاظمی ویسے آخر تک لکھتے رہے لیکن بہت اداس رہ کر یہاں سے گئے،

چنگاری ۳۲

اصل میں ناصر کاظمی نے حسن عسکری جیسے شاطر کی موجودگی میں خود کو مستند ثابت کرنے کی غلطی سرزد کی تھی اور نئی اور پرانی نسل کا قصہ چھیڑ دیا تھا،

اس بحث کی رو سے عسکری صاحب پرانے خیال کے بزرگ ٹھہرتے تھے، اس بات کے علاوہ میرا ذاتی شبہ ہے کہ عسکری صاحب کا مذاق سخن اس دوران قدرے بدل چکا تھا اور وہ چند روحانی مسائل میں بھی گرفتار ہو چکے تھے، ناصر کاظمی کی موت پر انہوں نے اک مختصر سی تحریر لکھی ہے جو ان سطور پر ختم ہوتی ہے، دیکھئے جو کچھ انکی تلاش کا حاصل تھا اسکے بارے میں وہ کہتے کیا ہیں!

یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آجکل بھی ان کا کلام مقبول ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ پڑھنے والے ان کے اشعار کے کس پہلو سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں، ان کے کلام پر تنقیدی بحث تو وہی کر سکتے ہیں جو ان معاملات سے واقفیت رکھتے ہوں میں تو صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ کم سے کم مجھے انکی شخصیت اور انکی شاعری دکھ اس کے باوجود اب بھی محبوب ہیں، اور میرا جی چاہتا ہے کہ ایسی چیزیں ہماری قوم کو اب بھی محبوب رہیں، حالانکہ اب تو آخری قسطیں چل رہی ہیں،

انہوں نے اپنی سادگی سے ناصر کی مقبولیت، اور قوم کی دکھی جیبوں کے امتزاج سے ایک رواں تحریر لکھ ڈالی، جو پُر تاثیر ضرور ہے،

عسکری صاحب انکی کھیپ کے ہنرمند اور مشہور ادبی کالم نگار تھے اور بڑے وثوق سے انکی اور حسن سے اپنی پسند، ناپسند کا اظہار کرتے تھے، ان سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی کچھ قارئین انکی رائے و معاملات ادب میں جاننے کیلئے بے چین رہتے تھے!

کالم نگاروں کی تحریری آرا سے بچنے کا ایک ہی کارگر طریقہ ہے کہ انہیں پڑھا ہی نہ جائے البتہ تھوڑی سی گڑبڑی اس وقت پیدا ہوگی جب آپ کا سامنا اس قاری سے ہوگا جس نے آپ کے منع کرنے کے باوجود کسی ادبی کالم کو پڑھ رکھا ہے، پھر بحث و تکرار میں نقص امن کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے،

آج کے کالم نگار جیسی معلومات آپ کو بہم پہونچانے میں انکا مقصد تخلیقی جوہر کو ابھارنے کا نہیں بلکہ اسے ختم کرکے آپکو پیدا جنگ کی طرف بھیجنے کا ہوتا ہے، ادب کے جائزہ حامزہ سے لطف اٹھانے کے لئے ویسے اس بہتر اخباری پروگرام پیش کرنا ممکن نہیں اس کے ذریعہ عصری ادب کے بعض ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جو ادب فہمی ہی نہیں ادیب فہمی میں بھی معاون ہوتے ہیں

۳۰ جنوری ۴

حاشیے

ہمزاد ایاز

سنا ہے گھنے پیڑوں کے سائے میں کبھی پودے نہیں پنپتے۔ انھیں اپنی دنیا دوا قبت سنوارنے کے لیے اس سائے کو خیرباد کہنا ہی پڑتا ہے۔ اردو شاعری کے باغ میں کئی تناور پیڑ اگے غالب، اقبال، میر، مومن وغیرہ وغیرہ آج کل تو اس وغیرہ وغیرہ کا بہت بڑا جنگل پھیلا ہوا ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اس جنگل میں پودے اگنا بند ہو گئے ہیں۔ جو کبھی پیدا ہوتا ہے تناور پیڑ بن کر ہی پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں کچھ ایسے جرأت مند بھی پیدا ہوئے جنھوں نے غالب و اقبال کے نقش قدم پر قدم رکھے اس خیال سے کہ ہم بھی وہیں جا پہنچیں گے جہاں یہ حضرات پہنچے۔ پہنچے تو خیر وہ بھی وہیں گئے جہاں یہ آسودہ خاک ہوتے مگر ادبی مرتبہ کے لحاظ سے ان کا وہی حشر ہوا جو گھنے پیڑوں کے سائے میں اگنے والے پودوں کا ہوتا ہے۔ بقول وزیر آغا: "اختر شیرانی، اقبال اور فیض — ان میں ہر ایک ریلوے ٹرمینس کی طرح تھا۔ یہاں ریلوے لائن اختتام پذیر ہو گئی تھی — اور اعلیٰ پائے کے شعراء کا یہ ایک نمایاں وصف رہا ہے کہ وہ راستوں کو مسدود کرتے ہیں اور مسافروں کے سامنے بند گلی کا سا منظر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔"

ہمیں شاعروں کے متعلق تو زیادہ عرض کرنا نہیں ہے (کیوں کہ عام آدمی کی بہ نسبت "عرض کیا ہے" کی ہوس ان ہی کو زیادہ ہوا کرتی ہے) ہم یہاں فقط ایک بات کہیں گے کہ میر تقی میر کے والد نے انھیں نصیحت کی تھی کہ "بیٹا! عشق کرنا عشق" چنانچہ اس فرماں بردار بیٹے نے وہی کیا۔ میر کے بعد آنے والی کئی نسلوں میں بہتوں سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ وہ میر تقی میر کے باپ کو غلطی سے اپنا باپ سمجھ بیٹھے اور اسی فرماں برداری کا ثبوت دیا جو میر سے سرزد ہوئی تھی چنانچہ اردو شاعری میں ناز و غمزہ کی گفتگو بھی دشنہ و خنجر کے پیرائے میں کی جاتی رہی اور مشاہدہ حق کی گفتگو بھی بادہ و ساغر کے بغیر نامکمل سمجھی گئی۔ عشق و عاشقی پر اس قدر زور دیا گیا (بلکہ اس کے لیے ایک اسکول، المشہور بھی کھولا گیا ویسے آج کل یہ کام ہمارے کالجوں میں بھی ہونے لگا ہے) کہ نتیجتاً محبت سیم تنوں نے شاعروں، افسانہ نویسوں کے اعصاب پر سوار ہو کر "خر سواری" کی۔ دانشمند جوبلی منانی اگر عورتوں کا زمانہ بھی آ گیا اب کیا ہو سکتا تھا۔

ابھی کل ہی کی بات ہے ایک کالج کے طالب علم نے ایک شاعر صاحب کو جو صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اصلاح کے لیے کچھ غزلیں دیں کہ کالج میگزین میں چھپوانے کا ارادہ ہے دیکھ لیجیے، انھوں نے جو دیکھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ شاعری میں دلہن کے ڈریسنگ ٹیبل پر گویا سولہ سنگار کا سامان سجا ہوا تھا۔ شاعر صاحب نے پوچھا— یہ غزلیں تم نے لکھی ہیں۔ طالب علم نے جواب دیا۔ جی ہاں شاعر صاحب بولے — تمہاری شاعری کو تو اصلاح کی اتنی ضرورت نہیں جتنی تمہیں ہے اس کے بعد انھوں نے اس کے اخلاق و شرافت کی چادروں اور دریوں کو اٹھا اٹھا کر وہ جھٹکا کہ سارا گرد و غبار نکل گیا۔

عشق و عاشقی کے سائے تو ہماری شاعری پر بہت دور دور تک پڑے۔ کچھ ذکر خیر غالب کے سائے کا بھی کریں جو اردو شاعری پر پڑا تو اس غریب کی دنیا سنور گئی یہ سایہ شاعری سے تجاوز کر کے اردو کے قاری پر بھی پڑا اور اب تک مسلسل پڑ رہا ہے۔ سائے کی ایک قسم پچھلے دنوں ہمارے ایک دوست کی باتوں سے ہم پر منکشف ہوئی وہ ہمارے ساتھ کہیں جا رہے تھے ایک صاحب ملے تو اپنی خیریت ان الفاظ میں بتانے لگے "یاں صاحب خیریت ہی خیریت ہے۔ ان بزرگ کا سایہ جو ہمارے سر پر ہے"۔ ہم نے انھیں ڈانٹ پلائی کہ کیا تم نہیں بھوت پریت سمجھتے ہو جس کا سایہ تم پر پڑ گیا اور اب خیریت ہی خیریت ہے۔ ہر چیز کی زیادتی مضر ہوتی ہے خیریت ایک بار ہو تو خیریت ہوتی ہے — اگر وہ دوبارہ ہو جائے تو پھر خیریت نہیں رہ جاتی۔

مرزا غالب کا سایہ طوطے پر پڑا تو وہ بیچارہ سوچ و فکر میں مبتلا ہو گیا۔ چنانچہ غالب کو اس کی خبر لینی پڑی کہ میاں مٹھو! تمہارے نہ جورو نہ بچے تم کس سوچ میں سر جھکائے بیٹھے ہو۔ البتہ غالب کا سایہ اس کی بیوی پر نہ پڑا کہ وہ ریل کی دوسری پٹری کی طرح تھی جو ہزاروں میل پہلی پٹری کے ساتھ چلے پھر بھی فاصلہ برقرار رکھتی ہے۔

آج کل ہم غالب کے اس سائے کو باندازِ دگر بھی دیکھ رہے ہیں۔ سنا ہے غالب نے زندگی بھر کوئی کتاب نہیں خریدی غالب نے یہ اچھا نہ کیا۔ ایک صدی بعد بھی غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اردو کے اکثر قاری غالب کے پرستار ہیں اسی کے اتباع میں اردو کی کتابیں اور رسائل تو در کنار، اخبارات تک خرید کر نہیں پڑھتے غالب کی پنشن کی آرزو اردو قاری اور ادیبوں تک آتے آتے رسالہ کی اعزازی کاپی میں ڈھل گئی ہے۔ غالب زندگی بھر مقروض رہا۔ اردو کا قرض بھی اردو کے قاری پر بہت چڑھ چکا ہے۔ جس کی ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لگتا ہے اسی قرض بازاری میں اردو دیوالیہ ہو جائیگی۔

غالب کا اردو کلام جس نے اسے اقلیم

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

افسانہ

احساس کے زخم

نکہت شاہجہانپوری

درمیان میں کتنی اکیلی کتنی پیاسی اور تنہا ہوں — دلکش پرندوں کی چہکار بھی آج دل کو خوش نہیں کرتی۔ سازِ ہستی کا ہر تار جھنجھناتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک عجیب بے یقینی کا عالم ہے اور میں ہولناک خوف میں ہوں۔ یہ پیار فضائیں کتنی بوجھل اور بے جان سی لگ رہی ہیں۔

یقین مکان کی بلند و بالا دیواریں دراصل آہنی دیواریں ہیں جو بے حسی کے ساتھ منہدم ہوتی جا رہی ہیں۔ بے یقینی کی فصیلوں کے اس پار حسن و جمال اور انجانے گمان لگتے ہیں کہ نقلی چیزوں کو اصلی چیزوں کے حوالے کر دینے والے بیوپاری کتنی خوبصورتی سے اپنا



جانے کتنے زخم ہیں جو نہ معلوم طریقے سے میرے احساس میں در آئے ہیں۔ اچانک ہی بالکل چپ چاپ بغیر کسی آہٹ کے۔ ہر گھڑی ہر لمحہ گھٹنے بڑھتے شبہات اور خطرات کے بھیانک ہالے میری جانب اپنے بے رحم اور خوفناک پنجے پھیلائے ہوئے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ اپنے ارد گرد بے شمار آسیبی سائے ناچ رہے محسوس ہوتے ہیں۔ بستر کی شکنیں بے چین کروٹوں کی کہانی بنا رہی ہیں۔

ذہن سے عجیب سی آوازیں ابھر کر سماعت میں تہلکہ سا مچا رہی ہیں۔ سارے مذہبی رشتے صلیب کے سنگین بندھن میں جکڑے ہوئے لگ رہے ہیں۔ پورے ماحول میں اذیت ناک سرگوشیاں بکھر رہی ہیں۔ اجنبی احساس کے زخموں میں ایک گہری سی کسک بیٹھ گئی ہے۔ کبھی دل چیخ چیخ کر رونے کو چاہتا ہے کبھی اس ماحول پر بے تحاشہ قہقہے لگا کر سر پھوڑ لینے کو۔

یہ گھر یہ آنگن قدم قدم پر پھولوں کے سائے اور ان سایوں کے درمیان رہنے والے یہ قابل اور ذہین لوگ۔ نیک اور پارسا لوگ۔ اور ان کو سلام کرتی ہوئی یہ پھولوں کی نازک لچکیلی جھکیلی شاخیں۔ رنگ و نور میں ڈوبا ہوا یہ گلشن اور اس میں موسم سے ملنے آئی یہ مہمان بہاریں ہمیشہ کی طرح اپنی سوغاتیں لٹانے اس بار بھی آئی ہیں۔ پھول کھل اٹھے ہیں کلیاں مسکرائی ہیں اور ان سب کے بزنس چلا رہے ہیں۔ وقتی عارضی خوشی کو حاصل کرنے والے یہ پاک باز پرہیزگار آدم کش وادی کے کتنے غرور اور یقین کے ساتھ بے غیرتی کی حدوں کو پار کرتے ہوئے اپنے سودے ٹھیک کر رہے ہیں۔

آتشِ ہوس کو بجھانے کی خاطر سماج کے یہ ٹھیکیدار خود کن حدوں سے گزر جاتے ہیں کہ انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ ان کے خوبصورت انسانی پیکروں میں گناہوں کی آلودگیوں سے پرے نیکی اور پاکیزگی کی کوئی رمق بھی باقی نہیں ہے۔ زندگی کا مفہوم ان کی نگاہوں میں وقتی آرام اور لمحاتی خوشی ہے خواہ وہ کیسے بھی حاصل ہو۔

اصلیت سے پرے ان کا وجود خود ان کے

لئے ایک بھاری بوجھ سے کم نہیں۔ ڈرامے کے کرداروں کی طرح اپنی دوہری شخصیت اور دوغلی فطرت کا بوجھ جو بیسوں گھنٹے ڈھونے کے خواب میں مبتلا رہتے ہیں۔ زندگی کے ہونٹوں کا رس نچوڑ لینے کے لئے جیتے اور مرتے ہیں۔ انسانی رشتوں اور قدروں سے بے نیاز آخر یہ دیوانے کس چیز کی تلاش میں شب و روز سرگرداں رہتے ہیں۔ اپنے دلکش یا حسین ناموں کی ڈیفینیشن کے برخلاف یہ اپنے گندے کارناموں اور ان پر چھپائے فخر اور فخر کے مضحکہ خیز حق پر لوگوں سے تائیدی سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے لئے ہر گھڑی کوشاں رہتے ہیں۔ زندگی کا یہ جبریہ انداز خود کو منوانے کی یہ بے چین تڑپ آخر یہ ناٹک کب تک چلے۔ اور ایسا کیوں ہے؟" لیجا مانو یا منوانے ایسی زیادتی اور جبر کیوں۔ سوچنے پر محسوس ہوتا ہے کیا یہ میرا قصور ہے یا ان کی کمی۔

ان حالات سے برسوں پہلے وہ لمحہ جو اس کی معصوم زندگی میں پہلی بار آیا تھا اپنے احساس میں درد کی ایک گہری کسک اور زخموں کی چبھن لیکر جب وہ ایک معصوم کلی تھی۔ جب زندگی دل کے ساز پہ نغمے گاتی تھی۔ وہ صبح کی پہلی کرن۔ برسات کی پہلی پھوار، موسم کی پہلی بہار بن کر اپنے باپ کے گلشن میں مہکی تھی۔ نو خیز پاکیزہ شباب نے بچپن کی دہلیز میں قدم رکھا تھا۔ جب وہ حسن و جمال کا بے مثال حسین پیکر تھی۔ ہر سمت اُجالے تھے۔ من موہنی راتیں تھیں۔

شہر کے اُجالوں میں زخم نہ تھے۔ سہانی کنواری راتوں میں خوف۔ خطرے آنسو اندھیرے اور آہیں نہ تھیں۔ خوشیوں اور خطروں سے بے نیاز زندگی ندی کے بہاؤ کی مانند ایک ہی اپنی سمت پر خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ لہروں میں ہلچل تھی نہ کناروں پر کوئی شور۔ بہت دن نہیں بیتے تھے کہ زندگی نے انگڑائی لی۔ لمحات کے پیکر بدلے۔ ماحول میں سرگوشیاں بکھرنے لگیں ۔۔۔۔ خاموشیاں سو گئیں ہنگامے جاگ پڑے۔ خواب مہک اٹھے۔ شباب کے سولہویں زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ کسی نے اپنی بانہوں کا سہارا دیا عمر کا لمبا سفر ساتھ طے کرنے کے لئے۔ اس کی زندگی میں وہ کچھ اس طرح شامل ہوا کہ وہ حیران رہ گئی۔ امیدواروں کی لمبی لائن کو پار کرکے آگے آنے والوں سے پہلے آخر یہ کیسے یوں اچانک یہاں تک آپہنچا۔

وہ آگیا۔ آنے والے نے بہار کے سولہ دروازے کھلے دیکھے اس نے صبح کی پہلی کرن کو چھوا۔ صبح کی وہی روشن اور پاکیزہ کرن۔ برسات کی پہلی پھوار کی کنواری ٹھنڈک اور فرحت بخش خوشبو سے اپنے وجود کو مہکایا۔ گلشن کے پہلے نئے شگفتہ پھول کی دلکشی کو لوٹا۔ موسم کی پہلی بہار میں وہ کچھ اتنا بدمست ہوا کہ وہ بہار اور اس کی دلکشی میں ڈوب کر سب کچھ بھول بیٹھا اور پھول کی پاکیزہ حسین نازک پنکھڑی پر خونِ دل کی سرخی سے اپنے خلوص، پیار اور وفا کے دستخط کر دیئے۔ بہاریں اس کے نام ہو گئیں۔ چمن اور فصلِ بہار پہ اس کا حق ہو گیا۔

اور پھر زندگی کی کتاب کے اوراق آہستہ آہستہ پلٹنے لگے۔ دن ہفتے۔ ہفتے مہینے اور مہینے سال بن کر بیتنے لگے۔ اعتماد کی فضاؤں میں کہرہ چھا گیا۔ یقین کی دیواریں گر گئیں۔ لمحات کے سینے میں حادثات کی چنگاریوں نے زخم ڈال دیئے۔ وقت کی نبض تھم سی گئی۔ ماضی کی سسکتی یادوں کے سینے سے لگ کر کرن چیخ پڑی۔ پھوار رو پڑی، پھول مرجھا کر بکھرنے لگا۔ حسین مہکیلا پیکر گھنا گیا۔ خوشبو نکہت خوف سے منہ چھپا کر صفحۂ قرطاس پر بکھرنے لگیں۔ قلم سے اتر کر الفاظ سسکنے لگے۔ سنہرے اُجالے کالے ہونے لگے۔ من موہنی راتیں ڈسنے لگیں۔ شام کی سیاہی بے وفائی کے خون میں نہا کر ابھرنے لگی اور سپنوں کے جادوگر پھر کسی نئے سپنے کی تلاش میں پرانے جالوں میں نئی پیوندکاری کرنے نکل پڑے۔ وہ دیکھتی رہی احساسات کے زخموں پر مصلحت کی مرہم کاری کرتی رہی کیونکہ دریا کے بہاؤ کو روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اب خیالوں سے پرے اس کی پہنچ سے کافی دور ہو چکا تھا۔ گو وہ اس کا اپنا تھا لیکن نام نہاد رشتوں میں جذبوں کی صداقت کہاں پائی جاتی ہے۔ وہ بھی اپنی تفریحات میں کسی کی بیجا دخل اندازی کو برداشت کرنے کا عادی نہ تھا۔ اس نے اپنے ذاتی معاملات میں گھر اور سماج کی بندشوں کو کبھی قبول ہی نہیں کیا تھا۔ شباب کی منزلوں میں قدم رکھنے سے لیکر عمر کی کئی بہاریں پار کرنے تک وہ من چاہی زندگی بے فکری سے گزارتا چلا جا رہا ہے بلا پیچھے مڑ کر دیکھے ہوئے۔ وہ ماضی سے بے نیاز۔ حال سے بے پرواہ اور مستقبل کے دلِ خوش کن تصورات میں مگن ہو کر زندگی کو ایک الگ انداز سے جی رہا ہے۔ زندگی اور اس کے عیش و عشرت پر اُس کا پورا حق ہے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے لازمی حصہ ہے۔ جس کے حصول میں اُسے کوئی شرم کوئی عار نہیں۔

عمر کے ساٹھ زینے اترنے کے بعد بھی تصورات کی پرواز بلندیوں پر ہے۔ وہی دم خم۔ وہی ولولے اور جوانی کا سا اُبھان آج بھی باسی رنگ میں اُگھتا دیکھا جاتا ہے۔ عالمِ شباب کی رنگ رلیاں بھی اُن کی اپنی مثال آپ ہیں۔ کسی بھی دوشیزہ کو دیکھ کر تعاقب شروع کر دیا جاتا اور نگاہوں کے محاصرے کئے جاتے۔ اکثر اماں وادی کی سرکی مزدورنیوں کو بھی وہ چلتی بھوک میں باسی لقمہ سمجھ کر ہی اپنی بھوک مٹانے میں بُرا نہیں کہتے تھے۔ شاید وہ یہ سوچ کر ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہوں کہ "بھوک میں تو چنے بھی اچھے لگتے ہیں" آخر ان حالات کے پیشِ نظر اچھا موقع دیکھ کر ایک اچھے خاندان کی خوبرو پڑھی لکھی سلیقہ شعار شریف لڑکی سے اُن کی شادی کر دی گئی۔ شادی کی تحریک میں بھی ان کی پسند اور مرضی کا پورا دخل تھا۔

احمد میاں اپنے نیک باپ کے پانچویں فرزند ارجمند ہیں۔ لمبا قد۔ چھریرا بدن۔ کھلتا ہوا گیہواں رنگ جو کہتے ہیں کبھی گورا رہا ہوگا۔ کتابی چہرہ۔ تیکھا نقشہ جنسی شراب میں ڈوبی ہوئی بڑی بڑی مدھ بھری کٹیلی آنکھیں۔ آنکھوں میں سیکس کی پرچھائیاں ڈسکو ڈانس کرتی ہوئی۔ لمبی اونچی لیکن قدرے موٹی ناک جو بیوی کے سامنے کئی بار نیچی ہونے کے باوجود بھی اور لمبی اور اونچی ہوتی گئی۔ کشادہ پیشانی پر سیدھے سیدھے بکھرے بال جنہیں بڑھاپے کی سفیدی چھپانے کے لئے وانڈرکس کی کالک پوت کر

سدا جوان بنے رہنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ بالوں [illegible] لگانے ایکٹر سہگل کا سا ہے۔ لیکن بڑا [illegible] کاربن کاپی بنے رہنے میں احمد میاں کو کمال حاصل ہے۔

تعلیم یافتہ مہذب گھرانے سے تعلق ہونے کی وجہ سے احمد میاں کی تعلیم پر بھی والدین نے کافی توجہ دی۔ خاصہ وقت اور پیسہ لگا۔ لیکن احمد میاں کی بے راہ رویوں میں ان کی تعلیم بس لیول ہی سی ہوئی۔ پھر بیوی کی کوششوں سے روتے مرتے انھوں نے انٹرمیڈیٹ کرلیا۔ سدا جنسی قلابازیاں کھانے والا دماغ اسکول کورس کی غیر دلچسپ کتابوں میں لگتا بھی کیسے۔ ہر سال شان سے فیل ہوتے رہے۔ اور اپنی دلچسپیوں کے فیلڈ میں آگے بڑھتے رہے۔ نوجوان لڑکیوں میں دلچسپی لینا ان کا پیچھا کرنا۔ عورتوں پر ریمارک پاس کرنا۔ پیشہ ور دلالوں کے ساتھ حسن و شباب کی ہر منڈی میں پہنچنا یہی احمد میاں کے دلچسپ آؤٹ ڈور گیمس تھے۔ شادی کے بعد ان کے مزاج میں ٹھہراؤ آنے کے بجائے ان کی دلچسپیوں کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا کہ وہ محلے سے شہر اور شہر سے بیرون شہر ہی نہیں بلکہ ایک صوبے سے لے کر دوسرے صوبے تک داد عیش دینے کے لئے بیوی کا زیور چوری چھپے لے کر آئے دن بھاگنے لگے۔ امیر گھر کی لڑکی وہ اسی لئے بیاہ کر لائے تھے کہ اُس کے جہیز میں ملے گہنوں اور قیمتی سامان کو فروخت کر کے وہ تسکینِ دل و جان کا سامان اپنے لئے مہیا کرتے رہیں والدین سے ملے اس کے جیب خرچ پر ڈاکہ ڈالتے رہیں۔

بمشکل تمام اُن کو بیوی نے سمجھا بجھا کر سروس کرنے پر رضامند کیا اور وہ محکمۂ تعلیم میں ٹیچر کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ سروس سے اور تو کیا ہوتا تھا صرف اتنا فرق پڑا کہ احمد میاں کا پیر بندھ گیا اب وہ بھوپال سے باہر جب تب نہ جا سکتے تھے علاوہ اپنے حق کی سرکاری چھٹیوں کے انھیں وہیں رہ کر اپنے شوق کی تکمیل کرنا تھی جسے وہ کھلے عام بھی کرتے اور گروہ سماج سے چھپ کر بھی جب جیسا موقع دیکھتے کرتے۔ بھوپال کی ایک بہت مشہور کہاوت ہے۔ "پردہ، زردہ اور گردہ" اوّل الذکر دو باتوں سے تو احمد میاں کو کوئی غرض نہ تھی آخر والی بات پر خاص دلچسپی لی کیونکہ جب یہ کہاوت وجود میں آئی ہوگی تب یقیناً اس کا مفہوم شہر اور راستوں کے گرد و غبار سے رہا ہوگا لیکن موجودہ زمانے میں اس کے معنی بدل کر اب نامردہ ہوگئے ہیں۔ خدا کے اس مظلوم ترین درمیانی طبقے سے دلچسپی اور ہمدردی رکھنے والے نیک نام لوگوں کی کمی بھوپال میں کمی نہیں اور اس میں اضافہ کرنے والوں میں احمد کامل سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں۔ گو یہ بات اور ہے کہ وہ اپنے آرٹ میں بے حد ماہر ہیں ہر کام احتیاط ہوشیاری اور انتہائی فریب و مکاری سے کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ بے حد ڈرامائی کرداروں کی طرح اپنی دوہری شخصیت کے روشن پہلو کی پاکبازی اور بلند کرداری کے پارٹ کو کمال صفائی سے پلے کرتے ہوئے خود کو رسوائیوں اور انگشت نمائی سے بچا کر نکل جاتے ہیں۔ وہ ایک کامیاب کھلاڑی کی طرح کبھی چوکے کبھی چھکے مارتے ہوئے سنچری پر سنچری بناتے ہوئے چلتے ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی سے ہارنا تو سیکھا ہی نہیں ہے۔

زندگی کے اس نئے ٹیسٹ میں وہ کچھ ایسے مگن ہوئے کہ انھیں اپنے وہ دن بھولے سے بھی یاد نہیں آتے جب وہ جوانی کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر ہر گزرنے والی ایکسپریس کا انتظار بے چینی سے کیا کرتے تھے اور کسی بھی گارڈ کی پرواہ کئے بغیر ہری جھنڈی دکھا کر ہی لوٹتے تھے۔ اُن کی ڈکشنری میں ناممکن جیسا کوئی لفظ نہیں۔ وہ خود کو نپولین بوناپارٹ سے کسی طرح کم نہیں سمجھتے ہیں وہ اپنے فیلڈ میں سب کچھ مقابلہ اپنے فیلڈ کے بادشاہ ہیں۔ بس فرق ہے تو اتنا کہ نپولین کی ازدواجی زندگی ناکام تھی۔ انھیں زندگی کے اس پہلو میں نیپولین کی ازدواجی زندگی کی طرح گھر کے میداں میں کراری ہار کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ ان کی مسز راحت قلبی کی طرح بے وفا نہیں ہے۔ گو وہ احمد میاں کے ڈارک پہلو سے بھی بخوبی واقف ہے لیکن شریف خاندان کی ہندوستانی لڑکی اپنی قدیم پاکیزہ روایتوں میں جکڑی ہوئی مرد سماج کے ہر ظلم و ستم کو خاموشی سے سہہ لینے میں ہی اپنی عزت اور فرض سمجھتی ہے۔ وہ شرم اور تہذیب کے دائرے میں میاں کو راہ راست پر لانے کی انتہائی کوشش کرتی ہے لیکن پانی تو احمد میاں کے سر سے کبھی کا گزر گیا۔ اب انھیں ڈوب مرنے کا ڈر ہی کہاں۔ وہ تو گلے گلے غلاظتوں کے اندھے کنوئیں میں ڈوبے پڑے ہیں۔ اسکول ٹیچر بننے کے بعد ہی وہاں کے اسٹاف ٹیچرس کے ساتھ انھوں نے اُستاد ہونے کا اپنا حق ادا کیا کہ کوئی کر نہیں سکتا کئی معصوم زندگیوں کو گمراہی کے اندھے غار میں اپنی ہوس کا شکار بنا کر دھکیل دیا۔ کئی حسین اور ذہین لڑکوں کو تباہ کر کے چھوڑا۔ ہر سال نئے کلینڈروں کی طرح احمد میاں کے محبوب بھی بدلتے رہے۔ خوب سے خوب تر کی جانب بڑھنے میں احمد میاں نے کئی چمن اُجاڑے۔ بے شمار کلیوں کو مسلا۔ ان گنت پھولوں کو روندھا۔

لیکن آج کے واقعے کا اثر راحت کے احساسات پر اتنا گہرا ہوا کہ وہ احمد میاں سے ہر طرح نبٹنے کو تیار ہوگئی۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر صورت حال قطع تعلق تک پہنچی تو وہ ذرا نہیں جھجکے گی اور عمر بھر کے اذیت ناک رشتے کے اس لعنت بھرے طوق کو ایک جھٹکے سے ہمیشہ کے لئے توڑ کر پھینک دے گی۔ یا تو احمد میاں ہمیشہ کے لئے ان اخلاق سوز گندی حرکتوں سے باز آجائیں یا اس سے رشتہ توڑ کر جو جی چاہے کرتے پھریں۔ آخر اس کے بھی تو بچے ہیں باپ کی بے راہ روی کا ان پر بھی تو بُرا اثر پڑ سکتا ہے۔ وہ انھیں اس ماحول نے کیسے بچا کر رکھے گی وہ نہیں سمجھ پائی۔

راحت نے ان حالات سے خوف زدہ ہو کر چھوٹی عمر میں ہی لڑکیوں کی شادی کردی۔ ایک لڑکا تعلیم سے ہٹ گیا دوسرے نے گریجویشن کر کے آزادی اختیار کرلی تیسرا باہر تعلیم حاصل کرنے چلا گیا۔ کل جہاں قہقہے بکھرتے تھے آج وہاں تنہائیوں میں ڈوبی اداسیوں کا بسیرا ہے۔ احمد میاں کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ راحت کی تنہائیوں کا خیال کرتے۔ وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ان دیکھی کرتے رہے۔ ہمیشہ غمگیں اور خاموش رہنے والی راحت سے انھیں کوئی ہمدردی

لگے۔ کیا سب لوگ سو گئے۔ یا ابھی کوئی جاگ رہا تھا۔ مدحت نے لحاف سرکا کر جواب دیا۔ معلوم نہیں۔ ہم لوگ تو سو رہے ہیں۔"

"تمہاری ممی نے گولی لے لی۔ وہ سو گئیں یا جاگ رہی ہیں؟"

"جی وہ سو گئیں۔ گولی بھی لے لی ہے۔" مدحت نے نیند میں ہی جواب دیا۔

احمد میاں سب طرف سے اطمینان کرنے کے بعد تیزی سے زینے طے کرنے کے بعد سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے۔ دھڑ سے درمیانی دروازہ بند کر کے اندر سے بولٹ کر لیا۔ دھڑاکے کی آواز ایسی تھی کہ گہری نیند میں سونے والے بھی اٹھ بیٹھیں۔ لیکن بے قراری کو کیا کیجئے جذبات نے عقل کے دروازے کو کمرے کے دروازے سے پہلے ہی بند کر دیا تھا۔

احمد میاں مرکیوری آف کر کے زیرو پاور روشن کیا۔ خوشبو دار اگربتی کی خوشگوار خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا۔ متلاشی مذہبی صحیفوں کی تحریریں آنکھیں کھول کر آنے والے لمحات کا انتظار کر رہی تھیں۔ زیرو پاور بھی گل کر دیا گیا تھا۔ تبھی راحت نے بھی اپنی آنکھیں دروازے کے روزن سے ہٹالیں اور دل تھام کر دیوار کا سہارا لیا۔ وہ سوچ رہی تھی کیا میری طرح خدا بھی بے بس ہو گیا ہے۔ آخر وہ کیوں ان دیکھی کر رہا ہے۔ قیامت کیوں نہیں آجاتی۔ زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی۔ آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔ آخر اور کس بات کا انتظار ہے۔

اندر سے سرگوشیاں۔ پلنگ کی چرچراہٹ سانسوں کی تیز آوازیں۔ متواتر راحت کے ہوش اڑا رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کاش آج وہ کسی طرح کمرے میں پہنچ جائے پھر تو وہ جنم جنم کا حساب احمد میاں سے مع بیاج کے چکا لے گی۔ لیکن کیا وہ ایسا کر سکے گی۔ اگر اس نے کبھی اس طوفان کو نہ روکا تو قدرت اس سے اس کے بچوں سے بھی تو انتقام لے سکتی ہے۔ ان پر بھی تو ایسی بلائیں نازل کر سکتی ہے۔ اس کی بیٹیاں بھی تو اسی آگ میں جل سکتی ہیں جس میں وہ شادی کے دو برس بعد سے ہی جل رہی ہے۔ اس کے بھولے سے لڑکے بھی تو کسی حریص بوڑھے کی درندگی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ تو پھر وہ کیا کرے۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ رہی تھی۔

اس نے سوچا کیوں نہ کمرے کے سبھی دروازے باہر سے بند کر کے اندر سے دروازہ کھٹکھٹا کر احمد میاں کو ٹھیک طور پر نادم کر دے لیکن وہ اپنے اوپر کوئی بات آسانی سے نہیں لے سکتے۔ اندر اس کا لائق وفا شعار شوہر پیار کے رس سے بھرے تھرڈ کے گھڑے انڈیل رہا تھا۔ اور اس کی شریعی کو جی بھر کر چٹا چٹ چاٹ رہا تھا جیسے گندی کیچڑ بھری نالیوں میں سُور کیچڑ چاٹ رہا ہو۔ راحت کے تصور میں یہ تصویر جوں ہی آئی اس کا جی متلا گیا۔ اس نے ایک دم لپک کر تھوک دیا۔ نفرت اور غصے سے اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔

جب اسے سردی کا احساس ہوا تو وہ سائڈ کے دروازے سے اندر آگئی اور اس نے تہیہ کر لیا کہ آج وہ احمد میاں کو سب کے سامنے بے نقاب کر کے چھوڑے گی۔ خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اس طرح قسطوں میں مرنے سے تو ایک بار ہی مرنا بہتر ہے۔ آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے اس ذلالت کی۔ میری بیماری کی شدت کی رات اس کے عیش کی رات بن کر گذرے اور میں ہمیشہ کی طرح آج بھی سہ لوں۔ لعنت ہے میری بزدلی اور شرافت پر۔ اور اس نے فوراً ہی اپنی اسکیم کے خلاف غصہ سے مغلوب ہو کر اندر کھلنے والا دروازہ تیزی سے کھٹکھٹایا اور آپے سے باہر ہو کر چیخی۔

"دروازہ کھولئے۔ کیا ہو رہا ہے اندر۔ کون ہے آپ کے ساتھ۔ میں کہتی ہوں فوراً دروازہ کھولئے۔" احمد میاں نے کوئی نوٹس نہ لیا اور بڑی دیر بعد ڈرامائی انداز میں سونے والی آواز بنا کر اندر ہی سے بگڑتے ہوئے پوچھا

"بھئی کیا بات ہے۔ سونے نہیں دیتیں۔"

"دروازہ کھولئے۔ ناٹک بند کیجئے۔ آپ سو نہیں رہے ہیں۔ پانچ منٹ میں کوئی سو نہیں جاتا فوراً کھولئے دروازہ۔ میں کھڑی نہیں رہ سکتی۔ راحت نے زور سے چلا کر کہا۔ لیکن احمد میاں قطعی طور پر اپنا دلچسپ کھیل ختم کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ تو آج کے گیم میں سنچوری بنانے کی فکر میں تھے لیکن خلاف توقع یہ گڑبڑ ہو گئی۔ وہ سمجھ گئے یہ سب بے صبری اور جلد بازی کا نتیجہ ہے ورنہ یہ ہنگامہ کاہے کو ہوتا۔ برابر خاموشی اور دیر ہوتی جا رہی تھی۔ اور پھر راحت مشتعل ہو کر دروازہ پیٹ رہی تھی۔ اور چلا رہی تھی۔

دروازہ کھولتے کیوں نہیں۔ آخر اتنی دیر سے کیا کر رہے ہیں آپ۔ اگر اب دیر کی تو ...."

بڑی دیر بعد احمد میاں اپنی آواز درست کرتے ہوئے بولے۔

"کیا کام ہے تمہیں دروازہ کھلوانے سے۔ بلا وجہ کیوں ڈسٹرب کر رہی ہو نہ خود سوتی ہو نہ دوسروں کو سونے دیتی ہو۔" اندر سے ہی اتنا کہہ کر وہ پھر کسی کام میں مصروف ہو گئے۔

کافی دیر اور گذر جانے کے بعد قدموں کی ہلکی آہٹ۔ دھیمی دھیمی سرگوشیاں اور بجائے اندر کا دروازہ کھولنے کے احمد میاں نے باہر کا دروازہ کھول کر اپنے مہمان کو بڑی خاموشی اور آہستگی سے بلا کسی آہٹ کے رخصت کیا۔ دروازہ واپس بند کر کے لائٹ آن کی اندر کا سب درست کیا اور پھر بڑے سانداز سے اندر والا دروازہ کھولا۔ اور راحت سے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ تیوری چڑھا کر بولے۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟" راحت نے اُن کے سوال کو حقارت سے اُڑا کر دلیری سے کیا۔

"ایکٹنگ بہت ہو چکی اب صاف صاف بتائیے کہ اس دروازے کو کھولنے سے پہلے باہر کے دروازے سے کیسے نکالا۔ کون تھا وہ؟ کیا ہو رہا تھا یہاں۔ دروازہ کیوں نہیں کھولا؟ یہ سب کیا ہے آخر۔ آپ اپنی حرکتوں سے اس عمر میں بھی باز نہیں آئیں گے۔ کیا سوچا ہے آپ نے۔ اگر مرنا ہی

یا انکار نہیں رہتا۔ اس کی معصوم بے ضرر ہستی سے
انھیں کوئی خوف و خطرہ نہ تھا۔ بڑے سائیں ان
اور آزادی سے ان کا کاروبار چل رہا تھا۔ زندگی
کئی حادثوں سے گذرتی ہوئی اس موڑ پر آکر
ٹھہری جہاں وہ سرکاری ذمہ داریوں سے بھی
سبک دوش ہوگئے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد
سرکاری مراعات بھی سب ختم ہوگئیں لیکن خدا کی
اس چھوٹی سی دنیا میں تسکین دل و جاں کا سامان
بیچنے والے تاجروں کی بھلا کیا کمی۔ کمی ہے احمد میاں
جیسے فیاض، باکمال اور زندہ دل کسٹمروں کی جو
مال کی منھ مانگی قیمت کے ساتھ خاص خاطر
مدارات بھی کرتے رہتے ہیں۔ اپنی وضع داری
اور اصولوں کو بھی تو نباہنا انھیں لازمی تھا۔
اور اپنے اصول انھیں جان سے بھی پیارے تھے۔

احمد میاں اکثر و بیشتر اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈال کر حاوی نہ ہونے دینے کے لئے شطرنج کی چالوں کی طرح اپنے جھوٹے رعب داب کی شہ دیتے رہتے۔ بے مطلب کی باتیں خود کی اپنے منھ آپ میاں مٹھو جیسی جھوٹی تعریفیں۔ بلا وجہ کی ڈانٹ ڈپٹ۔ شکایتی انداز میں ہمدردی کا اچھا طریقہ۔ غرض یہ کہ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ لوگ ان کی شاعرانہ باتوں اور اصلیت سے اچھی طرح واقف ہیں پھر بھی وہ اپنی برتری کی چھاپ ہر ایک کے دل پر جمانا چاہتے ہیں اور ایک گہری ندی کی طرح راحت کی زندگی ہے کہ جو کناروں پر پتھر پھینکے جانے کے باوجود بھی چوٹ کا درد سہتے ہوئے خاموشی سے اپنی سمت میں بہتی رہتی ہے۔ ان پتھروں کو اپنی قسمت کا حاصل سمجھ کر۔ وہ تقدیر بنانے والے سے بھی کوئی گلہ نہیں کرتی۔ لیکن آج طوفان آگیا۔ کئی دنوں سے پکتا ہوا لاوا آج پھوٹ پڑا۔ دسمبر کی برفانی رات تھی آج راحت کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اختلاج قلب کی تکلیف سے وہ بے چین تھی۔ رات کافی سرد تھی۔ سردی کی وجہ سے نو بجے سے پہلے ہی سارے ماحول میں خاموشی چھا گئی تھی۔ گھروں کے دروازے بھی جلد ہی بند ہو چکے تھے۔ بالائی منزل پر اپنے کمرے میں راحت بے قراری سے ٹہل رہی تھی آج اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ کبھی لیٹتی کبھی بیٹھتی اور کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ ملازم انور۔ بیٹی مدحت اور اس کی سہیلی سلمیٰ بھی اسی کمرے میں راحت کے پاس موجود تھے۔ راحت کی حالت سے متفکر اور پریشان ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر کو بلانے پر مدحت زور دے رہی تھی۔ ہاسپٹل لے جانے کی رائے سلمیٰ دے رہی تھی اور انور کسی بھی حکم کا منتظر تھا۔ ایسے میں اچانک احمد میاں اوپر آئے اور حالات کا جائزہ لئے بغیر بیٹی سے ادھر ادھر کی غیر ضروری باتیں کرنے لگے۔ اپنی باتوں میں کسی کی دلچسپی نہ دیکھ کر وہ ذرا چڑ گئے۔ معلوم کرنے پر سلمیٰ نے بتایا کہ امی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے وہ بے حد پریشان ہیں اور ہم لوگ بھی انھیں دیکھ کر گھبرا رہے ہیں کہ اب کیا کریں۔

احمد میاں نے سلمیٰ کی زبانی راحت کا حال سنا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اس کی حالت سے متاثر کیا ہوتے۔ آج تو ان کی آنکھوں میں چاروں کونے سرسوں پھول رہی تھی۔ باتوں کا انداز بھی بڑا والہانہ تھا۔ چال میں ایک عجیب مستانہ پن تھا۔ ایک ہفتہ باہر گذار کر کل ہی لوٹے ہیں۔ کل شب راحت سے رسمی ملاقات کا فرض ادا کیا ہے اور آج کسی ایسی طلب نے انھیں دیوانہ بنا رکھا ہے جو الفاظ کی پہنچ سے باہر ہیں۔ دل کی کیفیت ان کے ہر انداز سے جھلک پڑ رہی ہے۔ ابھی ابھی باہر سے لوٹے ہیں۔ دماغ میں کوئی پلان چل رہا ہے۔ مچلتے ہوئے ہیں۔ کبھی بیٹھتے ہیں تو کبھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنی جانب مخاطب نہ دیکھ کر وہ راحت سے بولے۔ "گھومنے سے بہتر ہے کہ بستر میں لیٹ جاؤ اس طرح تو طبیعت اور بگڑے گی۔"

راحت نے سنا اور خاموش رہی۔ اسے اپنی حالت کا صحیح اندازہ تھا کہ اسے کیسے چین آئے گا کیونکر سکون ملے گا۔ وہ کیا جانے کہ آج راحت کس تکلیف سے گذر رہی ہے۔ کیسے اس کا دل تڑپ رہا ہے۔ دسمبر کی شدید سردی میں بھی وہ پسینے میں نہائی ہوئی ہے۔ جانے کیوں کل کے خواب نے آج اسے کسی حادثے کی نشاندہی کی ہے لیکن وہ خوابوں پر یقین نہیں کرتی۔ پھر بھی احمد میاں کے انداز دیکھ کر اسے لگ رہا ہے کہ جیسے آج واقعی کوئی حادثہ ہونے کو ہے۔ اس کا دل نامعلوم اندیشوں کے بوجھ سے اور دبا جا رہا ہے۔ وہ گیلری میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی۔ سامنے ہی عام راستہ تھا جو کہ سردی کی وجہ سے سنسنی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سامنے کا بجلی کا کھمبا بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

احمد میاں پچھلے کمرے میں آنے سے پہلے سب کو یہ باور کرا چکے تھے کہ ان دنوں اکثر رات کے پچھلے پہر نیند کم آتی ہے۔ اس لئے آج ذرا جلدی سو جانا چاہتا ہوں۔ میرے کمرے سے آمد و رفت کا سلسلہ بند کرنا ضروری ہے تاکہ نیند میں ڈسٹربنس نہ ہو۔ اس لئے میں خود ہی درمیانی دروازے کو اندر سے بند کر لوں گا۔ ابھی [illegible] کہاں کھانے بازار جاؤں گا۔ وہاں سے آکر سو جاؤں گا۔

انھوں نے راحت کو نیند کی ٹیبلیٹ اور پانی کا گلاس دیا کہ یہ بھی کھا لینے سے کچھ دیر بعد ہی نیند آجائے گی۔ سو جاؤ گی تو سب تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔ اس نے ٹیبلیٹ لے کر مٹھی میں دبا لی اور کچھ دیر بعد لینے کو کہہ کر احمد میاں کو ٹال دیا۔ احمد میاں نے ذرا آواز میں گیارہ بجے کی خبریں سنیں بغیر یہ محسوس کئے کہ اور کوئی بیمار ہے۔

احمد میاں بازار گئے۔ راحت اب بستر پر تکیے کا سہارا لئے لائٹ آف کر کے سرہانے کھڑکی کی طرف منھ کر کے بیٹھ گئی اس کی نگاہیں اسی رہ گذر پر لگی ہوئی تھیں جس پر سے ہو کر احمد میاں لوٹنے تھے۔ وہ بیٹھی پہلو بدلتی رہی اور شکوک کے جال اس کے گرد اپنی گرفت مضبوط کرنے لگے۔ پندرہ منٹ بعد ہی غیر متوقع طور پر احمد میاں اپنے ساتھ اپنی تفریح کا سامان لے کر واپس آئے۔ راحت نے دیکھا آنے والا جانا پہچانا ہوا ہے۔ اور وہ اکثر و بیشتر دن میں مزدوری پر اور رات میں ملاقات کے لئے ان کے میاں کے پاس آتا رہا ہے کبھی ان کے ساتھ اور کبھی اکیلا۔ لیکن آج اسے دیکھ کر انھیں خود کو اس طرح نظر انداز کئے جانے کا بے حد ملال ہوا۔ شدید غم اور نفرت کے جذبے سے اس کا پورا جسم کانپنے لگا۔ وہ لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

مہمان کو بٹھا کر احمد میاں زینے پر آکر پوچھنے

۳۰ جنوری ۱۹۸۴ء

ہے تو اس طرح کیوں ڈرتے ہو۔ آپ تو بیمار رہتے ہیں نہ آپ کو کوئی تکلیفیں ہیں۔ ہمیں بیوقوف بنانے کا یہ گھٹیا طریقہ خوب نکالا ہے آپ نے۔ آخر آپ کی غیرت کہاں مر گئی۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"مجھے کچھ بھی تو نہیں۔ یہ سب تمہارا وہم ہے۔"

احمد میاں صاف جھینپتے ہوئے آہستہ سے کروٹ پھیر کر لیٹے۔ اور دروازے کے ادھ کھلے پٹ میں خود کھڑے ہو کر راحت کی بات کا جواب دے کر شاید کو پھر بند کرنا چاہتے ہوں گے کہ راحت نے دروازے سے ان کا ہاتھ ہٹایا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے سانپ نکل جانے کے بعد لکیروں کا گہرا جائزہ لیا۔ کمرے کی ہر چیز کو غور سے دیکھا اور ٹیبل کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ احمد میاں بستر پر لیٹ گئے اور اپنی آنکھوں اور چہرے پر ہاتھ رکھ لیا۔

راحت بے چینی کے عالم میں کھڑی ہوئی احمد میاں سے سخت و سُست کہتی رہی۔ کڑھتی اور بکتی رہی ویسے بھی وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے بھی بے حد پریشان تھی اور احمد میاں نے یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو ان صدمات سے دوچار کیا۔ ایک نازک مزاج نیک دل اور شریف خاندان کی پڑھی لکھی قابل اور کماؤ عورت بھلا یہ ستم کب تک سہتی۔ اس کا دل اس بے رحمانہ برتاؤ سے ٹوٹ گیا اور وہ بپھر کر انتقام پر آمادہ ہو گئی۔ اس نے احمد میاں سے دو ٹوک فیصلہ کرنے کی دل میں ٹھانی۔ اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب ہمارا فیصلہ ہو ہی جائے تو بہتر ہے۔ آپ بداعمالی اور سودا مستی چھوڑ نہیں سکتے اور میں اسے اب قطعی برداشت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ہم اپنی راہیں بدل لیتے ہیں۔ آپ مجھے طلاق دیجئے اور اپنی مرضی کی زندگی گزاریئے۔ میرے ساتھ رہ کر یہ نہیں چلے گا۔"

"میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا" احمد میاں نے دبی آواز میں کہا۔

"جانے سے پہلے فیصلہ کرنا ہو گا۔ اس طرح منہ چھپا کر چلے جانے سے کسی مسئلہ کا حل نہیں نکلتا۔ بہت ہو چکا یہ آنا جانا۔" راحت نے بھی جوشیلے انداز میں کہا۔

"بیٹھ جاؤ یا جا کر سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔ ابھی میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

"ٹھیک ہے صبح تک میری بات پر غور کر لینا۔ میں صبح سکول سے لوٹ کر ملاقات کروں گی۔" وہ اتنا کہہ کر سسکتی ہوئی اوپر جا کر اپنے بستر میں لیٹ گئی۔ غم کی شدت سے اسے تیز بخار آ گیا۔ تمام رات انگاروں پر گزاری۔ صبح اٹھ کر اپنی ڈیوٹی پر جیسے تیسے پہنچی۔ کئی بار سر چکرایا کئی بار گرتے گرتے بچی۔ گیارہ بجے جب لوٹی تو احمد میاں کو کمرے میں نہ پا کر بیٹی سے پوچھا۔ بیٹی سے پتہ چلا کہ ڈیڈی صاحب قریبی قصبے میں کشتی کا دنگل دیکھنے اپنے دوستوں کے ساتھ جا رہے ہیں۔ شام کو لوٹیں گے۔

راحت نے نوکر کو قریبی بازار میں بھیجا جہاں احمد میاں کا ٹھکانہ تھا اور کہلا بھیجا کہ میڈم نے ابھی گھر پر ضروری کام کے سلسلے میں بلایا ہے۔

اتفاق سے نوکر کو احمد میاں بازار میں ہی مل گئے۔ نوکر نے مالکن کا پیغام ان کو پہنچا دیا۔ پیغام ملتے ہی وہ نوکر کے ساتھ ہی گھر چلے آئے۔ اور بڑی سادگی سے بلانے کا سبب پوچھا۔ راحت انہیں سر سے پیر تک غور سے دیکھتی رہی۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس نئے چمچماتے سیاہ قیمتی بوٹ موزے پہنے ہوئے۔ آنکھوں پر دھوپ کی سنہرے فریم کی گاگل چڑھائے ایک دم ہینڈسم اور اسمارٹ دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ بکھیرے ہوئے احمد میاں بالکل کالج بوائے لگ رہے تھے۔ اُسے لگا یہ تو وہ رات والے ڈرامے کے ہیرو احمد میاں ہرگز نہیں لگتے وہ تو کوئی اور ہی خبیث آدمی رہا ہو گا اور یہ اپنی شخصیت کی دُہری تصویر ہیں۔

ماحول سے دور چبوترے پر تخلیہ میں بیٹھ کر بالمقابل چیئرس پر ایک دم روبرو ہو کر راحت نے ان سے فیصلہ کن انداز میں بات چھیڑ دی۔ آج بات کی شروعات کرنے کے لئے اُسے کسی تمہید کی ضرورت پیش نہ آئی اس نے ڈائریکٹ سوال داغ دیا۔

"آپ نے غور فرما لیا رات والے گہرے مسئلہ پر؟"

"میں نہیں سمجھا۔ آپ کا کون سے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے؟" احمد میاں نے بڑی ادائے دلبری سے مسکراتے ہوئے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ راحت ان کی اس شاعرانہ بات سے تلملا کر رہ گئی ان کے جواب نے آگ پر پیٹرول کا کام کیا وہ تڑپ کر بولی۔

"ایکٹنگ چھوڑیئے۔ رات والے موضوع پر آیئے۔ میرا اشارہ اسی نیک کارنامے سے ہے جو آپ رات میں بڑے شوق سے انجام دے رہے تھے۔ اب زیادہ میری زبان نہ کھلوایئے میں سمجھ رہی ہوں آپ نے اتنا موقع پا کر ہر مخالف ماحول سے نپٹنے کے لئے خود کو اچھی طرح تیار کر لیا ہے لیکن خیال رہے آپ ہمیشہ کی طرح آج اپنی کسی بھی چال میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ پہلے تو آپ یہ چشمہ اتاریئے۔ میری طرف دیکھئے اور میرے سوالات کا صحیح صحیح جواب دیجئے۔"

"آپ مجھ سے کن سوالوں کے جواب چاہتی ہیں؟ پہلے اپنے سوالات تو بتایئے اگر معقول ہوئے تو جواب دوں گا ورنہ میں جواب دینے کے لئے پابند نہیں ہوں۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ جواب نہیں ہے آپ کی معقولیت کا بھی۔ لیکن حضور آج کا تو موضوع ہی غیر معقول اور غیر فطری معاملے کا ہے۔ روشنی ڈالیں گے اپنے اس سیاہ کارنامے پر۔ کیا خیال ہے آپ کا اپنی آئندہ زندگی کے لئے۔ کچھ احساس اور شرمندگی ہے اپنی حرکتوں پر؟"

"آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں محترمہ میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ میں تو خود حیران ہوں کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ اور آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتیں تو ویسے کہئے میں الگ ہٹ جاتا ہوں۔ آج ہی اپنے لئے کوئی کمرہ ٹھیک کر لوں گا۔ لگے ہاتھوں اتنا بھی بتاتی چلئے کہ اپنے شہر اپنے محلے میں بھی رہنے دیں گی یا کہیں اور چلا جاؤں۔

میں تو یہاں صرف آپ کی وجہ سے پڑا ہوں ورنہ میرا یہاں ہے کون۔ اگر آپ بھی ایسا چاہتی ہیں تو میں آج ہی آپ کا گھر آپ کا شہر اور کہیں گی تو آپ کا صوبہ بھی چھوڑ جاؤں گا۔ ٹھیک بھی ہے بے کار میں آپ پر بوجھ بنا ہوا ہوں۔ میں دیتا ہی کیا ہوں آپ کو مجھ سے آرام بھی کیا ہے آپ کو۔ احمد میاں اپنی مردانہ فطرت کو بروئے کار لاکر انتہائی شاطرانہ انداز میں کسی منجھے ہوئے ایکٹر کی طرح اپنے سوچے سمجھے ڈائیلاگ بول رہے تھے۔ اور راحت حیران ہوکر ان کی صورت دیکھ رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اُن کی چالوں میں آجاتی۔ لیکن آج تو وہ ٹھان کر بیٹھی تھی کہ یا تو زندگی بنتی ہی ہے ورنہ بگڑی ہوئی تو ہے ہی۔ اور زیادہ بگڑ جائے گی۔ کوڑھ میں کھاج ملنے سے فرق ہی کیا پڑے گا۔ اور اگر یہ آدمی لائن پر آگیا تو باقی زندگی چین اور سکون سے گذر جائے گی۔ اُس نے ہمت بٹور کر کہا ۔۔۔۔

"دیکھئے جناب میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ یہ عیاری کی باتیں چھوڑ دیجئے اور اس حقیقت پر ایسی مکارانہ باتوں سے پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کیجئے جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی اور سُنی ہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ اپنا کیریکٹر سنبھالئے۔ گندی اور غیر فطری حرکتوں سے قطعی پرہیز کیجئے۔ زندگی کی بیش بہا نعمت کو یوں غلاظتوں میں نہ کھپایئے اگر نیکیاں نہیں کر سکتے تو برائیوں سے ہی بچئے خدا کے لئے اس کشتی کو طوفانوں سے آشنا نہ کیجئے جس میں آپ کے ساتھ میں اور میرے بچے بھی سوار ہیں۔ خدا کے عتاب سے ڈریئے جو کبھی بھی عذاب کی شکل میں آپ کے ساتھ ہم پر ٹوٹ سکتا ہے۔ ہماری اور بچوں کی زندگی سے کھلواڑ نہ کیجئے۔ ہم تو آپ کا دم ہی اپنے لئے غنیمت سمجھے ہیں۔ دُنیا کے اس خرابے میں آپ ہمارے لئے آہنی دیوار ہیں۔ ماحول کے خطرات سے حفاظت کے لئے آپ ایک مضبوط ڈھال ہیں۔ ہمارے گھر کا وقار ہیں۔ جب گھر میں باپ، بھائی، شوہر اور بیٹا نہیں ہوتا وہ گھر خطرات کی آماجگاہ اور غیر محفوظ ہوتا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کیجئے آپ کے بغیر میری زندگی بے معنی ہے لیکن آپ کے بگڑے ہوئے حالات نے آج مجھے اس حد تک مجبور کر دیا کہ میں خود آپ سے طلاق لینے کی بات کہہ رہی ہوں۔ آپ خود غور کیجئے اور ایمان سے کہئے اس میں میرا قصور ہے یا آپ کی غلطی۔ میں زندگی میں خلوص وفا اور مکمل اعتماد چاہتی ہوں۔ منافقانہ رویہ اور دوغلا پن نہیں۔

زندگی کے گھٹن بھرے لمحوں میں میں اب اور جینا نہیں چاہتی۔ مجھ سے اب یہ گھناؤنا ناٹک نہیں دیکھا جاتا۔ شرافت اور انسانیت کی دھجیاں اپنے گھر میں اُڑتی ہوئی نہیں دیکھی جاتیں۔ لہٰذا لحاظ برطرف اگر یہ رشتہ رہے گا تو حق و صداقت ایمان و اعتماد پاکبازی اور شرافت کی بنیادوں پر ہی قائم رہے گا۔ ورنہ میں قطع تعلق کر لینا چاہتی ہوں۔ آج اور ابھی۔" بولئے کون سا راستہ پسند ہے۔ بہ نسبت کسی کو دھوکا دینے سے بہتر ہے کہ اُسے ایک ہی بار اپنی راہ سے ہٹا دیا جائے۔ میں بخوشی اس جہنم سے نکلنے کو تیار ہوں تاکہ آپ آزادی سے اپنی من چاہی زندگی سے دیوانگی کی حد تک لطف اندوز ہوتے رہیں۔ کوئی دیکھنے روکنے والا نہ ہو۔"

"اچھا آج میں اپنا سب سامان لے کر یہاں سے چلا جاتا ہوں۔" احمد میاں نے زچ ہوکر کہا۔

"صرف ایک ہی شرط پر کہ پہلے مجھے طلاق دیں تاکہ ہم اپنے اپنے معاملات میں قطعی آزاد ہوں اپنی ذاتیات میں ہم خود مختار ہوں ایک دوسرے کے سامنے جواب دہ نہ ہوں۔" راحت نے اس جوشیلے انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"طلاق سے کیا ہوگا، طلاق کو آپ اتنا ضروری کیوں سمجھتی ہیں۔ بغیر طلاق کے بھی تو ہم آپس میں تشنہ و غیر متعلق رہ سکتے ہیں۔"

قطع نہ کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

"بہت خوب آپ اس معاملے کو ہنسی میں نہ اڑایئے۔ اس شعر کی معنویت آپ کے حال کے مطابق نہیں۔ آپ کہاں اس کی معنویت کو پہنچ سکتے ہیں۔ اور طلاق کی اہمیت کو میں اپنے لئے بھی ضروری سمجھتی ہوں۔ میں بھی اپنے معاملے میں آزاد اور خود مختار ہوں گی۔ میرے بھی جذبات ہیں۔ زندگی کی خوشیوں پر میرا بھی حق ہے۔ میرے لئے بھی زندگی اتنی ہی حسین اور تابناک ہے جتنی کہ شاید آپ کے لئے بھی نہیں۔ خدا کی اس حسین کائنات میں قدم قدم پر بکھری رنگ و نور کی حسین سوغاتیں میرے لئے بھی ہیں۔ آپ کے اور میرے درمیان عمر کا لمبا فاصلہ۔ برسوں کا طویل فرق مجھے بھی تو گریز کرنا ہوگا اپنی بے چین تمناؤں کے حصول کے لئے۔ لیکن نہیں۔ میری اپنی قدریں اصول۔ نظریے۔ معیار اور ذہنیت میں فرق اتنا ہے کہ میں بلندیوں کو چھو لینے کی تمنا کرتی ہوں صداقت اور خاندانی روایتوں کی امین ہوں۔ خدا اور سماج کی قائم کی ہوئی حدوں میں رہنا چاہتی ہوں اور آپ میرے خیالات کے بالکل برعکس۔ آپ ذرا مجھے آزاد کر کے تو دیکھئے۔

میرے لئے بھی زندگی کے بہترین اور قیمتی مواقع ہیں۔ غموں کی اس چلچلاتی دھوپ سے نکلنے تو دیجئے کتنے آسمان مجھ پر سایہ فگن ہوتے ہیں۔ کتنے ہاتھ مجھے اپنی پناہوں میں لینے کے لئے بڑھتے ہیں۔ مجھے بھی زندگی کی راہوں میں کسی ایسے ہم سفر کی ضرورت ہے جو میرا اور صرف میرا ہو۔ جو مجھ پر اپنے شب و روز نثار کرتا ہو۔ بے وفا۔ غدار اور دوغلا نہ ہو۔ بیچ راہ میں تنہا چھوڑ کر اپنی راہیں بدلنے والا بے ایمان اور عیار نہ ہو۔ دغاباز اور لٹیرا نہ ہو۔ راحت کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آرزو بے قابو ہو رہی تھی۔ احمد میاں نے بڑے اداکارانہ انداز میں ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا اور بے حد قریب چہرہ کھینچتے ہوئے مسکرا کر پیار بھرے رازدارانہ انداز میں۔ لہجے میں بلا کی نرمی اور شیرینی کا پُٹ دیتے ہوئے کچھ کہنا چاہا جو اب تک اس کی باتوں کو بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سُن رہے تھے۔ ماحول کی نزاکت اور

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

افسانہ

سرکس کا شیر

حبیب راحت حباب

محلہ ٹولہ کے شریفوں کی تو زندگی اجیرن کر رکھی تھی ان لوگوں نے سارے ہی دن دن بھر کرتے پھرتے پھرنا، کبھی کسی کے آنگن میں دوڑتے پھرنا، کبھی کسی کے ٹھنڈی غسلخانوں میں چھپتے پھرنا، بے دھڑک کھیل بھی دھماچوکڑی کے بعض اوقات کھیلتے کھیلتے ہی لڑائی جھگڑے کرنا اور پھر آپس میں سر پھٹول۔! نتیجتاً کچھ دن امن و سکون کا عالم رہتا بعد کو پھر وہی دھینگا مشتی۔! عورتیں عاجز۔ اگر کوس کاٹ لیتیں جی بھر جائے تو خاموش ہو رہتیں۔! لیکن ادھر وہی ہی ہی ہی ہو ہو اکون سنتا ہے آپ کیا بک بک کر رہی ہیں۔؟

بس میٹرک اور پھر ہائر سیکنڈری کا امتحان پاس کر لینے کے بعد تو سنجیدگی آ ہی جاتی ہے۔ مگر شیر خاں اور اس کے ہمجولیوں کے عادات و اطوار میں کوئی فرق نہیں آیا..! ابتدا میں روزگار کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکے.. اسی اثنا میں مجھ تک بھی اس کی رسائی ہوئی۔!

میں چونکہ محلہ والوں کی دانست میں زیادہ پڑھا لکھا تھا اس لئے اکثر لکھا پڑھی کے کاموں کے لئے لوگ سیدھے میرے پاس ہی آتے۔ محلے بھر کے بزرگ بچے، چھوٹے بڑے اکثر مجھے "بھیا" کہہ کر ہی مخاطب کرتے۔ اس لحاظ سے شیرا بھی میرا احترام کرتا۔ روزگار کے سلسلے میں وہ اکثر مجھ سے ملنے آتا۔

باوجود کوششوں کے جب اس کو روزگار مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آیا تو پھر...!

محلہ بھر میں شیر خاں عرف شیرا اور اس کے سنگی ساتھیوں کی دھاک جم گئی۔ دیگر محلوں کے چھٹے ہوئے اوباش اور موالی قسم کے لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی شیرا چھاتی ٹھونک کر کہتا۔ "آجائے سالا مائی کا لال، اگر کوئی ہو تو۔ شیرا سے ٹکر لینے والا۔" اور دبی زبان میں احتجاج کرنے والے بھی خاموشی سے تتر بتر ہو جاتے۔

شیرا تھا بھی شیر کی طرح۔ بھاری بھر کم جسم گول مٹول سا چہرہ۔ بھوری رنگت بھری بال بڑی بڑی نیلی آنکھیں۔ جس میں بے مروتی چھائی ہوئی فوجی کی بندوق کی طرح دشمنوں پر ہمیشہ تنی رہنے والی ناک۔ اور آواز بھی ببر کی طرح گرجدار۔ واقعی شیر تھا وہ۔!

امام باڑے کے دالان میں کھلے بندوں قمار بازی کا اڈا جمتا۔ کس کی مجال جو روک دے انہیں۔ کسے فرصت جو پولیس کو مخبری کرے۔؟ آخر پولیس ہے کیا بلا۔ شریف آدمی تو پولیس کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتا ہے۔ آج کل پولیس کے تو دونوں ہاتھوں میں لڈو رہتے ہیں۔ میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں اپنے گھر اپنے شہر سے دور کلکتہ چلا گیا تھا۔

آٹھ دس برس بعد وطن لوٹا ہوں۔ سب کچھ بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ پت جھڑ کا موسم ہے میں اپنے کمرے میں ایزی چیئر پر ادھ لیٹا سا پڑا ہوا کھڑکی سے صحن میں بچھے خشک و زرد پتے اور نیم عریاں درختوں، اور رنگا رنگ پھولوں کے مختلف جھرمٹوں کی طرف دیکھ رہا ہوں۔

معاً آنگن کا بڑا دروازہ کھلا۔ اور وہ ہڈیوں کا پنجر سر جھکائے آنے لگا۔

"اُف میرے خدا.. یہ کیا۔؟"

وہ سیدھا میرے کمرے میں گھستا چلا آیا۔ اور سلام کر کے مزاج پرسی کی اس نے

میرا ذہن تو اس کی حالت دیکھ کر چکرا رہا تھا۔ میں نے اس کو کیا جواب دیا اور پھر کیا سوال کیا اس سے۔ مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں میں تو سراپا سماعت بنا اس کی بات سنتا رہا۔ "بھیا جانتے ہو مجھے سروس مل گئی ہے۔ P.H.E. ڈپارٹمنٹ میں۔ مسٹر رول پر۔"

"اور کام۔؟" اس نے قدرے توقف سے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ کام وہی مزدوری، وہی سمنٹ کا تسلہ وہی کدال پھاوڑا!

لیکن نہیں، میں ہائر سیکنڈری تک پڑھا ہوا ہوں نا؟ اس لئے انجینئر صاحب کی خاص مہربانی ہے مجھ پر۔! وہ مجھ سے صرف اپنے گھر کا سودا سلف بازار سے منگواتے ہیں۔ صبح ان کی ننھی منی ۴ سالہ بے بی کو مال منڈر چھوڑنے جاتا ہوں دوپہر کو واپس لینے جاتا ہوں اور تمام دن بے بی کو سنبھالتا ہوں اس کے ساتھ ہی کھیلتا ہوں۔"

اس کی آواز میں کرب کی گھنگھور سی گھٹائیں امڈ آئی تھیں۔ اور صاف اس نے رقت انگیز آواز میں کہا۔ جب میں بے بی کو اپنی پیٹھ پر لاد کر، گھوڑا بن کر سارے کمروں میں دوڑتا ہوں اور .. اور بے بی اپنی معصوم تتلاتی زبان سے کہتی ہے۔ "چل میرے گھوڑے ٹک ٹک .. تو.. تو بھیا..

وہ ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ میں خود اپنے آپ کو سنبھالتا رہا۔ اُف میرے خدا!... میری تمام تر شکایتیں اس آدھے ادھورے جملے میں سمٹ آئیں۔

میں نے شیرا کو تسلی دی۔ زندگی سے مقابلہ کرنے کے لئے ہمت بندھائی اور کل ہی اخبار میں شائع B D T کی جگہ کے لئے اس کو درخواست دینے کا مشورہ دیا۔

میں نے سوچا شیرا یہ مژدہ سن کر خوشی سے ناچ اٹھے گا لیکن اس نے بدستور طنزاً مسکراتے ہوئے کہا۔ ہونہہ بھیا کی باتیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو میں اوور ایج ہو چکا ہوں۔"

اور ایک تیز دھار چھری میرے دل میں "دور دور" تک اترتی چلی گئی وہ مجھے سنبھلنے کی مہلت دئے بغیر رخصت طلب کرتے ہوئے بولا۔ "اچھا بھیا اب میں چلتا ہوں۔ بے بی کو مال منڈر چھوڑ کر بازار سے سبزی وغیرہ لینے کے لئے جاتا ہوں۔"

فضا پر چھائی ہوئی کبیدگی و مکدر کو دور کرنے اور اس کے بگڑے موڈ میں بشاشت

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

عتیق اقبال — آسودگی



• تین دن کے فاقوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا. جس کے باعث رکشہ کے پیڈل پر اس کی پنڈلیاں کانپ رہی تھیں.

سڑک کی چوڑی چکنی چھاتی پر ہزاروں سائے بھاگ رہے تھے. وہ تھکا تھکا اور مضمحل سا دو انسانوں کا بوجھ اٹھائے پسینہ میں نہایا. پوری محنت و جانفشانی سے پیڈل پر پیر کا دباؤ ڈال کر رکشہ کو آگے بڑھانے کی سعی کر رہا تھا.

ذہن میں ہزاروں چنگاریاں ناچ رہی تھیں. بھوک، افلاس اور بیماری کی کئی دن سے اس کی بچی موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی. لیکن پیسہ ....

اس کا پورا جسم آگ میں جل رہا تھا.

لوگ اس کا لاغر جسم دیکھ کر بیٹھنے میں احتراز کرتے صبح کے بعد یہ پہلی سواری کافی لمبے فاصلے کی اسے ملی تھیں. منزل پر پہونچانے کے بعد اسے مزدوری ملنا تھی وہ اسی سوچ میں مسرور پیڈل پر پیر کا دباؤ بڑھا رہا تھا. کہ اچانک اس کا رکشہ ایک ٹیکسی سے ٹکرا کر الٹ گیا. اس کے ناتواں جسم سے گرم گرم خون بہہ نکلا اس کی چیخ کے ساتھ ٹیکسی ایک دھچکے سے رک گئی اور کئی سائے اس کے اندر سے نکل آئے. ایک ساعت میں زخمی پیکر ٹیکسی کے اندر پہونچ گیا. اور ٹیکسی ہاسپٹل کی طرف تیزی سے بھاگنے لگی.

بے ہوشی کی کیفیت میں جب اس نے ٹیکسی کے اندر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایک کونے میں سمٹی سمٹی اس کی بیوی بیٹھی ہوئی ہے. جس کا چہرہ لپ اسٹک اور غازہ سے آراستہ ہے ایک لمحہ کے لیے اس کے چہرے پر کرختگی اور نفرت کے آثار پیدا ہوئے پھر اس کے ذہن میں بچوں کے زرد زرد چہرے گھوم گئے.

اور اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ بکھر گئی

ایک ننھا افسانہ

رام لعل نابھوی

کتابوں کی باتیں

کچھ نئی اور کچھ پرانی مطبوعات

ب-۱

کتاب	"دادین"
نوعیت	شعری مجموعہ
شاعر	شجاع خاور
صفحات	۱۱۲
قیمت	۲۵ روپے
اشاعت	فروری ۱۹۸۲ء
ناشر	قصر اردو ۸، ۱۳۲۴ اردو بازار جامع مسجد دہلی
سائز	$\frac{18 \times 22}{8}$

شجاع خاور بہت اچھا شاعر ہے اسکی نظمیں اسکی غزلوں سے بھی اچھی ہیں،

غزلوں میں اسکی عام روایت اور خصوصیت سے انحراف کرکے شاعروں نے ہزل کہے ہیں، مزاحیہ غزل کہی ہے، مضحکہ خیز غزلیں کہی ہیں، فلسفیانہ اور مفکرانہ غزلیں کہی ہیں یہاں تک کہ غزلوں میں سانپ بچھو اور پورا جنگل آباد کر دیا ہے مگر پہلی بار شجاع خاور نے غزلوں میں نفرت حقارت اور تمسخر کی آمیزش کی ہے، اس کا سب سے بڑا کمال بے ساختہ پن ہے، ہیئت غزلوں کی ہے مگر بالکل نئی فضا ہے اور یہ بالکل ضروری نہیں کہ ہر چمکنے والی چیز سونا ہو،

شاعر کو پورا حق ہے کہ وہ جو چاہے کہے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ غزل کا معیار آج بھی وہی ہے جو کل تھا اور جس کے لئے غالبًا عرفی نے کہا تھا،

چنگاری ۵۴

در دل ما غم دنیا غم معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہ ما

گفتگو چاہے مشاہدہ حق کی ہو چاہے حدیث دل، بادہ و ساغر کا پردہ ضروری ہے۔ اور صرف یہی نہیں پردہ کے ساتھ ساتھ پاس وضع بھی ضروری ہے۔ بے باک بے جھجک دو ٹوک بات کی متحمل غزل کا پیمانہ نہیں ہے۔ آبگینہ تندی صہبا سے پگھلتی نظر آئے مگر پگھلے نہیں یہی غزل کی معراج ہے اس کا آہنگ دھیما ہے یہ ریل تند نہیں جوئے نرم سیر ہے۔ اور پھر غزل نفرت کی تو متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔ اور نہ ہی تمسخر کی اس لیے شجاع خاور کی غزلوں کو میں غزل تسلیم ہی نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ شاعری ضرور ہے اچھی شاعری اس میں جو بے ساختہ پن ہے۔ جو نیا پن ہے جو تندی ہے وہ اردو دنیا کے لیے بالکل نئی چیز ہے پڑھنے والوں کو حیران بھی کرتی ہے اور خوشگوار تجربوں سے بھی آشنا کرتی ہے۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ یہاں تو دنیا ہی نئی ہے۔ وہ ہر شعر پہ رکتا ہے اور دیکھتا ہے نہ صرف لب و لہجہ آہنگ اور رویہ نیا اور منفرد ہے بلکہ معاملہ ہی مختلف ہے شاعر کو کلام پہ زبردست قدرت ہے مگر وہ کسی تجربے میں شریک نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ بڑی بے رحمی سے دو ٹوک بات کہتا ہے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے۔ البتہ بعض شعر غزل کے معیار کے اعتبار سے بھی بہت خوبصورت ہیں۔

مجھے قریب سے دیکھو مجھ اور دور ہٹو
تمہاری آنکھ اجالے سے اب بھی خیرہ ہے

شاعر کا لہجہ نہ تو غیر سنجیدہ یا مزاحیہ ہے اور نہ ہی فلسفیانہ یا باغیانہ وہ صاف کھرے اور صادق تجربات کے بہترین شاعرانہ اظہار پر قادر ہے یہ بڑی بات ہے۔ اور یہی اسے اس عصر کے دوسرے شاعروں سے ممیز اور ممتاز قرار دینے کا سبب ہے۔

شجاع خاور کی شاعرانہ حیثیت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ہم اس کی نظمیں پڑھتے ہیں۔ بہت پہلے جب میں نے اس کی طویل نظم دوسرا شجر پڑھی تو بے ساختہ چونک پڑا تھا اور مجھے محسوس ہوا تھا ایک بہت اچھا شاعر اردو دنیا کے افق پر نمودار ہوا ہے۔

شجاع خاور کی نظموں میں چاہے وہ چھوٹی ہوں چاہے بڑی۔ نظمیت بھی ہے اور شاعری بھی۔ نظمیت یوں کہ ان کی نظموں کا باضابطہ ارتقا ہوا ہے، پوری نظم متناسب ہے کہیں زائد حصہ نہیں جھول نہیں ابتدا، عروج اور انتہا میں گہرا اور فطری ربط ہے۔ تجربے نادر نایاب اور انوکھے ہیں بے ساختہ پن ہے گہرے دکھ سے مملو شاعر جب کہتا ہے۔

مسافر نے پھر تجھے دل سے کہا
میرے بچو دعا ہے

۳۰ جنوری ۱۹۸۴ء

تمہاری قیصوں میں کوئی گریباں نہ ہو۔
تو آدمی تڑپ اٹھتا ہے۔

وادیں، شجاع خاور کا ایک ایسا مجموعہ کلام ہے جسے ضرور پڑھنا چاہئے اس لیے بھی کہ اس کے رنگ، موسم اور ذائقے بالکل نئے ہیں۔

کتاب کی کتابت طباعت اور کاغذ بہت عمدہ ہے جلد اچھی، سرورق جاذب نظر ہے ۴۲ غزلیں ہیں لہٰذا متفرق اشعار کے بعد ۱۰ نظمیں ہیں ایک رباعیہ ہے۔ دیباچہ قیصر عقل نے لکھا ہے۔ گرد پوش کے آخری صفحہ پر "نذر بات" کے عنوان سے شاعر نے بڑی سنجیدہ اور اہم باتیں کی ہیں جن سے اس کی شاعری اور زندگی کے بارے میں رویے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہ کہتا ہے ہم نے تیسری دنیا میں شاعری کی ہے۔

اس کی شاعری اس اعتبار سے بھی واقعی تیسری دنیا کی شاعری ہے کہ اس میں تیسری دنیا کا غصہ، مسخراپن، سنجیدگی، سیاہی اور بے فکری شامل ہے۔ بوڑھا بچپن اور جوان بڑھاپا اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

●●●

کتاب۔ ایک آنکھ والا ہرن
مصنف۔ اوم کرشن راحت
قیمت۔ پندرہ روپے
صفحات۔ ۱۶۸ ڈیمائی سائز

مصنف کا یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ ۱۷ افسانے ہیں۔ روایتی ہیں۔ جدید۔ علامتی تجریدی رنگ نہیں ہے۔

افسانہ کو ایک ایسے دائرہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، جس میں فرد کی شخصیت، تہذیب و ثقافت۔ تاریخ زندگی کا ارتقائی عمل اور وقت کے معیار کے علاوہ مقصدیت مقید ہوتی ہے۔ جس طرح بت تراش پتھر میں سے خوبصورت مجسمہ نکال لیتا ہے اسی طرح عام زندگی میں بیت رہے واقعات کے خلوط کو جاننا اور افسانوی رنگ و آہنگ پیدا کرنا افسانہ نگار کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں کام مشکل ہیں۔

ایک کاوش مصنف نے کی ہے۔ پلاٹ اور کرداروں کا باقاعدہ اہتمام ہے۔ زبان صاف۔ سادہ اور سلجھی ہوئی ہے۔ بیان میں ندرت ہے اور قاری کی دلچسپی بنی رہتی ہے۔ معنی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مصنف کی کوشش رہی ہے کہ کہانی سے معاشرے کی اصلاح کا کام لیا جائے، حُسن کے جمالیاتی اظہار کا وسیلہ بنایا جائے، حقیقت اور رومان کا امتزاج پیش کیا جائے اور بامقصد کہانیاں پیش کی جائیں۔ اس کوشش میں مصنف بہت حد تک کامیاب ہے۔

کہانیوں کا دائرہ محدود ہے۔ جنس کا ذکر کرتے ہیں، تو جنس زدہ ہو جاتے ہیں۔ "منی جائزہ" ایک ایسی کہانی ہے جو حقیقت سے بعید ہے۔

عمدہ کتابت۔ خوبصورت طباعت۔ سفید کاغذ پر ساہتیہ اکادمی کے مالی اشتراک سے چھپی اس کتاب کی قیمت کم ہے۔

رام لعل نابھوی

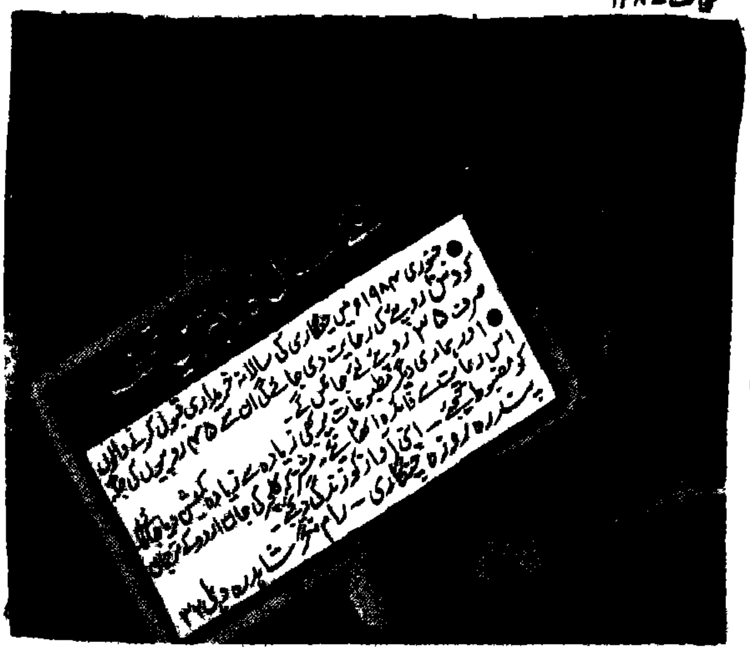
●●●

نام۔ سعادت حسن منٹو (اپنی تخلیقات کی روشنی میں)
مصنف۔ ڈاکٹر محمد محسن
صفحات۔ ۱۲۸
قیمت۔ ۳۰ روپے
ناشر۔ دارالاشاعت ترقی رام نگر شاہدرہ دہلی

اس کتاب میں منٹو کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے ان کے کرداروں میں ان کی شخصیت کے عکس کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ منٹو کی تمام تخلیقات، افسانے، خاکے، مضامین مصنف کے پیش نظر رہے ہیں۔

پروفیسر محمد محسن عالمی شہرت کے مالک نفسیات کے پروفیسر ہیں جن کی کتابیں امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی مستند سمجھی جاتی ہیں۔ انہوں نے افسانے اور مضامین بھی لکھے ہیں جن کی ایک زمانے میں دھوم تھی۔ درمیانی زمانے میں انہوں نے صرف انگریزی میں لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا تھا اب بہت دنوں بعد اردو میں ایک ایسی کتاب سامنے آئی ہے جس کا اردو کیا ہندوستان کی کسی اور زبان میں بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ اس کتاب سے پیشتر انگریزی میں تو اس طرح کی کتاب تھی مگر اردو میں کوئی اس طرح محنت کرنے کا قائل ہی کہاں ہے۔

منٹو جیسے اہم افسانہ نگار کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔



تہذیبی سرگرمیاں

قومی یک جہتی کیوں اور کیسے؟

افسر رضا

مذاکرہ و مباحثہ

زیر اہتمام انجمن ترقی پسند مصنفین کانپور۔

کانپور ۲۱ر نومبر ۱۹۸۳ء۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کانپور کے زیر اہتمام قومی یک جہتی کے مسائل پر ایک بڑا جلا مذاکرہ و مباحثہ اردو اکادمی کے رکن حکیم حبیب الرحمٰن کی صدارت میں سلاک نرسری اسکول میں منعقد ہوا جس میں ہر مکتبِ فکر کے دانشور شریک تھے۔ انجمن کے سکریٹری افسر رضا اور نامی انصاری نے مقالے ادریس ادیب نے ایک نظم 'ماں' اور تسکین زیدی نے ہندی کی مشہور کہانی 'گھائل' کا ترجمہ پیش کیا۔

افسر رضا کے مقالے 'قومی یک جہتی کیوں اور کیسے؟' میں کہا گیا تھا کہ قومی یک جہتی ایک نہایت اہم اور سیاسی سماجی اقتصادی اور معاشی مسئلہ ہے جس پر قوم کی بقا اور سالمیت کا دار و مدار ہے مگر اس کی راہ میں رکاوٹیں ہیں۔ اوّل تو قومی یک جہتی کا انحصار قومی شعور پر ہوتا ہے جس کے لئے ایک ایسے مقصد یا نصب العین کی ضرورت ہوتی ہے جس پر ساری قوم متفق ہو لیکن بدقسمتی سے فی الوقت ہماری قوم کے سامنے ایسا کوئی واضح نصب العین نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ ایک برِ صغیر ہے جہاں مختلف مذہب و ملت اور قوم اور قبیلوں کے لوگ آباد ہیں جن میں بجز ایک مخصوص سیاسی و جغرافیائی حدود کے اندر رہنے کے بظاہر کوئی قدرِ مشترک نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کی زبان، تہذیب، مذہب اور رسم و رواج ہی مختلف ہیں بلکہ ان کے سیاسی اغراض و مقاصد و کردار کے علاوہ ان کے سماجی، اقتصادی اور معاشی مسائل بھی متضاد ہیں جیسا کہ آسام، پنجاب اور کشمیر وغیرہ کی موجودہ صورتِ حال سے عیاں ہے۔ دوسرے جمہوریت کے غلط تصور نے عوام کے سب سے [illegible] کی زبان۔ تاریخ اور تہذیب کو سارے ملک کی زبان۔ تاریخ اور تہذیب قرار دینے پر اصرار کی وجہ سے دوسری چھوٹی اکائیوں میں احساسِ نا انصافی کی بدولت محرومی۔ مایوسی اور بددلی کے جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں جو قومی اتحاد کو مضبوط بنانے کے بجائے کمزور بناتے ہیں۔ مزید برآں ہمارا معاشرہ ذات پات کے علاوہ اقتصادی اور معاشی اعتبار سے بھی بہت سے طبقات میں بٹا ہوا ہے جن کے مسائل جُدا اور مفادات متضاد ہیں۔ جو ایک کا سود ہے وہ دوسرے کا زیاں ہے جس کی وجہ سے ان کے درمیان ہمیشہ کشمکش جاری رہتی ہے۔ الغرض یہ عوامل ایسے ہیں جو قومی یک جہتی میں رخنہ پیدا کرتے ہیں لہٰذا ایسی صورت میں ان تمام سماجی۔ اقتصادی اور معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے اور حقیقی معنوں میں سماجی انصاف پر مبنی ایک نئے معاشرہ کے قیام کے لئے جدوجہد کرنا ناگزیر ہو گیا ہے اور یہی وہ واحد نصب العین ہے کہ جس پر ساری قوم کو بہتر مستقبل کے لئے ہم خیال بنایا اور متحد کیا جا سکتا ہے۔

نامی انصاری نے اپنے مقالے 'قومی یک جہتی کے مسائل' میں کہا کہ ملک کی تعمیر اور ترقی کے لئے اگرچہ قومی یک جہتی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن عملی سطح پر اس کا حصول اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسے سماج میں جہاں اقتصادی اور معاشی بدحالی کا دور دورہ ہو اور جہاں حصولِ اقتدار کے واسطے مفاد پرست عناصر اور ان کے ہم نوا خود غرض سیاست داں عوام کو طرح طرح کے گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعے مستقل طور پر متحارب اور متصادم رکھتے ہوں وہاں قومی اتحاد کے جذبے کا پنپنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ مفاد پرست طبقہ جان بوجھ کر زبان۔ تاریخ اور کلچر کے نام پر غلط بیانی کر کے عوام میں انتشار پیدا کر رہا ہے اس لئے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ایماندار دانشور عملی سیاست سے اپنے لاتعلق کے رویہ کو ختم کریں اور میدانِ عمل میں قدم جما کر اس بدعت کا مقابلہ کریں تاکہ اس تخریبی سیاست کا سدباب کیا جا سکے ورنہ ملک کی سالمیت یقیناً خطرے میں پڑ جائے گی۔

طرزِ جدید کے شاعر خان زیب غوری نے مباحثہ کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ان مقالات میں قومی یک جہتی کے مسائل کا جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ صحیح سمت کی طرف اشارہ ہے اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو یقیناً مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملک کی سیکولر پالیسی قومی یک جہتی کے لئے اگرچہ ناگزیر ہے لیکن جس طرح فی الحال اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے وہ قومی یک جہتی کے لئے ناسازگار ہے کیونکہ اس پر ایک خاص مذہب کی زبان۔ تاریخ اور کلچر کی چھاپ نمایاں ہے۔ یوں بھی تاریخی واقعات کو اس قدر توڑ مروڑ اور مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے کہ جس سے عوام میں محبت اور اتحاد کے بجائے نفرت اور انتشار پیدا ہو رہا ہے جو قومی یک جہتی کے مقصد کے بالکل خلاف ہے۔ قومی اتحاد کے لئے منجملہ دیگر باتوں کے مذہب اور تاریخ کو واقعات کے صحیح پس منظر میں پیش کرنا ضروری ہے۔

ترقی پسند شاعر پیام فتحپوری نے کہا کہ قومی یک جہتی جذباتی نہیں بلکہ خالص سیاسی۔ سماجی اور اقتصادی مسئلہ ہے جس کو محض رسمی طور سے صلح و آشتی اور بھائی چارے کی تلقین کر کے حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ قومی یک جہتی پیدا کرنے کے لئے لوٹ کھسوٹ سے پاک ایک منصفانہ سماج کا قیام شرطِ اوّل ہے۔ جب تک ایک طرف دولت کا انبار رہے گا اور دوسری طرف بے پناہ غربت رہے گی اس وقت تک قومی مفاہمت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

ابنِ احمد کی رائے تھی کہ قومی یک جہتی کبھی قائم ہونے کے تحت اور پورے عوام پیار [illegible]

جاسکتی ہے۔ جب تک ایک طبقہ پیداوار کے ذرائع اور قومی معیشت پر قابض رہے گا اُس وقت تک اقتصادی طور پر کمزور طبقات کا استحصال ہوتا رہے گا جو اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کے درمیان کش مکش جاری رہے گی اور جب تک یہ صورتِ حال برقرار رہتی ہے اس وقت تک قومی یکجہتی کے نعرے کی اہمیت ایک مجذوب کی بڑ سے زیادہ نہ ہوگی۔

تسکین زیدی نے کہا کہ چونکہ ہندوستان میں عوام پر مذہب کی چھاپ بہت گہری ہے اس لئے انھیں یکجہتی کے جذبے کو فروغ دینے کے لئے مذہب کا استعمال موثر انداز میں کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ان کو ہر مذہب کی صحیح معلومات فراہم کی جائیں۔ کیونکہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

شکیب رضوی نے کہا قومی یکجہتی کے لئے مذہب اور تاریخ کو صحیح سیاق و سباق میں پیش کرنے کے علاوہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی ضرورت ہے جو عوام کو روحانی اور ذہنی بصیرت کے ساتھ ساتھ مادی فراغت بھی مہیا کر سکے۔

لطیف عباس نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کچھ سیاسی اور کچھ نام نہاد سماجی اور مذہبی تنظیمیں بھی جارحانہ انداز میں فرقہ پرستی کے شعلوں کو ہوا دیتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے قومی اتحاد کا جذبہ مجروح ہوتا ہے اس لئے ارباب اقتدار کو چاہئے کہ وہ بلا تاخیر ان پر پابندی عائد کریں جب کہ محمد طاہر کی رائے تھی کہ طبقاتی کش مکش اور اقتصادی و معاشی نابرابری کے علاوہ قومی اتحاد کو کمزور بنانے میں وہ نصابی کتابیں بھی ہیں جو ہمارے بچوں کو پڑھنے کے لئے دی جاتی ہیں۔ تعلیم کے نام پر یہ ایک ایسا مہلک زہر ہے جو ان بچوں کے دلوں میں اپنے ہم وطنوں کے خلاف انڈیلا جا رہا ہے جو انھیں محبت اور اتحاد کے جذبے کو سمجھنے ہی نہیں دیتا ہے۔

ادریس ادیب کی رائے تھی کہ ابن الوقت سیاست داں روز طرح طرح کے مذہبی اور سیاسی شوشے چھوڑتے رہتے ہیں مثلاً وشو ہندو پریشد کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کو سکولر جمہوریت کے بجائے ہندو جمہوریت قرار دیا جائے، بناسپتی میں چربی کی ملاوٹ اک تمتا یکیہ وغیرہ وغیرہ۔ فی الحال تو قومی یکجہتی کا خواب کسی دیوانے کا خواب نظر آتا ہے۔

صدر جلسہ حکیم حبیب الرحمن نے اس بات پر سخت تشویش کا اظہار کیا کہ تاریخ اور نصاب کی کتابوں اور دیگر ذرائع ابلاغ میں صرف ایک خاص فرقہ کو نمایاں حیثیت دی جاتی ہے جس کی وجہ سے دوسرے فرقوں میں غم و غصہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور کچھ فرقہ پرست تنظیمیں تو کھلم کھلا اپنے مذہبی۔ لسانی اور ثقافتی غلبے کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی مستقل مہم چلاتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے قومی اتحاد و یکجہتی کا نعرہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے قوم دشمن عناصر کی بیخ کنی کے واسطے ملک کی جمہوری اور سیکولر قوتوں کو تقویت پہنچانا بہت ضروری ہے۔ مباحثہ میں حصہ لینے والوں میں سحر صدیقی اور ظفر اکبرآبادی کے نام قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے کم و بیش انھیں خیالات کا اظہار کیا۔

مباحثہ کے بعد اُردو کے نامور شاعر کیفی اعظمی کو لوٹس انعام پانے پر مبارک باد کی قرارداد منظور کی گئی بعد ازاں ہندی کے مشہور ترقی پسند ادیب اور نقاد للت موہن اوستھی اور اردو کے جواں سال جدید شاعر ظفر زیدی کی ناگہانی موت پر اظہارِ غم کرتے ہوئے ان کے پسماندگان سے تعزیت کی گئی۔ آخر میں انجمن کے سکریٹری نے شرکائے جلسہ کا اس سیر حاصل مذاکرہ و مباحثہ کے لئے شکریہ ادا کیا۔

جگن ناتھ آزاد غیر ملکوں کے دورے سے واپس

اس سفر میں پروفیسر آزاد نے نیویارک، لاس اینجلز، ہوسٹن، بوسٹن، میامی، مانٹریال، اٹاوا، ٹورونٹو، ایڈمنٹن اور وینکوور کے بیشتر مشاعروں میں شرکت کی اور کئی شہروں میں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے اجتماعات سے بات چیت کی۔ پروفیسر آزاد کے علاوہ ان مشاعروں میں رئیس امروہوی، منیر نیازی، کشور ناہید، صہبا لکھنوی، افتخار عارف، احمد فراز، صہبا اختر اور حسن عابد نے شرکت کی۔ نیویارک میں تھرڈ ورلڈ ٹیلی ورژن فورم اور وائس آف امریکہ کو انٹرویو دیتے ہوئے پروفیسر آزاد نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ یو این او اُردو کو اپنی چھٹی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کرے۔

لندن میں بی بی سی اردو سیکشن اور بی بی سی ہندی سیکشن نے آزاد صاحب کے انٹرویو لئے اور علمی مجلس برطانیہ اور اسلامک مشن برطانیہ نے استقبالئے دیئے انہوں نے بتایا کہ ہندوستان پاکستان اور برطانیہ کے بعد شمالی امریکہ اُردو کا سب سے بڑا مرکز ہے اور امریکہ اور کینیڈا میں اردو کے متعدد اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کی اکثر یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے ان کے ذریعے سے اُردو زبان شمالی امریکہ میں روز بروز مقبول سے مقبول تر ہوتی جا رہی ہے۔

بقیہ احساس کے زخم

ہر ا کے رُخ کو پہچانا۔ گفتگو کو دوسرا موڑ دیتے ہوئے بولے۔ "اپنے اطمینان کے لئے مجھ سے کیا چاہتی ہو راحت! " میں تمھیں کس طرح اپنے اعتماد میں لوں۔ اور کس طرح اپنی وفا کا یقین دلاؤں۔ کیسے کہوں کہ جو گذر گیا ہے اُسے بھلا دو۔ میں تمہاری خوشی اور زندگی میں سکون کی خاطر تمھاری مقرر کردہ راہوں پر تمھارے ساتھ چلنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ جو کچھ تم کہتی ہو میں وہی مانے لیتا ہوں۔ لیکن تم سے بھی یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم کبھی موقع بے موقع پچھلی باتوں کے طعنے یا تذکرے ڈائرکٹلے یا ان ڈائرکٹلے طور پر میرے سامنے نہیں کروگی۔ اور میں آئندہ وہی کروں گا جو تم چاہوگی۔ بتاؤ راحت میں کیا کروں۔۔۔"

"ایسے وعدے تو اس طرح کے موقع آنے پر حالات بدلنے کے لئے آپ برسوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور ان پر جیسا کچھ عمل کیا جاتا ہے ہم دونوں بخوبی واقف ہیں۔ اب تو مجھے یقین دلانے کے لئے آپ کو بہت بڑی آزمائش سے گذرنا پڑے گا۔ اور پاک صاف ہوکر خلوص دل سے قرآن پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھانی ہوگی کہ مرتے دم تک آپ اپنی زندگی کو گناہوں کی آلودگیوں سے بچا کر پاکیزگی اور پرہیزگاری کے ساتھ گذاریں گے۔ خواہ کچھ بھی ہوجائے اپنے اس وعدے اور قسم سے نہ پھریں گے۔

احمد میاں نے بیوی کی بات پر اپنی رضامندی کا کھلا اور جوشیلا اظہار کیا۔ انھوں نے ویسا ہی کیا۔ نماز جمعہ سے فارغ ہوکر راحت کے سامنے قرآن شریف ہاتھ میں لے کر صدق دل سے آئندہ زندگی میں بُری باتوں اور گناہوں سے بچنے و نیکی کی زندگی گذارنے کی قسم کھائی۔

قسم کھانے کے بعد احمد میاں کچھ دنوں تک بے حد خاموش اور بجھے بجھے سے رہے۔ بہت کم گھر سے باہر نکلے۔ بغیر کسی کام یا ضرورت کے وہ کسی سے بات بھی نہیں کرتے تھے بس اُن کا کمرہ۔ ریڈیو۔ اخبار اور وہ۔ جیسے کہ وہ اپنے آپ کو کوئی سزا دے رہے ہوں۔ خود سے بیزار دور کل سے چڑے چڑے وہ اکثر کسی اُدھیڑبن میں لگے رہتے ہیں۔ ایک نیا خیال ان کے احساس میں جاگ اٹھا ہے اکثر وہ یہ کہتے سُنائی دیتے ہیں۔ آج یہاں درد ہے۔ کل وہاں چمک ہے۔ آج نیند نہیں آئی۔ کل دل بہت گھبرایا۔ وہی کمرہ، وہی ماحول، وہی تنہائی میں ڈوبی ہوئی سرد راتیں اور درمیان میں قرآنی وعدہ۔ خدا ہی جانے اُن کی تنہائیاں مہک رہی ہیں یا سسک رہی ہیں۔ اس کا جواب تو مستقبل کے بطن میں ہے۔

●●

بقیہ حاشئے

سخن میں شہنشاہی تختی ان کے نزدیک کلام بے رنگ تھا وہ اپنے فارسی کلام کو اردو پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ غالب کے پرستاران سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے جنھیں وفاداری کا تھوڑا بہت پاس تھا۔ رسم الخط کی تبدیلی کی دہلیز کو سجدہ کرائے بیشتر نے تو باقاعدہ دوسری زبانیں بھی منتخب کرلیں تاکہ انھیں غالب کے اتباع میں اردو پر ترجیح دے سکیں اور اب تو نوبت ترجیح سے تجاوز کر کے طلاق تک آپہنچی ہے۔ خدا خیر کرے۔

بقیہ سرکس کا شیر

پیدا کرنے کی غرض سے میں نے مزاجاً پوچھا" اور وہ تمہارا شیر کہاں گیا۔؟ اس نے حسب عادت طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا وہ تو کب کا سرکس میں رنگ ماسٹر کے ہنٹر کھا کھا کر تماشہ دکھانے لگا ہے۔" اور وہ سرعت سے باہر صحن میں بچھے زرد و خشک پتوں کو کچلتا وہ چلا جا رہا تھا ٹپک۔۔۔ ٹپک۔۔۔ ٹپک۔ اور میرے ذہن میں کسی معصوم بچی کی توتلی آواز گونج رہی تھی۔ چل میرے گھوڑے۔۔۔ ٹپک۔۔۔ ٹپک۔۔۔ ٹپک۔۔۔!

ٹیکس گذار توجہ فرمائیں

اب دوہرا فائدہ
6 سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ

پراویڈنٹ فنڈ، زندگی بیمہ پریمیم اور 10- سالہ اجتماعی میعادی کھاتوں وغیرہ پر انکم ٹیکس قانون کی دفعہ 80 "سی" کے تحت ٹیکس میں جو رعایت دستیاب ہے اس کا اطلاق 6- سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹوں میں لگائی گئی پونجیوں پر بھی کر دیا گیا ہے۔

چھٹے اجراء اور ساتویں اجراء پر بھی

چھٹا اجراء

- 1,000 روپے چھ برسوں میں 2,015 روپے ہو جاتے ہیں۔
- 12 فیصد سود سالانہ، ششماہی مرکب کیا جاتا ہے مدت پوری ہونے پر قابل ادا۔
- سالانہ حاصل ہونے والے سود پر انکم ٹیکس میں فائدہ۔

ساتواں اجراء

- 1,000 روپے لگانے پر ہر ششماہی کے بعد آپ کو 60 روپے حاصل ہوتے ہیں جبکہ اصل زر بجنسہ برقرار رہتا ہے۔
- 12 فیصد ششماہی قابل ادا۔
- باقاعدہ آمدنی کے لئے ایک مثالی منصوبہ۔

دونوں اجراء مختلف مالیتوں میں دستیاب ہیں۔ اپنی پسند کے مطابق انتخاب کیجئے۔

مشترکہ خاصے :

- رقم لگانے کی کوئی حد مقرر نہیں۔
- ضرورت پڑنے پر تین سال بعد بھنائے جا سکتے ہیں۔
- نامزدگی کی سہولت دستیاب۔
- 7000 روپے تک سود پر (بشمول دیگر متعینہ سود کی آمدنی) انکم ٹیکس قانون کی دفعہ 80 "ایل" کے تحت انکم ٹیکس سے چھوٹ۔
- نامقیم ہندوستانیوں کو ایک فیصد زائد یعنی کل 13 فیصد سالانہ سود۔ سود مکمل طور پر بلا کسی زیادہ سے زیادہ حد کے، ٹیکس سے مستثنیٰ۔

تمام ڈاک گھروں اور مستند ایجنٹوں سے دستیاب ہیں

قومی بچت ادارہ

پوسٹ بکس 96، ناگپور- 6

83/318

مصور پندرہ روزہ

چنگاری

دہلی ۳۲

ایڈیٹر
جمیلہ احمد
ادبی حصے کی ترتیب
بشیر احمد
انیس احمد خاں
شمارہ نمبر ـــ ۳۱
قیمت : ۲ روپئے ۵۰ پیسے
سالانہ : ۴۵ روپئے ـــ ۳۰ امریکی ڈالر
پتہ : ۳/۱۰ ۱۴۱ رام نگر شاہدرہ ، دہلی ۳۲

جمیلہ احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے جے۔ کے آفسٹ پرنٹرس دہلی ۶ اور سپر پرنٹرس اسی ۵۳ اے انارکلی دہلی ۵۱ سے چھپوا کر رام نگر دہلی ۳۲ سے شائع کیا۔

۱۵ فروری ۱۹۸۴ء

یوم جمہوریہ کے موقع پر خدا سے دُعا ہے کہ ہمارے مُلک میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوں۔

مرحوم کلیم الدین احمد صاحب کو خراجِ عقیدت و محبت پیش کرنا ہمارا فرض ہے، کلیم صاحب کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی عالمانہ حیثیت اور دانشوری سے انکار کرنا کفر سے کم نہیں ہے، انہوں نے جو بھی علمی اور تنقیدی کام کیا وہ لگن سے کیا اور الزام کے اور نتائج سے بے نیاز ہو کر کیا، کیونکہ انکو اپنی دانش پر اعتماد تھا اور وہ کسی کو خوش کرنے کیلئے قلم نہیں اٹھاتے تھے، اپنی بات کہنے کیلئے قلم اٹھاتے تھے، مرحوم کا سرمایہ تنقید و ادب اختلافی آوازوں کے باوجود ہمارا سرمایہ ہے!

علی سردار جعفری



دامن نگاہ کا

نئے ادب کی چنگاری دلّی سے جس طرح پھوٹ رہی ہے عجب نہیں کہ عامیانہ قسم کے رسائل کو اپنی زد میں لے کر عام لوگوں کی بھی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے ادبی رسائل کے کچھ اہم مسئلوں کی نشاندہی آپ نے شمارہ نمبر ۲۲ کے ذریعہ کی ہے۔ یہ درست ہے کہ عام لوگوں کو ادبی رسالے کا خریدار بنانے سے پہلے ہمیں ان لوگوں کے ضمیر پر اخلاقی دباؤ ڈالنا ہوگا جو اردو کی روٹی کے بل پر اپنے کنبے سمیت زندہ ہیں۔ لیکن انہیں ذرہ برابر اس بات کی فکر نہیں ہے کہ معیاری ادبی رسائل جو اردو میں شائع ہو رہے ہیں ہم ان کے خریدار بنیں یا ادب سے شغف رکھنے والے طلبا و طالبات میں بھی یہ احساس جگائیں کہ کسی بھی ادب کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کسی نہ کسی شکل میں گھر گھر ادب نہ پہنچ سکے گا۔ اور رسائل تو بہر حال اتنی زیادہ قیمت والے نہیں ہوتے کہ ہر وہ شخص جو اردو کی کچھ بھی جانکاری رکھتا ہو کم از کم ایک ادبی رسالہ نہ خرید سکے۔ صرف اردو کو اس کا حق مل جائے یہی کہنے سے مسئلہ حل نہ ہو جائے گا اردو کو اس کا حق دلانے والوں کو اپنی جیب سے اردو کے نام پر بھی دو چار روپے خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ روزانہ جانے کتنے ادبی رسائل نکلتے ہیں اور پھر کچھ دور تک جانے کے بعد راہ میں ہی دم توڑ دیتے ہیں چونکہ ان کی زندگی سے بھی اردو کے ٹھیکیداروں کی زندگیاں جڑی ہوتی ہیں۔ آج اگر اردو کا کوئی رسالہ یہ تحریک شروع کر دے کہ اردو کے تمام رسائل ہندی رسم الخط میں نکلنے چاہئیں اس لئے کہ ہندی میں ادبی رسائل کی حالت ٹھیک ہے بس اتنی سی بات پر ہی جاہل اردو کے ٹھیکیداروں کو اپنا اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا اور ایک لمبا چوڑا جلوس لے کر دلی [illegible] آپ چنگاری کے ذریعہ اس [illegible]

پر مجبور کیجئے۔

تازہ شمارہ (اگست دوم) میں ریحانہ اسٹر کا مضمون "نسوانی لبریشن، اگلا قدم" دلچسپ لگا۔ اس اہم موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک جگہ یہ بھی کہا ہے کہ "جب کبھی کوئی شادی شدہ عورت کام کرتی ہے تو شوہر اور بیوی کے رسمی رول میں کشمکش لازمی ہے۔" اگر واقعی شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں تو ایسا ہونا نفسیانی وجہ بھی ہو سکتی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ دونوں کے ازدواجی رشتے کے لئے بعض حد تک اچھی علامت ہے۔ پھر بھی ہمیں اس بات کی طرف بھی دھیان دینا ہوگا کہ موجودہ نظام میں اوسطاً ایک پڑھے لکھے شوہر کی آمدنی اتنی نہیں ہے کہ وہ صحیح ڈھنگ سے زندگی کی عام ضرورتوں کو پورا کر سکے لاکھ چھپاؤ "رات" کے کسی حصے میں جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ اندھیرے کے لمس کو براہ راست محسوس کر ہی لیتا ہے ہم اس نظام کی دین ہیں۔ جہاں نابرابری ہمارا مقدر ہے۔ متوسط طبقے کی حالت تو اور بھی اچھی نہیں۔ اس مشینی عہد میں رفتہ رفتہ ہم اپنے فطری جذبے کو بھی قتل کر رہے ہیں جبکہ ایسے مسئلوں کا حل ہے پیار، خلوص اور ایک دوسرے پر بھرپور اعتماد۔

قتیل شفائی کی غزلوں نے مایوس کیا ہے بجرج سلطان پوری کی شاعری پر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا مضمون پسند آیا۔ "من کہ قبلہ اردو" کے ذریعہ معین اعجاز نے اردو کے مردہ فروش محققوں پر زبردست اخلاقی وار کیا ہے۔ ممتاز قیصر تیم کا افسانہ معیاری لگا۔

اس بار چنگاری کے لئے چار ننھے افسانے بھیج رہا ہوں۔ یہ اس اعتبار سے اردو میں نیا تجربہ ہے کہ شیکسپیئر [illegible] کا سہارا لے کر کہانی کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انگریزی کے لئے یہ نئی بات نہیں لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے لئے نیا تجربہ ضرور ہے۔

ہندو پاک کے شاعروں کے تعاون سے ہندی میں ایک غزل سنکلن "ہم لوگ جلد ہی شائع کر رہے ہیں اگر آپ کا بھی قلمی تعاون ہمارے ساتھ ہو تو یہ اچھی بات ہوگی۔ سنکلن کا نام ہے "نیند کے پہلے کا سپنا"

قاسم خورشید

• • •

چنگاری کا شمارہ بروقت اور بالالتزام ملتا رہا لیکن پچھلے شماروں ۲۵، ۲۶ / ۲۷ اکتوبر سے تادم تحریر محروم ہوں۔ مذکورہ دونوں شماروں کی عدم وصولی سے وہاب تسنیم کو آگاہ کر دیا ہے۔ چنگاری شگفتہ، شائستہ، اور معیاری ادب کا آئینہ دار ہے۔ امید ہے جلد ہی ارتقا کو چھوئے گا۔ آپ کے سبھی عنوان جاذب نظر، معنی خیز، مواد وقیع اور جاندار ہوتا ہے۔ البتہ شعری حصہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے

کل وہاب تسنیم کی وساطت سے چنگاری کا شمارہ ۲۹، ۳۰ (حصہ دوم) اکتوبر باصرہ نواز ہوا اس کے منظوم حصہ صفحہ پر مندرج ایک نظم بعنوان شاعر کے گھر شاعر کی لقب زنی... پر نظر پڑی۔ اس کے تخلیق کار کی جگہ میرا تخلص آزاد بیابانی نظر آیا تو آنکھوں میں سراسیمگی کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ ہاتھوں میں رعشہ، رسالہ ہاتھ میں مشکل سے ٹھہر سکا اتنی خوبصورت نظم کا خالق مجھ جیسا نو مشق تو نہیں ہو سکتا۔

صلاح کار کجا و من خراب کجا

پتہ نہیں یہ آذر بیابانی کوئی اور شاعر ہیں یا کاتب صاحب کی نظر عنایت مجھ غریب پر ہوئی۔ نظم سے متعلق اظہار خیال بے محل ہوگا۔ عیاں را چہ بیاں

یہ نظم تو میری تخلیق نہیں کسی اور شاعر کے نظم کے ساتھ میرا تخلص چسپاں کر دیا گیا ہے میں اس دشت میں کوئی نووارد سیاح نہیں ہوں

اس نام سے گذشتہ پندرہ سولہ برس سے مختلف ادبی اور نیم ادبی رسائل میں میری نثری اور شعری تخلیقات اشاعت پذیر ہوتی رہی ہیں۔ جن میں تحریک، سب رس، خاتون مشرق، خاتون دکن، اس کے علاوہ شمع، سریتا (مرحوم) اور آجکل میں بھی میری ایک دو شعری تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ ادھر چند سال سے حالات کی ناسازگاری نے ادبی کاوشوں سے باز رکھا ورنہ یہ سلسلہ اشاعت منقطع نہ ہوتا۔ اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ یہ غلطی کاتب صاحب کے تغافل، تساہل، یا پھر تساغل کا نتیجہ ہی ہوگی۔ امید ہے کہ خط کو شائع فرمائیں گے!

آذر بیابانی

اداریہ

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

۱۵ ر فروری کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اس میں زیادہ تر مضامین کلیم الدین احمد کے ہیں۔ ایک مضمون پروفیسر محمد محسن کا ہے۔ ایک اسلم عظیم آبادی کا جو پاکستان میں شائع ہوا ہے۔ گوپال متل اور شہباز حسین کے مضامین تاثراتی ہیں۔ سردار جعفری نے بھی چند سطور کے ذریعے کلیم الدین احمد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ کلیم الدین احمد پر بھرپور شمارہ بلکہ نمبر نکالنے کا ارادہ تھا اور ہے مگر اردو قارئین کی بے نیازی کی وجہ سے ابھی تک ہم اس پوزیشن میں نہیں آسکے کہ چھپائی پر زیادہ رقم خرچ کرسکیں۔ اسی لئے یہ شمارہ صرف ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ انشاء اللہ کلیم الدین پر دوسرا شمارہ جو انھیں دو تین مہینوں کے اندر پیش کر دیا جائے گا زیرِ نظر شمارے سے زیادہ وسیع ہوگا۔

کلیم الدین احمد اردو کے واحد نقاد ہیں جنھوں نے باضابطہ کتابیں لکھی ہیں مبسوط اور مربوط۔ ورنہ زیادہ تر نقاد وہ ہیں جنھوں نے مختلف اوقات میں مختلف ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت مضامین لکھے اور انھیں مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا۔

اسی لئے ان کے مجموعوں میں تکرار بکثرت ملتا ہے۔ بعض اوقات تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ چونکہ ان کے پیشِ نظر کوئی معیار کوئی مقصد نہیں ہوتا اس لئے وہ ادبی سرمایہ میں اضافہ کا سبب نہیں بنتے۔ کلیم الدین احمد کی تحریریں ہمارے ادبی سرمائے کا وقیع حصہ ہیں۔

کلیم الدین نے زندگی بھر اعلیٰ عالمی اور ابدی معیاروں کو پیشِ نظر رکھا۔ انھوں نے ادب کے عالمی اور اعلیٰ معیاروں کو پیشِ نظر رکھ کر ادب کی پرکھ کے جو اصول پیش کئے وہ واضح روشن اور نمایاں ہیں۔ انھوں نے ذاتی پسند اور ناپسند کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ صداقت ان کا شعار تھا۔ محنت اور لگن شیوہ۔ صاف سادہ اور دل نشین نثر میں وہ کسی ستائش اور صلے کی پرواہ کئے بغیر آخیر دم تک لکھتے رہے۔ ہم نے ان کی قدر نہ کی۔ یہاں تک کہ ساہتیہ اکاڈمی نے انھیں ایوارڈ تک نہیں دیا بلکہ ان پر ایک ایسے آدمی کو ترجیح دی جو زندگی بھر سوتا رہا آج بھی کسی محفل میں اسٹیج پر ہی اسے سوتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ اس غریب کی کوئی قابلِ وقعت تحریر نہیں۔ مگر جوڑ توڑ سے کیا نہیں ہوتا۔ کلیم الدین کا کچھ نہ بگڑا ساہتیہ اکاڈمی کی ذلت میں اضافہ ہوا۔ مگر ہمارا قومی پریس تو کسی اقلیتی مسئلے سے دلچسپی ہی نہیں رکھتا اور اردو پریس قعرِ مذلت میں پڑا ہے۔

کلیم الدین احمد کی تحریروں کو اکثر لوگوں نے شوک ٹریٹمنٹ قرار دیا ہے۔ اس کی ضرورت تھی اور آج بھی ہے۔ کلیم الدین سے بہت سے لوگ کل بھی ناراض تھے آج بھی ناراض ہیں مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ کلیم الدین نے کوئی غلاظت پھیلائی نہیں بلکہ صرف یہ کیا کہ جہاں غلاظت تھی وہاں لالٹین روشن کر دی۔

بہرکیف اردو اس دور کے سب سے بڑے ناقد سب سے بڑے خادم سے محروم ہو گئی۔ اب بھی اگر اردو والوں میں ذرا بھی شرم و حیا ہے تو وہ زور دیں گے کہ کلیم الدین احمد کی تیار کردہ فرہنگ اور انگریزی اردو لغت کو جلد سے جلد شائع کیا جائے۔ کلیم الدین کی زبردست خواہش تھی کہ لغت جو اردو کی ابھی تک کی سب سے شاندار لغت ہے جلد سے جلد شائع ہو جائے مگر ان کی خواہش پوری نہ ہوئی انھوں نے کہا تھا شائد تم لوگ میری قبر پر لے کر آؤ گے ـــــ مجھے اس میں بھی شبہ ہے ـــــ ہم اتنے نااہل ہیں کہ یہ بھی نہیں کریں گے۔

بہرکیف مذکورہ موعودہ شمارہ توقع ہے بھرپور شمارہ ہوگا اور اس طرح ہم قارئین کی تشنگی دور کرسکیں گے۔

بعض لوگوں نے شکایت کی ہے کہ انھیں رسالہ نہیں ملا عرض ہے کہ ایسی شکایت آنے کے فوراً بعد ہم دوبارہ بلکہ سہ بارہ رسالہ بھیج دیتے ہیں مگر جو لوگ خریدار نہیں ہیں انھیں رسالہ بھیجنا مشکل ہے۔ ابھی تک ہم میں باہمی تعاون کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ آپ خریدار بنئے تاکہ خود آپ کو فائدہ ہو مگر کوئی اثر نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ اشاعت بڑھی نہیں اشاعت کم ہے اس لیے ہر جگہ دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے پریس والوں کو اسے چھاپنے سے دلچسپی نہیں ہوتی اس لئے کہ تعداد کم ہے چھپائی کی رقم کم ہوگی۔ دفتری، کاغذ والے، فلم بنانے والے، ہر جگہ پریشانی ہوتی ہے۔ اشتہار والے اشتہار نہیں دیتے۔ رسالہ غربت کے چکر سے نکل ہی نہیں پاتا۔ اسی لئے وہ مفلوک الحالی کی زندگی گذارتا ہے ـــــ اس مفلوک الحالی سے سب سے زیادہ نقصان لکھنے والوں کو ہوتا ہے۔ نہ ان کی تخلیق زیادہ دور تک پہنچ پاتی ہیں نہ انھیں ان کی محنت کا معاوضہ مل پاتا ہے ـــــ ہم بار بار زور دے چکے ہیں کہ اگر ایک ہزار لکھنے والے خریدار بن جائیں تو رسالے کا معیار بھی بہتر ہو جائے گا۔ صفحات بھی بڑھ جائیں گے۔

کلیم الدین احمد

گوپال متل

۲۱ر اور ۲۲ر دسمبر کی درمیانی شب کو اردو کے اہم ترین ناقد جناب کلیم الدین احمد کا انتقال ہوگیا۔ ان کا سن پیدائش ۱۹۱۰ء تھا اس اعتبار سے انھوں نے کم و بیش تہتر برس کی عمر پائی۔

کلیم الدین احمد انگریزی کے پروفیسر تھے اس لیے مغربی ادب کے بارے میں ان کی معلومات تفصیلی تھیں۔ مغربی اصول تنقید سے واقفیت کا دعویٰ تو اردو کے تقریباً سبھی ناقدین نے کیا ہے، حالی تک نے بھی جن کی معلومات شنید کی حد تک تھیں۔ لیکن کلیم الدین احمد کی تنقیدی تحریروں کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مغربی تنقیدی اصولوں کو برتا بھی ہے۔

کلیم الدین احمد گفتگو میں کافی بخیل تھے۔ اس بنا پر بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مبتلائے زعم ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ ان میں جو ایک مخصوص قسم کا پندار تھا بھی وہ اردو کے دوسرے ناقدوں کے رویّے کا ردِ عمل تھا جو ان کی تحریروں کا علمی جواب دینے کی بجائے منفی اور مثبت تنقید کے نعرے لگانے شروع کر دیتے تھے اور یہ بھول جاتے تھے کہ تنقید صحیح اور غلط تو ہوتی ہے، منفی اور مثبت نہیں۔

راقم کا خیال ہے کہ ان کے رویّے کو منفی رویّہ کہنا بھی صحیح نہیں۔ حالی کا انھیں نکتہ چیں تصوّر کیا جاتا ہے۔ لیکن حالی کے بارے میں یہ تحریر بھی ان ہی کی ہے :

”اپنے زمانہ، اپنے ماحول، اپنی حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ تعریف کی بات ہے وہ اردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اس وقت اردو کے بہترین نقاد بھی.... ان کی تاریخی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ ان کی نثر بلند پایہ ہے، ان کا خلوص زبردست ہے“ مٹ

مولوی عبدالحق کے بارے میں بھی یہ الفاظ انھیں کے ہیں :

”عبدالحق صاحب پختہ کار ہیں۔ وہ عجلت سے کام نہیں لیتے ہیں۔ محنت اور غور و فکر ان کی عادت ہے۔ وہ عموماً اپنے موضوعات پر کامل عبور رکھتے ہیں اور جب تک بات کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے ہیں رائے زنی نہیں کرتے ہیں۔ اپنی حدود کے اندر ذوق صحیح رکھتے ہیں۔ اچھے برے، کھرے کھوٹے میں تمیز کرتے ہیں۔ وسعت نظر بھی موجود ہے۔ مغربی ادیبوں سے تو واقفیت نہیں لیکن مغربی اصول تحقیق سے واقفیت ہے۔ جذبات سے کافی شغف ہے اور معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ہیں“ مٹ

حالی اور مولوی عبدالحق کے تنقیدی تسامحات کی نشاندہی میں البتہ انھوں نے بیجا مروت سے کام لینا ضروری نہیں سمجھا۔

عبدالرحمان بجنوری پر ان کی تنقید سخت ضرور ہے لیکن جن لوگوں نے بجنوری کی تحریروں کو پڑھا ہے وہ کلیم الدین احمد کی تنقید کے حرف حرف سے اتفاق کریں گے کلیم الدین احمد نے اس کا حوالہ نہیں دیا لیکن بجنوری کی تنقید کی بوالعجبی کا ثبوت ان کا یہ اہم فقرہ ہے :

”ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید اور ایک دیوان غالب“

دلچسپ بات یہ ہے کہ بجنوری نے جو کچھ کہا ہے وہ غالب ہی سے مستعار ہے غالب کا شعر ہے :

غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را کتاب ایزدیں بودے

غالب نے شرط لگا دی تھی کہ ان کا دیوان الہامی کتاب تبھی قرار پائے گا اگر فن سخن دین کا مرتبہ حاصل کر جائے گا لیکن بجنوری نے جدیدیت کی رو میں بہہ کر اس احتیاط کو خیرباد کہہ دیا۔

آل احمد سرور پر کلیم الدین احمد نے تضاد بیانی کا الزام لگایا ہے لیکن انھوں نے تین جگہوں میں ”ہاں“ اور ”نہیں“ کے عنوان سے دو کالم قائم کرکے ان کے متضاد اقوال بھی نقل کر دئے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے بارے میں ان کا ارشاد ہے :

”رشید صاحب نے یوں تو تنقیدی مضامین میں بھی بڑی خیال انگیز باتیں کہی ہیں، مگر دراصل وہ ایک مزاح نگار، طنز نگار اور انشا پرداز کی حیثیت رکھتے ہیں“

یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ یوم غالب پر صدیقی صاحب نے اپنا تنقیدی مقالہ پڑھا تھا جسے سن کر راقم الحروف نے ان

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

کلیم الدین احمد (مرحوم)

شہباز حسین

پروفیسر کلیم الدین احمد کے انتقال سے ایک ایسی شخصیت اٹھ گئی جو گزشتہ ۴۰، ۴۵ سال سے اردو ادب میں بڑی متنازعہ فیہ رہی ہے۔

اردو شاعری پر ایک نظر اور اردو تنقید پر ایک نظر کی اشاعت غالباً ۶۲، ۱۹۶۱ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے ان کی موت تک ان کے نظریات اور خیالات پر بڑی بحثیں ہوئیں اور جتنا ان کے خلاف لکھا گیا بہت کم لوگوں کے خلاف لکھا گیا ہوگا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ کلیم صاحب نے کسی کو نہیں بخشا تھا۔ اردو والے بڑی مروت کے لوگ ہیں۔ دوٹوک باتیں کہنے اور سننے کے عادی نہیں ہیں اور اخلاقیات کا اصول یہ ہے کہ خطائے بزرگاں کی گرفت کرنا بھی خطا میں داخل ہے۔ ایسی صورت میں سارے بزرگوں کے ساتھ کلیم صاحب نے جو سلوک کیا وہ سبھوں کے لئے ناقابل برداشت بن گیا۔

کہاں محاسن کلام غالب۔ دیوان غالب اور وید مقدس، کہاں اردو شاعری کی آبرو غزل اور کہاں غالب کے بارے میں کلیم صاحب کا ارشاد اور پھر ستم یہ کیا کہ اردو غزل کو ہی نیم وحشی صنف سخن قرار دے دیا۔ اقبال کی شاعری، انیس کے مراثی سبھوں کا ایسا تجزیہ کیا کہ مروجہ خیالات اور مسلمہ عقائد بری طرح مجروح ہوئے۔ لہٰذا ان کی تنقیدیں تخریبی اور مغرب زدہ قرار پائیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی تحریروں کو رد نہیں کیا جا سکا اور کیا بھی نہیں جا سکتا۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے ایک نئی بصیرت، ایک نیا ادراک پیدا کیا اور اردو میں عملی تنقید کی شروعات کی۔ اور ادب کو عالمی ادبی پس منظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ اور اس کا بہت فائدہ پہنچا۔

کلیم صاحب میرے استاد نہیں تھے مگر میرے استاد پروفیسر اختر اورینوی کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اور اختر صاحب کے توسط سے ہی پہلے پہل ہم لوگوں کا کلیم صاحب سے تعارف ہوا۔ ہم لوگ بھی شروع میں کلیم صاحب کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے ہمارے سارے ادبی سرمائے کو رد کر دیا تھا۔ مگر اختر صاحب نے رفتہ رفتہ ہمارے تعصب کو کم کیا اور سکھایا کہ دوسروں کے خیالات کو سننا چاہئے۔ اس پر غور کرنا چاہئے اور پھر کوئی فیصلہ کرنا چاہئے کیونکہ کسی کی ساری بات سے اتفاق کرنا تو ممکن نہیں۔ لوگ پیغمبروں، ولیوں اور درویشوں سے سو فی صد متفق نہیں ہوئے وہ تو محض ادیب تھے۔

کلیم صاحب ہوسٹل کے وارڈن تھے اور گنگا کنارے ایک کشادہ کوٹھی میں رہتے تھے۔ حلقۂ ادب ہمارے جلسے میں شرکت کے لئے پروفیسر احتشام حسین آئے۔ اور کلیم صاحب سے ملنے کے خواہش مند ہوئے۔ ہم چند طالب علم (غلام سرور سابق وزیر تعلیم حکومت بہار، پروفیسر قمر توحید (وائس چانسلر بھاگلپور یونیورسٹی) اور پروفیسر سید اختر (ڈپٹی اسٹوڈنٹ ویلفیئر رانچی یونیورسٹی) احتشام صاحب کے ساتھ کلیم صاحب کے یہاں پہنچے۔ علیک سلیک کے بعد مکمل سناٹا چھا گیا۔ ہم چھوٹے دو بڑوں کے بیچ میں کیا بولیں۔ احتشام صاحب نے سلام کلام شروع کیا۔ فی الحال کیا لکھ رہے ہیں۔ جواب ملا کچھ نہیں۔ احتشام صاحب نے پوچھا فلاں کتاب نظر سے گزری، جواب ملا، جی ہاں اس طرح کے دو چار جملوں کے بعد ملاقات ختم۔ ہم سب بہت نروس تھے کہ احتشام صاحب کیا سوچیں گے۔ لہٰذا ہم نے کہنا شروع کیا کلیم صاحب بہت کم بولتے ہیں کسی جلسے میں آتے جاتے نہیں۔ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں۔ ہر وقت پڑھتے رہتے ہیں۔ وہ ہرگز مغرور یا بداخلاق نہیں ہیں۔ احتشام صاحب مسکراتے رہے اور بولے کہ ہمیں کلیم صاحب کے مزاج اور افتاد طبع کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ آپ لوگ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اس طرح ہماری جان میں جان آئی۔ پھر بھی دل میں یہ خلش رہی کہ ایسی بھی کیا کم آمیزی۔ آخر کلاس روم میں لکچر کیسے دیتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ سارے طالب علم ہمہ تن گوش ہیں۔ اور وہ لوگ بھی کلاس میں شامل ہوں جو ادب کے طالب علم نہیں ہیں۔ قمر تو انگریزی میں ایم۔ اے کر رہے تھے اس لئے اکثر چلے جایا کرتے تھے مگر ہم لوگ کبھی کبھار جا پاتے تھے کیونکہ وہ ہمارے ادبی جلسوں اور مشاعروں میں شریک ہونے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتے۔

کلیم صاحب پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے اور پھر ڈی۔ پی۔ آئی اور پھر وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوئے۔ وہ معاصر برابر نکالتے رہے۔ معاصر نے بھی ادب کی اعلیٰ قدروں کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ تذکرے لکھے، ڈرامے لکھے، شاعری بھی کی۔ میرا پھر پٹنے سے ناتا ٹوٹ گیا۔ آج کل کے لئے شاید ہی انھوں نے کبھی لکھا ہو۔ دوبارہ کلیم صاحب سے ملنے اور ان کے آنے کا موقع ملا جب میں ترقی اردو بورڈ سے منسلک ہوا۔ بورڈ نے اردو اردو اور انگریزی اردو لغت کا منصوبہ بنایا تھا۔ اردو لغت کی تیاری کا کام پانچ مدیروں کے سپرد کر دیا گیا مگر انگریزی اردو لغت کی تیاری کا کام پروفیسر کلیم الدین احمد کے سپرد ہوا۔ اور اس سلسلے میں ان سے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا۔ پھر کلیم صاحب ترقی اردو بورڈ کے ممبر بنائے گئے۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے رکن بنے۔

کلیم صاحب اس پیرانہ سالی میں بھی بڑی محنت اور تن دہی سے کام کرتے تھے۔ دفتر ان کے گھر میں تھا، مگر بڑی باقاعدگی سے دفتر آتے اور اوقات کی پوری پابندی کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ پانچ سال کی منظور شدہ مدت میں انگریزی۔ اردو لغت سازی کا کام مکمل ہو گیا۔

(باقی صفحہ پر)

سید شہاب الدین ایم پی انگریزی ماہنامہ مسلم انڈیا سے ماخوذ

محلے اور گاؤں پرائمری اسکولوں کے لئے سو رہے ہیں، نوجوان صنعتی تربیت اور ٹیکنیکل تعلیم کے بھوکے ہیں، ذہین طلبہ مالی مشکلات کی وجہ سے پیشہ وارانہ نصاب کے حصول کے لئے تڑپ رہے ہیں، ہنر یافتہ کارکنوں کے پاس کاروبار شروع کرنے کے لئے ابتدائی سرمایہ نہیں ہے، رکشا والے اپنی رکشا خرید نہیں سکتے، چھوٹے دوکانداروں کے پاس دکانیں چلا سکنے کے لئے روپئے نہیں ہیں، دستکاروں کے پاس کچا مال خریدنے کے لئے سرمایہ نہیں ہے اور اسی لئے وہ بازار میں کھپ نہیں پاتے انھیں دلالوں کے رحم و کرم پر جینا پڑتا ہے ہماری بستیوں اور گاؤں میں لائبریریاں اور دار المطالعے نہیں ہیں، بچوں کے لئے کھیلنے کی سہولیات نہیں ہیں، یتیموں اور بوڑھوں کے لئے گھر نہیں ہیں۔ فساد زدگان کو بروقت راحت نہیں ملتی، بیواؤں کو امداد کی ضرورت ہے،

اور لڑکیاں شادی سے محروم ہیں،

اسکے باوجود سماجی مسابقت کے غیر تحریری اصول کے اسیر ہو کر ہم اپنی دولت ضائع کر رہے ہیں، اپنے خون پسینہ اور آنسوؤں کی کمائی تزک و احتشام پر برباد کر رہے ہیں!

عزیز بھائیو!

پہلا اصول یہ ہے کہ روپئے کو بیکار پڑا مت رہنے دو، روپئے کی قدر میں اسکی گردش سے اضافہ ہوتا ہے، بیکار پڑے رہنے سے روپئے ضائع ہوتے ہیں!

دوسرا اصول یہ ہے کہ صرف پر شعوری حد قائم کی جائے، اسلئے کہ انسان کے حرص کی انتہا نہیں ہے، اور اس لئے اسلام نے بیجا اسراف اور فضول خرچی سے روکا ہے،

تیسرا اصول یہ ہے کہ فاضل کو امانت سمجھا جائے اور اسے سماجی مفاد کے لئے استعمال کیا جائے، سماجی استعمال سے میرا مطلب خالص خیراتی استعمال نہیں ہے، اس کا مطلب منافع بخش سرمایہ کاری ہے۔

چوتھا اصول بھی اسلامی ترجیحات کے مطابق یہ ہے کہ اپنے قریبی عزیزوں کی مدد کرو۔ اپنے رشتہ داروں کی۔ دوستوں کی اور عزیزوں اور پڑوسیوں کی، ان لوگوں کی جو تمہیں جانتے ہیں، اور جنکو تم جانتے پہچانتے ہو، اس طرح غلط استعمال اور بددیانتی پر سماج کی گرفت ہوتی ہے،

میری مخصوص تجویز یہ ہے کہ آپ میں سے ہر شخص جسے اللہ نے زیادہ دیا ہے اپنے ارد گرد ماحول پر نظر ڈالے اور مخصوص منصوبہ کے تحت کام شروع کرے!

★ ہوشیار طلبہ کو وظیفے دیئے جائیں۔

★ تعلیمی اداروں کو، لائبریریوں اور کھیل گھروں کو عطیے دیئے جائیں،

★ مقامی امداد باہمی کی انجمنوں میں شرکت کی جائے،

★ دستکاروں اور ہنر یافتہ کاریگروں کو اپنا کاروبار شروع کرنے کے لئے قرضے دیئے جائیں۔

★ قابل قدر صنعتی کاموں میں حصہ لیا جائے،

★ پیشہ وارانہ تعلیم یافتہ جوانوں کو اپنا کاروبار شروع کرنے کے لئے قرض دیئے جائیں ڈاکٹروں کو مطب کھولنے کے لئے، انجینیوں کو کمپنی کے لئے، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کو دفتر کھولنے کے لئے، صحافیوں کو اخبار شروع کرنے کے لئے!

عزیز بھائیو!

سماجی محاذ پر بھی مقامی برادریاں لڑکیوں کی شادی کے لئے ادارے قائم کریں، بیواؤں کو سہارا دیں، بوڑھوں کی دیکھ بھال کریں مسجدوں کی مرمت کریں، مدرسوں کو قائم رکھیں، اتوار کے دن اسکول چلائیں، مقامی یتیم خانے چلائیں، ہر ایک محلہ اور گاؤں کے ویلفیئر کمیٹیاں بنائیں اور ان میں ایسے خاندانوں کے نمائندوں کو بھی شامل کریں جنکے رشتہ دار ملک سے باہر روپئے کما رہے ہیں مذاکرہ سرمایہ جمع کرکے انفرادی ضرورتوں کی تکمیل کا اقدام کیا جاسکتا ہے،

راحت کے محاذ پر بھی ایک مرکزی راحت کمیٹی بنائی جائے، اسمیں تمام سرگرم اداروں اور افراد کے تعاون کے ساتھ ساتھ ملک کے باہر کام کرنے والوں سے بھی تعاون حاصل کیا جائے۔ یہ کمیٹی دوسری پرانی اور تجربہ کار تنظیموں سے بھی تعاون حاصل کرے گی!

آپ کے مدد کی مختلف جہتوں میں ضرورت ہے، نجی اور عوامی سطح پر راست اور بالواسطہ طور پر جدوجہد ضروری ہے تاکہ برادری (قوم) قابل قدر ادارے قائم کرسکے، اور اُسے وقار اور تجربہ حاصل ہو، جیسے جیسے ان اداروں کی ترقی ہوگی انفرادی ذرائع کی ضرورت کم

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

بقیہ کلیم الدین احمد

کی خدمت میں عرض کیا تھا:

"صدیقی صاحب! میں آپ کے اندازِ بیان کا اتنا قتیل ہوں کہ آپ کے مفاہیم تک نظر جاتی ہی نہیں" اس پر صدیقی صاحب نے فرمایا تھا کہ "گوپال مِتّل اہم دونوں ایک ہی ماحول کے پروردہ ہیں، بتائیے مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے" اس پر میں نے کہا تھا کہ "آپ نے جو شعر غالبؔ سے منسوب کیا ہے وہ ثاقبؔ کا ہے"

اکثر لوگ کلیم الدین احمد کے اس قول پر بڑے برہم ہیں کہ "غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے" لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ غزل کی انتہا پسندانہ ستائش کا شدید ردِ عمل ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو مہذب پیرایۂ اظہار نثر ہے۔ اسکے مقابلے میں شاعری خواہ وہ نظم ہو یا غزل نسبتاً نیم وحشی ہی ہوگی۔ کلیم الدین احمد اس بات کو نہیں مانتے تھے لیکن شاعری بہرحال اضطراری کیفیات کا اظہار ہے، اس پر ذہن کا اتنا قید پہرہ نہیں ہوتا جتنا نثر پر۔

۱۔ اردو تنقید پر ایک نظر کلیم الدین احمد صفحہ ۱۲۱
۲۔ " " " " " " " " " " صفحہ ۱۲۳
اشاعت ۱۹۸۳ء بک امپوریم پٹنہ
" " " " " "

بقیہ شہاب الدین ایم پی

ہوتی چلی جانے لگی، اپنے خاندان اور دوستوں کی مدد سے مقامی اداروں اور تنظیموں کی مدد سے کام شروع کیجئے!

بلاشبہ مناسب صورت حال پیدا ہوگی، اور تجربہ کار اور باوقار ادارے ابھریں گے،

حسب بالا سطور مسلم انڈیا کے اداریہ سے ماخوذ ہیں، ہمیں امید ہے ہمارے قارئین بھی اسکی طرف توجہ فرمائیں گے!

بقیہ کلیم الدین احمد

اور بہار کا یہ ایک منصوبہ تھا جو مقررہ وقت کے اندر مکمل ہو گیا۔

یہ کام انھوں نے بڑی لگن اور محنت سے کیا تھا۔ افسوس ہے کہ اپنی زندگی میں وہ اسے چھپا ہوا نہ دیکھ سکے۔

کلیم صاحب اب اتنے کم آمیز نہیں رہ گئے تھے جتنا وہ شروع میں تھے۔ ادبی جلسوں میں بھی جانے لگے تھے۔ بہت سے اداروں اور کمیٹیوں کے جلسوں میں شریک ہونے لگے تھے اور بہار اردو اکاڈمی سے تو ان کا بڑا گہرا رابطہ تھا۔ بہار اکاڈمی کو فعال بنانے میں بھی کلیم صاحب نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔

کلیم صاحب اپنی ذات سے انجمن تھے انھوں نے بہتوں کا بھلا کیا۔ بہار میں اردو کو فروغ کے لئے انھوں نے زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ ادبی دُنیا میں ہمیشہ ان کا نام عزت و احترام سے لیا جائے گا۔

تہذیبی سرگرمیاں

ڈاکٹر قمر رئیس بہ یک وقت تین یونیورسٹیوں میں پروفیسر ہو گئے ہیں۔
یہ یونیورسٹیاں ہیں ——
دہلی یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی اور تاشقند یونیورسٹی۔

میں کہ جاندادۂ تکا تو ہوں
آرزو مندِ حیات و جُستجو ہوں

سوچ بھی دل میں ہے ارادہ بھی
خود ہی ہوں درد خود ہی دارو ہوں

خوش ہوں تھوڑی سی روشنی پا کر
میں شبِ آرزو کا جگنوں ہوں

مجھ کو لاکھ کتنا ہی ستیزہ کیش
میں ہمیشہ کشادہ بازو ہوں

ناچ کے بعد اتار پھینکا ہو
نرتکی نے جسے وہ گھنگرو ہوں

ہوش مندی کی بات کیا کرتا
ایک مدت سے رہن جادو ہوں

میں روایت کے بند کمرے میں
بند کیسے رہوں کہ خوشبو ہوں

پھول ہوں میری زندگی کیلئے
گرچہ حسن ہزار پہلو ہوں

کل کہیں دھول میں پڑا ہونگا
آج رونق فروزِ گیسو ہوں

کب مرا دل لگا ہے دُنیا سے
میں گرہست آشرم کا سادھو ہوں

کرشن موہن اداس ہے جیون
یاس کا یاتری ہوں بھکشو ہوں

کرشن موہن

کلیم الدین احمد سے ملاقات

بشیر احمد
حامد ربانی

۱: اردو غزل کے بارے میں آپ نے یہ کیوں کہا کہ وہ نیم وحشی صنف سخن ہے۔

ک۔ غزل میں ربط، اتفاق اور تکمیل کی کمی ہے۔ یہی ربط، اتفاق اور تکمیل تہذیب کا سنگ بنیاد ہیں اور انھیں چیزوں کی کمی کی وجہ سے میں نے کہا تھا کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے اردو شاعری حصہ اوّل ص ۱۱۳ تا ص ۱۴۸۔

۲: آپ پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ آپ اردو تخلیقات کا انگریزی کی تخلیقات سے موازنہ کر کے فتوی صادر کرتے ہیں کہ فلاں تخلیق انگریزی کی فلاں تخلیق کے مقابلہ میں گھٹیا ہے۔

ک، ادب کا اثر عالمگیر ہے۔ اس کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا ہے۔ اس لئے جن اصولوں پر ادب کی جانچ پرکھ کی جائے گی وہ بھی عالمگیر ہوں گے۔ سرور صاحب کہتے ہیں: کلیم الدین کے سامنے عالمی ادب کے معیار ہیں اور وہ انھیں معیاروں سے اردو کو پرکھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک افکار اور خیالات ساری دنیا کی ملکیت ہوتے ہیں۔

۳، کلیم صاحب آپ غزل کو نیم وحشیانہ صنف سخن کہتے ہیں پھر یہ اتنی مقبول کیوں ہے؟

ک: کسی چیز کا زیادہ مقبول ہونا اس کے ادبی معیار کی بلندی کی دلیل نہیں ہوتی۔ آج کتنے لوگ شیکسپیر کو پڑھتے یا سمجھتے ہیں اور جاسوسی ناول پڑھنے والوں کی تعداد لاکھوں ہے پھر بھی جاسوسی ناول معیاری ادب نہیں۔

۴: اردو میں کون سی صنف سخن ہے جسے عالمی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ کیا طلسم ہوشربا کو یہ مقام دیا جا سکتا ہے۔

ک: میں نے تو کہا ہے کہ اردو کی داستانوں کا مقابلہ کسی دوسری زبان کی داستانوں سے کیا جاسکتا ہے اور اردو کا پلہ بھاری رہے گا۔

۵: اردو تنقید پر ایک نظر کے بارے میں کچھ بتایئے

ک: یہ کتاب پہلے معاصر میں قسط وار شائع ہوئی پھر کتابی شکل میں کئی بار پھر ترمیم و اضافہ کے ساتھ فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا تھا، ۱۹۵۰ء میں اور پانچ اڈیشن شائع کئے۔ ابھی حال میں مزید ترمیم و اضافہ کے ساتھ کتاب بک امپوریم نے شائع کی ہے

۶: اس کتاب کے بعد اردو تنقید میں کوئی قابل ذکر چیز آئی یا نہیں؟

ک: اب تو بہت سی تنقیدی کتابیں لکھی جانے لگی ہیں اور کتابوں سے زیادہ تنقیدی مضامین۔ ظاہر ہے ان میں مفید کم اور بیکار زیادہ ہیں۔

۷: آل احمد سرور اور شمس الرحمٰن فاروقی کے بعد اردو میں کوئی قابل ذکر ناقد ہے؟

ک، شمس الرحمان فاروقی کے بعد کی نسل میں کوئی قابل ذکر ناقد نہیں ابھرا ہے۔

۸: کہا جاتا ہے کہ آپ نے گل نغمہ کی بڑی تعریف کی اور اس میں جانب داری سے کام لیا ہے۔

ک: کہنے والوں کا کوئی منہ بند نہیں کرسکتا۔ کیا آپ نے "ادبی تلاش" کی پہلی جلد دیکھی ہے؟ جس سچائی کا ثبوت وہاں ہے اسی سچائی کا ثبوت گل نغمہ میں بھی ہے۔ گل نغمہ کی نظمیں انگریزی طرز میں ۱۹۰۹ سے ۱۹۱۲ء کے درمیان لکھی گئی تھیں جب اس قسم کی نظموں کا رواج نہ کے برابر تھا۔ بہت سے انگریزی بند خصوصاً جو شعرائے مابعد نے استعمال کئے اس کا استعمال پہلی بار گل نغمہ میں ہوا تھا اور یہ اس کی تاریخی اہمیت ہے۔ رہی اس کی تعریف اہمیت تو اس میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ میں کسی کی جانب داری نہیں کرتا۔ رہا نغمہ تو یہ ادبی لوگوں کی خصوصیت ہے۔ یہ تو واقعہ ہے کہ گل نغمہ پہلے شائع ہوئی تھی اور اس کی ایک کاپی میں نے عارف کو دی تھی۔ یہ نام انھیں شاید اتنا پسند آیا کہ اسے اپنی کتاب کے لئے بھی پسند کر لیا۔

۹: آپ نے شاد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

ک: اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں اردو شاعری کی تاریخ نہیں مرتب کر رہا تھا۔ آپ کو شاید معلوم ہے کہ کلیات شاد تین جلدوں میں میں نے بہار اردو اکادمی کے لئے ترتیب دیا ہے۔

۱۰: آپ نے شاعری بھی تو کی ہے؟

ک۔ میری نظمیں معاصر میں شائع ہوئی تھیں، پھر میں نے دو مجموعے سات نظمیں اور بیس نظمیں شائع کئے لیکن میں نے دیکھا کہ دو تین بچوں کے بعد بھی کسی نے انھیں نہیں سمجھا۔ اور یہ مشکل ہے کہ میں نظمیں لکھوں اور پھر ان کی تشریح بھی۔

۱۱: کچھ تو ایسے ہم نے وہ نظمیں پڑھی تھیں۔

ک۔ وہ نظمیں مشکل اس لئے ہیں کہ ان کے پس منظر میں جو کچھ میں نے پڑھا جو کچھ تجربے مجھے ہوئے تھے جن کا دھندلا سا عکس آپ کو اسی تلاش میں جلد ۱ اور جلد ۲ میں ملے گا۔ اگر ان تجربوں سے واقف نہیں تو کچھ دشواری ضروری ہوتی ہے لیکن غور سے اگر پڑھا جائے تو معنی ہر جگہ روشن ہے

۱۲: آپ نے کتنی کتابیں لکھی ہیں۔

ک: انگریزی اور اردو میں تقریباً ۴۰ کتابیں لکھی ہیں کچھ کتابیں EDIT کی ہیں جیسے گل نغمہ، دو تذکرے، کلیات شاد وغیرہ اور کچھ تصانیف ہیں: اردو شاعری پر ایک نظر، اردو تنقید پر ایک نظر، اردو زبان اور فن داستان گوئی، عملی تنقید، اقبال۔ ایک مطالعہ، ادبی تنقید کے اصول، میری تنقید۔ ایک بازدید، قدیم مغربی تنقید وغیرہ اور انگریزی میں PSYCHO ANALYSIS AND LITERARY CRITICISM-MAKING OF CRITIC M THE MEANIN OF-CRITICISM-RECREATION-IDOLS

۱۳: آپ کی کتابیں مہنگی ہیں۔ تیس بیس روپے سے کم کوئی نہیں ہے

ک۔ پہلے تو میری کتابیں بہت سستے داموں پر مل جاتی ہیں۔ اب ہر چیز اس قدر گراں ہے کہ پبلشرز نے قیمت بڑھا دی ہیں۔

۱۴: نمبر کتنے لکھے آپ نے

ک: دو۔ ایک نذر کلیم، اردو ڈرامہ نمبر سرکار نے -

(باقی صفحہ ۲۲ پر) -

اپنی تلاش میں

(اقتباسات)

کلیم الدین احمد

سُنا ہے کہ میری پیدائش کا دن ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء اور وقت ساڑھے چھ بجے شام ہے۔ نہ کسی نے اس پیدائش کی بشارت دی تھی اور نہ کسی نئے ستارے نے آسمان پر جگمگا کر اس واقعہ کی طرف لوگوں کی رہنمائی کی تھی۔ اور اب ۶۱ سال کی عمر میں سوچتا ہوں کہ وہ دن جلد آنے والا ہے جب لوگ کہیں گے:

یہ کس کا جنازہ اُٹھ رہا ہے

اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جب جنازہ اٹھے گا تو نہ عبرت سر جھکائے گی اور نہ حیرت آئینہ دیکھے گی۔ آنکھیں اُداس نہ ہوں گی، سر بوجھ سے جھکے ہوئے نہ ہوں گے، دل داغ سے بھرے ہوئے نہ ہوں گے۔ باتیں، طرح طرح کی باتیں ہوں گی، آہیں نہ ہوں گی۔ نہ کوئی خاک سر پہ ڈالے گا اور نہ کوئی گریباں چاک ہوگا۔ اور ہنجر ڈ کی طرح یہ وصیت کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ کوئی شخص مجھے یاد نہ رکھے۔

ہاں اور اب اکسٹھ سال کی عمر میں سوچتا ہوں کہ ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء کو ساڑھے چھ بجے شام کے وقت یہ بات کیوں ہوئی۔ قدرت کا کوئی اندھا قانون تھا یا ضمیر قدرت میں اس کی کوئی وجہ بھی تھی۔ کچھ نہیں سے یہ 'کچھ' کیوں ظہور میں آیا اور پھر 'کچھ نہیں' کیوں ہونے والا ہے۔ غالب نے کہا ہے:

نہ تھا میں تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟ خدا ہوتا؟ کچھ نہیں ہوتا؟ یہ تو محض شاعری ہے۔ سوال یہ ہے 'ہونے' نے مجھ کو ڈبویا یا ترایا؟ بلبلا ابھرتا ہے، پھر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ بنتا بگڑنا کیوں؟ دریا کو بلبلوں کے بننے بگڑنے کی خبر ہے یا وہ بے خبر ہے؟ کہتے ہیں:

دریا بوجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

یہ صحیح ہے کہ "دریا بوجود خویش موجے دارد" لیکن اگر خس نہ ہو تو پھر اس کشاکش کی خبر کس کو ہو؟

اور یہ بھی سوچتا ہوں کہ کیا آج میں اکسٹھ سال کی عمر میں وہی ہوں جو میں اکسٹھ سال پہلے تھا۔ کیا یہ صحیح ہے کہ

THE CHILD IS FATHER OF THE MAN

کیا درخت کی صورت وہی ہوتی ہے جو تخم میں پنہاں ہوتی ہے یا زمین جو اس تخم کی پرورش کرتی ہے، دھوپ، پانی، ہوا۔ کیا یہ سب چیزیں تخم کے امکانات کو بدل دیتی ہیں بالکل بدل دیتی ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر جہاں تخم ہو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پھر اس تخم میں سے یہ شاخ کیوں نکلے:

اپنے ہاتھوں سے جس کو ڈھالا
اس کو اپنا خدا بنایا
جبّار اسے بنایا تم نے
قہّار اسے بنایا تم نے
کیسی اسے کبریائی بخشی
کیسی اسے بے نیازی بخشی
ستّار عیوب بھی بنایا
غفّار ذنوب بھی بنایا
اپنا یہ جلال اس کو بخشا
قادر بھی ہے، رحیم بھی ہے
ذوالفضل بھی ہے کریم بھی ہے
قدوس بھی ہے جمیل بھی ہے
عادل بھی، بے عدیل بھی ہے
آئینہ بنا کے اس کو تم نے
اپنا رُخِ روشن اس میں دیکھا

اور جس کی ابتدا ہو یہ ایمان: اقراء باسم ربک الذی خلق اس کی انتہا یہ کیسے ہو:

سُنتے ہو یہ تلخ بات سچ ہے
الہام کہاں، پیام کیسا؟
اس نے نہ کبھی زبان کھولی
اس نے نہ کہیں نقاب اُٹھائی
صحرا کے بگولے کچھ نہ بولے
گلشن میں یہ غنچے بھی نہ کھلے
جو راز تھا، راز ہے ابھی تک
اس کے دل کی جو دھڑکنیں ہیں
اصلا ان کی خبر نہیں کچھ

اور یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں ہوں تو کیا ایک سیدھی لکیر ہوں جو ایک نقطے سے شروع ہو کر دوسرے نقطے تک ختم ہو جاتی ہے یا لکیر ولک بھول بھلیاں ہوں، جس میں لکیریں سیدھی بھی ہیں ٹیڑھی میڑھی بھی، دائرے بھی ہیں اور مربعے بھی اور مثلث بھی۔ اقبال کے ایک ثنا سا سے کسی مولوی صاحب نے شکایت کی کہ اقبال ہندو کو کافر نہیں سمجھتا، اس کی طبیعت میں ذرا سا تشیع بھی ہے، راگ کو عبادات میں داخل سمجھتا ہے، حُسن فروشوں سے اسے عار نہیں ہے، شب کو گاتا ہے تو صبح کو تلاوت ہے۔ غرض:

مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے
دل دفتر حکمت ہے طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی

اقبال تک یہ شکایت پہنچی تو کہا:

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

اقبال ہی نہیں، کم و بیش ہر شخص مجموعۂ اضداد ہے، یہاں تک کہ خدا بھی مجموعۂ اضداد ہے،

باوجودیکہ وہ ہے گا یکتا
دیکھو سوئے متضادہ اسما
اسم ہیں اس کے تو ضار و نافع
قابض و باسط و حافظ و رافع

تضاد تو حقیقت ہے، سوال یہ ہے کہ اپنی حقیقت تک کیسے پہنچا جائے سامنے کیسے آئینہ دکھایا جائے۔ آئینہ تو اپنی آنکھوں کا ہے، اس آئینے پر دھول کیسے ہو۔ دوسری آنکھوں کے آئینوں میں دیکھا جائے تو یہاں بھی دشواری ہے ان آئینوں میں بھی عکس بدل اور بگڑ جاتا ہے اور نامۂ اعمال تو مل ہی نہیں سکتا جس میں شاید صحیح حلیہ ہو۔ بحر خیالات کا پانی گہرا سہی لیکن اس کی تہہ کو ٹٹولنا ضروری ہے۔ آیئے دیکھیں کیا کیا چیزیں نکلتی ہیں۔

ہاں تو میری پیدائش کا دن منگل ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء اور وقت ساڑھے چھ بجے شام ہے۔

میں نے کہا ہے کہ میری پیدائش کی تاریخ ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء ہے۔ میری میٹرک کے سرٹیفکٹ کے مطابق اور سرکاری ریکارڈ میں میری پیدائش کی تاریخ ۱۵ ستمبر ۱۹۰۹ء ہے۔ بات یہ ہے کہ جب میں نے اسکول میں داخلہ لیا تو وہاں ۱۹۰۹ء ہی لکھا گیا۔ اور میں ایک عرصہ تک سمجھتا رہا کہ یہ تاریخ صحیح ہے۔ جب مجھے اباجان کی کتابوں اور کاپیوں کو کھنگالنے کا شوق ہوا تو مجھے ایک کاپی ملی جس میں بہت سی جنم کنڈلیاں تھیں۔ اباجان کو علم نجوم، جوتش، پامسٹری وغیرہ سے شوق تھا۔ ان پر کافی وقت صرف کیا تھا۔ صرف کتابیں ہی نہیں پڑھی تھیں بلکہ ان "علوم" کے جاننے والوں کی صحبت میں نہ جانے کتنی راتیں اور کتنے دن گذارے تھے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک کاپی میں بہت سی جنم کنڈلیاں تھیں۔ بڑے ابا کی، ان کی اپنی اور دونوں کے بچے بچیوں کی۔ ان جنم کنڈلیوں کی تفصیل بھی تھی۔ ہونے والے واقعات کا خاکہ، تقدیر کی تفسیر تھی۔ اپنے متعلق بہت تفصیل سے کام لیا تھا۔ سال بہ سال ہونے والے واقعات کی روداد لکھی تھی۔

انھیں جنم کنڈلیوں میں رحیم الدین احمد کی بھی جنم کنڈلی تھی۔ میرا پیدائشی نام رحیم الدین احمد تھا۔ جب میں اسکول میں داخلہ لینے والا تھا تو میرا نام بدل کر کلیم الدین احمد ہو گیا۔ میرا نام کیوں بدل گیا۔ اس کی وجہ میں نہیں بتا سکتا۔ ۔ ۔ ۔ رحیم الدین احمد نام ہونے کی وجہ سے پکارنے کا نام رحمو ہو گیا تھا۔ مبارک عظیم آبادی نے اپنے کسی قطعہ میں جو انھوں نے میرے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کہا تھا۔ لکھا ہے۔

"جنھیں پیار سے لوگ کہتے ہیں رحمو"

میرے اسکول کے دو چار ساتھی جو بچ گئے ہیں مجھے اسی نام سے جانتے ہیں اور ایک دو بزرگ بھی مجھے اسی نام سے اب بھی پکارتے ہیں۔

میں نے گولیاں بھی کھیلی ہیں اور "گلی ڈنڈا" بھی۔ میں نے کبڈی بھی کھیلی ہے اور فٹ بال بھی۔ گھر کے بچے، ہم لوگوں کے ہمسایہ نواب احمد علی خاں کے بچے اور محلے کے دوسرے بچے مل کر دو ٹیم بناتے اور فٹ بال کھیلا کرتے۔ کھیل کی جگہ مکان سے ملحق کچھ زمین تھی وہی ہم لوگوں کی فٹ بال فیلڈ تھی اور کبھی کبھار نواب احمد علی خاں کے مکان میں بھی بچے جمع ہو جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک نئی گیند منگائی تھی اور کھیل جاری تھا کہ گیند ایک ہمسایہ کے گھر میں جا پڑی۔ ایسا واقعہ اکثر ہوتا تھا اور گیند واپس مل جایا کرتی تھی۔ اس ہمسایہ کی عورت بہت بد مزاج واقع ہوئی تھی۔ اس روز اس کا شوہر نہ تھا اس نے گیند بنڈا اس میں پھینک دی اور ہم لوگ ناکام واپس آئے۔ کیا بتاؤں کہ کتنا قلق ہوا اور کچھ دنوں کے لئے کھیل بند ہو گیا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ گنگا خشک ہو گئی تھی اور اس کا کنارا ایک میل دور جا پڑا تھا۔ ریت پر لڑکے کھیلا کرتے۔ کبڈیاں ہوتیں، پتنگ بازی ہوتی اور فٹ بال بھی کھیلا کرتے۔ ایک مرتبہ فٹ بال کھیل رہے تھے کہ محمود علی خاں صاحب نے میری سلیپرز کو۔ اس وقت چپل نہ تھی اور سلیپر کا رواج تھا۔ بالو میں چھپا دیا اور بالو کو برابر کر دیا۔ جب کھیل ختم ہوا تو میری سلیپرز نہ تھیں۔ میں نے تمام ڈھونڈا پر نہ ملیں۔ ساتھیوں نے ڈھونڈا پھر بھی نہ ملیں۔ میں نے دیکھا کہ محمود کچھ مسکرا رہے ہیں۔ شبہ ہوا کہ انھوں نے ہی کچھ شرارت کی ہے۔ ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے اقرار کیا کہ انھوں نے چھپائی تھی لیکن وہاں بھی نہ ملیں۔ تب وہ کچھ گھبرائے اور ہم لوگوں کے ساتھ تلاش کی لیکن وہ سلیپرز نہ ملنا تھا نہ ملیں۔

میں نے کشتی گیری اور پنجہ کشی بھی سیکھی تھی۔ وجہ یہ ہوئی کہ بڑے ابا کو ڈنڈ، بیٹھک کشتی کا شوق تھا۔ گھر میں اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ وہ کافی اچھے پہلوان تھے۔ استاد (میر کھچو پہلوان) کہا کرتے تھے کہ اگر وہ پہلوانی پیشہ اختیار کرتے تو بہت نام کرتے۔ انھیں کی وجہ سے سارے بچے اس فن سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ اُستاد کے گھر بھی جاتے، وہاں بھی اچھے اچھے پہلوان آتے، کشتیاں ہوتیں، نئے نئے شوق رکھنے والوں کو کشتی گیری کا فن سکھایا جاتا، اس کے نکات بتلائے جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ میں بھی لنگوٹ باندھ کر ڈنڈ بیٹھک کیا کرتا اور کشتی بھی لڑتا۔ لیکن سبھوں سے چھوٹا، کم جثہ، کمزور تھا اس لئے اس فن سے بہت جلد کنارہ کش ہو گیا۔ البتہ جب مشہور پہلوان بلائے جاتے اور کشتیاں ہوتیں تو میں بھی دیکھنے چلا جاتا۔ مجھے بھی لاٹھی کی تعلیم دی گئی اور اس فن میں کافی ماہر بھی ہو گیا تھا۔ مجھے

یاد ہے کہ ایک روز ہم لوگ لاٹھی کا شغل کر رہے تھے کہ بڑے ابا کسی مریض کو دیکھ کر گھر لوٹے انھوں نے ایک لاٹھی تھامی اور مجھ سے کہا وار روکو اور مجھ پر تیزی سے وار کرنا شروع کیا۔ میں دیر تک ان کے وار روکتا رہا لیکن پیچھے قدم ہٹتا گیا اور آخر میں صحن کے دوسرے کنارے جا پہنچا۔ تب انھوں نے ہاتھ روک لیا اور مجھ سے کہا، تم وار تو روک لیتے ہو لیکن تمھیں پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے اور اس ضمن میں کچھ مزید باتیں بتائیں۔ اسی طرح ایک روز میں مالو بھائی کے ساتھ لاٹھی کھیل رہا تھا کہ میں نے "ہولا" مارا جسے وہ روک نہ سکے اور ان کی پیشانی میں چوٹ لگ گئی اور خون نکلنے لگا۔ انھیں خبر بھی نہ ہوئی کہ خون نکل رہا ہے لیکن میں نے ہاتھ روک لیا اور انھیں بتایا کہ چوٹ لگ گئی ہے۔

شمشیر زنی اور خنجر بازی تو وقتی ضرورتوں کا تقاضا تھی۔ مرغ بازی، کبوتر بازی اور پتنگ بازی کا بھی ان دنوں رواج تھا۔ بڑے ابا کو مرغ بازی کا شوق تھا، اصیل مرغ پال رکھے تھے۔ ایک بھلے سے آدمی تھے جن کی صورت ابھی تک نظروں میں پھرتی ہے، لیکن نام یاد نہیں۔

پتنگ بازی بھی عام مشغلہ تھی۔ میں بھی اس فن میں کافی مشاق ہو گیا تھا اور اس میں بہت وقت گنوایا کرتا تھا۔

اور کھیلوں کی طرح تاش اور شطرنج کی بھی عادت تھی۔ تاش، یعنی 'کورٹ پیس' ہم لوگ گھنٹوں کھیلا کرتے تھے۔ اس میں بہت وقت ضائع ہوتا تھا۔ اکثر رات کے بارہ بج جاتے، نیند آتی رہتی لیکن اس حال میں بھی کھیل جاری رہتا اور یہ کھیل چوری چھپے ہوا کرتا تھا کیوں کہ تاش کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔

اسکول میں لڑکے رمز و کنایہ میں کچھ باتیں آپس میں کرتے اور میں کچھ نہ سمجھتا۔ ایک روز نمو بھائی کے ایک دوست یوسف کے پاس کچھ لڑکے جمع تھے اور وہ کچھ تصویریں دکھلا رہے تھے۔ میں اس طرف سے گزرا تو کچھ تصویروں پر نظر جا پڑی وہ تصویریں لڑکوں کی تھیں جو زنانہ لباس پہنے ہوئے تھے اور جنھوں نے زیورات بھی پہن رکھے تھے۔ مجھے یہ عجیب سی بات معلوم ہوئی۔ یہ یوسف ڈاکٹر ایوب کے لڑکے تھے، انھوں نے دو شادیاں کی تھیں اور دونوں بیویوں سے ایک ایک لڑکا تھا۔ دونوں کا نام یوسف تھا اور دونوں سیاہ فام تھے! برعکس نہند نام زنگی کافور۔ رفتہ رفتہ یہ بھید کھلا کہ لڑکے آپس میں عشق و عاشقی کی باتیں کرتے ہیں اور یہ عشق بازی باتوں کے حدود سے گزر کر عمل تک پہنچ جایا کرتی ہے۔ یہ وہی عشق تھا جس کا ذکر فراق بہت شد و مد سے اپنی کتاب "اردو کی عشقیہ شاعری" میں کرتے ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ محلّے کے قریب ہی لکھنؤ کے ایک حکیم صاحب رہتے تھے۔ ان کی خاص دھوم تھی۔ جب وہ نکلتے تو ان کی بغل میں ایک خوبصورت سا لڑکا بیٹھا رہا کرتا اور لوگ چہ می گوئیاں کرتے۔ ایک دفعہ اسکول کے لڑکے گلزار باغ سے کسی میچ کے بعد لوٹ رہے تھے کہ کچھ لڑکوں نے گویال پر جو خوبصورت سا لڑکا تھا نرغہ کیا۔ اسے گھیر لیا۔ میں تو جلد جلد آگے بڑھ گیا۔ دوسرے روز کسی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس بےچارے کے ساتھ لڑکوں نے نازیبا حرکتیں کی تھیں۔ اس لڑکے کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے بہت سے عشاق تھے جو اس کی ناز برداری کیا کرتے تھے۔ میں گھر میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا کہ نمو بھائی کے ایک دوست آئے۔ یہ برابر آیا کرتے تھے۔ آکر پلنگ پر بیٹھ گئے۔ کچھ باتیں کیں پھر لیٹ گئے اور مجھے بھی لیٹنے کو کہا۔ جب میں نہ لیٹا تو مجھے زبردستی لٹانے کی کوشش کی لیکن میں اٹھا اور اندر چلا گیا۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ میں گلزار باغ کسی میچ میں شریک ہونے کے لئے جا رہا تھا ایک صاحب میرے ساتھ تھے جب کسی گلی سے ہو کر ہم لوگ گزر رہے تھے تو انھوں نے کچھ محبت آمیز گفتگو شروع کی، ایک ریشمی رومال مجھے نکال کر دیا، جو میں نے نہ لیا۔ پھر انھوں نے چاہا کہ جھک کر میرے گال کو چوم لیں۔ میں چیخ اٹھا وہ مجھے تنہا چھوڑ کر تیزی سے بھاگ گئے۔ کوئی مکان نزدیک تھا۔ میری چیخ سن کر کچھ عورتیں نکل آئیں، پوچھنے لگیں، بابو کیا ہوا؟ میں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ پھر ان سے رستہ پوچھ کر اس جگہ جا پہنچا جہاں میچ ہونے والا تھا لیکن اس واقعہ کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا۔

ان سانحوں کے بہت دنوں کے بعد نمو بھائی اپنے ایک دوست بھونیشور کو گھر لائے تھے یہ بہت گورا چٹا لڑکا تھا اس سے دیر تک باتیں کرتے رہے پھر میں سو گیا۔ کوئی بارہ بجے نیند ٹوٹی تو میں نے دیکھا کہ نمو بھائی اور بھونیشور دونوں نہیں ہیں۔ اور کیا دیکھتا ہوں کہ میرا پائجامہ بھیگا ہوا ہے۔ میں نے سمجھا کہ شاید پیشاب ہو گیا ہے لیکن دیکھا تو پیشاب نہیں کوئی اور چیز تھی۔ میں اٹھا کہ بالٹی سے پانی لے کر پاجامہ دھو ڈالوں۔ بالٹی خالی تھی۔ ایک لوٹے میں پانی تھا، اسی سے پاجامہ دھو ڈالا اور لالٹین پر اسے سکھایا اور پھر سونے کی کوشش کی لیکن مجھے نیند نہیں آئی، میں نے سمجھا کہ مجھے کوئی سخت بیماری ہو گئی ہے۔ لیکن میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ بہت دنوں کے بعد پتہ چلا کہ یہ جوانی کی نشانی تھی۔

تنقید کیا ہے؟

کلیم الدین احمد

ہماری تہذیب خنجر سے آپ اپنا گلا کاٹ رہی ہے۔ اس وقت تنقید کا اہم ترین کام تہذیب کو خودکشی سے بچانا ہے۔ موجودہ زمانے میں مشین نے ایک مہیب عفریت کی شکل اختیار کر لی اور اب یہ عفریت ہمارے قابو سے باہر ہو چلا ہے۔ اسے ہم نے اپنے کام کے لئے بنایا تھا۔ اس کی مدد سے ہم اپنی آسائش کے نئے نئے سامان مہیا کرتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ عفریت خودسر ہو گیا ہے، ہماری آسائش کی پرواہ نہیں کرتا اور اپنی طاقت میں مست انسانیت کو کچلتا ہوا رواں دواں ہے۔ ہمیں اس عفریت کو قابو میں لانا ہے اور اس سے انسانی بہبودی اور ترقی کا کام لینا ہے۔ یعنی ہمارے سامنے نہایت مشکل مرحلہ ہے اور وہ یہ کہ مشین ٹوٹ پھوٹ بھی نہ جائے اور ساتھ اس کی ایسی فتح بھی نہ ہو کہ وہ ہماری روح کو چور چور کر دے یا اُسے برابر کے لئے اپنے پنجوں میں گرفتار کر لے۔

مشین تو سائنس کی دین ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس مشکل وقت میں، اس مسئلہ کو حل کرنے میں سائنس ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سائنس کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ حقیقت کی تفتیش ہے۔ پروفیسر پولیانی نے کہا ہے کہ میری نظر میں سائنٹفک حقیقت سے زیادہ مقدس کوئی دوسری چیز نہیں اور سماجی ضرورتوں کے بہانے سے خالص سائنس کے مشغلہ میں خلل ڈالنا سائنس اور انسانیت دونوں کے لئے مہلک ہے۔ اس قسم کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ سائنٹسٹ بھی سماج کا ایک فرد ہے اور کچھ سماجی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اس حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں۔ پروفیسر برنال کے خیال میں سائنس کا بس یہی مقصد ہے کہ وہ ساری سماجی زندگی پر متحدہ، منظم اور شعوری قابو حاصل کر لے۔ اور کرووڈر کا کہنا ہے کہ نوع انسان کی بقا سائنس کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے یہ سائنٹسٹ کا فرض ہے کہ وہ برابر اس کا خیال رکھے کہ سائنس سے برابر اچھا کام لیا جائے اور اسے کبھی کسی بُرے کام میں نہ لگایا جائے۔ ہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ سائنٹسٹ کی سماجی ذمہ داری کا وہ مطلب نہیں جو آج کل رشیا میں ہو رہا ہے۔ یعنی روسی سائنس الگ قائم کیا جائے اور وہ بھی نہیں جو جرمنی میں ہوا تھا کہ سائنس کی ایجادیں اس خاص غرض سے کہ ایک ملک دوسرے ملکوں پر دست تصرف دراز کرنے میں کامیاب ہو۔ سائنس کا نصب العین انسانیت کی خدمت ہے نہ کہ کسی خاص ملک یا کسی گروہ کی حرص و ہوس کو کامیاب بنانا۔

بہرکیف، تہذیب کی ترقی میں سائنس نے دستِ غیب کا کام کیا ہے لیکن ڈیڑھ دو سو برس میں سائنس نے اس تیزی سے ترقی کی ہے۔ اتنی بے شمار نئی چیزیں بر سرِ کار آئی ہیں کہ ان کے بوجھ سے تہذیب کا دم گھٹنے لگا ہے۔ بات یہ ہے کہ مادی چیزیں، ضرورتیں، پیچیدگیاں بہت بڑھ گئی ہیں اور اخلاقی اور دماغی صلاحیتوں میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی حالت اس بچّہ جیسی ہے جس نے لوہار کا بھاری ہتھوڑا اُٹھا لیا ہو اور پھر اس کا بوجھ نہ برداشت کر سکے اور اِدھر اُدھر ڈگمگاتا پھرے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سائنس اپنی لائی ہوئی مصیبت سے ہمیں بچا سکتا ہے یا نہیں۔

مادی نعمتوں کے علاوہ سائنس ایک مخصوص نقطۂ نظر، چھان بین کا ایک الگ طریقہ سکھاتا ہے جس کی چند خاص خصوصیتیں ہیں۔ یقین کو معرضِ التوا میں رکھنا، جب تک ثبوت نہ مل جائے شک کرتے رہنا، ذاتی رجحان و تعصب کے عوض واقعات پر بھروسہ کرنا اور انھیں مشعلِ راہ بنانا، خیالات کو غیر معتبر اور انھیں مفروضوں کی طرح جانچنا، ان پر عقائد کی طرح بھروسہ کرنا اور تحقیق نئے نئے میدانوں اور نئے نئے مسئلوں کو خو[…] دریافت کرنا۔ یہی باتیں ہیں جو سائنسٹ کو عام لوگوں سے ممتاز بناتی ہیں لیکن یہ سائن[…] طریقۂ کار ابھی تک چند مخصوص اور خوش[…] لوگوں کی جاگیر ہے۔ عام طور سے لوگ لا[…] شکار ہوتے ہیں اور ان کے اعتقادات کی [بنیاد] عادت اور رواج، ماحول اور پروپگنڈ[…] ذاتی اور سماجی تعصب اور جذبات پر [ہوتی] ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس لاعلمی کو دور کر[نے کی] ضرورت ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اعت[قادات] کی بنیاد روشن ثبوت پر ہو۔ ایسا ہو تو [بہت سی] ہماری مشکلیں آسان ہو جائیں۔

یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے لیکن صرف سائنٹفک نقطۂ نظر اور طریقۂ کار کافی نہیں [جسے ہم] کلچر کہتے ہیں وہ بہت سے عناصر پر مشتمل ہے جو [ایک] دوسرے پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ قانون، سیا[ست] صنعت و تجارت، سائنس، حرفیات، فنون [لطیفہ] اخلاق، وہ قدریں جنھیں ہم قیمتی سمجھتے ہیں اور جس طرح ہم ان قدروں کی جانچ پرکھ کرتے ہیں، عام خیالات کا وہ نظام جس کی روشنی میں [ہم] بنیادی حالات کی تعریف و تنقید کرتے ہیں، ہمارا سماجی فلسفہ — یہ سب چیزیں مل جل [کر] کلچر کا نظام بناتی ہیں۔ یہ سب اجزا اہم [ہیں] لیکن سب برابر اہمیت نہیں رکھتے۔ خصو[صاً] فنونِ لطیفہ بہت اہم ہیں لیکن ان کی اہمی[ت] کا صحیح احساس کم ملتا ہے۔ جو چیزیں سماجی حا[لات] اور ذاتی آزادی پر اثر ڈالتی ہیں ان میں فن[ونِ] لطیفہ کی گنتی نہیں ہوتی اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ [محض] زیورات کی طرح کلچر کی خوبصورتی میں اضا[فہ] کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ چیزیں ہوا [اور] پانی کی طرح ضروری ہیں اور ہر شخص کو ان سے لطف اندوز ہونا چاہئے۔ ہم اس بات کو بھو[ل] جاتے ہیں کہ فنی کارنامے اظہار کے ذریعوں میں بہت بااثر ہیں اور وہ جذبات کو بھڑکاتے ہیں[…]

خیالات کو خالص رنگ میں رنگتے ہیں۔ تھیٹر، سینما، میوزک ہال، تصویر گھر وغیرہ سے پروپیگنڈا کا زبردست مصرف لیا جا سکتا ہے۔ عام احساسات اور خیالات کو کسی خاص رنگ میں رنگنے یا کسی خاص سانچے میں ڈھالنے کے لئے جذبات و تخیل بہت مفید و کارآمد ہتھیار ہیں، معلومات اور تعقل سے بہت زیادہ۔ [illegible]، کسی کا کہنا ہے کہ مجھے قوم کے گیت بنانے دو پھر جس کا جی چاہے اس کے قوانین بنائے۔

اگر یہ بات ٹھیک ہے اور اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ معلومات اور تعقل کے مقابلہ میں جذبات اور تخیل زیادہ آسانی سے عوام کے احساسات و خیالات کو کسی خاص سانچے میں ڈھال سکتے ہیں تو پھر فنونِ لطیفہ کی اہمیت روشن ہو جاتی ہے۔ یہ فنون گویا ایک عظیم الشان طاقت کے مالک ہیں اور ان سارے عناصر پر اثر ڈال سکتے اور ڈھالتے ہیں جو آپس میں مل جل کر کلچر کا نظام قائم کرتے ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ فنون لطیفہ سے دلچسپی کلچر سے دلچسپی رکھنے کے برابر ہے کیونکہ یہ فنون کلچر میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان سے منہ موڑ لینا تو بہت بڑی غلطی ہے، غلطی ہی نہیں خودکشی ہے۔

ظاہر ہے کہ فنونِ لطیفہ سائنٹسٹ کا میدانِ عمل نہیں۔ اس میدان میں تو تنقید ہی ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔

ضرورت ہے ایک ایسے کلچر کی جس کی بنیاد وہم و گمان، بنے بنائے اعتقادات، رسم و رواج اور عادت پر نہ ہو۔ اور جو ساتھ ساتھ بالکل مادی اور بے روح قسم کا بھی نہ ہو، اور جس میں انسانیت کی روح پھل پھول سکے اور اپنی تکمیل حاصل کر سکے۔ یہ روح کا پھیلاؤ اور روحانی امکانات کی تکمیل، کامل دماغی اور جذباتی سکون محض سائنس کے ذریعے نہیں حاصل ہو سکتا۔ اگر تنقید مشعلِ راہ نہ ہو تو پھر ہم اس منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ تنقید ہمیں تاریخی شعور عطا کرتی ہے اور یہ تاریخی شعور ہمیں یہ دیکھنا سکھاتا ہے کہ ماضی کی بھی ہے اور حال بھی۔ یہ احساس ہمیں زمانی اور دائمی چیزوں کو الگ الگ اور پھر ایک ساتھ دکھاتا ہے۔ گزشتہ کلچر کا شعور، اس کے بہترین عناصر کی پہچان، زمانی اور دائمی چیزوں کا احساس، اندرونی زندگی کا علم، یہ خیال کہ انسانی زندگی ایک مسلسل اور منظم سلسلہ ہے اور اس تسلسل کو باقی رکھنا ضروری ہے، یہ ساری باتیں سائنس کے "دامانِ نگہ" سے بہت دور ہیں۔ یہ "گلِ حسن" تو تنقید کی جنت نگاہی کا سبب ہیں۔

یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ انسان کے ارتقا کی تاریخ ہر قسم کے جھگڑوں، ہر طرح کی کشمکش سے بھری پڑی ہے۔ خیالات کا تصادم، مختلف قسم کے فلسفوں، مذہبوں اور تہذیبوں کا تنازع تو برابر ہوتا آیا ہے۔ یہ تصادم، یہ تنازع زندگی کی دلیل ہے لیکن اس کی وجہ سے بہت بڑا نقصان بھی ہوتا ہے، انسانیت اگر ایک قدم آگے بڑھتی ہے تو چار قدم پیچھے بھی ہٹ جاتی ہے۔ اگر کچھ اچھی باتیں ہوتی ہیں تو بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہماری کوشش تو یہ ہونی چاہئے کہ کسی قسم کا نقصان نہ ہو، بےکار ظلم و تخریب نہ ہو، بے ضرورت بے رحمی اور بہیمیت نہ ہو لیکن برابر ایسا ہی ہوتا ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تہذیب و ترقی کے باوجود بھی بربریت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

آپ نے خیال کیا ہوگا کہ جب کبھی کوئی جنگ ہوتی ہے تو بربریت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اچھے میلانات پر برے میلانات و جذبات چھا جاتے ہیں۔ بے رحمی، "ناانصافی، بددیانتی"، خونخواری اور بہیمیت کی حکومت عام ہو جاتی ہے۔ وحشی اگر آپس میں لڑتے ہیں تو اس کی کوئی فطری وجہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی ان کی خواہشات میں مخل ہوتا ہے یا ان کے سماجی نظام کی تخریب پر آمادہ ہوتا ہے تو وہ لڑتے ہیں۔ تہذیب یافتہ ہونے کے بعد بھی ہم کچھ اسی قسم کی چیزوں کے لئے لڑتے ہیں لیکن اصل وجہ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے ہیں۔ اپنے کو اور دوسروں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی خیال یا کسی نصب العین کے لئے لڑتے ہیں۔ عموماً کسی پاگل کو ملک گیری کی ہوس ہوتی ہے یا کسی قوم کو کسی دوسری قوم کی بزرگی یا خوشحالی سے رقابت ہوتی ہے اور لڑائی کا شاخسانہ قائم ہو جاتا ہے لیکن اصل وجہ کو ہم چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور بظاہر لڑتے ہیں "انصاف کے لئے، سچائی کے لئے"، انسانیت کے لئے لڑتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واقعی خیالات میں تصادم ہوتا ہے۔ خیر سبب کچھ بھی ہو جہاں جنگ ہوتی ہے تو انسانیت کو ایک زبردست دھکا لگتا ہے، ترقی کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ ناپسندیدہ عناصر ابھر آتے ہیں اور بے کار خون خرابہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں سوال صرف جانیں تلف ہونے کا نہیں۔ آخر وبا آتی ہے تو بہت سی جانیں تلف ہوتی ہیں۔ سوال نوع انسان کی بقا سے بھی زیادہ اہم ہے۔ انسانیت کے پیشِ نظر کوئی مقصد ہے، کوئی دور، بلند منزل ہے اور اسے اس مقصد کو حاصل کرنا ہے، اس منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے۔ اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو، اگر ہم منزل سے دور تھک کر یا بھٹک کر رہ جائیں تو یہ انسانیت کی شکست ہوگی اور یہ شکست نوع انسان کے فنا ہو جانے سے زیادہ افسوسناک ہوگی۔ اگر کسی دن یکایک کوئی بھولا بھٹکا ستارہ دنیا سے ٹکرا جائے تو دنیا اور انسان دونوں فنا ہو جائیں گے، لیکن یہ خیال برداشت کیا جا سکتا ہے۔ برداشت نہیں ہو سکتی ہے تو انسانیت کی خودکشی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت خودکشی پر تلی ہوئی ہے۔

ہر سمجھ دار آدمی چاہتا ہے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے انسان کی ترقی ہموار ہو جائے، جو کشمکشیں ہوتی ہیں اور خصوصاً ان کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے وہ نقصان نہ ہو۔ اس نقصان سے بچنے کی بس ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم دوہری ہم آہنگی حاصل کریں۔ ایک تو اندرونی ہم آہنگی ہے اور اس کو حاصل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ ہماری دماغی، روحانی

اور جذباتی میلانات اور ضرورتیں متوازن ہو جائیں اور ان میں کسی طرح کا تضاد اور کھنچاؤ باقی نہ رہے۔ دوسری خارجی ہم آہنگی ہے یعنی انسان اور اس کے ماحول میں کسی قسم کی کشمکش نہ ہو اور اس کشمکش کی وجہ سے کسی قسم کی بے اطمینانی نہ ہو بلکہ مکمل اتفاق، اتحاد اور ہم آہنگی ہو جائے۔ یہ دوہری ہم آہنگی سائنس کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو کچھ تنقید ہی عطا کر سکتی ہے۔

انسانیت کی راہ میں بہت سے خطرناک مقام آتے ہیں اور اس وقت اسے بہت بڑے خطرے کا سامنا کرنا ہے لیکن ہم ہیں کہ بالکل بے خبر۔ ذرا بھی کسی خطرے کا احساس نہیں۔ معمولی آدمی اطمینان کی میٹھی نیند سوتا ہے۔ اسے خیال بھی نہیں ہوتا کہ اسے کچھ کرنا ہے، کسی خاص خطرے کا مقابلہ کرنا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی روح آزاد نہیں اور جہاں آزادی نہیں وہاں بصیرت بھی ممکن نہیں۔ عادت، دستور العمل، رائے عامہ کا ڈر، اس دنیا اور دوسری دنیا میں سزا کا خوف، بہت ساری چیزیں جو زندگی کی منافی ہیں، جن میں شعلہ سامانی نہیں، یہ سب مل کر اس کی روح پر حکومت کرتی ہیں اور اس کے بدن کو ادھر سے ادھر دھکیلتی رہتی ہیں۔ تنقید ہمیں معمولیت کے پھندے سے چھڑاتی ہے اور ہماری روح کو آزاد بناتی اور اس کو شعلہ سامانی عطا کرتی ہے۔ انسان کی بے بصری اور اس بے بصری کی وجہ سے جو خطرے لاحق ہو گئے ہیں انھیں دن کی روشنی میں لے آتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ ہماری نئی تہذیب زندہ درگور ہے۔ اور اس کا ایک ہی علاج ہے یعنی زندگی ایک مسلسل نغمۂ روح ہو جائے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تہذیب نے جو یہ خطرناک صورت اختیار کر لی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے ارتقا کے دوران میں غلط راستے پر چل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی ذہنی طاقتوں کو ترقی تو دی لیکن جذبات و میلانات کی طرف سے کچھ بے پروا سا ہو گیا۔ اس لئے اب اگر ہمیں نجات مل سکتی ہے تو اسی طرح کہ ہم اپنے جذبات و میلانات کو ترقی دیں اس لئے کہ شدید جذبات کے ذریعہ ہی ہم کائنات کے ساتھ ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں، اس قسم کی وحدت کا احساس کر سکتے ہیں جو صوفی کو میسر ہے۔ شدید جذبات ہی کے وسیلے سے ہم اس شعلۂ زندگی سے باخبر ہو سکتے ہیں جو سینۂ کائنات میں روشن ہے۔ بات یہ ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کی جڑیں زمین سے اکھڑ گئی ہیں اور ضرورت اس کی ہے کہ جڑیں پھر مضبوط ہو جائیں اور ہم میں پھر اس وحدت کا زندہ احساس لوٹ آئے جو کبھی پہلے میسر تھا۔

اس مشکل میں تنقید ہی مشکل کشائی کر سکتی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ پہلے ہم ذہنی صوبائیت اور وطن پرستی سے نجات حاصل کر لیں اور ہماری زندگی کا جو ڈھنگ ہو بس اسی تک ہماری نظر محدود نہ ہو اور اسی کو ہم سب سے اچھا سمجھنے نہ لگیں۔ خیالات اور کلچر کی دنیا میں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کہنے سے کام نہیں چل سکتا۔ دوسری طرح کی زندگیوں، دوسری قسم کے کلچروں سے واقفیت ضروری ہے۔ اس واقفیت کے بغیر ہم کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے۔ تنقید ہمیں وطن سے باہر سیر و سیاحت کرنا، وسیع پیمانے پر نئے نئے ملکوں کا کھوج لگانا سکھاتی ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہماری نگاہوں پر پردے پڑے رہیں گے اور ہم تنگ قسم کی وطن پرستی اور غرور کے شکار ہو جائیں گے۔

یہ کہنے کی شاید ضرورت ہے کہ ہم ایک خاص رنگ میں سوچنے اور حس کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اس کی خبر تو نہیں ہوتی لیکن ہمارا دماغ لکیر کا فقیر ہو جاتا ہے اور صحیح اور آزاد طور پر سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ مختلف قوموں کے درمیان زبردست دیواریں حائل ہو جاتی ہیں۔ نسل، مذہب، تعلیم، اخلاق، کلچر، فلسفہ، سب اپنے طور پر مختلف قسم کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ مختلف جماعتیں خیالات اور جذبات کی الگ الگ دنیا میں بستی ہیں۔ نقاد کو اس قسم کی کمزوری سے بچنا چاہئے لیکن افسوس یہ ہے کہ اکثر اس کا دماغ بھی لکیر کا فقیر ہو جاتا ہے اور کسی دوسری دنیا میں سانس لینے میں اسے دشواری معلوم ہونے لگتی ہے۔

جس قسم کی دشواری کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ ایلیٹ کے اس بیان سے واضح ہو جاتی ہے۔ "اگر کسی کو چینی زبان کا علم نہ ہو اور اس نے بہترین چینی سوسائٹی میں اپنی زندگی کی ایک طویل مدت نہ گزاری ہو تو وہ کنفیوشس کو سمجھ نہیں سکتا۔ میں چینی دماغ اور چینی تہذیب کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور میں یہ ماننے کے لئے بھی تیار ہوں کہ بہترین چینی تہذیب میں بہت سی ایسی خوبیاں اور طاقتیں ہیں جن کے سامنے مغربی تہذیب بھدی اور بدنما ہوتی ہے، لیکن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ میں کنفیوشس کو اتنی اچھی طرح سمجھ سکوں گا کہ اسے اپنا سکوں۔"

میرا خیال ہے کہ ایلیٹ کو دشواریوں کا ضرورت سے زیادہ احساس ہے۔ دشواری تو ضرور ہے لیکن اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ پھر ایلیٹ کے بیان میں کچھ تضاد سا بھی ہے جس کو واقعی یقین ہو کہ بہترین چینی تہذیب کی خوبیوں اور لطافتوں کے سامنے مغربی تہذیب بھدی اور بدنما ہے تو اس کو ضرور یہ خواہش ہونی چاہئے کہ جس طرح سے بھی ہو اور اس مقصد میں کچھ بھی زحمت کیوں نہ ہو لیکن وہ ان خوبیوں اور لطافتوں کو حاصل کر لے۔ کوئی عملی اور جذباتی وجہ ہمیں زندگی کو اپنانے میں حائل نہیں ہو سکتی اور نہ ہونا چاہئے۔ جو دشواریاں بھی سامنے آئیں انھیں آسان کرنا چاہئے۔ ایلیٹ کے کہنے کا ماحصل بس اسی قدر ہے کہ وہ بھی کچھ لکیر کی فقیر قسم کا ہے اور بندھے ہوئے راستے سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔

وہ پوری پوری کاوش کرنی نہیں چاہتا۔ اگر اس کی دلچسپی حقیقی ہوتی تو وہ اس کاوش کے لئے تیار ہو جاتا۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ الیٹ میں کوئی خاص کمی ہے جس کی وجہ سے وہ کنفیوسیس کو پوری طرح سمجھنے سے مجبور ہے۔

ہاں ایک دوسری دُشواری بھی پیش آتی ہے اور وہ ذریعۂ اظہار سے وابستہ ہے۔ رچرڈز نے دکھایا ہے کہ منسی اُس کے نفسیاتی تصورات کو سمجھنا اور سمجھانا بہت دُشوار ہے گویا ناممکن ہے۔ رچرڈز کا کہنا ہے کہ جن دماغوں کے بارے میں منسی اس گفتگو کرتا ہے ان کی ساخت اور خود اس کے دماغ کی ساخت مغربی دماغوں سے کچھ مختلف تھی اور پھر اس کے سوچنے اور بولنے کی عادت اور قماش بھی کچھ دوسری تھی تفصیل کی گنجائش نہیں، میں مانتا ہوں کہ یہ دُشواریاں ہیں اور کسی معمولی آدمی کے لئے یہ دُشواریاں شاید ایسی ہیں کہ وہ انھیں آسان نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن تنقید کی مدد سے یہ دُشواریاں دور ہو سکتی ہیں۔ تنقید ہماری ذہنی تربیت کر سکتی ہے اور ہمیں ایسی صلاحیت عطا کرتی ہے جس سے ہم اس قسم کی مشکلوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں — تنقید، خیالات اور زندگی کے نت نئے ڈھنگ کا صحیح احساس عطا کرتی ہے اور یہ بات بتاتی ہے کہ ہر سماج کا اندرونی نظام اور احساسات و جذبات کا طور طریقہ مختلف تہذیبوں میں مختلف ہوتا ہے۔ اور ہر کلچر میں جذبات کا پیچیدہ نظام جُداگانہ ہوتا ہے۔ بصیرت، ذکی الحس، ادراک تخیل اور مختلف کلچروں سے شناسائی، پھر حقیقی دلچسپی اور ضروری کاوش، اگر یہ سب چیزیں ہوں تو پھر کچھ مشکل باقی نہیں رہتی۔

ہمیں ایک ایسی زندگی، ایک ایسے کلچر کی بنیاد ڈالنی ہے جو عالم گیر ہو۔ اس قسم کا کلچر بغیر کسی کے ممکن نہیں۔ ہماری انتہائی کوشش یہی ہونی چاہئے کہ جن قدروں کو ہم قیمتی سمجھتے وہ عالم گیر ہو جائیں اور وہ کل قیمتی قدریں جو ہم دوسرے کلچروں میں پاتے ہیں ہماری ملکیت ہو جائیں۔ اسی طرح ایک عالم گیر کلچر کی بنیاد پڑ سکتی ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے اگر ہم واقعی ایک عالم گیر کلچر کی ضرورت سمجھیں اور مشکلوں سے ہراساں نہ ہوں۔ وہ زندگی کا ڈھنگ جو ہمیں ورثہ میں ملا ہے اس سے وفاداری ضروری ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ یہ وفاداری تنگ نظر اور غیر ناقدانہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو پھر آزادی کے ساتھ دوسری قسم کے کلچروں کا کھوج لگانا ممکن نہ ہوگا اور ان کے بہترین اجزا کو اپنانے میں ہم کامیاب نہ ہوں گے۔

کلچر خلا میں سانس نہیں لیتا۔ اگر ہم کسی ایک کلچر کو دوسرے کلچروں سے بالکل الگ کر کے دیکھیں تو ہم اس کی حقیقی معنی خیزی اور اس کی صحیح قدر و قیمت کو سمجھ نہیں سکتے۔ ایک طرف تو ہمیں چاہئے کہ ہم اس کا ماضی کی روشنی میں جائزہ لیں اور احساس تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ دوسری زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ ہم اس کا دوسرے کلچروں سے مقابلہ و موازنہ کریں۔ اسی صورت میں اس کی معنی خیزی اور اس کی قدر و قیمت روشن ہو سکتی ہے۔ بظاہر ایک کلچر کسی دوسرے کلچر سے بالکل جُداگانہ معلوم ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ان میں بُنیادی تضاد ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اختلاف و تضاد کے باوجود سبھوں میں انسانیت کی روح دوڑتی ہے جو ہر آئینہ میں اپنی صورت دیکھنا چاہتی اور اپنے حسن کا نکھار دکھانا چاہتی ہے۔ یہی حقیقت ہے جو ہمیں تنقید سکھاتی ہے۔ اگر ہم اسے بھول جائیں تو پھر ہماری زندگی تشفی بخش نہیں ہو سکتی۔

وفاداری ضروری ہے لیکن یہ وفاداری انسانیت کے ساتھ ہو وہ انسانیت جو اپنا جلوہ الگ الگ رنگ میں دکھاتی ہے اور جو تھوڑی دیر کے لئے جلد گذر جانے والے مظاہرات کے ذریعے اپنی جھلک دکھاتی ہے — انسانیت نے اپنے لئے بہت سے عالی شان محل بنائے ہیں۔ تنقید ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ ہم کسی ایک محل میں رہ کر اسے ساری دُنیا نہ سمجھ لیں۔ یہ تنقید کی دین ہے کہ ہم وطن، نسل، ماحول، ذاتی خصوصیات و تعصبات کی تنگ نظری سے نجات حاصل کر لیتے ہیں اور اپنی روح کو انسانیت کی روح میں جذب کر کے سارے محلوں کی سیر کر سکتے ہیں۔ تنقید یہ بھی تلقین کرتی ہے کہ ہم انسانیت کے لئے ایک عالی شان محل تعمیر کریں جس میں سارے جھگڑے فنا ہو جائیں اور انسانیت کامل آسودگی کے سانس لے سکے۔

●●

تحلیل نفسی اور ادبی تنقید

کلیم الدین احمد

یہ شاید ایک خوش گوار یا کسی سست ارتقائی عمل کی بارآوری تھی کہ انسانی دماغ کی تخلیق ہوئی۔ لیکن انسان اپنی عظیم خوش نصیبی سے آگاہ نہیں تھا۔ اس نے اس معجزے کو ایک معمولی بات کی طرح قبول کرلیا اس نے اس عطیے کو جانچنے کی زحمت اٹھائے یا اس کے پیچیدہ نظام کو سمجھنے کی کوشش کیے بغیر استعمال کرنا شروع کیا۔ دانی کے بچھڑے کے دانت دیکھنا بدتہذیبی اور ناشکرگزاری کی علامت سمجھی جاتی اس نئے قاعدے کی رہنمائی میں اس نے باہر اور اپنے گرد وپیش نظر ڈالی اور جو کچھ اس نے دیکھا وہ اتنا دلچسپ، اتنا تحیر خیز اور پراسرار تھا کہ اس نے اپنی تمام قوتوں کو جستجوئے کائنات کے رخ پر لگا دیا۔ اس احساس حیرت سے بھی زیادہ ایک کج خلق راست معاند دنیا میں اپنی بے چارگی کا احساس تھا۔ اسے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں محفوظ رکھنا تھا جو اس کی دشمن تھی اسے اپنے زیر تصرف تمام وسائل کو ایک ہی فوری ضرورت کے لیے استعمال کرنا پڑا۔ یعنی اپنے ماحول کو انسانی اغراض کی خاطر قابو میں لانے اور اس پر مالکانہ قبضہ کر لینے کے لیے اپنے وسائل کی جانچ اور اپنی مبنوع صلاحیتوں کے امتحان و آزمائش کا کوئی موقع نہیں تھا۔ بچہ اپنی سی سی اور تیزی سے بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کا استعمال خود بخود سیکھ لیتا ہے۔ وہ ان کی نوعیت پر بحث کرنے یا ساخت کو پرکھنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ زبان جسے وہ آتنی مشکل سے حاصل کرتا ہے وہ بھی اسے ایک بالکل فطری چیز معلوم ہوتی ہے زبان کی اصل و نوع، اعضائے کلام کی تعداد، کام اور ارتقا۔ ان باتوں کی سوچ بچار کی زحمت سے اسے نہیں دوچار ہونا پڑتا۔ لہٰذا یہ قطعی تعجب خیز نہیں کہ انسانی دماغ کو اپنا موضوع بنانے والا علم النفس ایک تازہ ترین علم ہے ایسا تو نہیں کہ نفسیات کے ارتقا سے پہلے انسانی دماغ ایک بالکل نامعلوم سرزمین تھی۔ لیکن اس سے فعل کا علم محض وجدان پر مبنی تھا، نہ کہ تحقیقی طور سے حاصل کیے گیے اعداد و شمار پر۔ مثلاً افلاطون کہتا ہے:" ہماری فطرت میں ایک وحشی درندہ، گوشت و شراب سے آسودہ بیٹھا ہوا ہے جو جب ہم حالت خواب میں ہوتے ہیں تو جاگ اٹھتا ہے اور برہنہ گھومتا ہے اور جی بھر اپنا پیٹ بھرتا ہے اور کوئی ایسی حماقت یا جرم۔۔ یہاں تک کہ قتل والدین اور اختلاط محرم۔ متصور نہیں جس کا ارتکاب ایسی سرشت سے ناممکن ہو ہم تمام لوگوں میں نیک آدمیوں میں بھی ایک ایسی وحشیانہ جبلت سوئی ہوئی ہے جو خواب کے دریچوں سے جھانکنے لگتی ہے" اور ڈیڈروٹ فرائڈ کی پیش روی کرتا ہے: "اگر ننھے وحشی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اگر وہ اپنی تمام حماقتیں کو جمع کرلے اور جھولے میں پڑے ہوئے بچے کی ننھی عقل کو تیس برس کے جوان کے تند جذبات کے ساتھ ملائے تو وہ اپنے باپ کی گردن مروڑ کر ماں کے ساتھ ہم بستر ہو جائے گا۔"

بہرحال، ایسے ادارے نایاب تھے، وہ اشغال جن میں انسان کا دماغ مصروف ہے ان میں ایک تخلیقی شغل، عموماً تسلیم شدہ تھا۔ اور اس شغل کے نتائج یعنی فن کے کارنامے معمولی انسانی کوشش کے نتائج کی حیثیت سے مان سے گئے تھے۔ یہ انداز نظر ذرا بھی تعجب خیز نہیں۔ اگر ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ اس زمانے میں جادو بھی ایک معمولی انسانی شغل ہی تصور کیا جاتا تھا۔ اور جادوگر کی طرح فن کار کو بھی ایک فوق فطری مرتبہ حاصل تھا۔ ایک فنی تخلیق سے لطف اندوز ہونا بجائے خود کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس کا تجزیہ اس کی تقسیم اور اس کے عناصر ترکیبی کی جانچ پڑتال کو توہین مذہب سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ فن کی ماہیت اور فن کار کے دماغی عمل کو سمجھنا کھلے طور پر ایک بالکل غیر متعلق سی بات تھی یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ کچھ مبہم سے خیالات یا تھوڑے بہت سمجھے ہوئے الفاظ جو حیرت و اسرار کی نشان دہی کرتے تھے، کسی ذہن کو دغا دے جاتے تھے یعنی توضیحات اگر کچھ ملتی بھی تھیں تو فی الواقع کسی بات کی توضیح نہیں کرتی تھیں پورے موضوع پر مسلط تاریکی چھٹتی تو کیا، کچھ اور بھی گہری ہو جاتی تھی۔

تسلیم کرنا پڑے گا کہ علم النفس کے آغاز سے قبل فن اور فنکاروں کا مطالعہ غیر حکیمانہ طرز پر کیا جاتا تھا۔ گرچہ غیر حکیمانہ کا مطلب لازمی طور پر غیر تنقیدی نہیں ہے، منظم تحقیق سراسر عقل کی روشنی میں انجام پانے والی تحقیق کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی، صرف وجدان رستے کو روشن کرتا تھا۔ حقیقت کو تصور کے ذریعہ تلاش اور کبھی کبھی پا لیا بھی جاتا تھا لیکن کوئی خشک غیر جذباتی تحقیق اختیار نہیں کی جاتی تھی نہ ہی ایسے کسی عمل کو موزوں اور پسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ فن کو ایک جداگانہ شے خیال کیا جاتا تھا۔ اس کو دوسرے انسانی اشغال سے علاحدہ کر دیا گیا تھا۔ اس کو ایک بعید مقام پر کھڑا کر دیا گیا تھا تو توقع کی جاتی تھی کہ ہر شخص اس کے پاس ایک پجاری کا انداز احترام، نہ کہ متجسسانہ وغیرہ جانبدار، نہ حکیمانہ تحقیق کا جذبہ لیکر جائے گا جب علم النفس، جو انسانی دماغ کو اپنا موضوع بناتا ہے ترقی پا چکا تو ماہرین نفسیات قدرتی طور پر فنون کی طرف متوجہ ہوئے جو ان مشاغل میں ایک کے نمائندہ ہیں جن میں انسان کا دماغ اپنے آپ کو لگاتا ہے یہ بات ان کے خیال میں نہ آئی کہ وہ ایک ممنوع علاقے میں داخل انداز ہو رہے ہیں۔ ایک فن کار کے ذہن کی تحقیق انھیں دنیا کی سب سے فطری چیز

چنگاریاں

معلوم ہوتی۔ یُنگ لکھتا ہے: "یہ کافی واضح حقیقت ہے کہ نفسیاتی اعمال کا مطالعہ بسبب علم النفس کو ادب کے مطالعے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ انسانی نفس تمام علوم و فنون کا رحم ہے۔"

جو بات ماہر نفسیات کو بالکل فطری نظر آئی، ادبی ناقد کو ذرا بھی فطری نہیں معلوم ہوئی۔ ماہر نفسیات نے سمجھا کہ وہ تو صرف اپنا فرض ادا کر رہا ہے اور ساتھ ہی اس نے یہ بھی خیال کیا کہ علم النفس کی دریافتیں ادبی ناقد کے لیے بہت ہی کارآمد ہوں گی۔ وہ ناقد کی مذمت پر جو حد سے زیادہ پر جوش رہا ہے فن کے طرائق و محرکات کا بھانڈا [illegible] خطوط پر بہت قریب سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ گوئٹے، زولا، بائیرن، اور کیٹس، وائلڈ، بیتھوفن، شیلی اور لیونارڈو [illegible] ان کی اور بہت سے علاوہ دوسرے بہتیروں کی زندگیوں کو جانچا اور ملایا گیا ہے۔ ایسی کوئی چیز چھوڑی نہیں گئی جو ان ذہنی ارتقا یا خاص کارنامے پر روشنی ڈال سکتی ہو۔ ماہر نفسیات شاعروں اور مصوروں کو اپنے معمل میں پھنسا لایا ہے تاکہ ان کی حسی و ذہنی قوتوں کی پیمائش کر سکے۔ ماہر نفسیات کے اس لائق تحسین جذبے کے برابر ہی اس کی بے انتہا رجائیت ہے۔ اسے اس کا یقین ہے کہ نفسیات زندگی اور ادب میں انقلاب برپا کرنے جا رہی ہے۔ رچرڈز لکھتا ہے: "بہت عرصے سے تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اگر نفسیات میں ایسا کچھ کر لیا جا سکا جو طبیعیات کے کارناموں سے ایک ذرا بھی لگا کھا سکے تو اس کے عملی نتائج اس کسی بھی چیز سے کہیں زیادہ اہم ہوں گے جو انجینئر پیدا کر سکتا ہے۔ دماغ کے علم میں پہلے قدم سستی سے اٹھائے گئے ہیں لیکن انھوں نے آدمی کے پورے نقطۂ نظر کو بدلنا شروع کر دیا ہے۔"

شروع شروع میں نقاد عام طور پر ماہرین نفسیات کے کاموں کو ترچھی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ ان کے مبالغہ آمیز دعووں کا استقبال یہ لوگ ایک مسکراہٹ، شاید تحقیر آمیز مسکراہٹ سے کرتے تھے۔ بعض اوقات خدشہ ہوتا تھا کہ دماغ کے طریق فعل کا ضرورت سے زیادہ علم تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ شعور کی آتشی اچانک تو بے حد خطرناک تھی ہی۔

ایسے میں کسی کا [illegible]
[illegible] بالکل
یہاں تک [illegible] نے مذاق [illegible]
ذرا بتاؤ کس پاؤں کے بعد کون سا پاؤں حرکت کرتا ہے؟
اس سوال نے [illegible] کو اتنا [illegible]
مشکوک کر دیا کہ وہ ایک کھائی میں گر پڑا
اور سوچنے لگا کہ کس طرح دوڑے!

ہم سانس لیتے ہیں لیکن ہم کیسے سانس لیتے ہیں؟ اس سوال نے شاید ہی کبھی ہمارے تجسس کو انگیخت کیا ہو۔ اسی طرح فرض کر لیا گیا تھا کہ فن کار کو بس اپنے تخلیق کے کام میں لگے رہنا چاہیے، اسے اپنی قوت احساس حیرانی میں ضائع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ کام کرتا کس طرح ہے۔ اور ناقد کو اپنا شغل یہ بنا لینا چاہیے کہ کارنامۂ فن کی قدرشناسی کرے، نہ کہ اس کی چیڑ پھاڑ کرے جس طرح ڈاکٹر لاش کو چیرتا پھاڑتا ہے۔

عام نقاد کو جو ماہر نفسیات کی کوششوں پر ترچھی نگاہ ڈالتا تھا، بڑا صدمہ ہوا جب نفسیاتی تجزیہ کار نے اپنی نفسیاتی دریافتوں کا اعلان کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ تو انتہا ہو گئی۔ فن کے مقدس مندر کی بے حرمتی اس کی نگاہوں کے سامنے کر ڈالی گئی۔ جن دیوتاؤں کی وہ پرستش کرتا تھا ان کے ساتھ لکڑی یا پتھر کی مورتیوں جیسا برتاؤ کیا گیا۔ نفسیاتی تجزیہ کار کے بھاری قدموں نے حسین چیزوں کو روند ڈالا، اس کے چھوتے ہی خوبصورتی بدصورتی میں بدل گئی۔ نفسیاتی تجزیے کی ریاضتوں نے تہہ در تہہ جذبات کو ابھارا۔ انھیں عقل کی روشنی میں نہیں پرکھا گیا۔ نفسیاتی تجزیہ کار قیاس کاری، غلط استنتاج اور نادرست استدلال کی طرف مائل تھا۔ اس کے کاموں میں بے دلیل مفروضات، بے ربط تعبیرات اور مسخ کردہ حقائق [illegible] بہت کچھ بھی تھا لیکن صداقت کو غلطی یا نیم صداقت سے پہچان کر الگ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ تجزیہ نفس کی دریافتوں کو سرسری طور پر رد کر دیا گیا۔ سمجھا گیا کہ ماہرین تجزیہ نفس بعض ایسی [illegible] حماقت کی [illegible] ہے ہیں۔ ڈسمنڈ میک کارتھی لکھتا ہے:

"[illegible] ماہر نفسیات کی مداخلت تقریباً ہمیشہ حماقت کا باعث ہوتی ہے۔ ادبی تنقید اقدار سے تعلق رکھتی ہے، جبکہ اقدار کی نفسیاتی اصل سے۔ ماہر نفسیات کا طریق یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے دماغی اعمال اور انسانی جبلتوں کا مطالعہ ان کی نہایت مبالغہ آمیز شکل — دیوانگی یا انتہائی اعصابیت — میں کرتا ہے اور مختلف اقسام کے خرافات کی درجہ بندی کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ مشہور مصنفین میں کچھ اس قسم کے میلانات پاتے ہیں جیسے انھوں نے دیوانوں میں مطالعہ کیے ہیں، اور پاگل خانے کے ناموں کو ان پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ جتنی ذہین کا ناقد اس طرح تبصرے کرتا ہے گویا بڑے سے بڑا عبقری بھی باہر کی دنیا میں رہنے کے بجائے شفاخانے میں ہو سکتا تھا وہ صرف ذکاوت اور دیوانگی کے درمیان نقطۂ اشتراک کی جستجو کرتا ہے۔"

اور اس طرح نفسیاتی تجزیے کو رد کر دیا گیا۔ گرچہ ہر ناقد نے ایسا نہیں کیا۔ اے ڈبلیو ریڈ [illegible] لکھتا ہے: "[illegible] ناقد جواب دے گا کہ اس انداز سے تو ہم ایک ایسی چیز کو پس پشت ڈال رہے ہیں جو ہمیں فن کا تازہ فہم و شعور دے گی۔ خارجی فضا سے ایک نیا سیارہ طلوع ہوا ہے جس کی روشنی میں مانوس چیزیں عجیب صورت اختیار کر لیتی ہیں اور دھندلی چیزیں صاف ہو جاتی ہیں۔ تو کیا ہمیں ہارے تھکے [illegible] اپنے تنگ گھروں میں گھس کر دروازوں کو بند کر لینا اور [illegible]

پر رشتے ڈال دیا گیا تھا۔ ان لوگوں میں جنھوں نے ڈاکٹر کو نظرانداز میں گھس جانے سے انکار کر دیا ہے اور جنھوں نے سائنس کو نقش آمد دیا کہا ہے۔ رچرڈز سے جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ شاید ان تمام لوگوں میں اہل ترین ہے جنھوں نے نئی نفسیات کی معلومات کو ادبی تنقید کے میدان میں کھلانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوئی حیرت کا مقام یا انحراف نہیں ہے جس نے ریڈ کو نفسیاتی تجزیے کی طرف مائل کیا ہے۔

"ہمارے عہد کا حکیمانہ مزاج ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ فنکار اور اس کے ناقد سے کے تقدیر پرستانہ مزاحمت کرنی ضروری ہو۔ فن اور علم ہمیشہ صداقت کی دریافت و پیش کش کے مستقل طریقے رہے ہیں لیکن جب علم کا ایک ایسا شعبہ قائم ہو گیا جس کا موضوع ہی ماخذ تھا تو ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی کیونکہ اب سائنس دان انسانی ذہن کی ان تخلیقات سے بھی ارتباط رکھنے لگا جنھیں بغیر حق کو کارنامہ ہائے فن کہا جاتا ہے اس علم سے کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ یہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نفسیات ادبی ناقد کے دائرے سے براہ راست ٹکراتی ہے اس پر حملہ آور ہو کر اسے خارج کرتی ہے اور لاشعوری تعصبات کا ایک انبوہ ناک ویرانہ بنا کر چھوڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس صورت حال میں ناقد کو پورا انتقام لینا چاہیے اور علم النفس سے اپنے بہترین ہتھیار چھین لینے چاہییں۔ میں بتدریج ایک نفسیاتی ناقد کی ادبی تنقید کی طرف کھنچ آیا ہوں کیونکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ نفسیات خاص کر تجزیۂ نفس کا طریقہ بہتیرے ان مسائل کی تشریحات کر سکتا ہے جن کا تعلق شاعر کی شخصیت، شاعری کے فنی نظام اور نظم کی قدرشناسی سے ہے۔"

ریڈ کے بقول نفسیاتی تجزیہ بہتیرے مسائل کے حل میں اور ہمارے ذہن کے ان تاریک گوشوں کو جہاں تک روشنی کی کوئی کرن نہ پہنچ سکی ہے روشن کر کے ادبی ناقد کی مدد کر سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ ریڈ ادبی تجزیہ کے قائل ہے جن کے لیے نفسیاتی تجزیے سے دلچسپی رکھتا ہے۔ دونوں علوم کے مواد میں نمایاں فرق سے وہ باخبر ہے۔

"نفسیات دماغی حرکت کے اعمال سے متعلق ہے اور ادبی تنقید نتائج سے۔ ماہر نفسیات صرف عمل تک پہنچنے کے لیے نتیجے کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے فن کی وہی اہمیت ہے جو ذہنیت کے کسی دوسرے اظہار کی ہو سکتی ہے لیکن اس سے زیادہ اہمیت نہیں۔ اس لیے اس کی اہمیت اس کی ادبی قدر سے مطابق نہیں ہوتی۔ ماہر نفسیات ادبی اقدار کی طرف دھیان نہیں کرتا۔ افسوس! یہ بے پروائی اس کے اپنے کام میں بھی اکثر پائی جاتی ہے، بلکہ متعین طور پر اظہار افسوس بھی کر سکتا ہے خاص کر جب وہ کسی معروضی روایت یا معیار کے زیر اثر موضوعی تخیلات کے برداشت کی عکاسی کرتی ہوں۔"

لیکن اس بنیادی اختلاف کے باوجود ریڈ کا یقین ہے کہ نفسیات خاص کر نفسیاتی تجزیہ ادبی تنقید کے اصولوں میں کچھ مثبت اضافے اور شاعری کے متعلق ہماری قدرشناسی کو گہرا کر سکتا ہے۔

ان خیالات کے بالکل خلاف ہم رچرڈ مارچ کے خیالات کو پیش کر سکتے ہیں۔ وہ ڈسمنڈ میک کارتھی سے یوں مختلف ہے کہ تجزیۂ نفس کی دریافتوں کے خلاف جذباتی اور شدید ردعمل کا اظہار نہیں کرتا۔ وہ ان کا فلسفیانہ تجزیہ کرتا، ان کی صداقتوں کو تسلیم کرتا اور فیصلہ دیتا ہے کہ ان دریافتوں کو ادبی تنقید کے اصولوں کے اعتبار سے غیر تشفی بخش قرار دینا چاہیے۔ اس کو نفسیاتی تجزیہ ناقد ادب کے لیے بالکل غیر متعلق معلوم ہوتا ہے اس کے پیش نظر نفسیاتی تجزیے کا دوسرا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ یہ اس کو مدھیانہ اور احمقانہ نظر آتا ہے۔ یہ ایک غیر متعلق اور بے محل بات ہوگی اگر تجزیۂ نفس اور اس کے دعوے سائنسیت کے خلاف اس کے دلائل کو پرکھا جائے۔ اس کی ایک دریافت یعنی لاشعور اور ہماری زندگی میں اس کا حصہ متعلق اور لائق ذکر ہے۔ اس نقطۂ نظر کی انتہا پسندانہ صورت کو مارچ گروڈیک نے متشکل کیا ہے جو فرد کو بالکل لاشعور کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ "میرا خیال ہے کہ آدمی کو تحریک کا ارادہ ہوتی ہے جو اس کے کاموں اور مرحلوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ "میں زندہ ہوں" کا اقرار کل تجربے کے محض ایک چھوٹے اور سطحی حصے کو ظاہر کرتا ہے۔ جو کل یہ ہے "میں الڈ کے ذریعے زندہ رہتا ہوں۔" فرد بیچارہ ہے وہ ایک ایسی بالاتر طاقت کا کھلونا ہے جس کو وہ سمجھ نہیں پاتا — ایک مطلق العنان مالک کا غلام۔ الڈ کے مقابلہ میں ایغو بھی ہے جس کو میں فقط الڈ کا ایک آلہ سمجھتا ہوں۔"

اس میں گروڈک اضافہ کرتا ہے "الڈ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اس کے کام کو اپنا ہی سمجھیں اس کے مقاصد اور حسیات کو باشعور ذہن ایغو کے ارادہ و مقصد کا منفصل کردہ سمجھیں۔" چنانچہ فرد ایک غلام ہے جو اتنا کافی احمق بھی ہے کہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے۔ وہ ایک ایسے محرک کے زیر فرمان ہے جو عموماً لاشعور کی گہرائیوں میں مدفون ہے اور یہی وہ محض لاشعوری ہے جو اس کے تمام خیالات حسیات اور افعال کا فیصلہ کرتا ہے۔

یہ مفروضہ ناقابل قبول ہے کیونکہ جیسا رچرڈ مارچ نے بتایا ہے "فرد کی اہمیت مسلم ہے اور اس لیے کہ انسانی زندگی کا کوئی نظریہ جو ایک فرد نوع انسان کے اغراض و مقاصد یا ماہیت حقیقت کے مسائل کو نظرانداز کرتا ہے چنداں لائق اعتنا نہیں۔ فرد کی اہمیت اور اپنے خیال و اعمال کے لیے اس کی ذمہ داری سے انکار کرنا زندگی کو بے معنی بنا دیتا ہے۔" پھر لکھتا ہے "ہمارے عمل کا جواز یہ اور صرف یہی ہے کہ یہ ہماری اپنی

کا بہترین نمونہ ہے اور ہم لوگ اخلاقی وجود کے
الگ ٹھیک اسی حد تک ہیں جہاں تک ہم بہترین
قدر و قیمت کے [illegible] دائرے کو جانتے اور
اس کی [illegible] کرتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو
با اخلاق قرار [illegible] کرتے ہیں۔ جب ہم یہ
مان لیتے ہیں کہ یہ یا ایسا ہی دوسرا عمل چونکہ
ہماری رسائی کی حد تک بہترین ہے لہٰذا ہمیں
اس کا اتباع کرنا چاہئے اور یہ کہ نصب العین
چونکہ برحق نصب العین ہیں للہٰذا ان کا اختیار
مستقل ہے۔ یہ ضمیر کا سبق ہے ایک جہان
اغراض سے ہماری ناگزیر یکسانگی اور صاف
صاف یہ کہ جو کچھ ہم ہیں اور جو کچھ ہم ہو سکتے ہیں
اس کے متعلق یہ نکتہ نہایت ہی اہم ہے۔[8]

اسی سند سے ایک اقتباس اور ملاحظہ
ہو: "لہٰذا جو کام ہمارا فرض ہے وہی ہمارے
لیے سب سے سہل الحصول بھی ہے اور ہر کام
ہمارے لیے سہل ہے اگر ہم میں انتخاب و تکمیل
کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ ہمارا فرض اپنی نجات
سے بڑھ کر بہت دور تک وسیع ہو جاتا ہے۔
ہم ہر اس تغیر کے لیے ذمہ دار ہیں جو ہم اپنے
گرد و پیش کی دنیا یا دوسروں کی زندگیوں
میں بروئے کار لا سکتے ہیں اور ان تغیرات
کے نتائج کو اگر ہم مر بھی چکیں اور ہمارے کام
ہمارا تعاقب کر رہے ہوں لازماً ہماری
جانب منسوب کیا جانا چاہئے۔ نیکی حاصل
کرنے کے لیے ہمیں بسا اوقات اپنے آپ کو
بھول ہی جانا چاہئے۔ بہرکیف، جو کچھ ہم نہیں
بھول سکیں، وہ ہماری ذمہ داری ہے اور
یہ چیز نہایت شدت کے ساتھ ہماری ہی ہے۔"
اس صداقت کی رو بکاری ہی زندگی کو

اس کا مفہوم اور فن کو اس کا معنی عطا کرتی ہے
ہمیں نفسیاتی تجزیے کے عام نتائج سے کوئی
تعلق نہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نتائج
غلطی سے پاک نہیں، کم از کم ان کی دوسری
تعبیریں تو پیش ہی کی جا سکتی ہیں۔ آکلڈرچ
کہتا ہے: ایک مشہور نفسیاتی الجھن پدرانہ
الجھن ہے جو ملا نیشیا میں مالی نووسکی کی

تحقیقات کے مطابق کام پر مجبور کیے جانے یا بیدار
بنانے کے خلاف مزاحمت کرتی ہے۔ یعنی
وحشی جانور کی تربیت کے خلاف مزاحمت جیسے
معاشروں میں باپ ان ناگوار ضرورت کی علامت
ہے لیکن جزیرۂ ٹروبریانڈ کے رہنے والوں
کے درمیان ماموں ان باتوں کی علامت قرار
دیا جاتا ہے اس لیے کہ وہاں نسل کا لحاظ
صرف ماں کے واسطے سے ہوتا ہے۔ یہاں
لڑکا خارانہ الجھن رکھتا ہے، نہ کہ پدرانہ الجھن،
ینگ نے ثابت کیا ہے کہ اسی طرح معروف
مادرانہ الجھن در اصل وہ شہوت جنسی داعیہ)
ہے جو زندگی اور اس کی مشکلات سے پیچھے
ہٹ کر بچپنے میں پناہ لینا چاہتی ہے۔ جس
کے لیے علامت ماں ہے۔ مادرانہ الجھن رکھنے
والا مرد طفلی و الاشان، ایک دلارا، غیر ذمہ دار،
مطلق العنان ہونا چاہتا ہے یہ ہوس اقتدار
کی ایک طفلانہ صورت معلوم ہوتی ہے۔ کہا
جا سکتا ہے کہ پدرانہ الجھن اور مادرانہ الجھن
ایک ہی میلان کے مختلف پہلو ہیں۔ اول الذکر
میں علامت فرض سے نفرت اور ثانی الذکر میں
علامت فرار سے محبت ہوتی ہے۔"

ان عمومی خیالات کے بعد (جن پر مزید
بحث آئندہ ہوگی) اب ہمیں کچھ خصوصی،
زیادہ قریبی تعلق کی باتوں کی طرف متوجہ
ہونا چاہئے۔ ینگ کے بقول ہم نفسیاتی
تحقیق سے ایک طرف تو یہ توقع کر سکتے ہیں
کہ وہ فن پارے کی تعبیر کی تشریح کرے اور
دوسری طرف یہ کہ وہ ان عوامل کا انکشاف
کرے جو ایک شخص کو تخلیق فن کا اہل بناتے
ہیں۔ ایک ماہر نفسیات تخلیقی عمل کی
جانب بڑھ سکتا ہے اور ایک خاص فن کار کی
ترجمانی یا ایک خاص فن پارے کا تجزیہ
کر سکتا ہے وہ اشتغال تنقید کو وسعت دینے کے
طریقے بھی تجویز کر سکتا ہے۔ یہ وہ مختلف
طریقے ہیں جن سے نفسیاتی تجزیہ ناقد ادب
کے دائرے پر براہ راست اثر انداز ہو سکتا ہے
اور ناقد کو چاہئے کہ نفسیاتی تجزیئے کو پس پشت

ڈالے۔ اسے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے اسے
دوڑ کر اپنی کوٹھڑی میں گھس کر دروازے بند
کر لینے چاہئیں۔ اس کو چاہئے کہ اس نے
منظر کو جانچے اور دریافت کرے کہ واقعی ایک
نیا ستارہ طلوع ہوا ہے یا محض فریب نظر ہے؟

بقیہ کلیم الدین احمد سے ملاقات

اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی کے انگریزی اور اردو
کے شعبوں سے مل کر دو جلدیں نکالیں

۱۵: معاصر کے سال میں کتنے شمارے نکلتے ہیں
ک: جتنے نکلتے ہیں لیکن کبھی کبھار شائع ہو جاتا ہے

۱۶: آپ نے شعری تنقید لکھی ہے اردو نثر کی تنقید
کب تک ہوگی

ک: آپ نے معاصر دیکھا ہے؟ نثر میں تنقید
کی ابتدا ہو گئی ہے

۱۷: آپ نے اپنی کتاب سے کوئی خاص فائدہ بھی
حاصل کیا ہے

ک: بہت کم میری کتابیں پبلشرز بلا اجازت چھاپ
لیتے ہیں۔ اب کس کس پر مقدمہ کیجئے

۱۸: کیا آپ کتابوں سے کوئی مالی فائدہ اٹھانے
کے موقف میں نہیں ہیں

ک: اس زحمت میں کون پڑے

۱۹: آپ نے لغت بھی لکھی ہے۔ ادبی اصطلاحات کی
فرہنگ تیار کی ہے

ک: یہ دونوں کام ترقی اردو بورڈ کے لئے ہیں۔
فرہنگ جنوری [illegible] میں مکمل ہو گئی تھی اور انگریزی
اردو لغت مارچ [illegible] میں لیکن دونوں میں سے کوئی
ابھی تک نہیں چھپی ہے

۲۰: پاکستان میں اردو زبان نے ترقی کی ہے یا
ہندوستان میں

ک: جہاں تک میرا علم ہے اردو نے ہندوستان
میں زیادہ ترقی کی ہے

۲۱: آپ نے اردو غزل کو نیم وحشی صنف سخن
کہہ کر اردو دنیا کو چونکا دیا تھا۔ آپ نے ایسا جان بوجھ
کر کہا تھا یا یوں ہی

ک: میں وہی کہتا ہوں جسے حق سمجھتا ہوں۔

چینی ادب

کلیم الدین احمد

(۱)

کہہ سکتے ہیں کہ چینی شاعری کی ابتدا گویا وقت کی ابتدا ہے، تاریخی وقت کے دھندلکے سے ابھر کر یہ اپنی روشنی دور دور پھیلاتی ہے، اور یہ شمع ابھی تک روشن ہے!

یہ شاعری کیا ہے؟ یہ ایک گیت ہے، ایک کبھی نہ ختم ہونیوالا گیت جسے کوئی خوابیدہ روح بانس کے درختوں کے سایہ میں بلند آواز میں گاتی ہے۔ اور یہ شاعری نتیجہ ہے، ایک نئی، عجیب نہ سمجھنے والی قوت حاسہ کا، اس قوت حاسہ نے صدیوں میں تربیت پائی ہے، اس تربیت نے اسے ایسا نرم اور ملائم بنا دیا ہے، ایسا نازک اور لطیف اور حساس بنا دیا ہے کہ اسے ایک پھول کے پتی کے گرنے کی آواز ملکوں اور قوموں کے تصادم سے زیادہ تیز معلوم ہوتی ہے، اور زبان بھی لطافت کی دیوی ہے جو نرمی میں ریشم سے بھی زیادہ نرم ہے نکہت اور تازگی میں ،، پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے،،

اگر آپ ہیں چینی شاعری کو سمجھنے کی صلاحیت ہے اور یہ صلاحیت ذرا مشکل سے ہاتھ آتی ہے، ہاں اگر آپ میں صلاحیت ہے تو کبھی کبھار ایک شعر، ریشم کی چادر پر ایک ہلکی اور رنگین تحریر، اور ایک ہلکا پھلکا گیت جسے کوئی لڑکی دھان کے کھیت میں گاتی ہو، یہ چیزیں چین کو آپ کے سامنے زندہ لاکھڑا کریں گی، وہ ہلکا پھلکا شعر ہو یا ہلکی اور رنگین تحریر، اس میں لطیف اور نازک اشارات بھی ہوتی ہے اور ٹھوس واقعیت بھی، اس لئے معنی خیزی اور زندہ تصویر ساتھ ساتھ ملتی ہیں،

کہتے ہیں کہ چینی شاعروں نے ساری دنیا کی قوموں سے زیادہ نظمیں لکھیں، ہزاروں نظمیں تلف ہوگئیں، اب چینی شاعری کا سب سے پرانا نمونہ ،، شیِ جنگ ،، (گیتوں کی کتاب) میں ملتا ہے پہلے سمجھا جاتا تھا کہ مشہور چینی فلاسفر کونفیوسی اس کے پیش نظر ... ۳ نظمیں تھیں جو صدیوں کی آبیاری کا نتیجہ تھیں اور ... ۳ نظموں کی روح یہ ۳۰۵ نظمیں ہیں جو کونفیوسی اس نے چنی تھیں، یہ خیال غلط ہے، یہ مجموعہ بہت پہلے یہ صورت اختیار کرچکا تھا، بات یہ ہیکہ یہ نظمیں کونفیوسی اس کو بہت پسند تھیں، وہ انھیں اپنی بربط پر گایا کرتا تھا اور تلقین کرتا تھا کہ لوگ ان نظموں کو برابر مطالعہ کریں، لیکن اس کی دلچسپی اخلاق سے ہو، فلسفہ سے ہو، مذہب سے ہو، شاعری سے نہ تھی،

کہتے ہیں کہ ایک تیز نوجوان نے کونفیوسی اس کے لڑکے پوتو سے پوچھا ،، تمہارے باپ نے تمہیں کچھ ایسی چیزیں بھی بتائی ہیں جو اپنے دوسرے شاگردوں کو نہیں بتائی ہیں،، پوتو نے کہا ،، نہیں۔ البتہ ایک روز وہ اکیلے کھڑے ہوئے تھے کہ میں اسطرف سے گذرا تو انھوں نے پوچھا: ،، روڈز کا مطالعہ کیا ہے؟،، میں نے کہا: ،، نہیں،، اگر روڈز کا مطالعہ نہ کروگے تو الفاظ کا استعمال بھی نہ کرسکو گے،، پھر کسی دوسرے دن وہ اکیلے کھڑے ہوئے تھے اور میں اس طرف سے گذرا، کہا: رسوم کا مطالعہ نہ کروگے، تو اپنے کو مکمل بھی نہ کرسکوگے،، میں نے رسوم کا مطالعہ شروع کیا،

ایک مرتبہ کونفیوسی اس نے اپنے شاگردوں کو تنبیہہ کی: تم روڈز کا مطالعہ کیوں نہیں کرتے روڈز تمہارے جذبات کو ابھرنا سکھائیں گے، تمہیں غور و فکر کی دعوت دیں گے، تمہیں دوست بنانا سکھائیں گے، تمہیں نفرت کا رستہ بتائیں گے، تمہیں اپنے والدین کے اور بادشاہ کے لئے مفید اور کارآمد بنائیں گے، تمہیں چڑیوں، جانوروں، پودوں اور درختوں کے نام یاد رکھنے میں مدد کریں گے،،

ظاہر ہے کہ ان نظموں کے شعری حسن کی طرف دھیان نہیں، دھیان ہے، تو غیر شعری خصوصیات کی طرف!

ذرا آگے بڑھنے سے پہلے ،، شیِ جنگ ،، کی کچھ ہلکی پھلکی، چھوٹی، موٹی نظموں کو دیکھئے:

(۱)

پوربی دروازے کے باہر
بہت سی لڑکیاں ہیں جیسے بدلیاں چھائی ہوں
لیکن ان بدلیوں میں
وہ نہیں جسکو میرا دل چاہتا ہے
سفید کوٹ اور خاکستری اسکارف
ہی سے میرا غم غلط ہو سکتا ہے

دروازے کے مینار سے آگے
سینٹھے کے اون جیسی حسین لڑکیاں ہیں
لیکن ان سینٹھے کے اون جیسی حسین لڑکیوں میں
وہ نہیں جس کے پاس میرا دل ہے
سفید کوٹ اور مجیٹھ رنگ کا اسکارف
بس یہی ہمیں بچی خوشی دے سکتے ہیں

(۲)

پادری دروازے کے بید کے درختوں کے پاس
جن کے پتے بہت گھنے ہوتے ہیں
ہم تم سرِ شام ملنے والے تھے
اور اب صبح کا ستارہ چمک رہا ہے

پادری دروازے کے بید کے درختوں کے پاس
جس کے پتے نزدیک نزدیک ہوتے ہیں
ہم تم شام کو ملنے والے تھے
اور اب صبح کا ستارہ زرد ہو گیا ہے

(۳)

ٹھنڈی ہوا اتر سے بہہ رہی ہے
برف گر رہی ہے
مجھ سے محبت کرو، مجھ پر مہربان ہو
میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لو اور میرے ساتھ چلو
دیر اور اتنی دیر کیوں کرتے ہو
آؤ ہم تم چلیں!

ٹھنڈی ہوا اتر سے سن سنا رہی ہے
برف چکر کھاتی ہوئی گرتی ہے
مجھ سے محبت کرو، مجھ پر مہربان ہو
میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لو اور میرے ساتھ چلو
دیر اور اتنی دیر کیوں کرتے ہو
آؤ ہم تم چلیں!

صرف لال لومڑی
صرف کالا کوا —
مجھ سے محبت کرو، مجھ پر مہربان ہو
میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لو اور میرے ساتھ چلو
آؤ ہم تم چلیں!

(۴)

میرا تیتر اڑا چلا جا رہا ہے
لپ، لپ اس کے بازوؤں کی آواز سنائی دیتی ہے
اب میرے محبوب
تم مجھ سے کیوں جدا ہو؟

میرا تیتر اڑا چلا جا رہا ہے
اوپر نیچے اس کے گانے کی آواز آ رہی ہے
اے میرے کنورا!
تم نے میرا دل کیوں توڑ دیا ہے؟

سورج اور چاند کو دیکھو
ان سے کم دیرپا میری محبت نہیں
منزل دور ہے
میں اس تک کیسے پہونچوں؟

اے سارے نوجوان شہزادو!
تم اس کے نیک کاموں سے واقف ہو
اسے کسی سے نفرت نہیں، کسی پر رشک نہیں
کبھی اس نے کوئی برا کام کیا ہے؟

یہ نظمیں بلا تخصیص پیش کی گئی ہیں، البتہ بڑی بڑی نظموں کا ترجمہ طوالت کے خوف سے نہیں کیا گیا ہے، روبرٹ پین کا کہنا ہے: "ان نظموں میں جادو بھرے تجربوں کی شاعری ہے، یہاں سنجیدہ علم بھی ہے اور زمین کے حسن کا خوشی سے بھرا ہوا شعور بھی، یہاں چاول کے کھیت سونا بہاتے ہیں، عشاق چشموں میں نہاتے ہیں، سفید چٹان اور آبشار اور بگلے پہاڑ کی چوٹیوں پر بیٹھے ہوئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ابتدا پھر لوٹ آئی ہے، شاعری ہڈیوں تک تو نہیں لیکن چہرے تک عریاں ہے، اس میں نہ تو کوئی سختی ہے اور نہ کوئی آرائش، لڑکیاں چشموں سے پایاب اترتے ہوئے اپنا لباس اٹھا لیتی ہیں، دھان کے کھیت کے کنارے پرچم اڑتے ہیں۔ . . . زمین کے پھل اور انسان کے پھل مل جل کر پُرسکون کامیابی کا مکمل نقشہ بناتے ہیں، زندگی رسوم و موسم سے ہم آہنگ تھی، ابھی لوگوں نے شہروں میں رہنا نہیں سیکھا تھا یہ زندگی ایسی بھرپور تھی کہ یہ صفحوں پر پھٹ کر بکھر جاتی تھی، جیسے انار کے دانے اندر سے نکل کر بکھر جاتے ہیں۔ . . .

یہ نظمیں سب سے چمکدار چیزیں ہیں جو اس چمکدار منظر کی پیداوار ہیں جہاں دنیا کے سب سے زیادہ چمکدار آسمان ہیں،

یہ گانے ایسے لوگوں کی زبان ہیں جو زندگی سے حقیقی محبت رکھتے تھے، جو چمکدار رنگوں کی چمک کا زندہ احساس رکھتے تھے، تقریباً ہر نظم میں ایک رنگین لفظ ہے، اور یہ رنگ تازہ نظروں سے دیکھے گئے ہیں، لیکن ان کا کوئی مفصل بیان نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خالص زرد، خالص سبز، خالص قرمزی رنگ کی دنیا میں جا پہونچے ہیں — ایسی دنیا جہاں کوئی سایہ نہیں، جہاں ہر چیز اپنی ماہیت پر قائم ہے، . . . اور اس دنیا کے ہم آہنگ رنگوں میں رسوم اور روئیدگی کی مسرت میں، عشاق دکھائی دیتے ہیں۔ . . . چڑیوں کی طرح گاتے ہیں اور ہرنوں کی طرح محبت کرتے ہیں . . . .

اس مقام سے چینی شاعری نیچے گرنا شروع ہوتی ہے، وہ زندگی کی تکمیل کے مقدس احساس کو پھر کبھی نہ حاصل کر سکیں گے، پھل کے درخت ثمر فروشی کریں گے، پھول بیشمار ہوں گے اور نئے رنگوں کے . . . . لیکن چین پھر ایسا حسین

کبھی نہ ہوگا۔

یہ سطریں سوماں تقریظ ہیں تنقید نہیں، یہاں "شیر جنگ" کی چکیلی خصوصیتوں کا بیان ہے، سلجھا ہوا سادا تنقیدی تجزیہ نہیں، پھر بھی ان سطروں سے اس قدیم شاعری کی خوبیوں کا اندازہ ممکن ہے وہ تنقیدی نہ سہی، تعجب تو یہ ہے کہ گزشتہ بیس صدیوں سے چینی عالموں نے "شیر جنگ" کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور "شیر جنگ" سے متعلق بہت ساری دشواریوں کو آسان کیا ہے، لیکن ان بیس صدیوں میں بھی ان کا خیال سب سے اہم مسئلہ کی طرف نہیں گیا یعنی انھوں نے ان نظموں کے شعری حسن اور ان کی شعری تکنیک سے کوئی واسطہ نہ رکھا، اور یہی بے توجہی بعد کی نظموں کے ساتھ بھی رہی ہے،

کہتے ہیں کہ دوسری صدی قبل مسیح سے چینی عالموں کو تین لفظوں سے خاص شغف رہا ہے: فوہ، بیان، پائی، استعارہ، ہنگ، تلمیح لیکن مختلف عالموں نے الگ الگ معنی بتائے ہیں، کاش وہ یہ سارا وقت بوطیقا کے نہ سمجھ میں آنیوالے نکتوں پر صرف نہ کرتے تو شاید زیادہ نفع ہوتا لیکن بات یہ ہے کہ چینی عالموں نے ابھی تک دنیائے نقوش (امیجری) کی تفتیش بھی نہیں کی ہے،

ایک جملہ ہے: شی ین چی، شی، روڈز، ین، بولنا، بیان کرنا، چی، ارادہ، خواہش، لوکی نے تیسری صدی میں شی سے لیرک شاعری سمجھا اور کہا کہ شاعری میں جذبات کا لطیف بیان ہوتا ہے۔ دوسروں نے چی کے ارادی رخ پر زور دیا اور روڈز کو شاعروں کی خواہشوں اور تمناؤں کا بیان سمجھا، اور شاعری حسین خیالات کا بیان قرار پائی یہاں تک کہ کنفیوسس نے کہا کہ ان نظموں کے مجموعے کو ایک جملے میں بیان کیا جاسکتا ہے، ٹیڑھے خیالات نہ رکھو،

ان باتوں کو تنقید سے دور کا بھی سروکار نہیں "شیر جنگ" سے متعلق تنقیدی باتیں کہیں نہیں ملتیں، گویا ان نظموں میں مذہب ہے، فلسفہ ہے اخلاق ہے، لیکن شاعری نہیں، شعری محاسن نہیں جن نظموں کا میں نے ترجمہ کیا ہے ان کے شعری محاسن سے متعلق بہت کچھ کہا جاسکتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چینی عالموں کو ان چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں، دور کا بھی لگاؤ نہیں، کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کے وجود کو مسلم سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ ان نظموں کی دوسری خصوصیتوں کی طرف جھکتے ہیں، لیکن یہ درست نہیں، ارسطو نے یونانی ادب کو سامنے رکھ کر کچھ اصول بنائے تھے لیکن چین میں کوئی ارسطو نہ تھا جو "شیر جنگ" کو سامنے رکھ کر شاعری سے متعلق کچھ اصولی باتیں کرسکے، نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی عیسوی سے پہلے چینی ادب میں تنقیدی شعور نہیں ملتا،

(۲)

چینی ادب کی تاریخ اپنا موضوع نہیں، اسلئے میں چند بڑے چینی شاعروں کے ذکر پر قناعت کروں گا،

۱۔ چو یوآن (۳۴۳-۲۷۷ قبل مسیح) اس کا شمار چین کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے، اس کی نظمیں ذرا ابھاری بھرکم ہوتی ہیں، ان میں ایک وزن ہے، گہرائی ہے اور چکیلا تخیل ہے، انہیں حسین نقوش کی زیادتی ہے اور یہ نقوش نیچر کی بوقلموں دنیا سے لے گئے ہیں، چو یوآن کا اثر چینی شاعروں پر بہت گہرا اور دیرپا تھا، اور مبالغہ کی حد یہاں تک پہنچی کہ اسے گویا شاعری کا خدا سمجھنے لگے جب اس کا ذکر ہوتا تو مبالغہ کے ساتھ، اس مبالغے کی ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں،

ستوماچی ان کا کہنا ہے کہ چو یوآن ایسا فرد تھا کہ کیچڑ اور گندگی میں پڑ کر بھی کسی قسم کی گندگی سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیتا، اور اس کا دل ایسا تھا کہ وہ چاند اور سورج سے زیادہ روشنی بخشتا،

لیو ہسی ہیہ کا کہنا ہے کہ جب وہ اپنے غم کو بیان کرتا ہے تو ہمارے دل میں جیسے غم کا نشتر لگاتا ہے اور جب وہ پہاڑوں اور چشموں کی بات کرتا ہے تو ہم ان کی آواز سنتے ہیں، اور انھیں اپنے سامنے دیکھتے ہیں اور جب وہ اوقات اور موسموں کا ذکر چھیڑتا ہے تو یہ اوقات اور موسم ہمارے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا غیر معمولی ذہن اس قدر بلند و بزرگ تھا اور اس کا دھول اتنی بلندی پر پیچ و خم کرتا تھا اور ایسے کبھی نہ ختم ہونے والے پہاڑوں اور چشموں کے نظارے تھے اور ایسی منطق، ایسے احساسات اس کی نظموں میں تھے کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا چہرہ سونے کا تھا اور اس کا روپ جیڈ کا، اس کا حسن کل حسین چیزوں سے زیادہ درخشاں تھا ایک بال جیسا ہلکا،

یہ تقریظ ہے، مبالغہ آمیز تقریظ ہے، وہ نہیں جو فن کی جان ہے بلکہ وہ مبالغہ جس سے تنقیدی شعور اگر ہو بھی تو فنا ہو جاتا ہے۔

چو یوآن کی دو نظمیں ملاحظہ ہوں، پہلی نظم ہے "بادلوں میں رہنے والا خداوند"

(۱) وہ آرکڈز (ثعلبیہ) کے بیچ میں نہاتا اور
اور اپنے بالوں کو معطر چشموں میں دھوتا اور
اپنے پہلو رکوٹ کو شفق کے درخت کے
پھولوں سے سجاتا ہے،
یہ دیوتا آہستہ قدم اترتا ہے اور ٹھہرتا ہے
اسکے تجلی کی چمک دمک کبھی نہ ختم ہونیوالی ہے
وہ اپنے ابدی محل میں رہتا ہے اور آرام لیتا ہے
اس محل کی چمک سورج و چاند کی چمک سے کم نہیں

ایک رتھ میں جسے اژدہے کھینچے ہیں، شاہانہ کپڑے پہنے ہوئے
وہ اپنے آکاش کے بے پایاں میدانوں میں سیر کرتا ہے
چمکتی ہوئی تجلی میں یہ دیوتا اترا ہے
یکایک وہ بادلوں میں بلند پرواز کرتا ہے
اپنی کھڑاوے سو پہاڑ اس سے بھی دور دور دیکھتا ہے
چار سمندروں کی لمبی دوری پر پھیل جاتا ہے
اس خداوند کا خیال آتے ہی میں ٹھنڈی سانس بھرتا ہوں
میرے دل کو غم کا بھاری پتھر دباتا ہے

(۲) "پہاڑوں کی دیوی"

لارڈ: پہاڑ پر ایک دیوی دکھائی دیتی ہے
جو ریشمی ہری انجیر میں ملبوس ہے عشق پیچاں جس کا کمربند ہے
نیچی نظروں اور چمکیلے دانتوں سے مسکراتی ہے
اسے میری تمنا ہے، بار بار اشارے کرتی ہے

لیڈی

سرخ پلنگ پر سوار جسکے پیش پیش دھاری دار لومڑی ہے
سینکڑوں پہاڑی رتھوں میں جن میں تیزبات کے جھنڈے لگے ہوئے ہیں
اور کاکزر (شعلیہ) میں ملبوس، ازیلیا کا کمربند باندھے
میں اپنے محبوب کیلئے بیٹھے بیٹھے پھول توڑ رہی ہوں

لارڈ

میں ایک تاریک بن میں رہتا ہوں جہاں آسمان دکھائی نہیں دیتا
رستہ بہت ڈھلوان ہے جس نے آنے میں بہت دیر لگادی
میں پہاڑ کی چوٹی پر اکیلے ستون کی طرح کھڑا ہوں
بادل میرے پاؤں کے نیچے منڈلاتے اور تیرتے ہیں

لیڈی

سیاہی اور تاریکی کی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے،
دن دھندلا دھندلا معلوم ہوتا ہے
پوربی ہوا طیش میں ہے، دیوتا بارش برسا رہے ہیں
میں اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہوں، میں کھوئی
کھوئی سی ہوں اپنا گھر بھی یاد نہیں
سال ڈھلنے پر [illegible] کون کرے گا؟

لارڈ

میں تین قسم کے لارک اسپر کو پہاڑی کا پھول توڑتا ہوں
سنگستانی چٹانوں اور گھنی انگور کی بیلوں میں
شہزادی کا شکوہ کرتا ہوں واپسی کے خیال سے دل
محزون سا ہو جاتا ہے
وہ میری یاد کر رہی ہے لیکن مجھے تسلی دینے کی فرصت نہیں

لیڈی

میں پہاڑ کی دیوی ہوں، ایلپنیا کا تاج پہنے ہوئے
پہاڑی جھرنوں سے پانی پیتی ہوں، سرو و صنوبر کے سایہ میں
میں سوچتی ہوں کہ کیا تم مجھے ابھی تک یاد کرتے ہو
رعد گرجتا ہے، بارش کی بوچھار زمین کو تاریک بناتی ہے

لارڈ

بندر رات بھر چیختے چلاتے اور ماتم کرتے ہیں
سن سناتی ہوئی ہوا گرتے ہوئے پتوں سے سرگوشیاں کرتی ہے
شہزادی کا بے فائدہ دھیان کرتے ہوئے کیسے غم غلط کر
سکتا ہوں،

ان دو نظموں سے چو یوآن کی شاعری اور اسکی
بزرگی کا اندازہ ممکن ہے، ان دونوں نظموں کا شمار
بڑی اور بزرگ نظموں میں ممکن نہیں لیکن انکی اچھائی
میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں، پہلی نظم کو
لیجئے اس میں جذبات کی سچائی ہے لیکن جذبات کی
زیادتی، ناموزوں سیلاب نہیں، زیادہ سے زیادہ
چینی نظموں میں شعراء اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہیں

اس خداوند کا خیال آتے ہی میں ٹھنڈی سانس بھرتا ہوں
میرے دل کو غم کا بھاری پتھر دبائے دیتا ہے

میں نے کہا کہ اس نظم میں سچائی ہے، جذبات
کی سچائی ہے اور ساتھ ساتھ حسین اور رنگین اور
چمکتی ہوئی تصویریں بھی ہیں، یہ تصویریں چھوٹی موٹی
سی ہیں لیکن ان میں ایسی حسن کاری ہے کہ یہ نظر
کے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں، اور یہ تصویریں ٹھوس
قسم کی ہیں مبہم نہیں، اور ایک دوسرے سے مختلف

اپنے چھاؤ کوٹ کو شفق کے درخت کے پھولوں سے سجاتا ہے

یا

ایک رتھ میں جسے اژدہے کھینچے ہیں شاہانہ کپڑے پہنے ہوئے
وہ اپنے آکاش کے بے پایاں میدانوں میں سیر کرتا ہے

یا

اس محل کی چمک سے چاند و سورج کی چمک ماند پڑ جاتی ہے

چینی شاعری میں اکثر مطالب مشکل ہوتے ہیں،
لیکن نقوش (امیجری) مشکل نہیں، سیدھے سادے
صاف و شفاف، رنگ بھرے ہوتے ہیں، جو مثالیں
اوپر پیش کی گئیں ہیں انہیں ترتیب اور رنگینی،
سادگی اور صفائی اور چمکیلا پن ہے۔

دوسری نظم کچھ زیادہ اچھی ہے "پہاڑوں کی دیوی"
میں جذبات کی سچائی ہے اور ان میں لطافت زیادہ
ہے، احساسات جو پوری نظم میں رچے ہوئے ہیں،
ان میں ایک نفاست ہے ایک حجابی کیفیت ہے،
لیکن یہ حجاب موجوں کے تھپیڑوں سے بھی نہیں ہٹتا
اور یہ نفاست اور نزاکت، یہ کیفیت چینی نظموں
سے باہر نہیں ملتی،

ہاں تو "پہاڑوں کی دیوی" میں سچائی ہے، لطافت
ہے، اور اس کی سچائی اور لطافت سے نقوش میں
احساس کی تیزی اور گرمی آجاتی ہے، یہ یہاں پر
نقوش کی کمی نہیں، فراوانی ہے، گرتے نے شیکسپیئر
کے بارے میں کہا تھا کہ ہر لفظ ایک تصویر ہے، یہی
بات اس نظم پر بھی چسپاں ہوتی ہے، کہہ سکتے ہیں
کہ یہ بات شیکسپیئر کی نظموں سے بھی کچھ زیادہ چینی
شاعری پر چسپاں ہوتی ہے،

یہاں ساری نظم میں احساس غم رچا ہوا ہے
اور براہ راست یا بالواسطہ یہ اپنی جھلک بھی دکھاتا
ہے، میں کیسے غم غلط کر سکتا ہوں، واپسی کے خیال
سے دل محزون ہو جاتا ہے، میں پہاڑ کی چوٹی پر
اکیلے ستون کی طرح کھڑا ہوں،

رعد گرجتا ہے، بارش کی بوچھار زمین کو تاریک بناتی
ہے لیکن یہ غم کا احساس ٹریجڈی نہیں بن پاتا،
ہر لفظ ایک تصویر ہے، رینگتی ہوئی انجیر،
عشق بیچاں، سرخ پلنگ، دھاری دار لومڑی،
میگنولیا اور کدّز، ازیلیا، تاریک بن، ڈھلوان رستہ،
ستون منڈلاتے اور تیرتے ہوئے بادل، دھندلا دھندلا
دن، پوربی ہوا کا طیش، پانی کا برسنا، لارک، سپرہ
سنگستانی چٹانیں، گھنی انگور کی بیلیں، ایلینیا
کا تاج، پہاڑی جھرنے، سرو و صنوبر کے سائے،
رعد کی گرج، بارش کی بوچھار، بندروں کا چیخنا
چلانا، ہوا کا سنسنانا اور پتوں سے سرگوشیاں کرنا،
دیکھئے! کتنے اور کیسے نقوش ہیں اور یہ سارے
کے سارے نیچر کی بوقلمونی پر شاہد ہیں، یعنی شاعر کی
کی آنکھیں نیچر کے حسن، نیچر کی رنگینی سے بھرپور تھیں
شاید وہ بھی غالب کی طرح سمجھتے تھے!

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
آنکھ کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

چو یوآن کو ذوق تماشا تھا، اس کی آنکھیں بھی ہر
رنگ میں وا تھیں، کم سے کم نیچر کے ہر رنگ سے
واقف تھیں، اور یہ نقوش اس بات کا ثبوت ہیں
ہر لفظ ایک تصویر ہے، یہ تصویر چھوٹی موٹی
ہو، تصویر چھپ ہو یا بڑے کینوس پر بنائی گئی ہو دونوں
صورتوں میں برابر صاف و شفاف اور حسین ہے
سرخ پلنگ پر سوار جس کے پیش پیش دھاری دار لومڑیاں
میگنولیا کے رتھ میں جس میں تیز پات کے جھنڈے لگے
ہوئے ہیں،
اور کدّز میں ملبوس ازیلیا کا کمربند باندھے
میں اپنے محبوب کیلئے میٹھے میٹھے پھول توڑ رہی ہوں
ہر لفظ مصوّر ہے، یہ کامیاب لفظی تصویر ہے
اور یہ تصویر کینوس پر بھی بنائی جا سکتی ہے، یہ کچھ
[illegible] مبالغہ نہیں کہ پہاڑوں کی دیوی میں ہر بند

ایک اچھی، بولتی ہوئی تصویر ہے اور ان لفظی تصویروں
کو کوئی مصوّر آسانی کے ساتھ کینوس پر کھینچ سکتا ہے
لیکن شاید اسکی ضرورت نہیں، یہاں الفاظ صورت
گری میں برش اور رنگ سے کچھ زیادہ ہی کامیاب ہیں،
۲ - ٹاؤ یوآن منگ (۳۶۵-۴۲۷ء) اس شاعر کی
شخصیت اپنی آپ مثال ہے اور یہ شخصیت اس کی
شاعری اور ممتاز شاعروں سے مختلف ہے، نظم و نثر
میں اس کی شخصیت ابلی پڑتی ہے اور شاید اپنی
شاعری کے مختلف پہلوؤں پر وہ اپنا آپ نقاد ہے
وہ کہتا ہے،

"پانچ بیدوں والا عالم مجھے معلوم نہیں کہ کہاں
کا رہنے والا ہے اور کسی کو اس کا نام اور خاندانی نام
معلوم نہیں، اس کا گھر پانچ بیدوں کے پاس ہے،
اسی لئے اسے پانچ بیدوں کا عالم کہا جاتا ہے، وہ چپ
چاپ قسم کا ہے بلکہ بہت ہی کم گو ہے، اسے دولت
اور شہرت کی خواہش نہیں، وہ کتابوں سے دل بہلاتا
مگر اتنا نہیں کہ ان کی پوری پوری تشریح کی تکلیف
اٹھائے، لیکن اگر اسے کوئی ایسا ٹکڑا مل جاتا جس سے
وہ خوش ہوتا تو وہ خوشی میں کھانے کی پرواہ نہ کرتا،
اسے شراب بہت پسند تھی لیکن کبھی عسرت کا
یہ عالم ہوتا کہ وہ شراب خرید نہ سکتا، اس کے دوست
اس بات سے واقف تھے اس لئے وہ برابر اسے شراب
کی دعوت دیتے، وہ ہمیشہ اپنا پیالہ خالی کرتا اور مصمم
ارادہ رکھتا کہ اور کچھ ہو نہ ہو وہ نشہ میں ہو جائے،
جب نشہ تیز ہو جاتا تو اٹھ جاتا اور اسے اس کی فکر نہ
ہوتی، کہ وہ کہاں اپنے کو پاتا ہے، اس کے گھر کی چاروں
دیواریں تنگی اور شکستہ ہیں اور اسے ہوا اور دھوپ
سے نہیں بچاتیں، ایک چھوٹا سن کے کپڑے کا جیکٹ
پہنے ہوئے، اور وہ بھی پھٹا ہوا، اور ایک خالی چاول
کا کاسہ لئے ہوئے وہ قانع ہے،
کبھی کبھی نظمیں لکھ کر وہ اپنا دل خوش کرتا

ہے، دنیاوی کامیابی اور ناکامیابی سے اسے کوئی
دلچسپی نہیں، اس کی تمنا اس کی نظموں میں چھپی
ہے، اور یوں اس کی زندگی اپنی انتہا کی طرف بڑھتی
ہے!

وہ نوجوانی کے زمانے سے سرکش اور ضدی
ایک نرم دل بوڑھے آدمی نے اس کو یہ تلقین کی: اپنے
پاؤں کو کیچڑ میں پھنسنے نہ دو، لیکن اس نے اس طرف
دھیان نہ دیا، وہ کیسے اپنی خودی سے انکار کر سکتا تھا
اس کا رستہ تو بن چکا تھا، وہ اسے کیسے بدل سکتا۔
اسے کھانے اور کپڑے کی کمی تھی، اس کی زندگی تلخ تھی
لیکن اس کا چہرہ ہمیشہ تازہ دکھائی دیتا تھا، وہ ہل
لے کر خوشی سے اپنا کام کرتا اور دوسرے کسانوں کو
پکارتا، دور دور سے ہوائیں کھلے ہوئے کھیتوں سے
گذرتیں، نیا دھان تازہ ہو جاتا،.... شام
کے وقت وہ کسانوں کے ساتھ ہنسی خوشی لوٹتا،
اس کے گھر میں ایک مہمان ہے، مہمان اور میزبان
دو قماش کے ہیں، ایک نشہ میں چور اور ہوشیار،
رواج اور آداب کی تقلید حماقت ہے، سربلند ہو،
کسی چیز سے ملوث نہ ہو، پھر تمہیں دانائی ملے گی،
مظاہرات اپنے مامور کئے ہوئے رستے پر چلتے ہیں، لیکن
روح کا مسکن سکون ہے، میری شخصیت مثبت
اور محکم ہے، چیدا یا تھو بھی ایسا سخت نہیں ہیں
زریں عہد کی یاد کرتا ہوں جب کھیت کی پیداوار
چوری نہ جاتی تھی، جب لوگ اپنا اپنا پیٹ بغیر کسی
تردد کے بھر لیتے تھے، صبح کو اٹھتے اور شام کو سونے
کے لئے لوٹ آتے تھے، لیکن میں اس عہد میں نہیں رہ
سکتا، میں اپنے باغ کو سنوارنا بہتر سمجھتا ہوں، جو آیا
ہے اسے جانا بھی ہے، قسمت کا بھی اٹل فیصلہ ہے،
اپنی تقدیر کا آخر تک ساتھ دو، کھیتوں کا سہارا لیکر
لیٹنا ہماری اندرونی تکمیل کو نقصان نہیں پہنچا
سکتا، بدلنے والا دھان اچھا ہو یا برا، قسمت [illegible]

پھر ہماری آزادی کو مس نہیں کرسکتا۔

ایک نظم ہے "دیہات کو واپسی" وہ کہتا ہے جب میں نوجوان تھا مجھے دنیاوی کاموں سے دلچسپی نہ تھی، اور میں پہاڑوں کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ پہاڑوں سے محبت کرنے لگا غلطی سے میں دنیا کے پھندوں میں جا پھنسا اور وہاں میں نے تیس برس ضائع کئے، گرفتار چڑیا قدیم جنگلوں کی تمنا کرتی ہے کنارے پر رہنے والی مچھلی اپنے پہلے پانی کی تمنا کرتی ہے، کسان کی طرح میں بھی اپنی کھیتوں کی طرف لوٹتا ہوں، میرے پاس دس ہتر سے زیادہ زمین نہیں . . . . . دور جھونپڑے دکھائی دیتے ہیں، اور ان کے چھتوں سے ہلکا ہلکا دھواں دکھائی دیتا ہے، کتے گہری گلیوں میں بھونکتے ہیں، مرغے شہتوت کی جھاڑیوں کے اوپر بیٹھے بانگ دیتے ہیں، گھر کے اندر مجھے کوئی آواز تکلیف نہیں پہنچاتی . . . . . انسا کا ردھا دیہات میں نہیں ملتے غریب تنہا گلیوں میں پہیوں کی آواز نہیں . . . دن بدن شہتوت اور سن بڑھتے ہیں، اور روز ہمارے کھیت میں ترقی ہوتی ہے، لیکن میں ہمیشہ برف و باراں اور پالے کی آمد سے ڈرتا ہوں، جب سب ویران ہو جاتا ہے اور گھنی جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں،

اس خلاصہ سے تاؤ یوآن مِنگ کی شخصیت اور اس کی شاعری کے اہم عناصر پر روشنی پڑتی ہے، اسے دنیاوی کاموں سے دلچسپی نہ تھی لیکن اسے تیس سال اس پھندے میں پھنسنا پڑا۔ وہ پہاڑوں یعنی نیچر کا پجاری تھا، اسے رد پھول، اور رکازہ، اور شعرو شاعری داؤدی سے خاص شغف تھا، ہاں تو وہ نیچر کا پجاری تھا، لیکن ! نیچر کی پیچیدگی اور روایتی چیزوں کی طرف وہ توجہ نہیں کرتا، دوسرے شعراء کے مقابلے میں وہ دھرتی سے زیادہ نزدیک ہے، اسے دیہاتی زندگی پسند تھی، جہاں وہ نیچر کی روح سے قریب تھا، اور جہاں نیچر اپنی سادگی کے روپ میں دکھائی دیتا ہے، اس نے دنیا کو نہ سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی، اس کا فلسفہ اس کو موت سے بچا نہ سکا، وہ اپنے باغ کو سنوارتا ہے، وائیشر نے کہا تھا۔

اور اس کام میں سنجیدگی سے منہمک ہے، لیکن کبھی کبھار اس کی سنجیدگی کو ایک دھکا سا لگتا ہے، اور اس کا چین، اس کا اطمینان، بے چینی، اور بے اطمینانی میں تبدیل ہو جاتا ہے، جب سخت سردی ختم ہوتی ہے اور وہ اپنے سوتی گاؤن میں دھوپ کی تلاش میں باہر نکلتا ہے اور دکھنی باغیچہ کو تنہا دیکھتا ہے . . . . . . ایک پتے کا بھی پتہ نہیں دور اشتری باغ میں بکھری ہوئی شاخوں کا ڈھیر دیکھتا ہے . . . . . اور بے اطمینانی محسوس کرتا ہے اور اپنے آپ پر تلخ سرزنش کرتا ہے، تو وہ یہ کہہ کر اپنی تشفی کرتا ہے، میری زندگی اس کوفت سے واقف نہیں جو کنفیوشس نے برداشت کی تھی، مجھے یاد رکھنا چاہئے اور اس یاد سے سکون حاصل کرنا چاہئے کہ قدیم عارفوں نے بھی اس قسم کی پژمردگی برداشت کی تھی،

اب میں تاؤ یوآن مِنگ کی ایک نظم کا ترجمہ پیش کرتا ہوں؛

"اپنے لئے ایک الیجی"

جہاں زندگی ہے وہاں موت کا ہونا بھی ضروری ہے
جلد مر جانا۔ یہ بھی شاید مختصر زندگی کا ہو
کل شب تک ہم انسان تھے
اور آج ہم مردوں کے زمرے میں داخل ہوتے ہیں
ہماری روحیں کہاں جا رہی ہیں؟
وہ کیا ہمارے مرجھائے ہوئے جسموں سے اب
بھی وابستہ ہیں؟
میرے پیارے لڑکے اپنے باپ کیلئے روئینگے
اور کچھ اچھے دوست میرے مردہ جسم کو آنسوؤں
سے پیار کریں گے،

اور رہا میں تو میں مجھ میں کچھ حس باقی نہ رہیگی
حق اور ناحق میں کوئی فرق نہ رہیگا
جب ایک ہزار سال گذر چکے ہوں گے
تو کوئی آجکی عظمت اور انکساری کو یاد نہ کریگا
ابھی جو میں اس دنیا میں ہوں
مجھے صرف ایک افسوس ہے کہ میں مسرت کیطرح
شراب نہ پی سکا،

جو میں زندگی میں نہ پی سکا
وہ مجھے موت کے بعد نہ ملے گی
چونٹیوں کو صرف بہار میں پر نکلتے ہیں
آیئے ہم لوگ زندگی کا لطف اٹھائیں جبتک وقت ہے
موقعہ ہاتھ سے نکل جائیگا جب لوگ میری بالیں
پر روتے ہوں گے،
جب میری آنکھیں دیکھ نہ پائیں گی اور میں
زمین کے اندر رہوں گا
اس روز جب مجھے صبح کو بڑے کمرے میں لٹاکر
رات کو میں پہلی بار ویرانے میں سوؤں گا
لمبی لمبی گھاس میری قبر پر لہرائے گی
ہوا سایہ دار پوپلر میں کراہتی ہوگی
خزاں سفید پالا زمین کو ڈھانک دے گا
گھوڑے میرے چاروں طرف چرتے و ہنہناتے ہونگے
اس چھوٹے سے زمین دوز کمرے میں، تنہا
میں ہزاروں سال گرفتار رہوں گا
ہزاروں سال روشنی سے محروم
ایک ہزار سال بول چال سے محروم

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

ادب آشوب

یہ جدّت، قدامت، ترقی پسندی
ہے تو دوروں کی اُردو میں اب پارٹی بندی
وطیرے مغلظ، زبانیں بھی گندی
یہ گلیوں میں پھرتے ہیں چاقو نکالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

یہ کرسی کا جھگڑا، یہ پیسے کا چکر
یہ خونخوار حربے، یہ تکرار فکر
ہیں لالچ کے مرغے، نہ بیٹھیں گے تھک کر
یہ اک دوسرے سے نہیں دبنے والے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

ہے اُردو زباں اِن کے ہاتھوں میں کاسہ
جسے جتنا حاصل وہ اتنا ہی پیاسا
کہاں تک حکومت انھیں دے دلاسا
یہ گنتے ہیں اک دوسرے کے نوالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

یہ سب اپنے مالک کے پنجرے کے مٹھو
یہ اپنوں کے بیری، یہ باہر کے پٹھو
مزا یہ کہ سب ان کے دیسی ہیں ٹٹو
ادب میں جو کرتے ہیں پیدا رسالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

ہر اک گھاٹ پر ان کی ہے جی حضوری
حقیقت پہ پردے، صداقت ادھوری
انھیں چاہئے اپنی خوراک پوری
یہ ہر جائے بھرتے ہیں اپنے ہی پیالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

عجب ہے یہ ان سب گروہوں پر آن بن
جو اک دوست تو دوسرا آپ دشمن
بچے کوئی ان سے، تو سب اُس سے بدظن
جو پوچھو تو کرتے ہیں حیلے حوالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

جو اک کی کہو دوسرا ٹانگ کھینچے
کہو دوسرے کی تو وہ دانت پیسے
اگر چپ رہو تو کوئی ہاتھ بھینچے
کہ کیا کر رہے ہیں غرغوں یہ سالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

یہ سیاست کی شطرنج کے سب کھلاڑی
ذرا ان کو مل جائے افسر اناڑی
تو پھر دیکھو ان کی اکھاڑ پچھاڑی
کہ رہ جائیں دنگ علم و تہذیب والے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

یہ اک دوسرے کے لئے گو ہیں پاجی
مگر لوٹ کے مال میں سب ہیں ساجی
دلائیں کلرکوں کو یہ دال بھاجی
اُڑائیں مگر خود یہ سب تر نوالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

ہے کالج میں ان کی عجب کج کلاہی
نیا لیکچرر وہ جوان کا سپاہی
ہے انصاف کیا اور ہے کیا داد خواہی
وہ منظور ان کو جو گردن جھکالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

یہ رکھتے ہیں پاس اپنے کتے شکاری
یہ حربوں سے اپنے ہیں غنڈوں پہ بھاری
سلکشن کمیٹی میں یہ سب مداری
دکھاتے ہیں اک اک کو کرتب نرالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

یہ مٹھو میاں اپنے زور بیاں میں
سمجھتے ہیں خود کو معزز جہاں میں
مگر تفرقہ کہہ گیا درمیاں میں
یہ لگلا بھگت سب کے ہیں دیکھے بھالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

ہوا درس گاہوں کا اب حال ابتر
ہیں شاگرد بے چارے حیران و ششدر
بنیں کس کے حامی، رہیں کس سے بچ کر
یہ اُستاد ہیں بحث و تکرار والے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

ہے تفرقہ و تقسیم وہ کیمپس میں
نہیں ضابطہ اب کسی کے بھی بس میں
پھنسے ہیں جو شاگرد ان کی ہوس میں
دعا کر رہے ہیں خدایا بچالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

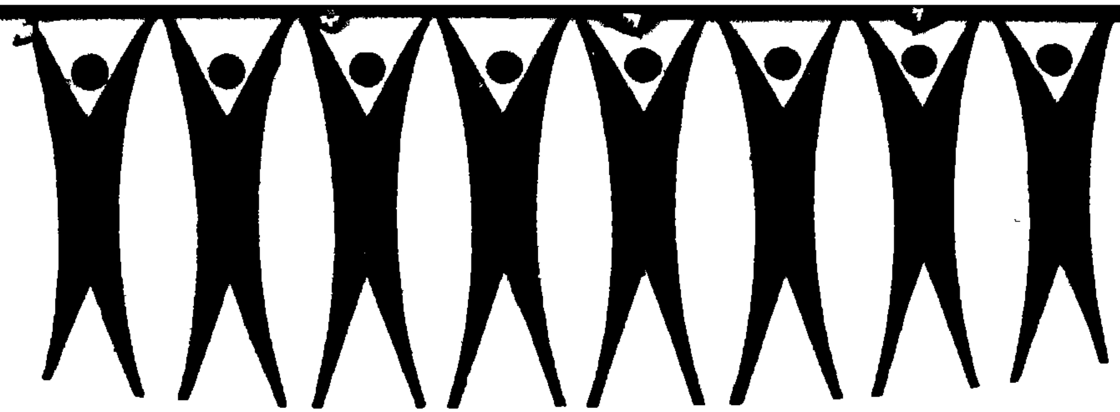
لگاتے ہیں یہ امتحانوں کے نمبر
یہ ہیں نوکری کے اداروں کے ممبر

یہ بھارت کی سرکار کے خاص رہبر
ہیں مٹھی میں عہدے زبانوں پہ تالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

ہے پروفیسری اب تجارت سے بڑھ کر
یہ محنت کریں درس دینے میں کیوں کر
ہے اصلی کمائی تو کالج کے باہر
کہ اُردو ادارے ہیں ان کے حوالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

کسی نے کہیں شاعروں کو ہے گھیرا
کسی کا کسی انجمن میں بسیرا
بہت سوں نے قبروں پہ ڈالا ہے ڈیرا
پڑیں کیوں نہ اب درس گاہوں میں تالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

ہے کالج کے لڑکوں کو اب یہ شکایت
پڑھیں کس سے اُستاد ہیں غرقِ سیاست
انھیں ملک و ملت نہ اُردو سے رغبت
کوئی کام کس طرح اُن سے بھلا لے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے



ان تمام طاقتوں سے ہوشیار رہیں گے
جو ہمیں کمزور کرنا چاہتی ہیں

موجودہ اور آئندہ

چنوتیوں

کا مقابلہ کرنے کو مستعد رہیں گے

83/369

پاؤں پھر بھاری ہوگیا!

فکر نہ کرو
اپنا حمل گِروادو



حمل گِروانا قانونی طور پر جائز ہے۔

حمل گِروانے کی سہولیات

تمام سرکاری اسپتالوں میں
بلا معاوضہ دستیاب ہیں۔

پہلے چھ ہفتوں میں
حمل گِروانا آسان اور محفوظ ہے



دو بچے کافی ہیں
تیسرے کی آمد روکئے

بار بار حمل گِروانا صحت کے لئے خراب ہے۔
خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مناسب طریقہ اپنائیے۔

نفسیاتِ کلیم

ڈاکٹر سید محمد محسن

آدمی حیوان ناطق ہے اس کا نطق اسے دوسرے حیوانات سے ممیز کرتا ہے۔ لیکن اس کا نطق ہی اسے ایک اور حیوانات ہونے کا ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔ حیوانات غیر حیوانات سے اپنے اعضا کے آزادانہ استعمال کی بنا پر ہی مختلف نظر آتے ہیں۔ آدمی کے سارے دوسرے اعضا کی مناسبت سے اس کے لب، اس کی زبان اور اس کے کام و دہن سب سے زیادہ متحرک ہیں اور انھیں کی کارکردگی اسے حیوان ناطق ثابت کرتی ہے۔ اگر آدمی کی تعریف محض اس کے نطق کے اعتبار سے کی جائے تو وہ حیوانات کے زمرہ سے باہر نہیں جاتا۔

کلیم الدین نہ آدمی ہیں نہ حیوان، آپ جب پہلی بار ان کے روبرو ہوں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک بے جان پتلا آپ کے مقابل کرسی پر بٹھا دیا گیا ہے جس کے اندر کچھ ایسے کل پرزے کام کر رہے ہیں کہ اس کے سر میں تھوڑی تھوڑی دیر پر سپاٹی انداز سے جنبش ہو جاتی ہے اور لبوں پر کچھ ایسی شکنیں نمودار ہو جاتی ہیں جن سے مسکراہٹ کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ آدمی کی تعریف میں اس کی بے پایاں فکر و نظر، تجسس و تعقل کی صلاحیتوں کو نمایاں حیثیت دیں گے تو کلیم الدین کو آپ محض آدمی تصور کریں گے اور حیوان کے دائرے سے انھیں خارج کرنا پڑے گا۔

کلیم الدین کی مقبولیت کا راز ان کی مثبت خاموشی میں بڑی حد تک پوشیدہ ہے وہ خود نہایت کم آمیز ہی نہیں بلکہ نا آمیز ہیں۔ شاید کسی نے انھیں اپنے پاؤں کے سہارے چلتے ہوئے ان کے گھر سے باہر نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ کسی کے یہاں اپنی خواہش سے نہیں جاتے لیکن خود ان کے یہاں دوسرے لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ آپ جب بھی ان کے گھر جائیں گے آپ جیسے دو چار ان کے گرد موجود ہوں گے۔ ان سے ملاقات کے لئے وقت لے رکھنے کی کوئی قید نہیں ہے ایک تو اس لئے کہ وہ گھر پر ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ جب دفتر کا سلسلہ تھا اس وقت بھی دفتر کے اوقات کے علاوہ وہ گھر کے اندر ہی پائے جاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ کسی نووارد کو بھی وہ یہ نہیں کہلاتے کہ اس وقت مل نہیں سکتے یا فرصت نہیں ہے جو انھیں نزدیک سے نہیں جانتا وہ یہ سمجھیگا کہ ملنے ملانے کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا کام نہیں ہے لیکن بار آور PRODUCTIVE کاموں میں ان سے زیادہ وقت لگانے والا شاید آپ کو کوئی مشکل سے ملیگا۔ دوسری محیر العقول باتوں کے علاوہ کلیم الدین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک طرف ان کے پاس ہر شخص سے وقت بے وقت ملنے کی فرصت ہے تو دوسری طرف اردو کے سارے داستان گو شاعر اور دوسری صنف کے ادیب و ناقد کی پوری پوری تصانیف کا بالتفصیل مطالعہ اور پھر اپنے تیز خرام اور بے باک قلم سے پے بہ پے ان پر تبصرہ و تنقید پیش کرنے کے لئے بھی ان کے پاس کافی وقت ہے ایک ضرب المثل ہے کہ وقت اور مد و جزر کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ اس کی صداقت کا ثبوت دوسروں کی کامیاب یا ناکام زندگی میں روز پیش ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کلیم الدین کی زندگی میں یہ روز جھٹلایا جاتا ہے۔ جیسے ان کے ہاتھ وقت کو کھینچ کر جتنا بھی چاہیں طویل بنانے پر قادر ہیں۔ اور مد و جزر تو ان کی پُر سکوت و پُر سکون شخصیت کے سامنے کبھی سر نکالنے ہی نہیں پاتا اس لئے اس کے بڑھنے یا نہیں بڑھنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

آپ کہیں گے کہ جب کلیم الدین عام طور پر اپنی زبان سے کام نہیں لیتے تو پھر لوگ ان کے گرد جمع کس لئے ہوتے ہیں؟ عام آدمی حیوان ناطق ہے اور عام آدمی کے لئے اپنے نطق کا بے روک استعمال تسکین یا آسودگی بخش ہے۔ چنانچہ ہر شخص کو کسی ایسے آدمی کی تلاش رہتی ہے جو اس کی سنے اور سنے ہی نہیں بلکہ اپنی کم کہے اور پھر سننے بھی تو اس انداز سے سنے کہ جیسے سننے والے نے بولنے والے کے لئے جتنی توجہ مرحمت فرمائی کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی ہو۔ ایسی صورت میں کلیم الدین سے بہتر اور برتر سننے والا کسی کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے؟ سنے جا رہے ہیں مخل کبھی نہیں ہوتے اور تھوڑی تھوڑی دیر پر سر اور گردن کچھ اس انداز سے ہل جاتی ہے اور چہرہ پر غائت توجہ اور دلچسپی کا اظہار کچھ اس طور سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ بولنے والے کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

ایک پیشہ ورانہ ماہر نفسیات کے لئے خوش اور غائت صبر و سکون کے ساتھ سننے کی صلاحیت دوسری خصوصی سماعتوں سے سب سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس فن کے اکتساب کے لئے اسے باضابطہ مشق و ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اسی فن کے سہارے معالج مریض کو اس بات کا پورا موقع دے سکتا ہے کہ وہ اپنے دل کے سارے راز بے کم و کاست اس کے سامنے کھول کر رکھ دے۔ چنانچہ زیادہ بولنے والا ماہر نفسیات محض اُستاد بن سکتا ہے۔ لیکن نفسیاتی علاج میں پیشہ ورانہ کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔ نفسیاتی مریض میں سب سے زیادہ عزت نفس کی مجروحی کا شکار ہوتا ہے۔ اس کی مہمل سے مہمل گفتگو کو بے روک توجہ کے ساتھ سن لئے جانے میں اسے اپنی قدر افزائی کا ثبوت ملتا ہے جس صلاحیت کو ایک ماہر نفسیات لمبی مشق اور تجربے کے بعد حاصل کرتا ہے۔ قدرت نے کلیم الدین کو فطری طور پر ودیعت کر دی ہے۔

کلیم الدین کی بے زبانی کا سبب ان کی قوتِ گویائی کا فقدان نہیں ہے وہ ہی کلیم الدین جن کے لبوں پر محفلوں کے اندر قفل پڑا ہوتا ہے جب انگریزی کے اُستاد کی حیثیت سے کلاس میں جلوہ افروز ہوا کرتے تھے تو اس منصب سے جس کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے تھے اس کی مثال میں ان کے ہم عصروں کے اندر صرف فضل الرحمٰن مرحوم کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے بعد آج تک

انگریزی کا کوئی پروفیسر بحر علم اور قوت اظہار و بیان سے اپنے شاگردوں کو اس حد تک متاثر و مسحور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں ان کا ہم عصر ہونے کی وجہ سے ان کا شاگرد تو نہ بن سکا لیکن ان کے بیسیوں شاگردوں سے ان کی عدیم المثال استادانہ صلاحیتوں کی تعریف سن چکا ہوں۔

میرے ایک ذرا منہ پھٹ دوست اچھے غزل گو شاعر کی حیثیت سے شعر و سخن کی محفلوں میں داد تحسین سے کافی نوازے جاتے ہیں۔ جب بھی ایسی محفل میں جہاں کلیم الدین بھی موجود ہوتے ہیں وہ غزل پیش کرنے لگتے ہیں تو اپنے اچھے سے اچھے اشعار پر بھی کلیم الدین کے منہ سے واہ واہ کی ایک مدھم سی آواز بھی نہ سن کر بڑی پسپائی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک بار جب ایسے ہی موقع پر حاضرین نے ان سے دوسری غزل عنایت کرنے کی فرمائش کی تو جھلا کر کہنے لگے، "غزل کیا خاک سناؤں کلیم صاحب سامنے بیٹھے ہیں لیکن میرے ایک شعر پر بھی تو انھوں نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔"

کلیم الدین کی کم سخنی سے سننے کی صلاحیت نے جہاں ان کی شخصیت کو مقبول و پسندیدہ بنا دیا ہے۔ وہاں یہ ان کی وسیع معلومات کا ایک نادر وسیلہ بھی بن گئی ہے۔ ارد گرد کے واقعات، اپنے شناساؤں کے باہمی تعلقات، ان کی آپس کی نوک جھونک، رفیقانہ اور حریفانہ سرگرمیاں، ان ساری باتوں کی واقفیت جتنی کلیم الدین کو رہتی ہے۔ شہر کی کسی دوسری ممتاز شخصیت کو حاصل نہیں ہے۔ وجہ یہی ہے کہ ان سے گفتگو کرنے والا کبھی احتیاط سے کام نہیں لیتا۔ ان کی مشتاق نگاہیں اور ان کا ہمہ تن گوش بر آواز نہ ہونا بولنے والے کے اندر کی ساری گرہوں کو کچھ اس طرح کھول دیتا ہے کہ وہ ان کے سامنے اپنا کوئی راز راز نہیں رہنے دیتا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس سے کہی ہوئی باتیں وہ اپنی بے زبانی کی وجہ سے کسی دوسرے تک پہنچائیں گے بھی نہیں۔ چنانچہ ہر شخص کے بارے میں اور اس کی وساطت سے دوسروں کے بارے میں اچھا اور برا جتنا وہ جان لیتے ہیں کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔

کلیم الدین کی اس بے پایاں واقفیت کا ثبوت آپ کبھی براہ راست حاصل نہ کر سکیں گے۔ البتہ ان کے دو ایک منہ لگے شاگرد یا گنے چنے دیرینہ آشنا آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ جن کی موجودگی میں ان کی زبان کا قفل ٹوٹ جاتا ہے اور اس وقت وہ بولتے زیادہ اور سنتے کم ہیں۔ ان خوش نصیبوں کی تعداد کسی صورت میں آٹھ دس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ حالانکہ ان سے شرف ملاقات رکھنے والوں کی تعداد ان گنت ہے۔ آپ نے شاید کیکٹس کا پھول نہیں دیکھا ہوگا۔ کیکٹس کب پھولے گا اور کتنی دیر کے لئے پھولے گا کوئی نہیں جانتا۔ آپ کی طرح کتنے لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے کیکٹس کا پھول دیکھا ہی نہیں ہوگا۔ یہی حال کلیم الدین کی گلفشانی کا ہے۔

کلیم الدین کی ناآمیزی اور بے زبانی کے سلسلے میں ان کی طالب علمی کی زندگی کے چند واقعات یاد آگئے۔ میرے والد مرحوم کی کلیم الدین کے والد ڈاکٹر عظیم الدین مرحوم سے ننھیالی برادری تھی۔ ہم سب بھائی عید بقرعید کے موقع پر والد کے ننھیالی برادری والوں سے ملاقات کی غرض سے صادق پور جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر عظیم مرحوم کے یہاں جاتے تو ان کے بڑے صاحبزادے علیم الدین مرحوم اور ان کے داماد سے ضرور ملاقات ہوتی۔ لیکن کلیم الدین کو میں نے پہلے پہل اس وقت دیکھا جب میں ان کے ہم عصر طالب علم کی حیثیت سے پٹنہ کالج میں داخل ہوا۔ وہ کالج میں مجھ سے دو کلاس اوپر تھے۔ والد مرحوم نے جب بھی ڈاکٹر عظیم مرحوم سے کلیم الدین کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے یہی جواب دیا کہ "وہ کمرے کے اندر چارپائی پر کوئی کتاب پڑھ رہا ہوگا۔" پلنگ اور کتاب سے کلیم الدین کا رشتہ عہد طفولیت سے لے کر آج تک باقی ہے۔ انھوں نے اپنی ساری تصانیف پلنگ پر ہی مرتب کی ہے۔ جب کالج میں داخل ہوئے تو یا تو وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ساتھ ان کی بگھی گاڑی میں پٹنہ سیٹی سے پٹنہ کالج آیا کرتے یا بس پر۔ آتے وقت انھیں بس کے کرایہ کی رقم دے دی جاتی۔ اگر اتفاق سے کبھی ریزگاری نہ ہونے کی وجہ سے پورا روپیہ ان کے حوالے کر دیا جاتا تو وہ بس کے کنڈکٹر کے ہاتھ میں روپیہ دے کر کچھ دیر انتظار کرتے۔ اگر کنڈکٹر ریزگاری انھیں واپس کر دیتا تو خیر۔ ورنہ وہ ایک وقفہ کے بعد بس سے اتر کر کالج کے گیٹ میں داخل ہو جاتے۔

ایک بار میں اور میرے دو اور ساتھی پٹنہ کالج لائبریری کے ریڈنگ روم میں داخل ہوئے تو کلیم الدین اپنے گرد پانچ چھ کتابیں رکھے ان میں سے ایک کے مطالعہ میں مستغرق تھے۔ ان کی بے زبانی سے ہم سب واقف تھے۔ میرے ایک ساتھی نے اس کی مزید تصدیق کے لئے ان کے سامنے سے وہ کتاب ہٹا دی جو وہ پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے دوسری کتاب کھول لی۔ پھر وہ بھی ہٹا دی گئی۔ تو تیسری کھل گئی اور اسی طرح چوتھی۔ کلیم الدین کی اس معصومیت نے ہم تینوں کو اس درجہ شرمندہ کیا کہ ہم منہ چھپائے ریڈنگ روم سے باہر نکل آئے۔

کلیم الدین کی شادی کے موقع پر دعوت ولیمہ میں میرے گھر کے سبھی لوگ شریک تھے ان میں مسلم عظیم آبادی بھی تھے جو آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ یہ ڈاکٹر عظیم الدین کے قریبی رشتہ دار ہونے کے علاوہ ان سے بہت بے تکلف بھی تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر عظیم سے سوال کیا کہ کلیم الدین نے دلہن کی طرف التفات کیا یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ شادی کے دوسرے ہی دن دلہن کو بخار آگیا اور انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ تھرمامیٹر کلیم الدین کے حوالے کرکے انھیں تاکید کی کہ ہر چار گھنٹوں پر دلہن کا ٹمپریچر لے کر اس کی نقل رکھیں تاکہ ڈاکٹر کو مرض کی تشخیص میں سہولت ہو۔

پٹنہ کالج کی پرنسپلی سے پہلے کلیم الدین سماجی زندگی سے قطعاً ناآشنا تھے۔ گھر سے کالج آتے کلاس میں لکچر دیتے اور پھر گھر میں واپس جا کر مطالعہ میں غرق ہو جاتے۔ جب پرنسپل ہوئے تو اہل غرض ان کے کوارٹر میں پہنچنے لگے اور جب

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

شوک ٹریٹمنٹ ان کا شیوہ ہے



کلیم الدین احمد
شخصیت اور کارنامہ

تحریر: اسلم عظیم آبادی

تعیّنات نقاد کلیم

اردو شاعری پر ایک نظر (تیسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۶۴ء پہلی جلد ناشر ادارہ فروغ اردو پٹنہ ۴) کے گرد پوش در آخر پشت پر یہ کا نثری تحریر ہے۔

"کلیم الدین احمد ادب اردو میں اچانک آئے اور ان خوش نصیبوں میں شامل کئے گئے جن کی ناموری کا سبب ان کی نکوکاری سے زیادہ بدنامی ہوتا ہے۔"

"یک مالی جو بدنامی کی شہرت عام کے بعد نصیب ہو، اس ناموری سے کم مایہ ہوتی ہے عیب سے لے ملتا ہے جو شہرت کا تقاضا ہے"

"لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"

اردو شاعری پر ایک نظر پہلا ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۴۰ء ناشر عظیم پبلشنگ ہاؤس پٹنہ) میں جو نغمے بر عنوان گیارہ صفحات پر مشتمل، گر مرتب کی وہ جا بجا ناتراشی تنقید موجود نہ ہوتی تو علاوہ کلیم میں یک ذاتی کتاب کے اس نسخہ میں صفحہ ۸ پر یہ عبارت درج ہے۔

"گل نغمہ کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک نئے اور خوشگوار باب کا آغاز ہوتا ہے خصوصاً اس کا پہلا حصہ رقص بسمل خاص اہمیت رکھتا ہے۔"

گل نغمہ ان الفاظ علی عباسی حسینی "نکالی شاعری کا نمونہ ہے" یا یہ بات کسی فروت نقاد کی زبانی بھی معلوم ہوتی۔ پر گل نغمہ کو "ایک نئے خوشگوار باب" کا اضافہ سمجھا میری سمجھ عام کی رسائی میں نہیں آ سکتی ہے۔ جو معروف کرے۔ جب محمد حسین آزاد حالی مدرکی استادی میں نیت ہو گئے تو لائق بیٹے کی سعادت مندی دیدہ ماسے کیسے روپوش رہتی؟ جیب سے سنگین نقاد رہا ہوتا ہے پھر علیم احمد کیوں کہتے جاتے؟

یک سال سے پہلے کلیم الدین احمد کی ناموری پر یہ پہلا گہن لگا اور ابھرا۔

چار برس بعد جب اردو شاعری پر ایک نظر کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۶۵ء شائع ہوا، تو کلیم الدین احمد نے عبارت مندرجہ بالا کو یک جنبش قلم اس سے خارج کر دیا۔ عالم کے اس طور کو۔ رضا و تفویض موصوف سے خود پیدا در عمل اضافہ ہیں اظہار کیا۔

"گل نغمہ کی اشاعت کی پوری ذمہ داری مجھ پر ہے کہ پہلے حصے میں رقص بسمل کی نظمیں میرے خیال میں الگ اہمیت رکھتی ہیں۔"

ورد و تحریری لکڑ فقرہ۔ میرے خیال میں ملاحظہ کیجئے اس میں جو گریز اور تحفظ ہے اس کی بے الحود واد دیجئے۔ قلم سے اپنی کمزوری کا اظہار ایک کا رنگ ہے یہی کلیم الدین احمد کی نکوکاری ہے جو کم ظرفوں کے لئے تازیانہ تھی اور ان کی ناموری کو لیگانہ بنا دیتی ہے۔

الغرض کلیم الدین اردو ادب میں اچانک آئے جیسے دلیر سے اچانک ہو جائے دریا اردو دریا اور پھر اردو شاعری دونوں میں کلیم الدین احمد کا وجود مسعود امر مفاجات ہو کر رہتا ہے۔

سال ۱۹۶۵ء کے ماہ ستمبر میں کلیم الدین احمد کا پہلا شعری مجموعہ "۲۴ نظمیں" سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ صاف ستھرا یہ خوش نما مجموعہ جب سامنے آیا اور ملک کے ادبوں کو ایک حیرت ہوا کلیم الدین اور شاعر؟ جس نے ساری حیرت سے لو تھا مجموعہ دیکھا اور غور سے کھولا۔ ایک سال کی مدت ختم ہی ہوئی تھی کہ پھر وہ اگست ۱۹۶۶ء کے جشن مسرت کے موقع پر کلیم الدین احمد کا دوسرا شعری کارنامہ "۲۵ نظمیں" نمودار ہوا۔ یک نہ شد دو شد، جہاں شک تھا وہاں اب یقین آیا تو شک اور یقین کے مابین جتنے مضحکہ ملول ہو گئے کہ یہ دکی علم ادب پر متحد نقاد بھی ایشیائی منتی بیک سلا ہو گئی وہ اہل قلم جو زمیان شاعری میں شمار ہے ان کے چہروں پر رونق دوڑ گئی جیسے اہل جماعت نے فروہ عالم اسناد کا تعصب بڈھے سے نہ جارحیہ بیگانگی اور حد تعجب کے مشرف با اسلام ہونے کا اعلان کیا

تو کلیم الدین احمد کی شاعری میں آمد محض ایک تاریخی بات ہے۔

ستمبر ۱۹۷۵ء سے پہلے وہ اچھے خاصے نقاد تھے اردو شاعری پر ایک نظر انکا پہلا تنقیدی کارنامہ ہے، جو تہائی صدی پہلے کی بات ہے، کلیم الدین احمد کا یہ قول سنگ شہاب جیسا اردو دنیا میں آگرا تھا، غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے، کلیم الدین کا یہ پہلا کلمۂ بے ادب تھا جو اس زور و شور سے پھیلا کہ آج کے معاشرے میں کسی معروف لیڈر کی بد اعمالیاں بھی اتنی مقبول یا نام نہ ہو سکیں،

کلیم الدین سے پہلے دوسرے پیغمبر ین سخن نے بھی غزل کی نجاست سے ناموسان ادب کو باخبر کر دیا تھا کلیم الدین احمد کی یک نظری مگر غضب ڈھا گئی، غزل تو غزل قصیدہ، ہجو، مثنوی، مرثیہ اور دوسرے شعری سانچے بھی اس یک نظری سے تین تیرہ ہو گئے، وہ تو فیض و فراق کا بھلا ہو، جنھوں نے جلدی سے جام غزل میں شراب نظم بھری اور مخانۂ تغزل کو سوز خوانوں کی نوحہ خوانی سے بال بال بچا لیا،

غزل کو بلحاظ فورم یا مواد ملعون کہنے والے کلیم الدین احمد ہوں یا حامد اللہ افسر یا انکے دیگر ہمنوا، اس پیچ سے کون پھرے کا یہ نجاست ہمارے بزرگوں کی دین ہے، غزل ہماری میراث ہے، غزل ہمارا سرمایہ ہے، غزل سب کچھ ہے، جو غزل کا منکر ہے وہ جذبات کے سرد و گرم اور محسوسات کی نرمی و نزاکت سے انکار کرتا ہے، ایسے بے ہواؤں انسان کو عقل کے ناخن ترشوانے چاہئیں، کہ اس کے مغز میں بھی تاثیر قلب پیدا ہو جائے!

تو صاحب کلیم الدین کے مزاج نقد کی رونمائی اردو شاعری پر ایک نظر سے ہوتی ہے، اس کتاب کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، ان نسخوں کے تقابلی مطالعہ سے مصنف کا باطن جھلکتا ہے، وہ باطن جو انتخار میں انکسار اور بے مروائی میں بیچ دلی کا غماز ہے، کلیم الدین خود و نمائش سے یوں بھاگتے ہیں جیسے مجذوب عقیدتمندوں یا سر یا اردو شاعری کا عاشق اپنے مہربانوں سے،

کلیم الدین کی ناموری کا ایک اہم راز انھیں اپنے کو پیش پیش دکر نیکا زاہدانہ جذبہ ہے، نہفتہ مگہ بیدار، اپنے زمانے کے ایک ہونہار متعلم تھے اور اپنے دور کے ایک نہایت قابل و کامیاب معلم، اس کامرانی کے باوجود جاہ و منصب کی شادمانیاں کلیم الدین کی اردو نوازی کو سرد نہ کر سکیں،

اردو شاعری پر ایک نظر کا پہلا نسخہ ایڈیشن ۱۹۴۳ء از ابتدا تا انتہا دیکھ جائیے، انگریزی حوالے، یا اقتباسات تو درکنار، پوری کتاب میں کسی جگہ ایک انگریزی لفظ بھی نظر نہ آئیگا، اپنے مضمون پر کلیم الدین کو جیسی بصیرت حاصل ہے، مغربی ادب و شاعری، نیز متعلقہ مغربی علوم پر جیسی انکی ذاتی واقفیت ہے، اس کا بشری تقاضہ تھا کہ اس تفخر و تبحر علمی کا جا بجا اظہار کیا جاتا، مگر ایسا نہ ہوا، کتاب شائع ہوئی، مصنف کے خیالات سے اردو دنیا روشناس ہوئی، اعتراضات اور تمسخرات کے در کھل گئے، کھٹا کھٹ، مگر مصنف نے کوئی جواب نہ دیا اسکے سامنے ایک واحد مقصد تھا، اردو کی خدمت، اس جذبے نے اہل زبان کے ہر اہل خرد کو متوجہ کیا، نوائے کلیمی میں تلخی تھی، انداز تخاطب میں جھنجھلاہٹ تھی اور استہزا تھا، مگر مقصد شیخی بگھارنا، یا دوں کی لینا نہ تھا،

اس کتاب کا دوسرا اور پھر تیسرا ایڈیشن چھپا، باتیں بے اثر نہ گئیں، تیسرا ایڈیشن چھپا، اس نسخہ میں مغربی ادب سے جستہ جستہ قابل دید نمونے اور مغربی شاعری کے متعدد تقابلی حوالوں کے اندراج سے نسخہ کی ضخامت دوگنی ہو گئی، اضافہ اور ترمیم کی یہ نمایاں تبدیلیاں سچا سمجھا عمل تھیں، کیا کہتا ہے ؟ کے بعد بارہ برس کی طویل مدت کے بعد اب اس بات کا بھی اظہار روا جب تھا کہ کون کہتا ہے،

کلیم الدین کا دوسرا تنقیدی کارنامہ اردو تنقید پر ایک نظر پہلا ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۴۳ء ناشر کرزاد مبند رو پٹنہ ۴) ہے ماضی و حال کے نیم وحشی شعرا ابھی ابھی عاقبت پر شیون اور اپنی حمیت پر ماتم ہی کر رہے تھے کہ کلیم الدین نے اردو تنقید کی کمر کی طرف نظر اٹھائی، اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔ ۔ ۔ ۔ کلیم الدین کا یہ دوسرا کلمۂ بے ادب تھا جو اردو دنیا میں الم نشرح ثابت ہوا، اردو کا ہر حاضر و غائب بڑا نقاد، کلیم الدین کو نیم حکیم معلوم ہوا، از میر تقی تا حسن عسکری ہر صاحب چشم بینا انھیں تماشا نظر آیا، ترقی پسندوں کی جہاں بینی اور قدامت پرستوں کی خلوت نشینی کچھ کام نہ آئی کوئی بخشا نہ گیا!

اردو دنیا کی اس ہمہ گیر تباہی میں قابل رشک ہیں وہ شعرا، وہ محقق، وہ نقاد، اور کہانی کار جن کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا، خوش بخت ہیں دیار مشرق کے وہ دور افتادہ اہل قلم جنکی قبر تا قیامت سالم ہی دنیائے اردو کے ہر گوشے میں ندائے کلیم سے آگ لگ گئی، پر بہار آتش بار نہ ہوا، آپ جانتے ہیں گھر کو آگ عموماً بلکہ اکثر گھر کے چراغ ہی سے لگتی ہے، شاہ عظیم آبادی، شوق نیموی، شہباز مسلم، جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی جیسے خوش گو شعرا، صفیر بلگرامی، امداد امام اثر، سلیمان ندوی، قاضی عبدالودود اور اختر اورینوی، جیسے صاحب فکر و نظر ناشر، رحمت یک نظری کا مسلم نمونہ ہیں، شکوہ بجا بھی کرے تو لازم ہے شعور، یہ بات بتلانے کی ضرورت نہیں، سمجھے اور سمجھ کر چپ رہنے کی ضرورت ہے کہ کلیم الدین کی دیدہ و دانستہ چشم پوشی غیر کی زبان میں معصیت ہو یا جانب داری، پر اہل بہار کیلئے نقاد کی وطن پرستی ہے، صالح وطن پرستی!

کلیم الدین کا تیسرا کارنامہ "فن داستان گوئی"

پہلا ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۴۳ء) ناشر برقی مشین پریس مراد آباد (پٹنہ) ہے،

شوک ٹریٹمنٹ کلیم الدین کا شیوہ ہے سنسنی خیزی انکے طریقۂ کار کا اہم وصف ہے، مثال کے طور پر اردو دنیا میں جب افسانوں کی قوالی ہو رہی تھی کلیم الدین نے داستانوں کی بھیروی الاپی۔ بے لحاظ فرمایا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ آج اردو میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز مختصر افسانہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ داستانوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا اور افسانوں کی تعریف میں تقریبًا ہر شخص رطب اللسان نظر آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

غور فرمایئے ترقی پسندی کے اس زور قیامت میں جب ادب برائے زندگی اور برائے مقصد کا نظریہ نئی روشن پرست کھلے بازو خاتون کی طرح ہیں۔۔ دعوتِ نظارگی دے رہا تھا، کلیم الدین نے فن داستان گوئی پیش کرکے نئی اور غیر مقبول بات کہہ دی،

ہوشیار ہتک، کالی شلوار، نئی شلوار، لحاف، پھسلن، حرام زادی، جیسے جیتے جاگتے، ملذذ افسانوں کے پیش نظر سرد و بے جان اور بدمزہ، داستانوں کی فضیلت و افادیت کا ذکر خطبۂ نقد میں بیان عذاب قبر کی مثال تھا، بس اسی پر نہیں آپ جانتے ہوں گے کہ ترقی پسندوں کو پیٹ کا خیال دماغ سے زیادہ بے قرار رکھتا ہے کیونکہ شکم دماغ سے زیادہ بڑا ہوتا ہے،

کلیم الدین نے اس لئے ترقی پسندوں کی طبیعت کا پاس رکھتے ہوئے اپنی بات کو ان کے انداز گفتگو کے بموجب یوں قلم بند کیا؛

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ طلسم ہوش ربا معمولی کھانا نہیں ایک عظیم الشان دعوت ہے، شاہانِ جہان کے لائق، یہاں ہر چیز کی افراط ہے کسی شے کی کمی نہیں۔ دیکھا آپ نے؟ کیڑوں کو کیڑوں سے مارتے ہیں! شاہی دعوت کا ذکر کرکے اور اسے دعوت عام کہہ کر کلیم الدین نے شکم پرستوں کی کیسی خبر لی؟

ادب اور افادیت کے شور و شر میں افسانوں کے مقابلے میں داستانوں کو افضل بتانا یہی کلیم الدین کا وہ شوک ٹریٹمنٹ ہے جسے حسن تدبیر سمجھئے یا جھٹکا۔

ایک بیان اور ملاحظہ فرمایئے، کلیم الدین نے نئے اور نوخیز افسانہ نگاروں کو کس جسارت کے ساتھ متنبہ کیا ہے، فرماتے ہیں؛

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ داستان گوئی اب زندہ نہ سہی لیکن کامیاب داستانیں زندہ ہیں رہیں گی ۔ ۔ ۔ ۔ "

ذرا ان نقاد نما نقاد کو آواز دیں جو کلیم الدین کو "انگلستان پلٹ" قرار دے کر انھیں خارج از بلاد اردو کر دینے کا فیصلہ سناتے ہیں، یہ بے لبہر نقاد کلیم الدین کی اس عبارت کو طبیعت پر زور دیکر پڑھیں اور سمجھنے کی سعی کریں، کہ کلیم الدین کی تحریر میں لنڈن لیونڈر کی خوشبوئیں ہیں یا عطر حنا کی،

وہ کس بے باکی سے کہتے ہیں؛

واقعہ تو یہ ہے کہ داستانوں کا جو سرمایہ اردو میں موجود ہے، یہ سرمایہ کسی دوسری زبان کے داستانوں کے مقابلے میں بلا تامل پیش کیا جا سکتا ہے، اور یہ بھی بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ کسی دوسری زبان کے سرمایہ کے مقابلے میں ہیچ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، یہ زور بیان ایک معلم ادبیات مغرب ہی سے ممکن تھا، قباحت تو ہوگی اس عبارت کو ایک بار پھر پڑھ لیں، غور کیجئے غریب و ناتواں اردو کو کسی جہت سے دنیا کی عظیم اور زندہ زبانوں کی صف میں جگہ دینے کا ایسا جرأت مندانہ حکم اس دیدہ ور سے ممکن تھا جس نے دنیائے ادب کے کئی گھاٹ کا پانی پیا ہو، سیر ہو کر گھر چپکے چپکے،

کلیم الدین نے اپنے ذوق نقد کا نمونہ زبانِ فرنگ میں بھی پیش کیا ہے، سائیکو انالی سس اینڈ لٹریری کریٹی سزم (مطبوعہ ۱۹۳۸ء) ناشر اجنتا پریس پٹنہ)

کلیم الدین کی مبسوط تنقیدی تصنیفات کی آخری کڑی ہے، آخری اس لئے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ایک خاموشی ہے، پندرہ برس کا ساکت و طویل عرصہ، کوئی نیا کارنامہ، کوئی نئی ضخیم تصنیف کلیم الدین نہیں پیش کرتے ۔ ۔ ۔ "کلیم الدین اب تھک گئے ہیں" "چراغ کلیم میں روشنی نہ رہی" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمہ گیر جمود کلیم پر بھی مسلط ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے چرچے ابھرے" کلیم الدین نے سنا، عزیزوں سے بھی اور دوستوں سے بھی انھیں سنتے اور چپ رہتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۶۳ء کے وسط میں دفعتًا عملی تنقید پہلی جلد (ناشر کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴) نمودار ہوئی،

عمل کلیم اب تک آنکھوں کے دم خم تک محدود تھا، بت تنقید کو آغوش کلیم نصیب نہ ہوا تھا، یک نظری کا سلسلہ ختم ہوا کلیم الدین بحر نقد میں اتر پڑے، "عملی تنقید" سے پہلے احتشام حسین کی "تنقید عملی تنقید" منظر عام پر آچکی تھی، پر صاحب تنقید پسندوں کیلئے یہ کتاب ایک خالی لفافہ تھی، احتشام حسین کی یہ تصنیف اس عمارت کی مثال بن گئی جس کے صدر دروازے پر خط جلی میں "قومی و ملی یتیم خانہ" کا سائن بورڈ لٹکا ہو مگر اندرون عمارت ناظر کو اشیائے شادیات کی سجی سجائی دوکانیں نظر آئیں، آل احمد سرور کی تصنیف "تنقید کیا ہے" دشت اردو کا پہلا سراب تھی اسے دیکھ کر غالبًا پہلے احتشام حسین کو چکر لگا، اور دوسروں کو احمق بنا کر انھوں نے اپنی خفت دور کی،

کلیم الدین نے اپنی عملی تنقید کو نہ ڈھول بنایا، اور نہ یہاں انھوں نے ڈھول بجایا ہے، عملی تنقید ان کی دیگر طویل و مبسوط نگارشات کی طرح خود ایک ضخیم کتاب ہے، اس تصنیف میں مصنف نے ۔ ۔ ۔

آنچہ شاستر گفتگو کی ہے، علمی حلقوں میں خطوں نے غزل کی وہ چھیڑ کی یوں عریاں کر دیا ہے کہ:

در حسن کے کھل گئے دو کواڑ

سخنہائے گفتنی پہلا ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۵۵ء، ناشر ادارہ فروغ اردو لکھنؤ) کلیم الدین کی تصنیفات میں پہلا مجموعہ ہے جس میں کسی واحد موضوع پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، سخنہائے گفتنی میں «معاصر» کے اداریے چند مقالے اور کئی تبصرے درج ہیں، اس میں کلیم الدین کا وہ گرانقدر تبصرہ بھی شامل ہے جو انھوں نے مشہور زمانہ تصنیف «اردو کی عشقیہ شاعری» پر لکھا تھا۔ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق کے اس کارنامہ سے اگر آپ جز ولاعلم ہیں تو آپکی علمی شخصیت کا ایک گوشہ تاریک ہے اس کتاب کے مطالعہ سے آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائینگے!

نگاہ مرد کامل سے بدل سکتی ہیں تقدیریں

اردو کی عشقیہ شاعری ایک دلچسپ کتاب ہے، مزا لغز دار ہے، اور شاندار بھی، اس میں مصنف نے امرد پرستی کے سنگین موضوع پر جی جان سے روشنی ڈالی ہے وجہ یہاں اسلئے کہ شروع شروع ان افکار سفالی کو مصنف نے ایک مقالہ کی صورت میں قلمبند کیا، یہ مقالہ انھوں نے سالم ہندوستان کے دینی اخبار «مدینہ» میں شائع کرایا، مدینہ جیسے ثقہ اخبار میں امرد پرستی کی اشاعت یوں بھی ایک عہد نگاری تھی، شرعی اور شرعی ہر دو طبقہ تلملایا اور کودا ...... یہ وہ زمانہ تھا جب ہر بے شعور فعل یا بے ہنگم بات ترقی پسندی میں داخل تھی، ......

لازماً اس مقالے نے بڑی شہرت پائی، مصنف نے اسے پھر شرح و بسط کے ساتھ کتابی صورت میں منتقل کر دیا، موضوع کے اس بار بار اشاعت سے آپ مصنف کے ذوق اور پڑھنے والوں کے شوق کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں!

سب سے زیادہ فراق گورکھپوری نے اس کتاب میں امرد پرستی ... پر دین خرافات پیش کئے جنھیں حسن کر دھوئے دعائے دانشوری بھی اھدنا الصراط المستقیم پڑھے گئے،

آپکی دلچسپی کے خیال سے اس جگہ میں صرف ایک سوال یعنی تبصرہ درج کر دیتا ہوں (یہاں فاضل مضمون نگار نے جو اقتباس دیا ہے اسے حذف کیا جاتا ہے)

دربیان محقق کلیم

شفق عماد پوری بگیاوی کا ایک مشہور شعر ہے،

دل ... حسینوں سے لگانا نہیں اچھا
ہو جاؤگے بدنام زمانہ نہیں اچھا!!

کلیم الدین کی «یک نظری» اور «عملی» آرٹ کتاب نے نئے گل کھلائے، انکی تنقید نگاری کی بسم اللہ اردو.. شاعری سے ہوئی، غزل کے عشوہ وغمزہ و ادائے خوابیدہ احساسات برانگیختہ کیا، مزاج زمانہ سے بے پرواہ ہو کر بھر بھر آنکھ انھوں نے اس بت شاعری کی سرمستیاں و بدمستیاں دیکھیں، نظر و عمل کی اس شوخی سے غزل کی عفت و عصمت تار تار ہو گئی مگر:

«ہم تو ڈوبے ہیں صنم تمکو بھی لے ڈوبیں گے»

والا ردعمل بھی رونما ہو گیا، یعنی تلاش کر تنقید میں-- کلیم الدین کے ہاتھ بے جگر پڑے، انھیں ماہنامہ شراد (اردو تنقید پر ایک نظر صفحہ ۱۱) اور احتمال لغزش،

«تنقید بعض اوقات تحقیق کی کمی کی وجہ سے لغزش کر جاتی ہے، تنقید نے انھیں ہوشیار کر دیا ہے، نگاہ تنقید نگاہ تحقیق سے بدل گئی، وہ تمیز سے تلاش کی جانب پھرے اور تحقیقات کی سنگلاخ وادی میں انھوں نے دقت لیتے پڑھا...... اس تبدیلی تلطف کی وجہ ایک دوسری بتائی جاتی ہے، راوی جس کے سید حسن پروفیسر شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی ہیں، «رسالہ صنم کے بہار نمبر (مطبوعہ ۱۹۵۹ء، سبر ... پٹنہ نمبر ۴) میں بیان حسن یوں ملتا ہے!

... تحقیق سے انکو وکلیم الدین کو ہم دلچسپی ڈاکٹر سید محمد حسنین لکچرار اردو، گیا کالج کے ساتھ کام کرنے سے ہوئی، ڈاکٹر حسنین جو کلیم صاحب کے عزیز شاگرد ہیں، مرزا محمد رفیع سودا کے متعلق تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے، وہ وقتاً فوقتاً کلیم صاحب سے مشورہ کرتے اور مدد لیتے تھے انکی مدد کرتے کرتے کلیم صاحب کو خود تحقیق کا شوق پیدا ہو گیا اور اسقدر ترقی کرتا گیا کہ وہ ڈاکٹر حسنین کے باضابطہ نگراں ... ہو گئے ......

کلیم الدین ... ذوق تحقیق کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ ... ہم شیخی ... ناواقف نہ ہوں گے کہ محقق اعظم قاضی عبدالودود اور کلیم الدین دونوں شہر پٹنہ کے اس تاریخی خطے کے باشی ہیں جو گیا گزرا عظیم آباد کہلاتا ہے، تو آمدم برسر مطلب کلیم الدین کی شخصیت کا دوسرا ضلع تحقیق ہے،

دیوان جہاں (مطبوعہ ۱۹۵۹ء، ناشر معاصر و دائرہ ادب پٹنہ ۴) انکے شوق تحقیق کا پہلا نقش ہے، جسکی ترتیب میں انکی نگاہ جستجو نے ارپٹنہ تا کلکتہ دوڑ لگائی، منشی بینی نرائن پسر مہاراجہ لکشمی نرائن کے پسندیدہ شعرا کی یہ یادداشت بصورت بیاض خدابخش لائبریری اور فورٹ ولیم لائبریری میں اپنی گمنامی کے دن گن رہی تھی کہ کلیم الدین کی نگہ عنایت سے یہ بیاض مخطوطے سے مطبوعہ ہو گئی اور مرتب کو خرقہ تحقیق پہنا گئی،

دو تذکرے (تذکرۂ شورش، عشق، پہلی جلد مطبوعہ ۱۹۶۱ء - دوسری جلد مطبوعہ ۱۹۶۳ء، ناشر معاصر دائرہ ادب پٹنہ ۴) کلیم الدین کا وہ مستحسن کارنامہ ہے جس میں معیار تحقیق کا وقار اور انداز تحقیق کی نفاست ہے، دو بہاری ہمعصر تذکرہ نگاروں کو اس جگہ کراما کاتبین کی طرح یکجا کر دیا گیا ہے، غلام حسین شورش اور ... وجیہہ الدین عشقی کے بیانات جس تقابلی ترتیب سے مرتب کئے گئے ہیں یہ پیش کش تذکروں کی ایڈیٹنگ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے،

... کلیم الدین میں شوق تحقیق ذوق تنقید کے بعد

شوق اور عمل کے عروج کی رکسوں اور ماہیوں کی طرح
نے اس میدان ادب میں بھی چیل جیسی وہ نادانی چیل د
بیٹھنے کا شوق تحقیق کا ایک شاندار اور بے مثال نمونہ
تذکروں کا ایک نادر و نایاب گنجینہ ہے، انکے پاس شعرائے
ریختہ کے تذکرے یا مسعود حسن رضوی کے علاوہ بڑا ذخیرہ
تذکروں کا ذخیرہ جمع ہے، ان تذکروں کی دستیابی اور
فراہمی میں کلیم الدین نے حیرتناک مستعدی دکھائی
اور جانفشانی اٹھائی ہے۔ کچھ تذکروں کی عکسی نقلیں
زرکثیر خرچ کر کے لندن اور برلن سے منگوائی ہیں، دو چار
تذکرے ایسے بھی ہیں جنھوں نے انکی نیندیں حرام کر ڈالی
ہیں، راتوں رات جاگ کر انکی نقل اتارنے میں کلیم الدین
نے خاندانی اور پیدائشی کاہلی کے بھی کان کاٹ لئے ہیں۔

تذکروں کے اس نایاب ذخیرہ کا ایک پس منظر
ہے اور کلیم الدین کی مستعدی و جانفشانی کے پیچھے ایک
آہنی پروگرام ۔۔۔۔۔ علیگڑھ تاریخ ادب اردو
(پہلی جلد) مطبوعہ ۱۹۶۲ء ناشر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی
علیگڑھ، دیکھ کر کلیم الدین احمد کو بڑی مسرت ہوئی جو
بعد مطالعہ حسرت میں بدل گئی! ۔۔۔۔ اردو میں
کسی جامع و مستند تاریخ ادب کی کمی انھیں کانٹے کی طرح
چبھتی رہی ہے۔ علیگڑھ تاریخ ادب اردو کی تالیف
و ترتیب کی خبر سن کر کلیم الدین احمد کو بڑی مسرت ہوئی
تھی کہ یہ ایک مبارک اور بڑا کام ہوگا۔

مطبوعہ جلد نے انھیں مایوس کر دیا کہ اس ادبی
تاریخ کی ترتیب میں سائنٹفک طریقہ کار روا نہ رکھا گیا جو مطلوب
جیسا چاہئے تھا ۔۔۔۔۔ تاریخ ادب اردو کا
خاکہ کلیم الدین کے ذہن میں ابھرا اسے عملی جامہ پہنانے
کیلئے انھوں نے پہلی منزل کی طرف اقدام کیا اور چند
سالوں کی قلیل مدت میں یہ نایاب ذخیرہ تیار ہو گیا۔

آج ریاست بہار میں آٹھ یونیورسٹیاں موجود
ہیں، اردو ایم اے کے پاس طلبا ریسرچ کی تلاش میں بھوکی
چیل کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں، دعا ہے کہ تذکروں کے
اس کھوئے ہوئے قافلہ سے پھر کسی راہرو کی ملاقات ہو جائے!

در بیان شاعر کلیم

کلیم الدین احمد انگریزی سے روشنی لیتے ہیں اور ادب
اردو کو توانائی بخشتے ہیں، یہ دھن کے پکے اور بات کے دھنی ہیں
انکی ضد میں عناد نہیں، حسد نہیں، نفرت نہیں،
والہانہ خودداری ہے، یہ ضد کلیم الدین کی وہ سرمستی ہے جو
انھیں نئے اقدام میں قوت اعتماد عطا کرتی اور نئی راہ پر
بے خطر بڑھاتی ہے، یہ ضد کلیم الدین کے ساکن و مستقیم وجود
کے سات پردوں میں چھپی رہتی ہے!

کلیم الدین کی شاعری اسی وصف نہاں کی ترجمانی
ہے ۔۔۔۔ تفصیل اسکی دلچسپ ہے!

مکتبۂ اسلوب کراچی سے ایک کتاب موسوم "فریب
نظر" شائع ہوئی ہے اس نام پر آپکو دھوکا ہوگا۔ کیونکہ
ناموں کے انتخاب سے اکثر رسوائی ہوتی ہے، مگر ناموں کا
کتابوں سے نسبتی تعلق بعض اوقات خریدار و قلم کار دونوں
کیلئے اہل تماشہ ثابت ہوتا ہے مثال کے طور پر!

فریب نظر شعری مجموعہ ہے اور نہ ناول، یا
رپورتاژ قسم کا کوئی کارنامہ، یہ احسن فاروقی کے "تنقیدی
مقالوں کا مجموعہ ہے جیسے اختر اورینوی کا مجموعہ "سراج
و منہاج" جسے آپ یاجوج ماجوج کا رزمیہ کہیں،

فریب نظر کے مصنف انگریزی ادب اور فلسفہ میں
ایم اے کے علاوہ انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی بھی ہیں،
فریب نظر میں صفحہ ۲۹ اور ۳۰ پر یہ عبارت تحریر ہے:
۔۔۔۔۔۔ بڑے نقادوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوا
جس نے کوئی تخلیقی قدم پہلے نہ اٹھایا ہو ۔۔۔۔ نقاد
وہی ہے جو کوئی تخلیقی کارنامہ بھی پیش کر چکا ہو ۔۔۔۔۔
ثبوت میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے ایسے اہل قلم کے نام گنوائے
ہیں جنکے ہاتھ میں بندوق، کاٹ میں چاقو کے ساتھ بازو سے
ایک جھولی بھی لٹکتی تھی، یہ شعری یا نثری تخلیقات سے
بھری زنبیل ہے،
مثلاً اسپنسر، ڈرائیڈن، ورڈسورتھ، کولرج، آرنلڈ
اور ایلیٹ وغیرہ وغیرہ،

ڈاکٹر احسن فاروقی نقاد بھی ہیں اور ناول نگار
بھی، شام اودھ انکی جھولی میں آچکی تھی، نیاز، رشید
احمد، مجنوں، فراق، عزیز احمد، اختر اورینوی اور حسن عسکری
جیسے معروف زمانہ نقاد کی جھولی میں کچھ نہ کچھ شعری یا
نثری تخلیقی کارنامے موجود تھے تو آل احمد سرور اور احتشام حسین
بازار اردو میں معلمانہ آئے، عرصے تک یہ ناقدانہ پھیرے، پھر
تماشائے اہل دل دیکھنے کی غرض سے کاسۂ نظر لے کر صدا بندی
کیلئے مجبور ہو گئے!

تہی دست تھے تو جناب کلیم الدین ۔۔۔۔۔ یہ
ناول نگار نہ افسانہ نگار نہ انشائیہ نگار نہ شاعر، نرے
نقاد تھے، یہ اشوک کی لاٹ کی طرح لانبے مگر سرد! ان
کی نگارشات کو ڈاکٹر احسن فاروقی نے کارنامۂ تخلیق
کے بجائے کارنامۂ منفی قرار دیا، بس اسی پر نہیں موصوف
نے انھیں "منفی نقاد" کے خطاب سے سرفراز کیا ۔۔۔
۔۔۔۔ کلیم الدین کو اس تنگ خیالی پر غصہ آیا کدورت
کو عورت سمجھنے کیلئے اس کا حامل ہونا شرط اساسی سمجھا گیا،
"منفی نقاد" کے اعزاز نے کلیم الدین کی سرد شخصیت
پر گرم اثر ڈالا، انکی خاموشی سنگین ہو گئی، حالانکہ منفی نقاد
کی بات بے ساون کی برسات تھی، کیونکہ ڈاکٹر احسن فاروقی
فلسفہ کی الجھنوں سے گزرتے ہوئے سرزمین ادب پر تشریف
لائے تھے،
انکے فکر و شعور میں ہیجان و انتشار رہا کرتا تھا،
تنقید اور ادبی تنقید کے بارے میں موصوف فرماتے
ہیں کہ "تنقید بذات خود فریب ہے"
ذرا سوچئے! یہ تنقید کی تعریف ہے یا تعارف؟ یا
اندھیرے میں اس کالی بلی کی تلاش جو کمرے سے باہر نکل
چکی ہے؛ ۔۔۔۔۔۔ ان کا یہ محض خیال نہیں ایمان
بھی ہے، ببانگ دہل فرماتے ہیں:۔
"مجھ سے اگر کوئی پوچھتا ہے کہ اردو کے سب سے

جیسے نقاد کون ہو سکتے ہیں جتنا بڑا شاعر غالب [illegible]
اور اقبال ہے۔
دیکھنا آپ نے [illegible] حسن ابتسام کا
کو دیوان [illegible] [illegible]
کا پردہ [illegible] داستان بنا دیا!
مطلق [illegible] ہے [illegible]
اس شان پر [illegible] ہیں!
کلیم الدین نے تنقید کی [illegible] کو کسی [illegible]
نقل کر کے [illegible] ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنی تنقید
کی بے اصناعتی یا کلیم الدین کی کم مائیگی ثابت نہ کی ہے
بلکہ اپنے فرمودات کی [illegible] تردید کر دی ہے۔
چند سال پہلے کی بات ہے ڈاکٹر احسن فاروقی
نے کلیم الدین کی محنت [illegible] ان الفاظ میں
کیا تھا [illegible] کی تنقید۔
"اردو میں تنقید..."
"...... کلیم الدین نے اردو تنقید کو [illegible]
بڑھا دیا ہے جتنا آج تک کوئی نہ بڑھا سکا تھا...."
[illegible]
"...... وہ کلیم الدین [illegible] تاریکی میں ایک مشعل
لئے ہوئے صحیح راستے کو دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں..."
"...." [illegible]
اور کہتے [illegible] اعتراف بھی کیا:
"..... وہ زمانہ دور نہیں جب کلیم الدین [illegible]
کی رایوں کو شاہد [illegible] ثابت کریں گے...."
[illegible] ۱۹۶۵ء
"منطقی نقاد کا یہ فتویٰ بے اثر رہا۔ اس سے کلیم الدین
کی شعری حرمت کو بل آگیا، بھلا اس کا بدلہ [illegible]
...... اور [illegible] نہیں [illegible] انھوں نے پتے
چھپا [illegible] دل میں جو [illegible] کی دنیا میں سناٹا تھا پر
ویرانی رہتی ...... بسیار شیوہ ہائے بتاں [illegible]
نیست......!

یہ خیالیاں [illegible]
قرۃ العین [illegible]
خوبصورت اور تندرست [illegible] .... کلیم الدین
[illegible]
نقاد کی [illegible]
ستمبر ۱۹۶۵ء [illegible]
ہیں [illegible]
کلیم الدین [illegible]
کے خالق [illegible]!
کلیم الدین کے شعری [illegible]
ہیں یا [illegible]
بھی .... [illegible] زیادہ کیونکہ
[illegible]
اور [illegible]
نظم بے عنوان [illegible]
[illegible]

بقیہ نفسیات کلیم

ان کی [illegible]
کی تعداد [illegible] کلیم الدین [illegible]
عادت [illegible]
شاد کام [illegible] نہیں جانتا کہ ان [illegible] اسکول
یا کالج کے ساتھیوں یا ان کے ہم عصر [illegible]
اساتذہ میں سے کسی کو ان کی دوستی کا [illegible]
شاید انھوں نے دوستی کرنی سیکھی ہی نہیں تھی۔
بس دو چار [illegible] لوگوں سے وہ [illegible]
تکلف [illegible] ان لوگوں کے [illegible]
زبان کھل جایا کرتی تھی [illegible]
ایک [illegible] دوستی کی کمی [illegible]
نہیں ملتا۔ [illegible] زیادہ تر تو ان کے
شاگرد رہے جن کے دلوں میں باوجود [illegible]
ہونے کے ان کا پاس ادب [illegible]
وہ ان کے دوست نہیں کہے [illegible]

[illegible] ان کا [illegible]
بے تکلفی [illegible]
لیکن دوستی [illegible]
کلیم الدین نے کسی سے [illegible]
اس کا [illegible] آپ [illegible] ملتا۔ [illegible]
انھوں نے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ان کے ربط و اتحاد کی سرحدیں دوسرے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
پر کلیم الدین کا [illegible]
مناسبت نے [illegible] انھوں نے
آدمی [illegible]
سے کبھی [illegible] نے بھی ان [illegible]
[illegible]
اور کبھی [illegible]
جو کسی طرح قابل اعتماد نہیں تھے۔ اس کی وجہ
سے انھیں اکثر دھوکہ بھی اٹھانا پڑا۔ ایسے ہی
لوگوں نے کبھی کبھی ان کے [illegible]
سے انھیں بدگمان [illegible] دیا۔
اس دور میں [illegible]
کلیم الدین نے جس حد تک اپنے ذاتی رسوخ کا
استعمال کیا [illegible]
شخص [illegible]
پٹنہ [illegible] اردو فارسی اور عربی [illegible]
شعبے [illegible]
محض کلیم الدین [illegible] عربی
و فارسی [illegible]
[illegible]
اردو [illegible]
انجام [illegible]
یا [illegible]

کیکٹس کی کھیتیاں

تم کہتے ہو ـــــ جب افغانستان میں روس کی فوجی خرگوشوں سے کیا واسطہ ہے؟ مجھے جزیرۂ فاکلینڈ کے مسئلے سے کیا علاقہ؟ عراق نے ایران کے پھول جیسے خرم شہر کو تباہ کر دیا ہے کر دیا ہو گا ... اسرائیل سرزمین فلسطین غصب کیے بیٹھا ہے ... کی ہو گی۔ مجھے کیا غرض؟

ہاں ـــ تمہیں کیا واسطہ، کیا علاقہ، تمہیں مرض ہے تو ڈالر کی قیمت میں اضافہ اور کمی سے، تمہیں واسطہ ہے تو صرف چاندی کی قیمتوں میں تیزی اور مندی سے، تمہیں انتظار ہے تو اس خبر کا کہ کب حکومت چاند پر بنی موُن منانے کا قیمتی ٹکٹ فروخت کرنے لگی، تمہیں مطلب ہے ان سب چیزوں سے جو تمہارا سامان تعیش بن سکتی ہیں تمہیں انتظار ہے کہ کب جنگ چھڑے تاکہ تم منہگا اناج بیچ سکو، ایک وقت کی روٹی کے بدلے من چاہے جسم سے کھیل سکو، بلیک منی سے جیبیں اور بلیک مال سے گودام بھر سکو ـــ تمہیں یاد آتی ہے وہ دوسری جنگ عظیم جب تم نے چاول کے چند دانوں کے بدلے خاندانوں کو رہن رکھا تھا، تمہیں یاد آتا ہے وہ وقت جب تم نے امریکن ڈالر کے بدلے غیر ملکیوں کو پناہ دی تھی، تمہیں یاد آتا ہے وہ منظر جب تم نے معبود جاپانی نائٹ صرف دس روپے میں خریدا تھا، تمہیں یاد آتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے منقش سنگِ سویرا اور نٹ راج کی مورتیوں کے لیے کثیر قیمتیں ادا کی تھیں، تم چاہتے ہو کہ تیسری بار پھر جنگ عظیم چھڑے ـــ تم چاہتے ہو تمہیں پھر گرم گوشت ملے، تم سوچتے ہو کہ کبھی کیساتھ ساتھ اب کے پلوٹو (PLUTO) بھی مغرب سے چل کر تمہاری تجوریوں کی زینت بنے گا، شاید الفرو دائٹ (APHRODITE) آپ اب کے کولہوں پر سے سایہ بھی اتار دے گی، ہو سکتا ہے اس بار بیک کس (Bacchus ؎) کی مہربانی سے گوالا کو آشن اور عشرتی ایکسں کی بوتلیں بھی مل جائیں مگر میں تمہارا یہ خواہش پوری نہیں ہونے دوں گا۔

کیونکہ میں گندم کے خوشوں کو اجاڑ کر اور گلاب کی کلیوں کو روند کر کیکٹس کی فصلیں سر چڑھتے ہوئے بات دیکھے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ فصل بار آور ہو، میں اپنی چھوٹی سی کھرپی سے تمہارا کھیت کھود ڈالوں گا۔ میں اسکی چمکیلی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ میں اسکی تیکھی زبان کھینچ لوں گا، میں گندم اور ڈیفوڈل کے پودے بوؤں گا تاکہ آدمی رموزِ زندگی سمجھ سکے ہاں کل ڈیفوڈل ڈسمی، اسکی دیدہ زیب پھر یاں مرسبی سگر اسکی لافانی مہک صداؤں میں پھیلی رہے گی، کوئی جب بھی اداس ہو گا ڈیفوڈل کی پنکھڑیاں اسے حوصلہ دیں گی، وہ بھی جئے گا چند لمحوں کی زندگی مگر بھرپور، تمہاری طرح گھسیٹ گھسیٹ کر نہیں ـــ زندگی کا صحیح لطف اٹھا کر کیکٹس کی گردن توڑتے میں میرے ہاتھ بھلے ہی زخمی ہو جائیں، گلیوں کے بہرے بھرے ڈیفوڈل میں میرا خون جھلکے گا ـــ کیونکہ مجھے تو نسبت ہے ..... ویت نام کے کشت و خون سے، فلسطینیوں کے خون و حزن سے، کمبوڈیا اور افغانستان سے، عراق سے ایران سے میزورم اور خالستان سے، کہ میں انسان ہوں، انسانیت کا خون میرا خون ہے ...... بیروت کی پیشہ میں جب چہرا گھسو دیا جاتا ہے تو میری روح فنا ہو کر رہ جاتی ہے، جب بھٹو کو پھانسی ہوتی ہے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔

تم ازم کی بات کرتے ہو، میں کسی ازم کی بات نہیں کرتا۔

تم کہتے ہو کیپٹل ازم دسیا لا سب سے بڑا ازم ہے۔ میں نہیں کہتا کہ ہیومنزم ہی دنیا کا سب سے بڑا ازم ہے کیونکہ کوئی بھی ازم بڑا ہو ہی نہیں سکتا، بلاشبہ ہیومینٹی دنیا کا سب سے بڑا مذہب اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے،

تم رنگین ٹیلی ویژن خرید رہے ہو، میں گھر کا ریڈیو بیچ رہا ہوں کیونکہ بنگال میں سیلاب آیا ہوا ہے، خیر تم رنگین ٹیلی ویژن خریدو ... شاید تمہیں اب فلسطین کا خون سیاہ نہ دکھ کر سرخ نظر آئے!



ایاز محمود شیخ

؎ دیوتا کے نذر دیونانی دیومالا) ؎ جوانی اور حسن کی دیوی (یونانی دیومالا) ؎ شراب کا دیوتا (یونانی دیومالا) ؎ نارگسی ؎ مغربی ممالک میں پایا جانے والا ایک سرخ پھول جو دوپہر سے پہلے ہی بکھر جاتا ہے!

اُگتے سورج کا اغوا

خوشتر گرانوی

یکایک گلی میں سکوت کی حکمرانی نافذ ہوگئی۔ .اور الزام وخوف نے گھیرے ڈال کر پھن پھیلا لیے۔ . .پختہ اور کچے گھروں کے نئے پرانے کرایہ داروں اور مالکان کی نقل وحرکت کے روابط منقطع ہوگئے . . . .جنت جہنم کے دوڑتے ہانپتے اور چلتے پھرتے بھوگی لوگوں کے سزا وجزا کا زمین سے رشتہ ناطہ خود میں سمٹ کر خاموش ہوگیا . . .اور انسانی پاؤں کے نشانات اپنے کالبدوں پر حنوط کی شفاف چادریں چڑھا کر محفوظ ہوگئے . . . .ہر طرف بکھری ہوئیں بے گور وکفن علامتیں۔ بے گوش وبے زبان اور بے بصارت آنکھیں مسخ شدہ بشرہ کے ساتھ دھوپ چاندنی سے جُڑی ہوئی تھیں۔ .تاہم ہوا کا خرام تیز تر ہوچکا تھا۔ . .؛ نونہال مقتول کے قاتل کا سراغ کون دیتا . . .؛ تمام شاہدین کی رتوں کا مزاج تبدیل ہوچکا تھا . . .؛ شراب کی غیر قانونی بھٹیاں قائم کرکے اپنی قلاشیت کے گھاؤں کو مندمل کرنے کے واسطے اُگتے سورج کا اغوا کیا ۔ .بقّال زادہ کی مٹھی میں دبیز نقدی دیکھ کر کے چند سدھائے ہوئے بچے چیل کوؤں کی طرح کاغذی ٹکڑے لیے اڑے . . .؛ اور وہ ان کے پیچھے دوڑ ہانپ کر اپنی موت گاہ تک پہنچ گیا . . . .؛ . .موت کی تلوار کھوکھلی نہیں ہے۔ مضبوط ہوا کرتی ہے اسے اٹھانے کی قوت اور حوصلہ بچے کا پنجہ و بازو نہیں رکھ سکتا . .بعقربی نونجیوں کی گرمیوں معصوم کی سانسوں کا تواتر ختم کرکے رکھ دیا . . .؛ اور گڑھ کا بوڑھا خلوت خانہ کپکپا اٹھا . .قصبہ کے باپوں کی شفقتیں اور ماؤں کی ممتائیں بلبلا اٹھیں . . .؛ ساری بستی پر سوگ کی چادریں تن گئیں . . .!سایوں نے غو پا کر ایک دوسرے میں ضم ہوکر زمین کو تاریک اور مرثیہ خواں بنا دیا . . .؛ واٹر پائپ کنویں چشمے منجمد ہوگئے اور پہاڑوں کی شریانوں میں منجمد کردہ لگے . . .؛ ساون کے توانا اور رنگین جسوم کو خزاں کے جوے چوسنے لگے . . .؛ پرندوں کے بازوؤں سے شہد اکھڑنے لگے . . .؛ زمین کے شادابی جذبات بگولوں کے شعلے اور بھنور میں چکرا کے بے بدن بھسم ہوگئے . . .؛ گھروں کی آب پاش اور برساتی کھیتیاں آندھیوں کے خوف سے ہیلی دھوپ میں بھی کپکپا اٹھیں . . .؛ اور بچے کا قاتل بچوں کا روپ جیون دھار کر معصوم و بے گناہ ہوگیا . . . . .! آزاد بھارت کی جمہوریت، گاندھی، آزاد، نہرو اور اندرا کی تصویریں تکتی رہ گئیں۔ .لیکن امن واخوت کے پیکر وسائے شِ کے نظام کا شعر دہرانے میں مصروف تھے۔

ہال گنی میں اک چھوٹا سا دھوکا کھڑا تھا لبے سانے پھیل رہے ہیں کھیلوں کھیلا تھا آخر رجعت پسند عناصر نے اپنے قبیح کھیلوں سے مرمری تیرہ ماحول میں گواہوں اور عدل وانصاف کے ساتھ کیا برتاؤ کیا . . .؛ اس سے متعلق بستی کے ساکنوں کو کچھ نہیں معلوم . . . .؛ البتہ شہر اور جنگل میں کوئی تفاوت نہیں رہا . . .! لکڑ بگھا بیسویں صدی کا پہلا طفلی قتل بغلیں بجا بجا کر درندوں کو سنا رہا تھا کہ اسی بستی کے ایک راجپوت خون کی سرد مہری نے اپنے پچھلے اوقات سے کہیں زیادہ آج جام میں تحمل جایا کرنے والی تمازتیں تحلیل کر لینا چاہا . . . . . . لیکن اسے ہمیشہ ادھار پیسے مایوسیوں کے بوجھ نے خاندانی زعم سے محروم بنا کر اندھیرے جنگلوں میں آوارگی کے لیے چھوڑ دیا . . .؛ ایک دن اسے ایک گیارہ سالہ مسلم چرواہے



سکے پاؤں میں گُدڑ جیسی پڑی ہوئی چاندی کی کڑی کے علاوہ کچھ نہیں دکھائی دیا۔۔۔؛ وہ سماج کا لا ولد آخر ٹھیکرے کی طرح اس کوڑے پر جا پڑتا ہے ۔۔۔۔۔۔اس کے خونی پنجے اور بے رحم ہاتھوں نے ایک خستہ نصابی قاعدہ اور ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح قریب کے گہرے اندھے کنویں میں پھینک کر کڑی سے حاصل شدہ رقوم سے اپنی خمری پیاس بجھانے کا سامان فراہم کر کے پورے جسم کو گرما لیا ہے.. پھر کسی مادا جانور سے تسکین پا کر کے کسی ویران کچھار میں جا چھپا۔۔۔۔۔۔ لیکن گڑھ کی باخبر آنکھیں اور عصبتی زبانیں اس غامضہ کا خوف قانون سے لاعلمی کا اظہار کرتی رہیں۔۔۔، وہ بوڑھی دہ اور کمر دانت ٹوٹے کٹے پنجوں کے بگڑے شیر کی طرح اور بے ہتھیار ڈکیت سا بے بھوک پیاس برسوں سادھو بنا بیٹھا رہا تاہم اسے بے چینی گھیرے رہتی تھی۔ ۔؛ اب کیا ہوگا۔۔۔۔؟ پولیس کا تجسس روز و شب میں سرایت کر گیا ۔۔۔۔۔، راج اور کھوج پختہ کچے دھاگوں میں بندھ گئے ۔۔۔۔۔۔۔شام کو جب بکریاں گھر کو تنہا پہنچتی ہیں۔۔۔ ان کے تھنوں کے لبن کی دھاریں آنسوؤں کا رنگ دھار کر ماں کی ممتا کی منتظر آنکھوں کے بدگمانی پیکروں کے ساتھ مرثیے پڑھنے لگتی ہیں ۔۔۔۔ آخر بکریوں کی آنکھوں کی تسوید گھر کے ممبران پڑھ لیتے ہیں اور بدگمانیاں یقین کی گواہ بن جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ ضمائر چیخ اٹھتے ہیں کہ بچے کا قتل لامذہب بھگوان اور بے کوکھ کا سیوت کلیوں سے عطر کشید کرنے والا اخزاں کا ایجنٹ اور بے دماغ و بے حس بدن رکھنے والا فرعون و نیرو کر سکتا ہے ۔۔۔۔؛ سائے روشنی کے وجود کی واضح علامت و دلیل ہوا کرتے ہیں لیکن جب آدمی اور بالخصوص بچے قتل ہونے لگتے ہیں تو چھائیں بھی اپنے جسموں سے باہر نکلنے یا نکل کر پھیلنے سمٹنے میں شدید خطرات محسوس کرنے لگتی ہیں کیونکہ نونہالوں کے روشن چہروں کے بغیر حال و ماضی اور مستقبل کے محلوں کی گلیاں اندھیری۔ ۔۔اور مکان بے آواز بند ہونٹوں کی زبانیں بن جاتے ہیں۔۔۔۔ ۔! بچے دو ہوں یا ایک لیکن بچہ کا وجود ماں باپ کے واسطے نہایت ضروری ہے ۔ ، وہ ہندوستان ہو کہ سوویت یونین ۔۔۔ اگر زمین و آسمان کے ساکنوں کے خالق و معبود اور پالنے والا وہ منصف اعظم سردار مردوں کے حضور عورتوں کو سرنگوں رہنے کا حکم دیتا تو۔۔۔ وہ پھر دنیا کی تمام بیویوں کے لیے اپنے شوہروں کو سجدہ کرنا مقدر کرتا۔۔۔۔اس کے باوجود عورت کو کمزور و فاطر نہیں سمجھنا چاہیے یہ ہر طرح مردوں کی ماں ہوتی ہے اور تمہاری سلطنت میں تمہاری حکومت کے فرقہ پرست بیٹے اپنی سرداری کی دہلیز پر ایک مقہور عورت کے اکلوتے بیٹے کے قاتل کی بجائے مجھ کو جھکا دینا چاہتے ہیں ۔۔۔۔۔ !اور استحصالی قوتیں آمریت کے خوف و رعب کا بوجھ رکھ کر کمر گردن اور گھٹنے توڑ دینا چاہتی ہیں ۔۔۔ میں اپنے معصوم بچے کے قتل کیس کو لے کر انصاف کے واسطے حاضر ہوئی ہوں۔۔۔۔ تم ٹھاکر نہیں ایک راجہ ہو۔۔۔۔۔۔بدمست مکٹ اور خوابیدہ سنگھاسن کو مندروں کی گھنٹیوں اور مسجدوں کی اذانوں نے بیدار کر دیا ۔۔۔ راجا کی دور رس نگاہیں آفتاب کی کرنوں کی طرح لمس کر کے ٹھاکر پولیس اور عدالت کا جائزہ لے چکی تھی اور ایک فریادی مگر دلیر عورت اور سچائی کی دیوی کی آنکھوں زبانیں اور اس کے چہرے پر ضمیر کے بکھرے ہوئے غوامض سمجھتے ہوئے بے ساختہ بول اٹھا۔ تم مطمئن رہو، تمہارے ساتھ انصاف ہوگا ۔۔ ! تم واقعی مظلوم ہو ۔۔۔۔۔! وہ اس یقین کے ساتھ اپنے گاؤں چلی آئی ـــ ـــ راجا کی مختاریاں کسی دھرم اور ٹھاکر کی باندیاں نہیں ہوتیں ۔ وہ اندھیری راتوں میں چراغوں کی ان مٹ روشنی ۔۔۔۔اور تپتے سلگتے دنوں کی دھوپ میں بلبلاتی ہوئی ممتا کو اپنے انصاف کا تشخص برقرار رکھنے کے لیے سایوں کو جنم دینے والی عظیم شخصیت بن جاتی ہے ۔۔۔ آخر پولیس نے کئی سالوں بعد قاتل کو گرفتار کر لیا۔۔۔خون بہا کی ہواؤں نے ممتا کے سلگتے جذبات کو سرد کر دینا چاہا۔۔۔۔ مگر سورج کی آگ سمندر نہیں بجھا سکا۔۔! جڑ کٹے پیڑ پودے چند مدت اور اپنے ہی کالبدوں کو چوس کر زندہ رہ سکتے ہیں کیونکہ ان کا دھرتی سے رشتہ ناطہ ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔۔۔تاہم قاتل اور

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

(ہندی) سشیل کارپوری

گھائل

ترجمہ: تسکین زیدی

اسپتال کے ایک وارڈ میں کچھ گھائل انسان بیڈ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے جن میں کچھ کی حالت مخدوش تھی۔ زیادہ تر لوگ زندگی اور موت کی آخری سانسوں میں الجھے ہوئے تھے۔

موت ان کے رگِ جان سے قریب تھی جس کی دہشت نے ان کے ذہنوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ بجھتے دیئے کی آخری لو کی طرح ایک روشنی چمک چمک اٹھتی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ مذہبی پاگل پن کے شکار لوگ لاوارثوں کی طرح پڑے تھے۔ زخموں کی تکلیف بچھوؤں کے ڈنک کا نشتر معلوم ہو رہی تھی۔

ایک گھائل جس کا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔ اپنے پاس والے آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ـــ

"جاگ رہے ہو کیا"؟

کراہتے ہوئے لہجہ میں اس نے جواب دیا 'ہاں'

"میرا ہاتھ کٹ گیا ہے"

"پانی پیوگے؟"

"ہاں"

"کون ذات ہو؟"

"ہندو ہوں"

"مسلمان کا چھوا پی لوگے"

ایک سناٹا، ایک سکوت چھا گیا کوئی جواب نہیں اور پندرہ منٹ گذر گئے پھر پاس کے ہندو کو بری طرح کراہتا دیکھ کر مسلمان نے پوچھا "بہت درد ہے کیا؟"

"ہاں بہت زیادہ۔ میں بچوں گا نہیں"

ایک ٹھنڈا لاچار سا جواب تھا۔ آخری جملہ سن کر وہ سناٹے میں آ گیا ـــ اس کی پسلی میں بھی شدید درد تھا۔ شاید وہ بھی نہ بچ سکے ـــ موت ـــ اُف ـــ

"سنو! پانی پلا دو۔ پیاس کے مارے جان سوکھی جا رہی ہے"

ہندو نے تڑپتے ہوئے کہا ـــ

"پھر تمہاری ذات نہ بگڑ جائے گی"

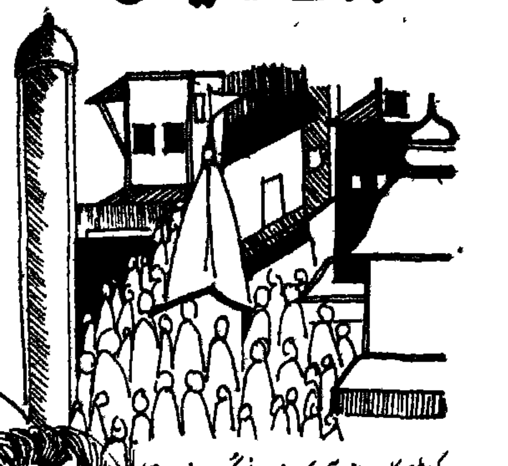
"مرنے والوں کی کوئی ذات نہیں ہوتی" دھیمے لہجہ میں اس نے کہا گھائل مسلمان اٹھا پاس رکھی الماری سے لوٹا اٹھایا ایک اچٹتی نظر نرس پر ڈالی ـــ وہ وارڈ کی بوجھل فضا سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھی ـــ لفظ دو گھائلوں کے پاس تھے جو نشتر بن کر چبھ رہے تھے۔ اس نے پانی پلایا اور چپ چاپ لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد ہندو نے کہا "کیا سوچ رہے ہو؟"

مسلمان نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہ جب مرنے والوں کی کوئی ذات نہیں ہوتی تو پھر پیدا ہونے والوں کی ذات کیوں ہوتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت لڑکی یا لڑکا ہوتا ہے۔ ہندو یا مسلمان نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کا کوئی نام ہوتا ہے۔ خدا کے گھر سے اس کی روح انسانیت کا چولا پہنے ہوئے اترتی ہے مگر دنیا اسے مذہبی کپڑوں میں لپیٹ دیتی ہے اور وہ ہندو۔ مسلمان سکھ۔ عیسائی وغیرہ بن جاتا ہے۔ اس لیے سوچتا ہوں پیدا ہونے والے کی ذات نہیں ہوتی اسے ذات دی جاتی ہے۔

پھر چند لمحوں بعد دونوں گھائل دنیا سے کوچ کر گئے۔ آس پاس دوسرے مریضوں اور نرسوں نے دیکھا کہ دونوں کا ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ پر تھا اور ان کے منہ کھلے ہوئے ـــ جیسے کہ وہ کہہ رہے تھے ـــ "پیدا ہونے اور مرنے والوں کی کوئی ذات نہیں ہوتی۔ ہم ساتھ خدا کے گھر جا رہے ہیں جہاں سے ہم صرف انسان بن کر آئے تھے۔ ہندو یا مسلمان بن کر نہیں۔



کالک لگا جیون



ابراہیم اختر



کوٹھری کا دروازہ آج بھی اندو نے کھلا چھوڑ دیا تھا یہ سوچ کر کہ اس کا بیٹا رات کی ڈیوٹی کر کے کارخانے سے تھکا ماندہ آئیگا اور آتے ہی اس کے آغوش میں سر رکھ کر سو جائے گا اور اس کے الجھے بالوں کو سہلاتے سہلاتے وہ خود بھی دیوار سے لگ کر سو جائے گی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ رات کو باہر کا دروازہ بند کرنا جیسے بھول سی جا رہی تھی جیسے وہ اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ رات تقریباً ختم ہو چکی تھی اور محراب میں جلتا ہوا مٹی کے تیل کا دیا بھی جھلملانے لگا تھا۔ محراب کے اوپر کا حصہ چراغ کے دھوئیں سے کالا پڑ چکا تھا۔ بالکل اسی طرح اس کا دل بھی جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔ کالک لگے محراب کی طرح اس دن وہ جوان بیٹے کی خون میں لت پت کچلی ہوئی لاش کو دیکھ کر رگھو کی باہوں میں گر پڑی تھی۔ ہسپتال میں تیسرے دن اس کی آنکھ کھلی تو پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ہونٹوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی لیکن آواز حلق میں الجھ کر رہ گئی۔

"نا... ا... ت... "

"صبر کرو اندو۔ صبر کرو" رگھو نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ لیکن وہ خود اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔

"ہماری دنیا اجڑ گئی اندو۔ ہم برباد ہو گئے" وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

اندو خاموش تھی۔ صرف اس کی آنکھیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ اور آج بھی اس کی آنکھیں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ جیسے ناتھو اب آتا ہی ہوگا۔ وہ اپنی ممتا کے پاگل پن کو سمجھا نہ سکی کہ اس کے بیٹے کو ماضی کے اندھیرے نے نگل لیا ہے اور ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ ابھی ابھی ہوا کے ایک جھونکے سے طاق میں رکھا چراغ بجھ گیا تھا اور دھوئیں کی ایک ہلکی سی لکیر اوپر اٹھ رہی تھی۔ اسے لگا یہ دھواں چراغ سے نہیں اس کے دل سے اٹھ رہا ہے رات کی شمع کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ شمع تو ختم ہو گئی لیکن ناتھو نہیں آیا۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس کی زندگی کی شفقت ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی تھی۔

اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور مٹی کے ننگے فرش پر لیٹ گئی۔

بیٹے کی موت کے بعد آج اس نے پہلی بار رگھو میں تبدیلی محسوس کی۔ بہت دیر سے وہ اس کے پاس بیٹھا تھا اور کئی بار بات کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ کہہ نہ پایا۔ اندو کی خاموش نگاہیں بار بار اس کی آنکھوں میں اترنے لگیں تو اس نے گھبرا کر نظریں نیچی کر لیں۔ وہ سوچنے لگی آج رگھو اس سے اتنے فاصلہ پر کیوں کھڑا ہے۔ یہ فاصلہ تو اس کی جان لے لے گا۔ اس نے پھر رگھو کی طرف دیکھا تو رگھو نے پتلون کی جیب میں سے ایک بنڈل نکال کر ڈرتے ڈرتے اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ نوٹوں کے بنڈل کو دیکھ کر اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا ہے؟"

"روپیے ۔۔۔ پانچ ہزار...." رگھو نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیسے روپیے؟" اندو نے تڑپ کر پوچھا۔

رگھو کچھ دیر تو خاموش رہا پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولا؟

بات یہ اندو کہ .. ناتھو اب واپس آنے سے تو رہا اور .. جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ یہ سچ ہے کہ ڈرائیور کی غلطی سے ناتھو ٹرک کے نیچے آ گیا۔ اگر ہم یہ پانچ ہزار روپیے لے کر ایک کاغذ پر دستخط کر دیں تو کیس ختم ہو سکتا ہے اور بے چارہ ٹھیکیدار اور ڈرائیور دونوں بچ سکتے ہیں۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے اور پھر اتنی رقم تو ہم زندگی بھر نہیں کما سکتے۔ اگر تم ہاں کہہ دو تو ..

وہ نظریں نیچی کئے اندو کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

اندو نے ایک بار سامنے رکھے نوٹوں کے بنڈل کو دیکھا اور آنسو پونچھتی ہوئی کمرہ میں چلی گئی۔

سُخن در سُخن

خامہ بگوش کے قلم سے



تمباکو نوشی کی طرح بعض شعری مجموعوں کا مطالعہ بھی صحت کے لئے مضر ہوتا ہے

عجیب و غریب غزلوں کا مجموعہ۔

چند ہفتے ہوئے ہم نے اساد دور کے استاد شاہ نصیر دہلوی کی مشکل پسندی کا ذکر کیا تھا اور نمونے کے طور پر ان کے چند شعر پیش کر کے عرض کیا تھا کہ ایسی ردیفوں میں شعر کہنا بہت مشکل کام ہے اور آج کا کوئی شاعر ایسی انداز میں داد سخن نہیں دے سکتا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایک صاحب ایسے بھی موجود ہیں جو اردو کے مرکزوں سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر ہمارے اس دعوے کو غلط ثابت کر دکھائیں گے اور ایسی ایسی بحروں میں کو سر سبز شاداب کریں گے کہ عقل حیران رہ جائے گی۔

اس سے پہلے کہ ہم ان صاحب کے بارے میں کچھ عرض کریں ان کی غزلوں کے چند مطلعے سن لیجئے۔

ساقی کے چھولوں کا ساقی سشو کا طمورہ
بنا چکا ہوں میں صوفی کدہ سکا طمورہ

روتے بھی جاتے ہیں اور چال ہے چست و چالاک
رنگ شگفتہ ہے پر تال ہے حسب و چالاک

جڑانے کو ہمیں کال ہے پہلے باب کا لہجہ
کر تحقیق مقالہ اور استہجے سکا لہجہ

بلبل چلی گئی تو بھی رم زاغ و دل
ہم رنگ پھر بہار میں ہو وہی گے باغ دل

متحرک رہی نظر پہ جہان گزراں
کون پسماندہ ہے؟ ہم یا کرہ پاک گزراں

ہر نقش پا سے پایا ایک رہگذر کا کتہ
آخر میں سلسلے کے بیٹھا ایک پشت سکا کتہ

درہم کی فہرست میں آتا ہے اوّل ماحصل
وصل کا قصہ ہے مہمل اور منفصل ما حصل

ہے ہم نوائی معمار جو ہر محراب
سمار گشت کسائے تو بپا کرے محراب

ثمر نہ کھائے گا خود اپنے باغ کا مسرور
مزاج رکھتا ہیں جیسے کہ راغ کا مرور

طولِ شب ہجراں ہے عارت گر شعلہ
کیا دل کی طنابوں سے بندھا ہے پر شعلہ

ہے عام بات کسی سرزمیں سے ہجرت
بھلا کبھی کوئی کرتا ہے دین سے ہجرت

ان ردیفوں میں ایک ایک دو دو شعر نہیں دس دس بارہ بارہ شعر کہے گئے ہیں۔ پوری کتاب میں کم از کم سو غزلیں ایسی ہی نا ہموار ردیفوں میں ہیں۔ جن میں سے صرف گیارہ غزلوں کے مطلعے ہم نے اوپر درج کئے ہیں۔ اس قسم کی غزلوں کو پڑھنا آسان کام نہیں۔ کاش سگریٹ کی ڈبیوں کی طرح بعض شعری مجموعوں پر بھی اس قسم کی تنبیہ لکھنے کا قانون نافذ ہو جائے "اس کتاب کا پڑھنا صحت کے لئے مضر ہے"

ہماری جگہ کوئی اور تبصرہ نگار ہوتا تو اوپر کے "مصائب" شعر درج کرنے کے بعد اس کے اسباب جدہ علم کو مزید جزئیات ہونے کی ہمت نہ ہوتی لیکن ہم برتی پسند یہ بھی مشکل پسند واقع ہوئے ہیں اور اپنے قارئین سے بھی ایسی ہی سخت جانی کی توقع رکھتے ہیں لہٰذا شاعر کا اور اسکے مجموعہ کلام کا تعارف بھی حسب عادت ہے

شاعر کا نام ہے ڈاکٹر داؤد رہبر۔ ہمیں یقین ہے کہ بعض لوگوں کے لئے یہ نام بالکل نیا ہوگا۔ خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو لکھنے پڑھنے کی بجائے صرف لکھنے کا کام کرتے ہیں اور ادب کو غیر ادبی مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اہل قلم کا وہ حلقہ جس میں تھا

کے عالم ہیں۔ ایک زمانے میں اردو کے علمی و ادبی رسائل میں ان کے مضامین کثرت سے شائع ہوتے تھے خصوصاً مولانا صلاح الدین احمد کے "ادبی دنیا" میں انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مضامین کا ایک مجموعہ "نسخہ ہائے دفا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے میں کچھ انشائیے ہیں، کچھ نیم فلسفیانہ تحریریں ہیں اور بیشتر مضامین یادداشتوں پر مشتمل ہیں کہیں شخصیات کا ذکر ہے کہیں سیر و سیاحت کا اور کہیں پرانی محفلوں کا

اپنے والد مرحوم کا شخصی خاکہ انہوں نے لکھا ہے، وہ بلا مبالغہ اردو کے بہترین شخصی خاکوں میں سے ہے۔ موسیقی سے بھی انہیں گہری دلچسپی ہے۔ عملی بھی اور علمی بھی "نسخہ ہائے دفا" میں موسیقی پر دو مضمون شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے متعدد علمی مقالے رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں اور یہ کتابی صورت میں مدوّن نہیں ہوئے۔ اس قسم کے دو مقالے خاص شہرت رکھتے ہیں ایک تو فارسی اور اردو میں ہیروڈی کے تصور کے بارے میں ہے اور دوسرا شاعری کی اہمیت اور اس کے ارتقا سے متعلق ہے۔ یہ دونوں مقالے جو اپنے موضوعات پر پہلی اور آخری تحریروں کا درجہ رکھتے ہیں، ۴۶ ۱۹۴۵ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے رسالے "اردو" میں شائع ہوئے تھے۔ مولوی صاحب مرحوم ڈاکٹر رہبر کے بڑے قدر دان تھے اور ان کے علمی ذوق و شوق کے معترف تھے انہوں نے براؤن کی مشہور تاریخ ادبیات فارسی کی ایک جلد کا ڈاکٹر رہبر سے ترجمہ بھی کرایا تھا۔ یہ ضخیم کتاب جو آٹھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے ڈاکٹر رہبر کے نام مولوی صاحب کے خطوط بھی خاصی تعداد میں ہیں اور یہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر رہبر کا بیشتر وقت پاکستان سے باہر گزرا۔ پہلے وہ بسلسلۂ تعلیم انگلستان میں مقیم رہے پھر ترکی چلے گئے جہاں وہ انقرہ یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے تھے اور اب وہ ایک طویل عرصے سے امریکہ میں مقیم ہیں اور بوسٹن یونیورسٹی کے شعبۂ تقابلِ ادیان میں پروفیسر ہیں۔

لکھنوی کی سعادت حسن پر شریک ہو کر شاہ ہیر کے ساتھ تصویریں کھنچواتے ہیں اور انہیں اخبار کے ادبی صفحے پر شائع کرتے ہیں جس کی ادارت کی ذمہ داری بھی انہوں نے خود سنبھال رکھی ہوتی ہے۔ ان شائع شدہ تصویروں میں بھی وہ اپنی صورت سے نہیں "حرکات" سے پہچانے جاتے ہیں۔ . . لیکن وہ لوگ جن کا علم اور ادب سے گہرا تعلق ہے، ان کے لئے ڈاکٹر داؤد رہبر کا نام نیا نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب فارسی کے مشہور محقق پروفیسر محمد اقبال مرحوم (جو کسی زمانے میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل تھے) کے فرزند ہیں اور خود بھی فارسی

ڈاکٹر رہبر بڑی شگفتہ نثر لکھتے ہیں۔ شاعری سے انھیں دلچسپی تو تھی لیکن یہ معلوم۔ تھا کہ یہ دلچسپی اس حد تک "خطرناک" ہے کہ وہ شاعر بنیر کو بھی پیچھے چھوڑ جائیں گے ۱۹۹۹ء میں ڈاکٹر صاحب نے دہلی کے جشنِ غالب میں شرکت کی اور غالب کا روحانی تصرف کچھ ایسا ہوا کہ وہ باقاعدہ شاعر ہو گئے اور اگلے دو برسوں میں انہوں نے تین سو غزلیں کہہ ڈالیں سو غزلیں اسی رسالے میں ہونا اسٹیٹ کھدیتے۔ پچاس کی تعداد میں "شائع" کی گئیں۔ دوسری مرتبہ یہ غزلیں "سحرِ صدرِ دل" کے نام سے طبع ہوئیں۔ امریکہ کے ایک پبلشر نے یہ کتاب ایک سو کی تعداد میں شائع کی ہے۔ یہ اردو کی پہلی کتاب ہے جو امریکہ میں چھپی ہے اور یہی اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

غزل بڑی سخت جان صنفِ سخن ہے۔ اس نے ہر دور میں ہر طرح کے عذاب سہے ہیں اور ایسے ایسے شاعروں کو جھیلا ہے جن کو کسی دوسری صنفِ سخن نے نہیں بادوق لوگوں نے بھی اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ خود ہمارے دور میں ایسے ایسے "باکمال" غزل گو موجود ہیں جنھوں نے غزل کو رسوائی کا وسیلہ بنا رکھا ہے (رسوائی اپنی بھی اور صنفِ غزل کی بھی) قلی قطب شاہ سے لے کر ابو رشعور تک ایسے شاعر انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جن کا اندازِ سخن مسعود ہو اور جن کے ہر شعر پر ان کی اپنی چھاپ ہو۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کو بھی انھیں شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے ان کی غزلوں کو پہچان کے لئے کوئی نام دیا جائے تو بہترین نام "عجب غریب غزلیں" ہو سکتا ہے۔ یہ معنی کے اعتبار سے عجیب اور اسلوب کے اعتبار سے غریب بلکہ غریب الغربا قسم کی چیز ہیں۔

ڈاکٹر داؤد رہبر نے ایک جگہ اپنی غزل گوئی کے بارے میں کہا ہے

رہبر کے اب مزاج میں آئی ہے پختگی
غزلوں میں اس کی صاف جھلکتا ہے بچپنا

"سحرِ صدرِ دل" کے مطالعے سے اس حال کی تصدیق ہوتی ہے ان غزلوں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بچہ کسی حیرت کدے میں پہنچ گیا ہے، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا ہے اور جو کچھ اس کی سمجھ میں آتا ہے۔ اور جو سمجھ میں نہیں آتا" اسے بھی بیان کرتا جا رہا ہے۔ اسی لئے اس کا اندازِ بیاں بھی غزل کے روایتی طریقِ اظہار سے مختلف ہو گیا ہے مثلاً یہ غزل دیکھئے:

کہتا ہے اس سے زندہ جو ہوتے اباجان
نام ہمارا کیوں نہیں رکھا محمد جان
یاد دلانا ہوں یہ کرتے نہیں ہو دھیان
ہم تم سب کے سب ہیں دنیا میں مہمان
طفل پکارا دیکھا جو اس نے قبرستان
یہ کیوں سوتے ہیں لوگ یہ سارے لمبی تان
دھیان بٹانے میں خطرہ ہی خطرہ ہے
مجھ کو کب فرصت ہے میں ہوں گرہ کٹ جان
جیتے داتوں ہی کے جسم پہ چھوڑو بات
بار چکے ہو اب نہ کہو سے لو تاوان

ٹھیک سبھی پر اس سے نہیں کہ کب نکلا
گو جوان ہیں اور بڈھے ہیں نیم جاں
اب تو رہبر سے کچھ کہہ دو اس کی زباں
سوکھ گئی ہے کہتے کہتے میری جاں

داؤد رہبر نے ایک جگہ اپنی غزل کے بارے میں یہ بھی کہا ہے:

دلِ سنگ کے اچھے برے پہلو ہیں سامنے سامنے
شعر سب اچھے برے موجود ہیں دیوان میں

شعروں کا اچھا یا بُرا ہونا اس پر منحصر نہیں کہ زندگی کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے ہوں اور اچھے پہلو سے اچھے اور برے پہلو سے بُرے شعر برآمد ہوں۔ کہنے والے تو اچھے پہلوؤں سے برے اور برے پہلوؤں سے اچھے شعر بھی نکال لیتے ہیں۔ داؤد رہبر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے زندگی کو جس طرح دیکھا ہے ویسے ہی اسے اپنے شعروں میں بیان کر دیا ہے۔ یہ بیان بڑی حد تک درست ہے ان کی غزلوں میں ایک مشرقی خود ساختہ جلاوطنی کے تحت مغرب میں زندگی بسر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک طرف اس کے گرد و پیش کا ماحول ہے اور دوسری طرف وہ دنیا جو اس کے ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔ اس دنیا کی یادیں قدم قدم پر دامنگیر ہوتی ہیں۔ متعدد غزلوں میں ماضی کی یادیں اپنا جادو جگاتی ہیں خصوصاً موسیقی کے حوالے سے۔ عرض کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر داؤد رہبر کو موسیقی سے عملی اور علمی دلچسپی ہے۔ اس کا اظہار غزلوں میں جا بجا ہوا ہے۔ مثلاً

گئی کلی، ہنڈول، سروں کا ملہار، بہار
چھوڑ کر لاہور سارے راگ بے موسم ہو گئے

راہبر سالا میں ایک شہر ان اطراف میں
جس میں سارنگی کے ایک استاد کی سنگت ملے

دھن کو گنگنا جب ایک طبعِ لطیف نے
لاشعور میں پایا گانا رہبر نے بائی سما

آلام کا گھر سمجھ کتنوں نے دنیا کو
گھر ہم نے مگر سمجھا بنسا دگھرانے کو

ڈاکٹر صاحب نے اپنی غزل کے بارے میں یہ شعر بھی کہا ہے

ستم اظہار کی صفائی نہیں ہنر کی بات
غزل میں کہتا ہوں بس ادھر اُدھر کی بات

اب کچھ ادھر اُدھر کی باتیں بھی سن لیجئے:

میں ایک طائفے کی تصویر کو پایا تھا
کہ دکھ کے دور سے عالم سے دوسرا دیا

تیری تصویر میں سب کچھ آیا
ایک کھسیا نگیں کاں ترا

کہا میں نے مریض ہوں کوئی سوالو سلاؤ
تو سارے گھر کا کوڑا اس نے میرے سر پہ ڈالا

سمجھے اس زر دو وہ صرف پایوستہ ہم
جانے دا تا ہوا اس کا ہیں اب ناہوستہ ہم

راہبر اولاد ہی کی پرورش کچھ کم نہیں
ایک نعمت مول کیوں لیں پال کر خرگوش ہم

مہرباں کو تو وہ بھی کسی جو مجھ سے یہ کہا
سیر کو تم جاؤ میرے گھر پہ سامان چھوڑ دو

"سحرِ صدرِ دل" بعض ایک دلچسپ کتاب ہے یہاں تک کہ اس میں خالص غزل کے شعر بھی ملتے ہیں، مثلاً:

تمہاری دید جب چاہی ہمہ تن گوش ہو بیٹھے
تمہاری بات سننے کو ہمیں اندازِ نظر دیکھا

یہ عشق کا معاملہ ہے دل کی ضد کا نام
آخر بہت ہیں ایسے کہ جن کو ہوا کبھی

ہے ساروں سے مرس باز تمس
کوئی آوارہ بھی رہے گی

کس کی سائی گری ہے دنیا میں
ہر طرف سے گل ہے دنیا میں
ہے دنیا کا کرم کہ لے دے کے
ایک میری گلی ہے دنیا میں

عشاق کو بس جب سے اتنا ہے علاقہ
گھر سے ہوتے پیاروں کی کوئی پھر خبر آئے

کس شان سے روس ہیں تنے کے دئے
آدمی میں مثالی ہے دو ہی ہم نے

ڈاکٹر صاحب میں چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کے بارے میں ایک شعر
جلیب سے دل میں اس صدی میں چوہدری صاحب
مرا دیا ہے انگریزی میں کیا ہے کا لہو

[redacted]

[redacted]

[redacted]

سمجھ لینے میں کیا حرج ہے؟

احمد رشید شیروانی

کبھی کبھی دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی بھی کوشش کرنی چاہئے، ضروری نہیں کہ ہم اس کے نقطۂ نظر کو مان لیں یا قبول کر لیں، مگر سمجھ تو لیں، سمجھ لینے میں کیا حرج ہے؟ مثلاً ہمارے ہندو فرقہ پرست بھائی ہیں، بھارت میں جتنے مسلمان ہیں (یعنی سیکولر مسلمان اور فرقہ پرست مسلمان سب ملاکر) فرقہ پرست ہندو شاید اس سے زیادہ ہی ہوں، اگر مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یا نہیں کیا جانا چاہئے تو فرقہ پرست ہندوؤں کو کیسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ کیا جانا چاہئے، مسلمانوں کو اپنے ووٹوں پر بڑا زعم ہے ٹھیک ہے، ہونا بھی چاہئے، مگر جتنا جتنے ووٹ مسلمانوں کے ہیں فرقہ پرست ہندوؤں کے ووٹ بھی اس سے کم تو نہیں، پھر اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ہر ایک ان کے ووٹوں کی دھونس مانے تو پھر جو کہی مسلمانوں کے پانچ کروڑ (یا چھ سات آٹھ کروڑ) ووٹوں کی دھونس مانے گا وہ فرقہ پرست ہندوؤں کے آٹھ دس کروڑ ووٹوں کو کیسے بھول جائیگا، موٹی سی بات ہے، مگر مسلمانوں کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہر ایک پارٹی بس مسلم ووٹوں کا رعب مانے، سو کیسے مان لے گی؟

اور پھر مسلمانوں کے پاس ووٹوں کے علاوہ اور کیا ہے؟ خاک دھول، فرقہ پرست ہندوؤں کے پاس روپیہ پیسہ ہے، اخبار ہیں، کارخانے ہیں، تعلیم ہے ان سب کو کیسے نظر انداز کر دیا جائے؟ مسلمان تو صرف ووٹ ہی دے سکتے ہیں، اسکے علاوہ اور کیا دیں گے کسی کو؟ بتائیے، فرقہ پرست ہندو ووٹ کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دے سکتے ہیں، کیا نہیں دے سکتے؟ اسلئے اگر کوئی لیڈر ہندو فرقہ پرستوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تو مسلمانوں کو شکایت کرنے کا کیا حق ہے؟ بس آپ ہی کا ہو کر رہ جائے یہ کیا بات ہے، آپ سے جو کوئی آپ ہی کا ہو کر رہ جائے؟

خود آپ کیا کر رہے ہیں؟

” حکومت یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال نہیں کرتی “ بالکل ٹھیک، کبھی یہ بھی سوچئے کہ خود آپ کیا کیا نہیں کرتے اور کیا کر رہے ہیں، حکومت ہماری مسلم یونیورسٹی کو ” اقلیتی کردار “ نہیں دے رہی ہے، واقعی شکایت ٹھیک تھی مگر پیسے سترہ برس تک حکومت نے، بلکہ حکومتوں نے، اس کے لئے کچھ نہیں کیا، ثبوت دیا کہ مسلم یونیورسٹی کو اقلیتی کردار نہ دے کر، مگر بالآخر یہ جنگ مار کے دیا ” اقلیتی کردار “ اس کے بعد سے اب تک خود مسلمان اس ” اقلیتی کردار “ کا کیا کر رہے ہیں؟

اپنی یونیورسٹی کا وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور ٹریژرار تک چن نہیں پائے، ایگزیکٹو کونسل اور مسلم یونیورسٹی کورٹ دونوں کی کارروائی عدالت عالیہ کے حکم امتناعی سے رکی پڑی ہے، سترہ برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد مسلمانوں نے اپنی یونیورسٹی کو جمہوری طریقے سے چلانے کا حق حاصل کیا، وہ خود چند مسلمانوں کے دائر کردہ مقدموں کی وجہ سے غصب ہو گیا، مسلم یونیورسٹی کو ایک فرد واحد یعنی سید حامد صاحب اپنے ” مرجنسی اختیارات “ سے چلا رہے ہیں، ” اکابرِ ملت “ بھی کہہ چکے اور ” رہبرِ ملت “ بھی کہہ چکے اور آل انڈیا مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی بھی کہہ چکی کہ یہ سب مقدمات واپس لئے جائیں تاکہ مسلم یونیورسٹی طریقے سے چل سکے اور تمام فیصلے ایگزیکٹو کونسل اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ذریعہ ہوں، لیکن چند حضرات نہیں مانے، مسلم یونیورسٹی کو جو نقصان ہو رہا ہے اسکی پرواہ کئے بغیر وہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں، اب ان چند مسلمانوں سے مسلم یونیورسٹی کو بچانے کیلئے کوئی بھی طریقہ کارگر نہیں ہو رہا ہے، یہ کبھی کبھار مسلم یونیورسٹی کے ساتھ ہوتا ہے۔

اسکے علاوہ دور دور جہاں جہاں مسلم ادارے ہیں، آزادی کے بعد ان پر جو کچھ گزری ہے، مسلم اقلیتی کردار کو تسلیم کرایا جاتا ہے، وہ اسپیشل مسلمان ہیں، جو مسلمان مسلمانوں کے ساتھ یہ کر رہے ہیں، سب مسلمان اور یہ سب مسلمانوں کے اپنے بچوں کے مستقبل کا خون کر رہے ہیں، ان اداروں کو کس نے اقلیتی کردار دلایا ہے اور اقلیتی کردار کے ساتھ جو خصوصی اختیارات اور آزادی ان اداروں کے مسلم منتظمین کو ملی ہوئی ہے اس کا استعمال مسلم بچوں کی تعلیم کو چوپٹ کرنے کیلئے ہو رہا ہے، کوئی ” اکابرِ ملت “ فکرمند نہیں، کسی ” ہمدردِ ملت “ کو غم نہیں، کوئی ” محسن المسلمین “ پریشان نہیں، ارے صاحب ان سب کو خبر ہی نہیں کہ وہ کون سے مسلم ادارے ہیں جہاں مسلم بچوں کی تعلیم کو الٹی چھری سے ذبح کیا جا رہا ہے، یقین نہیں آتا؟ تو ذرا کسی لیڈر المسلمین سے پوچھ کر دیکھ لیجئے، اگر ان دو درجن میں سے وہ آدھی درجن کے نام بتا دیں تو میں مان لوں کا کہ ہاں یہ لیڈر المسلمین صحیح باخبر ہیں۔

اردو کے دشمن کون؟

” ہائے اردو “ اور ” وائے اردو “ کے نعرے روز سن لیجئے، لیکن جن تین ہزار سے زیادہ پرائمری اسکولوں میں اردو ٹیچر تعینات ہو چکے ہیں وہاں جا کر اردو کی تعلیم کی حالت دیکھئے، اردو کے نام پر ٹیچری

کی جگہ حاصل کر سکتا تو سب سے ادھر ہیں گے، جنکو حکومت کی اور جو اردو پڑھانے پر مامور ہو گئے وہ کیا کر رہے ہیں؟ معلوم ہے کسی کو، یو پی اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن اردو ٹیچرز کے حقوق کی بات تو کرے گی (اور اسے ضرور کرنی چاہیئے اور زیادہ کرنی چاہیئے) مگر کیا آپ نے کبھی سنا کہ کسی جگہ کی اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کے کسی لیڈر صاحب نے یہ بھی بتایا ہو کہ انکی عظیم الشان تنظیم کے ممبران فلاں شہر یا فلاں قصبے میں اردو کی تعلیم کو کتنا فروغ دے رہے ہیں؟

انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ اتر پردیش اردو کیلئے حکومت سے مطالبات تو کرتی ہے (اور اسے ضرور کرنی چاہیئے اور زیادہ کرنی چاہیئے) مگر ابھی تک کسی ایک جگہ بھی اردو کی تعلیم کا جائزہ لے کر یہ انجمن نہیں بتا سکی کہ فلاں ضلع میں یا فلاں شہر یا فلاں قصبے میں گذشتہ تین برس میں اردو پڑھنے والے بچوں کی تعداد فلاں کلاس میں اتنی بڑھی یا اتنی گھٹی، بار بار اس انجمن کی صدر صاحبہ کی طرف سے اپنی انجمن کے مقامی کارکنوں کے نام اپیلیں اور ہدایتیں شائع ہوئی ہیں، کہ سروے کریں اور کرکے بتائیں کہ انکے علاقے میں اردو کی تعلیم کی حالت کیا ہے۔ مگر ایسا کوئی سروے ابھی تک منظر عام پر تو آیا نہیں، اگر آیا اور میں نے نہیں دیکھا تو اب مجھے بتا دیا جائے، میں مشکور و ممنون ہوں گا،

اردو کے دشمن اغیار تو ہیں ہی، ان کو برا بھلا تو کہا ہی جاتا ہے، انکی تنگ دلی اور کینہ پروری وغیرہ کی شکایتیں تو کی جاتی ہیں، ضرور کی جانی چاہیئے، اور زیادہ زور سے کی جانی چاہیئے، مگر خود اردو والوں کی سرد مہری، بے عملی، ناکردگی کی شکایتیں بہت کم سننے میں آتی ہیں،

سرکاری ملازمتیں

"ہائے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتیں اتنی کم ملتی ہیں" یہ شکایت تو دن میں پانچ بار کی جائیگی، کون سی ملازمت کیلئے مقابلے کے امتحان میں کتنے مسلمان شریک ہوئے، یہ بات کسی نے ابھی تک بتائی؟ اگر بتائی اور میں نے نہیں سنی تو بڑا کرم ہوگا اگر کوئی صاحب مجھے بتا دیں کہ ہاں فلاں شخص نے فلاں مقابلے میں امتحان میں شریک ہونے والوں میں مسلمانوں کی تعداد اور تناسب کی بابت معلومات فراہم کی تھی،

ہاں انفرادی طور پر کئی مسلمان شکایت کرتے ہیں کہ میں فلاں مقابلے میں بیٹھا مگر نہیں لیا گیا، یہ شکایتیں بھی ٹھیک ہوں گی، ضرور کی جانی چاہیئے، اور زیادہ کی جائیں لیکن کسی ایک مقابلے کے امتحان میں کوئی صاحب مجھے گن کر بتا دیں کہ کل اتنے لوگ شریک ہوئے جن میں مسلمان اتنے تھے، ضرور کسی دکھی نے کبھی نہ کبھی بتایا ہوگا، میں نے نہیں پڑھا کوئی محترم مجھے اب بتا دیں، ملک میں ہر سال کم سے کم پانچ سو مقابلے کے امتحان مختلف قسم کی ملازمتوں کے لیے ہوتے ہونگے، ان میں سے کسی پانچ کی بابت یہ معلومات کوئی مسلمانوں کی جماعت یا جمعیتہ یا مجلس یا انجمن یا تنظیم یا پارٹی یا فرنٹ یا محاذ یا اکھاڑہ حاصل کرکے پیش کر دے،

فرقہ وارانہ فسادات

ہاں ایک معاملہ ہے یعنی فرقہ وارانہ فسادات کا جس میں مسلمان واقعی مظلوم بھی ہیں اور بے بس ولاچار بھی، اس معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ اور بے قصور مسلمانوں کے ساتھ سچ مچ بڑی زیادتی ہوتی ہے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ ہوتی ہے، کھلم کھلا ہوتی ہے اخباروں میں رپوٹیں شائع ہو چکی ہیں، لاکھوں کی اشاعت والے مصور ہفت روزہ جریدوں کے سرورق پر رنگین تصاویر چھپ چکی ہیں، جن سے مسلمانوں کی مظلومیت اور پولس و سرکاری مشینری کا ظلم ثابت ہے مگر کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا، اس معاملے میں میرے جذبات بھی بالکل وہی ہیں جو کسی اور مسلمان کے ہو سکتے ہیں،

کتنے ہوں گے؟

لیکن اتنے فسادات ہوئے، حکومت کی مشینری کی صریحاً زیادتیوں کی اتنی شکایتیں ہوئیں کانگریس کے راج میں بھی اور جنتا پارٹی اور چرن سنگھ کے راج میں بھی، مگر کیا کسی ایک بھی مسلم لیڈر نے اپنی ہی پارٹی کے متعصب ہندو لیڈروں کے خلاف اسٹینڈ لیتے ہوئے پارٹی چھوڑی؟ اور مختلف وجوہات سے ہزاروں بلکہ دسیوں ہزار مسلمان پارٹی بدل چکے ہوں گے، مجھے ٹکٹ نہیں ملا تو یہ لو میں چلا... کانگریس سے لوک دل میں، اور مجھے سکریٹری پد نہیں ملا تو یہ لو میں چلا کانگریس فار ڈموکریسی سے اور پہونچا کانگریس فار ڈکٹیٹر شپ میں، مجھ سے چندے کا حساب مانگا گیا تو میں نے چھوڑی جنتا پارٹی اور بن گیا بی ڈی پی کا ممبر فلاں پارٹی لیڈر نے میرا سلام نہیں لیا تو میں نے فوراً دوسری پارٹی کے دفتر کی راہ لی، اور جاکر اسکے لیڈر کے قدم چومے!

لیکن اب تک کتنے مسلم لیڈروں نے کسی حکمراں پارٹی سے اس لئے استعفےٰ پیش کیا کہ کسی مقام پر مسلمانوں کے ساتھ فرقہ وارانہ فساد میں بالکل کھلی زیادتی، صریحاً کھلا ظلم ہوا؟ ایک آدھ ہی ایسے ہوں گے، ایسے مسلم لیڈروں کے نام کوئی صاحب مجھے بتا دیں، نوازش ہوگی،

مگر بات تو شروع ہوئی تھی ہندو فرقہ پرستوں سے، ختم ہو گئی مسلم موقع پرستوں پر؟ جی ہاں، مگر دراصل ہندو فرقہ پرستوں کی اصل شکایت بھی یہی ہے کہ مسلمان دوسروں کی...

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

فرید آباد میں ایک یادگار مشاعرہ

صدر انجمن جناب واسدیو ساہنی کیطرف سے تمام شعراء بلکہ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں اور سامعین کیلئے بھی پُر تکلف کھانے کا انتظام کیا گیا تھا، شعراء اور معزز مہمانوں کیلئے ہوٹل میں کمرے مخصوص اور انکے آنے جانیکے لئے کاریں بھی وقف تھیں، محکمہ نشریات کیطرف سے پورے مشاعرے کی ریکارڈنگ کے انتظامات تھے، جو پورے مشاعرے کے دوران آن رہے کہ کوئی بھی شاعر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا،

مشاعرے میں پنجاب، دلّی، اور ہریانہ کے دور دراز علاقوں سے آئے اردو ہندی پنجابی کے شعراء مدعو تھے، جو ادبی سنگم کے اسم بہ مسمّیٰ ہونیکا ثبوت دے رہے تھے، دعوت طعام کے بعد ٹھیک ۹ بجے مشاعرہ شروع ہوا، مشاعرے کی صدارت ادبی سنگم کے مستقل صدر جناب واسدیو ساہنی نے کی، اور ان شعروں پر خوب داد ملی،

تمہارے در پہ نئے زخم لینے آیا ہوں
جو زخم پہلے دیئے تھے وہ بھرتے جاتے ہیں
(امر ساہنی)

ان اشعار پر جی بھر کے داد حاصل کی،

تو اپنے نازک پتوں پر اتنا بھی مت اترا بانے !!
ڈھلتا ہے سورج سا کچھ سے کچھ اسکا بھی آبھا سے

(سبھاش سمن، ہندی،)

راہواں دے رکھ چھاواں کردے اکدے نیئن
بھاویں راہی مڑکے کچھ تکدے نیئن
(سیک سدھر، پنجابی،)

کچھ غمزدہ بھی ہوتے ہیں دنیا میں زندہ دل
خوش قسمتی کی شرط نہیں خوش دلی کیساتھ
(بدر السلام قاسمی کیرانوی)

جب حق کی بات کوئی زباں سے نکل گئی
آنگن مرے مکان کا اینٹوں سے پٹ گیا
(صغیر سکندر آبادی)

بس وہی آدمی تنہائی میں رہتا ہوگا،
جس نے دنیا کو بہت پاس سے دیکھا ہوگا
(اوم پرکاش ساگر)

جنوں میں اب وہ حرارت نظر نہیں آتی
کچھ ایسا لگتا ہے تھک سے گئے ہیں دیوانے
(سید ولا الحسنین نقوی)

اسکے بعد ہندی کے نوجوان کوی شری جگن ناتھ گوتم نے اپنی کویتا میں راون اور سیتا کی دھارمک کتھا کا آج کے حالات سے موازنہ کرتے ہوئے موجودہ جنسی بے راہ روی پر ایک تیکھا طنز پیش کیا، اور سامعین سے داد حاصل کی،

موہن آجاؤ تک ہرو سبھو کا بھار
نسبندی لینے نہیں دیگی پھر اوتار
(پریم ناتھ پریمی)

مرن دی لئی مل ہی جانیگی جگہ
جین دے لئی تھاں ملے نہ ملے
(راہی)

مشاعرے کا رنگ لمحہ لمحہ نکھرتا ہی جا رہا تھا، اسٹیج سکریٹری کی انگلیاں سامعین کی نبض پر تھیں انھوں نے ترنم کی اس فضا کو رنگا رنگ بنانے کیلئے پھر ہندی کے مشہور کوی پروفیسر کیشپ پرواسی کو استدعا کی وہ اسٹیج پر تشریف لا کر ہندی شاعروں کی بلندیوں اور ہندی طرز تکلم کی نغگی سے سامعین کو روشناس کرائیں، پروفیسر صاحب نے اپنی ایک خوبصورت کویتا،

کیا چھوڑوں کیا پیار کروں

سنا کر واقعی سامعین کو اپنی ترنم آواز اور اشعار کے جادو سے مسحور کر دیا جب تک وہ کویتا پڑھتے رہے ہال واہ واہ اور تالیوں سے گونجتا رہا۔۔۔

جتنے تارے نیل گگن میں
اتنے سپن چھپے ہیں من میں
اس گھمو جیون میں بولو تو
کس کس کو سا کار کروں !
جتنی چاہ نہ اتنی راہیں
جتنا پیار نہ اتنی باہیں
آج بر دیر کا دھن دیکھ بھی
پینے کو ملتی ہیں آہیں !
(کیشپ پرواسی)

ماحول ترنم کا بنا ہوا تھا تو اردو شاعر کیوں پیچھے رہتے جناب کیشپ پرواسی کے فوراً حضرت ایاز بلّبھ گڑھی اسٹیج پر تشریف لے آئے اور اپنی نظم مزدور مہ نہایت ہی دلکش ترنم میں پڑھ کر ہال میں موسیقی کی لہریں بکھیر دیں، ایاز صاحب کے ترنم میں انفرادیت تھی وہ ترنم سے پڑھنے والے روایتی شعراء سے ہٹ کر لگ رہے تھے، اور سامعین داد دینے کی بجائے محظوظ ہو کر انکے کلام میں کھوئے ہوئے تھے، ترنم کے اس ماحول سے تحت کی طرف آنیکے لئے اب ایسے شاعر کی ضرورت تھی جو ترنم کے اس طلسم کو توڑ سکے اسکے لئے جواہر لال یونیورسٹی دلّی سے آئے ہوئے جادو بیان شاعر جناب ناشر نقوی سے کلام پیش کرنیکی درخواست کی گئی، نقوی صاحب نے اسٹیج پر آکر پھر سے مشاعرے کا نقشہ بدل دیا، انکے اشعار میں ہی اتنی غنایت اور نغگی تھی کہ تحت میں پڑھ کر بھی وہ ترنم سے دو قدم آگے تھے، ان سے یہ اشعار بار بار پڑھوائے گئے اور سامعین کا دل پھر بھی نہیں بھر پا رہا تھا،

کبھی رونا کبھی ہنسنا کبھی خوشیاں کبھی آنسو
کرایہ دار سب تھے کرائے کا مکاں ہم تھے

اور.........

ہو سکے تجھ سے تو تو سب سے بنا کر رکھنا
راز بھی اپنے کسی کا تو چھپا کر رکھنا
ایک امید ہے جو سچ کو بھی جھٹلاتی ہے
ایک عادت سی ہے کہ کو بچا کر رکھنا
بدگمانی بڑی پُرکار ہوا کرتی ہے
اپنا سر اپنے ہی پتھر سے بچا کر رکھنا

(نقوی)

ناشر نقوی کے بعد پختہ کار اور منجھے ہوئے شاعر ہی لائے جا سکتے تھے اسلئے انکے بعد جناب انجم زیدی، اوم کرشن راحت، ستنام سنگھ خمار، خوش سرحدی ضیا فتح آبادی نے اپنا اپنا کلام سنایا اور انہیں کے دم سے ہی اختتام تک مشاعرہ پورے عروج پر رہا، ان شعراء نے اپنے ان اشعار پر بے پناہ داد... حاصل کی!

ہم بھی چپٹے رہے اس سے کسی پائل کی طرح
عمر بھر زیست چھڑاتی رہی داماں ہم سے

(انجم زیدی)

بپھریں گے بار بار یہ مذہب گزیدہ لوگ
ان پاگلوں کے ہاتھ میں خنجر نہ چھوڑیئے
کیا جانیں کب تراش کے رکھ دیں کوئی خدا
ان بت گروں کے شہر میں پتھر نہ چھوڑیئے

(اوم کرشن راحت)

زندگی ہے نشاط و کیف و سرور
خوگر غم فضول زندہ ہے!
یا سمجھتا نہیں اصول حیات
یا خلاف اصول زندہ ہے!

(خوش سرحدی)

دل وحشی کی کفر سامانی
کربلا کے سوا کچھ اور نہیں

(ضیا فتح آبادی)

ہر ایک سمت وہ شعلے اچھالنے والا،
جنہیں نے دیکھا تو کاغذ کے گھر لہتا تھا

(عشرت کرتپوری)

مشاعرے کے آخر میں ستنام سنگھ خمار نے اپنے مرصع کلام اور جادوئی ترنم سے ایکبار پھر مشاعرہ لوٹ لیا انکے اشعار تو سامعین کے دل میں اترتے چلے گئے!

جو گٹھڑی باندھ کر ہستی کی اپنے ساتھ لایا ہے
مسافر کو وہ سامان سفر سونے نہیں دیتا

آخر میں صاحب صدر جناب واسدیو ساہنی نے اپنی غزل کے چند اشعار پیش کئے، اور شکریئے کے ساتھ مشاعرہ ختم کرنے کا اعلان کیا، رات کے ساڑھے بارہ بجے..... سامعین ساہنی صاحب کا یہ شعر گنگناتے ہوئے ہال سے باہر نکل رہے تھے،

الہام سے بنے بڑھ کے دل مبتلا کی بات
یہ شاعری کی بات ہے گویا خدا کی بات

بقیہ سمجھ لینے میں کیا حرج ہے

شکایتیں بہت زیادہ کرتے ہیں خود جو کرنا چاہیئے وہ نہیں کرتے، خود تو پڑھیں گے نہیں لکھیں گے نہیں مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہوں گے نہیں، اور پھر چلائیں گے "ہائے ہمکو پندرہ فیصد سرکاری ملازمتیں دیدو" پہلے چلا چلا کر اردو کو نمبر رکھوائیں گے پھر خود اپنے ہی بچوں کو ان سے اردو نہیں پڑھوائیں گے۔ پہلے گلا پھاڑ پھاڑ کر مسلم یونیورسٹی کا "اقلیتی کردار" مانگیں گے، پھر آپس میں وہ جوتم پیزار ہوگی کہ توبہ بھلی پہلے پاکستان بنوائیں گے، سرکاری ملازمتوں والے مسلمان اپنی مرضی سے اپنا تبادلہ پاکستان کرالیں گے پھر چلائیں گے "ہائے سرکاری ملازمتوں میں مسلمان اتنے کم ہوگئے" کھاتے پیتے مسلمان اپنا بزنس اور اپنی جائدادیں بیچ کر، روپیہ چپکے سے بھجوا کر پاکستان کھسک لیں گے پھر چیخیں گے کہ "ہائے مسلمان غریب ہوگئے، ہائے سارا بزنس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

میں نہیں کہتا کہ ہندو فرقہ پرستوں کی سب باتیں صحیح ہیں، میں کہتا ہوں بیشتر غلط ہیں، مگر کبھی ٹھنڈے دل سے غور کر کے یہ بھی دیکھا جائے کہ کس حد تک کچھ باتیں ان کی ٹھیک بھی ہیں یا نہیں اپنے دشمن کی بات کو بھی اگر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کبھی کبھی اس میں سے بھی اپنے فائدے کا کوئی پہلو نکل آتا ہے، اور جو بات اچھی لگے وہ ضروری نہیں مفید ہی ہو، اور جو بات کڑوی لگے اسی میں کچھ اپنی بھلائی مضمر ہوتی ہے، مسلمانوں کیلئے دوسروں کو کیا کرنا چاہیئے؟ یہ بھی ایک اہم سوال ہے، مگر اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ خود مسلمان کو اپنے لئے کیا کرنا چاہیئے،

بقیہ اُگتے سورج کا اغوا

مقتول کا زمین و تاریخ سے رابطہ منقطع نہیں ہو سکتا......، چاہے انھیں سپرد خاک اور پھانسی کے پھندے کے حوالے ہی کیوں نہ کر دیا جائے.....؛ عجائب گھر برے بھلوں کا زندہ قبرستان ہی نہیں بلکہ گرم اور ٹھنڈے سماجی مظاہر کا شمشان بھی ہوا کرتا ہے...؛ شراب و شباب کا دھندا کرنے والا جتنا مجرم ہے اتنا ہی ایک فرقہ پرست اور شرابی شخص انسانی سماج کا ملزم ہوا کرتا ہے......؛ لیکن جانب داری اور دھرموں میں بٹ جانے والے افراد آج بھی امن و انصاف اور بھائی چارے کا گلا گھونٹ کر ملک و قوم میں استاذی و عیاری کے ساتھ زندہ ہیں.....اور انسانیت کا اقبال سر پیٹ رہا ہے۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جسمیں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔

دو نظمیں

ہم پہ الزام کیا دیا جائے
نام ہیں سر تیرا لایا جائے
اپنے ہونٹوں کو سی لیا جائے
ایسے اس دور میں جیا جائے
زہر بڑی سی پیا جائے
بخدا کیا، کیا جائے
دنیا ہے کا سراں نام وفاں
اب نہ آؤں گا پھر جو جاؤں گا
پھر ترے شہر میں نہ آؤں گا
رونق دنی
سہاب

دیکھ لی طوطا چشمی دوراں
ہر قدم پہ فریب چارہ گراں
ایک تفرقِ درعیاں و نہاں
اٹھ گیا اعتبارِ زندہ دلاں
رہ گیا امتیازِ این و آں
ورشِ غم سے ذہن و دل ہیں

ہونٹ بھی اپنے دانت بھی اپنے
غیر کوئی نہیں، سبھی اپنے
وہ جو دم سازتھے کبھی اپنے
آج شاکی بھی ہیں یہی اپنے
دھوپ مرکز پہ آ گئی اپنے
نہ کسی کا ہے کوئی سایہ یہاں

دیترے ناز اب اٹھاؤں گا۔ پھر ترے شہر سایہ سایہ کہیں نہ جاؤں گا

پھر ترے شہر میں

بات اک سہل تھی ہی وہ اہم
شیخ کی آن، برہمن کا بھرم
قولی یکجہتی درہم و برہم
انگبیں خلوص بن گیا سم
نذرِ آتش سہاگ اور یہ دھوں
چین اسے میں کیسے پاؤں گا۔ پھر ترے شہر میں
یہ نئی نسل کے نئے تیور
کوئی سرکش ہے کوئی ہے خودسر
ہوٹل آباد اور سینما گھر
نظمِ تعلیم جن کا زیر و زبر
حق اور انصاف سے بری یکسر
اور ماں باپ ہیں وبالِ جاں
داد فریاد کس سے پاؤں گا۔

پھر ترے شہر میں

تیرے اس شہر کا رواج ہے کچھ
کل تھا کچھ اور آج ہے کچھ
گھر اور دہلیز کا مزاج ہے کچھ
اُدھر آنگن کا احتجاج ہے کچھ
مرض کچھ اور ہے علاج ہے کچھ
مرگِ انبوہ، جشنِ نوحہ گراں

نہ صلیبِ فریب اٹھاؤں گا!
پھر ترے شہر میں ..
ہونٹ بھی اپنے دا،



کتابِ حیات

خوں میں ڈوبی ہوئی ———
طباعت ہے۔
روشنائی کو،
ڈس گیا ہے غبار۔
مکھی،
پیرہن ہے ———
لفظوں کا۔
نقشِ تحریر ———
گرد آلودہ۔
طرزِ اظہار ———
سازِ پارینہ
مردنی چھائی ہے،
فصاحت پہ
ٹائیٹل ———
موت کا مرقع ہے۔
جب سے / دیکھی ہے،
زندگی کی کتاب
طالبِ علم ———
ہوگیا خاموش !!!

شفیع اللہ خاں راز آبادی

اندھے ہاتھ

اندھا فقیر آیا اور اس کو میں نے ایک چونّی دی
اس نے چونّی لے لی اور پھر ٹھہر ٹھہر کر یوں بولا :
"اندھے کو دھوکا دیتے ہو بابو! چونّی کھوٹی ہے"
اس کے وہ الفاظ تھے یا تیتی سنگین نفرت کی !
اور بھی کچھ ویران ہو گئی تھیں اس کی ویران آنکھیں
اور بھی کچھ بڑھ گئی تھی جیسے عمر اس کی ناداری کی
میں نے حیرت سے اس اندھے کو دیکھا اور پھر پوچھا
"تم تو اندھے ہو تم کو کیسے اس بات کا علم ہوا؟
تم نے آخر کیسے جانا کہ چونّی کھوٹی ہے ؟"
اس نے ہنس کر کہا "یہ آنکھیں تو اندھی ہو سکتی ہیں
لیکن ہاتھ تو ہاتھ ہیں بابو، یہ کب اندھے ہوتے ہیں؟"
میں نے چونّی اس کے ہاتھ سے لیکر اس پہ نظر ڈالی
پنجم جارج کے وقت کی وہ اصلی چاندی کی چونّی تھی
میرا جی چاہا میں اُس سے کہہ دوں صرف آنکھیں ہی نہیں
روشن آنکھوں کے اس دور میں ہاتھ بھی اندھے ہوتے ہیں
لیکن پھر کچھ سوچ کے میں خاموش رہا۔ آخر مجھ کو
کیا حق تھا اک اندھے کے ہاتھوں کو قلم کر دینے کا؟

اقبال انصاری

"گمشدہ چہروں کے بیچ"

ہر ایک چہرے پہ
اِک نقاب وفا ہے لیکن
وفا کہاں ہے ؟
یہ لوگ ہنستے لیکن ان کی ہنسی میں
رنگِ طرب نہیں ہے
یہ کھوکھلے چہرے
جن کی نظریں
فقط خلاؤں کو گھورتی ہیں
بس اک گھنی تیرگی ہے
کوئی کرن نہیں ہے کہ جگمگائے
میں خود کو اس جمگھٹے میں
گم کرتی جا رہی ہوں !

نیناجوگن

پیڑ

یوکلپٹس کا وہ بوڑھا پیڑ بھی
اب گر چکا ہے۔
بنایا تھا جسے ہم نے کبھی اپنی محبت کا امیں۔
ہوا کی انگلیوں سے جس پہ لکھی تھی
مرے شاداب لمحوں کی کہانی
زرد موسم نے اسے بھی کھا لیا ہے۔
ہوا ریت سے ساحل کی
قدموں کے نشاں بھی لے گئی
اک موج آوارہ
لمس کی خوشبو
مقید ہو گئی ہے
بے حسی کے غار میں
اب تکلف کے بکھرتے ہر شوق کی طنابیں
ٹوٹنے کی حد میں داخل ہو چکی ہیں۔
اس سے پہلے کہ ۔
خلاؤں میں بھٹکتی آرزوئیں خودکشی کر لیں
چلو ہم اجنبیت کی اندھیری وسعتوں میں ڈوب جائیں

نیا سال

لوگ کہتے ہیں نیا سال مبارک ہو تمہیں
ہر نئے سال کی آمد پہ گماں ہوتا ہے
ہر نئے سال میں احساس جواں ہوتا ہے
شاید اس سال ہی ہم لوگ کی قسمت جاگے
شاید اس سال غریبوں سے غریبی بھاگے
شاید یہ سال اُمیدوں کو تجلّی دے گا
اُجڑے لوگوں کو نیا سال تسلّی دے گا
شاید یہ سال امنگوں کا ترانہ گائے

شاید یہ سال کوئی جشن بہاراں لائے
گزرے برسوں کا ہر ایک زخم بھلا دے شاید
ہر نیا سال مگر آ کے گزر جاتا ہے
دن وہی رات وہی صبح وہی شام وہی
زیست پژمردہ وہی زیست کا ہنگام وہی
پھر وہی آپسی نفرت کے مہکتے شعلے
بھوک افلاس غریبی کے لپکتے شعلے
کہیں آہیں کہیں نالے تو کہیں چیخ و پکار
کہیں روٹی کی صدائیں کہیں حجت تکرار
کہیں لٹتی ہوئی بستی کہیں جلتے ہوئے گھر
پھر وہی دھوپ میں جلتا ہوا دہقاں کا بدن
پھر وہ مُرجھائے سے چہرے وہی جھلسا ہوا تن
پھر وہی ظلم وہی ظُلم کا بڑھتا طوفاں
پھر وہ مظلوم کی دل دوز کراہوں کا سماں
کہیں تاریک مقدر کہیں تاروں کی چمک
کہیں لوہے کی سلاخیں کہیں پائل کی چھنک
کہیں چیتھڑوں کی تمنا کہیں کم خواب کی بات
کہیں گدّے کہیں مسند کہیں ٹھٹھری ہوئی رات
اے نئے سال تو اس سال بدل دے خود کو!

شین عرفی

۱ وقت ایم۔کے۔اثر

صحن سے لگی ہوئی بچی بلک رہی ہے
پتھر کی طرح ماں بے سدھ پڑی ہوئی ہے
اور وقت کا کالا ناگ پھن پھیلائے جھوم رہا ہے

۲ احساس

آغاز چونکا ہے
انجام سر چھپا لیتا ہے
چند ساعتوں کے بعد
میرے اندر کا "میں" ہنس دیتا ہے۔

۳ لاوا

بیکراں لمحوں کا کرب ــ آدمی
سرخ سرخ ٹھوکروں کا ــ آئینہ

اندر اندر
منتشر ہوتا ہوا
حلقۂ انتشار میں ــ سرنگوں
کرتا ہوا ــ سمجھوتا
وقت سے
آتش فشاں کی مانند۔

۴ ٹوٹی لکیریں

لاشعوری طور پر
برش سے نکلی ہوئی کچھ لکیریں
پھیل کر بنتی گئیں
سیاہ آنکھوں والی
ایک تصویر!
اور پھر
منتشر ذہنوں کا محور
سلسلہ در سلسلہ چلتا رہا
چشم تصویر سے چند شعاعیں چھلکی ہوئیں
بن گئیں پیرہن جسم فنکار کا
دفعتاً
عکس و معکوس دونوں ہی معدوم تھے

نظمیں

"ہو چلی شام"

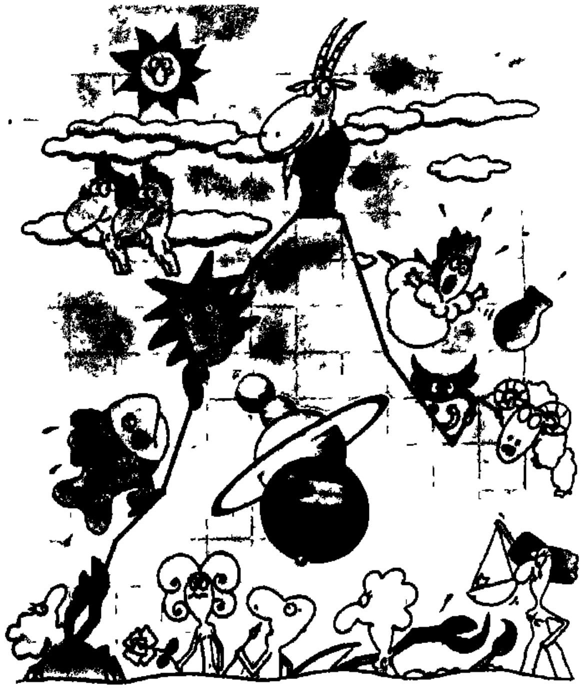
ہو چلی شام چلو اپنے بسیروں میں چلیں
پھر انہیں تلخ مگر نرم اندھیروں میں چلیں
اتنی تہذیبوں نے روندا ہے مسلسل کہ ہمیں
اب تو غاروں کی حرارت ہی بچا سکتی ہے

زندگی عقل سے معیار تو پا سکتی ہے
ایک صحرا میں کئی شہر بسا سکتی ہے
مطمئن لاکھ سہی اپنے عمل سے پھر بھی
عقل کے ساتھ یقیں ہو تو سکوں ملتا ہے

جس سے ملتے ہیں وہی سر بہ جنوں ملتا ہے
اپنی ہی ذات کے معبد میں نگوں ملتا ہے
جانے وہ کون سا لمحہ تھا جو دم توڑ گیا
ہم کو ہر دور میں جینے کی دعائیں دے کر

چندر بھان خیال

یہ ہندستان ہے یارو یہاں ایسا بھی ہوتا ہے
چمن کیسا ببولوں کے یہاں جنگل سرستے ہیں
ترقی کے لئے جمہوریت کے تنگ رستے ہیں
کروڑوں لوگ اک لمحہ خوشی کو بھی ترستے ہیں
امیروں کے لبوں سے پھول سے پیہم برستے ہیں
یہاں مزدور لیکن خون کے آنسو ہی روتا ہے
یہ ہندستان ہے یارو یہاں ایسا بھی ہوتا ہے
فساد و فتنہ و شر کی یہاں ملتی ہیں سوغاتیں
یہاں ہیں رنگ و نسل و قوم و مذہب کی خرافاتیں
یہاں ہمدرد بن کر دوستوں سے ہوتی ہیں گھاتیں
یہاں ہر سال آتی ہیں تباہی لے کے برساتیں
یہاں سیلاب کا پانی ہزاروں کو ڈبوتا ہے
یہ ہندستان ہے یارو یہاں ایسا بھی ہوتا ہے
یہاں صوبہ پرستی اکثر اپنا سر اٹھاتی ہے
یہاں غنڈوں کی مستی روز کوئی گل کھلاتی ہے
یہاں اہل ہنر کی تنگ دستی بڑھتی جاتی ہے
ہر اک جانب یہاں بے رونقی ہے بے ثباتی ہے
یہاں کا آدمی کا جو سپنا سکھ کی نیند سوتا ہے
یہ ہندستان ہے یارو یہاں ایسا بھی ہوتا ہے
یہاں رشوت کی رہتی ہے ہمیشہ گرم بازاری
تعفن سے بھرا ہے محکمہ جو بھی ہے سرکاری
بڑے افسر بڑے لیڈر سبھی کو ہے یہ بیماری
اسی کو کامیابی ہے جسے آتی ہے عیاری
یہاں تو بہتی گنگا میں ہی پاپی ہاتھ دھوتا ہے
یہ ہندستان ہے یارو یہاں ایسا بھی ہوتا ہے
یہاں جھوٹوں کا کاروبار بے خوفی سے چلتا ہے
یہاں نیتا کسی مطلب سے اپنا دل بدلتا ہے
برائی کا یہاں اچھائی میں پہلو نکلتا ہے
یہاں اپنوں کی خوش حالی پہ بس اپنا ہی جلتا ہے
یہاں ہر شخص نفرت میں محبت کو سموتا ہے
یہ ہندستان ہے یارو یہاں ایسا بھی ہوتا ہے
یہاں رشتہ ہے اجلے چہروں کا کالی کمائی سے
یہاں املاک کے باعث جدا ہے بھائی بھائی سے
یہاں دھوئے ہیں کتنے ہی ہاتھوں کی صفائی سے
یہاں مشکل ہوا آساں افسروں کی آشنائی سے
وہ محنت کش ہے فاقے سے جو دن بھر بوجھ ڈھوتا ہے
یہ ہندستان ہے یارو یہاں ایسا بھی ہوتا ہے



یہاں رنگ و مذاہب پہ زبانوں پہ یہاں جھگڑے
تعصب ہے عقائد پہ لباسوں پہ یہاں جھگڑے
تعصب ہے طریقے پہ اذانوں پہ یہاں جھگڑے
یہاں ناقوس پہ جھگڑے دکانوں پہ یہاں جھگڑے
مکانوں پہ یہاں جھگڑے تعصب کی ہے پروردا
یہاں ہر آدمی بالا تعصب [illegible]
یہ ہندستان ہے یارو یہاں ایسا بھی ہوتا ہے
یہاں [illegible] آزادی
[illegible] آبادی
[illegible] شادی
[illegible] فولادی
[illegible] دکھوتا ہے
یہ ہندستان ہے یارو یہاں ایسا بھی ہوتا ہے

عبدالسلام محمد حقی
ارجمیا بلڈنگ۔ مل روڈ چھتر پور ایم پی

۱

اپنی الجھن میں گرفتار ہے آپ
خود وہ اپنے لئے آزار ہے آپ
کیا کسی کو وہ سہارا دے گا
وہ تو گرتی ہوئی دیوار ہے آپ
اپنے پندار کی ہے خود وہ نفی !
اپنے اقرار کا انکار ہے آپ
کون کرتا ہے کسی کی پرسش
ہر کوئی اپنا ہی غم خوار ہے آپ
زر بااب جو مخالف کوئی
اپنی گردن پہ وہ تلوار ہے آپ
چھاک کیا دل کا دکھائیں محسن
زخم خود اپنا ہی اظہار ہے آپ

۲

آسماں اپنی بلندی سے گرا کیا اب کے سال
بن گئے کتنے ہی ذرے عرش پیما اب کے سال
دیکھئے وہ کیا دکھاتا ہے تماشا اب کے سال
اس کے تن پر اور ہی کوئی ہے چولا اب کے سال
ہر گا وصل دوست یا خون تمنا اب کے سال
فیصلہ کن موڑ پر ہے دل کا قصہ اب کے سال
جس سفر پہ لوگ جاتے ہیں محافظ لیکے ساتھ
اس سفر پر میں نکل آیا ہوں تنہا اب کے سال
اب نہ اگلی سی ملاقاتیں نہ اب وہ چاہتیں
دوستوں کا ہے عجب ہی کچھ رویہ اب کے سال
بھیڑ تو لوگوں کی ہے لیکن کوئی چہرہ نہیں
آئینہ تکتا ہے خود اپنا ہی چہرہ اب کے سال
صاحب افسر تھے جو محسن ابھی پچھلے برس
سر برہنہ پھر رہے ہیں ہو کے رسوا اب کے سال

محسن زیدی

۱

میں جو اک جھیل ہوں بستی ہے یہ پانی میری
روز سنتی ہے تری پیاس کہانی میری
بانٹ لے تو مری تنہائی بھی خوابوں کی طرح
اور پھر چوم اکیلے میں نشانی میری
ڈھل گیا شام کے صحراؤں میں سورج تیرا
جل گئی صبح کے باغوں میں جوانی میری
پاس میں ڈوب گیا سرمئی ساحل کا سکوں
آج بھی ہو نہ سکی شام سہانی میری
میں نے لمحوں کی رفاقت کو گوارا نہ کیا
اور اس نے بھی کبھی بات نہ مانی میری
لکھنا اور لکھ کے جلا دینا ترے نام خطوط
کھیلنا آگ سے عادت ہے پرانی میری

۲

یہ داستان اور کہاں تک سنائیں ہم
اے کرب ذات تجھ کو کہاں لے کے جائیں ہم
کتنے تمام روک کے اشکوں کو پڑھ لئے
چل اے شب فراق اب آنسو بہائیں ہم
یہ زندگی دراصل ہمارے لئے نہیں
اس بے وفا کو آج کہیں چھوڑ آئیں ہم
وہ کون لوگ تھے جنھیں آسودگی ملی
لے کر یہی سوال کہیں ڈوب جائیں ہم
پھر اک جمود سا ہے حریفوں کے شہر میں
راہی پھر اک غزل کہیں شائع کرائیں ہم

۳

چاند کھلایا کنول تالاب کا
لے کے ڈوبے گا سفینہ خواب کا
بستیاں پھر باندھ پر بس جائیں گی
آ گیا موسم اگر سیلاب کا
لہر چھلنے پر کھلا پتھر تھا وہ
پھر وہ پچھتانا دل بے تاب کا
ہو گیا آخر اکیلا ہر سنگھار
ڈھل گیا موسم دل شاداب کا
سرمئی آنکھوں کے جگنو بجھ گئے
صحن جب دیکھا شب مہتاب کا
رات پانی میں کوئی صورت نہ تھی
عکس باقی تھا مگر محراب کا
سو گئے سورج کے شہزادے کہیں
جال پھر تاروں نے پھینکا خواب کا

ایم کوٹھیاوی راہی

ٹھوکر کے بنا لوگ گزر کیوں نہیں جاتے
پتھر ہو مقابل تو ٹھہر کیوں نہیں جاتے
راہوں کے یہ ذرّے بھی ستارے ہیں فلک کے
پھر اُونچے مکانوں سے اُتر کیوں نہیں جاتے
گھِر آئے ہیں جو ذہن پر خدشات کے بادل
وہ جھوٹے دلاسوں سے بکھر کیوں نہیں جاتے
یہ بحرِ حوادث کی پُراسرار خموشی!
ڈوبے جو نہیں ہو تو اُبھر کیوں نہیں جاتے
اِس بستی کے جگنو بھی چھلاوے ہیں نظر کے
پھر لوگ سرِ شام ہی گھر کیوں نہیں جاتے
مر مر کے جئے جاتے ہیں سڑکوں کے کنارے
مرنا ہی ضروری ہے تو مر کیوں نہیں جاتے

ممتاز نکہت

عنایتوں میں عتاب میں تھا
میں اُس کے ہر انتخاب میں تھا
حقیقتوں پر نظر نہ ٹھہری
کہ حسن بے حد سراب میں تھا
اداؤں میں شخصیت چھپی تھی
ہر اک چہرہ نقاب میں تھا
وضع کی چولیں ہلی ہوئی تھیں
نفس نفس پیچ و تاب میں تھا
کسوٹیوں پر کھرا نہ اُترا
سبق جو میری کتاب میں تھا
ہے موت اس کی نجات راشد
وہ مبتلا اِک عذاب میں تھا

راشد جمال فاروقی

تم سے اب کچھ نہ چارہ گر ہوگا
خاک کا ڈھیر منتشر ہو گا
دُھوپ کے اس سفر میں سوچا تھا
راستے میں کہیں شجر ہوگا
رنج و غم میں بھی چِلتا رہتا ہوں
مجھ سا کِس شخص کا جگر ہو گا
دیکھ کر دوسروں کے گھر سوچوں
کبھی اپنا بھی ایک گھر ہوگا
صاف گوئی ہے تیری خو اُلفت
تیرا کب تک یہاں گزر ہو گا

اُلفت بٹالوی

ہر منظر پہ دھواں پردہ تھا
پردے میں اِک شہر چھپا تھا
شہر میں اِک جنگل تھا جس کا
دریا دریا ریت بچھی تھی
ساحل ساحل لب تشنہ تھا
تھر تھر زرد ی چھائی تھی
سایہ سایہ دھوپ جلا تھا
صدا صدا گونگی حیراں تھی
رنگ رنگ تب رنگ ہوا تھا
آنکھ آنکھ میں کالے سائے
چہرہ چہرہ خوف زدہ تھا
گھر گھر اک آسیب مسلّط
گلی گلی میں سناٹا تھا
موج ادھر موج اوپر بادل
بیچ اندھیرے میں تنہا تھا
میری تنہائی کے بن میں
اِک پردہ پیچ رہا تھا

سلیم شہزاد

پر، پرواز، پرندہ میں
میں بچّہ، میں کاغذ ناؤ
لہراں موجاں دریا میں
میں ساحل، میں عزم و جنوں
اور دھوکا ساحل کا میں
میں سرتا بہ قدم پتھر
پتھر تن پر سبزہ میں
میں بن، بن باسی، بن باس
چاروں شا میں اکیلا میں
میں کٹتا گرتا جنگل
بستی بستی اُگتا میں
میں جادوئے آب و سراب
دھوپ میں اپنا سایہ میں
میں تھا، جب سمٹا صحرا
پھیلا تو صحرا تھا میں!
میں نقشہ بے سمت سلم
نگر، ندی، بن صحرا میں

سلیم شہزاد



اس پہ جلتی دھوپ کا سایا نہ تھا
زندگی کی سمت وہ آیا نہ تھا
وہ تھا اپنے آپ سے ناآشنا
اس نے میری طرح غم کھایا نہ تھا
مجھ پہ حیرت کیوں ہے سارے شہر کو
مسئلوں نے کس کو الجھایا نہ تھا
اس کے غم پر آنکھ تر ہو ہی گئی
مجھ کو میرے غم نے تڑپایا نہ تھا
اس کی خاموشی پہ دل سہار لیا
طنز پر اس کے یوں گھبرایا نہ تھا
درد و غم کے چند سکوں کے سوا
پاس میرے کوئی سرمایا نہ تھا
ہے یہی اس کی تباہی کا سبب
نجمؔ نے دل کا صنم ڈھایا نہ تھا

مہ جبیں نجمؔ

جب ریت پہ سراب کا منظر لکھا گیا
پانی سے تشنگی کا مقدر لکھا گیا
موسم کی بے رخی سے ہٹا کر لکھا گیا
سورج کو روشنی کا سمندر لکھا گیا
قوسِ قزح کے رنگ بکھرتے رہے مگر
دھرتی پہ اس کے عکس کو منظر لکھا گیا
دن ہو کہ رات آسماں خالی دکھائی دے
دانشوروں میں جوہری آزر لکھا گیا
قطروں سے جس نے سات سمندر بنا لیے
اس کے لبوں کے واسطے پتھر لکھا گیا
اک بوند روشنائی کی ہستی بکھیر کر
کاغذ پہ گہری فکر کا جوہر لکھا گیا
ساغرؔ مرے بدن سے ٹپکتا ہوا لہو
لیکن مجھے شفق کے برابر لکھا گیا

تلک راج ساغرؔ

ڈھنگ بدلے وقت کی رفتار کے
ساتھ چلنے میں سبھی زردار کے
پہلے جو لائق نہ تھے گفتار کے
آج ہیں وہ آدمی کردار کے
دور کیا بدلا کہ سب کے دل سے اب
ختم جذبے ہو گئے ایثار کے
اب ادب تخلیق کوئی کیا کرے
ہاتھ جب کاٹے گئے فنکار کے
شوقؔ کس سے اب شکایت کیجئے
جو تھے اپنے وہ ہوئے اغیار کے

نعمان شوقؔ

بے زباں لوٹ کے آئے ہیں کہ بے سر آئے
ہم وفادار، بہر حال، وفا کر آئے
بھوک کو ختم کرے جیت لے شہرِ افلاس
کوئی اس عہد میں ایسا بھی سکندر آئے

سر اٹھائے جسے دیکھو وہ چلا آتا ہے
اب اجازت میں جسے دوں وہ مرے گھر آئے
تم کسی سنگِ سرِ راہ کو الزام نہ دو
لوگ یوں راستہ چلتے ہیں کہ ٹھوکر آئے
کیوں مری تلخ نوائی کا گلہ کوئی کرے
حوصلہ ہو تو مرے شہر سے ہو کر آئے
منتظر اس کی وہی بکھری ہوئی تنہائی تھی
صبح کے بھولے ہوئے شام کو جب گھر آئے
گھر بناؤ نگا وہاں، دوستوں میں اب کہ جہاں
دھوپ آنگن میں پڑے، چاند بھی چھت پر آئے
پھونک دے روح مرے شہر کے ہر پتھر میں
ایک ایسا بھی مرے عہد میں آزر آئے
یوں ترے شہر میں ہم لوگ جیا کرتے ہیں
رات کو قرض لیا، دن کو ادا کر آئے
عمر گذری ہے اسی فکر میں روشنؔ میری
میرا قد بھی سائے کے برابر آئے

روشن لال روشنؔ

بلائیں لاکھوں وہ سر پہ اٹھائے رہتا ہے
لبوں پہ پھر بھی تبسم سجائے رہتا ہے
رگوں میں دوڑتی ہے جو بجائے لہو
اک ایسی آگ وہ دل میں چھپائے رہتا ہے
نہ جانے کتنے اندھیروں کو چاہتا ہے وہ
جو اپنے آپ کو سورج بنائے رہتا ہے
مجھے ستانے کی خو، اس سے ترک ہو نہ سکی
وہ پاس رہ کے بھی دوری بنائے رہتا ہے
غمِ حیات کی ظلمت سے کیوں وہ خوف کرے
جو اپنی آس کی شمعیں جلائے رہتا ہے
کوئی شعورِ طلب ہو نہ ہو مگر تابشؔ
دعا کے ہاتھ ہر انساں اٹھائے رہتا ہے

طلعت تابشؔ

صدائیں دور کی جادو سا اک جگاتی ہیں
فریب خوردہ تمنائیں سر اٹھاتی ہیں
دمِ وداع جو مجھے دیکھتی تھیں حسرت سے
شبیہیں وہ نگاہوں میں جھلملاتی ہیں
تمہارے گاؤں سے آئی ہوئی ہوائیں سب
ہمیں تو روز ہی قصے نئے سناتی ہیں
ابل رہی ہیں نگاہوں سے التجا بن کر
دلِ حزیں میں کہاں خواہشیں سماتی ہیں
وہ دشت جس کی فضا سخت گرم ہو جائے
مرے ندیم! وہاں آندھیاں بھی آتی ہیں
نجانے ٹولیاں جا جا کے جگنوؤں کی کہاں
ضیا بدن کی اندھیرے میں بانٹ آتی ہیں
مشاہدہ ہے تبسمؔ مرا بسا اوقات

حنان تبسمؔ

ماہنامہ

چنگاری دہلی

اکتوبر ۱۹۸۴ء

ایڈیٹر: جمیل احمد

شمارہ نمبر ——— ۳۷

قیمت: تین روپئے

زرسالانہ ———

انفرادی خریداری ۳۵ روپئے

(اداروں سے ۴۵ روپئے مع U.P.C چارجز)

غیر ممالک سے ۳۰ امریکی ڈالر

پتہ: رام نگر (شانتی بلڈنگ) شاہدرہ دہلی ۳۲

جمیل احمد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور مالک نے نیر آفسٹ پریس ای ۵۳ اے انارکلی دہلی ۵۱ اور یونیورسل آفسٹ پریس دریا گنج نئی دہلی سے چھپوا کر شاہدرہ دہلی ۳۲ سے شائع کیا۔

چنگاری میں شائع ہونے والی تحریروں میں نام مقام اور واقعات فرضی ہیں ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر مالک پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

خوذ تحریروں میں چنگاری ہمیشہ حوالے دیا کرتا ہے۔ نا تحریروں میں کسی اخبار، رسالے اور کتاب کا حوالہ یں ہے وہ سب چنگاری میں پہلی بار شائع ہو رہی یا کم سے کم ادارہ کو ان تحریروں کی دوسری جگہ ناعت کی اطلاع نہیں ہے۔ ان تحریروں کو منف کی اجازت اور چنگاری کے حوالے کے ساتھ

اس شمارے میں



دامن نگاہ کا

عزیزی جناب مہدی پرتاب گڑھی کے توسط سے چنگاری کے چند شمارے دیکھنے کو ملے۔ رسالوں کے لئے رسمی تعریف کے جملے لکھنا مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔ چنگاری کے زیر نظر شماروں کے تعلق سے میں کچھ لکھنا تو چاہتا ہوں مگر اس لئے گریز کر رہا ہوں کہ میں اپنا شمار پیشہ ور قصیدہ نگاروں میں نہیں کرانا چاہتا صرف یہ کہ خدا نظر بد سے محفوظ رکھے۔

غزل نمبر کا اشتہار بھی نظروں سے گذرا چنانچہ پانچ غزلیں، تصویر اور بایوڈاٹا بھیج رہا ہوں انھیں بھی محفوظ کر لیجئے۔ دو غزلیں زیر ترتیب شمارے کے لئے بھی ہم رشتہ ہیں رسیدگی سے مطلع کر دیجئے تاکہ اطمینان ہو۔ ان دنوں ڈاک کا نظام بے حد ابتر ہے۔

آج ہی کی ڈاک سے اپنے مجموعۂ غزل خاکے اور لکیریں کی دو جلدیں بھی بھیج رہا ہوں امید ہے کہ اس پر کسی قریبی اشاعت میں تبصرہ کر دیا جائے گا۔

اور ہاں سردار جعفری کے خط سے معلوم ہوا کہ چنگاری کا کوئی شمارہ مرحوم سجاد ظہیر سے متعلق بھی شائع ہو چکا ہے۔ ڈاک ٹکٹ کی شکل میں رجسٹرڈ پیکٹ کے مصارف بھیج رہا ہوں ایک کاپی میرے پاس بھیج دیجئے بے حد کرم ہوگا۔ امید کہ آپ عافیت سے ہوں گی۔

نازش پرتاب گڑھی

• ● •

اگر تی دیوا بدوں کا پہلا حصہ اپنے

میں مکمل ہے۔ یہ ناول ۔ اگر میں زندگی میں پورا کر لے گیا، اپنے میں مکمل سات ضخیم ناولوں کا مجموعہ ہوگا۔ بہت سے ایسے ہندی قارئین ہیں، جنھوں نے اس کا دوسرا حصہ 'شہر میں گھومتا آئینہ' پہلے پڑھا، ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس کا تیسرا حصہ 'ایک ننھی قندیل' پہلے پڑھا، پھر دوسرا، پھر پہلا۔ ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان میں سے کوئی بھی نہیں پڑھا، صرف اس کا چوتھا حصہ 'باندھو ناقاس کھاتوں' بھی پڑھا ہے۔ اس چوتھے حصے میں بھی دو مکمل ناول ہیں، جن کا مواد ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ صرف ہیرو ایک ہے۔ اول تو باقی حصے میں نے ہندی میں لکھے ہیں۔ نہ بھی لکھے ہوتے، تو جب اردو میں لکھا ہوا حصہ، میں چالیس برس تک شائع نہیں کر پایا، دوسرے کر پاؤں گا، مجھے امید نہیں۔ بہرحال آپ جانیں۔ صرف ڈاکٹر گیان چند جین نے بہت اچھا خط لکھا کہ ایسا کوئی ناول اردو میں نہیں ہے۔ میری عمر تو بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ مجھے تو اس بات کا بھی یقین نہیں کہ میں اسے اپنی زندگی میں ختم بھی کر پاؤں گا۔ گٹ بازی تو ہندی میں بھی بہت ہے، لیکن اس سے ادیبوں کا اتنا نقصان نہیں ہوا، جتنا زبانوں کا ہوا ہے۔ اگر ہندی اور اردو ادب میں جمود ہے، یا لوگ صحیح راستہ نہیں پا رہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ گٹ بازی کی وجہ سے جو لوگ آگے آتے ہیں، ان میں دم نہیں ہوتا اور تمام شور شرابے کے باوجود وہ تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح بیچ سڑک پر پسر جاتے ہیں۔ روایت کو توڑنا ضروری ہے، لیکن روایت کو ایک دم بھلا دینا ضروری نہیں۔

اوپندر ناتھ اشک

• ● •

پچھلے ایک برس سے چنگاری پابندی سے پڑھ رہا ہوں۔ چنگاری کا تازہ شمارہ نظروں سے گزرا۔

بہت پسند آیا۔ ہر کہانی کا انداز منفرد اور جداگانہ ہے خصوصاً جناب دیویندر اسر کا مقالہ "۱۹۸۴ بھیانک مستقبل یا تیسری لہر کا انتظار" ایک معلوماتی مقالہ ہے۔

اداریئے کے تحت آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کافی اہم ہے اور ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت ہے۔

مصطفٰے مومن

• ● •

بجا شکایت
صحیح ہے شکوہ
کہ میری تحریر میں تلخیاں تھیں
مگر وہ کرمک
ہمارے ذہنوں کی نرم مٹی میں
کتنی صدیوں سے کلبلاہٹ مچا رہا ہے
وہاں تو اقبال نامور کی
عظیم فکری عنایتوں میں بھی بنکے شاہین
افق کے اس پار اڑ رہا تھا
وہی تو میر خود آشنا کو
لئے پھرا در بدر۔ شہروں شہروں
اس نے غالب کو خود سری کا انعام بخشا
وہی تو مرزا انیس کے دل میں
اک آبگینہ سا بنکے اترا
خیال احباب چاہئے تھا ہر دم
کہ ٹھیس اسکو نہ لگنے پائے
اسے نہ چھیڑیں
وہ ایک نازک سا آبگینہ
اسے نہ توڑیں۔

اعظم عباس شکیل

اداریہ

کیا سرکاری ملازم کام چور ہیں؟

اکثر کہا جاتا ہے کہ سرکاری ملازم کام نہیں کرتے، کام چور ہیں۔ گھومتے رہتے ہیں چائے پان سگریٹ اور گپ شپ میں وقت گذار دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ حقیقت ہے یا افسانہ اور اگر حقیقت ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟

کبھی ہماری حکومت نے یا کسی ادارے نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ حقیقت کیا ہے۔

دوسروں کو تو جانے دیجئے خود سرکاری ملازم بھی بعض اوقات مجرم ضمیری کا شکار ہو جاتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ اس ملک میں جو لاکھوں سرکاری ملازم ہیں وہ فرسودہ، از کار رفتہ اور غلط ضابطوں قاعدوں اور غیر انسانی بلکہ بلکہ حیوانی نظام کا شکار ہیں۔ وہ بندھوا مزدور سے زیادہ ستم زدہ ہیں فرق یہ ہے کہ انھیں اتنی روٹی ملتی ہے کہ بھوکوں نہیں مرتے۔ انھیں اس بات کی ضمانت دی جاتی ہے کہ روز گار سے آسانی کے ساتھ ہٹایا نہیں جائے گا۔ وہ جو رقم جمع کر رہے ہیں وہ انھیں مل جائے گی اور یہ کہ وہ ذمہ دار لوگ ہیں اچھے چال چلن کے لوگ ہیں۔

اس کے علاوہ انھیں کوئی سہولت ہیں۔ مکان عام طور پر انھیں اس وقت ملتا ہے جب وہ ریٹائر ہونے والے ہوتے ہیں۔ مکانوں کا بھتہ اتنا کم ہے کہ فٹ پاتھ کا کیرا (جو غنڈے اور پولیس فٹ پاتھ کے باشندوں سے لیتی ہے) بھی اس سے زیادہ ہے۔ منہگائی بھتہ کے نام پر اتنا ناکافی بھتہ ملتا ہے کہ آنسو بھی نہیں پونچھ سکتے۔ وہ زندگی بھر قرض کے سائے میں زندگی گذارتا رہتا ہے۔ قاعدے ضابطے اس قدر احمقانہ ہیں کہ کوئی کام آسانی سے، سہولت سے ہو ہی نہیں سکتا ارباب حل وعقد یا دانشوروں کو یہ نظر نہیں آتا کہ اس ملک کا ہر شہری برابر ہے۔ اس لئے اب انگریزوں کے دور کی طرح چند افسروں یا ایک سفید افسر یا آئی۔ اے۔ ایس ٹاپ کے بابو کے علاوہ تمام ملازموں کو غیر ذمہ دار سمجھنا وحشیانہ اور غیر دانشمندانہ عمل ہے۔ اس طرح ابھی تک گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ کی تقسیم چلی آ رہی ہے جو صریحاً دستور ہند کی بنیادی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ اس پر بس نہیں ہے سرکاری ملازموں کو خفیہ رپوٹ کے چکر میں بھی مبتلا کر دیا گیا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ اور اس کا مقصد کیا ہے،

یہ درست ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی تک زیادہ تر معاملے میں۔۔۔ اُلٹے بانس بریلی کو والا معاملہ ہے مگر آخر کب تک — سرکاری ملازم جن مشکل حالات میں کام کر رہا ہے ان میں اگر وہ دو گھنٹے بھی کام کرتا ہے تو بہت ہے۔ اس لئے کہ اس دو گھنٹے میں وہ اتنا خرچ ہو جاتا ہے کہ اس میں سکت نہیں رہ جاتی۔

دنیا اب اتنی ترقی کر چکی ہے کہ وہ جانتی ہے آدمی بھی خرچ ہوتا ہے یعنی کام کی وجہ سے اس کی توانائی صرف ہوتی ہے۔ کام کے یاجوج ماجوج اس کی توانائی کی دیوار چاٹتے ہیں جب تک کام میں مصروف رہتا ہے چاٹنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ کام ذہنی ہو یا جسمانی دونوں میں آدمی خرچ ہوتا ہے اس کے جسم کے خلئے کمزور ہوتے ہیں۔ اور اگر آدمی پر دباؤ ہو الجھن ہو پریشانی ہو تو اس کی توانائی زیادہ خرچ ہوتی ہے۔ آدمی مشین سے زیادہ گھستا ہے۔ اور ذہنی تناؤ کے عالم میں زیادہ گھستا ہے یہی وجہ ہے کہ جسمانی محنت سے زیادہ انرجی ذہنی کام میں صرف ہوتی ہے۔ اس انرجی کو پورا کرنے کے لئے، سونا، آرام، تفریح اور مطالعہ ضروری ہے۔

نیند، آرام، تفریح، مطالعہ، کھیل کود، دوسروں سے ملنا جلنا، سیر و سیاحت گپ شپ، اور آزادی، انسان کے لئے اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا کھانا پانی، کھانے سے انسان زندہ رہنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے متوازن کھانے سے وہ صحت مند، توانا اور متناسب معتدل اور متوازن رہتا ہے اور چونکہ معاشرہ افراد سے تشکیل پاتا ہے اس لئے جس معاشرے میں متناسب، معتدل، اور متوازن انسان رہتے ہیں وہ

معاشرے بھی ترقی کرتے ہیں۔ اور اس معاشرے کی ترقی انسانیت کی ترقی کے لئے مواد اور ترغیب و تحریک فراہم کرتی ہے۔ اس لئے آدمی کو انسانی زندگی گذارنے کے لئے کام کے ساتھ آزادی ذہنی دباؤ سے نجات اور آرام کی ضرورت ہے، فرصت کی ضرورت ہے۔ آدمی اشیا، صرف نہیں ہے۔ وہ اناج نہیں ہے جسے کھالیا جائے وہ جانور نہیں ہے جس کی اپنی زندگی نہیں ہوتی۔ یا برائے نام ہوتی ہے۔ آدمی کے لئے کام جتنا ضروری ہے فرصت اس سے زیادہ ضروری ہے۔

نہرو کا نعرہ تھا آرام حرام ہے۔ یہ نعرہ کافی رومانی ہے خوبصورت ہے مگر کوئی وزیر اعظم ہی یہ نعرہ لگا سکتا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ آرام بھی آدمی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کام۔

اور اگر کام فرحت بخش نہیں ہے تو اس کام سے تھکن اور بڑھتی ہے۔ آدمی اور زیادہ صرف ہوتا ہے۔

بعض اوقات تو مسرت بخش کام، آزادانہ کام آدمی میں توانائی کم کرنے کی بجائے توانائی میں اضافہ کرتا ہے۔

مگر سرکاری ملازموں کو عام طور پر جو کام دیا جاتا ہے اس سے انھیں کوئی مسرت نہیں ملتی۔ تھکن۔ اذیت اور کوفت حاصل ہوتی ہے۔ زیادہ تر حالات میں وہ ان کاموں کی سب خرابیوں کے لئے ڈانٹ سنتا ہے۔ اچھائیوں کا اسے کوئی انعام نہیں ملتا۔ صرف سزا اس کا مقدر ہے۔ جزا کوئی نہیں۔ بعض اوقات تو اچھے کاموں کی بھی اسے سزا ملتی ہے۔ کام نہ کرنے میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔ یعنی کام کے حالات بہت خراب ہیں اور سب سے بری بات یہ ہے کہ زیادہ تر سرکاری ملازموں کو ان کے کام کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دے دیا گیا ہے۔

اب یہ ضروری ہے کہ کام کے حالات ٹھیک کئے جائیں۔ جس جگہ کام ہوتا ہے وہاں کا ماحول خوشگوار ہو۔ سرکاری ٹرانسپورٹ انھیں گھر سے دفتر پہونچانے کی ذمہ دار ہو اور دفتر دیر سے جانے کی ذمہ داری سرکاری ملازموں پر نہیں بلکہ ٹرانسپورٹ پر ہو۔ یا دفتر کے پاس ہی گھر الاٹ کئے جائیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ سرکار افراد سے تو کہتی ہے کہ وہ ٹھیک وقت پر دفتر پہونچ جائیں۔ مگر خود اپنے اس زبردست وحشیانہ قوت کے باوجود ان کے لئے نہ تو دفتر کے قریب گھر کا انتظام کر سکتی ہے اور نہ ہی مناسب ذرائع ترسیل فراہم کر سکتی ہے۔ ذرا سوچئے جو آدمی صبح سات بجے بعض حالات میں اس سے بھی پہلے گھر سے نکل کر دفتر پہونچنے کے لئے بسوں میں دھکے کھاتا ہے۔ قطار میں گھنٹوں کھڑا رہتا ہے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر بھاگتی بسوں میں چڑھنے کی کوشش کرتا ہے وہ کس قدر ذہنی تناؤ میں مبتلا رہتا ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ صبح سے دھکے کھا کھا کر دفتر پہونچ جانے کا کام ہی اتنا زیادہ ہے کہ سرکار اس کام کا بھی معاوضہ نہیں دے سکتی چہ جائے کہ دن بھر دفتر میں بیٹھنا اور پھر افسروں کی ڈانٹ سننا۔ اور یہ افسری کا سلسلہ بھی کافی دراز ہے۔ یہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے کہ ہر افسر اپنے سے نیچے والے افسر سے کہتا ہے کہ وہ کچھ کام نہیں کرتا وہ نااہل ہے۔ اس طرح ڈانٹ کا سلسلہ کافی دراز ہے اور اگر یہ افسر ٹھیک کہتے ہیں تو کوئی سرکاری ملازم (اس افسر سمیت) نہ تو اہل ہے اور نہ کوئی کام کرتا ہے۔ ہر افسر اپنے بڑے افسر سے ڈرتا ہے اس لئے کہ اس کے ہاتھ میں اس کی CR رپورٹ ہوتی ہے۔ اس لئے اچھی رپورٹ کے لئے خوشامد ضروری ہے۔

جی حضوری ضروری ہے۔ غلامی ضروری ہے اور پھر یہ کہ اس غلامی کی زنجیر سے کسی کو نجات نہیں ہر ایک اس میں جکڑا ہوا ہے۔ اور خوش ہے کہ اگر فلاں ماتحت نے بدمعاشی کی تو رپورٹ خراب کر دے گا۔ اور ترقی نہیں ملے گی۔ انکری منٹ نہیں لگے گا اور بعض حالات میں تنخواہ بند ہو جائے گی۔

غرض دفتری ماحول اس قدر خراب ہے کہ سرکاری ملازم تیزی سے خرچ ہوتا ہے۔ یہ صرف ملک کے لئے قوم کے لئے انسانیت کے لئے نقصان دہ ہے ہمیں اسے روکنے کی صورت نکالنی چاہیئے۔ اس ڈھانچے پر کاری ضرب لگانی چاہیئے تاکہ ہمارا ملک ترقی کرے اور لاکھوں لوگ جو اس حکومت کے کل پرزے ہیں۔ دست و بازو ہیں۔ متوازن اور معتدل زندگی گزاریں اور جب تک یہ نہ ہوگا نہ

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

خواجہ احمد عباس

اردو افسانہ اور قومی یکجہتی کا تصور

اول تو میں کہوں گا کہ اردو زبان ہی نے ہندوستان کو قومی یک جہتی کا سبق پڑھانے کے لئے جنم لیا۔ اس کا لائحہ عمل، اس کا وجود ہی قومی یکجہتی ہے۔

"ادب زندگی کا آئینہ ہے" اس کلیئے سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ زندگی کی تمام رنگارنگی، زندگی کے تمام عناصر اور تمام قدریں۔ زندگی کی ہر تڑپ اور زندگی کے رخ بدلنے والی ہر قوت، خواہ وہ سیاسی ہو، معاشی یا اقتصادی ادب میں جھلکنی ہی چاہیئے۔

یہی نہیں کہ زندگی اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے یا جیسا سورگباشی منشی پریم چند جی نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ "ادب اور زندگی میں ایسا ہی رشتہ ہے جیسا میاں بیوی میں ہوتا ہے" بلکہ زندگی اور ادب میں اس سے بھی زیادہ نزدیکی رشتہ ہے یعنی دونوں دراصل ایک ہی ہیں۔ زندگی حقیقت ہے اور ادب اس کا عکس، اس کی پرچھائیں۔ اس کی تصویر . . .

اب یہ تصویر بنانے والے پر منحصر ہے کہ وہ اچھی تصویر بناتا ہے یا بری، حقیقت نگاری سے زندگی کے بھیانک رخوں کو عریاں کرتا ہے یا رومان نگاری سے ان پر سنہری ملمع کر دیتا ہے۔ شہنشاہیت کی قصیدہ گوئی کرتا ہے یا انقلابی تحریکوں کا ساتھ دیتا ہے۔ رومان پرست بھی فرار کے لئے اس دنیا کا ہی کوئی دلکش گوشہ تلاش کرتے ہیں اور خیالی گھوڑے دوڑانے والے بھی زندگی کے احاطے سے باہر نہیں جا سکتے۔

ہندوستان اور ہندوستانیوں کی زندگی پر قومیت کے احساس، قومیت کے جذبے اور قومیت کی تحریک کا گہرا اثر پڑا ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی بھی شعبہ نہیں جو اس جذبے سے اثر پذیر نہ ہوا ہو۔ ادب پر یہ اثر پڑنا ہی چاہیئے تھا کیونکہ جیسا میں نے پہلے عرض کیا کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور اس میں زندگی کے ہر پہلو کا عکس ملنا چاہیئے۔

مگر اردو ادب پر یہ اثر اور بھی گہرا ہے۔ کیونکہ اردو زبان بذات خود اسی قومیت کے احساس کی پیداوار ہے۔ جس رفتار سے ہندو مسلم تمدنوں کے امتزاج سے مشترکہ ہندوستانی تمدن اور قومیت کی تشکیل ہوئی ہے اسی رفتار سے اردو زبان نے ترقی کی ہے بلکہ کہنا چاہیئے کہ اردو کی ترقی قومی تحریک ہی کا ایک حصہ ہے۔ نظم میں حالیؔ، غالبؔ اور اکبرؔ سے لے کر اقبالؔ اور ظفرؔ علی خاں اور ان کے بعد جوشؔ، جگرؔ اور رگھوپتی سہائے فراقؔ جیسے موجودہ دور کے شعراء تک اور نثر میں شبلیؔ اور سرسید اور پنڈت رتن ناتھ سرشار سے لے کر کرشن چندر اور عصمت چغتائی تک اردو کا تقریباً ہر قابل ذکر شاعر یا ادیب قومیت کے جذبے سے متاثر رہا ہے اور بالواسطہ ہر ایک نے قومیت کی تحریک کو فروغ دینے میں مدد کی ہے۔

یہاں یہ صاف کر دینا ضروری ہے کہ ادب اور ادیبوں کا کام کسی خاص سیاسی جماعت کا پروپیگنڈہ کرنا نہیں رہا ہے بلکہ زندگی کی ترجمانی اس ڈھنگ سے کرنا ہے کہ مشترکہ قومیت کا احساس گہرا ہوتا چلا جائے اور ایسے رجحانات کی نشو ونما کرنا ہے جو قومی اتحاد اور ترقی دونوں کے لئے مفید اور معاون ہوں۔

دوسری زبانوں کے کلاسیکی ادب کی طرح اردو زبان کی تاریخ میں بھی نظم نثر سے زیادہ پرانی ہے اور نثر کی مختلف صنفوں میں افسانہ نگاری کی تو بہت ہی کم عمر ہے۔ مشکل سے سو ڈیڑھ سو برس۔ اور پھر شروع میں تو کوئی "افسانہ" کے لفظ ہی سے آشنا نہ تھا۔ افسانہ SHORT STORY کا تصور تو مغرب سے . . . . روس اور فرانس، امریکہ، انگلستان وغیرہ

سے آیا ہے۔ آجکل کے اردو افسانہ کی پیش رو وہ ادبی صنفیں تھیں جنہیں قصہ کہانی، داستان، مثنوی، حکایت وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ بقول اردو کے مشہور نقاد وقار عظیم کے "اس ڈیڑھ سو برس کی مدت میں اردو میں طرح طرح کے افسانے لکھے گئے! اس میں غواصی کی پھول بن بھی شامل ہے اور رتن ناتھ کی سیف الملوک اور بدیع الجمال بھی نوطرزِ مرصع بھی اور اس سے ذرا آگے چل کر باغ و بہار، حاتم طائی، آرائش محفل اور بتیال پچیسی بھی۔ پھر الف لیلہ، طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ بھی۔ میر، میر حسن، اثر، مومن اور نواب مرزا شوق کی مثنویاں بھی۔ رانی کیتکی کی کہانی بھی۔ فسانہ آزاد بھی اور منتخب الحکایات بھی"

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ بھلا ان جن بھوتوں پریوں کی داستانوں، مثنویوں کے منظوم عاشقانہ افسانوں اور دھارمک کہانیوں کا قومیت کے احساس سے کیا تعلق ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ جن قصے کہانیوں کو آج آپ گھٹیا اور پرانی سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری قومیت کی تشکیل میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ وہ کیسے؟ وہ ایسے . . . . . .

قصے کہانی پڑھنے یا سننے کا شوق انسان کی فطرت میں قدرتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شوق بچہ ماں کے پیٹ سے ساتھ لے کر آتا ہے یا یوں کہنے کہ انسان کے قدرتی تجسس اور انوکھی باتوں کی کھوج لگانے کا شوق جو اسے جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی کا ایک اظہار کہانی بھی ہے۔ اپنے بچپن کو ہی یاد کر لیجئے۔

گھر کی کوئی بڑی بوڑھی، نانی دادی انا یا دائی رات کو کہانی سنا رہی ہے اور بچے نیند کو بھولے، آنکھیں پھاڑے گرد بیٹھے سن رہے ہیں۔ جب بچہ پڑھنا سیکھتا ہے تو سب سے پہلے قصے کہانیاں پڑھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان ہی میں نہیں دنیا میں سب سے زیادہ ناول اور افسانوں کی کتابیں بکتی ہیں۔

شمالی ہندوستان کے ہندو مسلم نے جب اردو لکھنا پڑھنا سیکھا تو سب سے پہلے جو کتابیں چھپیں، بکیں اور پڑھی گئیں وہ قصے کہانیوں ہی کی کتابیں تھیں۔ اردو تو نئی زبان تھی اس میں بھلا اتنا بڑا ذخیرہ کہاں تھا سنسکرت، عربی اور فارسی، اور بعد میں انگریزی سے کہانیاں ترجمہ کی گئیں یا ان کے نمونے پر نئی کہانیاں اردو میں لکھی گئیں یا وہی بڑی بوڑھیوں کی زبانی بیان کی ہوئی گھریلو کہانیوں کو لکھ دیا گیا۔

رامائن اور مہابھارت کے تمام قصے . . . . رام اور سیتا کی کہانی، سیتا سوئمبر، رام کا بن واس، راون کا سیتا کو بھگا کر لے جانا۔ کورو پانڈو کی کہانی۔ دروپدی کا قصہ۔ کرشن اور ارجن، ستی ساوتری اور ستیہ راون کی کہانی رانی کیکئی . . . وغیرہ سب اردو میں آئیں اور لاکھوں مسلمانوں نے انھیں پڑھا۔

عربی سے الف لیلیٰ اور داستان امیر حمزہ، حاتم طائی کی کہانی وغیرہ ادھار لی گئیں اور انھیں اردو کا جامہ پہنایا گیا۔ لاکھوں ہندوؤں نے انھیں پڑھا۔

اور پھر دنیا کے ہر ملک کے عشقیہ افسانے اردو میں چھپے، لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ وامق عذرا، رومیو جولیٹ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور لاکھوں ہندوؤں مسلمانوں نے اور اسطرح آہستہ آہستہ قصے کہانی کے شوق نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے تمدنی پس منظر سے روشناس کرایا اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی تمدنی تاریخی اور ادبی روایات کو اپنایا۔

اور دو قوموں، دو تمدنوں، دو زبانوں کے ملاپ سے بتدریج ایک نئی یگانگت ایک نئے قومی احساس کی تشکیل ہوئی۔ آئندہ طوطے مینا، کی کہانی اور طلسم ہوش ربا پرانی کتابوں کے ڈھیر میں پڑی نظر آجائیں تو انھیں حقارت کی نظر سے نہ دیکھئے۔ . . . . ایسے ہی کتابوں کی مقبولیت نے ہماری زبان اور قومیت کے احساس کو جنم دیا ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا، "فسانۂ آزاد" اردو زبان کی سب سے ضخیم کتاب ہی نہیں بلکہ اردو کا

سب سے پہلا سیریل ناول ہے برسوں یہ ناول لکھنؤ کے ہفتہ وار اخبار اودھ میں چھپتا رہا اور جب سے ابتک اسے لاکھوں بچوں اور جوانوں نے پڑھا ہوگا ضخامت کے اعتبار سے یہ ناول ضرور ہے مگر ناول کی موجودہ تعریف پر یہ پورا نہیں اترتا۔ دراصل "فسانۂ آزاد" کا انداز رامائن اور مہابھارت، اور داستان امیر حمزہ اور الف لیلیٰ کی ادبی روایات کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ کتاب پرانی طویل داستانوں اور موجودہ ناول یا افسانے کے درمیان کی کڑی ہے۔

مگر اردو ادب میں اس کی اہمیت اس پر ختم نہیں ہو جاتی "فسانۂ آزاد" کا گہرا تعلق ہماری قومیت کی تشکیل سے بھی ہے۔ کیا یہ امر حیرت انگیز اور معنی خیز نہیں کہ ایک ہندو ادیب ہندستانی مسلمان گھرانوں کی اتنی اچھی اور مفصل تصویر پیش کر سکے۔ جیسی پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "فسانۂ آزاد" میں کی ہے۔ کیا اس سے اس تمدنی اتحاد اور معاشرتی میل جول کا پتہ نہیں چلتا جو لکھنؤ، دہلی وغیرہ جیسے شہروں میں ہندو مسلمانوں دونوں میں مشترکہ قومیت کا احساس پیدا کر رہا تھا۔ آج اردو میں درجنوں ہندو اور سکھ افسانہ نگار اپنے افسانوں میں مسلمان کرداروں اور مسلم گھرانوں کی سچی تصویر پیش کر سکتے ہیں اور اسی طرح درجنوں مسلمان افسانہ نگار ہندو کرداروں اور ہندو گھرانوں کا ماحول اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں، لیکن رتن ناتھ سرشار پہلے اردو ادیب تھے جنہیں اس لحاظ سے ہندوستانی قومیت کا پہلا افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔

جس طرح دھارمک کہانیوں کلاسیکی عشق کے افسانوں اور الف لیلیٰ کے حیرت انگیز مضمون نے اردو داں ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے تمدن سے متعارف کر کے ایکدوسرے کے قریب کیا۔ اسی طرح رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" اور ان کی دوسری کہانیوں نے بھی قومیت کی تشکیل میں بڑی مدد کی۔ اگرچہ یہ غیر شعوری طور پر ہوا۔

لیکن اس میدان میں سب سے بڑا کارنامہ منشی پریم چندجی کا ہے۔ دراصل اردو کے سب سے پہلے اور بعض اعتبار سے سب سے بڑے افسانہ نگار پریم چند ہی تھے۔ اس کے علاوہ وہ پہلے ادیب تھے جنہوں نے شعوری طور پر افسانے سے قومیت کے بڑھتے ہوئے احساس کی عکاسی کا کام لیا۔ ان کے افسانے اور ناول ان کے دور کی مکمل سیاسی، معاشرتی، و اقتصادی تصویر پیش کرتے ہیں۔ پریم چندجی کا دور گاندھی جی کا دور تھا۔ غلامی کا احساس، آزادی کی تڑپ، مغرب کی اندھا دھند تقلید سے بیزاری، غریبوں سے ہمدردی، ذات پات توڑ اور اچھوتوں کو برابری کے حقوق دلانے کی خواہش فرقہ وارانہ اتحاد، عالمگیر انسانیت اور اخوت کا نظریہ، انسان دوستی، متحدہ قومیت کا تصور اور اخلاق اور روحانی اثر سے سیاسی اور اقتصادی تبدیلیوں کے امکان میں اعتقاد . . . . . یہ سب کچھ جو گاندھی جی کے سیاسی فلسفے اور ان کی تعلیمات میں تھا۔ پریم چندجی کے افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ مگر اردو جاننے والوں نے گاندھی جی کے مضامین کم پڑھے اور منشی پریم چند کے افسانے زیادہ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو داں طبقے میں قومیت کا احساس اور قوم پرستی کا جذبہ اور تحریک آزادی کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنے میں پریم چند کے افسانوں کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

پریم چندجی کے آخری دنوں میں قومیت کا احساس ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ قوم کا تصور ایک فرضی بھارت ماتا یا اشارتی (SYMBOLIC) اور وطن کی بجائے جنتا کے وسیع مضمون میں تبدیل ہو رہا تھا۔ قومیت کا احساس اونچے درجے کے وکیلوں، اخبار نویسوں اور خوش حال قوم پرستوں کے تنگ دائرے سے نکل کر کسانوں کی جھونپڑیوں اور مزدوروں کی چالوں تک پہونچ چکا تھا۔ عوام بیدار ہو رہے تھے اور جنگ آزادی میں پیش پیش تھے۔ مگر سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ وہ اقتصادی اور معاشرتی آزادی بھی چاہتے تھے۔ ہندو مسلمان کسان زمینداری اور

بیداری کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے
... مسلمان مزدور اور ان کے نچلے
... طبقے کے لوگ سرمایہ دار کے
... احتجاج کر رہے تھے۔ اور طبقاتی
... کشمکش کی آگ میں اتحاد اور قومیت
... نیا تصور ابھر رہا تھا۔ پریم چند
... قومیت کے اس روپ کو بھی دیکھا
... اپنے ادب میں اس کی بھی عکاسی
... ان کی کہانی "استعفےٰ" ایک نئے
... وستانی کردار کو پیش کرتی ہے۔
... خوددار ہندوستانی کلرک جو صاحب
... گالیاں سن کر اور ٹھوکریں کھا کر
... نہیں رہتا بلکہ ڈنڈا سنبھال کر
... صاحب سے کان پکڑواتا ہے۔ معافی
... واتا ہے اور پھر اس کے منہ پر استعفےٰ
... کر چلا آتا ہے۔ اور محسوس کرتا ہے
... آج وہ خوش ہے اور آزاد ہے۔
... ایک اور کہانی "کفن" افلاس
... بیچارگی کا ایسا سچا نقشہ پیش کرتی
... جو جذباتیات سے بے نیاز ہو کر
... جی حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔

پریم چند کے ہمعصروں میں قومیت
احساس ہمیں پنڈت سدرشن، نیاز
... پوری، مجنوں گورکھپوری، سلطان
... جوش، سجاد حیدر وغیرہ کے ہاں
... ملتا ہے۔ لیکن اس شدت اور
... فانی کے ساتھ نہیں جو پریم چند
... افسانوں کی خصوصیت تھی۔

پریم چند کے آخری دور کی ادبی
... روایات ترقی پسند ادب کی تحریک
... ساتھ وابستہ تھیں اور اسی تحریک
کے ادیبوں نے ان روایات کو زندہ رکھا اور پروان چڑھایا ہے۔ پچھلے بیس برسوں میں اردو افسانے نے نہ صرف ادبی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کی ہے بلکہ اتنی ہمہ گیری اختیار کی ہے کہ قومی زندگی کا کوئی شعبہ اور قومی جدوجہد کا شاید ہی کوئی اہم واقعہ ہو جس پر کسی نہ کسی افسانہ نگار نے قلم نہ اٹھایا ہو۔

حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی، اختر حسین رائے پوری، احمد علی وغیرہ کے اکثر افسانوں میں قومیت کا تصور جھلکتا ہے۔ سجاد ظہیر کا طویل افسانہ یا مختصر ناول "لندن کی ایک رات" لکھے پڑھے انقلاب پسند مگر دماغی طور سے الجھے ہوئے نوجوان قوم پرستوں کی تصویر پیش کرتا ہے۔

منٹو کا مشہور افسانہ "نیا قانون" ۳۵ء کی ریفارمز کو ایک تانگے والے کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے بدبودار اور بدنام افسانے "سوتری" میں بھی منٹو نے انوکھے اور بے ڈھب انداز میں ہندوستان اور پاکستان کے نام پر جو تفرقہ اندازی کی گئی ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دیوندر ستیارتھی کے افسانوں میں کسانوں کے دل دھڑکتے ہیں اور مظلوموں کے خون سے رنگی ہوئی "لال دھرتی" نظر آتی ہے۔ عصمت چغتائی نے سیاسی موضوعات سے دامن بچانے کی کافی کوشش کی مگر نہ بچا سکیں "لال چھپے تھے" میں عوامی تھیٹر کے سٹیج پر انقلابی یورش دیکھتی ہیں"۔ "دھانی بانکیں" انھیں ہندو مسلمان عورتوں کے ان سہاگوں کی یاد دلاتی ہیں جو فسادات میں اجڑ گئے۔ اور اپنے افسانے "جڑیں" میں وہ دکھاتی ہیں کہ سینکڑوں برس کے میل جول اور ہمسائیگی کو وقتی جنون اور خون خرابے بھی نہیں اکھیڑ سکتے۔ ان کے ناول "ٹیڑھی لکیر" میں تو قومی تحریک آزادی کا واضح پرتو ہے

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "ہیروشیما سے پہلے۔ ہیروشیما کے بعد" ہندوستان کے گاؤں پر دوسری جنگ عظیم کا جو اثر پڑا ہے اس کا نہایت مؤثر انداز میں جائزہ لیتا ہے۔

ایک صحافی کی حیثیت سے میری اپنی کہانیوں پر قومی تحریکوں اور انقلابی واقعات کا زیادہ اثر پڑا ہے "زندگی" گاندھی جی کے برت کے بارے میں ہے "اجنتا" "انتقام اور" "سردار جی" فسادات کے مختلف پہلوؤں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں "زعفران کے پھول" اور "میرے بچے" کشمیر پر لکھی گئیں ہیں۔ اور "ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام" گاندھی جی کی شہادت کے بعد لکھی گئی ہے۔

کرشن چندر جو شروع میں اپنی رومانی اور رنگین کہانیوں کے لئے مشہور اور مقبول تھا قومی زندگی سے کس حد تک متاثر ہوا تھا اس کا اندازہ اس

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

اصغر علی انجینیر

غالب اور جدید ذہن

میرے خیال سے ایک عظیم ادیب اور شاعر کے لئے تین باتیں بہت ضروری ہیں: "(faith) وابستگی (commitment) اور عقلی ادراک (intellectual perception) ان تینوں عناصر کے توازن سے ہی تخلیق میں عظمت پیدا ہوتی ہے۔ تیقین اور وابستگی ہو اور عقلی ادراک اور بالیدہ شعور نہ ہو تو تخلیق میں جذباتی ثروت (emotions richness) تو پیدا ہو سکتی ہے، شعور کی گہرائی نہیں۔ آخر الذکر عنصر کے بغیر تخلیق ہمارے جذبات کو فوری طور پر اپیل تو کر سکتی ہے لیکن زمان و مکان سے ماورا لیجانے والا وصف اس میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ عقلی ادراک سے ہی مشاہدے میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

اگر دوسری طرف عقلی ادراک کا عنصر موجود ہو اور جذباتی ثروت کا عنصر غائب جو بنیادی طور پر تیقین اور وابستگی کی شدت سے پیدا ہوتی ہے تو تخلیق میں فن پارے کی مخصوص کیفیت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ محض عقلیت (intellectualism) سے ادب پیدا نہیں ہوتا ہے۔ غالب ایک عظیم شاعر تھے اور ان کے یہاں ہمیں ان تمام عناصر کا متوازن استعمال نظر آتا ہے۔

یہاں میں نے faith اور commitment کا ذکر کیا ہے اسے کئی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اس لئے شروع میں ہی ان کی وضاحت کر دینا ضروری ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تیقین یا faith سے مراد روایتی faith نہیں ہے۔ میں نے یہاں faith کو مذہبی معنی میں یا دوسرے لفظوں میں "ایمان" کے معنی میں استعمال نہیں کیا ہے۔ غالب خود روایتی مذہب کے ہرگز قائل نہیں تھے۔ وہ عالم اور عابد کو ریاکار قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا اسلام سے جو بنیادی طور پر دین فطرت ہے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک فارسی شعر میں عالم و عابد کے لئے انہوں نے بڑے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔

بر عالم و عابد نتواں کرد کرست
این یکے بیہودہ گو واں دگرے بیہودہ کوش

دراصل تیقین زندگی کی طرف صحت مند رویہ ہے۔ ایک سائنسداں جسکا سارا دار مدار عقل (reason) پر ہوتا ہے، کو بھی اپنے سائنسی نظریات پر یقین ہوتا ہے۔ اس قسم کے صحت مند تیقن کے بغیر دنیا کی کوئی شے بھی انسان کے لئے مفید اور بامعنی نہیں ہو سکتی۔ عقل کے ساتھ اگر تیقن کی کیفیت نہ ہو تو نتیجہ محض خالی رائے (empty opinion) ہوگا۔ رائے اور فکر میں گہرائی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب وہ اس کی شخصیت کی ساخت میں پیوست ہو (to be rooted in ones personality)۔ عقل اور تیقن کے توازن سے ہی بارآور اور زرخیز شخصیت (personality productive) پیدا ہوتی ہے۔ عقل حرکت اور تبدیلی کی طرف لے جاتی ہے اور تیقن استحکام کی طرف۔ ایک بارآور شخصیت کے لئے اور تخلیقی شخصیت ضروری ہوتا ہے۔ حرکی استحکام میں (dynamic stability) بے حد تناؤ (creative tension) جو زندگی کو آگے لیجانے والا ہوتا ہے متضاد قوتوں سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ تیقن کی کیفیت ہی انسان کو وابستگی (commitment) کی طرف لے جاتی ہے۔ تیقن میں جتنی زیادہ شدت ہوگی کمٹ منٹ اتنا ہی زیادہ مضبوط ہوگا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کمٹ منٹ اسی صورت میں بامعنی ہوتا ہے جب وہ نظریات سے نہیں اقدار سے ہو۔ عام طور پر کمٹ منٹ نظریات سے ہو جاتا ہے اور اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نظریات سے کمٹ منٹ اقدار کی قیمت پر ہوتا ہے۔ کوئی بھی عظیم فنکار — جیسے کہ غالب تھے — نظریات کے مقابلے میں اقدار کو ہی زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ خیالات اور نظریات — اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے — جب حکمران طبقوں کا ان پر اجارہ ہو جاتا ہے وہ حکمراں طبقہ پرولتاری ہی کیوں نہ ہو، تو ان میں مطلق العنانیت (authoritarianism) کا زبردست میلان پیدا ہو جاتا ہے اور نظریات کی مطلق العنانیت ذہنی غلامی کی طرف لے جاتی ہے۔ اقدار پائیدار ہوتی ہیں اور نظریات کو تبدیلی کے عمل سے مفر نہیں۔

اب ہم اپنے موضوع "غالب اور جدید ذہن" کی طرف آتے ہیں۔ جدید ذہن میں وہ سب خوبیاں ہوتی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں۔ جدید ذہن جہاں عقل کو اپنا محور بنا کر تبدیلی کے عمل کو زندگی کے لئے قابل قبول بناتا ہے وہاں ذہنی استحکام کے لئے وہ چند بنیادی اقدار میں یقین رکھتے ہوئے ان سے وابستگی کو بھی ضروری سمجھتا ہے اور وہ کسی ایک دور کے پیدا شدہ خیالات اور نظریات کی حاکمیت کو رد کرنا بھی ناگزیر قرار دیتا ہے۔ اس طرح اس کی شخصیت تشکیل کے منفی مرحلے سے ماورا جا کر مثبت تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتی ہے۔

غالب کے یہاں یہ باتیں ہمیں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں۔ غالب کسی بھی نظریے یا طرز فکر کی کمل حاکمیت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ عقل کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے

مسلسل حرکت کے قائل نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان مسلسل سفر کی حالت میں ہے اور وطن کی طرف وہ اسی وقت راغب ہوتا ہے جب تھک جاتا ہے

ہر تیم نا سازگار آمد وطن فہمیدہ ایم

گرد شنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدمش

وہ دوران سفر کسی مقام کو اپنی منزل قرار نہیں دیتے، ہر مقام ان کے لئے۔ چاہے وہ مقام کعبہ ہی کیوں نہ ہو، "نقش پائے رہرواں" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم۔

کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدمش

اسی لئے وہ دیر و حرم کو بھی انسانی تمناؤں کے تکرار کا آئینہ قرار دیتے ہیں اور یہ انسان کے لئے منزل نہیں بلکہ اس کی واماندگی کی پناہ گاہیں ہیں۔ جدید کہنگی کو جو انسان کی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہیں قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور اپنے لئے تلاش مسلسل کے عمل کے تحت "نمطے دیگر" پیدا کرتا رہتا ہے

رمتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم   در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

یہاں "بزم رنگ و بو" "نمطے دیگر" کے ساتھ بڑی بامعنی ترکیب بن جاتی ہے۔ اس جہاں کی بزم میں رنگ و بو محض فطرت کی رنگا رنگی سے ہی نہیں بلکہ انسان کی کوششوں اور نئے نئے طور طریقوں کو اپنانے کا بھی نتیجہ ہے۔ اگر انسان ایک ہی طرز کو اپنا کر ہمیشہ کے لئے اس پر قانع ہو جائے تو یہ بزم رنگ و بو قائم نہیں رہ سکتی۔ بزم رنگ و بو اور نمطے دیگر کا گویا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہی بات دوسرے لفظوں میں غالب ایک ترجیع بند میں جو بہادر شاہ ظفر کی شان میں ہے یوں کہتے ہیں۔

ہر چہ نہ بود بود فرو ہشتہ انگنم   ہر چہ نہ فرسودہ قرار آورم

غالب چونکہ ہر عہد میں جدت کے قائل ہیں اس لئے وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ تمام برکتیں ماضی کے ساتھ وابستہ تھیں اور ماضی کے ہی گن گان کرتے رہنا چاہئے۔ پہلے جو کچھ تھا وہ آج بھی ہے بلکہ بہتر شکل میں ہے۔ اگر ذہن رسا اور دیدۂ بینا ہو تو زندگی کی برکتیں بہتر سے بہتر شکلیں ہر دور میں نظر آئیں گی۔ اس خیال کو وہ یوں ادا کرتے ہیں

بجام و آئینہ حرف جم و سکندر چیست

کہ ہر چہ رفت بہ ہر عہد در زمانۂ تست

یہ ضروری نہیں ہے کہ جام کا ذکر آئے تو جمشید کی طرف ہی ہمارا خیال جائے اور آئینے کے ساتھ بھی ہم سکندر کا نام جوڑے رہیں۔ ان سے بہتر موجد اور خوبتر ایجادات ہمارے دور میں بھی پائی جاتی ہیں غالب تو ایک دوسری انتہا پر جا کر یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ پلک کی ہر حرکت کے ساتھ ایک نیا جہاں وجود میں آ جاتا ہے۔ یہ بڑا ہی معنی خیز شعر ہے غالب کا کہ

در ہر مژہ برہم زدن ایں خلق جدید است

نظارہ سگالد کہ ہماں است و ہماں نیست

ہماں است و ہماں نیست تو نظارے کا فریب ہے لیکن اگر دیدہ بینا اور متحرک ہو تو ہر جھپک کے ساتھ ہمیں خلق جدید نظر آئے گی۔ غالب آنے والی نسلوں کو اپنے پیش رووں کا معیار قرار دیتے ہیں کیونکہ تلچھٹ جتنی بیٹھتی جائے گی شراب اتنی ہی صاف و شفاف ہوتی جائے گی۔

عیار فطرت پیشینان ز ما خیزد

صفائے بادہ ازیں دردِ تہ نشیں پیدا است

غالب کا ذہن کس قدر جدت پسند تھا اس کا اندازہ ان کے اس موقف سے بھی اچھی طرح ہو جاتا ہے جو انہوں نے مولانا فضل حق خیر آبادی اور ان کے مخالفوں کے درمیان ختم نبوت کے تنازعے سے متعلق اختیار کیا تھا۔ اس پر بحث چھڑی تھی کہ کیا اللہ تعالیٰ اب اور پیغمبر پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ شاہ اسمٰعیل شہید نے جو وہابی تحریک کے پیشوا تھے اپنی تصنیف تقویۃ الایمان میں لکھا کہ اگر خدا چاہے تو ایک پل میں آنحضرت صلعم جیسے کروڑوں کی تعداد میں پیدا کر دے۔ اس کے برخلاف مولانا فضل حق خیر آبادی نے اس نظریئے سے تعرض کیا اور کہا کہ خاتم النبین کی طرح کسی کا پیدا ہونا بالذات ناممکن ہے مولانا فضل حق نے غالب سے وہابی اعتقاد کی رد میں مثنوی لکھنے کی فرمائش کی لیکن غالب نے بڑا لطیف موقف اختیار کیا۔

صورت آرائش عالم نگر

یک مہ و یک مہر و یک خاتم نگر

آں کہ مہر و ماہ و اختر آفرید

می تواند مہر دیگر آفرید

قدرت حق بیش زیں ہم بودہ است

ہر چہ اندیشی کم از کم بودہ است

یک در یک عالم از روئے یقیں

خود نمی گنجد دو ختم المرسلیں

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است

قدرت حق را نہ یک عالم بس است

خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے

ہم بود ہر عالمے را خاتمے

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود

رحمۃ اللعالمینے ہم بود

کثرت ابداع عالم خوب تر

اور پھر

یا بہ یک عالم دو خاتم خوب تر

منشاء ایجاد ہر عالم یکیست

گر دو صد عالم بود خاتم یکیست

جو ہر سل بر نتابد تشنہ

در محمد رہ نیابد تشنہ

صانع عالم چنیں کرد اختیار

کس بعالم مثل تمہید نہ نہار

پھر گراپہ سایہ نہ پسند و خدا
پھر روئے نقش کے بندو خدا

مندکرہ بالا اشعار سے ظاہر ہے کہ اس نازک مسئلے پر غالب نے کسی مذہبی عقیدے کی طرفداری کرنے کے بجائے بڑی حد تک ذہنی تجدّد سے ہی کام لیا ہے فلسفیانہ شاعرانہ تاویل کرکے فریقین کی بات رکھ لی۔ غالب دراصل کائنات میں مستقبل کے امکانات (potentialities) سے انکار نہیں کرنا چاہتے۔ ان امکانات کی نفی کے معنی ہیں تبدیلیوں اور آئندہ ترقیوں کی تمام راہیں مسدود کردینا۔ غالب کا ذہن اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا۔ جہاں وہ ختم رسالت کے قائل ہیں وہاں وہ مستقبل کے تخلیقی امکانات کے بھی پوری طرح قائل ہیں اس لئے وہ مولانا فضل حق کی طرح اسے ایک جامد عقیدہ نہ قرار دیتے ہوئے ایک طرف تخلیقی امکانات اور فطرت کی حرکیت (dynamism of nature) کا دروازہ بھی کھلا رکھتے ہیں اور جوہر کل تثنیہ سے مبرا ہے یہ فلسفیانہ وجہ بتاکر اور جس کا سایہ بھی پیدا کرنا پسند نہیں کرتا اس کا ہمسر پیدا کرنا خدا کیسے پسند کرسکتا ہے جیسی شاعرانہ وجہ بتاکر دوسری طرف ختم رسالت کے عقیدے پر بھی قائم رہتے ہیں۔ غالب کی جگہ کوئی اور شاعر ہوتا تو وہ ایسی لطیف راہ مشکل سے ہی پیدا کرپاتا جس پر چل کر عقیدے کی آبرو رکھنے کے لئے ذہنی اپروچ کی قیمت نہ ادا کرنی پڑے۔

غالب کا ذہنی تجدّد ہمارے لئے کچھ سیاسی اور سماجی مسائل بھی پیدا کرتا ہے جن پر روشنی ڈالنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ غالب کا دور ہندستان کے لئے سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے شدید بحرانی دور تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندستانی سماج نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ تہذیبی اعتبار سے بھی ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ نئی تہذیب اور نئی قدریں وجود میں آرہی تھیں جن پر مغرب کا گہرا اثر تھا۔ مسلمانوں کو سیاسی اقتدار ہاتھ سے نکل جانے کا غم تھا اور دوسری طرف نئی تہذیب اور نئی قدروں سے انکار۔ اس کی نفسیاتی وجہ بالکل صاف ہے۔ کسی بھی زوال پذیر معاشرے میں عدم تحفظ کا احساس (sense of insecurity) بڑا شدید ہوتا ہے۔ اور جب نئی تہذیب اس کی جگہ لیتی ہے تو یہ احساس شدید تر ہوجاتا ہے اور یہ احساس جتنا شدید ہوتا جاتا ہے اس کے خلاف مقاومت کا جذبہ بھی اتنا ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

غالب کے ہمعصر دانشور، علماء اور ارباب اقتدار اسی تجربے سے گزر رہے تھے۔ اور سب کے لئے یہ بڑی آزمائش کا دور تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سوال سیاسی اور سماجی ترجیحات کا بھی تھا۔ چھنتے ہوئے اقتدار کے لئے جدوجہد یا نئی تہذیب اور اقدار کا خندہ پیشانی سے استقبال۔ یہ انتخاب بڑا ہمت آزما تھا۔ اس میں سماجی وجوہات اور معاشی مفادات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی توجیہات کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔ علماء نے سیاسی جدوجہد کو ترجیح دی اور انگریزوں کے خلاف کمربستہ ہوگئے۔ سیاسی اعتبار سے یہ یقیناً ترقی پسند اقدام تھا۔ انگریزوں کی سامراجیت اور استعماریت کو چیلنج کرنا یقیناً بہت ضروری تھا۔ اس شدید بحرانی دور میں نہ تو مسلمانوں میں ابھرتا ہوا سرمایہ دارانہ طبقہ تھا نہ ہی نئی ضرورتوں کے پیش نظر کوئی واضح صاف گو (articulate) مڈل کلاس ہی موجود تھا جو انگریزوں کی سامراجیت کا مقابلہ کرتا۔ مسلم معاشرہ جاگیردارانہ معاشرہ تھا اور جاگیرداروں اور تعلقہ داروں نے اپنے مفادات کے پیش نظر انگریزوں سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ سوائے علماء کے انگریزوں کا سیاسی مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں کوئی نہیں تھا۔ علماء نے اس سیاسی جنگ میں انگریزوں کے خلاف مذہبی محاورہ (idiom idiom) استعمال کیا جو بالکل فطری بات تھی۔

یہاں علماء کے نفسیاتی میلانات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ علماء راسخ العقیدہ اور قدامت پسند ہوتے ہیں اور پرانے سیاسی نظام سے وابستہ۔ انگریزوں کی حکومت کو قبول کرنے کا مطلب تھا ایک طرف اس قدیم سیاسی نظام سے جس میں ان کا مقام تھا ٹوٹنا اور دوسری طرف نئے نظام سے وابستہ نئی فکر اور اقدار کو راہ دینا۔ علماء نفسیاتی اعتبار سے اس کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھے۔ فکری اعتبار سے علماء کا رول ترقی پسند نہیں تھا لیکن سیاسی ترقی پسندی اور فکری ترقی پسندی — اوّل الذکر کے علماء نمائندہ تھے — کے درمیان سوال ترجیحات کا تھا۔ ایک پر دوسرے کو ترجیح دینا ان حالات میں اتنا آسان نہیں تھا۔ انگریزی اقتدار کے خلاف جنگ مغربی مغربی سامراجیت کے خلاف تھی اور یہ ملک کے مفاد میں بنیادی اہمیت رکھتی تھی۔ دوسری طرف نئی فکر اور اقدار سے انکار مستقبل کے امکانات کی برکتوں سے محروم ہونا تھا خلافت تحریک کے وقت بھی ہمارے سامنے اسی پس وپیش کا معاملہ تھا۔ کئی اسکالر اس خیال کے حامی ہیں کہ خلافت تحریک نے ہماری قومی زندگی میں رجعت پرستی کو راہ دی۔ یہ سیاسی مصلحت پسندی (political expediency) تو ہوسکتی ہے لیکن اصول پرستی نہیں۔

لیکن اس خیال کی صحت میری نظروں میں مشکوک ہے۔ کسی بھی سیاسی حکمت عملی میں حالات کے تقاضے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم آج کے ہمارے شعور کو ماضی پر پروجکٹ (project) نہیں کرسکتے۔ خلافت تحریک۔ انگریزوں کی سامراجیت کو زبردست چیلنج تھی پچھڑے ہوئے سماج میں جدید معاشی اور سماجی بنیادوں کی غیرموجودگی میں سیکولر قومی نظریہ استوار نہیں ہوسکتا اور قومی اقتدار کی جنگ اس کا انتظار نہیں کرسکتی۔ بہرحال یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے اور اس کے

کئی پہلو ہیں۔ ہم کسی ایک پہلو کو مدِ نظر رکھ کر ہی اس پر فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتے۔

اگر ہم صحیح تناظر میں معاملات کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ علما کا رویّہ ان تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور اس دور کے حالات کے پیشِ نظر بڑی حد تک صحیح تھا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے مختلف علما کے فتاوی نصرت الاجرار کے نام سے جمع کر کے شائع کئے جن کے مطابق انگریزی حکومت کے تحت ہندستان کو دار الحرب قرار دیا گیا تھا اور دار الحرب میں حکومت کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہو جاتا ہے۔ اس لئے علما نے مسلمانانِ ہند کو اس دور میں انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کی ترغیب دی اور ہندوؤں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر لڑنے کے لئے آمادہ کیا۔ شاہ عبد العزیز نے تو مراٹھوں کے تحت ہندستان کو دار الامن اور انگریزوں کے تحت اسے دار الحرب قرار دیا تھا

اب ہم پھر غالب کی طرف آتے ہیں۔ علما کے برخلاف غالب سماجی اور مذہبی معاملات میں بالکل کھلا ذہن رکھتے تھے اور راسخ العقیدگی سے انھیں سخت اختلاف تھا۔ نفسیاتی اعتبار سے وہ نئی فکر اور اقدار کو قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ حرکت اور تبدیلی ان کے ایمان کا جزو تھی۔ ویسے جاگیر دارانہ معاشرے کو حرکت اور تبدیلی سے اللہ واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ غالب اس معاشرے کا طبعی اعتبار سے (علامتیں) جزو تھے لیکن ذہنی اعتبار سے نہیں۔ روایت پرستی سے انھیں وحشت محسوس ہوتی تھی اور انھیں "سبحہ و زنّار کے پھندے میں کوئی گیرائی" نظر نہیں آتی تھی۔ وفاداری میں ہی ان کے نزدیک شیخ و برہمن کی اصل آزمائش تھی۔ کفر و دین بھی انھیں محض "آرائشِ پندار" وجود نظر آتے تھے۔ ان کی نگاہیں [illegible] پردوں کو چاک کر کے ہر کشش کا جلوہ … نظر آتی تھی۔

اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جاگیر دارانہ معاشرہ ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ اس لئے غالب نے سیاسی اقتدار کی جنگ پر سماجی تبدیلی کی جدوجہد کو ترجیح دی اور مستقبل کے نئے امکانات کی خیر و برکت کو جو نئے نظام نے پیدا کر دیئے تھے، سینے سے لگانا مناسب سمجھا۔ غالب کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ ان کے لئے فطری انتخاب تھا۔ نظام کہنہ ان کے سامنے منتشر ہو رہا تھا اور اس نظام سے ان کا کوئی ذاتی مفاد بھی وابستہ نہ تھا، جذباتی لگاؤ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غالب کے یہاں ہمیں فکر کی پختگی اور سماجی شعور کے باوجود سیاسی شعور نظر نہیں آتا۔ انھیں اس بات کا غم نہیں ہے کہ ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جا چکا ہے، ذہنی اور فکری آزادی انھیں ہر قیمت پر عزیز ہے اور انگریزوں کی ایجادات ذہنی انکشافات میں انھیں انسانی ترقی کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔ آئینِ اکبری پر لکھی گئی ان کی تقریظ اس بات کا بہترین ثبوت ہے۔

جنگِ آزادی کی جدوجہد کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جو لوگ مغربی افکار سے تحریک حاصل کر کے اصلاحی تحریکوں میں شامل ہوئے وہ آزادی کی جدوجہد سے دور ہی رہے۔ وہ راجہ رام موہن رائے ہوں یا سرسید، وہ مدراس کے پیری یار ہوں یا مہاراشٹر کے گوکھلے، ہمیں یہی کردار نظر آئے گا۔ یہ ہمارے استعماری معاشرے کے دو متضاد پہلو تھے لیکن دونوں کی اپنی اہمیت تھی۔ جہاں ہمارے معاشرے کو سامراجی اور استعماری قوت سے نجات دلانا ضروری تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر صحیح معنی میں معاشی اور صنعتی ترقی ممکن نہیں تھی۔ وہاں نئے ذہنی رجحانات کو پروان چڑھانا بھی لازمی تھا۔ ان نئے ذہنی رجحانات کو پروان چڑھائے بغیر صنعتی ترقی اور سماجی تبدیلی کے لئے عقلی فضا ہموار کرنا ممکن نہ تھا۔ ان ظاہری تضادات کے باوجود یہ دونوں رجحان ایک خاص نقطے پر پہنچ کر ایک دوسرے کے معاون بن جاتے تھے۔

غالب نے اپنے طبقاتی حدود اور ذہنی رجحان کے پیشِ نظر جنگِ آزادی کے مقابلے میں فکری آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو کر نئے نظام کے امکانات کا خیر مقدم کرنا بہتر جانا اور اردو شاعری پر اپنی ذہنی عظمت کا سکہ بٹھا گئے۔ غالب نے اردو شاعری کو فکر کی نئی جہات سے روشناس کرایا۔ سیاسی آزادی کے لئے جوش جیسے شاعر بھی جوش دلا سکتے تھے لیکن شاعری میں حسن و صداقت کے عناصر کو قائم رکھتے ہوئے فکر کے عنصر کو غالب کر دینا غالب کا ہی کام تھا۔

[illegible]

ایک تھوکا گیا آدمی

منیر احمد شیخ

جب وہ ایک مدت کے بعد وطن واپس لوٹا تو گاڑی سے اتر کر ویگن میں سوار ہوا تو اس نے ٹکٹ چیکر سے اسلام آباد کا ٹکٹ کاٹنے کو کہا۔ ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ دینے سے پہلے اونچی آواز میں اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا
ڈیڑھ روپیہ۔

ٹکٹ چیکر کی یہ حرکت اسے ذرا عجیب سی لگی۔ کئی برس پہلے جب اس نے وطن چھوڑا تھا، اس وقت چیکر سواری کی صورت دیکھ کر ہاتھ میں ٹکٹ تھما دیا کرتے تھے مگر ٹکٹ دینے سے پہلے پیسوں کا اعلان اسے عجیب سا لگا۔ اسے یوں لگا جیسے ٹکٹ چیکر نے اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہی لگا ڈالی گو بظاہر ولایتی سوٹ بوٹ میں ملبوس وہ ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ حیثیت کا مالک دکھائی دے رہا تھا۔

پھر جب اس نے دو روپے ٹکٹ چیکر کے ہاتھ میں تھما دیے تو ٹکٹ چیکر نے بڑی بے اعتنائی سے ٹکٹ کاٹ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور لمبے کرتے کی دائیں جانب والی جیب کے اندر سے اٹھنی نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھی اور زور سے ایک تھوک ویگن کے فرش پر پھینکی۔ اٹھنی اور تھوک ایک ہی وقت میں ہاتھ اور فرش پر گرے۔

فرش پر گری ہوئی تھوک اسے اٹھنی لگ رہی تھی جو کسی سواری کی جیب سے وہاں گر گئی ہو اور کسی کی نظر نہ پڑی ہو۔ ایک لمحے کے لیے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کنڈکٹر نے اٹھنی فرش پر پھینک دی ہے اور تھوک اس کے ہاتھ پر گرا دی ہے۔ اسے تھوک سے سخت نفرت تھی اور جب تک اسلام آباد کا اڈہ نہ آیا، وہ تھوک اس کے سامنے اس کی نظروں سے چپکی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ تھوک اس کے سامنے پڑی، اسے وطن آنے پر خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ اس نے جھنجھلا کر باہر کھڑکی میں دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ تھوک اس کے ذہن میں اس طرح چپک گئی تھی کہ اسے باہر پھیلی ہوئی زمین، ویگن کا فرش دکھائی دے رہی تھی جس پر وہ تھوک اٹھنی کی صورت میں جگہ جگہ پڑی ہوئی تھی۔

یہ پہلی تھوک تھی جو وطن میں قدم رکھتے ہی اس کے سامنے گری تھی۔ اس لئے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اکثر ٹکٹ چیکر بدتمیز اور جاہل ہوتے ہیں یہ تھوک اس نے عادتاً پھینک دی ہے اور اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں لیکن جب تک اسلام آباد کا اڈہ نہ آیا اور وہ بس سے نہ اترا وہ تھوک اسے بہت پریشان کرتی رہی۔ اور جب اس نے ویگن سے باہر قدم رکھا تو اسے ایسے لگا جیسے بس میں اسے کسی نے گالی دی تھی اور اب وہ دوبارہ ایک پاکیزہ فضا میں آ گیا ہے۔

دو چار گھر گئے، اس نے جس جگہ آن کے قیام کیا تھا۔ وہاں کا جغرافیہ معلوم کرنے کے لئے اس نے شام کو سیر کا ارادہ کیا۔ وہ کپڑے بدل کر اپنے آپ کو اس بستی سے متعارف کرانے کے لیے نکلا جس میں اب اسے رہنا تھا۔ بستی کی عمارتوں اور راستوں کو جاننا ایسے ہی تھا جیسے وہ اسے ارد گرد کی فضا کو اپنے وجود سے آشنا کرانا چاہتا ہے۔ عمارتیں اور راستے اب جانے کتنی دیر کے لئے اس کے جیون ساتھی بننے والے تھے۔

وہ اسی گلی کا موڑ مڑا۔ اس کے دائیں جانب سرمئی پہاڑ تھے اور خنک سی ہوا چل رہی تھی۔ سبزی پہاڑوں کی ڈھلوان پر سبز اور تر و تازہ خوشبو اس کے نتھنوں کو چھونے لگی اور اسے ایک خوبصورت لینڈ سکیپ میں اپنے آپ کو پانے پر ایک انجانی سی خوشی ہوئی یہ بستی کس قدر خوبصورت ہے اور پھر یہ اپنے وطن کا حصہ ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے لمبی داڑھی والا ایک ملا اور اس کا ایک شاگرد جس کی داڑھی ابھی نئی نئی داڑھی پھوٹی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ باتوں سے زیادہ ایسے لگ رہا تھا۔ وہ ملا اپنے شاگرد کو کوئی سبق دہرا رہے تھے جو اس نے اسے مدرسے میں دیا تھا۔ جب وہ دونوں اس کے ذرا قریب آئے تو لمبی داڑھی والے ملا نے زور سے کھانسا اور گلے میں سے کرخت آواز کے ساتھ ایک بہت بڑی بلغمی تھوک اس کی طرف دیکھتے ہوئے سڑک پر پھینکی۔ وہ ایک دم کانپ سا گیا۔ اسے یوں لگا کہ مولوی صاحب نے جیسے اسے دیکھتے ہی ایک پتھر مار دیا ہے اور یہ پتھر سڑک پر نہیں گرا، بلکہ اس کے جسم پر لگا ہے۔ تھوک سے اسے سخت نفرت تھی مگر ابھی جبکہ وطن کے تازہ خوشبو کے جھونکے کے نشے میں سرشار ہونے کی کیفیت میں تھا، مولوی صاحب کی اس تھوک نے اسے ہلا کے رکھ دیا۔ وہ تو اس بستی سے اپنا تعارف کروانے نکلا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ عمارتوں اور راستوں کو پہچان سکتا اس تھوک نے اس کے وجود ہی کی نفی کر دی۔ اسے ایک منٹ کے لئے ایسا لگا جیسے اس راستے کی عمارتوں میں سے تھوکیں گر کر اس کے اوپر گرنے لگی ہیں اور ایک ناپسندیدہ آدمی ہے۔ مگر جلد ہی اس نے خیال کو دبا دیا کہ یہ محض ذہن کی اختراع ہے اور اسے اس طرح نہیں سوچنا چاہئے۔ مولوی صاحب کو ایسے ہی بلغم سی آئی ہوگی اور انہوں نے سینے کو ہلکا کرنے کے لئے تھوک دیا۔ اسے خواہ مخواہ زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہئے۔ مگر یہ دوسری تھوک تھی جو وطن واپس لوٹنے کے بعد اس کے حصے میں آئی تھی۔ اس سے پہلے جب وہ یہاں تھا تو لوگ اس وقت بھی بسوں، کاروں اور سڑکوں پر تھوکتے ہوں گے۔ اس نے کبھی اس کا نوٹس نہ لیا تھا۔ اس کے باوجود کہ تھوکنا اسے سخت برا لگتا تھا۔ مگر اب جانے کیوں خود سے اس نے تھوکوں کی گنتی شروع کر دی تھی۔ اس دوسری تھوک پر اسے پہلے والی تھوک بھی یاد آ گئی جو ویگن کے فرش پر اٹھنی کی صورت میں گری تھی۔

اب اس نے اپنے کام پر جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ سامان میں ایک کار بھی لایا تھا۔ جو اس نے کسٹم والوں سے آزاد کروا کے لی تھی۔ اس نے اس کی سروس کروائی، نہلایا دھلایا اور خوب چمکا کر اسے باہر نکالا اور دفتر کو روانہ ہوا۔ یہ بھی کتنی خوش نصیبی اور خدا کی نعمت ہے۔

کہ آپ کے پاس اپنی سواری ہو اور آپ کو بد اخلاق بسین ڈرائیوروں، رکشا والوں اور بس کنڈکٹروں سے نجات دلا رکھے۔ وہ دل ہی دل میں کلمہ شکر ادا کرنے لگا۔ اتنے میں ایک ٹرک [illegible] دیتا ہوا بڑی تیزی میں اس کے برابر سے نکلا اور جب اس نے ٹرک کو راستہ دینے کے لئے اپنی کار کو ایک طرف کیا تو ڈرائیور کی کھڑکی میں سے ایک تھوک اڑتی ہوئی اس کی کار کے سامنے والے شیشے پر ٹھک سے آن کر گری اور اس کے چھینٹے دائرے کی شکل میں تھوک کے گرد کرنوں کی طرح پھیل گئے۔ وہ سیٹ پر بیٹھا ایک دم اپنا سر کو پیچھے لے گیا۔ جیسے یہ تھوک اس کے منہ پر گری ہو۔ اگر درمیان میں کار کا شیشہ نہ ہوتا اور کار کے بجائے سڑک پر پیدل چل رہا ہوتا تو۔ اڑتی ہوئی تھوک ضرور اس کے چہرے پر آن کر گرتی۔ اس نے جلدی سے کار کے وائپر چلا دیئے مگر اب وہ تھوک صاف ہونے کے بجائے شیشے پر پوری پھیل گئی اور وہ شیشہ اندھا ہو گیا۔ اور سامنے کا راستہ بھی اس کی نظروں کے سامنے گدلا سا گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ گاڑی وہیں کھڑی کر کے پیدل چلنے لگے کہ وہ شیشہ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سفید تھوک کی ایک چادر ہے۔ جو اس کے اور باہر کی فضا کے درمیان کھنچ گئی ہے اور اگر اس نے ہاتھ سے اس چادر کو درمیان سے ہٹانا چاہا تو اس کے ہاتھ بھی تھوک میں لتھڑ جائیں گے۔ اس کیفیت میں اس کا جی متلانے لگا۔ وہ ٹرک اب بہت دور جا چکا تھا اور اسے فوراً یاد آ گیا کہ یہ تیسری تھوک ہے جو ایک ہفتے کے اندر اندر اس پر گری ہے۔ اس گنتی پر حیرت ہوئی کہ کیوں تھوک کو گن رہا ہے حالانکہ تھوکنے والے عمداً کسی پہ تھوک نہیں رہے ہوتے۔ وہ عادتاً ایسا کرتے ہیں یا کسی اور وجہ سے مگر ان کی نیت یہ ہرگز نہیں ہوتی کہ وہ دوسروں پہ تھوک رہے ہیں۔ تھوک ان کی زندگی کا ایسے ہی حصہ ہے، جیسے جنسی فعل۔

ملک اور معاشرے میں تھوکنے پہ کوئی پابندی نہیں۔ ہر ایک کو تھوکنے کی پوری آزادی ہے۔ گھر کی چاردیواری کے اندر بھی اور باہر بھی۔

اگلے روز وہ مارکیٹ کی طرف شاپنگ کو جا رہا تھا۔ ایک چپ چاپ سی سڑک پر گورے سانولے رنگ کی ایک جوان سی لڑکی چلی آ رہی تھی جس کے کپڑے تو بہت معمولی تھے مگر جسم اور چہرہ دونوں پرکشش تھے۔ اس کی چال میں بلا کی جنسی کشش تھی جو راہگیروں کو اپنی جانب متوجہ کرنے پہ مجبور کر رہی تھی جب وہ لڑکی اس کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں جھاڑو ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ جمعدارنی ہے اور جوانی کے نشے میں مست و بے خبر ہے۔

جونہی اس کی نظریں اس لڑکی سے چار ہوئیں تو اس نے اسی بے پروائی کے عالم میں جس میں کہ وہ چل رہی تھی، تھوک دیا۔ جیسے وہ اپنی طرف ہونے والی توجہ کی تصدیق کر رہی ہو۔ اپنے حسین ہونے کا یہ انداز اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ایک جوان و خوبرو دوشیزہ اپنی طرف متوجہ ہونے والے کو اپنے وجود کا احساس تھوک پھینک کر دلاتے، یہ بڑی عجیب سی بات تھی مگر یہ واقعہ اپنی جگہ تھا کہ ایک جوان عورت کے یہاں جوانی کا احساس اس صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ اس پر اس کی سوچ کا چکر پھر سے چلنے لگا کہ کیا یہ تھوک اس عورت کے وجود کی شہادت تھی یا اس نے اپنی جانب دیکھنے والے کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اور جوانی کے نشے میں اس کی نفی کر دی تھی؟ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ تھوک اگر نفی اور حقارت کا اظہار ہے تو اس میں کونسی ایسی بات تھی کہ اسے تھوک دیا جاتا۔ اس نے تو اپنے تئیں ایک مرد ہونے کے ناطے نظروں ہی نظروں میں اس کے حسن کی داد دینا چاہی تھی۔ مگر جواب میں اسے ایک تھوک زمین پر گری ہوئی ملی جو کچھ بھی تھا مگر یہ چوتھی تھوک تھی جو اس نے گنی اور پہلی تین تھوکیں بھی اسے یاد آ گئیں۔ اور پہلی مرتبہ اسے اپنے وجود کے بارے میں شک ہونے لگا کہ کہیں اس کے اندر کوئی ایسی تبدیلی تو نہیں آ گئی جو لوگوں کو [illegible] اسے دیکھتی ہے۔ تھوک دینے پر مجبور کر دیتی ہے وہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا۔ کیا لوگ اب زیادہ تھوکنے لگے ہیں یا محض اسے ایسے لگ رہا ہے؟ بہرحال کچھ نہ کچھ تبدیلی کہیں ضرور آ گئی تھی کہ جس شخص سے اسے کسی طرح کا واسطہ پڑا تو وہ شخص اسے دیکھتے ہی تھوک دیتا۔ گننے کو تو اس نے چار تھوکیں ہی دیکھی تھیں مگر اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ تھوک اب اس کا مقدر ہے اور وہ جس شخص کی طرف دیکھے گا تو وہ ضرور تھوکے گا۔ یہ وہم تھا یا باطنی مگر واقعہ یہ ہے کہ سڑک پر چلتے ہوئے وہ اپنے آگے آگے چلنے والے کے بارے میں یہ سوچتا کہ جونہی وہ اس کے برابر ہوگا تو وہ ضرور تھوک دے گا ہمیشہ وہ کسی اجنبی کے بارے میں ابھی یہ سوچ ہی رہا ہوتا کہ میرے قریب آ رہا ہے تو اجنبی کی تھوک گر جاتی اور اسے لگتا کہ یہ تھوک اسی کے لئے تھی۔ اب اتنی تھوکیں اس کے سامنے گر چکی تھیں کہ اس کی گنتی بھی گڈمڈ ہو گئی اور وہ سینکڑوں تھیں کہ ہزاروں، ایسا لگتا تھا کہ اس کے چاروں طرف تھوکیں ہی تھوکیں ہیں اور وہ ان سے بچ نہیں سکتا۔

ایک مرتبہ اسے اسلام آباد سے لاہور سے جانا پڑا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی ایک بس پہ وہ سوار ہوا اور ڈرائیور کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس سیٹ پر تین سواریاں بیٹھ سکتی تھیں۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا تاکہ تازہ ہوا کے ساتھ باہر کے منظر سے بھی لطف اندوز ہو سکے۔ جونہی بس سٹارٹ ہوئی تو اس کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے جس نے گلے میں منکے ڈالے ہوئے تھے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے وہیں سے کھڑکی کی طرف زور سے تھوکا اور بلند آواز سے سفر کے حفاظت سے گزر جانے کی دعا مانگی۔ اس کے تھوک کے چھینٹے اس کے چہرے پر گرے۔ اور اس کا جی بیزار ہو گیا۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ اس فقیر صورت سائیں کو داڑھی سے پکڑ کے ایک زور کا چانٹا منہ پر لگائے مگر وہ یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ ممکن ہے سائیں نے اللہ کو پکارنے سے پہلے اپنے منہ کو آلائشوں سے پاک صاف کرنا چاہا ہو۔ اللہ کا پاک نام لینے سے پہلے گلا اور منہ غلاظتوں سے پاک ہونے چاہئیں اور سائیں کی مراد بھی یہی ہو گی مگر اس تھوک کے کچھ چھینٹے اس کے چہرے پر بھی تو آن گرے تھے۔ کیا یہ اس نفی کے چھینٹے تو نہیں تھے جو اب یہاں اس کا مقدر ہو گئی تھی۔ اسے لگا کہ اس نفی میں کچھ کچھ حقارت بھی شامل ہے۔ تھوکنے کے فعل میں یہ دونوں عناصر ہوتے ہیں۔

بس ابھی شہر سے نکلی ہی تھی کہ کھلا منظر اس کے سامنے آ گئے۔ اس نے سائیں کی تھوک کو بھول جانا چاہا اور اپنی نظروں کے سامنے کے پہاڑی نالوں اور سرسبز وادیوں کے حسن میں کھو گیا۔

ابھی وہ اس کیفیت کا لطف لے ہی رہا تھا کہ اس سیٹ پر بیٹھا ہوا تیسرا آدمی جو کہ ایک وردی میں ملبوس تھا اور سائیں کے برابر بیٹھا ہوا تھا اپنی جگہ سے ذرا سا اٹھا اور وہیں سے ایک زوردار تھوک کھڑکی کی طرف لنڈھا دی۔ اس کے چھینٹے کچھ سائیں کے اور کچھ ان کے چہرے پر گرے۔ سائیں نے تو اپنے چہرے پہ دایاں ہاتھ اس طرح پھیرا جیسے دعا کے بعد پھیرا جاتا ہے اور سیدھا تکنے لگ گیا مگر اس دوسری تھوک نے اس سفر کا لطف کرکرا کر دیا۔ اس نے رومال نکال کر اپنے چہرے کو صاف کیا۔ اور وردی والے کی طرف ایک سخت حقارت کی نظر ڈالی۔ مگر وہ بڑی بے نیازی کے عالم میں اپنی مونچھوں کو مروڑ رہا تھا جیسے اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔ بالکل بے خبر۔ اس کا جی چاہا کہ ایک مرتبہ وہ اس کا گریبان پکڑ کر اسے بتلائے کہ ہمسفری کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور ایک سیٹ پر بیٹھنے والے سبھی ایک سے ہوتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے مگر اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اسے کچھ کہہ سکے۔ وردی والے کے چہرے پر جو اعتماد تھا اس سے ایسا لگ رہا تھا کہ اس سے اگر اس کا ذکر کیا گیا تو وہ کہیں یہ نہ کہہ دے کہ شکر کرو کہ میں نے تمہارے منہ پر نہیں تھوک دیا۔ باہر ہی تھوکا ہے اور تھوکنا نہ گناہ ہے، نہ ظلم۔ اس میں غصہ کرنے اور تلملانے کی کونسی بات ہے۔

لاہور تک سارا راستہ وہ داڑھی والا اور وردی والا دونوں وقفہ وقفہ کے بعد برابر تھوکتے رہے اور وہ سارا راستہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتا رہا مگر وہ بات جو پہلے محض ایک دہشت تھی اب یقین میں بدل گئی۔ کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوگا، تھوک سے نہیں بچ سکے گا جب سے وہ واپس لوٹا تھا سفر میں تھا، یا حضر میں، اس کے آگے، پیچھے دائیں بائیں تھوکیں ہی تھوکیں تھیں۔ جب وہ گھر میں بستر پر اکیلا لیٹا ہوا تھا تو اسے تھو تھو کی آوازیں آنے لگتیں۔ جو پہلے آہستہ ہوتیں پھر تیز ہونے لگتیں اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور تولیے سے اپنا چہرہ صاف کرنا شروع کر دیتا۔ چہرہ صاف کرنے کے بعد وہ غسلخانہ میں جا کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا تو اسے لگتا کہ وہ پاگل ہوتا جا رہا ہے مگر نہیں وہ تھوکیں جو باہر سڑکوں پر بسوں اور گاڑیوں میں، دفتروں اور گھروں میں سے اس کے اوپر گر رہی تھیں ان سے اس کا چہرہ ہی نہیں روح مسخ ہونے لگی تھی۔

"تم وہ آدمی ہو جسے رد کر دیا گیا ہے۔"

"تمہارا وجود کسی کو قبول نہیں۔"

"تم ایک ناپسندیدہ شخص ہو۔"

"تم ایک ذلیل انسان ہو۔"

"گھٹیا ہو۔"

"چھتر ہو۔"

یہ سب تھوکیں تھیں جن کو کبھی وہ رومال سے صاف کرتا، کبھی تولیے سے اور کبھی بازوؤں سے، اسے یقین ہو گیا کہ وہ فرقہ ملامتیہ کا آدمی ہے اور چاروں جانب سے تھوکوں کی بارش ایک لعنت کی شکل میں اس پر آن گری ہے مگر لوگ اسے دیکھ کر اور اپنے درمیان پا کر کیوں تھوکنے لگ گئے؟ وہ تو پہلے بھی تھوکتے تھے۔ بغیر کسی وجہ اور ضرورت کے تھوکتے تھے کبھی کسی وجہ اور ضرورت سے بھی۔ گلا صاف کرنے کیلئے بلغم خارج کرنے کے لئے، اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے، کسی کی تذلیل کرنے کے لئے، نفرت کے اظہار کے لئے۔ مگر ایسا کیوں ہونے لگا کہ ادھر کسی سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی اور اس نے سوچا کہ یہ آدمی کہیں تھوک نہ دے کہ اتنی دیر میں اس نے تھوک دیا۔

اس نے اپنے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا "تم نہ کسی سے زبان سے کچھ کہتے ہو نہ اشارے سے مگر پھر بھی تھوک دئیے جاتے ہو۔ ادھر بس ذرا سوچ ہی رہے ہوتے ہو تو جھٹ سے ایک تھوک تمہارے منہ آن گرتی ہے۔ تو کیا یہ تھوک تمہاری سوچ پر گرتی ہے؟"

"مگر سوچ پہ تو میرا اختیار نہیں، بولنے اور اشارہ کرنے پہ تو اختیار ہو سکتا ہے۔"

وہ اپنی سوچ کے ہاتھوں عاجز ہونے لگا

اسے ان لوگوں پر رشک آنے لگا جو سوچ سے عاری کر دئیے گئے ہیں کہ یہ ان کے خالق کا ان پر بڑا کرم ہے وہ تھوک کے تو نہیں جانتے رد تو نہیں کئے جاتے

"میں اپنے سوچ کے سوتے کیسے بند کروں اس کا کوئی طریقہ کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آ رہا۔ میں سخت حالت عذاب میں ہوں۔ میری سوچ، میری قبولیت کے راستے میں دیوار بن گئی ہے۔ نہیں، دیوار نہیں، دیوار تو گرائی جا سکتی ہے۔ یہ تو میرے لئے لعنت کا ایک طوق بن گئی ہے۔ جو گردن میں پھنس گیا ہے۔ میں رد کر دیا گیا ہوں، میں اپنوں میں ناپسندیدہ ہو گیا ہوں، میں اس لعنت سے بھاگ کے کہاں جاؤں؟"

"یہ سب لوگ کیوں تھوک رہے ہیں؟ یہ تھوکنے کے بجائے منہ سے کیوں کچھ نہیں کہتے؟ ایسے لگتا ہے کہ لفظ ان کے منہ کے اندر چپ ہو گئے ہیں اور جب لفظ منہ میں چپ ہو جائیں تو پھر منہ کے اندر صرف لعاب ہی رہ جاتا ہے اب انہیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے، وہ تھوک کے کہہ دیتے ہیں۔ لیکن جو تھوک رہا ہے، وہ کچھ کہہ رہا ہے۔ اپنے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔ مگر جب لفظ تھوک میں بدلنے لگ جائیں تو یہ قرب قیامت کی نشانی ہے۔ تھوک کے جو کچھ کہا جائے وہ تھوکنے کے فعل کو خوبصورت نہیں بنا سکتا۔ تھوک غلیظ اور گندی شے ہے اور کراہت پیدا کرتی ہے۔

اسے کوئی راستہ، کوئی روشنی نہیں دکھائی دے رہی تھی وہ کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتا تھا لعنت کے خوفناک سحر نے اسے جکڑ لیا تھا۔ اس نے گھبراہٹ اور شدید نروس نیس کے عالم میں اس لعنت پر تھوک دینا چاہا، پر جب اس نے تھوکنے کی کوشش کی تو اسے پتہ چلا کہ اس کا گلا خوف سے خشک ہو چکا ہے اور منہ میں لعاب نہیں رہا۔ اس نے تھو تھو کی آواز نکالی مگر کوئی تھوک اس کے منہ سے نہ نکلی نہ جانے کیوں یہ خوف کی وجہ سے ایسا ہوا تھا یا اسے تھوک سے شدید نفرت تھی۔ جو کچھ بھی تھا، وہ کوشش کے باوجود نہ تھوک سکا اور خالی تھو تھو کی آواز نکال کر بالآخر چپ ہو گیا اور بستر پہ گر گیا نیند میں اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس پر مسلسل تھوکوں کی بارش ہو رہی ہے اور جب وہ بیدار ہوا تو اسے لگا اس کا سارا بدن تھوکوں سے لتھڑا ہے وہ جلدی سے غسلخانے کی طرف بھاگا پہلے وہ صرف چہرہ ہی صاف کرتا تھا، اب سارا بدن صاف کرنے لگا۔

بشکریہ ادب لطیف

افسانہ

دشتِ خموشی

مشرف عالم ذوقی





ادھر وہ بالکل بدلا بدلا سا لگ رہا تھا اس سے قبل وہ جب بھی آتا تھا، جنگ کی باتیں لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی مٹھیاں شدت سے بھینچ جایا کرتیں چہرہ لال سرخ ہو جایا کرتا۔ اور وہ بڑے ہی ڈرامائی انداز میں بتلایا کرتا۔ دوست! جنگ بہت ضروری ہے۔!"

"ہاں، جنگ بہت ضروری ہے۔"

میں ہمیشہ کی طرح اس کی ہاں میں ہاں ملایا کرتا۔ "مگر یہ جنگ آخر تم کب لڑو گے۔؟"

وہ میری اس بات پر اپنا سر جھکا دیتا۔ اس کی مٹھیوں کا تناؤ آہستہ آہستہ کم ہوتا۔ پھر وہ تھکے ہارے لہجے میں بتایا کرتا۔ "اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے... اب جنگ ہو کر رہے گی۔"

پھر وہ ٹیبل پر اپنے دونوں پیروں کو پھیلا دیتا اور گہری سانسیں لینے لگتا۔ میں جانتا تھا۔ ایسے موقعے پر اسے چھیڑنا مناسب نہیں۔ اس لئے پاس پڑی ہوئی کوئی کتاب اٹھا کر خاموشی سے ورق گردانی شروع کر دیتا۔ اور اس دوران کنکھیوں سے برابر اس کے جذبات کا مطالعہ کرتا رہتا۔ میں جانتا تھا۔ یہ جنگ اس کی اپنی ایجاد ہے۔ جب بھی گھبراتا ہے یا کوئی پریشانی اسے گھیر لیتی ہے۔ یا اس کے اندر کے آدمی کو چوٹ پہنچتی ہے۔ جنگ کا خبط اس پر سوار ہو جایا کرتا ہے۔

مگر اس دن جب وہ آیا تو کافی گھبرایا ہوا تھا اس دن اس نے جنگ کی بات بھی نہیں چھیڑی بلکہ خلاف معمول اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ سوار تھی۔

"آج تمہیں میرے ساتھ چل کر دیکھنا ہوگا۔ وہ کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اندر ہی اندر کھول رہا ہو۔ اور کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہو۔ جس نے اس کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہو۔

"بیٹھ جاؤ۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ کیونکہ دیکھ رہا تھا اس کی ذہنی حالت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ اور وہ اس حال میں ہے کہ جو دل میں آئے گا، اول فول بکنے لگے گا۔

"چائے پیو گے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں۔ بس تم تیار ہو جاؤ۔ آج تمہیں دیکھنا ہی پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے میں تیار ہو جاتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا اور جلدی جلدی کپڑے پہننے میں لگ گیا۔

شہر سناٹے میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا دکانیں بند تھیں۔ شاہراہوں پر جھنڈ کے جھنڈ لوگ جمع تھے۔ لوگوں کے چہرے پر وہی دہشت رہی آگ تھی جو میرے دوست کے چہرے پر سلگ رہی تھی۔ حیرت اور تعجب کی بات تو یہ تھی کہ مجھے کوئی پریشانی نہ تھی اور شہر میں دکانوں کے بند ہونے کی اطلاع بھی مجھ تک نہ پہنچی تھی۔ شاید اس کا واحد سبب یہ تھا کہ میں نے ان معاملوں میں کبھی دخل ہی نہیں دیا۔ وہی پرانی میری کوٹھری رہی اور میں رہا۔ کبھی کتابوں میں کھو گیا۔ کبھی ورق کے ورق سیاہ کر دیئے۔ اور ان شب و روز میں اکیلے پن کے باوجود کبھی تنہائی سے میرا واسطہ ہی نہ پڑا۔ مگر میرا دوست۔ وہ تو تنہا ہوں

کا اسیر ہے۔ ایک دو نہیں ہزار ہا تنہائیاں ہر وقت اس کے شامل چلتی ہیں۔ سڑک پر ہونے والا حادثہ اس کا اپنا حادثہ ہے کسی کے گھر میں ہو رہے ماتم میں وہ شریک ہے۔ غم میں... دکھ میں... غرض ہر جگہ باتوں کے درمیان وہ اپنی شخصیت کی ایک موٹی پرت ضرور چھوڑ جاتا ہے۔

بند دکانوں کو دیکھ کر بھی جب میرے چہرے پر کوئی تبدیلی کا دھواں پیدا نہیں ہوا تو اس نے استعجاب سے میری آنکھوں میں جھانکا۔

'دکانوں کے بند ہونے کا مطلب جانتے ہو۔؟'

'ہاں جانتا ہوں۔ کچھ ہنگامہ ہو گیا ہوگا۔ یا فساد پھوٹ پڑا ہوگا۔'

اب چونکنے کی باری اس کی تھی۔ 'تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے یہ ہنگامہ، فساد بہت معمولی چیز ہو۔'

'ہاں۔' میں نے اپنے شانے سکوڑے 'میرے لئے اب یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ جو روز ہوتے ہوں ان کے بارے میں کیا سوچنا۔ تعجب تو تب ہوگا جب کسی روز شہر میں ہنگامہ نہ ہو اور فساد نہ پھوٹے۔'

'یعنی تمہیں ان سب سے کوئی مطلب نہیں۔'

اس نے چڑچڑے پن سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اور وہی پرانی آگ اس کی آنکھوں میں سلگ اٹھی۔

'جانتے ہو۔ فساد میں کس کا گھر جلتا ہے... کس کا خون ہوتا ہے... کون مارا جاتا ہے... وہی لوگ جن کے پاس نہ سونے کو گھر ہے... نہ پہننے کو کپڑے... اور یہ آگ جانتے ہو کس طرف سے لگائی جاتی ہے...؟

اس کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ پھر اس نے انگلیوں سے سرفراز اور بلند بالا عمارتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا... ان بڑے بڑے گھروں سے پر تری کے شعلے نکلتے ہیں اور زمین پر چلنے والے حقیر کیڑوں کو ختم کر دیتے ہیں۔"

'ٹھہرو۔'

اتنا کہہ کر میں نے اپنی نظریں بلند و بالا عمارتوں سے جھانکتی متعدد نظروں پر مرکوز کر دیا۔ اور تب میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان بڑی بڑی عمارتوں سے جھانکتی آنکھوں میں بھی وہی دہشت تھی... اور وہی آگ تھی...

'آگ تو وہاں بھی ہے۔'

میں نے اسے دوست کو اشارہ کیا۔ 'ان تمام آنکھوں میں جو اپنی کھڑکیوں سے اس دہشت زدہ بھیڑ کو گھور رہی ہیں۔ غور سے دیکھو کیا تمہیں وہاں اضطراب نظر نہیں آتا۔ کیا وہاں بے بسی کے آنسو نہیں ملتے۔'

میرا دوست اچانک غصے سے مڑا۔ اور ضدی پن کی وہی بوسیدہ گڑیا اس کی نظروں میں مچل گئی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو کہ یہ بے قصور ہیں۔ میرے دوست! یہ نقاب لگائے ہوئے لوگ ہیں آگ لگانے والے بھیڑیے۔ فساد برپا کرنے والے بھیڑیئے.. آؤ.. میں تمہیں دکھاتا ہوں...

اتنا کہہ کر اس نے میرا ہاتھ سختی سے تھام لیا۔ پھر وہ مجھے دکھانے لگا۔ ہنگامے میں لٹ بانٹی دوکانداروں کے گرے ہوئے پھل.. روندی ہوئی سبزیاں۔ کیچڑ میں سنے ہوئے چنیا بادام... جا بجا خوف سے جھانکتی آنکھیں.. پھٹے کپڑوں میں سمٹا جسم.. اور بھی بہت کچھ... وہ دکھاتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی ملتہ حسی بھی کرتا جا رہا تھا...

"یہ سب انہی کے طفیل سے ہوا۔ انہی بھیڑیوں کی وجہ سے۔ یہ بھیڑیئے بہت خوفناک ہیں۔ درندہ صفت ہیں... صبح ہوتے ہی ان کے لہو آگیں ہونٹ شکار کو چلنے لگتے ہیں۔ پھر یہ سڑکوں پر بچھ جاتے ہیں... جھونپڑپٹیوں میں رینگ جاتے ہیں... نٹ پاتھوں کو توڑ دیتے ہیں... اور خون پینے لگتے ہیں..."

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ میرے دوست! ان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا سلسلہ جانے کب سے جاری ہے... اور ہم ہر بار سوچتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں جنگ کے مشعل تھما دیں... اور ہر بار انکی نقاہت دیکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں.. ان کے نحیف ہاتھوں میں کبھی قوت ہی نہیں آتی... مگر اب جنگ ہو کر رہے گی.. اور تم دیکھ لینا۔'

'ٹھیک ہے میں تمہارے جنگ ہونے کا انتظار کروں گا۔'

میں اپنے ہاتھ کو اس کی گرفت سے آزاد کیا۔ اور واپسی قدموں کو صدا دی۔ راستے میں اب بھی جا بجا پتھر پڑے تھے... اور ان پر خون کے نشانات واضح تھے... اور دوست کا جملہ میرے کانوں میں بج رہا تھا... وحشی.. بھیڑیئے... درندے..

میں اپنی کوٹھری میں واپس آ گیا ہوں۔ کمرے کا سوئچ آن کر دیا ہے۔ روشنی کمرے میں پھیل گئی ہے.. دروازہ بند کرنے کے بعد میں نے خود کو کرسی پر گرا لیا ہے۔

بڑی عجیب بات ہے... اس کوٹھری کو جانے کب سے میں نے اپنے اکلوتے وجود سے آباد کر رکھا ہے۔ مگر اس کے باوجود مجھے وحشتِ تنہائی نہیں۔ اور دوست وہاں اپنے بڑے سے گھر میں، اپنے گھر کے مختلف افراد کے ہمراہ وحشت تنہائی کا مرثیہ پڑھنے میں لگا ہے.. اس کے گھر کی مختلف کھڑکیاں مختلف شاہراہوں پر کھلتی ہیں مگر وہاں سے بھیڑیئے جیسی خونی آنکھیں نہیں جھانکتیں۔ اس کے گھر کے مختلف دروازے، مختلف گلیوں میں کھلتے ہیں مگر اس کے باوجود وہاں سے بھیڑیئے جھونپڑپٹیوں اور گلیوں میں بنے چھوٹے موٹے مکانات کو مسخ نہیں کرتے...

بڑی عجیب بات ہے —

میں خود کو سمجھاتا ہوں — تنہائی دراصل اس کی میراث ہے۔ وہ اپنے بھیڑ والے

گھر میں محض اس لئے تنہا ہے کہ جس وقت اس کے دماغ میں جنگ کی باتیں ہوتی ہیں۔ اور جس وقت وہ تخلیقی کرب سے گزر رہا ہوتا ہے... درندوں اور وحشی بھیڑیوں کی فوج اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں شور کرتی اور آگ لگاتی ہیں... تب وہ بری طرح سے ڈر جاتا ہے... اور اس ڈر اور خوف سے تنہائی کا بڑا عجیب و غریب اور رجحان لیوا تصور جنم لیتا ہے... اور وہ اپنی دنیا کا اس وقت تنہا آدم بن جاتا ہے...''

ہا... ہا... یہ... یہ...

مجھے اپنی سوچ پر بڑی ہنسی آئی پھر مجھے اس دن کا واقعہ یاد آیا جب دوست اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ میرے گھر آیا تھا۔ چائے کا دور چلا اور پھر اس نے وہی راگ چھیڑ دیا۔

''جب سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے معصوم فقیروں کو دیکھتا ہوں... فٹ پاتھوں پر سوئی ہوئی بے جان لاشوں کو تکتا ہوں... اور عالیشان عمارتوں سے اٹھتے ہوئے فلک شگاف شور... اور گاڑیوں کی بے ہنگم آوازیں میں نفرت کے جراثیم پاتا ہوں... تو ایک ہُک سی سینے میں اٹھتی ہے... کہ آہ! روندی جا رہی نسل پر ہو رہا یہ ظلم آخر کب تک ختم ہوگا؟ کب لڑی جائے گی لڑائی۔؟؟؟

اتنا کہہ کر جب وہ چپ ہوا تو میں نے اس کی جانب دیکھا...

''دوست ایک بات کہوں۔ جس دن تم ایسا سوچنا چھوڑ دو گے۔ اس دن لڑائی کی یہ بات بھی ختم ہو جائے گی۔''

دوست بڑی عجیب نظروں سے میری جانب دیکھتا رہا۔ جیسے میری بات سمجھا ہی نہ ہو اور میں کیا کہتا۔ کیا سمجھاتا۔ کہ تم نے ظلم کی جو صورت منقوش کی ہے وہ صورت غلط ہے تم جس لڑائی کی بات کرتے ہو۔ وہ لڑائی کبھی لڑی ہی نہیں جا سکتی۔ اور جہاں تک خوشی اور ناخوشی کا سوال ہے... سب اپنی جگہ پر خوش ہیں۔ اور یہ ساری لڑائی... یہ سارے نعرے خالی اور کمزور ذہن کی پیداوار ہیں جو ایک دور کے تحت زور پکڑتے ہیں ادھر عمر کا وہ حصہ ختم ہوا اور ادھر وہ شعلہ دنیاوی معاملات میں چھپ گیا۔''

مگر وہ اب بھی اپنی ہی ہانک رہا تھا۔ تم نہیں سمجھو گے جنگ بہت ضروری ہے...

''جب بڑی بڑی عمارتوں سے جھانکتی آنکھوں میں۔

لہو کے دھبے پاتا ہوں۔

ٹوٹی ہوئی گیتوں،

اور اجڑی ہوئی جھونپڑپٹیوں کے کنارے

سسکتے ماتم کرتے...

بھوک اور افلاس سے روتی آنکھوں میں

بلند و بالا عمارتوں سے اڑتی ہوئی گرد پاتا ہوں...

آہ کتنا بے چین ہو جاتا ہوں۔''

''ہاں تمہاری بے چینی ظاہر ہے۔'' میں دل ہی دل میں ہنسا۔ جو دوستوں کے جھرمٹ میں سینما ہال کی جانب روانہ ہو جاتی ہے... یا چائے کی دکان کا ایک دلچسپ موضوع بن جاتی ہے... یا پھر تمہارے تنہا کمرے میں قید ہو جاتی ہے...''

دوست چلا گیا۔ رات کے پچھلے پہر اچانک شور سے میری نیند ٹوٹ گئی۔

شور بڑھتا ہی جا رہا ہے چیخنے چلّانے کی آوازیں بلند و بانگ فضا میں تیر گئی ہیں.. آگے بڑھ کر میں نے کھڑکی کھول دی ہے۔ اور پھر جیسے اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا ہوں... بغل والی کالونی سے آگ کے بڑے بڑے شعلے اٹھ رہے ہیں...

وحشی... بھیڑیئے... درندے اور جانور... اور ایک نقش میرے دوست کا میرے ذہن پر بن رہا ہے... RETINA پر کئی تصویریں بنتی ہیں... بکھر جاتی ہیں...

آگ کے شعلے ہلکے ہو رہے ہیں... اور بھیڑیوں، درندوں کی پرچھائیاں بھی RETINA پر ہلکی ہو رہی ہیں...

لڑائی ہو کر رہے گی۔''

دوست کا جملہ پگھلے شیشے کی طرح جسم کے اندر پیوست ہو گیا ہے۔ بلند و بالا اور عظیم الشان عمارتوں کے دروازے ایک ایک کر کے کھل رہے ہیں... ایک دحشت طاری ہے... گھبراہٹ ہے... بعض عمارتیں جو محفوظ ہیں اُن کی کھڑکیاں بھی کھل گئی ہیں۔ اور خوف میں سمائی آنکھیں سڑکوں پر بچھ گئی ہیں... افراتفری ہے... بھاگم بھاگ ہے... میں بھیڑ میں بھیڑیوں کو تلاش رہا ہوں... درندوں کو تلاش رہا ہوں...

مگر۔ وہاں بھی تو وہی درد ہے... وہی وحشت... یعنی کل ملا کر ایک ہی رنگ...

فائر بریگیڈ شور کی گھنٹی بجاتا ہوا کالونی کے قریب آ کر لمبا ہو گیا ہے اور آگ کے شعلے سرد ہوتے جا رہے ہیں...

وحشت، دہشت اور پریشانیوں کی بھیڑ اپنے گھروں میں چھپتی جا رہی ہے... سڑکوں پر جھنڈ بنائے لوگ اب بھی کھڑے ہیں... گفتگو ہے... آگ لگنے کا بہترین موضوع ہے... رات کے ڈھائی بجے ہیں... اور آنکھوں میں نیند کا نام و نشان نہیں ہے...

''جاؤ... جاؤ... اپنے گھر جاؤ...'' میرے اندر کا مبہوت الحواس پرندہ ہنس رہا ہے...

''جب آگ لگی تم گھر میں قید تھے... جب آگ بجھ گئی، تم گھر سے باہر نکل آئے اور ایک بہترین موضوع ہاتھ آ گیا... بس اب اسی موضوع کو لے کر ڈگ ڈگی پیٹو اور پیٹتے رہو...!

میں نے کھڑکی بند کر دی ہے۔ آنکھوں میں اب بھی کالونی سے اٹھنے والے آگ کے شعلے لپک رہے ہیں... اور میں سوچ رہا ہوں... سڑکوں پر جھنڈ بنائے لوگوں کی نیندیں چرا کر کون لے گیا ہے؟ کالونی سے اٹھنے والی آگ کا ذمہ دار کون ہے۔؟؟

میں بستر پر دوبارہ لیٹ گیا ہوں...

RETINA پر اب بھی وہی منظر رینگ رہا ہے... کالونی سے اٹھنے والی آگ... آگ میں

جلا ہوا گھر... جلے ہوئے گھر کا منہدم حصہ... حواس باختہ لوگوں کے چہرے...

وحشی... بھیڑیئے... درندے...

جانور... اور ایک نقش میرے دوست کا میرے ذہن پر بن رہا ہے...

صبح ہو گئی ہے... باہر اب بھی جھنڈ کے جھنڈ لوگ جمع ہیں... رات کے حادثے کے تذکرے میں شامل لوگ.. آس پاس تمام عمارتوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہوئے ہیں... سڑکوں پر پولیس جیپ کھڑی ہے... کئی خاکی ٹوپیاں ہوا میں معلق ہیں... ٹھاک ٹھاک کے شور ہیں اور معائنہ کرتی آنکھیں ہیں...

مگر میرا دوست ان میں کہیں نہیں ہے..

کالونی کے دوسرے مکانات میں پھر وہی شور اور ہنگاموں کی آماجگاہ بن گئے ہیں... ریڈیو آن ہے... گانے کے شور ہیں... باتیں ہیں... تذکرے ہیں.. سچ ہے... جھوٹ ہے... غلط بیانی ہے... آنکھوں دیکھا حال ہے... پولیس ہے... چپ ہے... بند ہونٹ ہیں... اور پُراسرار خاموشی ہے۔

اور صبح کے اخبار کی جلی سرخیاں ہیں۔

سی۔آئی۔اے کی کوشش ہے..

ہندو مسلم فساد کی چنگاری ہے...

غریبی کا نحیف جسم اور امیری کے قوی ہیکل دیو کی جنگ ہے..

اور ان سے الگ میں واقعات کی تہہ پر غور کر رہا ہوں جو اخبار کے ایک چھوٹے کونے میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔

"بڑی بڑی دکانوں کے زیر سایہ فٹ پاتھ پر بیچنے والے سبزی فروشوں اور دیگر دکانداروں کا انقلابی احتجاج۔

مورخہ کم جنوری۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لمبے عرصے سے بڑی بڑی دکانوں کے زیر سایہ فٹ پاتھ پر چھوٹے موٹے سامان بیچنے والوں کے درمیان سرد جنگ چلتی چلی آ رہی تھی۔ بڑی بڑی دکانوں کے مالکوں کا خیال تھا کہ ان فٹ پتھیوں کی وجہ سے ان کی اپنی خریداری پر اثر پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقعے نے اس وقت انقلابی صورت اختیار کر لیا جب انہی بڑی دکانوں کے مالکوں میں سے ایک نے صبح کے وقت ایک سبزی فروش کا خوانچہ الٹ دیا اور متحد ہو کر ان سارے فٹ پتھیوں نے انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ کافی ہنگامہ ہوا مگر اس بھاگم بھاگ میں نقصان انہی فٹ پتھیوں کا ہوا۔ ان کے خوانچے الٹ گئے۔ سامان جا بجا موریوں اور نالیوں میں چھتر گئے۔ پولیس نے جلد ہی ہنگامہ پر قابو پا لیا۔ مگر رات کے وقت فٹ پتھیوں کے اسی مستعل گروپ نے ان دکانداروں کے عالیشان محلوں میں آگ لگا دی... اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ نے شدت کی صورت اختیار کر لی.."

اور...

میں اخبار تہہ کر کے ٹیبل کی دراز میں ڈال دیتا ہوں۔ دماغ بھاری ہے... ذہن میں آگ لگی ہے... اور میرے اطراف آگ کے بڑے بڑے الاؤ روشن ہیں... اور ہم سب آگ کی دھیمی دھیمی آنچوں پر پک رہے ہیں.. فٹ پاتھ پر آگ... عالیشان عمارتوں میں آگ... اخبار کی سرخیوں میں آگ...

"میں آ سکتا ہوں۔؟"

دروازے پر میرا دوست کھڑا ہے۔ سر جھکائے۔

'ہاں۔ آ جاؤ۔' میں بیٹھے ہی بیٹھے جواب دیتا ہوں۔

'آج کا اخبار پڑھا۔؟' وہ میری آنکھوں میں جھانکتا ہے۔

'ہاں پڑھا۔' میں نے پھر ایک چپ اختیار کی

'کیا نتیجہ اخذ کیا۔؟'

'وہی سب جو لوگ کہتے ہیں۔'

'لوگ تو بہت کچھ کہتے ہیں۔ مثلاً سی۔ آئی۔ اے والوں کی حرکت ہے... ہندو مسلم فساد کی ناکام کوشش ہے... امیری اور غریبی کے نام پر کھیلی گئی ایک شرمناک حرکت ہے...'

'ہاں میں بھی یہی سوچتا ہوں۔' میں نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ 'مگر میری سوچ ذرا ان سے مختلف ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جو صبح میں ہوا وہ بھی ایک حادثہ تھا اور اس حادثے میں غم و غصہ کو دخل تھا اور جو رات میں ہوا وہ بھی غصے کی شدت کی وجہ سے ہوا۔'

'مگر میں یہ نہیں سوچتا۔'

دوست کی مٹھیاں بھینچ گئی ہیں... 'جو صبح میں ہوا وہ ان عالیشان عمارتوں میں بسنے والے دکانداروں کی ایک شرمناک حرکت تھی اور فٹ پاتھی دکانداروں کا اپنے حق کے لئے ایک دھیما احتجاج تھا۔ اور جو رات میں ہوا وہ انقلاب تھا... اعلان جنگ تھا... برتری کا وہی شعلہ تھا جو ایک غیر معینہ مدت کے بعد ان کمزور نحیف جسموں میں سرایت کر گیا تھا...

'تم دیکھ لینا جنگ ہو گی۔

جنگ ضرور ہو گی.......'

دوست کی مٹھیاں دوبارہ شدت جذبات سے بھینچ گئی ہیں...

چہرے پر آگ روشن ہے... اور خونی ڈوروں کا آنکھوں میں رقص ہے...

کمرے کی ویرانی میں جنگ کے جگنو جگمگ، جگ مگ کر رہے ہیں...

اور میں سوچ رہا ہوں... ہاں جنگ ضرور ہو گی۔ اس محلے میں رہنے کا حق دینا ہو گا... سوشل ورک کرنا ہو گا... ہمدردی کی بکری پالنی ہو گی... عمارتوں کو فٹ پاتھوں کا خوف دکھانا ہو گا... اور فٹ پاتھوں کو روشندانوں سے جھانکتی خونی آنکھیں دکھانی ہوں گی... '

اور جنگ کے جگنو کمرے کی ویرانی میں جگ مگ۔ جگ مگ کر رہے ہیں... میرے دوست کی مٹھی آہستہ آہستہ کھل رہی ہے...

'میں جا رہا ہوں۔' دوست اٹھ کر کھڑا ہوا۔

'ٹھہرو۔ میں بھی تمہارے شامل چلوں گا۔'

دروازے پر تالا لگا کر میں باہر نکل آیا ہوں

دوست واقعی بہت تنہا ہے۔ اور شاید اس کی طرح ہی سماج کا ہر فرد تنہا ہے۔ اور

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

ادھ کھلی آنکھیں

تسکین زیدی

رات کے ۸ ربج رہے تھے، قبرستان کی ویران خام سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے کھمبے کی ہلکی ہلکی روشنی ایک تازہ قبر پر پڑ رہی تھی جس میں ایک اعلٰی خاندان کی خوب رو اور جوان العمر دوشیزہ دنیا کی بے ثباتی سے روٹھ کر ابدی نیند سو رہی تھی جسے دنیا کی بہاریں نہ راس آسکیں۔

چند لمحے قبل یہ تازہ قبر اس نے تیار کی تھی۔ اعزا، کو چہرہ دکھاتے وقت اس نے بھی ایک مرجھایا گلاب سا چہرہ دیکھا تھا اور وہ اب تک اس کے ذہن کے کینوس میں محفوظ تھا۔ دمکتے ماتھے پر سہرہ بندھا ہوا گلاب کے پھولوں اور بیلے کی حسین مہکتی ہوئی کلیوں سے گندھا ہوا اور ایک عطر بیز خوشبو کا احساس ہر طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی نیم وا آنکھوں میں جئے جانے کی خواہش کا پرتو باقی تھا۔ کچھ لمحے پہلے اسکا سیمیں پیکر زندہ اور متحرک تھا۔ وہ اب منوں مٹی کے نیچے دب کر رہ گیا تھا

فاتحہ پڑھنے کے بعد سارے اعزا، واقربا، رخصت ہو گئے تھے۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ صدا اس کی سماعت سے ٹکرا رہی ہو کر مجھے اس ویرانے میں تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ ایک صدا — ایک بازگشت . . . اور پھر ایک سکوت بیکراں۔ اس کی روح میں سناٹا گھولتا ہوا قبرستان کی ویران فضا میں سائیں سائیں کرتی ہوائیں خوف بن کر پھیلی ہوئی تھیں، خشک پتے گر گر کر تازہ قبر پر بکھر رہے تھے آج جمعرات کی شب تھی۔ نوچندی جمعرات — لوگ فاتحہ پڑھنے آئے ہیں اور ایک سکون سا محسوس کر رہے ہیں — شہر خموشاں کی بستی جہاں خامشی کا راج ہوتا ہے شہر کے ہنگاموں کا یہاں کوئی دخل نہیں — لوگ اپنے اپنے اعزا، کی قبروں کے پاس یوں خامشی سے کھڑے ہوئے فاتحہ پڑھ رہے ہیں جیسے ان کے زندہ ہونے کی امید ہو — مومی شمعوں کی مدھم روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور اگر بتیوں کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں بکھری ہوئی ہے۔

وہ اس لڑکی کے تصور میں کھویا ہوا تھا جس کے جنازہ میں ہر قبیلے اور ہر مذہب رنگ ونسل اور خیالات کے انسان یکجا تھے۔

آج اسے سارے انسان ایک ہی سطح کے معلوم ہو رہے تھے۔ کتنی شان وشوکت تھی اس کے جنازہ میں — جوان موت اور وہ بھی بڑے گھر کی باپ ہائے عظمت — ہائے بیٹی کہہ کہہ کر چیخیں مار مار کر رو رہا تھا اور اسی لمحہ اسے اپنی چھوٹی بہن عطیہ یاد آگئی تھی۔ اور اس کے ذہن میں ماضی کے اوراق بکھر گئے تھے۔ عطیہ بھی اسی جگہ دفن ہوئی تھی وہ بھی اس لڑکی کی طرح کم سن۔ معصوم اور کسی کی بے وفائی کا شکار ہوئی تھی — مگر غریب تکیہ دار کی بیٹی تھی۔

باپ کے اچانک مر جانے پر اس نے رکشہ چلانا چھوڑ کر قبرستان کی نگرانی سنبھال لی تھی — بیمار ماں اور بہن کے ساتھ وہ زندگی کے کٹھن راستہ پر چل رہا تھا۔

یہ قبرستان شہر سے میلوں فاصلے پر ہے اس لئے یہاں بہت کم میتیں آتی ہیں مہینے میں دو چار لاشوں کے لئے قبر تیار کرنا پڑتی ہے۔

جمعرات کو کچھ آمدنی ضرور ہو جاتی تھی ورنہ پچیس روپیہ ماہوار وقف کی تنخواہ کے علاوہ کیا تھا — اب وہ رکشہ بھی تو نہیں چلا سکتا تھا یہاں کی جو ساری ذمہ داری اس پر آگئی ہے۔ ماں نابینا تھی اسے بھی تو ایک نگراں کی ضرورت تھی۔

عطیہ کے مرنے پر اس کے کفن کے لئے وہ کس کس کے پاس نہیں گیا تھا — جن لوگوں کے یہاں اباروز

قرآن پڑھتے تھے وہاں گیا جن اسکولی بچوں کو وہ اپنے رکشہ پر لے جاتا تھا ان سے کہا اور مذہب کے ٹھیکیدار اور غریب پرور صاحب حیثیت لوگوں سے التجا کی کہ عطیہ کے کفن کا انتظام کر دیں لیکن ہر جگہ بے حسی چند سکے خیرات کے طور پر ـــــ پھر بھی کفن کے لئے پورا پیسہ نہ مل سکا تھا اور پھر اس کے مزدور اور محنت کش ساتھیوں نے اپنی محنت کی کمائی سے (اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر بچائی ہوئی رقم سے) انتظام کیا۔ تب سے اسے ان بڑے لوگوں سے نفرت ہو گئی تھی اور چھوٹے بڑے لوگوں کی ذہنیت کے فرق کا اندازہ ہوا تھا ـــ عطیہ کی مٹی میں صرف رکشہ والے شریک تھے اور آج اس سرمایہ دار کی لڑکی کی مٹی میں شہر بھر کے لوگ ہیں ـ اس کی قبر پختہ بن جائے گی لیکن میری عطیہ کی قبر ابھی تک کچی ہے ـــ اب کی طوفانی بارش میں اس کی قبر کافی دھنس گئی تھی جس کی اس نے مرمت کر دی تھی لیکن رفتہ رفتہ دو برسوں میں اس کی قبر کا نشان دھندلا ہوتا جا رہا ہے وہ کب تک اس کی قبر کی حفاظت کرتا رہے گا۔ جب تک وہ زندہ ہے نہ اور پھر ـــ یہ نشان مفلسی اور کم مائیگی کا نشان ایک دن ختم ہو جائے گا ـــ کئی بار عطیہ

کی قبر کو سوکھے پتوں سے صاف کرتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کو پکار رہی ہے ـــ بھیا۔ بھیا کہہ رہی ہے ـــ اس کے دونوں ہاتھ قبر سے باہر نکلے ہوئے ہیں اور پھر وہ اس مٹی میں اسے ڈھونڈھنے لگتا ہے ـــ اور یہ تازہ قبر اسی کے پاس بن گئی ہے ـــ یہ لڑکی بھی عطیہ کی طرح سب کو پکار رہی ہے۔ سب سے شاکی ہے کہ کیوں اسے یہاں سب چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

رات ڈھلتی جا رہی ہے ایک مہیب سناٹا فضا پر مسلط ہے ماں ابھی کھانستے کھانستے سوئی ہے آج وہ اس کی دوا بھی نہ لا سکا وہ اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پڑا ہوا تھکن سے نڈھال دونوں قبروں کو حسرت و یاس بھری نظر سے دیکھ رہا ہے ـ قبر کے اوپر سایہ فگن شجر سے خشک زرد پتے گر گر اپنے غموں کا اظہار کر رہے ہیں ـ اس کی نظر پھر قبروں پر مرکوز ہے اور اسے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے قبروں کے اوپر سے دو ادھ کھلی آنکھیں اسے گھور رہی ہیں اور کہہ رہی ہوں ابھی ہم کیوں دفن کر دیا ہمیں پھر ایک بار دنیا میں لے چلو ـــ ہمیں دنیا کو کچھ لمحے اور دیکھنے دو۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ

انسان کو اس فانی دنیا کا کتنا موہ رہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی روحیں واپس آنا چاہتی ہیں جبکہ وہ زندہ رہتے ہوئے بھی زندگی کی رنگینیوں سے دور تھیں ـــ وہ بھی ایک زندہ لاش لئے کب سے اپنے کو دفن کرنے کی راہ دیکھ رہا ہے ماں کا ساتھ نہ ہوتا تو وہ نہ جانے کہاں ہوتا ـــ چالیس برس کی عمر میں اپنے آپکو بوڑھا محسوس کرنے لگا ہے۔ اس نے لیٹے لیٹے بے چینی سے کروٹ بدلی ـ آدھی رات ہو چکی تھی ـــ تبھی کسی کے قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔ تازہ قبر کے پاس ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔ وہ اس قبر کی مٹی ہٹانے کی کوشش میں مصروف تھا وہ اٹھ بیٹھا اور نوجوان سے مخاطب ہوا ـ "تم کون ہو اور یہاں اس وقت اس قبر پر کیوں آئے ہو؟ وہ نوجوان کچھ دیر خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا اس کے چہرے پر وحشت و خوف لرزاں تھا۔

دوبارہ پوچھنے پر اس نوجوان نے چونکتے ہوئے کہا "میں۔ میں شکیل ہوں" یہ قبر میری عظمت کی ہے ـــ مجھے اس کی موت کی خبر بھی نہ دی گئی اور میں اس کی مٹی میں بھی شریک نہ ہو سکا اب

میں اسے ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں — مجھے اسے دیکھنے دو — لوگوں نے اس کے اور میرے درمیان غلط فہمی کی دیواریں حائل کردیں تھیں اور میرے ماں باپ کو گمراہ کردیا تھا — انھوں نے زبردستی میری شادی میری مرضی کے خلاف ڈاکٹر خان کی لڑکی سے کردی تھی — میں یہاں اس سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ مجھے اسے دیکھنے دو۔ صرف ایک بار اس کی ایک جھلک۔۔"

"پاگل ہوگئے ہو کیا؟ ۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا" اس نے کہا "تم مجھ سے اس کا معاوضہ لے لو۔ منہ مانگا انعام دوں گا۔ اور پھر اس نے کئی بڑے بڑے نوٹ اس کے سامنے ڈال دیئے۔ وہ ان نوٹوں کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا اسے آج تک ایک ساتھ اتنے نوٹ اپنے قریب کبھی نہ دیکھے تھے — ایک لمحے کے لئے وہ سوچنے لگا کہ کیا وہ اس کی مدد کردے ؟ کب سے وہ اپنی کو سنوارنے کی جدو جہد میں ٹوٹتا جارہا ہے۔ پھر ایک سوال اس کے ذہن میں ابھرا کہیں اس نے اپنی محبوبہ کو فریب تو نہیں دیا ہے۔ آخر اس نے زہر کیوں کھایا — ؟ — اور یہ سوال اس نے اس نوجوان سے پوچھ ہی لیا ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ کچھ لمحہ کے لئے خاموشی سے کچھ سوچنے لگا پھر ٹوٹے ہوئے لفظوں میں گویا ہوا —

"ہاں میں خطاوار ہوں۔ میں اسے چاہتا تھا۔ اور شادی بھی کرنا چاہتا تھا — وہ میری نشانی کو اپنی کوکھ میں پالتی رہی — پھر میں کئی مہینے کے لئے باہر چلا گیا اور اس سے نہ مل سکا غلط فہمیاں اور بڑھیں اور پھر میرے ماں باپ نے زبردستی میری شادی دوسری جگہ کردی اور وہ یہ صدمہ برداشت نہ کرسکی اور اس نے اپنی زندگی ختم کرلی مجھے آج شام کو ہی معلوم ہوا ہے مجھے ایک بار اسے دیکھنے دو — اور میری خواہش بھی سن لو کہ مرنے کے بعد مجھے اس کے پاس ہی دفن کرنا۔"

اس کی بہن عطیہ کی موت کا منظر اس نظر میں رقص کرنے لگا اور اس کا خون کھولنے لگا — عطیہ کے ساتھ بھی تو کسی نے بے وفائی کی تھی۔ اس کی غریبی کی آڑ میں ہی کوئی اس کی عصمت اور معصوم جوانی سے کھیلا تھا اور پھر ایک نشانی دے کر غائب ہوگیا تھا — پھر اس نے دوسری جگہ شادی کرلی اور عطیہ مدتوں اس کی منتظر رہی اور پھر ایک دن اس نے بھی اسی طرح اپنی زندگی ختم کرلی۔

اب وہ غصہ میں کانپنے لگا اور اس نے بڑھ کر اس نوجوان کا گلا پکڑ لیا۔ "ذلیل۔ کمین۔ دغا باز۔ فریبی۔ کسی کی زندگی سے کھیل کر اب اس کی موت کا مذاق اڑانے آئے ہو اسے قبر میں بھی چین سے نہ سونے دوگے۔ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ پولس کو خبر کردوں گا — تم جیسے لوگ سماج کے ماتھے پر کلنک تم سماجی بھیڑیئے ہو۔ چلے جاؤ ورنہ تمہیں بھی یہیں دفن کردوں گا — اور پھر وہ نوجوان تیزی سے باہر نکل گیا۔

اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے تازہ قبر سے دو ادھ کھلی آنکھیں اس جاتے ہوئے نوجوان کا تعاقب کررہی ہوں۔

بھولاناتھ

اردو زبان اور رسم الخط

بزرگ شاعر جسونت سنگھ راہی "چنگاری" کے شمارہ نمبر ۲۷ میں چھپے اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ یہ بات ان کے دکھ کا کارن بن رہی ہے کہ ان کے گھر کے سب لوگ جادو کر دینے والی اردو زبان کو نہیں جانتے اور ان کے بعد ان کا گھر اس انمول ہیرے سے محروم ہو جائے گا۔ اردو کے مخصوص رسم الخط (نستعلیق) کے بارے میں تو یہ بات شاید بہت سے گھروں کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ بیشتر نوجوان کیا ہندو کیا مسلمان کیا سکھ کیا عیسائی' اس رسم الخط سے ناواقف ملتے ہیں۔ کیونکہ مرکز اور ریاستوں میں اردو سرکاری زبان نہ رہنے سے روزی روٹی کے لئے انہیں اس کی ضرورت نہیں رہی۔

لیکن جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے اس کی مقبولیت تو دن بدن بڑھ رہی ہے۔ ہماری " فلموں کی زبان ہندی کی بجائے اردو کے زیادہ نزدیک ہوتی ہے۔ اردو زبان فلموں میں اس لئے استعمال نہیں ہوتی کہ فلم سازوں کو اس سے خاص لگاؤ ہے بلکہ اس لئے کہ لوگ اس زبان کو سمجھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ غزلیں جتنی آجکل مقبول ہیں پہلے شاید کبھی نہیں تھیں۔ مشاعروں میں جگہ مشکل سے ملتی ہے کوی سمیلنوں کے لئے سننے والے مشکل سے ملتے ہیں۔ سرکاری عتاب اور سرد مہری کے باوجود اردو زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اس زبان کی قوت کا ثبوت اور اس کے زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کی ضمانت ہے۔

اردو کے مخصوص رسم الخط کی اپنی اہمیت ہے اور اس کی بقا اور فروغ کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس رسم الخط کے لیے جہاں اردو ادب کے خزانوں تک رسائی ممکن ہوتی ہے، وہاں پاکستان کا پنجابی ادب بھی ہماری پہنچ میں آجاتا ہے کیونکہ وہ اسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے اور شاید ہمیشہ رہے گا جو اس رسم الخط کو تو نہیں جانتا لیکن اردو زبان بولتا ہے سمجھتا ہے اور اس سے پیار کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کی خاطر ہندی (دیوناگری رسم الخط) اردو کی اشاعت سے گریز نہیں ہونا چاہیے۔

کوئی دو سال ہوئے نیشنل میوزیم National Museum میں اسلامک ہیریٹیج Islamic Heritage کے موضوع پر ایک نمائش لگی تھی جس میں عربی کے گیارہ رسم الخط کے نمونے نموں نے رکھے ہوئے تھے۔ یہیں پر فارسی کے تین اور اردو کے دو رسم الخطوں کے نمونے بھی تھے جو عربی کے گیارہ رسم الخطوں ہی میں سے تھے۔ نستعلیق کے علاوہ اردو کا دوسرا رسم الخط جس کا نمونہ وہاں تھا وہ تھا ثلث۔ نمائش کا موضوع اگر اسلامک ہیریٹیج نہ ہوتا تو نستعلیق اور ثلث کے ساتھ دیوناگری کو بھی اردو کا ایک رسم الخط دکھایا جاتا کیونکہ آج کل اردو اکثر دیوناگری رسم الخط میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ اور پھر اردو اسلامک ہیریٹیج ہی نہیں یہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کی آبرو ہے۔

اردو ہندی اور پنجابی کے معاملے میں مسئلہ زبان سے زیادہ رسم الخط کا لگتا ہے۔ عام طور پر لوگ نستعلیق کی عبارت کو اردو' دیوناگری کو ہندی اور گرمکھی کو پنجابی کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ کئی دفعہ اردو (نستعلیق) رسم الخط میں ہندی اور پنجابی زبان لکھی ہوتی ہے۔ ہندی کلاسک تلسی رامائن (رام چرت مانس) جس کا پاٹھ میرے والد صاحب کیا کرتے تھے وہ اردو (نستعلیق) رسم الخط میں ہی تھی کیونکہ وہ ہندی (دیوناگری) رسم الخط نہیں جانتے تھے۔ ہندوستانی پرچارنی سبھا کی حال ہی میں چھپی بچوں کی کتابیں جو اردو (نستعلیق) رسم الخط میں ہیں ان کی زبان سنسکرت پردھان ہندی ہے۔ پاکستان میں پنجابی اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ پنجابی ادب پہلے اسی رسم الخط میں لکھا جاتا تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے پنجاب یونیورسٹی کے پنجابی کے امتحان گرمکھی کے ساتھ ساتھ اردو رسم الخط میں بھی ہوتے تھے۔

اردو اب ہندی (دیوناگری) رسم الخط میں کافی چھپنے لگا ہے۔ کئی بار تو ایسا ہوتا ہے کہ اردو کی کتاب اردو رسم الخط میں نہیں ملتی اور دیوناگری میں مل جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال کیفی اعظمی کا مجموعہ کلام "آوارہ سجدے" ہے۔ اس کتاب کو ساہتیہ اکادمی' کا اردو کا ایوارڈ ملا اور یہ اردو کی کسی دکان یا ادارے سے نہ مل سکی۔ جب میں اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا تو ایک بک فیر Book Fair میں یہ کتاب مجھے ہندی رسم الخط (دیوناگری) میں مل گئی۔ بہت سے دوست جو اردو رسم الخط نہیں

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

کہانی کی کہانی

ریاض معصوم قریشی

آج پہلی بار دوست و احباب کے بے حد فرمائشی اصرار پر، میں نے محبت پر ایک کہانی لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری کہانی کے کردار فاروق اور روحی ہیں۔ فاروق سے مجھے انتہائی ہمدردی ہے کیونکہ میرے قلم کے ایک ہلکے سے اشارے نے کم سنی میں ہی اُسے اس کے والدین سے جدا کیا حالانکہ فاروق کو لفظوں کا جامہ پہنانے سے پہلے اس قسم کا کوئی بھی خیال میرے ذہن کے کسی بھی گوشے میں نہیں تھا۔ یتیم اور بے سہارا سے ہر کوئی ہمدردی کرتا ہے تو فاروق کی بے بسی اور بے کسی پر ترس کھا کر اس کے لاولد چچا اور چاچی نے اسے گود لے لیا پالا پوسا اور بڑا کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ زیور تعلیم سے بھی آراستہ کیا لیکن کبھی اُسے محبت نہ کر سکے۔ کیونکہ اُسے گود لینے کے ٹھیک ایک سال بعد جب مجھے محسوس ہونے لگا کہ ان کی اولاد کو ترستی آنکھیں ہر وقت فاروق کے لیے بھی راتی ہیں تو میں نے انہیں روحی کی نعمت سے نوازا اور پھر ان کی تمام محبتوں اور شفقتوں کے دریاؤں کا رخ روحی کی طرف موڑ دیا۔ اور اب فاروق چچا اور چاچی کی آنکھوں سے نکلنے والے نفرت کے شعلوں سے ہر لمحہ راکھ ہو جاتا تھا۔

نہ معلوم کیوں میں فاروق پر مصیبتوں، تکلیفوں اور اذیتوں کے پہاڑ توڑنا چاہتا ہوں اسے اذیت میں مبتلا دیکھ کر مجھے عجیب قسم کی روحانی مسرت مل جاتی ہے۔ اور پھر میں نے فاروق کو کچھ اس قسم کا بنایا ہے کہ بات کرتے وقت نہ صرف وہ ہکلاتا، شرماتا اور بوکھلا جاتا ہے۔ بلکہ مخاطب کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اُسے بہت ہی مرعوب ہو گیا ہو۔ اسی پر میں نے بس نہیں کیا بلکہ فاروق مخاطب سے دبا دبا سا بھی رہتا ہے۔ اس کا چہرہ احمقوں سا ہے اور اس پر ہمیشہ پھٹکار برستی رہتی ہے۔ اور یقیناً ایسے چہرے دیکھ کر دوسرے غصے میں مبتلا ہو کر یہی چاہتے ہیں کہ اس قسم کے گاؤدی چہرے کو تب تک نوچ کھوٹ لیں جب تک کہ اس پر گوشت کا آخری ٹکڑا (لوتھڑا) بھی باقی رہے۔ اور فارق سے مخاطب لوگوں میں یہ جذبہ اُس وقت اور شدت اختیار کرتا ہے جب وہ رک رک کر کچھ اس طرح باتیں کرتا ہے جیسے اُسے اپنے احمق ہونے کا شدت سے احساس ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی وہ گھر میں اور گھر سے باہر ٹھوکروں پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اب تک کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس نے آنسو بہا بہا کر کاٹا ہے۔ کسی کو بھی اُسے محبت نہیں ہے۔۔ ہاں۔۔ اگر اس کے ساتھ کسی کو ہمدردی ہے تو مجھے ہے۔ کیونکہ میں ہر لمحہ اُسے ایک نئی مصیبت اور ایک نئے تکلیف میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اسی لیے۔ ہاں اسی لیے میں نے اس کی تقدیر میں دفتروں کی خاک چھاننا لکھا ہے۔ اور اب وہ روز صبح نوکری کی امید لے کر گھر سے نکلتا ہے اور شام کو مایوس، شرمسار اور سر جھکاتا ہوا واپس لوٹتا ہے جہاں اس پر، اس کے وجود پر اس کی بیکاری پر طعنوں کے تیر برسائے جاتے ہیں "نکما، مفت کی روٹیاں توڑنے والا، احمق، گاؤدی" یہ سب اس کے القاب ہیں اور ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ چچا کے گھر میں صفائی سے کر پکانے تک" کا ہر کام کرتا ہے اور روحی اس کی عم زاد اُسے یہ کام کرتے ہوئے دیکھ کر بے تحاشہ ہنستی ہے۔ انداز تضحیک آمیز اور تحقیر آمیز ہوتا ہے۔!!

میں جانتا ہوں کہ فاروق کے دل میں بہتری بار فرار اور خودکشی کی خواہش نے جنم لیا لیکن میرے قلم کی گرفت اس پر اتنی مضبوط ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اور یقیناً اس کو ملنے والی ایک ایک اذیت سے مجھے روحانی خوشی اور انبساط مل جاتی ہے اور اُس وقت اس خوشی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے جب روحی نہ صرف اس کا مضحکہ اڑاتی ہے بلکہ اس کے عتاب کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔

روحی کو میری کہانی کا دوسرا کردار... میں نے اتنا خوبصورت بنایا ہے کہ دیکھنے والوں کے دلوں کی دھڑکنیں رک جاتی ہیں۔ ..اس کی اداؤں اور اشاروں پر ایک ایک لمحہ ہزار ہا نوجوان قربان ہو جاتے ہیں اور بوڑھے ایکبار پھر جوان ہونے کی تمنا کرتے ہیں۔ ا روحی کو میں نے حسن، والدین، چاہنے والے سب کچھ دیا ہے۔ ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اسے اتنی دولت نہیں دی ہے کہ وہ اونچے طبقے کی کہلائے۔ نہ معلوم کیوں۔ احالانکہ کہانی لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں صرف اتنا تھا کہ روحی ایک اونچے گھرانے کی لڑکی، فاروق نامی ایک غریب شخص کے لیے تخلیق ہو گی اور ایک دوسرے کو پانے کی جدوجہد اور کشمکش کے اردگرد محبت کی یہ کہانی گھومے گی۔ لیکن۔ روحی جوں جوں جوان ہوتی چلی گئی تو مجھے اپنی ضائی پر رشک آنے لگا۔ روحی کو دیکھ کر میں سوچنے لگتا کہ کیا یہ وہی روحی ہے جسے میں نے فاروق کے لیے تخلیق کرنا چاہا تھا۔ اور دونوں کے درمیان ایسی دیواریں کھڑی کرنی چاہی تھیں کہ بادی النظر میں دوسروں کو ان کا ملاپ ناممکن نظر آجائے۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے روحی کو اپنے لیے تخلیق کیا ہے .... صرف اور صرف اپنے لیے .... ہاں میں اس کو بنانے

محسوس اتنا کھو گیا کہ وہ روحی نہیں بلکہ میرا تصور بن گئی ... اور اب مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ میں روحی سے محبت کرتا ہوں ... میں ایکبار پھر کہوں کہ میں روحی سے محبت کرتا ہوں کیونکہ وہ میرا تصور ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ روحی بھی، مجھ سے ....صرف مجھ سے محبت کرتی ہے ...شدید محبت کرتی ہے .. جس کا اظہار وہ کئی بار کر چکی ہے۔ وہ گھنٹوں میرے ساتھ باتیں کرتی ہے۔ محبت کا راگ چھیڑتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ جیسے میرا عضو عضو اس کی محبت کی راگ کا ایک ایک سر ہے۔

فاروق پر جس قدر ظلم ڈھاتا ہوں روحی پر اسی قدر محبتیں نچھاور کرتا ہوں۔ فاروق کو اذیت میں دیکھ کر مجھے اتنی ہی روحانی خوشی مل جاتی ہے جتنی روحی کو محبت کا راگ چھیڑتے ہوئے۔ سوچتا ہوں کہ میرے ساتھ دونوں کے کتنے گہرے تعلقات ہیں... دونوں مجھے اپنا بہترین دوست اور مددگار سمجھتے ہیں لیکن میں خود دونوں کے لیے کتنا مختلف ہوں۔ ایک کے لیے ظالم تو دوسرے کے لیے رحیم ... ..

ایک دن فاروق مغلوما نہ چہرہ بنائے ہوئے میرے پاس آکر کہنے لگا۔ تم جانتے ہو کہ روحی میری عم زاد ہے۔ چچا اور چاچی اس کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتے ہیں

فاروق کے اس جملے نے مجھ پر بم سے بھی زیادہ کام کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کر سکیں۔ روحی اور فاروق کی طرح وہ بھی میرے کردار ہیں.. وہ وہی سب کچھ سوچ سکتے ہیں، جو میں انھیں کردار بنا دوں۔ وہی سب کچھ بول سکتے ہیں جو میں کہلوانا چاہوں گا۔ اگر انہوں نے ایسی بات فاروق سے کہی بھی، تو میں اسے بے خبر کیوں ہوں۔ اور۔ اور۔ یہ فاروق بھی آج نہ ہکلاتا ہے اور نہ ہی شرما رہا ہے۔ اگر یہ میرے پاس نہ آجاتا تو میں بے خبر ہی رہ جاتا

.... کیا میرے قلم کی گرفت میں بھی کردار نہیں ہیں... مگر مجھے اپنے قلم پر پورا پورا اعتماد ہے۔ تو پھر یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ مجھے کوئی علم کیوں نہیں .... ہاں... یاد آیا روحی کی محبت میں، میں نے روحی کے والدین کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔

میں سوچتا رہا اور ضبط کے دامن پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ "مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے .. ؟" بالآخر میرے منہ سے نکل ہی گیا

"کیسے کہانی کار ہو۔ چچا اور چاچی کے پاس روحی کو جہیز میں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے اور کوئی مناسب رشتہ ملتا بھی نہیں ہے اسی لیے انہوں نے اس کی شادی میرے ساتھ طے کر دی ہے۔"

آخر یہ سب کچھ مجھے معلوم کیوں نہیں .. میرے کردار آپس میں ایسی باتیں کرتے ہیں اور مجھے خبر تک نہیں .. تف ہے مجھ پر

. اچانک مجھے یاد آگیا کہ روحی کی محبت میں گرفتار ہو کر میں نے اس کی تقدیر کو لکھنا ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ مگر تقدیر لکھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے.... کیونکہ وہ میری ہے ... صرف میری... میرے تصور کی طرح ٹھیک ہے روحی کی شادی فاروق سے ہو جائے

ہاں. ہاں فاروق کے جانے ہی میں روحی کی تقدیر فاروق کے ساتھ وابستہ کروں گا. ہاں اس طرح فاروق پر ایک اور ظلم ڈھا سکوں گا۔ مگر نہیں .. روحی مجھ سے محبت کرتی ہے وہ فاروق کو کبھی برداشت نہیں کرے گی... اگر روحی اور فاروق کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کیا تو روحی پر ظلموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے... نہیں ... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے .. کبھی نہیں ... لیکن فاروق کی محرومیوں میں مزید اضافہ کرنے کے لیے میں روحی کو اسی سے منسوب کروں گا... ہاں۔

"تم جانتے ہو ... کہ آج تک میں نے تصور میں بھی روحی کو اپنی دلہن کے روپ میں دیکھنے کی جرأت نہ کی۔ اور جب چچا اور چاچی کی بات میرے کانوں میں پڑی تو روحی مجھے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوئی اور... اور اب میں اسے پیار کرتا ہوں

مجھے ایسا لگا جیسے میرا وجود دہل کر رہ گیا ہو۔ آخر فاروق کو یہ باتیں کس نے سکھائیں فاروق ایسی باتیں کر سکتا ہے میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کیا کرداروں پر میری گرفت کمزور ہو گئی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں سوچ سکیں اور جو چاہیں کہہ سکیں۔ یہ ناممکن ہے۔ بالکل ناممکن۔ کیسے ناممکن ہے۔ ؟ میں فاروق کو اپنے کانوں سے نہیں سن رہا ہوں۔ اسے روحی سے محبت ہو گئی ہے... اگر روحی کو فاروق سے وابستہ کرنے کی غلطی مجھ سے سرزد ہو گئی تو فاروق کی تمام محرومیوں کا ازالہ ہو جائے گا.. نہیں ... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے ... روحی میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ میں فاروق کو انتہائی دردناک اذیت میں مبتلا کروں گا .... یہ میں بھی برداشت نہیں کر سکتا ہوں کہ فاروق روحی کے متعلق سوچ بھی سکے۔

میری آنکھیں سرخ ہو گئیں ..... میں جانتا ہوں کہ میرا غصہ فاروق سے بھی نہ چھپ سکا کیا میں اتنا ہی بے بس ہوں کہ فاروق روحی کا ذکر مجھ سے کرے۔ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں میں دہاڑا۔ "تو پھر۔ ؟"

فاروق میری طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ "تم خفا کیوں ہو گئے میں تو صرف اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ مجھے کوئی مشورہ دے سکو .... تم جانتے ہو کہ روحی مجھ سے نفرت کرتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ کسی اور کے چاہت میں گرفتار ہے۔ مجھے مشورہ چاہیے۔

شدت غصہ سے میں اپنے ہونٹ

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

نسیم شہزاد گورکھپوری

محافظ ۔۹

(مختصر کہانی)

اور پھر..... فرقہ واریت کا سُرخ بادل نفرت کی سیاہ چٹان سے ٹکرا ہی گیا۔ درندوں کا خونی ناچ شروع ہوگیا ـــ انسانیت نے چیخ کر اپنی آنکھیں بند کرلیں..... وحشیانہ قہقہے بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے ـــ ایک بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا دروازہ ٹوٹنے لگا ـــ دولت کے ساتھ عصمت بھی سرِعام لٹتی رہی ـــ زمین خون سے رنگین ہوتی رہی ـــ جسم تڑپتے رہے ـــ لاشوں کی تعداد بڑھتی رہی ـــ چیخ تیز ہوتی رہی ـــ !!

یکایک دور سائرن کی آواز سنائی دی جو بتدریج قریب ہوتی گئی ـــ وحشیوں نے چونک کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا ـــ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے ـــ پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ خوف و ہراس کے سائے سمٹنے لگے ـــ چیخ و پکار کی بجائے سسکیاں ابھرنے لگیں۔

چند منٹ بعد ـــ ایک بڑی موٹر گاڑی اس نیم اجاڑ بستی میں آکر کھڑی ہوئی ـــ اور پھر ـــ یکے بعد دیگرے پچاسوں مسلح باوردی جوان کود پڑے۔ مایوس اور خوف زدہ چہروں پر امید کی لہر دوڑ گئی ـــ بجھی ہوئی آنکھیں روشن ہوگئیں ـــ! ـــ لیکن یہ کیا ـــ؟ اسی بستی سے ایک بار پھر پہلے سے کہیں زیادہ دل ہلا دینے والی چیخیں بلند ہونے لگیں.....!!!

بقیہ کہانی کہانی کی

چبانے لگا.... نہیں... یہ غصہ نہیں تھا بے بسی تھی۔ ہاں، میں بے بسی سے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ فاروق یہ تک نہیں جانتا ہے کہ روحی کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ میں اُسے کیا مشورہ دے سکتا ہوں... کیا فاروق کا ذہن اب میرے قلم کے تابع نہیں ہے.. ؟ اُسے تو وہی اب کچھ سوچنا چاہیے جو میں سمجھا دوں، پھر اس قسم کی باتیں ـ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ کیا کہانی میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ ؟ ہاں [illegible] میں شروع سے کہانی کو ایک [illegible]

کہانی کا کردار فاروق نہیں بلکہ میری زندگی کی کہانی کا رقیب فاروق نامی ایک امیر گھرانے کا اکلوتا چشم و چراغ ہے۔ جو روحی اور میرے درمیان دیوار بنا ہوا ہے ـ وہ روحی سے محبت کرتا ہے اور روحی. مجھے نہیں معلوم کہ روحی اس کے لیے کیسا جذبہ رکھتی ہے۔ ہم تینوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے ہیں اور دوست بھی ہیں. آج پہلی بار مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ روحی کو قریب سے دیکھنے کے لیے میرے رقیب فاروق نے مجھ سے دوستی کرلی ہے... ورنہ کہاں ایک غریب کہانی کار۔ اور کہاں ایک اونچے گھرانے کا فرد۔ اور پھر فاروق کے جاتے ہی میں نے فیصلہ کیا... ہاں میں نے فیصلہ کیا... بالکل ایک کہانی [illegible] روحی اور میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور فاروق ایک رقیب... بہت سوچ و بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا۔ کہانی کے اختتام پر ویلن کو.... ہاں میرے قلم کی ایک جنبش سے فاروق اپنے انجام کو پہنچ گیا... لیکن۔ مگر فاروق کا انجام اب اس کہانی کا انجام نہیں ہے... بلکہ کہانی شایع ہونے کے بہت دن بعد، میں ایک شام کو اپنے کمرے میں بیٹھا تنہائی سے لڑ رہا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی ... میں نے دروازہ کھول کر دیکھا کہ روحی رو رہی ہے .... زار و قطار.. میں نے اُسے کمرے کے اندر داخل ہونے کی دعوت دیتے ہوئے اس کے رونے کا سبب پوچھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہنے لگی ـــ "اسلم... فاروق کو کسی نے قتل کردیا ہے۔ اسلم تم فاروق اور میری محبت کے گواہ ہو۔ اسلم اب میں اس دنیا میں اکیلی رہ گئی ـــ"، کچھ لمحوں کے بعد، وہ پاگلوں کے سے انداز میں مجھے گریبان سے پکڑتے ہوئے کہنے لگی ـــ" اسلم ..تت ـتت تم۔ تم فاروق کے قاتل ہو ... تمہاری کہانی تمہارا اعتراف جرم ہے .... انسپکٹر صاحب یہی میرے شوہر کا قاتل ہے اور ثبوت کے لیے اس کی لکھی ہوئی کہانی موجود ہے ـ" اتنا کہہ کر وہ "دھم" سے نیچے گر پڑی۔

ابوالبرکات

فنکار

چار سال قبل محمود کا یہ حال نہیں تھا۔ پہلے پہلے اس کا بدن بھرا بھرا تھا چہرے پر خفیف نمک کشادہ پیشانی اور شبلائی آنکھوں پر اتنی گھنی اور کالی پلکیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا کہ آنکھوں میں کاجل کی سلائی بڑے سلیقے سے گھمائی گئی ہے۔ سر میں کافی گھنے اور موٹے بال جو بڑی ہی مشکل سے اپنی بائیں طرف آگے سے پیچھے کی جانب سرنگ بنانے دیتے۔ لمبی لمبی ٹانگوں والا۔ لمبے چھریرے ہاتھوں میں لمبی لمبی چھرک انگلیاں جن کو دیکھ کر منجم کہتے "یہ لڑکا ضرور فنکار بنے گا" ہر وقت دلکش پوشاک میں نظر آتا اور مسکراتا رہتا تھا۔ اس کے پاس "شعر وادب" کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ چونکہ میں ادب کا طالب العلم تھا اور وہ سائنس کا اس لئے ہم دونوں کے درمیان لمبی لمبی بحثیں چھڑ جاتیں۔ اس کے خیال میں "ادب محض ایک ذہنی عیاشی تھا ------

میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔

"ارے یار! تم نہیں سمجھتے سائنس کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن یہ ساری سائنسی ایجادات کس کے لئے ہیں . . . . ! ہم انسانوں کے لئے اگر ادب ہمارے شعور کی تربیت نہ کرے تو پھر انسانوں کی حالت جانوروں کی سی ہو کر رہ جائے۔ اور ساری سائنسی کرامات دھری کی دھری رہ جائیں"۔ لیکن میری وہ ایک بھی نہیں سنتا۔

مگر آج جب میں محمود سے ملا تو اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی چہرہ زرد پڑا تھا۔ سر کے بال بکھرے پڑے تھے اور برآمدے میں کرسی پر بیٹھے کہیں دور ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی اور آنکھوں میں ایک تیز چمک میں خاموشی سے اس کی بائیں جانب کی کرسی پر جاکر بیٹھ گیا لیکن اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کوئی میرے پاس آکر بیٹھ گیا ہے۔ وہ تو خیالوں میں مستغرق تھا۔ میں نے دیکھا یکایک اس کے چہرے پر رونق آگئی اور آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔ اس کی اس کیفیت سے معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کو کوئی انمول شئے ملنے کی بشارت ہوگئی ہو اور وہ کرسی سے اٹھ کر اندر جانا ہی چاہتا تھا کہ مجھ پر نظر پڑ گئی۔ بڑے ہی تپاک سے بولا "آداب عرض ہے! آپا آپ کب آئے میں نے تو آپ کو آتے دیکھا نہیں۔ . ------ میں نے نہایت انکساری سے جواب دیا "کیا فرق پڑتا ہے اب تو تم نے دیکھ لیا"۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ریڈنگ روم میں لاکر بٹھا دیا۔ میں نے اس کمرے کا سرسری جائزہ لیا۔ اور حیرت زدہ ہوگیا۔ کمرے میں پانچ بڑی بڑی الماریاں قرینے سے رکھی گئی تھیں۔ جس کے سامنے کے پٹ پر شیشے لگے ہوئے تھے۔ اور ان میں بڑے سلیقے سے کتابوں کو سجایا گیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے لائبریرین کتابوں کو سجاتا ہے تاکہ مطلوبہ کتابوں کی تلاش میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ کمرے کے بیچ میں ایک بڑا سا ٹیبل تھا جس کے اوپر ایک صاف شفاف بڑے سائز کا شیشہ جس کے نیچے رنگ برنگ مور، سرخاب وغیرہ کے پر سجے تھے۔ شیشے کے اوپر تین اطراف سے ڈیڑھ دو درجن، تاریخی ادبی اور سائنسی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دو دوات اور پانچ چھ قلم موجود تھے پورب کی طرف اسپرنگ کی کرسی رکھی تھی اور ٹیبل کی تینوں جانب پانچ اور کرسیاں۔ یہ سب دیکھنے کے بعد مجھے منجم کی وہ بات یاد آگئی۔

"یہ لڑکا ضرور ایک دن بڑا فنکار ہوگا"۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ "محمود ایک بڑا تو نہیں لیکن فنکار ضرور ہوگیا ہے"۔ مجھے محمود سے ہمدردی تھی اس لئے اس کی شکل وصورت دیکھ کر بہت افسوس ہوا اور میں

[illegible]

"یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے
معلوم ہوتا ہے اسپتال سے آج ہی آئے
ہو؟"
"جینے کے لئے مرنا پڑتا ہے اور ہر
تخلیق میں فنکار کو ایک بار مرنا پڑتا ہے"
پھر خیالوں میں غرق ہو کر کھوئے
لہجے میں گویا ہوا
"اف۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !! آپ اسے نہیں
سمجھ سکتے تخلیقی کرب کیا ہوتا ہے"
اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر
"یہ تخلیقی کرب کیا ہوتا ہے —— !!
یہ ایک فنکار ہی سمجھ سکتا ہے
"ہمارے یہاں یعنی اردو رسائل کی
یہی روش ہے کہ مضامین نہیں دیکھے
جاتے مصنف کا قد دیکھا جاتا ہے، اس
کا گروپ دیکھا جاتا ہے، اس کا شجرہ
اور تب مضمون شائع کیا جاتا ہے"
"لیکن ایسی تو کوئی بات نہیں ہے،
میں نے تو بہت سے نئے فنکاروں کو بھی
شائع ہوتے دیکھا ہے، جن کا تعلق
مذکورہ بالا کسی گروپ سے نہیں ہے"
"ہاں! نئے لوگ بھی چھپتے ہیں
اور میں بھی چھپوں گا شروع شروع
میں ایسا ہی ہوتا ہے پہلے فنکار کے
آگے گھاس نہیں ڈالتے اور پھر۔ ۔
میں نے چار رسالوں میں اپنے منتخب
افسانے اور مضامین بھیجے ہیں اور
وہ اشاعت کے لئے منظور بھی کر لئے
گئے ہیں۔ لیکن اب تک شائع نہیں
ہوئے
اس کے چہرے پر ایک [illegible]

پھیل گئی اور افسوس ظاہر کرتے ہوئے
"افسوس میں نے یاددہانیوں کے خطوط
بھی ارسال کئے اور جواب بھی آتا ہے
بہت افسوس اس شمارے میں آپ
کا افسانہ شامل نہ ہو سکا اگلے شمارے
میں ضرور شامل ہو جائے گا" لیکن
یہ سب خطوط ہی تک۔ ۔ ۔ ۔
"تو پھر جب تمہاری دوکان چمک
جائے گی، تم بھی دونوں ہاتھوں سے
دولت اور شہرت بٹورو گے" میں نے
چھیڑتے ہوئے کہا۔
زیر لب تبسم سے "بس صاحب!
فنکار کو پیسے کہاں ملتے ہیں۔ ۔ ۔ !!
اور سب کچھ مل جاتا ہے۔ اسٹیج پر
جی کھول کر لوگ داد دیتے ہیں۔
سامعین خوش ہو کر اپنی ٹوپی اور
جوتے تک نچھاور کر دیتے ہیں اور بچارہ
فنکار اتراتے ہوئے گھر کا رخ کرتا ہے
جہاں بیوی کی جھڑکیاں سننی پڑتی
ہیں اور بچوں فریاد"
اچانک پردہ ہلا اور ایک خوش شکل
مائل عورت نمودار ہوئی جو نیچے سے
اوپر تک آسمانی رنگ کے لباس میں
ملبوس تھی اور پاؤں میں بھی آسمانی
رنگ کی چپل تھی بڑے ہی سلیقے سے
دو پیالی چائے رکھ کر پھر اندر چلی گئی
میں بہت ہی متعجب ہوا کہ اتنی
ساری تبدیلیاں ہو گئیں۔ لیکن اس
نے کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔ شاید
میرے چہرے کے تاثرات کو اس نے

بھانپ لیا۔
"یہ میری اہلیہ ہیں" محمود نے بتایا
"تم نے تو مجھے ہوا تک نہیں لگنے دی"
میں نے کہا۔
"یہ ایک ایسی کہانی ہے جس
کو دہرانا اپنی روح پر ظلم کرنا ہے۔
لیکن آپ میرے ہمدرد ہیں اس لئے
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسا کہ آپ
کو معلوم ہے میں بی۔ ایس سی کرنے
کے بعد بے کار ہو گیا۔ میں نے سوچا
پھر اردو سے بی۔ اے آنرز اور
ایم۔ اے کر لیا جائے کچھ نہیں تو
لکچرر ضرور ہو جائیں گے۔ اس طرح
میری آدھی جائداد فروخت ہو گئی۔
مگر پھر وہی بیکاری کی بیکاری۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ اسی درمیان مجھے لکھنے پڑھنے
کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور میں نے سوچا
کیوں نہ ایک چھوٹی موٹی لائبریری
قائم کر لی جائے تاکہ لکھنے میں سہولت
ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے بچی ہوئی جائداد
کو بھی فروخت کر دیا۔ جس کا ثمرہ سب
کچھ تمہارے سامنے ہے۔ سوچا تھا
میری دکان چمک جائے گی اور۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن خواب تو خواب ہی ہوتا
ہے" کمرہ بھی اس کے چہرہ کی طرح
بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ پھر اس نے کہا
"خدا کا شکر کرو کہ مجھے ایک عدد قبول
صورت نیک سیرت بیوی مل گئی
میں تو اس سے بھی مایوس ہو چلا تھا
میرے پاس رہ ہی کیا گیا تھا وہ تو بابا

روح کے زخم

پرویز بن ناظم

عیش و آرام کی تمنا کسے نہیں ہوتی یہ تو انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ جسے بہر صورت انسان پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر اس نے ایسا تو کوئی برا نہ تھا کہ وہ غریب الوطن بن گیا۔

یوں بھی اس ملک میں اس نے بہت دکھ اٹھائے تھے اور شاید اسی لیے جاتے ہوئے اس کے چہرے پر سکون تھا۔ وہ اضطرابی کیفیت مٹ چکی تھی جو یہاں اسکے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ ہاں آنکھوں میں گہرا تجسس تھا، وہ تجسس جو ان دیکھی جیزوں کے لیے ہوا کرتا ہے وہ سنی سنائی باتیں اسے یاد آرہی تھیں جو ان ممالک کے لیے کہی جاتی رہی تھیں۔ اور جو کچھ اس نے سنا تھا کچھ ترمیم کے ساتھ وہاں کی رنگین زندگی دیکھی لوگ خوش تھے۔ زندگی خوبصورت تھی، اتنی خوبصورت کہ وہ خوش ہو گیا۔ چلو چھٹکارا ملا۔ اب اس نے کام کی تلاش شروع کی۔ پڑھا لکھا بھی تھا اور شکل و صورت بھی بری نہیں۔ اور شاید اب خدا کو بھی اس پر ترس آگیا۔ تاریکی چھٹتی گئی اور اس کی زندگی کا سورج نہ جانے کس طرف سے نکلا کہ اسے خود بھی حیرت تھی۔ اس نے یہ سب تو سوچا بھی نہ تھا ارے یہاں تو واقعی خدا ہے۔ ویسے خدا کا قائل تو وہ پہلے بھی تھا مگر۔ . . . .

وقت بھاگتا گیا اور دیکھتے دیکھتے دو سال بیت گئے۔ وقت کی اس بھاگ دوڑ میں وہ بھی شامل ہوگیا۔ اب اسکی زندگی کے اطوار ہی بدل گئے، جینے کا ڈھنگ بدل گیا اور اس طرح بدلا کہ وہ پرانی پہچانیں مٹ گئیں، وہ جو مشرق کی دین تھیں۔ اب تو پیسہ تھا، دولت تھی، عیش و عشرت کی جیتا جاگتا زندہ تھی؛ اور یہ سب کسے نہیں بھاتا؟ زندگی ہنگاموں کی ندر ہوگئی۔ شراب و شباب زندگی کے اہم جزو بن گئے پھر بھلا طوفان بھی کہیں رکتا ہے کیا؟ اور یہ طوفان تو اچھے اچھوں کے قدم اکھاڑ دیتا ہے۔ . . . مگر ندی کی اس تیز دھار میں بہتے بہتے اچانک جیسے ٹھہراؤ آگیا . سامنے دیکھا، کوئی نہ تھا کرسٹی تھی۔ ہاں وہی کرسٹی جو اسکے آفس میں ہی کام کرتی تھی، حسین بھی تھی اور طرحدار بھی۔ بھورے بالوں والی یہ لڑکی اسے بہت پسند تھی۔ اور ایک دن اس نے اپنی خواہش کا اظہار کر ہی دیا۔ ایک خاموشی . . . سناٹا . . اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بڑی کھنک دار ہنسی تھی، وہی ہنسی جو اسے پاگل سا دیتی۔ دوریاں تو پہلے بھی نہ تھیں مگر وہ جس قرب کا متمنی تھا وہ یہ تو نہ تھی۔

اس نے غور کیا۔ کوئی مشکل نہ تھی۔ وہ اس کی بن گئی

سورج نے کروٹ بدلی۔ دو سال اور بیت گئے۔ اب وہ بوڑھا نظر آنے لگا تھا شاید ہاں، شاید نہیں۔ کیونکہ اسکے بازوؤں کی مچھلیاں اب بھی اسی طرح تڑپتی تھیں۔ اس کے خون میں اب تک حدت باقی تھی۔ مگر کرسٹی تو دور بھاگ رہی تھی۔ اس لیے اس کے اصولوں سے وہ ایک کی بن کر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ انداز نظر کا فرق رنگ لایا۔ اس نے کئی بار سمجھایا، مگر کرسٹی نے کہا: "چاندنی لامحدود ہوتی ہے۔ کسی قید کی پابند نہیں" وہ کڑھتا رہا۔

وہ خود اس کے پاس آئی "میں البرٹ کے پاس جا رہی ہوں"۔

"جاؤ" وہ اب بھی چپ تھا۔ اس کے چہرے پہ کوئی رنگ نہ تھا۔ پتھر کی طرح سپاٹ مورت کی طرح بے جان

وہ چلی گئی مگر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ یہ اس کی عادت نہ تھی۔

وہ مشرق و مغرب کے اس تضاد کو تولتا رہا اس نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ لوٹ جائے! مگر کہاں؟ ذہن میں:

'جہاں بھوک ہے، غربت ہے، مفلسی ہے'

'مگر فطرت عریاں تو نہیں۔ ایک پردہ تو ہے سماج کا، عزت کا، وفاداری کا، اور وہ واپس لوٹ آیا۔

عجیب دنیا تھی۔ وہ پہچان نہ سکا۔ 'یہ وہ کہاں آگیا؟ بڑی بڑی سڑکیں تھیں اونچے اونچے پل اور عمارتیں۔ وہ خوشحالی کا مظہر تھیں۔ نیچے جو غریبوں کا مسکن تھا نیچے؟ مگر نیچے کون دیکھتا ہے؟ اس نے اوپر دیکھا۔

یونیورسٹی ہے، کالج ہے۔ تعلیم ہے۔

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

جہانگیر اُنیس

سوغاتِ عید

سہل نسخہ :-

ایک وکیل نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے کہا "شاہ جی! علماء تعبیر و تاویل میں ید طولیٰ رکھتے ہیں کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمایئے کہ آدمی کھاتا پیتا رہے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے"

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کہا "نسخہ سہل ہے کاغذ و قلم لے کر لکھو ایسا مرد چاہیئے جو مجھے صبح صادق سے مغرب کے وقت تک جوتے مارتا جائے" میں جوتے کھاتا جاؤں اور غصہ پیتا جاؤں"
—اور اس کے بعد فرمایا "جاؤ اس طرح کھاتے پیتے رہو روزہ کبھی نہیں ٹوٹے گا"

خالی عید :-

عرصہ ہوا، ایک مرتبہ بدایوں میں اختلاف رویت ہلال پیدا ہوگیا۔ اٹھائیسواں روزہ تھا کہ چند لوگوں نے چاند کا اعلان کر دیا اور آخر بحث و مباحثہ کے بعد اگلے دن عید منانے کا اعلان کر دیا گیا۔ وہیں کے کسی ظریف شاعر نے اس واقعہ سے متاثر ہوکر ایک قطعہ لکھا جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

ہمیشہ ہوئی تھی انتیس تیس کی رویت
مگر بدایوں میں اب کے ہوئی نرالی عید
بنا کے فروری ماہ صیام کو افسوس
ستم ہے بارہ ستمبر ہی کو منالی عید
جو ہر برس گھٹتا رہے گا یونہی ایک اک دن
تو بست دہشت برس بعد ہوگی خالی عید

ہماری عید :-

اکبر الہ آبادی سے ان کے کسی واقف کار نے عید کی تعریف پوچھی۔ اکبر الہ آبادی نے برجستہ یہ قطعہ پڑھ دیا

کہیں دیباچہ رنج والم تالیف ہوتے ہیں
خوشی و مسرت کی کہیں تمہید ہوتی ہے
زمانے کے ستم دیکھو ہلال عید سے اکبر
جگر پھٹتا ہے گردوں کا ہماری عید ہوتی ہے

یتیموں کا مال :

کوئی قاضی صاحب بدریات تھے حاص طور سے یتیموں کا مال ہضم کر لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے عید کا چاند ۲۹ ر تاریخ کو دیکھا لیکن قاضی صاحب نے شہادت کو معتبر نہ مانا اور دوسرے دن عید منانے کا حکم نہیں دیا۔ اس پر ایک شاعر نے جل کر کہا

سَرَقَ عیدٌ کَانَ اَل عِیدُ اَموالُ الیَتَامیٰ

قاضی جی نے عید کو چرا لیا گویا عید بھی یتیموں کا مال ہے

عید کب آئی ہے؟

ایک شخص نے سوال کیا مَتیٰ جَاءَ عِیدٌ؟ (عید کب آئی ہے؟)

دوسرے نے جواب دیا اِذَا جَاءَ عَینٌ عَلیٰ یَدٍ

یعنی عید آنے کی تین صورتیں ہیں

عین کے معنی ہیں "سونا" فقرے کا یہ مفہوم ہوا کہ جب ہاتھ میں "سونا" آجائے تو عید آگئی

عین سے ہلال عید بوجہ تشبیہ مراد لیا جا سکتا ہے اب فقرے کا یہ مفہوم ہوگیا کہ جب ہلال ہاتھ میں آجائے یعنی عید کا چاند دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا جائے کہ "وہ دیکھو چاند" اس وقت عید آگئی۔

فقرے کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ جس وقت حرف "ع" لفظ "ید" کے اوپر آجاتا ہے تو عید آجاتی ہے

بدیہہ گوئی :-

شہزادہ مراد بخش احمد آباد کا صوبہ دار تھا۔ سعید خاں جو نہایت ہی طباع و ذہین اور برجستہ وفی البدیہہ شعر کہنے میں کمال رکھتا تھا شہزادہ کے ساتھ تھا۔ عید الفطر کے دن شہزادہ نے سعید خاں سے کہا "عید کے لئے کوئی قصیدہ کہا ہو تو سناؤ" اتفاق سے سعید خاں نے کچھ نہ کہا تھا لیکن انکار کی جرأت نہ تھی عرض کیا "ایک غزل لکھی ہے نماز عید کے بعد سناؤں گا" شہزادہ نے کہا ابھی سنا دو سعید خاں نے جیب سے کاغذ نکالا اور سنانا شروع کیا —

غزل ختم ہوئی تو شہزادہ سعید خاں کے ہاتھ سے کاغذ لے کر دیکھا تو بالکل سادا تھا بہت تعجب ہوا اور حاضرین سے کہا "دیکھو بدیہہ گوئی اس کا نام ہے!"

..کی عید—

بقول ملا رموزی "عید کے ایک معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ مثلاً" علی گڑھ والوں کی عید کہتے ہیں اسے کہ اس کی ٹیم ٹورنامنٹ جیت کر کپ حاصل کرلے، عام طلبا کی عید ہوتی ہے اسکول کی چھٹی، لیڈروں کی عید ہوتی ہے جبکہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی قوم سے غداری کر کے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر بن جائیں یا بن جانے کے قریب پہنچ جائیں یا انھیں امید ہو جائے کہ آئندہ سال وہ ضرور صدر بن جائیں گے، بڑے مولوی صاحب کی عید ہوتی ہے اس دن جب انھیں محلے کے کسی امیر آدمی کے یہاں سے حضر تناول کا اذن آجائے، دفتری ملازموں کی عید ہوتی ہے جب کہ ان کی تنخواہوں میں اضافہ کا حکم ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہوکر گزر جائے تانگے والوں کی عید ہوتی ہے جبکہ انھیں ایک کے اوپر ایک ہوکر بیٹھنے والی سواریاں اتنی تعداد میں مل جائیں کہ گھوڑے کا سانس اکھڑ جائے، قلی، مزدوروں کے

(بقیہ صفحہ ۵۷ پر)

ڈاکٹر اسریٰ ارشد

یہ انڈے مُرغی کے

سعید سعید مصادی۔ بالکل اُبلے نگلے کے پر جیسے۔ نارواداسے پالی مرغیوں کے نتیجہ ہیں فارم کے انڈے۔ تھوڑا گندمی، تھوڑا کتھئی۔ بالکل مصادی ہیں۔ کچھ ٹیڑھے میڑھے ہر سائز کے جسے کیلا نگاں میں کھیلتے بچے گُلا کے۔ یہ ہیں دیسی انڈے۔ اور اگر یہ دیسی دستیاب نہ ہوں تو کوئی بات نہیں۔ فارم والوں کو کتھے کے رنگ میں رکھ کر دھو ڈالو۔ یا چائے کی پتی میں ڈال دو۔ یہ رنگ پکڑے گا اور فارم کا انڈا دیسی ہو جائے گا۔ اور یہ دیسی انڈے ہوتے بھی زیادہ مزہ دار۔ زیادہ لذیذ۔ اس لئے زیادہ قیمتی ہیں تو سیدو سمائی نہ حاصل ہاؤس کے گھروں پر پالتو مُرغیوں کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ وائٹ لگ ہارن ملیک منار کا اور کیا کیا۔ انڈے جب دیئے سفید دیئے۔ مگر پردوں نے لاکھ کوششیں کی تھیں کہ بلیک منار کا ہے سفید انڈے نہ ہو کالے ہوں اور یہاں بھی سیگر یگمتس کے اصول کو لاگو کر دیں پر ایک نہ چلی۔ کھوج کھوج کر ایک حیوانیاتی قانون کا انکشاف کیا۔ سنڈ ملیس لا۔ مگر وہ ختم ہو جب مُرغیوں پر آ کر یعنی اگر وائٹ لگ ہارن کی مرغی ہو اور بلیک منار کا مُرغہ ہو تو انڈے تو سفید ہوں گے مگر چینگے یاری باری سفید کالے اور چتکبرے ہوں گے ورنہ چتک سے ہوتے بڑے خوبصورت بھی کچھ خالص انگلو انڈین۔

اور جب دیسی کی بات چھڑی ہے تو وہ گھر بڑا اچھا ہے جہاں کے دڑبے مُرغیوں سے بھرے ہوں۔ رات کا وقت ہے دہات کا وسط سعد یادیں اسلام پورے لڑکے والے لڑکی کی بات کرتے آئے ہیں۔ گھر میں ایک تہلکا مچا ہے۔ "اے لوا کتنے شرم کی بات ہے" "سو سو آیا اب کیا ہوگا" میاں فتو دوڑے گھر میں آئے اور گرجنے لگے "رات کے دس بج چکے ہیں اب سمدھی لوگ آئیں ہیں جلد کھانا تیار کرو۔ ارے ڈربے میں پڑی نامراد مرغیاں کب کام آئیں گی۔ ایک دو کی گردن حلال کر دو۔ اس پر سے پلاؤ۔ انڈے کا سلاد۔ انڈے کا حلوہ جو تم نے سنا رکھا ہے میٹھے کا کام کرے گا۔ بہترین لذیذ کھانا ہوگا۔ فتو ایک بار اور گرجے۔ جلد کرو۔ جلدی۔

اور واقعی ہی بی بلقیس نے ایک دو کی گردن موڑ دی آنے والے نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اور رات گئے بات پکی کر کے بیٹھے تو بولے "کھانے میں کیا کھا! کھلایا ہے مُرغ ہی مرغا" اور فتو دل میں سوچ سوچ کر ڈر تے ہیں۔ مُرغ کھلایا بھی اور یہ جانیں "مُرغی" لے جانے کا دام کتنا مانگیں گے۔

میرا مطلب جہیز سے ہے

یوں کسی بے نام شاعر نے مُرغیوں کے انڈے کو وکیلوں سے وابستہ کر دیا ہے

مُرغیاں انڈے دیتی ہیں جھیل میں
اور وکیل صاحب بڑے لفیل ہیں

شاید کوئی دل جلا رہا ہوگا۔ وکیل صاحب نے کافی میں ایسٹھلی ہوگی اور مقدمہ بھی ہار گیا ہوگا۔ تب ہی تو وکیل صاحب کو مُرغیوں کے برابر لا کر بیٹھا دیا ہے۔ اور جب شاعر کی بات ہے تو شاعر کا الٹا عائد ہوتا ہے۔ ایک استاد شاعر کا شاگرد تھا اس کی عادت تھی کہ وہ اکثر اپنے شاہات کو شاعری کا جامہ پہنایا کرتا اور شاعر صاحب جب لینے لگتے تو وہ اپنے اس تحرلے کو سنایا کرتا۔ چنانچہ پیر داتے ڈاتے اس نے مصرعہ کہا۔ اُستاد حضور صرف ایک ہی مصرعہ پایا۔

کھریں جاکر لکھ اور پڑھ
سب درخت میں بزرگ بڑھ

اُستاد نے فوراً شعر کا میسٹ کر دیا۔

ہر بھرے پتے گول گول پھر ایک ستے کا اور واقعہ ہے کہ جب استاد حضور کی مُرغی ہی کڑک ہو گئی۔ مگر یہ لے مُرغی کو پکڑ کر اس کے پیر سے اس کے ناک چیر ڈالے حالانکہ مُرغی نے کافی شور و غل مچایا۔ پر ٹری بی کب ملنے والی تھیں۔ آہستہ سے گھونسہ لگاتے بولیں "دھت۔ جراتن ہے موٹی۔ ایک بھی نڈر د۔ اسی کی طرح کیا ہمیشہ کڑک رہے گی تو شاگرد کو مصرعہ سوجھ گیا

ناک میں مرغی کے پر۔ استاد نے شعر چُست کیا
ناک میں مُرغی کے پر۔ آدھا اِدھر آدھا اُدھر

ایک دن ایسا ہوا کہ شاعر صاحب کی جُبّہ کر حرمہ بے جا بھارت ہوئی۔ ماسٹر نے خبر اپنا مصرعہ بنا کر تیار تھا۔ پیر جھکتے جھکتے بولا استاد حضور مرغی انڈا دیتی ہے باہر سے بچہ۔ بچے سے پھر انڈا انڈے سے پھر بچہ۔ کیا خدا کی قدرت ہے مگر حضور یہ اصول کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اللہ نے آخر دونوں کو ایک ساتھ بنایا نہیں ہوگا۔ پہلے یہ یا پہلے وہ۔ مصرعہ ہے حضور

ہوا ہے پہلے مرغ یا مرغی کا انڈا
لگاؤں عقل پر دو چار ڈنڈا

استاد تو بگڑے تھے ہی۔ کڑک کر بولے یہ تو فلسفہ اور یقیں کی بات رہی اب ذرا ان نظاروں کو بھی دیکھئے جو آج کل یہ انڈے شہر کے چوراہوں پر۔ گلیوں میں تاریک کونوں میں اور خاص مندر ہنومان کے پیچھے تماشے دکھاتے ہیں۔

انڈوں کا انبار اور چھلکوں کا ڈھیر۔ ایک ٹمٹماتی بتی تو بیچنے والے کی زندگی کی حقیقت بیان کرتی رہتی ہے۔ ستار کی جس جیسی داڑھی آدھی کچی آدھی پکی ٹیڑھی تین کونیاں ٹوپی۔ گلے میں پھٹا سا گمچھا جو اکثر صافی کا بھی کام کر جاتا ہے۔ دیکھئے آنچ میں لکڑی کے کوئلے کا جلتا چولہا لعل ہیں چٹ پٹی مسالوں سے نمک جو گرما گرم انڈے کے مزے کو ٹیس چڑھا دیتا ہے اور شاید وقتی گرمی بھی لاتا ہے۔ اللہ جانے آپ نے تو انڈے ہزار کھائے ہیں مگر گرمی کے بجائے سردی آگھسرتی ہے۔ مگر رجائی مرتضیٰ جیسے کچھ لوگ اور بھیا پچن جیسے لائٹر بوکس انڈا کھایا نہیں کہ گرم ہوگئے۔ نالیاں بہاتے ہیں اور کہیں گے اوہ کہ یہ گرمی آئی ہے۔ مگر صبح میں تو لائٹر بوکس اکثر خاموش رہتا ہے۔

اور اس روز بڑے کڑاکے کی سردی تھی۔ مونہہ کا بھاپ آپ ہی نظر آ رہا تھا۔ ہر سانس کے آمد و رفت سے ماتھے پر بھی بوندیں ٹپک جائیں اور گھبرا اٹھے تھے ایسے میں رات کے گیارہ بجے پنڈت دھر مندر بانٹے ہرے کرشن ہرے رام۔ اوم شانتی۔ اوم شانتی۔ سرکو کھجونتی سو کھی۔ مندر کے بن منڈیر والے کنواں پر پانی بھر بھر کر نہا رہے تھے۔ شاید تپ اور تپش کا ثبوت ہم لنگڑے انسانوں کو دکھا رہے تھے۔ نہانے کے بعد انہوں نے جٹا دھاری ٹیک کی زلفوں کو ذرا سے جھٹکا دیا اور گیروا استر نپ تن کر کاٹ کی کھڑاؤں پہن گلے میں رودر کی مالا ڈال اوم شانتی اوم شانتی کرتے چلے۔ وہ گلی سنسان سی ہو چلی تھی۔ اکّے دُکّے لوگ نظر آ رہے تھے۔ رات پر رات بہاتے کھٹ

کھٹ کھڑا [illegible] کرتے انہوں نے جبار سے [illegible] ہیں۔ لا یار۔ آج آ [illegible] ایک سا [illegible] پنڈت جی یہ انڈے ہی انڈے۔ [illegible] اچھل بھی رام بھل جبار تو بھی رہ گیا۔ اس شدھی کرنے کے زمانے میں سب چیزیں پوتر ہو جاتی ہیں۔ انڈے پاپ ہیں۔ رام بھل پاپ نہیں۔ اب تو ہی سوچ۔ اتنے لوگوں نے بناسپتی ڈالڈا میں چربی کھائے تو کیا ہوا۔ بس تھوڑی گنگا جل پی لینگے اور سب شدھی ہو جائے گی۔ اگر تجھے بھی ضرورت ہو تو کہنا۔ جے جے ہنومان گوسائیں۔ وہ زور سے کھانے لگے۔ شاید رام بھل انڈے س کر جلتی ہیں۔

اور اُسی رات ایک رومال جبار کے پاس آگرا اس میں دس کے نوٹ تھے۔ دس دے دس۔ سیٹھ منّا جین بینکے والے کھڑے ٹیڑھے اپنے ہی بھاپ سے اپنے گالوں کو سینکتے ہرن کی طرح اِدھر اُدھر تاک رہے تھے۔ وہ نوسدھا ہم چھتر نکل آیا اِدھر تو غضب ہو جائے گا۔ بھگوان بچائیں۔ اس نے رومال لیا۔ انڈے کی گرما گرم کُلبلاہٹ سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اور زیرِ لب گنگناتا اندھیرا ہے رات سجن رہیں کی جنیٔ ہوئ اُس گلی کے سناٹے میں کھو گیا۔

اور جبار نے رات گئے حساب جوڑا۔ آج کی کمائی اچھی ہوئی۔ جمنا چودھری سے دو گنی ہوئی مگر اس سے کیا۔ وہ تو دن میں سنگھاڑے بیچ لیتا ہے۔ اور رات کے سناٹے میں انڈے بھی کھینچ دیتے ہیں پر میں اس سے مات کھا جاتا ہوں۔ تو ہاں بکری ہوئی دو سو روپئے انڈوں کے دام ایک سو ستّر کو ٹلا تیرہ روپئے۔ گوکہ مرچ نمک وغیرہ دو روپئے۔ ڈھبری کا کراسن تیل دو روپئے۔ سمن چھوکرے کو پانی وغیرہ لانے کے تین روپئے۔ کوتّیل نمبر میں لیبسی دو روپئے دن رات کی کمائی کا اپنا حصّہ صرف ۱۸ آٹھ روپئے۔ دن رات انڈے کی گرمی بیچتے بیچتے رات کے سناٹے میں جبار کو سردی لگنے لگی۔ ان آٹھ روپیوں میں آٹھ بچوں کے گھر میں کیا ہوگا اس نے انڈے کے چھلکوں کو بٹور کر ایک کنارے کیا اور کل کے لئے میدان کارزار تیار کیا۔ کچھ سوچتا۔ کچھ بڑبڑاتا بڑھتا گیا۔ اللہ مدد کر۔۔۔ یہ گرانی کب ختم ہوگی۔ یہ بچے آنے بند ہوں گے۔ مگر اللہ اس سردی کو قائم رکھیو بلکہ سردی اور بڑھا دیجیو۔

تو جناب میں بھی بات کیا کرنے لگا۔ بات تو صرف اتنی تھی کہ انڈوں کی میڈیکل یا طبی حیثیت کیا ہے؟ ہم ہندوستانیوں کو انڈے بہت پسند ہیں۔ سالِ رواں بھی تقریباً تیرہ ارب انڈے پیدا کئے گئے یہ انڈے قدرت کے بہترین کرشمہ ہیں۔ ایک بہترین غذا۔ جسمیں ملاوٹ کا سوال ہی نہیں۔ یہ سدھا سدھایا کھانے کا پیگ ہے جو لمسِ انسان سے مبترہ ہے اس لئے پاک اور صاف ہے تب ہی تو آپ کے پاس کے گاؤں ماریہ پور میں درگاہ وارثی میں انڈے اور چائے کے ساتھ چڑھائے جاتے ہیں۔ پرشاد کے طور پر وہ بھی کھا لیتے ہیں انڈے جو انڈے سمجھ کر کبھی نہیں کھاتے۔ یہ انڈے پروٹین اور وٹامنز سے بھرپور۔ وٹامن سی کو چھوڑ کر سب ہی وٹامن اور تیرہ معدنیات ہیں جس میں لوہا فاسفورس اور میگنیشیم بھی شامل ہے۔

انڈوں کی بڑی خاصیت ہے طرح طرح سے استعمال کیا جاتا۔ یہ لوٹ سے کسی بھی حالت میں کہتے ہیں ہیں انڈے کے حلوے۔ سلاد۔ کسٹرڈ۔ انڈے کا تلیا قورما تلا انڈا۔ جوشاندا انڈا۔ پوچ انڈا۔ روٹی انڈے۔ کسی ہندوستانی باورچی نے کہا ہے کہ انڈے کسی دو طرح کے عدد کو جوڑ سکتے ہیں۔ ہاں ٹوٹے دلوں کو جوڑ نہیں سکتے۔ اللہ جانیں۔ گرم انڈوں مگر خاصیت کچھ اور سنتے ہیں۔ تو جانشادا لوں کا خیال ہے کہ حضرت آدم کو آسمان پر سے انڈے میں بند کر کے گرایا گیا تھا زمین پر اور تب انڈا پھٹا تھا اور حضرت آدم زمین پر گامزن ہوئے تھے۔

مگر انڈے صحیح ہیں یا غلط۔ انڈے انڈے ہیں کہ گندے ہیں جا ضروری ہے۔ کبھی بھی در کے انڈے پر یقین نہیں رکھنا چاہئے۔ ہوا اندر پیوست ہوگئی تو انڈے کے اندر بے حساب بیکٹیریا پیدا ہو جائیں گے اور ایسے انڈوں کو پکانے سے زہر پیدا ہوگا جسے فوڈ پوائزنگ FOOD POISING کہتے ہیں۔ انڈوں کو پہچاننے کے لئے انڈوں کو پانی میں ڈالیں۔ گندے انڈے پانی میں تیرنے لگیں گے اور اچھے انڈے پانی کی تہہ میں جا کر جم جائیں گے۔

انڈے کی ایک قسم آحتہ ہوتی ہے جو مرغیاں بغیر مرغوں کو دعوت دئے دیتی ہیں۔ انڈوں میں طاقت کم ہوتی ہے۔ ان سے بچے پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک انڈوں کو کچھ دنوں تک رکھنے کا سوال ہے تو انڈوں کو ریفریجریٹر میں اوپر کے خانے میں رکھنا چاہیئے کیونکہ وہاں ہوا کم جاتی ہے اس لئے انڈے زیادہ دنوں تک اچھی حالت میں رہتے ہیں۔ بار بار ہوا لگنے سے سامنے رکھے ریفریجریٹر کے انڈے جلد خراب ہو جاتے لیکن کمروں میں رکھنے سے انڈے ریفریجریٹر کے مقابلہ میں سات گنا جلد خراب ہوتے ہیں اس لئے گھروں میں اگر ریفریجریٹر ہو تو اُسی میں رکھنا چاہئے۔

اور آج کی مُرغیاں مُرغیاں نہیں ہیں۔ سائنس نے ان کی غذائیت پر اتنی چھان بین کی ہے اور ان کی نسل کو اس طرح اِمپرو (IMPROVE) کیا ہے کہ وہ مُرغیاں اب انڈے دینے کی مشین بن گئی ہیں۔ روز بلا ناغہ ایک انڈے آپ اُن سے لیجئے اور کبھی تو صبح و شام لیجئے۔ اور وقت وہ آنے والا ہے جب خاص آواز ہوگی۔ مُرغی کو حکم ہوگا۔ علی بابا چالیس چور کی طرح کھل سم سم اور وہ انڈے دیدے گی۔ ہاں مہماں کی مہمان نوازی تب بڑی آسان ہوگی ویسے کبھی کبھی قابلِ انڈا رسیلاں دریروں کے لئے بھی یہ بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔ جھولے میں بم کی جگہ مُرغی رکھی ہوگی گو انڈا بم تیار ہے۔ حسب ضرورت ہوئی دو چار انڈے ان پر دے مارے اور خوشی اس بات کی ہے کہ دار و غنہ و بودگی کوئی روپیہ اس میں نہ چل سکے گا ہاں پروفیسر سید سی راجہ کی پریس رپوٹر کی بن جائے گی۔ صبح اخباروں میں ہوگا۔ جھولے میں مرغی نے حکم پر انڈے دئے اور وہ صاحب کو جا لگے۔

اور مرغیاں آج ہندوستان میں آٹھ کروڑ ہیں جبکہ ۱۹۹۶ء میں صرف دو کروڑ تھیں اور سب سے بڑا فارم اس وقت ڈیگاں پولٹری انڈسٹریز ہے جو ویدگاواں میں ہے یہاں بیک وقت چار لاکھ مرغیاں پالی جاتی ہیں اور وہ روزانہ ایک لاکھ انڈے دے ڈالتی ہیں مُرغیاں انڈے زیادہ دیں اس کی لگاتار کوشش ہو رہی ہے پونے میں وینکٹیشورا ہیچریز ہے جہاں سترہ سائنس داں دن رات اس میں کوشاں ہیں کہ دیسی اور بدیسی کو ملا کر ایسی طاقتور مرغی اور تندرست مُرغا پیدا کیا جائے جو بے حساب انڈے دے سکے۔ چنانچہ اب تک اس کی کاوشوں سے پہلے جو مُرغیاں سال میں صرف دو سو انڈے دیتی ہیں اب وہ ۲۲۵ دے رہی ہیں اور اکثر تو ۲۸۰ دینے لگی ہیں۔ مگر پہلے مُرغیاں زیادہ تر یہ ہوتی تھیں اب اس کے مقابلہ میں کم رہتی ہیں کھاتی بھی پہلے کے مقابلہ میں آدھی ہیں مگر قدرت خدا کی نہیں بلکہ کاوش انسانوں کی ہے کہ پہلے کے مقابلہ میں ڈیڑھ گنا انڈا اب زیادہ دیتی ہیں۔

پونے کے قریب ۷۰ کیلو میٹر کی دوری پر وینکٹیشورا ہے جہاں قریب چالیس ہزار پرندے ہیں۔ یہ صاف و شفاف لوہے

کے تاروں والے جالوں میں رکھے جاتے ہیں۔ بعل میں دانے اور پانی رکھے ہوئے ہیں۔ مرغی خانوں کی نچلی سطح ڈھلوان ہوتی ہے۔ بیٹ پیچھے کی طرف گر جاتی ہے جو سالانہ طور پر صاف کی جاتی ہے اور بیٹ کھاد کی حیثیت سے بکتی ہے۔ بعل میں انڈے دینے کے کمرے بنے رہتے ہیں۔ جہاں مرغیاں انڈے دیتی ہیں وہ باہر آتے ہی لڑھک کر سلور ٹرے میں پڑ جاتے ہیں۔ مرغیاں ۱۸ ماہ کی عمر سے انڈے دینا شروع کر دیتی ہیں۔

ایک برس تک ان کو یہ کام کرنا ہے اور پھر کسی دسترخوان کی نذر کر دی جاتی ہیں۔ مرغیوں کے ہر آرام و آسائش کا خیال کیا جاتا ہے اور مرغی خانوں کی صفائی کی جاتی ہیں۔ کافی روشنی کا انتظام رہتا ہے اور گرمیوں میں ہلکی ہلکی پانی کی پھواروں کی ٹھنڈک رہتی سر دو شاد کام رکھتی ہیں۔ ان کے دئے انڈے دن میں تین مرتبہ جمع کئے جاتے ہیں۔ انہیں صاف کر کے پلاسٹک کے ٹرے میں رکھا جاتا ہے۔ ایک ٹرے میں تیس رکھے جاتے ہیں تجار انڈے پسند کرتے ہیں اور ٹرکوں میں بھر بھر کر جلدی سے پورے اور اس کے اطراف پہنچا دیا جاتا ہے۔ یوں تو انڈے، داتی طور پر بیچے جاتے ہیں لیکن ایک ادارہ نیشنل ایگ کوآرڈی نیشن کمیٹی بھی ہے جو صوبے میں اچھی طرح کام کر رہی ہے شمالی ہندوستان میں بھی اس کی شاخیں کھلنے والی ہیں۔ اس میں پالٹری فارم کے مالکان اپنے انڈوں کے بیچنے کی شرح طے کرتے ہیں روز صبح میں بازار میں انڈوں کی آمد اور اس کی مانگ کے حساب سے دام طے کئے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ دام طے ہو گیا پھر انڈوں کو ٹرکوں میں لاد کر ہندوستان کے کونے کونے میں بھیج دیا جاتا ہے۔

انڈا ایک بہترین غذا ہے مگر اصل تو مرغی ہے جی۔ اللہ بھرا رکھے ان کے ڈربے کو صبح ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ مضمون منزل مقصود پر ہے غ فیملی اوٹ ڈور کے سامنے یوں شور ہونے لگا دو بلیک منار کا لڑ رہا ہو۔ "اے دیکھ لوں گا"۔ "دیکھ لوں گا"۔ چپ بے۔ مرغ ساڑالوں گا"۔ عاشق مرغابیوں میں تجھے ہی مرغی ساڑالوں گا"۔ میں نے قسم بہ گردن نکال کر دیکھا۔ دو عدد بھائی جان لوگ بے زار تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ حق بھائی نے مرغا پالا تھا۔ وہ بجانت لگ ہاسن جب چلتا پر

پھڑکائے سیناتانے جیسے ڈی ایم یا سمرہ شری لیس کے لال امیتابھ بچن یا گری گوری پک۔ وہ سیناتان کر چلتا اور نحو بھیا پر لب گالیاں بولتے "سالا حب چلتا ہے۔ انڈین ٹارزن بن کر چلتا ہے"۔ وہ چلتا رہتا ہے ٹپ ٹپ ستاہا۔ چال اور نحو بھیئے کے دال میکتے ہے ٹپ ٹپ "کبھی تو آؤ گے دسترخوان پر"۔ وہ اکثر سوچ کر لیتے۔

اور اس دن ایسا ہوا کہ ادیب بھائی کی چتکبری مرغی ڈھمال کرک ہو گی۔ اسے گلا لوٹے آگس پس اڑا کر پھینکا۔ وہ کڑکڑ کرتی ایک کونے میں دبکنے لگی ٹارزن منڈیرے پر تھا۔ آؤ نہ دیکھا تاؤ۔ کود گیا ادیب بھائی کے گھر۔ گلا لوٹے جھٹ ڈربہ میں چتکری اور ٹارزن کو بند کر دیا۔ ڈربہ آج بھی بند، کل بھی بند۔ ادھر کہرام سا مچ گیا۔ لاکھ حق بھائی نے کھوجا۔ آ۔ٹی۔ٹی گنڈے بکل وائے۔ تصویریں پڑھیں لاکھ پھینٹیں پر نہ ملا ٹارزن۔ آخر صبر کر کے بیٹھ گئے۔ افسوس کرتے کہتے۔ آہ بلی نے کس طرح نوچ نوچ کر کھایا ہو گا۔ ان کی آنکھیں نم ہو جائیں۔

مگر اس دن صبح وہ نماز پڑھ کر بیٹھے تھے ہی کہ ٹارزن کی آواز سنائی دی۔ "ککڑوں کوں"، پوری صبح اس کی رودار آواز سے گونج اٹھی۔ بس کیا تھا۔ حق بھائی اچھل پڑے۔ ارے یہ تو اپنا ٹارزن ہے۔ ٹارزن منڈیر پر آ کر چیخنے لگے۔ ٹارزن۔ ٹارزن۔ آ۔ٹی ٹی سا ور وہ غریب اندر بلند پھڑپھڑاتا رہا۔

اور حق بھائی گرجے "نکال میرے ٹارزن کو" پھر تو لڑتے لڑتے دونوں میرے فیمیلی اوٹ ڈور کے سامنے آئے جیسے انصاف چاہتے ہوں۔ میں نے کہا حق بھائی۔ اس میں مضائقہ کی کیا بات ہے۔ پہلے لیلا ہرن ہوئی تھی۔ اب رام ہرن ہوئے ہیں۔ اسے گاؤں مورور کے کتنے ہی پٹھے جوان چھوکرے گھوڑوں اور ہیں امارے کے سسرال ڈربے میں اغوا ہو کر اب تک بند ہوں۔

ادیب بھائی نے تیور بدل کر کہا "اسری بھائی۔ میں نے پلوائے قسم ہے پچیس روپیہ میں خریدا ہے۔ میں نے کہا "اس جانے بھی دیجئے حق بھائی۔ اگر ٹارزن واپس لینا ہے تو دین مہر دینے کے"۔

وہ دین مہر حق بھائی نے گھوڑے جھکائی اور جوتے جوانی کے ساتھ دیا ہے۔ ٹارزن اب بھی گھومتا ہے۔

سیناتانے۔ ہاں چتکبری انڈوں پر بیٹھ چکی ہے۔

بقیہ اردو افسانہ قومی یکجہتی

کی کہانیوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ "ان داتا"، جو بنگال کے قحط پر سب سے اچھی کہانی ہے اور ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے "موبی" "پال" "بالکنی"، جو جنگ کے ماحول سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ "اجنتا سے آگے"، جس میں حیدرآباد کے مظلوم کسانوں کی فریاد سنائی گئی ہے۔ "ہم وحشی ہیں"، کی ساری کہانیاں جو فسادات کی بربریت کے خلاف ایک نعرہ جنگ ہیں اور "بت جاگتے ہیں" جو عوام کی بے چینی اور مایوسی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ ان سب کہانیوں میں ہم نہ صرف کرشن کے آرٹ کو نہ صرف اردو افسانے کو بلکہ ہندوستان کی قومیت کے تصور کو ارتقا کی مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ "ایک تھا راجہ"، سے لے کر آج اردو کہانی "کالو بھنگی"، اور "پھول سرخ ہیں"، تک پہونچ گئی ہے۔ کیونکہ ہندوستانی قومیت بھی ماضی پرست کے قریب سے لے کر اب عوامی راج کی سرحد تک آ گئی ہے۔

اردو ہی نہ صرف قومیت کو فروغ دیتی ہے بلکہ قومی یکجہتی کے ساتھ پورا انصاف کر سکتی ہے اور قومی یکجہتی کے لئے ہمارے عوامی شعور کو تیار کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

سلامت علی مہدی سے ایک انٹرویو

عظیم آباد کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے۔ اسی تاریخی شہر میں ۱۱ر فروری کو اردو کے دو مشہور اور بلند قامت صحافی اور ادیب تشریف لائے اور پٹنہ کے دل میں واقع ہوٹل "نٹراج" میں ٹھہرے (دوسرے بڑے ہوٹلوں کے درمیان آج یہ ہوٹل گم ہو چکا ہے)۔ یہ ادیب و صحافی سلامت علی مہدی اور رحمٰن نیر تھے۔

سب سے پہلے ان دو مشہور شخصیتوں کی آمد کی اطلاع مجھے رضوان احمد (مدیر اعلیٰ "عظیم آباد ایکسپریس" پٹنہ) نے دی اور ان کے ساتھ ہی میں ہوٹل تک گیا۔ سلامت علی مہدی "شبستان" "محراب" "پاکیزہ" اور اپنی ادارت کے کئی رسائل میں میری کتنی ہی تخلیقات شائع کر چکے تھے اس لئے وہ بہت لپک کے ملے —— پھر انھوں نے ہی مجھے رحمٰن نیر صاحب سے ملوایا — رحمٰن نیر بھی بڑے بے تکلف اور یار باش قسم

سلامت صاحب اور رحمٰن نیر صاحب کئی روز پٹنہ میں رہے اور میں ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ روزانہ آٹھ دس گھنٹے کا ساتھ رہتا تھا۔ ہم آپس میں اتنے قریب آگئے اور اس حد تک بے تکلف ہو گئے کہ من و تو کی تخصیص جاتی رہی تھی۔

سلامت صاحب سے قریب آنے کے بعد میں نے سوچا کہ سلامت صاحب سے کیوں نہ انٹرویو لے لوں اور ۱۴ر فروری کو ہوٹل ہی کے کمرہ میں میں نے انٹرویو لے لیا۔ میرے ساتھ "عظیم آباد ایکسپریس" کے مدیر فیضان احمد بھی تھے لیکن وہ درمیان میں ہی اُٹھ کر چلے گئے۔ انٹرویو کی درمیانی مدّت میں البتہ رحمٰن نیر جمے رہے۔ انھوں نے انٹرویو کے درمیان "جراحات" سے اپنی دلچسپی کا اظہار بھی کیا اور دو قسطوں میں نیند بھی پوری کی۔

میں نے سلامت صاحب سے پہلا سوال کیا، آپ کی پیدائش کب ہوئی؟!

سلامت: ۱۶ر جولائی ۱۹۲۸ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوا۔

ہرگانوی: صحافتی زندگی کب سے شروع ہوئی؟

سلامت: ۱۹۴۴ء میں روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ میں رفیع احمد قدوائی مرحوم کے توسط سے صحافت سیکھنے کے لئے وابستہ ہوا اور یہیں سے ابتدا ہوئی۔

ہرگانوی: آپ نے اپنا اخبار بھی تو نکالا تھا؟

سلامت: جی ہاں، پہلے پہل ۱۹۵۵ء میں روزنامہ "ملت" لکھنؤ سے نکالا تھا۔ ڈیڑھ سال چلا — دراصل سیاسی مقدمے میں مجھے ایک سال کی سزا ہو گئی تھی۔ میں جیل چلا گیا تھا، اس لئے اخبار بند ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے پانچ رسالے نکالے جس میں ہفتہ وار بھی تھا۔

ہرگانوی: آپ نے "اعلان" کے نام سے ایک ماہنامہ بھی نکالا تھا؟ میں نے اس کے کئی شمارے دیکھے ہیں۔

سلامت: ہاں! "اعلان" روزنامے کا ماہانہ ایڈیشن تھا۔ ہفتہ وار کا نام "شکایت" تھا۔

ہرگانوی: اردو صحافت کو آپ سے بہت فائدہ پہنچا ہے، لیکن کیا آپ ہندوستان میں اردو رسائل کے مستقبل سے مطمئن ہیں؟

سلامت: اردو کے رسائل امداد طلب نظروں سے حکومت کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں تو یقیناً ان کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔ سرکاری امداد کے بل پر رسائل طویل مدّت تک زندہ نہیں رہ سکتے۔ سرکاریں بدلتی رہتی ہیں اور ان کی پالیسیاں بھی — یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ اچھی چیز ہمیشہ بکتی ہے۔ قوت خرید مہیا نہ ہو۔ اگر اردو کے صحافی اچھے رسائل اور اچھے اخبار نکالیں تو ضرور فروخت ہوگا۔ مواد اور ہر قسم کی خوبصورتی ضروری ہے — پاکستان کے رسائل کو لیجئے، ظاہری خوبصورتی اور ریڈنگ میٹر کے لحاظ سے اچھے ہوتے ہیں اسی لئے وہ فروخت ہوتے ہیں۔ ان کی کھپت ہندوستان میں بھی ہے۔

ہرگانوی: آج کا قاری کس قسم کا مواد پسند کرتا ہے؟

سلامت: آج کے قاری کی کئی قسمیں ہیں — مثلاً فلمی ادب کا قاری۔ خالص ادب کا قاری — سیاسی ادب کا قاری۔ فحش ادب کا قاری۔ جتنے بھی قاری ہیں یہ سب دلچسپ ادب چاہتے ہیں۔ خشک مواد نہیں چاہتے۔ انگریزی کے

ہفتہ وار "السٹریٹڈ ویکلی" کو لیجئے۔ اسے اس لئے پسند کیا جاتا ہے کہ سیاسی ہونے کے باوجود دلچسپ ہوتا ہے۔

ہرگانوی: اُردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کا نظریہ؟

سلامت: میرا خیال ہے کہ آئندہ پچاس برس بعد اردو دنیا کی چند بڑی زبانوں میں ہوگی۔

میں اس غم میں مبتلا نہیں ہوں کہ ہندوستان میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ہندوستان میں آج، تقسیم ہند کے پہلے کی بہ نسبت زیادہ اردو پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ زیادہ کتابوں کی اشاعت ہو رہی ہے اور رسائل نکل رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اردو کو سرکاری حیثیت حاصل نہیں ہے اس لئے اس کی سرکاری اہمیت میں کمی آگئی ہے۔ لیکن یہ عوامی ملکیت ہوتی جا رہی ہے۔

ہرگانوی: میدان سیاست میں آپ کیسے آئے؟ مسلم لیگ کے کینڈیڈیٹ کی حیثیت سے آپ الیکشن میں بھی کھڑے ہوئے تھے، اس سے آپ کو کیا فائدہ پہنچا؟

سلامت: میں سیاست میں زمانہ طفلی سے ہی آگیا تھا۔ بڑا سخت نیشنلسٹ رہا۔ آج بھی ہوں۔ میں مسلم لیگ میں اس لئے شامل ہوا ہوں کہ میں اپنی اس جماعت کے ذریعے مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی تعداد کو دیکھئے۔ اتنے مسلمان بدحال رہے تو ہندوستان کبھی خوش حال نہیں ہو سکے گا۔ سیاست میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ مسلم لیگ میں آنے سے مجھے مالی طور پر سیکڑوں ہزاروں کا نقصان اُٹھانا پڑا اور کئی بار جیل بھی جانا پڑا —

ماہوار کا نقصان ہوا ہے۔ کئی اچھے دوستوں سے تعلقات خراب ہوئے۔

ہرگانوی: کیا ہندوستانی مسلمان متحد ہو سکیں گے؟

سلامت: متحد نہ ہوئے تو تباہ ہو جائیں گے، مسلمان جب تک اس کا احساس نہ کریں گے کہ ان کے متحد ہوئے بغیر ان کی تقدیر کے بند دروازے نہیں کھلیں گے تب تک وہ پریشان رہیں گے۔ اسلام نے مسلمانوں کو جو پیغام دیا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ متحد رہو، لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مسلمان اس پیغام کو بھول رہے ہیں۔ جب جب مسلمان منتشر ہوئے، دشمنوں نے شکست دی، اور جب وہ متحد ہوئے فتح کی منزل تک پہنچے خواہ وہ پانی پت کا میدان ہو، بیت المقدس کی جنگ ہو یا نہر سویز کا معرکہ۔

ہرگانوی: فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لئے آپ کی نظر میں کوئی راستہ؟

سلامت: آبادی کے تناسب سے پولیس کے محکمہ میں مسلمانوں کو بھرتی کیا جائے۔ اب تک یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اصل فساد اس وقت شروع ہوتا ہے جب پولیس موقع پر پہنچتی ہے چونکہ پولیس ایک فرقہ کی ہوتی ہے اس لئے جانب داری سے کام لیتی ہے۔

ہرگانوی: آپ نے دُنیا کے بیشتر ممالک کا سفر کیا ہے، وہاں کے تاثرات؟

سلامت: مجھے سب سے زیادہ اپنا ملک پسند ہے۔ یہاں کے لوگ، تہذیب، بول چال اور یہاں کی زندگی۔ مجھے ساری دنیا میں ہر جگہ ہندوستان نہ ہوتے ہوئے بھی نظر آیا۔ اسی لئے غربت نظر آئی، بے روزگاری نظر آئی بھوک بھی نظر آئی۔ ہمارے ملک میں خواہ مخواہ یورپ اور امریکہ کی ترقیوں کے افسانے مشہور ہیں۔ ایسی ترقی کس کام کی جو انسان کو ترقی کا قیدی بنا دے ——— میں پاکستان، ایران، نیپال، اردن، لبنان، اسرائیل، قبرص، ترکی، عراق، اٹلی، فرانس، انگلینڈ، اور آئرلینڈ دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اس سے زیادہ خوشی یہ سوچ کر ہوتی ہے کہ میں خود اپنا ملک دیکھ چکا ہوں۔ ہندوستان کے ہر صوبے کی سیر کر چکا ہوں۔ لدّاخ کی برفانی وادیوں سے لے کر کنیا کماری کے ساحل تک۔ اور آسام کے گھنے جنگلوں سے لے کر بیکانیر کے ریتیلے میدان تک۔ میرا اپنے ملک کے نوجوانوں کو مشورہ ہے کہ وہ غیر ممالک جانے کی بجائے اپنا ملک دیکھیں جس میں سیکڑوں ملک ہیں، تہذیبیں ہیں، زبانیں ہیں، یہاں ۱۵۴ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر بہار کو لیجئے تو یہاں ساٹھ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہاں سے زیادہ سچے، بھولے، اور نیک انسان مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔

ہرگانوی: آپ نے دُنیا کی بڑی شخصیتوں سے انٹرویو لئے ہیں۔ انٹرویو دیتے وقت لوگوں کے کیا احساسات ہوتے ہیں؟

سلامت: میں نے کچھ لوگوں میں بڑے پن کا احساس پایا۔ کچھ میں خلوص اور کچھ میں جذبۂ تشہیر۔ میں بڑا ان کو سمجھتا ہوں جو مقاصد کے لئے مخلص ہوں اور جو بڑا ہونے کے باوجود خود کو بڑا نہ سمجھیں۔

ہرگانوی: مختلف ادوار کے ادب میں قدر مشترک کا پایا جانا اپنی جگہ تو صحیح ہے لیکن کیا ہر دور کے ادب کی الگ الگ خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں؟

سلامت: ادب معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور معاشرہ بدلتا رہتا ہے۔ تہذیب بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے ادب بھی بدلتا رہتا ہے۔

ہرگانوی: حسن و عشق سے متعلق آپ کا نظریہ؟

سلامت: میرے خیال میں دُنیا کی کوئی شئے بدصورت نہیں ہے ——— ہر وجود خوبصورت ہے۔ سوال ان آنکھوں کا ہے جو خوبصورتی تلاش کر پاتی ہیں یا نہیں۔ میں عشق کے جذبے کو نہیں مانتا۔ عشق کے بہت سے اقسام ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ جس عشق کے بارے میں سوال کر رہے ہیں، میں اس عشق کو نہیں مانتا۔ جسمانی عشق ایک جذبے کی تسکین کا وسیلہ ہے۔ اس کا ایک خوبصورت نام ہے، عنوان ہے۔ جسمانی ملاپ نیچر کی پکار ہے اور بس۔ میں ایک چیز کو خوبصورت کہتا ہوں، آپ بدصورت کہتے ہیں، ایک حبشی کو اپنے ملک کی حبشن خوبصورت نظر آتی ہے۔ ہم اسے بدصورت کہتے ہیں یہی بات ایک آدمی یا سی کے لئے بھی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خلاق عالم نے ہر چیز کو خوبصورت پیدا کیا ہے۔

ہرگانوی: زندگی نے آپ کو کہاں کہاں دھوکے دیئے ہیں؟

سلامت: کسی نے مجھے دھوکہ نہیں دیا۔ میں نے خود دھوکے کھائے ہیں۔ کاروباری دھوکے، سیاسی اور دوستوں سے دھوکے اور جس چیز کو آپ عشق کہتے ہیں اس میں بھی دھوکے کھائے۔ عشق ایک جذبے کی تسکین کا نام ہے جو مستقل ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے فلاں لڑکی سے محبت ہے تو میں مسکرا دیتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ شخص، لفظ محبت کا کیسا خود غرضانہ استعمال کر رہا ہے۔ اگر یہ لڑکی کانی یا لنگڑی ہو جائے تو کیا محبت باقی رہے گی؟ کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں کو ممتاز سے عشق تھا، لیکن اسے کیسے مان لوں جب کہ شاہجہاں کے محل میں دنیا کے ہر ملک کی پانچ ہزار کنیزیں تھیں ——— لیلیٰ مجنوں کی بات کر سکتے ہیں کہ مجنوں نے لیلیٰ سے عشق کیا لیکن میں یہ بتا دوں کہ اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ انار کلی کی طرح یہ بھی کسی شاعر کے دماغ کی اختراع ہے۔ شیریں فرہاد کا قصہ مشہور ہے لیکن شیریں نے فرہاد کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ایران کی ملکہ تھی۔

(رحمٰن بیر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے مسکرا کر سلامت صاحب سے سوال کیا) "یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اگر ان لڑکیوں کے ماں باپ اسے ملا دیتے تو؟"

سلامت: "شادی کر لیتے"۔ (ان کا جواب

اتنا معصوم تھا کہ میں مُسکرانے لگا۔)

(رحمٰن نیّر نے ایک اور دلچسپ سوال کیا)

"پھر یہ تاج محل کیوں بنوایا؟"

سلامت: اپنی یادشاہت کی نمائش کے لئے۔

رحمٰن نیّر: لیکن دوسروں کو کیوں نہیں فوقیت دی؟۔

(رحمٰن نیّر اس موضوع پر اپنی دلچسپی چھپا نہ سکے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے ذہن میں عرصے سے کُرید رہی ہو اور آج اس کرید کو ختم کر دینا چاہتے ہوں ——— سلامت صاحب پر ایک رات قبل "شراج ہوٹل" کے اسی کمرہ میں دل کا دورہ پڑا تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ تھک گئے تھے۔ انھوں نے لیٹنے کی اجازت چاہی اور تکیہ پر سر رکھ کر ایک لمحہ کے لئے مسکراتے رہے، پھر رحمٰن صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولے۔)

سلامت: خاص قربت کی وجہ سے۔ ممتاز محل شاہجہاں کو بے حد پسند تھی لیکن اس کی موت چودھویں بچے کی پیدائش کے وقت (زچگی کی حالت میں) ہوئی۔ شاہجہاں نے اسے بچہ پیدا کرنے کی مشین بنا دیا تھا۔ وہ برہانپور میں حالتِ سفر میں مری۔ کیا اسی کا نام محبت ہے؟ عشق تھا تو سجا کر رکھتا ہر وقت۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہوئی اور چالیس سال کی عمر میں مر گئی۔ سچ پوچھئے تو وہ ٹھیک سے ملکہ بھی بن نہ پائی ہوگی۔ کپڑے تک ٹھیک سے پہن نہ پائی ہوگی ——— اصل میں محبت کی نیو جہانگیر نے ڈالی (نورجہاں سے) لیکن اس میں بھی جنس کا جذبہ کارفرما تھا کیونکہ اس کی چھ بیویاں تھیں پھر بھی وہ غم زدہ بیوہ کے پیچھے پڑا، اس کے شوہر کا وہ قاتل تھا۔ اسے بلا کر اپنی ماں کے ساتھ لال قلعہ میں رکھا تاکہ ہر وقت نظر کے سامنے رہے۔ جب وہ مل گئی تو سارا جذبہ ختم ہو گیا۔ اورنگ زیب نے بھی زین آبادی سے عشق کیا، لیکن جیسے ہی نکاح میں آئی۔ سارا جذبہ ختم ہو گیا۔ عورت کو تسخیر کرنے کا جذبہ عشق ہوتا ہے۔ ملکہ بن گئی، سب ختم ——— حقیقت تو یہ ہے کہ سچا عشق انسان خدا سے کرتا ہے، ماں سے کرتا ہے، ماں بیٹے سے کرتی ہے۔ اس عشق کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ کلیاں خود بخود کھلتی ہیں، پھول خود بخود بنتا ہے اس کے لئے کوئی محرک نہیں ہوتا۔ ایک ماں اپنے کوڑھی بچے سے بھی اتنا ہی محبت کرتی ہے جتنا صحت مند اولاد سے۔ اگر میری بیوی کو کوڑھ ہو جائے تو میں اس کے کمرے میں بھی نہیں جاؤں گا۔ اسے چھوؤں گا بھی نہیں۔ لیکن ماں اس کے کپڑے تک دھوئے گی ——— اگر آپ کو عشق سے بھرپور آنکھیں دیکھنا ہوں تو اس ماں کی طرف دیکھئے جب وہ اپنی اولاد کی طرف دیکھ رہی ہو۔ میں اس لئے اپنی ماں سے عشق کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میری زندگی میں میری ماں کا عشق نہ ہوتا تو میں سلامت علی مہدی نہ ہوتا۔

ایک دفعہ میری ماں نے مجھ سے کہا کہ ———

"ساری عمر تمھارے باپ سے کہتی رہی کہ مجھے سونے کی چوڑیاں بنوا دو لیکن انھوں نے نہیں بنوائیں، تم بنوا دو" ——— میں نے اپنی ماں کی سونے کی چوڑیاں بنوانے کی خاطر چند بہترین ناول لکھے تاکہ مجھے بہتر سے بہتر معاوضہ ملے اور میں ماں کی چوڑیاں بنوا دوں۔ میری ماں کو چوڑیاں مل گئیں اور میں مصنف بن گیا ——— میرا یقین ہے کہ خدا پر یقین رکھنے والوں کی طرح ماں سے محبت کرنے والے، احترام کرنے والے، ماں کی بات ماننے والے، ماں کو خوش رکھنے والے اپنی زندگی میں کبھی بھی آنسو نہیں بہاتے۔ وہ ترقی ضرور کرتے ہیں، وہ کامیاب ضرور ہوتے ہیں۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ یہ آپ جانتے ہیں۔ ماں سے محبت کرنے والوں کی اولاد بھی ان سے محبت کرتی ہے۔ ذرا اپنی ماں کے کلیجے سے لگ کر دیکھئے، پھر مجھے بتائیے کہ کیا یہ سکون کسی اور کے ساتھ میں ملا ہے؟ کم از کم میرا تجربہ یہی ہے ——— جب میں پہلی بار سیاست میں آنے کی وجہ سے گرفتار ہوا تو ماں نے مجھ سے جیل میں کہلوایا تھا کہ میں معافی نہ مانگوں۔ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ دودھ نہیں بخشیں گی۔ تب سے میں ہمیشہ کے لئے نڈر اور بہادر ہو گیا حالانکہ میری ماں چھ ماہ تک روتی رہیں اور مجھے لکھنؤ سے نینی جیل الہ آباد بریانی پکا پکا کر بھجواتی رہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ میں بریانی شوق سے کھاتا ہوں ——— میں نے جب اسمبلی کا الیکشن لڑا تو میری ماں کو الیکشن سے زیادہ اس بات کی فکر لگی رہی کہ سلامت اگر ہار گیا تو دل کا یہ مریض صدمہ برداشت کر سکے گا یا نہیں۔ وہ اس لئے دُعا مانگتی رہیں کہ میں جیت جاؤں ورنہ انھیں کیا پتہ کہ سیاست کیا ہے، اسمبلی کیا ہے اور الیکشن کیا ہے ——— یہاں میں اپنی ماں کی تعریف نہیں کر رہا۔ ہر ماں ایسی ہی ہوتی ہے۔ دُنیا کی ہر چیز بدل جاتی ہے لیکن ماں نہیں بدلتی۔ میں نے پیرس میں بے پناہ خوبصورت اور بے پناہ فیشن زدہ ماں کو، بچے کو گود میں لئے دیکھا۔ ناک پونچھتے اور پیشاب کراتے دیکھا۔

رحمٰن نیّر: عورتوں کی یہ بھی عجیب و غریب خواہش ہے کہ وہ بچہ پیدا کرے گی، چاہے وہ ختم ہی کیوں نہ ہو جائے۔

سلامت: ہاں۔

ہرگانوی: آپ اپنی زندگی میں کس سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں؟

سلامت: اپنے باپ سے۔ میں نے اپنے باپ کو بے حد محنتی پایا اور مجھے ان سے زندگی کا یہ راز ملا کہ محنت کرنے والے کبھی پریشان نہیں ہوتے۔ میں نے اپنے باپ کو اپنی ماں سے بے حد محبت کرتے پایا۔ میں نے بچپن میں دیکھا کہ میرا باپ میری ماں کے بغیر کھانا نہیں کھاتا۔ اور اس طرح میں نے ماں سے محبت کرنے کا سبق سیکھا۔ میں نے ان کو علم سے محبت کرتے دیکھا، ان کو مصیبت کا بہادری سے مقابلہ کرتے دیکھا۔ میں بھی بہادر ہوں۔ مجھ پر صرف میرے باپ کی زندگی کی چھاپ ہے۔ پرانے لوگ جنھوں نے میرے باپ کو دیکھا ہے اور جو اب بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر کہتے ہیں کہ سلامت علی مہدی بالکل مہدی حسن ہے۔ میرے باپ کی مجھ پر کتنی چھاپ ہے ——

اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ مہدی میرا تخلص نہیں ہے۔ بلکہ میں نے اپنے باپ کا نام اپنے نام کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ جب کوئی مجھے سلامت علی مہدی کہتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ مجھے بھی پکارتا ہے اور میرے باپ کو بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح میرا باپ ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے ۔۔ مجھے اپنے باپ سے اتنی محبت ہے کہ ان کی قبر کے پاس میں نے اپنی قبر کی جگہ مقرر کی ہے اور مصنوعی قبر بنوالی ہے اس میں جو بھروا دیا ہے۔"

ہرگانوی: جو؟ گیہوں کیوں نہیں بھروایا جبکہ گیہوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

سلامت: گیہوں کی تاریخ یقیناً بہت پرانی ہے۔ مصر میں جو اہرام نکلے ہیں اس کے ساتھ گیہوں بھی نکلے ہیں۔ لیکن اس گیہوں میں قوت نمو نہیں۔ گیہوں بہت سخت ملّہ ہے۔ یہ عجیب بات ہے اور غور طلب بھی کہ گیہوں دُنیا کے ہر مُلک میں پایا جاتا ہے۔ اور دُنیا کا ہر بڑے سے بڑا آدمی اسے کھاتا ہے۔ چاہے وہ روٹی کی شکل میں ہو یا سلائس کی شکل میں ۔۔۔ بہر حال میں نے جو بھروایا ہے۔

ہرگانوی: آپ کی زندگی کا کوئی غیر معمولی واقعہ جسے آپ فراموش نہ کرسکے ہوں۔

ایسا تو کوئی نہیں ہے۔ ویسے ایک واقعہ ہے۔ میں شیر کا شکار کھیل رہا تھا۔ تب مجھے خبر ملی کہ باپ کا انتقال ہو گیا ۔۔ میں لکھنؤ پہنچا تو وہ دفن ہو چکے تھے۔ اس حادثہ کو میں فراموش نہیں کر سکتا۔

ہرگانوی: شکار کا شوق کب سے ہوا؟

سلامت: بچپن میں والد نے ائیر گن خرید دیا تھا۔ تبھی سے شوق بڑھا۔ ویسے شکار ایک بے کار شوق ہے۔ یہ مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک جانور مر رہا ہے اور ہم خوش ہو رہے ہیں ۔۔ مجھے جب سے یہ احساس ہوا میں نے شکار کرنا چھوڑ دیا۔ میرے شوق کی شاید ایک وجہ یہ ہو کہ میں نسلاً منگول ہوں اور منگولوں کا پیشہ ہی شکار تھا۔ وہ شکار کھیل کر اپنی غذا فراہم کرتے تھے۔

ہرگانوی: اب آپ کو کس چیز سے شوق ہے؟

سلامت: مجھے سب سے زیادہ شوق تاریخ سے ہے، تاریخی عمارتیں دیکھنے سے ہے اور ان بستیوں کے دیکھنے کا ہے جہاں نئی تہذیب پہنچی نہیں ہے۔ اکثر جب میرے پاس فالتو پیسے ہوتے ہیں تو میں ہمالیہ کے دور دراز علاقے کے دیہاتوں میں پہنچ جاتا ہوں اور وہاں دس بارہ دن رہتا ہوں۔ ایک زمانے میں مدھیہ پردیش کے چھتیس گڑھ علاقے میں بہت جاتا تھا اور وہاں کے قبائلی دیہاتیوں میں بیٹھتا تھا ۔۔۔ مجھے وہ لوگ بہت پسند آتے ہیں۔ ان کے جھونپڑوں میں رہ کر مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ اکثر میں یہ سوچتا ہوں کہ آسمان سب جگہ ہے، لیکن ان دور افتادہ بستیوں میں رات کے وقت آسمان اتنا خوبصورت اور پُرسکون کیوں نظر آتا ہے؟ شاید ہماری تہذیبی بلندی نے آسمان کی خوبصورتی چھین لی ہے۔

ہرگانوی: ہمارے یہاں تہذیبیں بھی تو عجیب و غریب ہیں؟

سلامت: ہاں، ہمارے ملک کی تہذیبیں بھی عجیب ہیں۔ کیرالا میں عورتیں مرد کے گھر رات لے کر جاتی ہیں اور مرد روتے ہوئے گھر سے 'بدا' ہوتے ہیں اور اپنی سسرال میں رہتے ہیں۔ دہرہ دون کے تحصیل چکراتا اور جان سار باہر کے علاقے میں ایک عورت کے کئی مرد ہوتے ہیں۔ یہ مرد آپس میں بھائی ہوتے ہیں۔ لداخ میں اور ہمالیہ دور پہاڑی علاقے میں ابھی حال تک باقاعدہ رائج تھا کہ مہمان کے پاس میزبان اپنی بیوی کو تواضع میں رات کے وقت بھیجتے تھے۔ اب یہ طریقہ ختم ہو رہا ہے۔ آسام میں عورتیں سارا کام کرتی ہیں اور مرد گھر بیٹھتے ہیں ۔۔۔ چھتیس گڑھ کے علاقہ گھیٹو میں کنوارے لڑکے لڑکیاں گاؤں سے ایک علیحدہ مکان میں رات کے وقت ننگے سوتے ہیں۔ ان کی نگرانی کے لئے کوئی بزرگ نہیں ہوتا۔ وہیں سے وہ آپس میں جوڑا یا ساتھی چن لیتے ہیں۔ اور بعد میں الگ اپنا جھونپڑہ بناتے ہیں۔

(رحمٰن نیر ایک بار پھر سوتے سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے پوچھا:)

رحمٰن نیر: اگر ان کی شوٹنگ کی جائے تو کیا سنسر اسے کاٹ دے گی؟

سلامت: نہیں کاٹ سکتی ۔۔۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض قبیلوں میں عورتوں کو روزی فراہم کرتے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ جفاکشی صحیح معنوں میں عورتوں کے حصّے کی چیز ہے۔ آپ دیکھئے کہ ایگل یعنی عقاب میں نر صرف اُڑتا ہے، مادہ عقاب شکار کرتی ہے اور اپنے نر کو کھلاتی ہے۔ شیرنی اپنے لئے اور بچوں کے لئے شکار کھیلتی ہے۔ شیر صرف اپنے لئے شکار کرتا ہے۔ گھر کی مرغی اپنے چوزوں کو لے کر گھومتی ہے۔ مرغ صرف جفتی کرتا ہے۔

رحمٰن نیر: نہیں داداگیری کرتا ہے۔

(اس ریمارک پر ہم تینوں ہنستے ہیں)

ہرگانوی: بہار کی تاریخ کے متعلق آپ کی واقفیت کہاں تک ہے؟

سلامت: بہار کی تاریخ دراصل ہندوستان کی تاریخ ہے۔ اس لئے جو شخص ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہے، وہ بہار کی تاریخ سے بھی واقف ہے۔ ہندوستان کی تاریخ پاٹلی پترا اور نالندہ کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے۔ بہار ہمیشہ سے تاریخی واقعات کی آماجگاہ رہا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں بہار موجود رہا ہے۔ خواہ وہ یونانیوں اور ہندوستانیوں کی جنگ ہو، مسلمانوں کا دورِ حکومت ہو، انگریزوں کے قبضے کی داستان ہو، یا تحریک آزادی کی کہانی ہو۔ بہار ہر جگہ موجود رہا ہے اور صفحۂ اوّل میں موجود رہا ہے۔ کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ بکسر کی جنگ نے انگریزوں کے لئے شمالی ہندوستان کے دروازے نہیں کھول دیئے۔ کیا اس کی تردید کی جا سکتی ہے کہ گاندھی جی کی تحریک

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

مظہر امام — ایک خوش نصیب شاعر

مظہر امام ان خوش نصیب شاعروں میں ہیں جن کو شہرت و عزت چراغ لے کر ڈھونڈنے نکلتی ہیں۔ میں تقریباً ۱۹۵۰ء سے ادبی دنیا میں ہوں میں نے اتنے لمبے عرصہ میں مظہر امام کی شہرت کا آفتاب ایک لمحہ کے لئے بھی ماند پڑتے نہیں دیکھا۔ بہت سے شعرا شروع میں خوب لکھتے ہیں شہرت حاصل کرتے ہیں اور تھک کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان کے افکار و خیالات کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ زمانہ انہیں فراموش کر دیتا ہے۔ مگر مظہر امام مسلسل لکھتے آ رہے ہیں۔ ان کی ادبی تخلیقات ہند و پاک کے معیاری رسالوں میں پے بہ پے شائع ہوتی آ رہی ہیں۔ اور آج سچائی تو یہ ہے کہ وہ اپنے ہمعصروں میں نہایت ممتاز اور مستحکم حیثیت کے مالک ہیں۔ فن شعر سے ان کی واقفیت گہری ہے۔ زبان و بیان پر غیر معمولی گرفت حاصل ہے۔ نظم و غزل دونوں میں انھوں نے مقام حاصل کیا ہے۔ کچھ نئے شعری تجربے کئے ہیں۔ آزاد غزل کا سب سے پہلا تجربہ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے ہی کیا۔ اس وقت وہ اپنے وطن دربھنگہ میں مقیم تھے اور وہ زمانہ ان کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد انہوں نے ماہنامہ "نئی کرن" کا بھی اجرا کیا تھا جو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کچھ دنوں تک جاری رہا۔ ترقی پسند تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے مظہر امام جیل بھی گئے۔ میں نے ۱۹۵۲ء میں چاٹگام میں سنا تھا کہ وہ ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے ابھر رہے ہیں۔ اس کے بعد جب میں کلکتہ آیا تو اس وقت بھی ان کی ادبی پوزیشن بہت اچھی تھی۔ ان کی ذاتی صلاحیت، مزاج کی شگفتگی اور نفاست، ان کے وسیع اخلاق اور مہذب انداز نے کلکتہ میں ان کو بے حد مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اساتذہ، طلبہ، شعرا، دانشور اور اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے فنکار ان کی طرف کھنچے پڑتے تھے۔ قدرت نے ان کو جیسی دولت عطا کرنے میں تو فیاضی دکھائی ہی تھی اس کے ساتھ ظاہری طبیعت کا حسن بخشنے میں بھی اس نے کسی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ اس ظاہری اور باطنی حسن نے ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر خاصے بڑے پیمانہ پر کی اور اس میں ایک خاص قسم کی مقناطیسیت بھر دی۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اور میں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں میں نے ان کو بہت زیادہ مخلص پایا۔ وہ متانت، سنجیدگی اور تہذیب کا نمونہ ہیں۔ اردو کے مشہور و یکتائے زمانہ ادیب حضرت ل۔ احمد اکبرآبادی انہیں "نوجوان بزرگ" کہا کرتے تھے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے مظہر امام کا ادبی سفر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شروع ہوا۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "زخم تمنا" ترقی پسند افکار و خیالات پر مشتمل نظموں اور غزلوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس مجموعہ کی ایک طویل خوبصورت اور مشہور نظم "خواب سچے بھی ہوتے ہیں" کی تخلیق نے مظہر امام کو ترقی پسند شعرا کی صف میں بہت جلد نمایاں کر دیا اور ترقی پسندوں کے قافلہ سالار سجاد ظہیر نے ممتاز ترقی پسند شاعر پرویز شاہدی کے پاس خصوصیت کے ساتھ خط لکھ کر اور تار بھیج کر مظہر امام کو اردو کانفرنس اور ہند و پاک کے چند مشاعروں میں شرکت کے لئے مدعو کیا۔ اس زمانہ میں اس نوعیت کے مشاعروں میں شرکت کرنا اقلیم شعر و ادب کی فرمانروائی چند بڑے ترقی پسندوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ترقی پسندوں میں بھی بہت کم شعرا اتنے خوش نصیب تھے جو اس دور میں آسمان شہرت پر چمک پائے تھے۔ مظہر امام کا کمال اور ان کی خوش نصیبی یہ ہے کہ وہ اس دور میں بھی شہرت کے معاملہ میں بڑے بڑوں سے پیچھے نہ رہے اور مزہ تو یہ ہے کہ جب ترقی پسندی کا سکہ بند دور ماند پڑنے لگا اور جدیدیت ایک رجحان بن کر ہند و پاک کے ادبی منظر پر نمایاں ہوئی تو اس وقت بھی مظہر امام شہرت کے معاملہ میں کسی جدید شاعر سے پیچھے نہ رہے۔ انہوں نے ترقی پسندی سے لے کر جدیدیت تک ادبی مقابلہ کی دوڑ میں کافی دم خم کا ثبوت دیا۔ آج بھی جب کہ جدیدیت روبہ انحطاط ہوتی جا رہی ہے اور ادب کی نئی آواز تیسری آواز کے نام سے ابھر رہی ہے میں سمجھتا ہوں مظہر امام اپنی تازہ کاری و تازہ دمی کے باعث ادب کی تیسری آواز کے شاندار دور میں بھی داخل ہوں گے اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوائیں گے۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو خود ان کی ذاتی صلاحیت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ جدید شاعری کے دور میں بھی مہمل گوئی سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ جب جدیدیت نے پر پرزے نکالنے اس وقت تین طرح کے فنکار جدیدیت کے زیر دام آئے۔ پہلی قسم کے فن کار وہ تھے جو ترقی پسندی کی شکست و ریخت کے کام پر مامور تھے۔ دوسری قسم کے فن کار ایسے تھے جو ترقی پسندوں کی سخت گیری، ان کی فکر و نظر کے کٹرپن اور ادعائیت سے تنگ آ کر اپنی آزاد خیالی کے تحت کھلی فضا میں سانس لینے کی خاطر جدیدیت کے دھارے میں شامل ہو گئے تھے۔ تیسری قسم کے وہ بے شمار بندی اور پرانے فن کار تھے جنہوں نے محض رسالے میں چھپنے کی خاطر جدیدیت کا سہارا لیا اور اس کو سوچے سمجھے بغیر سکہ رائج الوقت سمجھ کر اختیار کر لیا۔ پہلی اور تیسری قسم کے فنکاروں کی ادبی تخلیقات زیادہ تر بے سر و پا، لغو اور مہمل و مبہم ثابت ہوئیں۔ ان تخلیقات نے زندگی کی کسی سمت کا پتہ ہی نہیں دیا ان کے لئے ہندی کا ایک لفظ "دشاہین" بہت ہی موزوں اور مناسب لفظ ہے۔ واقعہ ہے کہ یہ ساری تخلیقات "دشاہین" ہیں ان کا اول و آخر مقصد بے سمتی ہے[1] ان کو شروع تا آخر پڑھ جائیے مگر ان میں ہمارے سماج اور ہماری زندگی کی کوئی جھلک نہیں ملے گی۔ نہ ہی ان کے اندر کسی قسم کے طبقاتی کردار کی عکاسی ملے گی۔ ان تخلیقات نے ذہنوں پر سوائے کنفیوژن پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ دوسری قسم کے وہ فن کار جو ترقی پسندی کے دھارے سے کٹ کر علیحدہ ہوئے تھے ان کی تخلیقات سے آج بھی موجودہ صنعتی تمدن کی گھٹن اور جبر معاشرہ کے خلاف ایک دبی دبی سی چنگاری یا صدائے احتجاج نکلتی رہتی ہے۔ میں مظہر امام کا شمار انہیں دوسری قسم کے فن کاروں میں کرتا ہوں۔ اختر الایمان وغیرہ کے متعلق بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے جدیدیت کے زیر اثر اپنی فکر و نظر کو گونگا بہرا اور دشاہین بنانے کی بجائے اس کو تاب مقاومت بخشی اور اس سے مزاحمت کا وہ کام لیا جس کی توقع ایک ایماندار اور صاحب ضمیر فن کار سے بجا طور پر کی جاتی ہے۔ میں یہ لکھتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ مظہر امام نے بھی ادبی و فنی دیانتداری سے کبھی روگردانی نہیں کی اور

---

[1] بے جہتی

اور وہ جدیدیت کے چوکھٹے میں رہ کر موجودہ دور کی گھٹن کی عکاسی کرنے میں اپنا زورِ تخلیق صرف کرتے رہے اتنا ہی کافی نہیں بلکہ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "رشتہ گونگے سفر کا" میں ایک نظم ہے "اکھڑتے خیموں کا درد"۔ اس میں ایک خوبصورت مستقبل کی بشارت ہے۔ ایک حسین زندگی کی نشاندہی اور اُمید ہے:۔

جو اپنی کشتی پہ بچ رہے گا
وہی علیہ السلام ہوگا

یہ اس نظم کا نقطۂ عروج ہے۔ یہ دو مصرعے اُمید و یقینِ فردا کی روشنی کا پتہ دیتے ہیں۔ شاعر کو اس کا یقین ہے کہ زندگی اپنے دشمنوں سے نبرد آزمائی کرنے کے بعد فاتح و کامران ہو کر ضرور سرخرو ہوگی۔ مجھے یہ نظم بہت پسند ہے۔ اس میں وہ سارے زلزلے، جھٹکے، طوفان اور طبقاتی گھٹن موجود ہیں جو بورژوا نظام کی دین ہیں۔ اس نظم میں مزاحمت و مقاومت کی لَے بھی سنی جا سکتی ہے۔ مظہر امام نے اپنی خبر اور خطوط میں بھی اس امر کی نشاندہی اور وضاحت کی ہے کہ ان کی شاعری موجودہ دور کی تھکن، گھٹن، بے اطمینانی، نا آسودگی اور حزن و یاس کی تصویر پیش کرتی ہے۔ اگر جدید شاعری یہی ہے تو ترقی پسندوں کو چاہیئے کہ وہ بڑھ کر اسے گلے لگائیں۔ ایسی جدید شاعری کو میں مبارک اور کارآمد شاعری سمجھتا ہوں۔ وہ جدیدیت جو اپنے دور کے اضمحلال کو پیش کرتی ہو ترقی پسند شاعری کی توسیع نہیں تو اور کیا ہے؟

بورژوا نظام کے سائے میں جس صنعتی تہذیب نے فروغ پایا ہے وہ بڑی ظالم اور بے رحم ہے۔ اس نے تمام انسانی رشتوں اور قدروں کا بے دردی سے قتل کر ڈالا ہے۔ فرد کی شخصیت کچل کر رکھ دی ہے۔ انسان اندر سے خود کو غیر محفوظیت کا شکار پاتا ہے۔ بورژوا نظام میں حسین فردا کی کوئی گارنٹی نہیں ملتی۔ جیسے جیسے یہ منحوس اور انسان دشمن تمدن پھیلتا اور ہوتا چلا جا رہا ہے ویسے ویسے انسان کے سینے میں پھانس سی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے اندر کا اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ اس کی گھٹن بڑھ رہی ہے۔ موجودہ بورژوا نظام کی انہی باتوں نے بے سکونی و بے اطمینانی اور ایک عجیب و غریب عام احساس پیدا کیا ہے۔ چونکہ فن کار حساس اور باشعور ہوتا ہے مزید برآں

لفظوں کے ذریعہ اس احساس گھٹن اور ان دیکھے غم کے اظہار پر قادر ہوتا ہے اس لئے اس کی تخلیقات میں معاشرہ کی دردناک تصویر اُبھر آتی ہے۔ یہ تصاویر مظہر امام کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مظہر امام نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فراموش نہیں کیا کہ زندگی اور فن کا رشتہ کتنا گہرا اور مستحکم ہے۔ نیز یہ کہ فن زندگی کا نقیب ہی نہیں اس کا محافظ و نگہبان بھی ہے۔ وہ اس کو حریفوں سے رزم و پیکار کا حوصلہ بخشتا ہے اور فاتح و کامران بنا کر اس کے لئے آرام دہ خلوتیں آراستہ کرتا ہے۔

ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "رشتہ گونگے سفر کا" کے کچھ اشعار پیش ہیں جن سے ثابت ہے کہ انھوں نے جدید دور مہمل گوئی میں بھی کتنی روشن اور زندگی سے بھر پور شاعری کی ہے۔ یہ اشعار جدیدیت کے رائج تصورات کی مطلق نفی کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:۔

میں نے ہی ماضی کے مرقد پر جلائے ہیں چراغ
میں مجاورِ حال کا ہوں حجرۂ فردا میں ہوں
بد دعا کس لمحۂ حاضر کی ہے مجھ پر امام
ہوں صدائے عصر لیکن گنبدِ فردا میں ہوں
ساحلوں پر مری تصویر بنانے والو!
بیچ دریا میں بھی اک بار ابھارو مجھ کو
کئی دنوں سے ترے شہر میں یہ چرچا ہے
کوئی مسیح فلک سے اُترنے والا ہے
اسی اُمید پہ اربابِ شہر زندہ ہیں
کہ اس پہاڑ سے آگے بہت اُجالا ہے
سنا ہے موت نے کل رات خودکشی کر لی
نئے مریض سے کہہ دو شگون اچھا ہے
کل تلک شور تھا محفل میں کہ ہم اپنے ہیں
آج آواز تو دو مجھ کو، کہاں ہو یارو
بے تعلق تو نہ تھے اتنے سحر سے پہلے
چاند ڈوبا تو یہاں ہو نہ وہاں ہو یارو
آؤ توڑیں تو کسی طرح سکوتِ امروز
نغمہ دو جس کہ فردا کی فغاں ہو یارو
رتجگو کے وہ ساتھی کس جہاں میں بستے ہیں
کیا ہمیں تک آئے گی صبح کی کرن تنہا؟
اپنے رستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں
زندگی! میری طرف دیکھ کہ میں آ رہا ہوں

ان اشعار میں جو فکر ہے ان کی پرورش و پرداخت جدیدیت نے کی ہے یا ترقی پسندی نے یہ چھپائے نہیں چھپتی حالانکہ یہ اشعار اس دور کے ہیں جب مظہر امام ترقی پسندی کے لٹریچر سے تنگ آ کر اور اکتا کر صحت مند جدیدیت کی فضا میں سانس لینے آئے تھے۔ اس وقت ان کی آزاد خیالی ان کے ہمرکاب تھی۔ آج بھی ہے۔ گر یہاں بھی آئے تو ان کے احساسات نے وہی شمعیں فروزاں کرنی شروع کیں جن کی روشنی موجودہ معاشرہ کی المناک تاریکی کو مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ ایک خوش آئند علامت ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں یہاں ڈاکٹر وحید اختر کی یہ بات کافی وزنی اور ٹھوس معلوم ہوتی ہے کہ جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع ہے۔ میرے خیال میں بھی جدیدیت واقعی ترقی پسندی کی توسیع ہے مگر کون سی جدیدیت؟ وہ جدیدیت جو صحت مند فکری عناصر سے معمور ہے اور جس کے تحت مزاحمتی ادب کی توسیع سمجھ کر اختیار کیا اور برتا ہے۔ جدیدیت کے کچھ علمبردار لاکھ شور و غل مچائیں اور جدیدیت کو دِشاہین بنانے کی ہزار سعی کریں لیکن جو سچا اور مخلص فنکار ہوگا وہ جو بھی تخلیقِ فن کرے گا اس کا مقصد زندگی کی حفاظت مدافعت، آراستگی اور انسانیت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ سچے فن کاروں کی تخلیقات سمت اور منزل دونوں کا پتہ دیتی ہیں۔ ان میں علاجِ گردشِ ایام چھپا ہوتا ہے سو وہ بے سمت اور بے صدا ہرگز نہیں ہوتیں۔ ان کا کام مرض کی تشخیص کرنے کے ساتھ نسخے لکھنا اور دوائیں دینا بھی ہے۔

آخر میں چند باتیں کشمیر کی غزلوں کے متعلق کہوں گا اور ان سے قبل "رشتہ گونگے سفر کا" کے چند شعر پیش کروں گا جن میں طبقاتی گھٹن کا شدید احساس پنہاں ہے ساتھ ہی ساتھ مزاحمتی رنگ و آہنگ بھی:۔

کسی تالاب میں لہریں ہی بناتے، گھنٹے
وہ بھی دشت میں ہم ہاتھ میں کنکر بھی نہیں
اُکتا گئے ہیں لوگ فسانہ کہا نہ جائے
کس سمت جا رہا ہے زمانہ کہا نہ جائے
آنکھیں اُفق پہ سنگ کی صورت اٹک گئیں
شب ہو گی کب سحر کا نشانہ کہا نہ جائے
درد کا بھولا بھالا چہرہ جاگا سا کچھ سویا سا
کیا بتلاؤں میں نے کیا کیا دیکھا آدھی رات گئے
ہے غم کی رات تیز کریں گردشِ سبو
اب کے نچوڑنا ہے کڑے وقت کا لہو

مظہر امام کی شخصیت

ظہیر ناشاد دربھنگوی

مظہر امام موجودہ دنیائے شعر و ادب کی ایک تہہ دار اور توانا شخصیت کا نام ہے۔ خوش رو، خوش خلق، خوش لباس اور خوش قامت پیکر خاکی کا دوسرا نام مظہر امام ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد اردو ادب میں جو چند قابل احترام شخصیتیں ابھری ہیں ان میں ایک نام مظہر امام ہے۔ مظہر امام کی پیدائش ۵ر مارچ ۱۹۳۰ء کو دربھنگہ شہر کے ایک رئیس خاندان میں ہوئی۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم کا زینہ طے کرنے کے بعد انھوں نے انگریزی اور دوسرے مضامین کی تعلیم کے اسکول میں داخلہ لیا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کے امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ مظہر امام اپنے وقت کے ذہین اور سنجیدہ طلبا میں شمار کئے جاتے تھے۔ اسکول اور کالج کی ادبی تحریک میں ہمیشہ پیش پیش رہا کرتے تھے اور کالج کے زمانے میں وہ ہر ایک وقت "بزم اردو" اور "بزم فلسفہ" کے سکریٹری رہے۔ امام کی زندگی کا قیمتی حصہ متھلادیس کی رنگین و دلفریب، دلکش و دلفزا اور پیار محبت سے بھرپور نشیلی فضا میں گذرا ہے۔ اس وقت متھلادیس کی فضا میں مستقل کے شہرۂ آفاق شاعر ودیاپتی کے گیتوں سے براہ راست متاثر ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ میری داستانوں میں "بجز حکایت مہر و وفا" کچھ اور بات نہ ہو۔

مظہر امام نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے گرد و پیش فرسودہ مذہبی روایات کا جال بچھا ہوا تھا۔ دربھنگہ شہر پرانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ مانا جاتا تھا۔ اس زمانے میں عربی اور فارسی کی تعلیم باعث عزت و شہرت سمجھی جاتی تھی۔ ملک بھر میں فارسی اور عربی دانوں کی اجارہ داری تھی۔ مولانا عبدالعلیم آسی، نور اصلاحی، مالک رحمانی، مولانا حافظ [illegible] شکری وغیرہ کی علمی و ادبی شہرت کا کافی چرچا تھا۔ انھیں بزرگوں کی صحبتوں سے فیضیاب ہوسکے۔ اصلاح [illegible] کے [illegible] میں مصروف عمل ہو گئے۔

مظہر امام ادبی شہرت کی ابتدا اور اصل [illegible] دراصل دربھنگہ سے شروع ہوتی ہے۔ منظر شہاب ان کے رفیق خاص تھے اور انہیں دونوں صاحبان کی کوششوں سے دربھنگہ میں ۱۹۴۳ء-۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی۔ اب حافظہ ساتھ نہیں دے رہا ہے کہ حسن امام درد وغیرہ کے علاوہ اس تحریک کے ابتدائی دور میں اور کون سے حضرات تھے۔ اس دور میں مناسب رہبری اور ماحول نہ ملنے کی وجہ سے دربھنگہ کے ذی استعداد اور ہونہار نوجوان گمراہی کے شکار بنتے ہوئے تھے۔ مظہر امام نے اپنی غیر معمولی صلاحیت، استعداد اور خدا قدی کے بل بوتے پر کالج کے ذہین طلبا کی نمائندگی کا بیڑا اٹھایا اور دربھنگہ (شمالی بہار) سے ایک نئی زندگی، ایک نئے مقصد اور نئی منزل کی نشاندہی کا اعلان کیا۔ مظہر امام کی سرپرستی میں ہر ماہ پابندی کے ساتھ انجمن کی نشست ہوا کرتی تھی۔ انجمن کی کارروائی کا شہر کے علاوہ قرب و جوار کے گاؤں میں بھی چرچا شروع ہو چکا تھا اور دور دور سے نوجوان سمٹ کر اس پلیٹ فارم پر جوق در جوق جمع ہونے لگے تھے۔ تنگ نظر اور قدامت پرست ترقی پسند تحریک کی ہردلعزیزی اور روزافزوں مقبولیت کو دیکھ کر اس کے خلاف نفرت کا بیج بونے لگے اور اس تحریک سے وابستہ افراد کو ملحد، کافر اور بے دین کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مظہر امام کو خاص طور سے لعن طعن کا نشانہ بنایا گیا۔ اور ایک عرصہ تک مذہبی حلقے میں یہ بحث چھڑی رہی کہ ترقی پسند تحریک کے پیشوا مظہر امام کو مسلمانوں کی جماعت میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ اس بحث کو طول دینے میں زیادہ تر جماعت اسلامی سے متعلق حضرات تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ارباب اقتدار نے کمیونسٹ نظریہ کے ہمنوا ہونے کے ناطے مظہر امام کو جیل کی چہار دیواری کے اندر دھکیل دیا۔ اور ان کے جیل جانے کے بعد ہی انجمن کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

مظہر امام اپنی ادبی زندگی کی ابتدا ہی سے اپنے ہمعصروں میں منفرد شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ امام اردو کے ان چند خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کو زمانہ نے ہمیشہ ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور ہر محفل شعر و سخن میں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اردو کے ادیب حضرت [illegible] آبادی نے مظہر امام کو "نوجوان برنگ" کے نام سے پکارا ہے۔ اور حضرت پرویز شاہدی نے "شاعر خود آگاہ" کے لقبوں سے نوازا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ خطابات کچھ یونہی نہیں عطا کئے گئے ہیں۔

مظہر امام ہند و پاک کے ممتاز شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں اور یہ اپنے ہمعصروں میں بہتوں سے زیادہ شہرت کے مالک ہیں۔ ہند و پاک کا شاید ہی کوئی مقتدر اور بلند پایہ رسالہ ہوگا جس میں مظہر امام کا کلام باقاعدگی کے ساتھ شائع نہ ہوتا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ مظہر امام کو تخلیق فن کے ساتھ ساتھ عرض ہنر کا سلیقہ بھی آتا ہے۔

جو آدمی میں جرأت عرض ہنر بھی کچھ
اس کے بغیر قدر متاع ہنر کہاں!

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جب کبھی کوئی شخصیت ابھرنے لگتی ہے تو ماحول اس کا مخالف ہو جاتا ہے۔ خاص کر ہم پیشہ جماعت کے افراد تو اور بھی جلنے کڑھنے لگتے ہیں اور موقع و محل دیکھ کر ٹانگ پکڑ کر نیچے کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مظہر امام بے حد حساس اور بالغ نظر شاعر ہیں۔ اس لئے ان کو اپنے دوستوں کی ناچتی کا احساس ہی نہیں۔ ایک شدید احساس ہے جب ہی تو فرماتے ہیں ؎

دشمنو! کچھ مری رسوائی کا سامان کرو
دوستوں کو مری شہرت بھی گراں گزری ہے

مظہر امام کی شاعرانہ شخصیت کی تشکیل پر قیام کلکتہ میں ۱۹۵۱ء کا گہرا اثر پڑا۔ وہ حضرت پرویز شاہدی کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے اور سالک دہوش صاحبان نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔ کلکتہ کی زہرہ جمالوں کی دلکش ادائیں اور بت سیم وش کی رعنائی و زیبائی نے ان کے ذوق جمال کو زیادہ سے زیادہ نکھارا اور بہار کی سیاسی کشمکش اور انقلابی تحریکوں نے ان کے فکر و نظر کا سانچہ بدل ڈالا۔ اسی کوچے کی ہوا نے ان کے ذوق شاعری کی چنگاری کو شعلہ بنایا اور اسی کوئے دلبراں میں ان کی امیدوں کا جنازہ بھی پڑھا گیا ؎

ہے یہی شہر نگاراں وصل فرقت کا دیار
میری دوزخ بھی یہیں ہے میری جنت بھی یہیں

مظہر امام تقریباً آٹھ سال تک کلکتہ میں مقیم رہے۔ پانچ سال تک "انجمن ترقی پسند مصنفین" کلکتہ کے معتمد اعلیٰ رہے۔ کچھ عرصے تک انجمن ترقی اردو کے بھی ذمہ دار عہدیدار رہے۔ [illegible] اسکول میں کئی سال تک استاد رہے۔ [illegible] علاوہ اور بھی کئی ادبی انجمنوں سے [illegible] رہ

زمانہ امام کی ادبی زندگی کا سنہرا زمانہ ہے۔ اسی دور میں امام کو اپنی شاعرانہ شخصیت کی تعمیر کا بہترین موقع ملا اور شعر و ادب کی دنیا میں نام کمانے کے مواقع ہاتھ آئے مگر اس دور میں بھی امام کو یہ خیال ستاتا رہا ؎

جہاں امام کے اعزاز میں ہے جلسۂ عام
وہاں سے کوئے ملامت بھی کوئی دور نہیں

مظہر امام کی روز افزوں ترقی اور شہرت کو دیکھ کر ان کے اکثر احباب و اعزہ مخالف ہو گئے اور اسی کرب نے امام کو یہ شعر کہنے پر مجبور کیا ہوگا ؎

دوستوں کی دشمنی راس آ گئی
آپ ایسے تھے کہ بیگانے سے ہے

مظہر امام کی شخصیت کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے وقت اور صلاحیت کا جائز مصرف لینا جانتے ہیں۔ امام کا مشاہدہ تیز اور تجربہ بہت گہرا ہے اس لئے وہ آج کل کے مقصدی انسان کو پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکتے اور کوئی گھاگ آدمی بھی ان کو آسانی سے دھوکا نہیں دے سکتا کیونکہ وہ اپنے دور کے مزاج کو بطرز احسن پہچانتے ہیں۔

مظہر امام کا اپنے متعلق خیال ہے کہ "میری شعر گوئی کی رفتار اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں بہت سست رہی ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ میں زندگی کے ہر شعبے میں سست گام ہوں"۔ اسے دراصل ان کا انکسار کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہاں پر اگر تھوڑی سی خود ستائی کی اجازت دیجئے تو عرض کروں۔ آج سے چند سال پہلے میں نے مظہر امام کے نام کٹک کے پتہ پر ایک خط لکھا تھا خط کے ساتھ اپنی ایک تازہ غزل بھی بھیجی تھی۔ امام صاحب نے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ "آپ کی غزل کا یہ شعر ؎

یارانِ سست گام کو مجھ سے ہے یہ گلہ
میں کیوں رہِ حیات میں آگے نکل گیا

[illegible] کا مقولہ ہے کہ

اس قول کی صداقت سے مظہر امام کی شخصیت کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ انسانی کمزوریاں ان کے اندر بھی ہیں۔ لیکن ان کے اندر خوبیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اب ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو اجاگر کرنے سے بھی ان کی بڑائی اور عظمت پر مطلق حرف نہیں آ سکے گا۔ اس سلسلے میں دانستہ اس پر روشنی ڈالنے سے گریز کرتا چلا۔

مظہر امام کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انگریزی زبان و ادب سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اردو اور فارسی میں ایم۔ اے۔ گولڈ مڈلسٹ ہیں۔ ہندی ادب کا بھی اچھا علم رکھتے ہیں۔ شاعری کے علاوہ امام نے اب تک بہت سارے مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کے مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ مضمون لکھنے کی مشق جاری رکھ سکے تو نثری ادب میں بھی بہت جلد اپنی ایک خاص جگہ بنا لیتے ہیں۔ مظہر امام نے "زخمِ تمنا" کے تعارف میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں کسی انکسار کے بغیر یہ عرض کر دوں کہ میں شاعری کے علاوہ کسی اور فن یا ہنر کے اختیار کرنے کا اہل نہیں ہوں بلکہ اب تو اکثر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ میں شعر گوئی کا بھی اہل ہوں یا نہیں"۔ مجھے ذاتی طور پر موصوف کی اس رائے سے اختلاف ہے میرے خیال میں مظہر امام صاحب شعر گوئی کے اہل تو ہیں ہی مگر ادبی مضامین لکھنے کی بھی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں

مظہر امام نے دوسری زبانوں کے کئی اہم اور معلوماتی مضامین کا بھی اپنی زبان میں کامیاب ترجمہ کیا ہے جس میں زبان کی دلکشی اور اندازِ بیان کی ندرت دیدنی ہے مترجم کی حیثیت سے بھی ان کی ادبی شخصیت قابلِ احترام و توجہ ہے۔

میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں مظہر امام کو دربھنگہ میں دیکھا تھا اور ان سے میری جان پہچان علیک سلیک سے آگے کچھ نہ تھی۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں مجھے بھی تلاشِ معاش میں کلکتہ آنا پڑا۔ اس زمانے میں مظہر امام روزنامہ "کارواں" کلکتہ میں نائب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ۳۵ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ میں رہا کرتے تھے۔ میں بھی بمشکل ہوا وہیں پہونچا اور مجھ کو ایک عرصے تک امام کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ انہیں ماضی کی یادوں کو آج تازہ کر رہا ہوں۔

بہ حال میں نے مظہر امام کی شخصیت کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی شخصیت کے کچھ گوشے میرے دل و دماغ کے نہاں خانے میں محفوظ ہیں جن کو بیان کر کے میں اپنی شخصیت کا بھرم کھونا نہیں چاہتا۔ میں نے مظہر امام کو رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے معاملے میں کبھی ہمیشہ دوسروں سے جدا گانہ پایا۔

مظہر امام کی شخصیت کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ وہ بہت جلد دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے، ہر مدرسۂ فکر اور مکتبۂ خیال کے لوگوں کو کس طریقہ سے اپنا دوست بنایا جا سکتا ہے یہ گر کوئی مظہر امام کو اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ معلوم ہے۔ کلکتے کے اکثر شاعر و ادیب مظہر امام کے قریب ترین دوستوں میں تھے۔ ان میں پرویز شاہدی، مظفر پوری، شہراہو فائز فرخ، احسان دربھنگوی، مصطفیٰ حیدری، حرمت الاکرام، ناظر الحسینی، حفیظ رزاقی، رمز عظیم آبادی، قیصر شمیم، علقمہ شبلی، وہاب اشرفی، دکیل اختر، شہاب لکھنوی، نشاط الایمان، اسد الزماں، اصغر راہی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ کلکتہ کے بزرگ شاعر و ادیب پرویز شاہدی، ل۔ احمد اکبر آبادی، مولانا سید احمد اکبر آبادی، سید امیر رضا مظہری، عباس علی خاں بیخود، ابراہیم ہوش، سالک لکھنوی، اشک امرتسری، جرم محمد آبادی، یونس نظری وغیرہ بھی مظہر امام کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مظہر امام کی زندگی کا بیشتر حصہ صاحب علم و کمال اور اہلِ زبان کی صحبتوں میں گذرا ہے۔ اس لئے مظہر امام کو اپنی خامیوں کے دور کرنے اور غلطیوں کی اصلاح کرنے کا بہت زیادہ موقع ملا۔ بہار، بنگال، اڑیسہ، آسام اور کشمیر کے مرکزی شہروں میں زندگی کے دن گذارے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہے۔ اور زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے میں مدد ملتی رہی۔

مظہر امام اس معنی میں بھی بہت خوش نصیب ہیں کہ ان کو زندگی کے ہر ہر قدم پر حسن دربھنگوی، شاقب عظیم آبادی، پروفیسر اختر قادری، علامہ جمیل مظہری، پرویز شاہدی، ابجی رضوی، ل۔ احمد اکبر آبادی، ماجد بجی، ڈاکٹر اختر اورینوی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، سہیل عظیم آبادی اور رضا نقوی واہی جیسی محترم اور معتبر بزرگ ادبی شخصیتوں کی قربت نصیب ہوئی۔

مظہر امام کی صحبت میں مجھے فنکار کے کردار، خلوص اور اخلاقی بلندی و پستی کے سمجھنے اور پرکھنے کا کافی موقع ملا۔ سنہ ۱۹۵۱ء تک مجھے شاعری کا روگ نہیں لگا تھا اس لئے میرے اور مظہر امام کے درمیان اکثر غیر ادبی گفتگو ہی ہوا کرتی تھی۔ ہم دونوں ہی اس زمانے میں گردشِ ایام کے شکار تھے اور اکثر ایک دوسرے کو اپنی اپنی داستانِ غم سنا کر غم غلط کیا کرتے تھے۔

میں نے مظہر امام کو ہمیشہ اپنی شخصیت کا احترام کرتے ہوئے پایا ہے۔ دوسروں سے ملنے جلنے کے معاملے میں بھی بہت محتاط رہتے ہیں۔ ادیب دوستوں کے خطوط کا پابندی کے ساتھ جواب دینے میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ شاعر و ادیب کے خطوط کو وہ اپنے پاس کچھ اس طرح با حفاظت رکھتے ہیں جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کی تصویر کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو۔ مظہر امام اپنی آئندہ نسل کے

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

محمد سالم "کاشانۂ اختر" محلہ بھدولی، دربھنگہ-۲ (بہار)

مظہر امام اور کشمیر کی غزلیں

یوں تو ہمارے ادب میں غزل گو شعراء کی ایک بھیڑ دکھائی دیتی ہے لیکن اس بھیڑ میں امتیازی رنگ لئے ہوئے چند چہرے ہی جانے پہچانے لگتے ہیں۔ مظہر امام بھی ان ہی خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جو اپنے انفرادی لب و لہجہ کی بنا پر اس بھیڑ میں گم نہیں ہو پاتے بلکہ ان کی منفرد آواز جو نئی حسیت کی پروردہ ہے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

سائنسی اور صنعتی ترقی کے ساتھ جب پرانی قدریں آہستہ آہستہ مٹنے لگیں اور روایتی عقیدے سکڑ کر دم توڑنے لگے تو نیا انسان تنہائی کے احساس سے دوچار ہوا جس کے ردِ عمل میں اسے مایوسی، افسردگی، غصہ، بیزاری، بے چینی اور انتشار کی دولت ملی۔ نتیجے کے طور پر شعر و ادب میں ایک نئے رجحان کی تشکیل ہوئی جس کو ہم نئی حسیت کا نام دیتے ہیں۔ اب تک مظہر امام کے دو شعری مجموعے "زخمِ تمنا" اور "رشتہ گونگے سفر کا" شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں اور اربابِ نقد و نظر سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اس وقت میں مظہر امام کی شاعری کا تجزیہ ان کی کشمیری غزلوں کے پس منظر میں کروں گا۔ "کشمیر کی غزلیں" مذکورہ مجموعوں کے بعد کی تخلیقات ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد کی غزلوں میں مظہر امام کے یہاں جدید احساسات کا رنگ دیکھنے میں آتا ہے۔ داخلی کشمکش، اضطراب اور بے چینی، زندگی کی ناآسودگی، جدید تہذیب کے کھوکھلے پن کا احساس اور معاشرہ کی بے حسی وغیرہ جن کے ردِ عمل میں ذات کا کرب وجود میں آیا، کشمیر کی غزلوں میں یہ تمام رنگ نئی حسیت سے مزین ہو کر اور گہرے ہو گئے ہیں۔

نومبر ۷۸ء سے ملازمت کے سلسلے میں مظہر امام کشمیر میں مقیم ہیں۔ کشمیر جسے جنت نظیر کہا جاتا ہے اور جسے قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ حسن ودیعت کیا ہے۔ یہ حسن و محبت کی سرزمین بھی ہے اور اس لئے ہجر و وصل کی سرزمین بھی۔ "کشمیر کی غزل" کسی نئی صنف کا تجربہ نہیں ہے۔ مظہر امام چوں کہ آزاد غزل کا تجربہ کر چکے ہیں، اس لئے کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ کشمیر کی غزل بھی کوئی نیا تجربہ ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ان غزلوں میں کشمیر کے مخصوص قدرتی حسن، برف پوش پہاڑیوں، سبزہ زاروں، آبشاروں، چنار کے آتشیں درختوں سے پیدا شدہ کیفیتوں کا اظہار بھی ہوا ہے لیکن ان غزلوں کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ ان کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جو شاعر پر گذرے ہوئے ان واقعات و حادثات، اس کے ان تجربوں اور اس کے ان جذبات کی عکاسی کرتے ہیں جو کشمیر کے دورانِ قیام کی دین ہیں۔ خود مظہر امام کا بیان ہے کہ وہ ان غزلوں کے بیشتر اشعار کہہ ہی نہیں سکتے تھے، اگر انھیں کشمیر میں رہنے کا موقع نہ ملا ہوتا۔

مظہر امام کی کشمیر کی غزلوں کی صحیح تعداد کیا ہے؟ میں کہہ نہیں سکتا لیکن اب تک میں نے ۲۲ مطبوعہ غزلیں جمع کی ہیں جو مختلف اردو رسائل مثلاً شاعر بمبئی، زبان و ادب پٹنہ، ناآہنگ گیا، گفتگو بمبئی، شب خون الہ آباد، تحریک جوبلی نمبر دہلی، الفاظ علی گڑھ، سطور دہلی، جواز مالیگاؤں وغیرہ کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں۔ مذکورہ غزلوں کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۱۹۶۰ء سے قبل کی غزلوں میں جو رجائی انداز تھا وہ ان غزلوں میں خال خال دکھائی دیتا ہے اور ان کے بیشتر اشعار شکست خوردگی کے احساس کے زیرِ اثر کہے گئے ہیں لیکن اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شکست و ریخت کے عہد سے دوچار ہو کر مظہر امام کا اجتماعی غم ذات کے کرب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لمحاتِ گمشدہ کے تعاقب میں رہ گیا
خم دار سیڑھیوں کا اندھیرا تھا کھو گیا

مرا نصیب بھی ہموار راستے کی تھکن
وہ کون تھا جو پہاڑوں پہ چڑھ کے اترا بھی

روندی ہوئی زمیں تھی، نئے رہ گزر بھی تھے
وہ تھے تو اپنے ساتھ نقوشِ سفر بھی تھے

ہم کو ملا تو سایۂ ابرِ سیہ ملا
ورنہ اس آسمان پہ شمس و قمر بھی تھے

وہ پل کہاں ہے جو دنیا سے جوڑتا تھا مجھے
جو پاؤں تجھ کو تو سب سے قریب آؤں میں

دل اکیلا ہے بہت لالۂ صحرا کی طرح
تم نے بھی چھوڑ دیا ہے مجھے دنیا کی طرح

مگر شاخوں سے پتے گر رہے ہیں
وہی آب و ہوا ہے اور میں ہوں

جدید غزلوں کی تشکیل میں خصوصی طور پر علامت پسندی اور پیکریت کو کافی دخل ہے لیکن مشاہدہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جدید غزل گو پیکریت کو فوقیت دیتے ہیں اس لئے کہ پیکر تراشی کا عمل ہماری قدیم شاعری میں بھی ہوتا رہا ہے۔ غالباً پیکر تراشی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ترقی پسندوں کے یہاں بھی یہ طرز مقبول رہا ہے چوں کہ مظہر امام خود کلاسکیت اور ترقی پسندی سے گذر کر جدیدیت تک پہنچے ہیں اس لئے نفسیاتی طور پر وہ آج بھی کشمیر کی غزلوں میں پیکریت کی جانب زیادہ مائل نظر آتے ہیں اور اپنے اس عمل میں وہ خوبصورت تراکیب اور نئی تشبیہات کا سہارا لے کر ایسی خوبصورت امیجری بناتے ہیں جس سے دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے اور یہ کیفیت قاری کو دھیرے دھیرے نئی جہتوں سے آشنا کرتی ہے یعنی شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کا معنوی پیکر سامنے آ جاتا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

نہ جانے موسمِ تلوار کس طرح گذرا
مرے لہو کا شجر تو جھکا جھکا سا تھا

چراغِ منزلِ دل پر جلا کے کیا کرتے
وفا کا قافلہ کب سے رکا رکا سا تھا

برہنگی پہ بھی گذرا قبائے زر کا گماں
لباس پر ہوا جزوِ بدن کا دھوکا بھی

ایسے بگڑے ہوئے چہرے کو بھلا دیں سب لوگ
جشنِ آئینہ سہی، ہاتھ میں پتھر نہ رہے

وہ بے لباس ہی، جامہ زیب کتنا ہے
ابھرتے چاند کو پوشاک کیا پنہاؤں میں

تم ہوا تو بکھیرو مجھے ساحل ساحل
موج ہو تو بہا دو مجھے دریا کی طرح

جلتی ہوئی سڑک پہ اکیلا رہا سفر
برفیلی وادیوں میں ترا ساتھ ہو گیا

اس رفاقت کو سرا اپنی بنا لیں دونوں
قہر کا شہر ہی قاتل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ

ثبت ہوں دستِ خموشی پہ حنا کی صورت
ناشنیدہ ہی سہی، تیرا کہا ہوں میں بھی

برفانی ہواؤں سے تیز اور بھی لو ہوگی
محرابِ تمنا پہ میری طرح جل جاؤ

زلزلے سب دل کے اندر ہو گئے
حادثے رومان پرور ہو گئے

آ گئے ہیں ہم تو لائے ہیں یادوں کے سائباں
سنتے ہیں اس دیار میں بادل کے گھر بھی تھے

علامتی اسلوب زیادہ بھرپور معنویت رکھتا ہے جس سے جدید حسیت کو ظاہر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر کسی شعر کے معنی کی تلاش میں غور و فکر نہ کرنا پڑے تو شعر میں زیادہ لذت باقی نہیں رہتی۔ ابہام میں غور و فکر کی دعوت ہوا کرتی ہے اور ذہنوں کی رسائی کا امتحان بھی ہو جاتا ہے۔ اس سے شعر کا حسن بڑھ جاتا ہے لیکن علامتوں کا وضع کرنا اور ان کو صحیح ڈھنگ سے استعمال کرنا بھی فنکاری ہے کیونکہ اس صورت میں قاری کا تصور، شاعر کے مافی الضمیر تک بہ آسانی پہنچ جاتا ہے۔ مظہر امام کے یہاں بھی بہت اچھے علامتی اشعار ملتے ہیں۔ آیئے پہلے ہم ان کے ایک خوبصورت مطلع پر گفتگو کریں جو علامتی انداز میں کہا گیا ہے۔ پھر اس ضمن میں کچھ اور مثالیں پیش کروں گا ؎

جاگتی آنکھیں لٹاتی ہیں زر و گوہر ابھی
شہر سے لوٹے نہیں خوابوں کے سوداگر ابھی

اس شعر میں زر و گوہر، 'شہر'، 'سوداگر' علامتی طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ تصور یہ ہے کہ جو تاجر ہیرے موتی کا بیوپار کرتے ہیں، وہ ہیرے موتی کی پہچان بھی رکھتے ہیں، اس لئے ان کے صحیح قدرداں بھی وہی ہوتے ہیں اور پھر شعر کو یوں معنی پہنا سکتے ہیں کہ شاعر اجتماعی غم میں شریک ہو کر یہ محسوس کرتا ہے کہ آنکھیں جو مضطرب ہو کر ایسے خوابوں کے سوداگر کے لئے منتظر ہیں وہ شہر سے ابھی تک لوٹے نہیں ہیں اس لئے وہ آنسو کی شکل میں زر و گوہر لٹاتی نظر آتی ہیں۔ میرے خیال میں خوابوں کے سوداگر سے شاعر کی مراد خوابوں کے قدرداں سے ہے حالانکہ سوداگر کا لفظ عام طور پر اچھے معنی میں استعمال نہیں ہوتا لیکن مظہر امام نے اس کو اچھے مفہوم میں استعمال کیا ہے جو اس لحاظ سے جائز ہے کہ اقبال کے یہاں بھی سوداگر کا استعمال اچھے مفہوم میں ہوا ہے مثلاً اقبال کہتے ہیں ؎

وہ سوداگر ہوں جس نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

مظہر امام کا ایک اور سادہ سا شعر دیکھئے جس میں انھوں نے اپنے خیال کو علامتی پیکر دے کر کس خوبی سے حسن پیدا کیا ہے۔ یہاں حزنیہ رنگ بھی نمایاں ہو گیا ہے ؎

سمندروں سے گہر کب کے ہو گئے ناپید
تمہارے ساتھ میں گہرائیوں میں اترا بھی

یہاں سمندروں سے انسانی دلوں کی جانب اشارہ ہے اور گہرا کو خلوص سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج انسان اپنی اقدار کھو کر کتنا کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اس کی گہرائیوں سے خلوص کے موتی کب کے ناپید ہو چکے ہیں۔ اس ضمن میں شاعر کو اپنے محبوب کے ساتھ معاشرہ کے دیوالیہ پن کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اب دو اور علامتی انداز کی خوبصورت مثالیں ملاحظہ فرمائیں ؎

قتل ہوتے جا رہے ہیں نیلے پیلے شوخ رنگ
پیش منظر بن نہ جائے ہے جو پس منظر ابھی

دھوپ میں پہلے نکل جاتے تھے لوگ
اس کے کیا گذری کہ پتھر ہو گئے

گو کہ بہ حیثیت مظہر امام کی غزلوں میں المیہ کے احساس کو اجاگر کیا ہے لیکن کبھی کبھی امید اور رجائیت کی قندیل آج بھی ان کے اندر جل اٹھتی ہے جس سے ان کے جدید رجحان کا مثبت کردار ابھر کر سامنے آتا ہے ؎

دیکھ لو شاید بدل جائے کبھی موسم کا رنگ
اس طرح کھولو نہ اپنے درد کا دفتر ابھی

کشمیری کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ مظہر امام زبان اور فن کے سلسلے میں بہت محتاط ہیں۔ کوئی ایسی غلطی دکھائی نہیں دیتی جو قابل ذکر ہو۔ دوسرے انھوں نے عام بول چال کی زبان اپنانے میں مناسب ترین الفاظ کا استعمال بڑی چابکدستی سے کیا ہے اور سیدھے سادے لہجے میں وہ اس طرح سوز بھرتے ہیں کہ تغزل کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چند خوبصورت نمونے ملاحظہ ہوں ؎

اٹھو کہ رات تو صبح ہوئے دیر ہو گئی
وہ داستانِ درد سنا کر سو گیا

یہ ساری برف گرے دو پہر
تپش حد سے سوا ہے اور میں ہوں

اصرار تھا کہ ذکر ہماری طرف سے ہو
ورنہ ہمارے حال سے وہ باخبر بھی تھے

اس نے اس طرح اتاری مرے غم کی تصویر
رنگ محفوظ تو رہ جائیں یہ منظر نہ رہے

تھا تیرے پیار کو کتنا مری انا کا خیال
مرا غرور بھی تیرا غلام کتنا تھا

کرم تھے مجھ پہ کچھ اتنے میں سوچتا کیسے
کہ دوسروں پہ بھی وہ مہرباں کتنا تھا

یہ آرزو تھی کہ یک رنگ ہو کے جی لیتا
مگر وہ آنکھ وہ شعلہ [illegible] رشتے بھی

بجھتی ہوئی صبحیں ہوں کہ جلتی ہوئی راتیں
تجھ سے یہ ملاقات سرِ شام بہت ہے

میں جانتا ہوں وہ نزدیک و دور میرا تھا
بچھڑ گیا جو میں اس سے قصور میرا تھا

مجھ کو پانا ہو تو ہر لمحہ طلب نہ کر مجھے
رات کے پچھلے پہر مانگ دعاؤں میں بھی

لیکن مذکورہ ۲۲ غزلوں میں مختلف بحور کے انتخاب کے سلسلے میں ایک بات کھٹکتی ہے کہ مظہر امام نے بحر مجتث مثمن مخبون محذوف یعنی مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن کے وزن کو سات بار استعمال کیا ہے اور یہی بحر کرامت علی کرامت کے مطابق 'زخمِ تمنا' کی غزلوں میں سات بار اور 'رشتہ گونگے سفر کا' میں پانچ بار استعمال کی گئی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مظہر امام اپنے شعری رویہ میں اب تک مخصوص بحروں کی یکسانیت سے خود کو الگ نہیں کر پائے ہیں۔ اگرچہ ایک ہی بحر میں غزلیں کہنا کوئی عیب نہیں اس لئے کہ شعر کہتے وقت شاعر لاشعوری طور پر کسی بھی بحر میں اپنے خیال اور جذبے کا اظہار کیا کرتا ہے چنانچہ ہم بحروں کے انتخاب کے سلسلے میں کوئی پابندی نہیں لگا سکتے۔ اس ضمن میں میرا نظریہ صرف یہ ہے کہ جس طرح ایک ہی دھن کو بار بار سنا جائے تو سماعت پر گراں گذرے گی اسی طرح مختلف غزلیں ایک ہی بحر میں ہوں تو ان کی سماعت سے قاری کے دل کو وہ تازگی نہیں ملے گی جو مختلف بحروں کے اشعار سن کر حاصل ہو گی اس لئے مظہر امام مذکورہ غزلوں میں بحر کی یکسانیت سے پرہیز کرتے تو بہتر ہوتا ویسے بقیہ دوسری غزلوں کی بحروں میں بہت کم یکسانیت پائی جاتی ہے۔

بہرکیف، مظہر امام کو بنیادی طور پر نظموں کا شاعر کہا جاتا ہے۔ 'اکھڑتے خیموں کا درد' ان کی ایک معرکۃ الآرا نظم ہے جو ان کے دوسرے شعری مجموعہ 'رشتہ گونگے سفر کا' میں شامل ہے لیکن کشمیری کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ مظہر امام ایک بلند پایہ غزل گو بھی ہیں اور امید ہے کہ مستقبل میں جدید غزلوں کے نئے امکانات کے ساتھ اپنے نئے تجربات کو اجاگر کرنے میں وہ اپنے ہم عصروں سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

مظہر امام اور آزاد غزل

پریم رومانی
رنگ ٹینگ
عالی کدل
سرینگر کشمیر

آزاد غزل کیا ہے؟

اس کے متعلق مختلف اربابِ ادب نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن اس کو ہیئتی تجربے کا نام دیتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق آزاد غزل ایک طرح کی پابند نظم ہے۔ کرامت علی کرامت کہتے ہیں کہ آزاد غزل کی صنف کو غزل کی صنف پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ اس میں خیالات کے پھیلاؤ کے وسیع امکانات رہتے ہیں اور شاعر کے جذبات گھٹ کر نہیں رہ جاتے۔ خود مظہر امام اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آزاد غزل نہ تو پابند غزل کا ردِ عمل ہے اور نہ اس کی ضد میں لکھی جا رہی ہے۔ آزاد غزل کے اپنے امکانات ہیں اور ان کو بروئے کار لانا ہمارا فرض ہے۔

مظہر امام اور آزاد غزل کا رشتہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ امام جدید اُردو غزل کے ایک نمائندہ شاعر ہیں۔ اُنھوں نے اُردو غزل کو ایک نئی آواز، نیا زاویہ، نیا رجحان، نئی جہت اور نئی ساز و آہنگ عطا کیا ہے۔ آزاد غزل اُن کا ایک تجربہ ہے۔ اس تجربے میں بھی اُن کی رنگا رنگ اور پہلودار شخصیت جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات اب مسلمہ بن چکی ہے کہ مظہر امام آزاد غزل کے موجد ہیں جس کا اعتراف کم و بیش سارے نقاد ان فن نے کیا ہے۔ نامور شاعر شاذ تمکنت کے خیال میں مظہر امام کی یہ کوشش اپنی جگہ ان کی جستجوئے خوب تر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ علیم صبا نویدی نے بھی اپنے مجموعۂ کلام "ردِ کفر" میں مظہر امام کو آزاد غزل کا موجد ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ مظہر امام نے نہ جانے کن محرکات و عوامل کے پیشِ نظر ایک نئی لگن کے ساتھ آزاد غزل کی طرف اپنے تخلیقی سفر کو نیا موڑ دیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے بیان کے مطابق ہمارے عہد میں مظہر امام نے غزل کے مصرعے چھوٹے بڑے کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے برعکس جگن ناتھ آزاد شک کی بنا پر آزاد غزل کا موجد [illegible] مظہر امام [illegible] [illegible] آزاد غزل [illegible]

دعویدار ہیں۔ جگن ناتھ آزاد' آزاد غزل کو کوئی بڑا کارنامہ بھی نہیں مانتے۔ مجھے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ میرے خیال میں ہر ایک نیا تجربہ ایک قابلِ فخر کارنامہ ہوتا ہے۔ اگر نیا تجربہ کوئی کارنامہ نہیں ہوتا تو نیوٹن، پکاسو، یا پھر سارے کوئی غالب، تلسی داس، شیکسپیئر وغیرہ کے نئے تجربات کوئی اہمیت نہ رکھتے۔ مظہر امام نے آزاد غزل کی صنف شروع کر کے اس کی بنیاد کا پہلا پتھر رکھا اور اس پر ایک عمارت تعمیر کرنے والوں میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس کی مثال کرامت علی کرامت، یوسف جمالی، رزینہ شاہی، سلیم شہزاد، علیم صبا نویدی، ظفر اقبال، حرمت الاکرام، ظہیر غازی پوری، بدیع الزماں خاور، خالد رحیم اور مظفر ایرج وغیرہ کی آزاد غزلیں ہیں۔

مظہر امام نے آزاد غزل کہنے کا پہلا تجربہ ۱۹۴۵ء میں کیا ہے۔ چونکہ اس نئے تجربے کی پذیرائی کے بارے میں انہیں اندیشہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے پندرہ سال تک اسے شائع نہ کرایا۔ ۱۹۶۱ء میں یہ غزل پہلی مرتبہ ماہنامہ "فنار نو" دربھنگہ کے خاص نمبر میں شائع ہوئی لیکن اس زمانے میں اس نئے تجربے کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہو سکی کیونکہ مظہر امام کی ادبی حیثیت اُس زمانے میں اتنی مستحکم نہیں ہوئی تھی اور اب جبکہ اُنھوں نے اُردو شاعری کو نیا موڑ دیا ہے اور اپنے رنگا رنگ خیالات سے وسعت، سنجیدگی، برجستگی اور شگفتگی عطا کی ہے تو اُن کی یہ کاوش تحریک کہلانے لگی ہے اور یہ تجربہ اتنا کامیاب ہو گیا ہے کہ اب اس صنف میں کم و بیش تیس پینتیس شاعر طبع آزمائی کر رہے ہیں اور حرمت الاکرام جیسے قادر الکلام شاعر بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

مظہر امام کی آزاد غزلیں حشو و زوائد سے پاک ہیں۔ اُن کی آزاد غزلوں میں نہ الفاظ کا بے جا اسراف پایا جاتا ہے اور نہ ہی فرسودہ ترکیبات کا۔ ہمدم، ندیم، ہم نشیں، دوست وغیرہ جیسے الفاظ جو ایک زمانہ میں کثرت سے غزلوں میں استعمال کئے جاتے تھے۔ اُن کی آزاد غزلوں میں نہیں ملتے ہیں۔ ان غزلوں میں نہ گل و بلبل کی روایتی داستان ملتی ہے اور نہ عشق و حسن کی پیش پا افتادہ رنگینیاں بلکہ ان میں کیف و سرمستی

اور ایک خاص نوع کی گداختگی کے علاوہ عصری حسیت کی تازگی بھی جلوہ گر نظر آتی ہے۔ یہ مظہر امام کی آزاد غزل کی ایک اور خصوصیت ہے۔ مثلاً

؎ کتنا گرم لہو ہے اپنا دنیا کو بھی دیکھنے دیں
رکھنا ہونٹ پہ ہونٹ اور دینا ہات میں ہات

؎ پھر سوال آج یہی ہے کہ ملے بودھ کو کیسے نروان
مسئلہ زندگی و موت کا چکر —— نہ بھی

؎ تو جو مائل بہ کرم تھا تو زمانے کا مجھے ہوش نہیں رہتا تھا
میں کہ خود سر تھا، ترے زیرِ نگیں رہتا تھا

مظہر امام کی آزاد غزلوں میں وسعت، پھیلاؤ اور کشادگی ملتی ہے یہاں ترسیل اور ابلاغ کا لاینحل مسئلہ نہیں ہے۔ اُن کی آزاد غزلوں میں ایک طرف تو عصری میلانات اور عصری حسیت کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ فکر و آہنگ کی جھلکیاں ملتی ہیں اور دوسری طرف فضا آفرینی بھی اپنے پورے تند و مد کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ مظہر امام نے اپنی آزاد غزلوں میں مصنوعی پن کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اسی لئے ان میں ایک طرح کا منفرد احساس و جذبہ اور مختلف فکر و خیال کی مربوط مثالیں ملتی ہیں۔

مثلاً

؎ رات آنکھوں میں خیالے کے گذر جاتی تھی
لمحۂ شوق بہت چین بہ جبیں رہتا تھا

؎ جن کے دل میں زرشندہ ہیں الہامی آیات
وقت کے بھاری شانوں پر وہ رکھ کر دیکھیں اپنا ہات

؎ ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا آپ ہیں
عشق طوفاں ہے، سفینا آپ ہیں

مظہر امام کی آزاد غزلوں کی ایک اور انفرادیت یہ ہے کہ ان میں بظاہر معمولی اور عام الفاظ معنی و مفہوم کی نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ ان کی نئی تراکیب روایت کی ایک الگ اور جداگانہ فضا قائم کرتی ہیں گرچہ بہت سی تراکیب کلاسکی روایت کی پروردہ ہیں۔ لیکن مظہر امام نے ان کو اپنے قلم سے ایسی توانائی بخشی ہے کہ نئے اور نادیدہ پیکر سامنے آتے ہیں۔ امام سیدھے سادے الفاظ میں بات کرنے پر قادر ہیں۔ اس ضمن میں وہ نہ فارسی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں اور نہ ہی پامال موضوعات کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ ان کی آزاد غزلوں میں ایک ایک لفظ کئی جہتوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ وہ نادر تشبیہات اور استعارات سے شعری پیکروں میں نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں زبان شستہ، سادہ اور پُر تاثیر نظر آتی ہے۔ مظہر امام الفاظ کے برجستہ استعمال کا گر جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کے اشعار میں نکھار [illegible] اس ضمن میں

اُن کے مندرجۂ ذیل اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔

؎ دور سے دیکھ رہا ہوں میں اُٹھتی ہوئی ناکام اُمیدوں کا دھواں
وہ اسی جلتے ہوئے گاؤں کا شہری تھا یہیں رہتا تھا

؎ بیج نمک کے بونے والے کھیتی میں مصروف
اب کے جانے کب تک ٹھہرے زخموں کی برسات

؎ سانس لینا ہی اگر زیست کا معیار رہے
یہ بہت ہے کہ فلک سر پہ ہے ورنہ یہی گھر سہی

؎ آرزوؤں کی اندھیری رات میں
میرے خوابوں کے اُفق پر جگمگایا جو ستارا آپ ہیں

مظہر امام کی آزاد غزل میں پیکر تراشی کا عمل نمایاں ہے۔ اُن کا ایک ایک پیکر ہوتا ہے اور ان سے کئی پیکر وجود میں آتے ہیں جس سے فضا سازی کا ایک ایسا منظر بندھ جاتا ہے کہ قاری گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔ اُن کی آزاد غزلوں میں بار بار بولتی ہوئی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ وہ علامتوں کا استعمال بھی کرتے ہیں جو روایتی پیکروں کو اپنے الفاظ کے طلوسات سے متحرک بناتے ہیں۔ مثلاً شاخ، آنسو، مکاں، دھواں، فلک، خاک، سمندر وغیرہ روایتی الفاظ ان کے یہاں ایک نئے انداز سے سامنے آتے ہیں۔ ان علامتوں کے علاوہ اُنھوں نے اپنی آزاد غزلوں میں جدید ترین علامتیں استعمال کی ہیں جس سے ایک نئی امیجری جنم پاتی ہے اور اس امیجری سے جدید فکری حیات کے تجربوں کی رومانیت پیدا ہوتی ہے۔ لمحہ۔ پانی۔ تجربہ۔ سفر۔ صبح۔ لہو۔ رات۔ پتھر۔ گھر وغیرہ جیسے الفاظ اُن کی آزاد غزلوں میں ایک نئی تحریک کو جنم دیتے ہیں۔ پیکر تراشی کا یہ عمل ان غزلوں میں ایک نئی فضا قائم کرتا ہے اور انسان کو خوابوں سے نکال کر ایک نئی دنیا تعمیر کرنے پر اُکساتا ہے۔ مثلاً

؎ سانس لینا ہی اگر زیست کا معیار ہے
یہ بہت ہے کہ فلک سر پہ ہے ورنہ یہی گھر سہی

؎ آ میرے جسم تک آ، ابرِ طرحدار کی طرح
یہ تو معلوم ہے تو چھا تک نہ پائے گی مری شمع کے اندر نہ سہی

؎ میری منزل بے نشاں ہے لیکن اس کا کیا علاج؟
میری ہی منزل کی جانب جادہ پیما آپ ہیں

مظہر امام کی آزاد غزلوں میں جہاں منفرد احساس و جذبات و تازہ فکر و خیال کی جھلکیاں ملتی ہیں وہاں بہت سے اشعار ہلکے پھلکے جذبات نگاہ اور آثارِ حیات کا سنگم دکھش اور حرارت پیدا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اُنھوں نے روایتی عناصر سے پوری طرح کنارہ کشی نہیں کی ہے جس کا اعتراف مشہور شاعر خلیل مظہری اپنے اس قول میں بھی کرتے ہیں کہ "مظہر امام اور رنگِ بیان کی تلاش میں ہماری حدِ نگاہ سے آگے جانے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتے بھی جاتے ہیں۔ وہ شاعرِ حال نہیں بلکہ شاعرِ مستقبل ہیں لیکن ماضی کے عظیم اندازِ بیان و زبان کی طرف سے بھی انھوں نے اپنی آنکھیں نہیں موند رکھی ہیں" اس احساس کی عکاسی اُن کی آزاد اور پابند دونوں طرح کی غزلوں میں ہوتی ہے۔ وہ جہاں اپنے خیالات کی پاکیزگی سے اپنی آزاد غزلوں میں توازن، تسلسل اور روانی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً

؎ "آج ہوا سر ہو رہا تھا (میں اُونچے گھر کی بیٹی ہوں !)
دیکھو بھر مت کرنا ایسی ویسی بات !"

؎ پھول ہو ریت میں ڈوبا ہوا پتھر ہی سہی
دوستو میرا بھی کچھ حق تو ہے چھپ کر ہی کھل کر ہی سہی

؎ آرزوں کی اندھیری رات میں
میرے خوابوں کے اُفق پر جگمگایا جو ستارا آپ ہیں

؎ شاخ در شاخ گلابوں کی دھنک پھوٹی ہے
اک پرندہ تھا یہیں رہتا تھا۔

مظہر امام ایک عاشق ہیں۔ وہ دھڑکتے ہوئے دلوں کے ماہر شناس ہیں۔ وہ دل کے درد کو چھو کر محسوس کرتے ہیں اور اس کو تر رحال سا سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کی آزاد غزلیں جذبے کی فراوانی سے معمور ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی گہری فنی بصیرت کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ امام کا عشق دراصل اُن کی تخلیقات کی ایک زندہ اور پائندہ علامت ہے جس کا یہ رچاؤ اُن کی آزاد غزلوں میں بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن ایک جگہ پر لکھتے ہیں کہ "مظہر امام عشق کی خاموش نگاہوں سے محسوس بھی کرتے ہیں اور خوبصورت پیکروں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ کر بے قرار بھی ہو جاتے ہیں۔ اس بے قراری سے کردار کے رحم کی پہچان ہوتی ہے یہ جدید تصوف کی رومانیت ہے جو مظہر امام کے مبادیِ فن سے میل کھاتی ہے۔" اُن کی آزاد غزلوں کا مطالعہ کرکے اس بات کو کبھی جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ اُن کے ہاں عشق کی دھیمی دھیمی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی ہے۔ اس ضمن میں مظہر امام کے مندرجۂ ذیل اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں جن میں سنجیدگی، شگفتگی اور عمیق فکری رجحانات کے علاوہ "جدید تصوف" کی رومانیت بھی غالب ہے۔ مثلاً

؎ صبح کا تڑکا ہوتے ہوتے اُڑ جاتے تھے لفظوں کے سب رنگ
جاگ کے تجھ کو خط لکھتے تھے آدھی آدھی رات

؎ کتنا گرم لہو ہے اپنا دنیا کو بھی چکھنے دیں
رکھنا ہونٹ پہ ہونٹ اور دینا ہات میں ہات

؎ سانس لینا ہی اگر زیست کا معیار ہے
یہ بہت ہے کہ فلک سر پہ ہے ورنہ یہی گھر سہی

؎ یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر ہی آپ کا پیکر نہ سہی

آزاد غزلوں میں مظہر امام نے اپنی پابند غزل کا سا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے۔ اُن کی زبان بیان بھی قادیت کے بلے سے آزاد ہے۔ اُن کے مصرعے سروقت صاف پاک لیس اور رواں دواں معلوم ہوتے ہیں۔ غزلیں آزاد ہونے کے باوجود بھی لطف، عنایت اور رکھاس سے لبریز ہیں۔ یہی تنگی اور عنایت دلوں کو توانائی اور رعنائی سے اور ماضی کے تھرکنے سے نکلے اور حال اور مستقبل سے ہم آہنگ ہونے پر اُکساتی ہے لیکن ماضی تو ہر وقت اور ہر صورت میں فراموش کرنے کا درس نہیں دیتی بلکہ اس کے زیرِ سایہ پھلنے پھولنے اور پیچھے کی آواز بازگشت سناتی ہے۔ اس طرح سے اُن کی شاعری ماضی اور حال و مستقبل کا سنگم بن جاتی ہے۔

مظہر امام کی آزاد غزلوں نے اپنے نزدیک دو ترک عملا دیئے ہیں اور بہت سے شعرا آزاد غزل گوئی کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ اس صنف کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے میں مشہور شاعر جناب کرامت علی کرامت کے مضامین کا بھی کافی ہاتھ ہے۔ اس صنف کو مقبول بنانے کے سلسلے میں مظہر امام اپنی کوششوں سے مطمئن نہیں ہیں۔ اُنھوں نے تعداد کے اعتبار سے بہت کم آزاد غزلیں کہی ہیں اور وہ بھی ہال لئے تھے کے بعد سامنے آئی ہیں لیکن پھر بھی اُن کی آزاد غزلوں نے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اس صنف کو فروغ دینے کے لئے زیادہ سے زیادہ اقدامات کرتے ہیں۔

آنگن میں ایک شام

شام کی
لمحہ لمحہ
اُترتی ہوئی
دُھند میں
سر جھکائے ہوئے گھر کے
خاموش آنگن میں بیٹھے ہوئے
میری واماندہ آنکھوں کو جلتی ہوئی ریت سے
اک بپھرتے سمندر کی آوارہ لہریں اچانک اُبھرنے لگیں !

شام کی
رستہ رستہ
اُترتی ہوئی دُھند میں
اس بپھرتے سمندر کی آوارہ لہروں کو
چوری چھپے
دفن کرتا پڑا

اُس کھنڈر میں
جہاں مُردہ صدیوں کے بھٹکے ہوئے راہ رَو
چھپتے پھرتے ہیں
اپنی ہی کھوج میں !

خوف کا سانپ
رگ رگ میں خوں کی طرح سرسراتا رہا :
رات کے چیدبے کار لمحات کی رازداں
دیکھ پائے نہ پھرے سمندر کی آوارہ لہروں کا چہرہ کہیں
اور پوچھے محبت سے، اصرار سے :

یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا ہوا ؟
کچھ مجھے بھی کہو —— !

شعاعِ فردا کے رازدانو !

حیات کا قافلہ بھٹک کر یہ کیسی منزل پہ آگیا ہے
نہ کوئی رہبر، نہ کوئی ہمدم
بس ایک لا انتہا خموشی
جو تیرگی کی مُہیب پلکوں پہ منجمد ہو کے رہ گئی ہے

شکستہ پا، خستہ حال راہی
اُداس، گُم سُم
بس اپنی ہی سانس گن رہا ہے —— !

شعاعِ فردا کے رازدانو !
جو تم زمان و مکاں کی پہنائیوں سے آگے
کوئی نئی رہ گذار پاؤ
تو کاروانِ حیاتِ خستہ کا نام لینا
شکستہ پا کا سلام لینا

جنوں ابھی دیدہ ور نہیں ہے
خرد ابھی معتبر نہیں ہے
ابھی تو ختم سفر نہیں ہے
ابھی تو ختم سفر نہیں ہے

بے ادب ستاروں نے

بے ادب ستاروں نے
نیند میں مُخل ہو کر
تم سے کچھ کہا ہوگا
لیکن اُن کی باتوں کا
تم یقین مت کرنا
آؤ، آ کے خود دیکھو
مضطرب کہاں ہوں میں !

کتابوں کی باتیں

کچھ نئی کچھ پرانی مطبوعات

فکر تونسوی
پروفیسر قمر رئیس

جوگندر پال نے ایک نیا اور انوکھا ناول تلیز کیا ہے "نادید" جھجکتا ہوں کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار کروں یا نہ کروں۔ اظہار بھی کروں تو یوں لگے، اظہار نہیں کیا ہے۔ اور اظہار نہ کروں۔ تو یہ سوچ کر تسکین حاصل کر لوں۔ کہ اظہار کی ضرورت تو اظہار سے بے نیاز تھی۔ کیونکہ اس ناول میں خود جوگندر پال ایک مقام پر کہتا ہے کہ:

"شاباش! میں صرف سوچ رہا ہوں۔ جو ہمیں بولنا ہے شروع! وہ صرف تمھیں بولنا ہے۔ اور جو تمھیں سُننا ہے وہ صرف تمھیں سُننا ہے۔ اور مجھے صرف سوچنا ہے، چلو شروع کریں۔ لو، میں سوچ رہا ہوں، تمھاری ساری سوچیں صرف میری ہو گئی ہیں۔ یعنی میری بجائے تم ہی سوچ رہے ہیں، تمھاری سوچیں، میری ہو گئی ہیں۔ یعنی میری بجائے ہم ہی سوچ رہے ہیں، یعنی ہماری بجائے میں ہی سُن رہا ہوں، میں ہی بول رہا ہوں۔۔۔ ٹھہرو بولا! مجھے لگ رہا ہے ہم تین نہیں رہے، ایک ہو گئے ہیں۔ ہاں، غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ ہم تین ہیں، یا ایک؟"

مکرمی، جوگندر پال کے اس ناول میں آغاز سے اختتام تک اظہار کی یہی تکنیک کارفرما ہے۔ پورا ناول ایسے ہی سادہ مگر پُرکار لہجے میں گوندھا گیا ہے۔ اس لہجے میں، اگر میں جھجک کر ہی سہی، یہ کہوں۔ کہ میں رائے کا اظہار یوں کروں۔ جیسے رائے میں دے رہا ہوں، اظہار تم کر رہے ہو، بلکہ رائے بھی تم دے رہے ہو، اظہار بھی تم کر رہے ہو۔ بلکہ تم جو رائے دے رہے ہو، وہ رائے نہیں ہے، اظہار ہے۔ اظہار اور رائے میں کوئی تفریق نہیں۔ ہم سب ایک ہیں، دو نہیں ہیں، تین نہیں ہیں ایک سر چاہے دوسرا سُنتا ہے۔ اور دوسرا وہی سُنتا ہے جو تیسرا سوچتا ہے۔

جوگندر پال کے اس ناول کا مرکزی خیال ہے اس میں اچھوتا پن بھی موجود ہے، اچھوتا گیان بھی۔ اور دھیان بھی۔ یہ ہمارے موجودہ معاشرے کی پستی زیادہ اور کم ہوتی ہوئی بلندی کو دیکھنے والی محسوسات کی ایک آنکھ ہے۔ جو دیکھ سکتی ہے مگر دیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ جدید ترین علامتی اظہار بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔ تجربے اور نئے تغیر کی طوفانی لہروں میں اُلجھنا، اُکھڑنا، بکھرنا، اور کسی کسی کا جُڑنا پھر بکھرنا، طرزِ نو کا شیوہ بن گیا ہے۔ جوگندر پال نے اپنے اس ناول کو تجربے اور تغیر کی پیچیدہ جدیدیت کے سپرد کر دیا مگر اس سنبھالے کے ساتھ کہ اُس کے صالح مرکزی خیال کی عظمت نے اُسے اُلجھاوے اور اکھڑاؤ سے حتی الامکان محفوظ رکھا۔ کیونکہ صدق، صفا اُس کی عظمت میں سرا سر شاملِ حال رہی۔ اور اسی جس غیر ضروری دلدل سے بھی اس ناول کو محفوظ رکھا۔ اس دلدل کا نام ابہام ہے۔ جس نے ہمارے ادب کی جدیدیت کو ماضی کے حُسن سے توڑا ہے بھی۔ حال سے بھی بے حال کر کے رکھ دیا ہے۔

ناول کے مرکزی خیال کی عظمت کیا ہے؟ ناول بڑا واضح اور بے باک جواب دیتا ہے کہ ہم اس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں۔ جس کی دونوں آنکھیں تو موجود ہیں۔ مگر دیکھنے کی صلاحیت کے باوجود دیکھ نہیں سکتیں۔ اور جو خود دیکھ بھی لیتا ہے، وہ سراسیمگی کے عالم میں کہے جا رہا ہے کہ میں تو اندھا ہوں۔ تم سب کی طرح جو صرف سوچ سکتے ہیں۔ دیکھ نہیں سکتے۔ یعنی دیکھ سکنے والی آنکھیں بھی اندھوں میں اندھا بن کر رہنا چاہتی ہیں۔ کیونکہ اندھوں کے معاشرے میں اندھا بن کر رہنے کا طریقہ ہی سب سے محفوظ طریقہ ہے۔ اسی طریقے سے ہی اس کی ذات کا امیج برقرار رہتی ہے۔ وہ خود برقرار رہتا ہے۔ اگر وہ واقعی اعتراف کرے۔ کہ وہ دیکھ سکتا ہے۔ تو نابیناؤں کا پورا ہجوم اُس کے ٹکڑے چیر کر رکھ دے۔

ناول کا ہیرو ایک بیلا ہے۔ جو پہلے اندھا تھا۔ لیکن اچانک ایک ایکسیڈنٹ میں اُسے وہ آنکھیں عنایت ہو جاتی ہیں۔ جو گرد و پیش کی ہر شے کو دیکھ لیتی ہیں۔ دیکھ لینے کی استطاعت نصیب ہوتے ہی وہ سراسیمہ ہو جاتا ہے۔ اُس کا وہ امیج جو اُسے اندھے معاشرے میں سُرخ رو رکھتا تھا۔ اُسے اپنا رہنما تسلیم کیا جاتا تھا۔ مسخ ہونے لگتا ہے۔۔۔ اندھا تھا تو اس کی خو میں نیکی تھی۔ دیدبلی۔ تو اُس کی نیکی کی خو دبنے اور رچھپنے لگی۔ اس خوف سے کہ اُس کی خو کہیں فنا نہ ہو جائے۔ وہ تصنع کے سہارے اپنے اندھے پن کو زندہ رکھنے لگتا ہے۔ پوز کرتا ہے۔ اندھے پن اور بینائی کی کربناک کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جتنے بھی سیاسی، معاشی اور مذہبی رہنما ہیں۔۔۔ وہ سبھی کچھ نہ کچھ فی صدی، اسی کش مکش کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ نیکی کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن بینائی کی بُرائیاں اُسی کام میں سدِ راہ بن جاتی ہیں۔ آپ سب نے محسوس کیا ہو گا کہ معاشرے کی اقتصادی، سماجی اور سیاسی بُرائیوں کو ہمارے سبھی رہنما جانتے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں۔ مگر اُن کا گلا گھونٹنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ دیکھ بھال کر بھی اُن کے خلاف مجاہدانہ اقدام نہیں اُٹھاتے۔ اس خوف سے کہ کہیں یہ مجاہدانہ قدم، اُن کی ذات کی چمک دمک والی امیج کا گلا نہ گھونٹ ڈالے۔ لہٰذا وہ اپنے شعور کی آنکھ بند رکھتے ہیں۔ اندھے بنے رہتے ہیں۔ اور بظاہر معصوم بن کر یہ کہتے رہتے ہیں کہ کاش! ہماری آنکھیں ہوتیں۔ تو ہم دیکھ سکتے کہ اندھے، پاک اور معصوم معاشرے کا استحصال کون کر رہا ہے کیسے کر رہا ہے۔ اور آہ! کیا وہ یہ استحصال اُس وقت تک کرتا رہے گا۔ جب تک ہم بے دھڑک یہ اعلان نہ کر دیں۔ کہ ہماری ایک تیسری آنکھ بھی وجود میں آ چکی ہے۔ جو شیو جی کی طرح کی تیسری آنکھ ہے۔ اور جو معاشرے کے دُشمنوں کو اندھے کوئیں میں دھکیلنے والے دُشمنوں کا ستیاناس کر سکتی ہے۔

اس ناول "نادیدہ" میں لفظ اندھا ایک علامت ہے۔ جو مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور پورا ناول ایک گھومتے ہوئے دائرے کی طرح، مسلسل اس مرکزی نقطے کی آنچ سے حرکت اور حرارت قائم رکھتا ہے۔ شکر ہے (پتہ نہیں کس کا) کہ اس واحد اور واضح علامت کو مبہم ایمائیت کے بجھنور

میں اُلجھایا نہیں گیا۔ جیسا کہ ہمارے جدید ترین ادب میں ایک صاف اور شفاف خیال کو اُلجھا اُلجھا کر پہلے تو غائب کر دیا جاتا ہے اور پھر حکم دیا جاتا ہے۔ کہ یہ باطنی اُلجھاؤں کا ایک بھنور ہے۔ لہٰذا قاری کا فرض ہے کہ اس خیال کو کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ نکالے۔ (نہیں ڈھونڈ سکتا تو جہنم میں جائے، نالائق کہیں کا)

جوگندر پال ہمیں ایسے جہنم کی دعوت نہیں دیتا۔ خیال صاف، علامت صاف بلکہ شفاف اور خوبصورت، اور اسی حُسنِ علامت کے اِرد گرد اُس نے پلاٹ کا تانا بانا بُنا ہے۔ علامت کے طور پر ہی اُس نے اندھوں کا ایک گھر بنایا ہے۔ یہ گھر نہیں ہے بلکہ موجودہ معاشرہ ہے، معاشرے کا نام ہی اندھوں کا گھر ہے۔ اس گھر میں پانچ چھ اندھے کردار زندگی کے لمحے یوں گذارتے ہیں۔ جیسے یہ لمحے گذارنے پر وہ مجبور ہوں۔ مگر پھر بھی اس مجبوری میں تسکین اور مسرت اور ترقی کے سامان ٹٹولتے اور محسوس کرتے رہتے ہیں۔ ایک جسم کا لمس دوسرے جسم کے لمس کو تشفی عطا کرتا ہے، نفرت، غصہ، ہمدردی اور بے نیازی، حسد، حسرت اور غم کی بے شمار جھلکیاں، اس ناول میں بکھری ہوئی ہیں۔ اور بکھری ہوئی یوں ہیں۔ کہ اندھے ہونے کی وجہ سے وہ اپنی سوچ اور گفتگو کو یوں محسوس کرتے ہیں۔ جیسے آنکھیں نہ ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ چیزیں دیکھ رہے ہیں — جو دیکھنے والی آنکھوں کے نصیب میں بھی نہیں۔

ہاں، جوگندر پال ہمارے نیم صنعتی معاشرے کی زیادہ سے زیادہ کرب ناک ٹریجڈیاں ہمیں بتاتا ہے کہ اس معاشرے میں جینے والے انسان کتنے بے بس، بے کس، مجبور اور محبوس ہیں۔ کہ جو کچھ اُن کے اِرد گرد، ظلم، تعدی، انتشار، لوٹ کھسوٹ، روایات کی بہتر قدروں کا زوال، نئی قدروں کا فقدان — غرض ہر قسم کی خود غرضانہ کیفیتوں کی کار فرمائی ہو رہی ہے۔ ہم لوگ انھیں دیکھنے کے باوجود نہیں دیکھ رہے۔ نہ دیکھنے کے عالم میں مسرت اور تسکین کے چند مسلسل لمحے کبھی کبھی حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن یوں جیسے اُن میں نشاط کا حصول غائب ہو۔ ان کے ظاہر میں نشاط کی کچھ ایک جھلکیاں موجود ہیں۔ مگر باطن میں آرزوؤں کی جو لہریں پوشیدہ ہیں، وہ انھیں دیکھ نہیں سکتے۔ دیکھنا چاہیں تو سماجی نظام انھیں دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے وہ اندھے پن کی زندگی کے چند سانس گزارنے کو مقصدِ اعلیٰ سمجھے بیٹھے ہیں۔

بے بسی کا یہ دردناک تصور دیکھ کر جی چاہتا ہے۔ کہ ایک آہ بھریں اور جوگندر پال کے ناول کی سطح کی ایک آہ بھریں۔ کیونکہ یہ ناول بھی تاریخ کی ایک آہ ہے۔ بلکہ صرف آہ نہیں، زبردست احتجاج بھی ہے۔ اور ہر اعلیٰ ادب، احتجاجی ادب ہی ہوتا ہے۔ صاف ستھرے، توازن اور سادہ لہجے کے باوجود یہ کار احتجاجی نشتر۔

اور یہ احتجاج کرتا ہے کہ اے استحصال کی جابر طاقتو! تم نے معاشرے کو اندھا بسلئے رکھنے پر کیوں مجبور کر رکھا ہے۔ کیوں اُس کی آنکھیں نوچ لی ہیں۔ کیوں ایک اندھا کنواں تسلیم کر رکھا ہے جس میں سارے معاشرے کو آہستہ آہستہ خودکشی کی ترغیب دی جا رہی ہے۔

ناول جب اپنی عروجی منزل پر پہنچتا ہے۔ تو معاشرے کے خداوند اُس نیک خو بابا کو ایک بجلی اور نقری کرسی پر بٹھا دیتے ہیں۔ اور اُس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ نیشنل اور انٹرنیشنل بدخو حاکم طاقتیں اُسے اندھے پن سے محروم کر کے اُس کی ریاضت اور نیک نفسی کا قلع قمع کر دیتی ہیں اور اُسے اندھوں کے گھر سے الگ کر دیتی ہیں۔ اندھے، جسے اپنا رہنما تسلیم کرتے تھے۔ پہلے تو کرسی کے انداز پر جھوم اُٹھتے ہیں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اداس ہو جاتے ہیں، کہ اُسے اگرچہ بینائی مل گئی ہے مگر پھر بھی وہ آنکھوں کے باوجود اندھا بنے رہنے کی مکاری کر رہا ہے۔

لیکن آخر میں جوگندر پال نے اپنے ناول کا ایک مثبت موڑ دیا ہے۔ کہ اندھے بابا کی قدیم نیک خوئی کی صفت اُس کی روح میں اضطرابی ہلچل مچا دیتی ہے۔ اور وہ جابر قوتوں کا پُرزہ بننے کی بجائے خودکشی کر لیتا ہے۔

شاید یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ خودکشی نہیں ہے بلکہ معاشرے کی نیک صفتوں کا احتجاج ہے۔ وہ احتجاج جو کبھی فنا نہیں ہوتا۔ شیطنت کی طاقتوں کے خلاف یہ نیک صفتی ایک زبردست تیر آزمائی ہے جو اگرچہ اندھی ہے مگر پھر اُس کی تیسری آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ اور کسی بھی لمحے تانڈو ناچ کر کے استحصال کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔ معاشرے کے ایسے اندھے پن کو بینائی عطا کر سکتی ہے۔

●●●

کالم نگار نمبر

ادیب اور صحافی کے درمیان کالم نگار کی حیثیت کم و بیش وہی رہی ہے جو تیسری جنس کی مانی جاتی ہے۔ فکر تونسوی چونکہ خود کالم نگار رہے ہیں اس لئے ہمیشہ اپنی اس مشتبہ حیثیت پر کڑھتے رہے اور اسے ادب میں ایک معتبر اور مستند مقام دینے کی ترکیبیں سوچتے رہے۔ زیرِ نظر کالم نگار نمبر اسی فکر و تشویش کا ثمر ہے لیکن ایسا کہ اسکی داد دیئے بغیر چارہ نہیں۔ وہ واقعی کالم نگار کو مشتبہ جنس سے نکال کر لائے ہیں۔ اور اپنے حسنِ انتخاب سے ادب اور صحافت دونوں میں اس کا حقیقی مقام بحال کر دیا ہے اس یادگار نمبر میں فکر صاحب نے اودھ پنچ کے دور سے ابتک کے کالم نگاروں کی نمائندہ تحریروں کا جو انتخاب کیا ہے شاید اس سے بہتر انتخاب ممکن نہیں تھا۔ پرانے رسائل کی گرد سے انھوں نے ایسے تیر و نشتر نکالے ہیں جن کی چبھن آج بھی تڑپا دیتی ہے۔ فکر صاحب کا پیش لفظ اور تعارفی نوٹ بھی اپنے جاندار ظریفانہ اسلوب کا نمونہ ہیں

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

شکیب نیازی

سفر آشنا ایک جائزہ

کتاب کا نام : سفر آشنا
مصنف : پروفیسر گوپی چند نارنگ
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
قیمت : پندرہ روپئے۔
صفحات : چھیاسی ۸۶

ایک کمی سال پروفیسر نے ۹ جولائی ۱۹۸۱ء میں پانچ مغربی ممالک جرمنی، ناروے، کینیڈا، امریکہ اور برطانیہ کا سفر کیا۔
نام ہے، گوپی چند نارنگ
واپسی پر چھیاسی صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔
نام رکھا "سفر آشنا"
(۱) سیل سفر (۲) شجر سایہ دار۔ (۳) بہر سو رقص بسمل (۴) منزل منزل عشق و جنوں (۵) تبسم گل فرصت بہار، عنوانات کے تحت پانچ ابواب پر مشتمل یہ چھوٹی موٹی سی کتاب ۱۹۸۲ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی ہے۔

اس کتاب کے چند ایسے حصے ملاحظہ فرمائیں جن سے نارنگ صاحب کے اخلاقی منصوبے کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یورپ کے سائنسی کرشموں میں ایک حیرت انگیز ایجاد کمپیوٹر بھی ہے اور وہاں اس سے جو کام لیا جاتا ہے وہ بھی کسی معجزے سے کم نہیں۔ میڈلسن میں قیام کے دوران پروفیسر نارنگ نے بھی کمپیوٹر کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا امتحان لیا۔ اب آگے آپ انھیں کی زبانی سنئے۔

"مجھ سے پوچھا گیا کہ کسی چیز کا تصور کیجئے۔ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کی زندگی میں جس نوعیت کے بعض کرداروں سے سابقہ رہتا ہے میں نے یکسلخت کئی جانداروں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ پھر پوچھا گیا کہ اس کے سینگ ہیں۔ میں نے کہا ہاں پھر پوچھا گیا کہ اس جاندار کی خوراک کیا ہے۔ وہ گوشت کھاتا ہے کہ گھاس، سواری کے قابل ہے کہ نہیں، دولتی جھاڑتا ہے دودھ دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں کہا گیا آپ نے گدھے جیسی کسی احمق چیز کے بارے میں سوچا تھا۔ جواب اثبات میں تھا۔" صفحہ ۳۱

دیکھا آپ نے ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کا کیا مقام ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، آخر پروفیسر صاحب نے اپنے آپ کو ہندوستانی اساتذہ کی فہرست سے خارج کیوں سمجھا؟

اب آئیے ان کی طرز نگارش کا دوسرا نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

"زہرہ مرکزی لندن کے ایک نہایت ہی فیشن ایبل علاقے میں رہتی ہیں۔ ان کے میاں ماجد علی ابوظہبی کے شیخ کے مالی مشیر ہیں۔ فلیٹ کا محل وقوع اور آرائش و کشادگی دیکھ کر دل خوش ہوا۔ دہلی میں بعض اردو والوں کے ذہنی امراض کے لئے زہرہ کے فلیٹ کی زیارت نسخۂ شفا کا کام دے سکتی ہے۔" صفحہ ۴۳

جہاں تک ہم سمجھتے ہیں ذہنی امراض کا تعلق بیشتر ناہمواریوں اور ناآسودگیوں سے ہے۔ پتہ نہیں نارنگ صاحب کے علم میں یہ بات ہے یا نہیں اور اگر ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے اردو کے ذہنی مریضوں کے لئے صرف زہرہ کے فلیٹ کا ہی انتخاب کیوں کیا۔

اسی کتاب میں ساقی فاروقی کے کردار کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے۔

"باہر نکلے تو پڑوسن چھوٹے نوارے سے گلاب کی کیاری میں پانی دے رہی تھی۔ علیک سلیک ہوئی۔ ساقی نے خیریت پوچھی اس نے بھی خیریت پوچھی۔ ساقی نے کہا خدا کا شکر ہے بیوی میکے گئی ہوئی ہیں۔ میں بالکل اکیلا ہوں تمھارا جب جی چاہے آجاؤ بس یہ سڑک بیچ میں ہے۔ وہ کچھ مسکرائی کچھ شرمائی۔ گلابوں کو پانی دینے لگی۔ میں نے کہا ساقی یار کیا بدتمیزی ہے۔ کہنے لگے میں تو فرمودات ربانی پر عمل کر رہا ہوں۔" بھئی سبحان اللہ۔ مزہ آگیا۔ فرمودات ربانی پر عمل کس طرح کیا جا سکتا ہے یا کس طرح کیا جانا چاہئے۔ ساقی فاروقی نے اس کی عملی مثال پیش کر کے بہت سے ایمان والوں کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔ مذہب کی صحیح قدر شناسی غالباً اسی اسپرٹ کا نام ہے جس کی طرف ساقی نے اشارہ کیا ہے۔ اور پھر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس واقعے کو دہرانے کی ضرورت گوپی صاحب نے کیوں محسوس کی؟ ان غیر شائستہ باتوں کے بعد اسی کتاب سے ایک فکر آمیز سنجیدہ تحریر ملاحظہ فرمائیں۔ نارنگ صاحب رقم طراز ہیں۔

"دہلی کے ان کرم فرماؤں کی بھی یاد آئی جنھیں خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کو حسد اور رقابت کی راہ میں فیاضی سے لٹاتے رہتے ہیں، جو بڑی بڑی انسان دوست تحریکوں سے وابستہ ہیں لیکن جنھیں سازشیں بونے اور نفرتیں کاٹنے میں کمال حاصل ہے کیونکہ ذہنی کشادگی اور انسانیت سے ان کی صاحب سلامت بھی نہیں اللہ ان پر رحم کرے اور انھیں جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے۔" صفحہ ۲۶

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد بے ساختہ وہ شعر یاد آگیا جو شاید ایسی ہی صورت حال کے لئے لکھا گیا تھا۔ آپ بھی سن لیجئے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

پروفیسر صاحب کے اردو کے متعلق چند محبت آمیز بیانات ملاحظہ ہوں۔

"یہ وہ ملک تھا جہاں میں نے جوانی کے پانچ برس صرف کئے تھے، اردو کی تعلیم و تدریس کے لئے مقدور بھر سعی کی تھی، اور دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا تھا۔" صفحہ ۲۵

"اردو کے رشتے کہاں تک ہیں اور کہاں نہیں، کہاں زبان کی حد ختم ہوتی ہے

اور جان کی شروع ہوتی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یا کوئی سطح ایسی بھی ہے جہاں جسم، جان، روح، ایمان سب تحلیل ہو جاتے ہیں اور محض عین باقی رہتا ہے۔ کیا میرے لئے اردو ایسا ہی عین سا ہے؟ ” صفحہ ۲۶

” اردو میرے لئے دیوانگی کا سودا کب نہیں تھی “ صفحہ ۲۷

” اردو کی تعلیم و تدریس کے لئے مقدور بھر سعی کی تھی “ اور ” کیا اردو میرے لئے ایسا ہی عین سا ہے “ یا ” اردو میرے لئے دیوانگی کا سودا کب نہیں تھی “ وغیرہ وغیرہ۔ غیر سنجیدہ قسم کی باتیں پروفیسر صاحب کے منھ سے کچھ زیادہ بھلی معلوم نہیں ہوتیں۔ کیوں کہ ایسی جذباتی باتوں سے ایک عام قاری کو پروفیسر موصوف کی صحیح عمر جاننے میں سخت دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ لہٰذا انھیں اپنی عمر کے مطابق ایسی باتیں کرنا چاہئیں جس سے ان کی بزرگی پر آنچ نہ آنے پائے۔

اور پھر حضور والا اگر آپ کو اردو سے واقعی ایسا قلبی لگاؤ سا ہے جیسا کہ آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے تو اس کے لئے اتنا ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ اردو سے محبت کرتے بھی ہیں تو کون سا احسان کرتے ہیں۔ اس محبت کی آپ پوری پوری قیمت بھی تو وصول کر رہے ہیں۔ یہ عہدہ، یہ بنگلہ، یہ عیش و عشرت، یہ رنگ رلیاں، یہ بیرون ممالک کے دورے۔ سب کچھ اردو ہی کے طفیل میں تو ہیں۔ ورنہ سوچنے کا مقام یہ ہے کہ اگر آپ میں سے اردو کو منہا کر دیا جائے تو باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔ صرف گوپی چند نارنگ! اور بغیر اردو کے روزانہ نہ جانے کتنے گوپی چند نارنگ ہیں جو سڑکوں کی دھول پھانکتے رہتے ہیں اور جنھیں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔

اب آئیے ذرا ” سفر آشنا “ کی کچھ مضحکہ خیز باتوں سے بھی لطف اندوز ہوتے چلیں۔ اس سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ نارنگ صاحب کے اس سفر کا اصل مقصد کیا تھا۔

” پھلوں اور پھولوں کی دکانوں کی فرنٹ میں بڑی افراط ہے۔ خاص طور سے آلوچا، آلو بخارے اور شفتالو خوب خریدے جا رہے تھے۔ “ صفحہ ۱۶

اور دیکھئے۔

” ریڑھی والے ہمارے یہاں کی طرح زور زور سے آوازیں لگاتے اور رنگین کاغذوں میں مال لپیٹ لپیٹ کر دیئے جاتے تھے۔ “ صفحہ ۱۶

اور ملاحظہ کیجئے

” کاردنیشن کے قریب پھولوں کی دکانوں کو میں دیکھتا ہی رہا “ صفحہ ۱۶

لندن میں ٹیلی فون کس طرح کیا جاتا ہے وہ بھی سن لیجئے ورنہ بعد میں نارنگ صاحب سے یہ شکایت نہ کیجئے کہ لندن میں ٹیلی فون کرنے کا طریقہ انھوں نے آپ کو نہیں بتایا۔ تو لندن میں دیکھئے ٹیلیفون کس طرح کیا جاتا ہے۔

” لندن میں طریقہ یہ ہے کہ پہلے نمبر گھمائیے، پھر پپ پپ کی آواز آتی ہے تب سکہ ڈالنا پڑتا ہے۔ “

دیکھا آپ نے لندن میں ٹیلیفون اس طرح کیا جاتا ہے یعنی نمبر گھمانے کے بعد ٹیلیفون کا پپ پپ کرنا نہایت ضروری ہے۔ خدانخواستہ ٹیلیفون پپ پپ کرنا بند کر دے تو سمجھ لیجئے کہ ٹیلیفون کے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔

قارئین کرام یہ کتاب جہاں ایسی کئی مضحکہ خیز باتوں سے بھی پڑی ہے وہاں اپنے اندر کئی انکشافاتی پہلو بھی رکھتی ہے۔ مثلاً ساقی فاروقی کے بارے میں اردو قارئین کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ بحیثیت انسان ہونے کے جانوروں سے زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ جانوروں کے ساتھ رہتے رہتے نہ صرف ان کی بولی سمجھنے لگے ہیں بلکہ جانوروں سے جانوروں کی طرح گفتگو بھی کر لیتے ہیں۔ اس حیرت انگیز معلومات کے لئے ہمیں بہر حال نارنگ صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

” اتوار کا دن تھا ساقی فاروقی اپنے جانوروں کے ساتھ محو گفتگو تھے “ صفحہ ۱۵

اب آئیے ذرا ” سفر آشنا “ کے تعلق سے تھوڑی سنجیدہ باتیں ہو جائیں۔ اس کی وجہ دراصل یوں پیش آئی کہ اس کتاب میں نارنگ صاحب نے کہیں کہیں سنجیدہ ہونے کے پوز بھی دیئے ہیں۔ جن سے ایک عام قاری ان کے تعلق سے غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے قاری کو اِدھر اُدھر نہ بھٹکنے دیں اور اسے صحیح صورت حال سے آگاہ کرائیں۔ کیوں کہ یہیں نارنگ صاحب کے نظریئے کی آزمائش بھی مقصود ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ ہماری اس آزمائش پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔

نارنگ صاحب فرماتے ہیں۔

” یہ ممکن تھا کہ میں لندن سے سیدھا نیویارک جاتا اور وہاں سے فلائٹ بدل کر واشنگٹن روانہ ہوتا۔ لیکن نیویارک سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ “ صفحہ ۲۰

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ نارنگ صاحب کو نیویارک سے واقعی نفرت رہی ہے مگر کبھی انھوں نے اس نفرت کا جواز ثابت نہیں کیا۔ کچھ تو حالات رہے ہوں گے جس کے تحت انھوں نے اپنی اس نفرت کا اظہار کیا ہے۔

” میں بار بار سوچنے پر مجبور ہوا کہ قطع نظر اس امر کے کہ مغربی ملکوں کا تموّل اور افراطِ زر دراصل مشرق کے افلاس اور پس ماندگی کی دین ہے۔ صدیوں کی سامراجی پالیسیوں نے افریقہ اور ایشیا کو ایسا محتاج بنا کے رکھ چھوڑا ہے کہ ان کے لئے کوئی راہِ نجات دکھائی نہیں دیتی۔ جہازوں، راکٹوں اور فوجی ساز و سامان کی صنعتیں اربوں کھربوں کے منافع کی صنعتیں ہیں۔ یہاں کی پروڈکشن لائنز کو مصروف رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے، مشرقی ممالک میں فوجی ساز و سامان کی کھپت اور استعمال۔

گویا مفاد پرستی اور منافع خوری کی اندھی دوڑ ہے جس میں سب لگے ہوئے ہیں۔ ویت نام کیا ہوا۔ ایران میں کیا سامنے آیا۔ اسرائیل کس کی شہ پر سب کچھ کرتا ہے۔ مغربی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں کیا بھیانک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔" صفحہ ۲۳

ان خیالات کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگانے میں ذرا دشواری نہیں ہوتی کہ نارنگ صاحب موجودہ حقائق سے پوری طرح واقف ہیں۔ وہ اس سیاسی پس منظر سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں جس کے تحت یہ سرمایہ دارانہ ممالک، ایشیا، افریقہ کو، دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی علم ہے کہ ان تمام سیاسی قزاقوں کا سرغنہ صرف امریکہ ہے۔ مگر رونا تو اسی بات کا ہے کہ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی حقیقت کے راست اظہار سے گریز کر رہے ہیں۔ ان سے بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب آپ سچائی سے پوری طرح واقف ہیں تو سرمایہ داری کے خلاف کھل کر کیوں نہیں لکھتے۔ افلاس زدہ خلقت کے لیے کام کیوں نہیں کرتے۔ استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے میں عار کیوں محسوس کرتے ہیں اور ترقی پسند قوتوں کے خلاف آپ نے جان بوجھ کر محاذ کیوں قائم کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے نارنگ صاحب کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔

مجھے یہاں وارث علوی کے امریکی سفر کی یاد آ رہی ہے۔ وارث علوی کی تنقید سے مجھے سخت اختلاف ہے، بلکہ میں ان کی تنقید کو تنقید کم اور دشنام طرازی زیادہ سمجھتا ہوں۔ تاہم مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی شرمندگی محسوس نہیں ہو رہی کہ کردار کی سطح پر جدید ناقدین میں سب سے قد آور شخصیت وارث علوی کی ہی ہے۔ کم از کم وارث علوی نے مردانہ جرأت کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کی دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑنے کی کوشش کی ہے۔ مغربی ممالک کے استحصال کا پردہ تو چاک کیا ہے۔ اس لحاظ سے نارنگ صاحب کے بجائے وارث علوی کی فراہم کردہ معلومات ہمارے لیے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

"سفر آشنا" سے اسی قسم کا ایک اور مبہم اقتباس دیکھیے۔

"امریکی گھروں میں کتابیں دکھائی دے جاتی ہیں، لیکن زیادہ تر سجاوٹ کے طور پر یا انسائیکلوپیڈیا کی قطاریں۔ پورا پورا شہر گھوم جائیے۔ سنجیدہ کتابوں کی دکان آسانی سے نہیں ملے گی۔" صفحہ ۷۲

کیا ہی اچھا ہوتا اگر نارنگ صاحب اس کی وجہ بھی بیان کر دیتے کہ ایک سرمایہ دار ملک میں جنسی، ہیجانی، جاسوسی اور سنسنی خیز موضوعات پر مبنی رسالے اور کتب اتنی وافر تعداد میں آسانی سے دستیاب کیوں ہو جاتے ہیں اور اس بے ہودہ لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ شائع کرنے کے پیچھے سرمایہ داروں کے ایجنٹوں کا کیا مقصد ہوتا ہے اور وہ اس لٹریچر سے کیا کام لینا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور بیان دیکھیے۔

"ناروے میں تقریباً سو صفحے کی کتاب ۸۰، ۹۰ کرونر یعنی دو سو روپے کی فروخت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ فائدہ بھی تو ہے کہ ایک کتاب کی اشاعت سے مصنف کو تیس پینتیس ہزار روپے مل جاتے ہیں۔" صفحہ ۷۳

یہ بات لگتی تو بڑی دل خوش کن ہے کہ ایک مصنف کو سو صفحے کی کتاب پر تقریباً تیس پینتس ہزار روپے مل جاتے ہیں مگر اس کا دوسرا رُخ نارنگ صاحب نے پیش نہیں کیا، یعنی حضور والا نے یہ نہیں بتایا کہ اس سو صفحے کی کتاب پر پبلشر اور اس کے حواریوں کو کتنا نفع پہنچتا ہے اور یہ کہ وہ کتاب کتنی تعداد میں چھپتی ہے۔

اب ذرا پروفیسر صاحب کی تنقیدی بالغ نظری کی بھی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔ تنقید کے سلسلے میں نارنگ صاحب وفاداری کو اولین شرط مانتے ہیں۔ یعنی جس شخص سے وفاداری نبھانا مقصود ہو تو وہ اپنی تنقید میں اس شخص کی گھٹیا سے گھٹیا تخلیق کو خراج تحسین پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اپنے اس نظریے پر سختی سے عمل پیرا بھی ہیں۔ مثلاً صلاح الدین پرویز کی "نمرتا" کو نارنگ صاحب نے تخلیق کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے۔ جب کہ بیشتر باشعور اور سلجھے ناقدین نے اس ناولٹ کو منہ تک سے نہیں لگایا۔

بہرحال نارنگ صاحب اس لحاظ سے تو احترام کے لائق ہیں کہ انھوں نے دیارِ غیر میں بھی اپنے اس کرم فرما کی شاعری اور نمرتا دونوں کو اپنے حافظے کا ضروری حصہ بنائے رکھا اور جہاں کہیں بھی موقع ملا وہ اس کی مدح سرائی میں مشغول ہو گئے۔ اب یہ بات جانے دیجیے کہ آخر نارنگ صاحب کا بطور نقاد کیا مقام ہے یا ان کی تنقیدی رائیں کس نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ ایک جگہ ساقی فاروقی سے فرماتے ہیں۔

"جس نئے پن پر تم زور دیتے ہو اور جو ادب کی جان ہے۔ صلاح الدین پرویز کے ہاں منفرد تخلیقی شان کے ساتھ ابھرا ہے۔ اس کے کندھوں نے فرسودہ روایات کا بوجھ قبول ہی نہیں کیا۔ اس کے لہجے میں ایسی تازگی ایسا رس اور ذائقہ ہے جو یکسر اس کا اپنا ہے۔ اس کی کوئی نظیر جدید شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔" صفحہ ۵۷

لیجیے بے چارے دوسرے جدید شاعروں کا تو انھوں نے قصہ ہی پاک کر دیا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا — دراصل جدید شاعروں کی اتنی بھیڑ ہو گئی تھی کہ ان میں سے یہ پہچاننا بھی مشکل ہو گیا تھا کہ اصلی جدید کون ہے۔ اب کم سے کم یہ تو معلوم ہوا کہ صرف صلاح الدین پرویز ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کے یہاں جدیدیت ایک انفرادی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے۔

بقیہ اداریہ

معاشرہ ترقی کر سکتا ہے اور نہ ملک۔
سطور بالا میں جو باتیں کہی گئی ہیں۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک مضحکہ خیز اور حیرت انگیز معلوم ہوں گی۔ اور خود سرکاری ملازموں کی ایک بڑی تعداد اس سے اتفاق نہیں کرے گی اس لئے کہ جب درد حد سے گزرتا ہے تو دوا بن جاتا ہے۔ قفس میں رہتے رہتے صیاد سے انس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ قفس سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ ڈر لگتا ہے۔ قفس سے نکل کر جان سے گذر جانے کا خوف دامن گیر ہوتا ہے۔ اس لئے کئی سرکاری ملازم تو دفتر میں ہی رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے لئے اتوار اور تہواروں کی چھٹیاں بھی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ یہ بیمار لوگ ہیں۔ غیر معتدل اور غیر متوازن لوگ ہیں ہم اس دن سے ڈرنا چاہیئے جب لوگ غلامی کے خوگر ہو جائیں کہ آزادی مصیبت معلوم ہو۔
ہمیں ایک بار پوری سنجیدگی سے اس مطالبہ پر زور دینا چاہیئے کہ کام کے اوقات کم کئے جائیں۔ ہفتے میں ڈھائی دونوں کی چھٹی دی جائے!
اور اگر حکومت سمجھتی ہے کہ اس طرح کام کا نقصان ہوگا تو وہ ملازموں کی تعداد دوگنا کر سکتی ہے۔ اس طرح زیادہ لوگوں کو ملازمت بھی مل جائے گی اور انسان کو انسان کی طرح زندہ رہنے کا حق بھی مل جائے گا۔ اور اچھے متوازن انسانوں پر مشتمل معاشرہ کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کو انسان کی طرح جینے، تفریح، آرام، سیر و سیاحت، مطالعہ اور آزادانہ کام کرنے کی سہولت حاصل ہو۔ اور سرکاری ملازم بھی انسان ہیں انھیں بھی انسان کی طرح زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیئے!

بقیہ کتابوں کی باتیں

اس یادگار دستاویز میں گذشتہ سو سال کی سیاسی اور سماجی زندگی کے اہم واقعات اور موڑ بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس میں صرف ہندستان کے ہی نہیں پاکستان کے ممتاز کالم نگار احمد ندیم قاسمی، ابن انشاء، ابراہیم جلیس اور رفیق ڈوگر کے کالموں کا خوبصورت انتخاب بھی ہے۔ یہ خاص نمبر آفسیٹ کی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ ساتھ کالم نگاروں کی تصویروں اور خاکوں سے بھی مزین ہے۔ صفحات ۴۷۰۔ قیمت سو روپے۔

بقیہ اردو رسم الخط

جانتے وہ بھی اسے پڑھ سکے اور اس سے محظوظ ہوئے۔ جب ہندی اور پنجابی اردو رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے اردو زبان اپنے ان چاہنے والوں کے لئے جو اردو رسم الخط نہیں جانتے کیوں نہ لکھی جائے۔ اگر ایسا عام ہو جائے تو جسونت سنگھ راہی صاحب جیسے بزرگوں کی اردو کے بارے میں تشویش بڑی حد تک دور ہو جائے۔

بقیہ دشت خموشی

سڑک پر جو دوڑتے ہوئے لوگوں کی قطار ہے
اس قطار میں شامل ہونے کے لئے تنہائی کا
مکالمہ ادا کرنا ضروری ہے۔
شاہراہ عام پر ٹریفک پھر سے بحال
ہو گیا ہے ... فٹ پاتھ پر دکانیں پھر سے
سج گئی ہیں۔ بڑی بڑی دکانوں کے شٹر
پھر سے کھل گئے ہیں ... رونق کی گڑیا پھر
سے بازاروں میں ناچنے لگی ہے ... جلے
ہوئے گھروں سے گانے کے شور پھر سے
اٹھنے لگے ہیں .. جھانک رہی ہیں۔
خاکی ٹوپی والے بھی جا چکے ہیں ...
اور سب کچھ پہلے جیسا بحال ہے۔
مگر ہم دونوں کی آنکھوں میں آگ کے
شعلے پھیلتے جا رہے ہیں ...
وحشی ... درندے ... بھیڑیئے ...
جانور ... اور ایک نقش میرے دوست کا
میرے ذہن پر بن رہا ہے ...

بقیہ سوغات عید

لیے کام کا ملنا، موٹر لاریوں کے ڈرائیوروں کے لیے مسافروں کی کثرت، رئیسوں کے لئے ان کے گھوڑ دوڑ میں ان کے گھوڑے کا سب سے آگے آجانا، مالکان رسائل کے لئے ان کے عید نمبر کا بالکل فروخت ہوجانا

بابرکت مرغ :۔

اہواز کے ایک قاضی کی مالی حالت بہت خراب تھی عید الضحٰے جب قریب آئی تو قاضی نے اپنی بیوی سے کہا "عید الضحٰے سر پر آپہنچی ہے لیکن قربانی کا کوئی انتظام نہیں"

بیوی نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا "آپ غم نہ کریں میں نے ایک مرغ پال رکھا ہے اسی کو ذبح کردیں گے"

یہ بات کسی طرح ہمسایوں تک پہنچ گئی کہ قاضی صاحب کے یہاں قربانی کا کوئی انتظام نہیں۔ ہمسایوں نے مشورہ کرکے تیس مینڈ ہے قاضی صاحب کے گھر پہنچا دیئے۔ قاضی صاحب گھر پر موجود نہیں تھے جب آئے تو دیکھا کہ صحن میں ہر طرف مینڈھے ہی مینڈھے ہیں۔ بیوی سے پوچھا "کہاں سے اتنے مینڈھے آگئے"

بیوی نے کہا "ہمسایوں کو جب معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں قربانی کا کوئی انتظام نہیں تو انھوں نے یہ مینڈھے بھیجے ہیں"

قاضی جی بیوی کی بات سن کر چپ چاپ گھر سے نکل گئے اور کچھ دیر بعد لوہے کا ایک پنجرہ لیے ہوئے واپس آئے اور بیوی سے کہا "بھلی مانس مرغ کو اس پنجرے میں بند کرکے حفاظت سے رکھو یہ نہایت ہی برکت والا ہے خدا نے اسمٰعیلؑ کے لئے ایک مینڈھا فدیہ کے طور پر بھیجا تھا اور اس مرغ کے لئے اکٹھے تیس۳۰۔

بقیہ فن کار

"المختصر میرے یہاں شادی کا پیغام آیا اور میں نے قبول کرلیا اب سوال پیدا ہوا پیسہ کہاں سے لائیں میں نے فوراً شرع کا سہارا لیا اور اطلاع کردی کہ صاحب! میں اپنے چند رشتہ داروں کے ساتھ آؤں گا اور نکاح کے بعد رخصتی ہوجائے گی، میں رسم و رواج کو راہ دینے والوں میں سے نہیں شادی خالص شرعی ہوگی اور پھر ایسا ہی ہوا۔"

اس بات کو پورا کرتے کرتے اس کے چہرے پر غم و اندوہ کے بادل منڈلانے لگے۔ میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"دیکھو یار تمہیں کوئی نوکری نہیں ملتی تو کوئی بزنس ہی کرلو اور فرصت کے وقت لکھتے پڑھتے رہنا"

"کیا بتاؤں۔ میرے خیال میں قوت حس کے ساتھ ایک زحمت بھی ہے مجھے خستہ حال اور سڑک کے کنارے پڑے لوگوں کو دیکھ کر بہت ترس آتا ہے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہوں کہ یہ امتیاز کیوں؟ کوئی دانہ دانہ کے لئے محتاج ہے اور کوئی ان کو دانہ کے دام میں پھنسا کر ان کا سب کچھ لوٹ لیتا ہے۔۔"

"تو پھر تم صاحب استطاعت ہوجاؤ گے تو ایسے لوگوں کی امداد کرنا۔۔۔۔۔"

"لیکن نہ اب میرے پاس پیسے رہے اور نہ میں کچھ کرنے کے لائق رہا، ماسوا لکھنے پڑھنے کے۔۔۔۔۔ اب تو اس غریب کے پاس گنے چنے [illegible] بھی نہیں رہے"

یہ کہتے کہتے محمود کا گلا روندھ گیا اور وہ دوسری طرف رخ کرکے کھڑکی سے کہیں دور دیکھنے لگا۔

داداکے سکے پر میں بھی چل نکلا۔

بقیہ انٹرویو

آزادی کی ابتدا بہار کے دیہاتوں سے ہوئی تھی؟ گوتم بدھ کی آواز آپ کے بہار سے ہی گونج کر پورے ایشیا میں پھیلی، جین مذہب کی ابتدا آپ ہی کے صوبے سے ہوئی۔ چانکیہ بھی اسی صوبے کا تھا۔ آج بھی بہار ہندوستان کی نئی تاریخ میں نئے عنوانات قائم کرنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔

برگانوی: ایک سوال اور، اردو ادب کی چند بڑی شخصیتوں میں قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، علامہ جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی بہار کے ہی ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کو آپ کس حد تک مانتے ہیں؟

سلامت: یہ ساری ادبی شخصیات کیا ہیں، یہ سب عظیم محلات ہیں جن میں سر جھکائے بغیر داخل ہی نہیں ہوا جاسکتا۔ اردو کے قصر کی محرابیں ہیں یہ سب، بلکہ قصر کے در و دیوار ہیں۔ یہ ادبی شخصیتوں نے اردو کو جو کچھ دیا ہے اگر نہ دیا ہوتا تو اردو کا سرمایہ بد نصیبی کی حد تک کم رہ جاتا۔

کئی گھنٹے ہوچکے تھے۔ میں تھک چکا تھا، میرے پاس سوالات ختم ہوچکے تھے۔ لیکن سلامت صاحب ابھی تک تر و تازہ تھے۔ حالانکہ رات سے ان کی طبیعت ناساز تھی۔ انٹرویو کے بعد میں سلامت صاحب سے دوسرے موضوعات پر باتیں کرنے لگا۔ اس لئے ان کا شکریہ بھی ادا نہ کرسکا تھا۔ اب اس انٹرویو کی اشاعت کے وقت ان کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔)

ایک خوش نصیب ...

صدیوں کا خون پی کے بھی اب تک ہے پیاس کی
دھرتی پکارتی ہے ابھی تک لہو! لہو!!
سنگِ گراں کی طرح کھڑے کیوں ہو دوستو!
منزل کو جانتا ہوں مگر راستہ تو دو

اس قبیل کے اشعار کے علاوہ بھی ایسے شعروں کی کمی نہیں جن میں حسن ہی حسن، دلآویزی ہی دلآویزی اور رعنائی ہی رعنائی ہے۔ طوالت کا خوف اگر دامن گیر نہ ہوتا تو مظہر امام کی غزلوں کے وہ اشعار ضرور نقل کرتا جن میں لہجہ کی نرمی و شیرینی اور نفاست کے علاوہ ایک دلنواز قسم کی نشاطیہ کیفیت پنہاں ہے۔

ادھر کچھ عرصہ سے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جب سے مظہر امام کشمیر گئے ہیں تب سے "کشمیر کی غزلیں" کے عنوان سے ان کی غزلیں ملک کے مقتدر ادبی جریدوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ یہ عنوان ایک طرح سے نیا اور خوبصورت ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ مظہر امام ہمیشہ کسی نہ کسی نئی بات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ نئے ڈھنگ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اصل میں وہ پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کئے رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے اس ذہنی رویہ کے ذریعہ ہم ان کے اندر چھپی ہوئی نرگسیت کا بھی سراغ لگا سکتے ہیں یہ نرگسیت ان کی اکثر نظم و غزل میں جلوہ گر ہے۔

مظہر امام کو ہمیشہ کسی نہ کسی تازہ ویرانے کی تلاش رہتی ہے۔ وہ بندھی ٹکی ڈگر پر چلنا کبھی پسند نہیں کرتے۔ ان کو نئے لہجے، نئی علامتوں، نئی تمثیل اور نئے تجربے سے عشق ہے میں سمجھتا ہوں یہ اچھی بات ہے۔ اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔ اس سے فن کار کے ایک ذہنی رجحان کا پتہ چلتا ہے یعنی یہ کہ وہ زندگی اور فن دقیانوسیت کے خلاف ہے۔ اس کو لکیر کا فقیر بن کر جینا اور دقیانوسی نہج پر تخلیق فن کرنا پسند نہیں۔ وہ زندگی کے ارتقائی سفر میں شامل رہتا ہے اور ہر بدلے ہوئے دور کا ساتھ دیتا ہے۔ فنکار کے ذہن کا ہمیشہ رواں دواں رہنا اس کے طرزِ فن کی تازگی و ترقی پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فن کار کے اندر تلاش و جستجو کا مادہ ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ مختصر یہ کہ مظہر امام ایک خوش نصیب شاعر اور فنکار ہیں۔ ان کی رومان نگاری قابلِ ذکر چیز ہے۔

...یہ مظہر امام کی شخصیت

... چونکہ بیلنس چھوڑ سکیں گے کہ نہیں یہ کہنا میرے لئے مشکل ہے مگر یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غالب کی طرح

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

مظہر امام کے گھر سے بھی نایاب خطوط کا قیمتی خزانہ مل سکیگا۔

امام اپنی دھن کے بڑے پکے انسان ہیں۔ ہر کام لگن اور پابندی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اکثر ادبی رسالوں کی ترویج و ترقی کے لئے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے رہے ہیں۔ مغربی بنگال کی ادبی محفلوں میں اپنا نقش جما کر وہاں سے چھوڑ کر جب وہ آل انڈیا ریڈیو کٹک تشریف لے گئے تو وہاں بھی بہت جلد اپنا ایک خاص ادبی حلقہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے پھر اس کے بعد گوہاٹی منتقل ہو کر گئے تو وہاں بھی اپنے بہی خواہوں کا اچھا خاصا گروہ پیدا کر لیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مظہر امام کے اندر خود کو ماحول کے سانچے میں ڈھالنے کی زبردست صلاحیت ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کی شخصیت میں مظہر امام کے جیسی جاذبیت اور دلکشی پائی جاتی ہو۔ مظہر امام دراصل صورتاً اور سیرتاً دونوں حیثیتوں سے حسین واقع ہوئے ہیں۔ بڑی بلغ و بہار طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی گفتگو کا نرم و شیریں لہجہ بے حد دلربا اور دلپسند ہوتا ہے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں کے منتظم کی حیثیت سے بھی امام کی شخصیت یادگار رہے گی۔

میرے خیال میں مظہر امام کی ہمہ گیر شخصیت کی نرمی اور ان کے ہاتھوں میں سمٹ کر چلی آئی ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو آزمائش کے طور پر ان سے ہاتھ ملا کر دیکھ لیجئے۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ مظہر امام سے ایک بار ہاتھ ملا کر پھر کبھی ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کر سکیں گے۔ میرا خیال ہے کہ مظہر امام کا یہ شعر

نا قدرِ رسم حرم ہیں، نام ہے گرچہ امام
نیک نامی میں ہوئے ہیں ہم بہت بدنام بھی

ان کی شخصیت کا مکمل آئینہ دار ہے۔ مظہر امام، ماضی، حال اور مستقبل کے شاعر ہیں۔ مظہر امام وقت کے ساز پر گانے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ ایسی خوبی ہے جو ہر شخص کو میسر نہیں۔

بقیہ روح کے زخم

وہ لال عمارت؟ ہسپتال ہے۔ سامنے ہاں سامنے وہ رفیوجیوں کا کیمپ۔ کیمپ جو مظلوموں کی آماجگاہ ہے۔ مظلوم جو ہمیشہ سے ہیں ہمیشہ رہیں گے۔ بھوکے، ننگے، بیمار اور اپاہج۔ کھانا؟ ہاں کبھی مل جاتا ہے

وہ چلتا رہا۔ آگے اور آگے۔ اب منظر بدل گیا۔ انسانوں کی ننگی بھیڑ جو وحشیوں کی طرح ناچ رہی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے منظر خوفناک ہو گیا۔ لوگوں کی آنکھیں ابلنے لگیں۔ خون میں لت پت زبانیں اسے بار بار اپنی طرف بڑھتی محسوس ہوئیں۔ وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس نے چیخ کر بھاگنا چاہا۔

پھر سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا....
دھیرے دھیرے آنکھوں کے پپوٹے کھلے دھوپ پھیل چکی تھی۔ لوگ سڑکوں پر آ جا رہے تھے۔ اسے یقین نہ آیا۔ تو کیا سب کچھ خواب تھا؟

× —— × —— × —— ×

سرمایہ داروں کے اخبارات جو لکھتے ہیں ان سے آپ واقف ہیں۔ مگر کیا آپ جانتے ہیں کمیونسٹ پریس کیا لکھ رہا ہے۔

اس کے لئے پڑھئے۔

مارکسی کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان ہفتہ وار کھیت مزدور (کلکتہ) ہفتہ وار لوک لہر (اردو) دہلی۔ اور ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان ہفتہ وار حیات دہلی جو اب مکمل آفسٹ پر چھپتا ہے۔

اجے بھون کوٹلہ مارگ نئی دہلی



پاکستان سنٹرل جیل

کچھ قیدی ہیں سنٹرل جیل کراچی میں
کچھ قیدی ہیں سنٹرل جیل پشاور میں
کچھ لاہور اور پنڈی میں
حیدرآباد اور سبی میں

باقی ہم سب
پاکستان سنٹرل جیل کے قیدی ہیں
سر پہ بندوقوں کی نالیں
سینوں پر ننگی تلواریں
چہرے حرف و سخن سے عاری
سب اظہار کی جیبیں خالی
کیا جیتیں کیا ہاریں
دل میں دہشت
آنکھ میں وحشت

لب پر پہرے
حاکم اندھے، عادل بہرے
کون سا روپ اب دھاریں
کب سے کندھوں پر مسلح انسانوں کا بوجھ دھرا ہے
کیونکر اسے اتاریں
دست دیا زو آرڈی ننسوں میں جکڑے ہوئے ہیں
ہم مفتوحہ ملک کے باسی
اپنے وطن کی فاتح فوجوں کے نرغے میں
سسک رہے ہیں تڑپ رہے ہیں
ایسی گھٹن میں بولیں کیونکر
اتنے خداؤں کے جھرمٹ میں
کس کا نام پکاریں
کس موسم کے خوابوں کی تعبیر کا مجھ کو سودا تھا
کس موسم میں لے آئی ہے تیز ہوا
چاروں سو ہے ہُو کا عالم
جلتی رُت میں گھٹتا ہے دم
حدِ نظر تک پیلے پتے کانپ رہے ہیں
اپنے لاشے آپ اٹھائے ہانپ رہے ہیں
بڑوں پر شب کی عریانی بے شرمی سے ناچ رہی ہے
بجانی دہشت کے بگولے
ذہنوں کے شیشہ خانوں سے ٹکراتے ہیں

رو نظر کو شرماتے ہیں
ہے کے دروازوں پر انسانی خوں کی تحریریں

ہاتھ میں زہر کا پیالہ
سر پہ لہراتی شمشیریں
سب کی سب ہیں گویائی کے پاؤں کی زنجیریں
ساری قوم ہے
پاکستان سنٹرل جیل کی قیدی
مشرق و مغرب میں شاید یہ سب سے بڑا زنداں ہے
جس کے قیدی آٹھ کروڑ انساں ہیں

فارغ بخاری

•••

زندہ باد امریکہ

زندہ باد امریکہ
تیرگی کے بیوپاری
کیا دکاں سجائی ہے
اے خزاں کے پنساری
زندہ باد امریکہ

ہاتھ میں ترازو ہے
جس کے دائیں پلڑے میں
اسلحہ ہے شیطانی
اور بائیں بازو میں
سر ہیں سب فلسطینی
ہاتھ سے ٹپکتا ہے
تیرے خونِ انسانی
سلواڈار کے دشمن
اے بہار کے دشمن
زندہ باد امریکہ
تیرگی کے بیوپاری

گیہوؤں کے تھیلے ہیں
بھوک بھیج دیتا ہے
خوشنما کتابوں میں
جہل چھاپ دیتا ہے

تیرے مال کی راجہ
ہر طرف بڑائی ہے
مار ہے کٹائی ہے
ہجر ہے جدائی ہے

آنسوؤں کی نہروں سے
فصل کی سنچائی ہے
جبر کی فضاؤں میں
زخم کی کٹائی ہے

زندہ باد امریکہ
تیرگی کے بیوپاری

مرکزِ اشاعت پر
جھوٹ کے سپہ بھونرے
گنگناتے رہتے ہیں
نشر ہوتا رہتا ہے
جھوٹ بھی سیاہی بھی

فکر اور نظریوں کے
ایسے کچھ ادارے ہیں
جو دروغ بانی کے
فن سے تھان بنتے ہیں
جن کی نرم سطحوں پر
ریشمی فریبوں کے
دل فریب گل بوٹے
جگمگاتے رہتے ہیں
اور یہ تھان منڈی میں
خوب خوب بکتے ہیں
ان پہ چھاپے خانوں کے
نام تک نہیں ہوتے
بعض ایسے گاہک ہیں
دام تک نہیں ہوتے

ایشیائی ملکوں کے
نوجوان سادہ ذہن
پھول پھول جالوں میں
جا کے پھنس ہی جاتے ہیں
انگ انگ دلدل میں
لوگ دھنس ہی جاتے ہیں
زندہ باد عیاری
زندہ باد امریکہ
کیا دکاں سجائی ہے
تیرگی کے بیوپاری
زندہ باد امریکہ

حسن عابد (کراچی)

الینا سیرولوک

ترجمہ: ڈاکٹر قمر رئیس

بھکارن

وہ ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے
ایک عظیم ملک میں، قدیم زمانے سے
اس کی ساری، دھول یا پگڈنڈی کی طرح ہے
اس کی چولی اس کی نگاہوں کی طرح درماندہ اور نگوں ہے
میں اس سے کچھ کہوں لیکن وہ بڑی مغرور ہے
میں اسے کچھ دوں لیکن وہ کہاں رکھے گی؟
اس کے جھری دار چہرے پر سنتوں کی سی طمانیت ہے
اور ایک قوم کی جہاں آشنا عظمت کا وقار
اور اس کے چاروں طرف جگمگاتی دنیا
ایک طنز بھری تیکھی مسکراہٹ ہے

دوپہر کا چکّر

غم زدہ پھول اور شادماں تتلیاں
دوپہر کے وقت، ایک دور دراز ملک میں
شطرنج کی بساط کی طرح بچھے دھان اور جوار کے کھیتوں میں
جن کی مینڈھ پر نرم کاہی گھاس کا سُبک آنچل پڑا ہے
اناج اور بھوسے کے انباروں میں چلتے ہوئے بیلوں کے جوڑے کو دیکھ کر
جنھیں ایک ہنکانے والا مسلسل گردش دے رہا ہے
میرا سر چکرانے لگتا ہے۔
لیکن وہ تتلی کی طرح خوشیاں سمیٹ رہا ہے
اور بیلوں کی سی محنت سے آگہی بٹور رہا ہے
ان میں کون سی بات اہم ہے اور کون سی محض کھلونا؟
اس کا انجام کیا ہوگا اور یہ کب تک کھنچے گا؟
حقیقت کیا ہے اور نظر کا دھوکا کیا؟
میں روح کی حقیقت اور فریب میں امتیاز کر سکتی ہوں۔
دماغ کے دو حصّوں میں سے کون سا صحیح ہے؟
یا پورا ہی۔

نوٹ: ایک روسی شاعرہ الینا سیرولوک نے حال ہی میں ہندوستان کا دورہ کیا اور تقریباً پچاس نظمیں ہندوستان کی زندگی اور مظاہر فطرت سے متاثر ہو کر لکھیں —— یہ دو نظمیں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ (ادارہ)

عبداللہ مزدور کا بیٹا کیوں فیل ہوا

اُس کے پاس کتاب نہیں تھی
تو عبداللہ مزدور کے بیٹے نے
اپنے دل سے سارا پرچہ یوں حل کر ڈالا:
سوال ۔ لال قلعہ اور تاج محل
کس نے بنایا؟
جواب ۔ کاریگروں نے، مزدوروں نے
سوال ۔ بھارت کب آزاد ہوا؟
جواب ۔ ابھی کہاں آزاد ہوا!
سوال ۔ منصوبوں کے بارے میں کچھ لکھو
اپنے جیون پر ان کا اثر دکھاؤ
جواب ۔ منصوبے اچھے ہوتے ہیں
میرے باپ کو پہلے سے
اب دُگنے پیسے ملتے ہیں
مہنگائی آٹھ گُنی ہے
بہنوں نے ہڑتال میں گولی کھائی
بھائی بے کار ہے کیونکہ
کام کی خاطر رشوت دینی پڑتی ہے
ماں کو ٹی بی ہے
دوا بہت مہنگی ہے

عبداللہ مزدور کے بیٹے کا
فیل تو ہونا لازم تھا

شفق

آسماں نے جُھک کے اپنے خشک لب
زمیں کے منتظر لبوں پہ رکھ دیئے
تو گرمیٔ نشاط موجِ رنگ بن گئی
اُفق پہ سُرخ سُرخ پھول کھِل اُٹھے

سیّد محمد مہدی

سعیٔ لاحاصل

دُور آسماں کی لامحدود وسعتوں میں
جب کوئی ستارا جھلملا آئے
تو دل کے زخم کھِل اُٹھتے ہیں
رات کی تاریکی اور گہری ہو جاتی ہے
اور ٹمٹماتی جھلملاتی شب کے ماتھے پر
یاد کے جگنو روشنی بکھیرنے لگتے ہیں
اندر کا اندھیراپن اور بڑھ جاتا ہے
اور میں گمنام راہ کے مسافروں کی طرح
تنہا کھڑا
کسی کے پانے کی تمنّا
دل میں لئے
چاند کو چھونے کی
اک سعیٔ لاحاصل کر رہا ہوں

ظفر اقبال

زندگی

مادّہ، اشعاع و اطّلاع سے نہیں
یہ جہاں زندگی کی بستی ہے
زندگی سے بقائے استکمال
بنتے بنتے حیات بنتی ہے
زندگی مُستمر تبادل ہے
لینے دینے سے بات بنتی ہے
ہوگی پیچیدہ جس قدر ہیئت
مُرتفع ارتقا میں ہوتی ہے
زندگی نام ہے تدوّر کا
دائرہ، دائرے پہ ہوتی ہے
مادّہ، اشعاع و اطّلاع کے سبب
اوج پر برقرار رہتی ہے
گرچہ نازک ہے پیکرِ حیواں
ذاتِ ہستی متین ہوتی ہے
ہے یہ تبدیلیوں میں پُشبہ قرار
اپنی ہیئت بنائے رکھتی ہے
زندگی موت سے نہیں مرتی
رمز خلیے میں چھوڑ دیتی ہے
ایک خلیے سے بڑھتے بڑھتے حیات
پورا پیکر سنوار لیتی ہے
ایک پیکر کی موت سے پہلے
تازہ پیکر نکھار لیتی ہے
فرد، جمعیت اور کائنات
اِن کے رشتوں سے ذات بنتی ہے
رازِ ہستی ہے رازِ مادّہ حبیبؔ
مادّہ ہی سوز و سازِ ہستی ہے

حبیبؔ حیدرآبادی

رعنائیاں

تشنہ تشنہ ڈھال رہی ہے
رنگھ لی رعنائیاں
خون بدن میں سرپٹ دوڑے
ذہن پہ اشک کے سوتے پھوٹے

گہرائیاں

خشک ہاتھ کی کنکریوں پر
لہریں دینے لگتی ہیں
پانی کی شادابیاں
پور پور پر ہنس اٹھتی ہیں
خوابیدہ گہرائیاں

عارج میر

انصاف

اسے معاف ہی کرنے میں خیر ہے سب کی
کہ جس کے واسطے دنیا پکار اٹھتی ہو
سزائے موت کسی جرم کی سزا تو نہیں
کسی بھی رہبرِ کشور عوام کی خاطر
سزا ہی دینا ہو مقصود تو اسے آخر
جلاوطن کی اسے عدلیہ سزا بخشے!
وہ تاکہ اپنے گذشتہ حیات کو لے کر
ہر ایک اجنبی بستی میں گشت کرتا رہے
کہ غار غار سے تا زیست جست کرتا رہے
اسے اسی کے بدن میں بٹھا دیا جائے
حقوق شہر سے بے بس بنا دیا جائے
مگر بشر کو سلاخوں میں بند رکھتے ہیں
یہی رواج چلا آرہا ہے صدیوں سے
زبان والوں کو محبوس کر دیا جائے
کہ جس گیا ہے بشر سے وقار آدم کا
عجیب خانے اور چڑیا گھر ونکے جسموں سے
دماغ و چشم کو ملتی ہے تفریح و عبرت
کہ پھر بھی ہوتے ہیں اجرام زندگی ہر سو
کسی کو آئین و مذہب بچا نہیں سکتا
کہ جھوٹ سچ میں تفاوت ہمیشہ رہتا ہے
کوئی بھی کیوں نہ ہو یکسانیت نہیں ملتی
کہ جھوٹ سچ میں تفاوت ہمیشہ رہتا ہے
کسی بھی جرم کو کوئی چھپا نہیں سکتا
ہمیشہ گویاں رہیں گی جہاں کی تاریخیں
سمادھی اور کبھی لحد کے نشانوں سے
اٹھیں گے سینکڑوں فتنے برائے امن و اماں
کہ سنگ باریاں ہوتی رہیں گی لعنت کی
ہر ایک سانس سے آئیگی بو بغاوت کی

سیف الدین انصاف

لمحوں کی قبر

ایک اک قطرہ لہو کا
روز و شب کی یہ صدا
وقت کی مٹھی
سمٹتے ٹوٹتے
اعصاب میں
لٹ رہا ہے قافلہ امید کا
ریت کی مانند پھیلی بے رخی
ہر طرف بے چہرگی
دفن ہو کر رہ گئی
اپنی صداؤں کی وہ لاش
بے صدا لمحوں کی سونی قبر میں ۔۔!
کرب اور آلام کی قبر نے
میری
چیختی ہیں ہڈیاں
ٹوٹ جاتا ہے سکوت
آرزوؤں کا وہ چہرہ ہر طرف مرجھا گیا
قفل جبر و ظلم ہونٹوں پر لگا
آج بھی
تھرتھراتی ہے زباں
جبڑوں کے حلقوں میں

شوکت صبا کیفی

غزلیں

زمیں چھین لی اس نے اک آسمان دیکر
مجھے بھی کردیا بے خانماں جہان دیکر
بھٹک رہا ہوں کہ لطفِ سفر بیاں کروں
اکیلا ہو گیا یاروں کو کارواں دے کر
پھر اس کے بعد زمیں بھی سمٹ گئی مجھ میں
وہ کتنی خوش تھی مجھے اپنی پیتیاں دیکر
درخت اپنے مناظرے ہو گیا محروم
ہوا کے ہاتھ میں سرسبز پتیاں دے کر
عجب سلوک کیا مجھ سے میرے دشمن نے
خود اپنی جان گنوا دی مجھے اماں دیکر
بنا رہا ہے وہ تصویر میرے ہاتھوں میں
مرے ہی چاک گریباں کی دھجیاں دیکر
مجھے کہیں کا نہ رکھا میرے قبیلے نے
بہت ذلیل کیا چند ڈگریاں دے کر
وہ اپنی جان سے گذرا تو قدر کی اسکی
حریف شہر نے لوباں کا دھواں دیکر
نخشوں میں گذرتی ہے زندگی اب تو
کسے گواہ کروں نقد جسم و جاں دے کر

عبدالرحیم نشتر

احساس کی زمیں سے ستارے اگا دیئے
میں نے بیاں کے پھول پہ پہرے بٹھا دیئے
محرومیوں کی رات گھنی اور ہو گئی
صدیوں کی اس منڈیر پہ اب تو جلا دیئے
طوفان کے اس نگر میں اتر کر خوشی کے ساتھ
موجوں کے سر پہ چھلکے سفینے جلا دیئے
دار و رسن کے فخر شہادت کی آرزو
(ز)م و عمل کو ہم نے سلیقے سکھا دیئے
اتنے وہ کس کی چیخ تھی لیکن مجھے لگا
جیسے کسی نے عرش کے گنبد ہلا دیئے

الافضل عمر

ہر اک شے آج گھر کی بے وضو ہے
مکاں میرا غریقِ آبجو ہے!
میں خود پڑھتا ہوں قسمت کا نوشتہ
بیاض چہرہ میرے روبرو ہے
میں خود اپنی نظر سے گر گیا ہوں
انا دشمن مری ہی گفتگو ہے
پریشاں آج سارے دیوتا ہیں
کہ تانڈو نرت میں رقصاں لہو ہے
کوئی پودا تمنا کا لگاؤ!
بہت ویراں کشتِ آرزو ہے
خموشی کی لگی ہیں لب پہ مہریں
مرے اندر مگر اک ہاؤ ہو ہے
کسی صفحے پہ اپنا نام لکھ دو
ابھی سادہ کتابِ آرزو ہے
جسے سمجھے جنوں بے جان پتھر
اسے دیکھا کہ محوِ گفتگو ہے

جنوں اشرفی

روتے روتے جو سو گیا مجھ میں
ہو گیا کتنا بے صدا مجھ میں
میں سمندر سے پیاسا لوٹ آیا،
جاگ اٹھی تھی میری انا مجھ میں
لوٹ جانے کا ہے بہت امکاں
روز ہوتا ہے حادثہ مجھ میں
میری صورت پہ سب گئے لیکن،
کس کو فرصت تھی جھانکتا مجھ میں
کس کا لاشہ میں ڈھوئے پھرتا ہوں
کون اے کیف! مر گیا مجھ میں

کیف عظیم آبادی

ہماری زیست ہے تم سے ہماری جاں تم ہو
سجی ہے محفلِ یاراں مگر کہاں تم ہو!
کڑی ہے دھوپ مگر اس سے کیا بگڑتا ہے
ہمیں تو ہے یہ تسلی کہ سائباں تم ہو
تمہارے سامنے رکھا تھا آئینہ لاکر
بس ایک بات پہ برسوں سے بدگماں تم ہو
ہمارے سینے میں چھالے تمہارے طنز کے ہیں
مگر ہے شہر میں چرچا کہ بے زباں تم ہو
خرید کر بھی تمہیں گھر میں لا نہیں سکتے
کہ گنجِ لعل و جواہر سے بھی گراں تم ہو
سوال جیسا ہو ویسا جواب دو پیکر
نہیں تو لوگ یہ سمجھیں گے بے زباں تم ہو

نور پیکر

شہر کی یاد کو سینے سے لگائے رکھنا،
دشت میں بھی کوئی ماحول بنائے رکھنا
رات کے پچھلے پہر بھی کوئی آ جاتا ہے
اپنی چوکھٹ پہ چراغوں کو جلائے رکھنا
راس آیا ہے ہمیں بھی کوئی موسم شاید
گھر امیدوں کا کھنڈر میں بھی بچائے رکھنا
قافلے روشنی میں بھی لٹے ہیں اکثر
رہبروں سے ذرا دامن کو بچائے رکھنا
بڑھ گئی اور بھی وحشت مری تنہائی میں
بھولنے والے کو مشکل ہے بھلائے رکھنا
زندگی جانے ہمیں کیسے نوازے آ کر،
سُرمئی خواب کچھ آنکھوں میں چھپائے رکھنا
راز کر دیتی ہیں غیروں پہ یہ افشا دل کا
بات کرتے ہوئے آنکھوں کو جھکائے رکھنا
ٹوٹتے رشتوں نے دیوار پہ لکھدی سرخی
روح کا درد بھی اپنوں سے چھپائے رکھنا
لوگ شیشوں کو بھی ہمراز بنا لیتے ہیں
چلمنیں اپنے دریچوں کی گرائے رکھنا

سادھو رام دلوانہ

غزلیں

پرسش غم کو جب وہ آتے ہیں
زخم سینے کے مسکراتے ہیں
لاکھ ہو ساحل سکوں ساماں
ڈوبنے والے ڈوب جاتے ہیں
ہم ہی وہ صاحب ہم ہیں جو
آندھیوں میں دیئے جلاتے ہیں
اک مرے شوق دید بے حد پر
وہ تجلّی دکھائے جاتے ہیں
شان بے تابی جمال نہ پوچھ
اب مسلسل پیام آتے ہیں
پھر سے مقتل میں روشنی کے لیے
لو، وہ تیغ نظر اٹھاتے ہیں
ہائے وہ وقت جب شب فرقت
ہم خدا کو ہی بھول جاتے ہیں
مژدہ اے وحشت دل ناشاد
گھر میں سناٹے سرسراتے ہیں
اف وہ اک عالم حجاب ناز
اپنی نظریں وہ جب جھکاتے ہیں
دیکھئے نقش روئے ناکامی
قصّے کیسے کیسی سناتے ہیں
دوست ہوتے ہیں اے بسنت وہی
وقت مشکل جو کام آتے ہیں

بی ایل بسنت

لاش بے نام جو محروم کفن ہے ابتک
اسکے سینے میں چبھن دل میں جلن ہے ابتک
آگ لگنے کی حکایت کو تو یگ بیت گئے
پھر بھی ذہنوں میں دھواں اور گھٹن ہے ابتک
ایک مدّت سے فروزاں ہیں تمدن کے چراغ
پھر بھی شب رنگ زمانے کا چلن ہے ابتک
کتنی صدیوں سے نشیمن ہے کنار دریا
میری منقار گل تشنہ دہن ہے ابتک
ہم نے سو بار اسے کند کیا ہے لیکن
تیز تر نیشتر رنج و محن ہے ابتک
ان فضاؤں میں بصیرت کے صنم بھی ہیں مگر
آدمی سجدۂ ظلمت میں مگن ہے ابتک
ہم نے اک بار بھی دیکھا نہیں ایسا ہوتے
کیسے مانیں کہ گھر بار گگن ہے ابتک
الجھنیں اور جھمیلے ہیں افق تا بہ افق
زندگانی کا سفر سخت کٹھن ہے ابتک
عہد طفلی میں سجالی تھی جو مورت ہادی
میرے جیون پہ وہی عکس فگن ہے ابتک

منوہر لال ہادی

وہ گل حسین تر لگے اگر حجاب میں رہے
جو ہم کو چاہیے جیتنا تو پھر نقاب میں رہے
کچھ اس طرح رہا ہے وہ ہمارے بیچ دوستو!
کہ جیسے کوئی خار ہو کے بھی گلاب میں رہے
نظر وہ ایک لطف کی ہمیں نصیب ہی کہاں
کہ ہم تو اسکو چاہ کے بھی اک عذاب میں رہے
رہے ہیں انکے دل میں ہم بھی اپنی اصل بھولکر
کہ جیسے کوئی برگ گل کسی کتاب میں رہے
تو چھینتا ہے کس لئے نظر کے جام ساقیا
کہ ہم تو غرق عمر بھر اسی شراب میں رہے

منظور حسین

وہ سیڑھیوں سے اترتا دکھائی دینے لگا
پھر اسکے بعد اندھیرا دکھائی دینے لگا
تعلقات کی بوسیدگی بڑھی اتنی
ہر ایک شخص اکیلا دکھائی دینے لگا
سنا رہا تھا کہانی شگفتہ لمحوں کی
ایک دم ہی شکستہ دکھائی دینے لگا
وہ اجنبی کی طرح میرے پاس بیٹھا تھا
چلا گیا تو فرشتہ دکھائی دینے لگا
رکی تھی ریل تو کرا سنگ پہ چند لمحے مگر
یہ کیوں سفر مجھے لمبا دکھائی دینے لگا
ہوا جو ان بچھڑنے کا کرب جب سلیم
افق افق کوئی چہرہ دکھائی دینے لگا

محمد سلیم انصاری

غزلیں

کیسے ملا یہ شرف مجھ گناہ گار کے بعد
ہُوا نہ وادرِ رحمت میرے وقار کے بعد
چمن کی سیر کرا تا رہا مجھے صیّاد
کبھی بہار سے پہلے کبھی بہار کے بعد
ہوئے تھے گرد بسِ کارواں ہی گم تو ہیں
اُبھر رہے ہیں کئی قافلے غبار کے بعد
اِدھر تو شیخ نے کی بات خلد و دوزخ کی
اُدھر چڑھا بھی گیا ذکر نور و نار کے بعد
جنوں میں تن کو بھی اب لخت لخت کرنا ہے
یہی بچا ہے گریباں میں تار تار کے بعد
حریمِ حُسن کا برسوں کیا طواف بسیم
جھلک نصیب ہوئی سعیٔ بار بار کے بعد

بسیم حیرتی

جھونکے بھی بہاروں کے پاتے وہ دریچوں میں
آواز اگر دیتے وہ دل کے مکانوں میں!
ہر سمت بہاریں جب اس بار بھی آئی ہیں
خوشبو تو کہیں ملتی بکھری ہوئی زلفوں میں
جب کوئی تعلق اور نسبت ہی نہیں مجھ سے
تحریرِ محبت کیوں پڑھتے وہ نگاہوں میں
یہ ذکر ہوا کس کا یہ نام لیا کس نے
سیلاب نظر آیا آنکھوں کے جزیروں میں
جس راہ سے گذرے ہو سنسان ہے وہ رستہ
یادوں کی مہک لیکن باقی ہے ہواؤں میں
انسان رہے زندہ کھا کھا کے غذا کیسے
بکتا ہے وہی سودا جب آج دکانوں میں
جب دور بدلتا ہے یہ دور بھی بدلے گا
وہ رنگ ڈھونڈو تم کچھ اپنے سماجوں میں

شہناز مسرت

تہذیب کیا اِسے کہیں دَورِ جدید کی
تقلید کر رہا ہے زمانہ یزید کی
پیغام عیش دے گی کرن کیا اُمید کی
دل میں مہک ذرا بھی نہیں اب بھی عید کی
جو چاہو وہ سزا دو یہی ہے مری خطا
جس سے بھی کی ہے میں نے محبت شدید کی
میرے لئے تو پیار گناہ عظیم تھا
تکلیف کیوں گناہ کی تم نے مزید کی
ہر آرزوِ شوق کو دم توڑنا پڑا
دیکھی جو آرزوؤں نے میّت اُمید کی
ہر شے سے بے نیاز ہر اک غم سے ماورا
کتنی حسین ہوتی ہے دنیا اُمید کی
راغب ثبوتِ حق و صداقت کے واسطے
کافی ہے ایک بوند ہی خونِ شہید کی

آفتاب عالم راغب دہلوی

ایک اِک سانس کا رکھتی رہی تو بھی تو حساب
زندگی بول ترا مجھ پہ بقایا کیا ہے
پھاڑ کر پھینک دیا تھا جسے لکھ کر تو نے
پُرزہ پُرزہ ہوں وہی خط مجھے پڑھنا کیا ہے
کوئی دیوار گری ہے نہ کوئی چھت ٹوٹی
گھر میں ہر سمت یہ بکھرا ہوا ملبہ کیا ہے
تو کبھی میرا تھا۔ اب کس کا ہے معلوم نہیں
اُڑتے بادل کا کسی کھیت سے رشتہ کیا ہے؟
شاد و آباد رہیں مل کے بچھڑنے والے
ہم بھی کیا لیں گے اسے سیماب ہمارا کیا ہے

سیماب سلطانپوری

محرومیوں کی کاٹ چکا ہوں کڑی سزا
کیا ہوگا اس سے بڑھ کے کوئی اور مرحلہ
اپنی جفا کا رہنے دو تم یونہی در کھلا
ورنہ کہیں گے لوگ میں مطلب پرست تھا
افسوس جنکو جینے کا حق مجھ سے تھا ملا
وہ آج میری سانسوں کو گنتے ہیں بارہا
ہلکی سی اک جھلک تھی مری ابتدائے زیست
اب بن گئی ہے درد کا مضبوط سلسلہ
تم ساتھ ساتھ ہو قسمت کی بات ہے
ورنہ یہ دور آج کا لگتا ہے سرپھرا
چلئے کسی بہانے تمہیں اے شمیم راز!
اپنے و غیر دونوں کا کچھ تو پتہ چلا،

شمیم راز

جہاں سربلندی ہو اقبال ہو
جہاں ہر بشر خوب خوشحال ہو
جہاں خوف کا ہو نہ کوئی وجود
کُھلی ہوں محبت کی ساری حدُود
خردمند و عالم ہوں ہر جا جہاں
ہوں اُلفت کی نہریں ہمیشہ رواں
دلوں پر ہوں قابض نہ بغض و عناد
نہ فطرت میں ہو شامل دنگا فساد
کریں سخت محنت جو پیر و جواں
غریبی کا مٹ جائے نام و نشاں
یہی مہر مانگے خدا سے دُعا
رواں ہو وطن میں نسیم صبا

مہر بخشی

غزلیں

خدا سی بات پہ منہ اپنا موڑتے کیوں ہو
پرانی دوستی ایک پل میں توڑتے کیوں ہو
اگر ہے دل میں کوئی بات صاف کہہ ڈالو
فضول طنز کے تم تیر چھوڑتے کیوں ہو
بس ایک وار میں قصہ تمام کر ڈالو
یہ دھیرے دھیرے لہو نچوڑتے کیوں ہو
جھپٹ کے چھین لو جام شراب ساقی سے
حصول عشق کے لیے ہاتھ جوڑتے کیوں ہو
مرادیں یوں کبھی فردوس بر نہیں آتی
فسردہ سنگ پہ سر اپنا پھوڑتے کیوں ہو

فردوس گیاوی

آج کل گھٹائیں بھی اس طرح برستی ہیں
جھیلوں میں باڑھ آئے کھیتیاں ترستی ہیں
تیری جستجو کب تک دربدر رہبر اسے گی
اب تو شہر کی راہیں ناگ بن کے ڈستی ہیں
جن کی آرزو لے کر میں نے کتنے جیسے
زندگی کی وہ گھڑیاں آج مجھ پہ ہنستی ہیں
ان حسین جسموں کی چھاؤں زہر ہوتی ہے
صندلوں کی شاخوں میں ناگنیں بھی بستی ہیں
نیک نامیوں کا ذکر کوئی بھی نہیں کرتا
آجکل سبھی داموں ذلتیں ہی سستی ہیں
اسے نشاط مت پوچھ زندگی کی کچھ یادیں
آج اپنی بانہوں میں کس طرح سے کستی ہیں

(ڈاکٹر) احسن نشاط

آنکھوں میں بوند بوند سمندر لئے پھروں
میں دل میں تیری یاد کے نشتر لئے پھروں
دنیا سے دور نیند کی پریوں کے دیس میں
بے خواب آرزوں کو شب بھر لئے پھروں
کیوں در بدر پھروں میں کسی کی تلاش میں
محرومیوں کا اپنی مقدر لئے پھروں!
شہر بتاں میں میرا کوئی قدرداں نہیں
ان انگلیوں میں صنعت آذر لئے پھروں
الفاظ کو عطا کروں پیکر نئے نئے!!
ہاتھوں میں اس کا ہاتھ برابر لئے پھروں
روئے زمیں کی سیر کروں یا فضا کی سیر
کب تک اس آسمان کو سر پر لئے پھروں
وہ نازنیں ملے جو کبھی صحن باغ میں
میں شہر شہر فکر سخنور لئے پھروں
ادنیٰ سے اک دماغ میں قدرت کا یہ کمال
اسرار کائنات کا دفتر لئے پھروں
پرچھائیاں زمانۂ ماضی کی اے حزیں
تنہائیوں کے دشت میں اکثر لئے پھروں

جنید حزیں

صبح کاذب ہی رہی رات کے پالونکی حدیث
تیرگی سن کے پشیماں ہے اجالونکی حدیث،
کس نے کہدی غم دوراں کے سوالونکی حدیث
جس سے بے کیف ہوئی زہرہ جمالونکی حدیث
سینۂ دشت پہ رقصاں ہوئے آوارہ گلاب
جب بھی کانٹوں نے سنی پاؤںکے چھالونکی حدیث
جانے یہ کون سی منزل ہے جہاں یاد مجھے!
اب نہ لیلیٰ کا فسانہ نہ غزالوں کی حدیث
زندگی رقص کناں ہوتی ہے اس دم خادم
مستند ہوتی ہے جب مجھ سے جیالونکی حدیث

خادم بلخی

حصول جلوہ ... بنایا تھا
بتایئے تو وہ انداز ... کیا تھا
تھا فیصلے کی صداقت سے انحراف اسے
کوئی بتائے تو اس کا سبب مگر کیا تھا
نظر نہ آئے کہیں بھی نقوش اجالے کے
سیاہ رات کا سیلاب تیز تر کیا تھا
شکار خوف تعاقب نہ ہونا تھا اس کو
اگر تھا ساتھ کسی کا سفر میں ڈر کیا تھا
مرے حریفوں سے اسنے مری شکایت کی
وہ میرے ذوق کا دشمن تھا اد گر کیا تھا
اگر تھا طرز قدامت سے احتراز اسے
جدیدیت کے طریقوں میں بھی ہنر کیا تھا
تمام عمر تو تم اشر رہا ۔ ۔ ۔ ۔ انور
سمجھ سکا نہ ذرا حرف معتبر کیا تھا

انور پانی پتی

وہ نہ کہہ دے یہ تیرا چہرہ نہیں
ڈر سے میں نے آئینہ دیکھا نہیں
پھل کے گرنے میں ہوا کا ہاتھ تھا
میں نے پتھر کوئی بھی پھینکا نہیں
گھٹ کے ماحول میں انسان سکا،
دم گھٹا کرتا ہے اور مرتا نہیں
جنگلوں میں رہ کے بھی بے خوف تھے
جبکہ تھا تہذیب کا چرچا نہیں
جرم ہے میرا یہی میں کیا کروں
میں نے چپ رہنا کبھی سیکھا نہیں
دل کا تھا مضبوط کتنا آئینہ!
تیری انگڑائی سے بھی ٹوٹا نہیں
مشتعل سورج ہے پیچھے ...
تیز تر تھا کوئی سایہ نہیں

... عمادی